خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ

ماهنامہ

سسپنس ڈائجسٹ

مارچ 2013

نگران اعلیٰ

معراج رسول

www.paksociety.com

سسپنس ڈائجسٹ
مدیرہ اعلیٰ

جلد43 • شمارہ03 مارچ 2013 • زرِ سالانہ 700 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 60 روپے •
پبلشر و پروپرائٹر: ذیشان رسول • مقامِ اشاعت: گراؤنڈ فلور C-63 فیز II ایکسٹینشن، ڈیفنس، مین کورنگی روڈ کراچی 75500

انشائیہ

نسخہ کیمیا

جون ایلیا

وہ سرزمین ہار گئی جس میں سب سے پہلی بار گیہوں بویا گیا تھا۔ وہ زمین ہار گئی جس میں پہیّا ایجاد ہوا تھا۔ وہ زمین ہار گئی جس نے دنیا کو دانش سکھائی تھی اور پیغمبروں کو پرورش کیا تھا۔ وہ زمین ہار گئی جس نے انسانوں کو اپنی دانش پر فخر کرنا سکھایا تھا۔ وہ زمین ہار گئی جس نے دنیا کو پہلی بار قانون کے ضابطے تعلیم کیے تھے۔ ہاں، جورابی ہار گیا۔ تو صورت حال یہ ہے کہ عراق ہار گیا۔ انسانوں کی بہترین ذہانتوں، کہانتوں اور خطابتوں کی پیش گاہ ہار گئی۔ جون ایلیا تم ہار گئے، تمہارا نسب نامہ ہار گیا۔ تمہارا ماضی اور ماضی کا ماضی ہار گیا۔ بابل ہار گیا، بغداد ہار گیا۔

ایتھنز کے بعد تاریخ نے بغداد سے زیادہ دانش افروز شہر پیدا نہیں کیا۔ اگر تاریخ پڑھتے ہوئے بغداد کو چھوڑ کر آگے بڑھا جائے تو مہذب انسانیت کا ذہن بیسویں صدی سے گزرنے کا تصور ہی نہیں کر سکتا۔

جب ہلاکو خان نے بغداد کو تباہ کیا تھا تو دنیا کے عظیم ترین شاعر سعدی نے اس تباہی کا مرثیہ کہا تھا۔

آسماں راحق بود گرخوں بہ بارد بر زمیں
برزوال ملک مستعصم امیر المومنین
اے محمدؐ گر قیامت سربروں آری زخاک
سربروں آرد قیامت درمیان خلق ہیں

اے میرے ہم نشین شام قیامت برپا ہو گئی ہے۔ بغداد اپنی بدترین سرنوشت سے دوچار ہوا ہے۔ تمہاری تہذیب کی سب سے بڑی علامت لہولہان ہو گئی ہے۔ شہروں کا وہ شہر تباہ و برباد ہو گیا ہے جس کے چوراہوں پر تاریخ کی سب سے اعلیٰ دانش، سب سے اعلیٰ بینش کام کیا کرتی تھیں۔ یہ سب کچھ ہو گیا ہے اور کچھ بھی نہیں ہوا۔ بغداد تباہ و برباد ہو گیا اور کسی سعدی نے کوئی مرثیہ نہیں کہا۔ اس لیے کہ اس زمانے کا بغداد سعدی کے زمانے کا بغداد نہیں تھا۔ اس وقت بغداد کے پیچھے ایک درخشاں تاریخ تھی مگر اس بار بغداد کے پیچھے کوئی تاریخ نہیں تھی۔

سن لیا جائے اور سمجھ لیا جائے کہ تاریخ کے خلاف کبھی جنگ نہیں کی جا سکتی اور اگر جنگ کی جائے گی تو شرمناک ترین شکست کا منہ دیکھنا پڑے گا۔ تم نے تاریخ کے خلاف جنگ کی اور اپنے اندر اور اپنے باہر شکست کھا گئے۔ جو مستقبل کی طرف قدم نہیں اٹھائے گا، وہ ماضی کی طرف بُری طرح دھکیل دیا جائے گا۔ تمہارے حریف اور اس کے اتحادیوں کے ساتھ علم تھا، دانش تھی۔ حکمت اور عمل کا ایک طویل سلسلہ تھا۔ اس لیے ان کی دھاندلی جیت گئی۔ تمہارے ساتھ ایسا کوئی سلسلہ نہیں تھا اس لیے تمہاری غلط کاری اور غلط کوشی کو تو سزا یاب ہونا ہی تھا۔ تم بتاؤ، جواب دو کہ ایسا کیوں نہ ہوتا۔ آخر تم نے تاریخ سے ایسا کون سا معاہدہ کیا ہے کہ تم وقت سے ہٹ کر چلو اور وقت تمہیں راستہ دے دے۔ عراق کی شکست جمہوریت کے مقابلے میں آمریت کی شکست ہے۔ علم کے مقابلے میں جہالت کی شکست ہے۔

کیا یہاں کبھی یہ سوچا گیا کہ اسلحہ درآمد کرنے والے، اسلحہ برآمد کرنے والوں سے کیسے مقابلہ کر سکتے ہیں اور اگر مقابلہ کر بھی گزریں تو کیسے فتح پا سکتے ہیں؟

کیا ہنر کی نقالی ہنر سے جیت سکتی ہے، کیا خریدی ہوئی مہارت حقیقی مہارت کا سامنا کر سکتی ہے؟ حیرت ہے کہ ہم یہ بات کیوں نہیں سوچتے اور یہ نکتہ کیوں نہیں سمجھتے۔ ہمیں اس حقیقت کا احساس کیوں نہیں ہوتا کہ ہم ایک ہزار برس سے تاریخ کے دسترخوان پر حرام خوری کے سوا اور کچھ نہیں کر رہے۔

میں اپنے آپ سے اور اپنے گردوپیش سے یہ سوال کرنا چاہتا ہوں کہ آخر ہم نے سوچا کیا ہے؟ ہم تاریخ سے آخر کس طرح کا مقابلہ کرنا چاہتے ہیں؟

حقیقتِ حال یہ ہے کہ ہم تاریخ سے کوئی معاملہ کرنا ہی نہیں چاہتے۔ ہم نے تاریخ سے کبھی کوئی سلیقے کا معاملہ نہیں کیا۔ تاریخ قوموں کی کوئی زرخرید لونڈی نہیں ہے کہ اس سے جو کچھ چاہا جائے، وہ منوا لیا جائے۔

تاریخ کی سب سے بڑی حقیقت یہ ہے کہ یہ زمانہ علم، دانش اور جمہوریت کا زمانہ ہے۔ علم کے سامنے ذلیل ہونا جہالت کا مقدر ہے۔ جمہوریت کے مقابلے میں شکست کھانا آمریت کا مقسوم ہے اور کوئی قوم اپنے تاریخی مقدر اور مقسوم سے سرتابی نہیں کر سکتی۔ جو قوم علم، دانش اور جمہوریت کے ساتھ زندہ رہنے کا شعور نہیں رکھتی، اسے رہنے کا کوئی حق نہیں۔ علم، دانش اور جمہوریت، یہی قوموں کے لیے اک نسخہ کیمیا ہے اور بس۔

آپ کا خط

عزیز قارئین!
السلام علیکم!

مارچ 2013ء کا شمارہ رنگ برنگے پھولوں کی آمد اور بدلتی رتوں کی نوید کے ساتھ حاضر ہے۔ 23 مارچ 1940ء "قرارداد پاکستان" تاریخ کا ایک اہم سنگ میل...... ایک پرامن اور ترقی یافتہ ملک کی بنیاد اور عزم کا دن مگر...... تاحال "پیوستہ ہیں شجر سے اور امیدیں "باہر" ہیں" ویسے آج کل "ملک سنوارو" مہم بڑے زوروں پر ہے۔ ہر جگہ صفائی کا خاص خیال، شکستہ سڑکوں کی مرمت، گندے پانی کی نکاسی کا تیز رفتار نظام اور دیگر شعبہ جات کی شکستگی کو دور کرنے کا انتظام۔ واہ...... گویا "الیکشن سے بھرپور فضا" کو ملک میں تمام سال طاری رہنا چاہیے، جب تمام قائدین صحیح معنوں میں "مجبور عوام" کے خادم نظر آتے ہیں۔ کسی بھی قوم کی ترقی میں اس کی بنیادی ترجیحات کا کمال ہوتا ہے، جس میں تعلیم کا شعبہ سب سے اہم ہے مگر ہمارے ہاں تعلیم کے معاملے میں حکومتی سنجیدگی کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ہائر ایجوکیشن کمیشن کی خودمختار حیثیت کو ختم کرکے اسے حکومتی تحویل میں لینے کی سمری منظوری کے مراحل میں ہے۔ اس کے علاوہ کراچی کے کئی سرکاری اسکولوں کی پرائیویٹ سیکٹر کو فروخت کے اسکینڈلز بھی سامنے آرہے ہیں اور یہ کوئی اتنا خوشگوار احساس نہیں ہے۔ موجودہ حکومت کی آئینی مدت کا مکمل ہونا اگرچہ قابل تعریف امر ہے مگر توانائی، مہنگائی اور دہشت گردی کے خلاف اقدامات جیسے عوامی مسائل صرف بحث و مباحثے تک ہی محدود رہے اور اس ضمن میں کوئی ٹھوس قانون سازی نہیں کی جاسکی۔ شخصیات کے حوالے سے جہاں دختر پاکستان ملالہ یوسف زئی کی صحت یابی کی خوش خبری ملی وہیں بین الاقوامی سطح پر مشہور شخصیت ڈاکٹر محمد علی شاہ جو کئی ملکی و بین الاقوامی اعزازات کے مالک تھے، نہ صرف کامیاب سرجن، بلکہ اسپورٹس کے بھی روح رواں تھے۔ امریکا میں پچھلے دنوں علالت کے دوران انتقال کر گئے۔ اللہ انہیں جوار رحمت میں جگہ دے اور لواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائے (آمین) ان سطور میں ایک بار پھر یاد دلائیں گے اور امید کرتے ہیں کہ نوجوان نسل الیکشن کے دوران مثبت رویوں کی پاسداری کرے گی اور اب چلتے ہیں خوشگوار سندیسوں کے دیس میں۔

☩ **سعدیہ بخاری، اٹک** سے محفل کی رونق بنی ہیں "کراچی کے حالات کو دیکھتے ہوئے دعا کرتی ہوں کہ اللہ آپ سب کو حفظ و امان میں رکھے (آمین) جنوری کا مہینا سیاسی افق پر خاصا ہنگامہ خیز رہا بالکل اپنی محفل دوستاں کی طرح۔ فروری کا سرورق ڈارک کلرز کے ساتھ شرماتی ہوئی خوب رو حسینہ اور پر کبوتروں کا پیئر...... واؤ سوروما نٹک۔ انشائیہ میں جون ایلیا ہمارے اندر، باہر کا حال بتاتے ہوئے ہمیں آئینہ دکھا گئے۔ خلاف معمول خطوط پر تبصرے سے پہلے کہانیوں پر تبصرہ کہ بعد میں ہمارا قلم لڑکھڑانے لگتا ہے۔ آغاز کرتے ہیں "فتنہ ہوس" سے جس میں ملک صاحب کی چھٹی حس اور زیرک نگاہی نے کمال ہوشیاری سے صفراں کے قاتلوں کو بے نقاب کیا۔ اسٹوری آف دی منتھ "آشوب وفا" نواب صاحب کے سحر انگیز قلم سے نکلنے والے الفاظ نے تو سچ مچ سحرزدہ کردیا۔ کشکول میں شیخ حامد کی موت معما بن چکی ہے جس کی وجہ سے کہانی یوٹرن لے رہی ہے۔ اسلام کی ابتدائی تاریخ سے ڈاکٹر ساجد امجد چھان کر ہمارے لیے لائے "سوودزیاں" بنوامیہ کی سلطنت کا چراغ جلانے والے حجاج بن یوسف کے اسلامی کارناموں پر اس کے ظلم و سفاکی اور ایک لاکھ بیس ہزار مسلمانوں کے قتل نے سیاہی پھیردی۔ مسافر کی رفتار کافی سلو ہوتی جارہی ہے البتہ وہاں کے مقامات و دریائی علاقہ بیلا ہماری تمام تر توجہ کا مرکز بنا ہوا ہے۔ شمع صوفیاں میں ایک ولی اللہ کے کرامات بھرے واقعات کو دلچسپی سے پڑھا۔ مختصر کہانیوں میں مریم کے خان کی اسیر ابلیس نمبرون رہی واف...... اتنی خوفناک کہانی پڑھ کر جھرجھری آگئی۔ کیرم بورڈ نے آبدیدہ کردیا۔ خیرخواہ میں فہد کی ثابت قدمی کا اسے بہت خوب صورت انعام ملا۔ دانش مند میں ایلس کرسٹی کا فیصلہ انتہائی غیر دانشمندانہ تھا۔ بڑے کھلاڑی میں شکر کہ ماریو کی جان بچ گئی۔ محفل شعروسخن میں اس بار قارئین کا انتخاب کچھ خاص نہ لگا۔ اب چلتے ہیں محفل دوستاں کی جانب جو سخت سردی میں بھی اسلام آباد کے لانگ مارچ کا سا منظر پیش کررہی ہے۔ صدر محفل قدرت اللہ نیازی کچھ سکڑے سمٹے سے بیٹھے ہیں آپ کو اپنے پرنس عبداللہ کی آمد بہت بہت مبارک ہو، آپ کی رائے بالکل غلط ہے آج کل اساتذہ نے ڈنڈے کے زور پر جس طرح معصوم بچوں کو عدم آباد بھیجنا شروع کررکھا ہے تو محکمۂ تعلیم والے یہ غضب نہیں ڈھا سکتے کہ اساتذہ کو پالیسی سازی کے عمل میں شامل کرلیں۔ احسان سحر جی واہ پہیلی کا کیا شاندار استعمال بتایا آپ نے کمال کردیا۔ قیصر اعوان بھیا بہت معذرت کہ آپ کی صنف کو الو سے تشبیہ دے ڈالی الوؤں نے بھی اس کا سخت نوٹس لیا۔ ماہا ڈیئر ایمان سے آپ کا تبصرہ پڑھ کے بہت مزہ آیا، جب بھی بولتی ہو کفن پھاڑ کے بولتی ہو۔ طاہرہ یاسمین سسٹر شکایتیں چھوڑو اور بتاؤ کہ اتنا عرصہ غائب کیوں رہیں۔ جاوید بلوچ آپ اس بار ماٹھے ماٹھے سے نظر آرہے ہیں۔ 21 دسمبر کو قیامت تو نہ آئی پر آپ پر یقیناً قیامت ٹوٹ پڑی ہوگی اپنا نام بلیک لسٹ میں دیکھ کر اگرچہ آپ تردید کررہے ہیں۔ ہمایوں سعید سب آپ کے پیچھے ہاتھ دھوکر پڑے ہیں آپ پاؤں دھوکر میرے پیچھے کیوں پڑ گئے، میں نے کیا نسوار بنانے کا آپ کا خاندانی نسخہ آپ سے پوچھ لیا ہے......؟ ماریہ فاروق اللہ آپ کو شاندار کامیابی عطا کرے (آمین) شیر علی جس حسین چہرے کو دیکھ کر ہمایوں سعید کو شرم آگئی، سمجھ لینا کہ وہ ہی پاکیزہ حسن ہے۔ ابن مقبول گمشدہ افراد میں ایک آغا فرید بھی ہیں جنہوں نے کافی عرصے سے خط لکھنا چھوڑ کے لسٹیں بنانے اور تقسیم کرنے کا کام پکڑ رکھا ہے انہیں بھی آواز دے لیں۔"

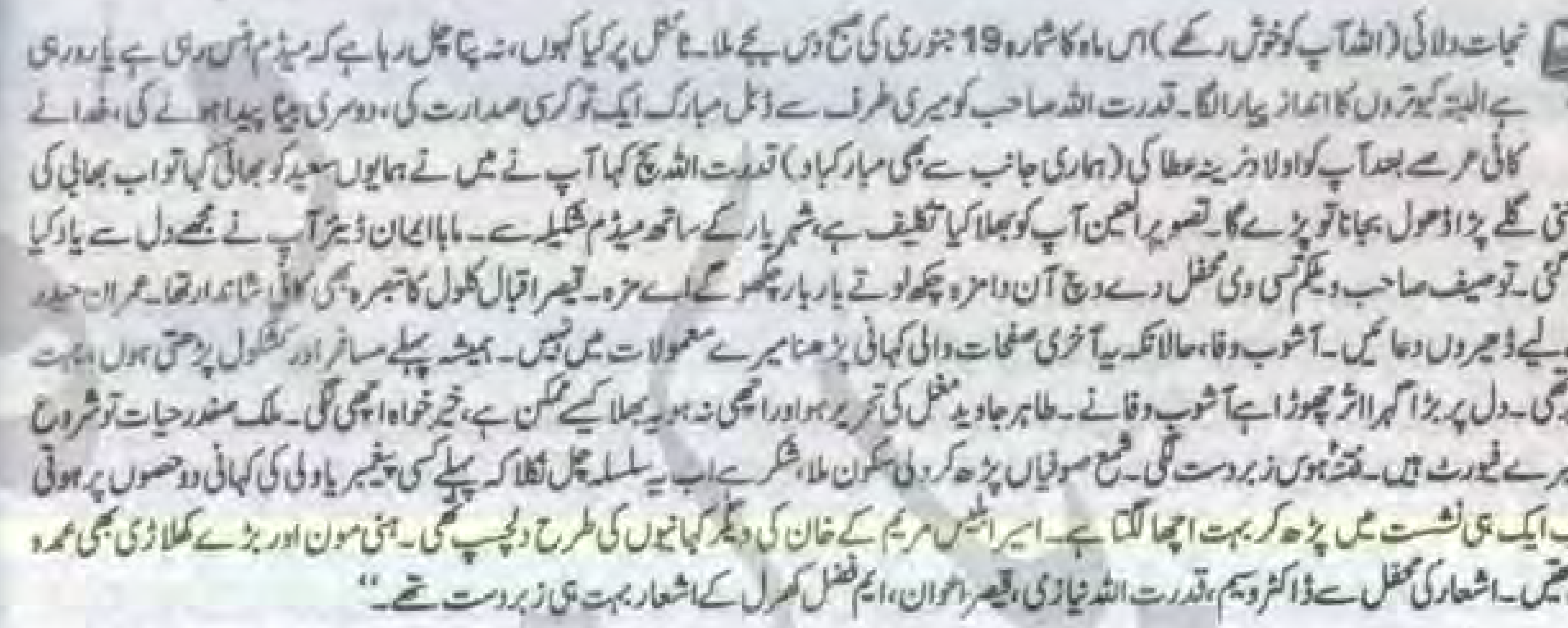
☩ **قیصر اقبال گچھ، بکلول، بھکر** سے تشریف لارہے ہیں "سال نو کا دوسرا مہینا فروری، جس کا شمارہ 20 جنوری کو ملا۔ سرورق پر نگاہ دوڑائی تو موسم خزاں کی ترجمانی کرتی پتوں سے بے نیاز شاخ پر کبوتروں کا جوڑا اپنی مستی میں غرق اور سرورق پر لڑکی کے ہاتھوں میں چوڑیاں تھیں۔ انشائیہ میں جون ایلیا نے آج کے معاشرے کی ایک تلخ حقیقت بیان کی۔ محفل رنگارنگ میں قدرت اللہ نے سب سے زیادہ رنگ اپنے چہرے پر مل کر رنگین کرسی پر بیٹھنے کا شرف حاصل کیا۔ رنگین مبارک آپ کو۔ تعلیمی پالیسی میں ہم آپ کے مشورے کے حق میں ہیں۔ احسان برادر! ہمایوں سعید کے منہ پر پہیلی ضائع نہ ہی کرو تو بہتر ہے۔ قیصر اعوان اللہ تعالیٰ آپ کی اور عمران بلوچ کی مشکلات آسان فرمائے۔ تصویر العین کے ڈبل ہونے کو ہم کوئی اور رنگ دیے گئے تھے۔ شیر علی بھائی، ماہا کی اصلیت کا

بتا اگر کسی بزرگ قاری سے کرنا ہے تو آپ سے پہلا خط چالیس سالہ پرانے قاری کا ہے۔ اس سے رابطہ کرو، ڈاکٹر وسیم، طاہرہ گلزار ابھی شاید 49 کے انفرادی اسکور پر بیٹنگ کررہی ہیں۔ خطوط کی محفل میں بلند مقام کی حامل ماہا ایمان کا قدرت اللہ کو دیا گیا نازیبا جواب انہیں زیب نہیں دیتا۔ اگر آپ نام نہاد ماہا ایمان نہیں ہیں تو اس قدر غصہ کرنے کی وجہ؟ ابن مقبول صنف اوئی اوئی کی نفی کرتے اور ان کی خوشنودی حاصل کرتے نظر آئے۔ برادر محمد جاوید میں تو کہوں گا کہ ہمایوں سعید کو اپنے نام کے ساتھ اب کھوجی لگا لینا چاہیے۔ مسافر کے رومانٹک سین کو پڑھ کر ہمایوں سعید دل کو بہلاتے نظر آئے۔ برادر عدنان ف، ہمایوں سعید کی باتوں کا برا مت منائیے۔ اونٹ کے منہ سے ہمیشہ حجازی کی خوشبو ہی آئے گی۔ ابتدائی صفحات پر ساجد امجد کی سوودزیاں میں حجاج بن یوسف کے واقعات پڑھے۔ ایک لاکھ بیس ہزار افراد کو قتل کرنے والے نے چند اچھے کام بھی کیے اور پھر محمد بن قاسم کی 22 سال کی عمر میں وفات کا پڑھ کر آنکھیں نم ہوگئیں۔ آشوب وفا میں محی الدین نواب نے 12 سورماؤں کی اصلیت کا پردہ چاک کرکے اور یہودیوں کے مکروہ عزائم آشکار کرکے اپنے قلم کا حق ادا کردیا۔ انوار صدیقی کی کشکول میں شیخ حامد ابھی تک سامنے نہیں آسکا۔ لیکن لودھی کی موت اس بات کا اشارہ کرتی ہے کہ آکٹوپس ابھی زندہ ہے۔ انوار صدیقی سے گزارش ہے کہ کشکول کے صفحات میں اضافہ کریں۔ مسافر کی اس قسط میں بھی میڈم اور شہریار کے رومانٹک سین اور ڈائیلاگ چھائے رہے اور کام پر توجہ کم رہی۔ نئے کردار نگینہ کا اضافہ ہوا اور سابقہ روایات کے مطابق کہانی کے آخر میں پھر دونوں یعنی میڈم اور شہریار خطرے کی زد میں تھے۔ میری ناصر ملک سے گزارش ہے کہ کہانی کو ایک ہی جگہ گھمانے کے بجائے آگے بڑھائیں۔ فتنہ ہوس میں ملک صفدر حیات نے صغری عرف گگی کے قتل کی واردات کو خودکشی کا رنگ دینے کی زلیخا کی تمام امیدوں پر پانی پھیر کر زلیخا اور بشارت جٹ کو کیفر کردار تک پہنچا دیا۔ ضیا تسنیم بلگرامی کی شمع صوفیاں میں حضرت خواجہ مودودؒ سے منسلک ایمان افروز واقعات نے معلومات میں بے پناہ اضافہ کیا۔ کاشف زبیر کی بڑے کھلاڑی میں جونز نے سینیٹر گورڈن کے عزائم کو ناکام بنا کر روز اور ماریو کو اس کی دسترس سے بہت دور کردیا۔ ڈاکٹر شیر شاہ سید کی کیرم بورڈ ان بوڑھے والدین کی کہانی جن کی اولاد پردیس سدھار گئی اور وہ والدین اپنا من اپنی اولاد کے بچپن کے کھلونوں کو سینے سے لگا کر بہلاتے ہیں۔ طاہر جاوید مغل کی خیرخواہ میں مہوش واقعی فہد کی خیرخواہ ثابت ہوئی اور سارہ جیسی شکی لڑکی سے فہد کو بچایا۔ تنویر ریاض کی ہنی مون میں جیب تراش جوڑے نے آخرکار اپنا ہنی مون منا ہی لیا۔ مریم کے خان کے اسیر ابلیس میں ایلس اور رانکا کے خوفناک انجام کو راز رکھنا میٹ کے لیے ضروری تھا کیونکہ اسی میں سب کی بھلائی تھی۔ صفدر صدیقی کی دانش مند میں ایلس کرسٹی نے قطعی غیر دانش مندانہ فیصلہ کرکے ہومر کو موت کو گلے لگانے پر مجبور کردیا۔ محفل شعروسخن کے اشعار بھی اچھے تھے۔ مجموعی طور پر فروری کا شمارہ ہر لحاظ سے معیاری اور زبردست لگا۔" (بہت شکریہ)

☩ **حسیب احمد، کرک** سے تبصرہ کررہے ہیں "فروری کا شمارہ 18 جنوری کو ملا۔ سرورق کی دوشیزہ دلہن کی طرح شرما رہی تھی۔ اس کو اس کے حال پر چھوڑ کر سیدھا خطوط میں گھس گیا لیکن یہ کیا...... میرا خط تو ردی کی ٹوکری میں تھا۔ اپنا خط نہ پاکر غصہ آیا (غصہ صحت کے لیے مضر ہے) سرجی میں نے تو آپ کو 24 دسمبر کو خط بھیجا تھا۔ پلیز اب یہ بہانہ مت کرنا کہ جگہ نہیں تھی۔ 20 مارچ کو میری سالگرہ ہے (اوہو...... مبارکاں بھئی) ماریہ فاروق آپ بھی F.S.C. کررہی ہیں میں بھی F.S.C. پری میڈیکل کررہا ہوں۔ آپ کے مضامین کون سے ہیں۔ مسافر میں شہریار نے کچھ زیادہ ہی چالاکیاں کیں۔ لیکن پھر بھی آخر میں ملاح کے ساتھ نیم تاریکی میں جاتے وقت پھنس گیا۔ پچھلی بار شاہد سلیم آیا لیکن دوبارہ غائب ہوگیا۔ اب نگینہ آگئی ہے۔ ڈاکٹر شاہ جی اور کھالے کی طرح وہ بھی غائب ہوجائیں گی۔ پھر آشوب وفا پڑھی۔ جس میں سلومن یہودہ جلالت اسرار نے یہودیوں کے ساتھ اچھا گیم (Game) کھیلا۔ محی الدین نواب صاحب صرف میرے ہی نہیں بلکہ تمام قارئین کے فیورٹ ہیں۔ کاشف زبیر کی بڑے کھلاڑی بہت پسند آئی۔ جس میں جیکوئس چھوٹے بچے ماریو کا جگر اپنے جسم میں منتقل کرنے کے لیے اس پر مہربان تھا۔ تنویر ریاض کی ہنی مون میں لوسی اور اس کے منگیتر نے اچھا دھندا شروع کیا تھا۔ کشکول میں لیاقت حسین کچھ زیادہ ہی سرگرمیاں کررہا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی کہانی سوودزیاں ایک منفرد اور زبردست تحریر تھی۔ ملک صاحب کی فتنہ ہوس تو ایک سنسنی خیز داستان تھی۔ ملک صاحب سے تو کوئی مجرم بھاگ نہیں سکتا۔ طاہر جاوید مغل کی خیرخواہ، ڈاکٹر شیر شاہ سید کی کیرم بورڈ، مریم کے خان کی اسیر ابلیس اچھی کہانیاں تھیں۔"

☩ **سارہ، کراچی** سے چلی آرہی ہیں "دعا ہے اللہ کریم ہمارے ملک خصوصاً شہر کراچی کو امن کا گہوارہ بنائے (آمین) آپ کی شبانہ روز محنتوں کا ثمر...... سسپنس...... فروری کا شمارہ 15 جنوری کو ملا۔ حیرت انگیز...... خوشی بھی ہوئی، سرورق کافی اچھا ہے اور انشائیہ تو بہت ہی اچھا...... ناممکن تو نہیں البتہ مشکل بہت ہے، اس منافقت سے نکلنا...... اداریے نے سیدھا دل پہ اثر کیا۔ محفل میں جھانکا تو...... قدرت اللہ نیازی...... راجا بنے مسند صدارت پر براجمان ہیں۔ بہت مبارک ہو بھئی۔ قیصر اعوان بھیا...... آپ کو ایسا کیوں لگا؟ ہماری دعائیں آپ سب کے ساتھ ہیں۔ ماریہ جی آپ نے بتایا نہیں کہ کون کون کس کس سے لڑ رہا ہے؟ تصویر العین...... لیجیے سسٹر، ذاکر انکل نے آپ کی سن لی۔ چار چھ نہیں پوری آٹھ چوڑیاں پہنادی ہیں۔ احسان بھائی ہمارے تبصرے پر قلم کی نوک خنجر کی طرح چلتی ہے، ایڈیٹر کی مہربانی سے۔ ماہا کے تبصرے نے یقیناً صنف کرخت کے بارہ بجائے ہوں گے۔ تاریخ کے جھروکوں سے بنوامیہ کا دور اپنی جھلک دکھلا رہا تھا۔ حجاج بن یوسف، ظالم، سفاک اور شقی القلب انسان...... ہماری تاریخ کا سیاہ باب ٹھہرا۔ فتنہ ہوس، حسد کی ایک اور کارگزاری پڑھنے میں آئی۔ خیرخواہ میں طاہر انکل نے...... تھوڑا حیران کیا...... مریم۔ کے خان، اسیر ابلیس کے ساتھ آئیں۔ خاصا سسپنس کری ایٹ کیا۔ آشوب وفا اچھی لگی...... مگر...... دیوتا کے سحر سے ہم آج تک نہیں نکلے۔ نواب انکل اس کی جونیئر لکھ ڈالیں۔ ہم نواب انکل کے لیے دعاگو ہیں اور آپ کے شکرگزار۔ کشکول اچھی جارہی ہے۔ لودھی کے خون سے...... آکٹوپس کے علامتی نشانات، بہت دلچسپ...... یقیناً آئندہ زیادہ دلچسپی کی حامل رہے گی۔ مسافر میں ایک اور انٹری......؟ اصل روداد تو بذات خود...... غائب ہوتی جارہی ہے۔ پلیز اسٹوری خراب نہ کریں۔ ارے ہاں حمیرا آپی سے کہنا ہے...... علاج اور غذا کے ساتھ ساتھ روزانہ ظہر اور عصر کی نماز کے بعد سورہ النبا پڑھنا بہت مفید رہے گا اسے معمول بنالیں۔ انشاء اللہ آپ کی بینائی ٹھیک ہوجائے گی۔"

☩ **طاہرہ یاسمین، سرگودھا** سے محفل کی زینت بنی ہیں "سب سے پہلے تو آپ کا شکریہ کہ آپ نے میرا خط شامل کرکے مجھے تمام پریشانیوں سے



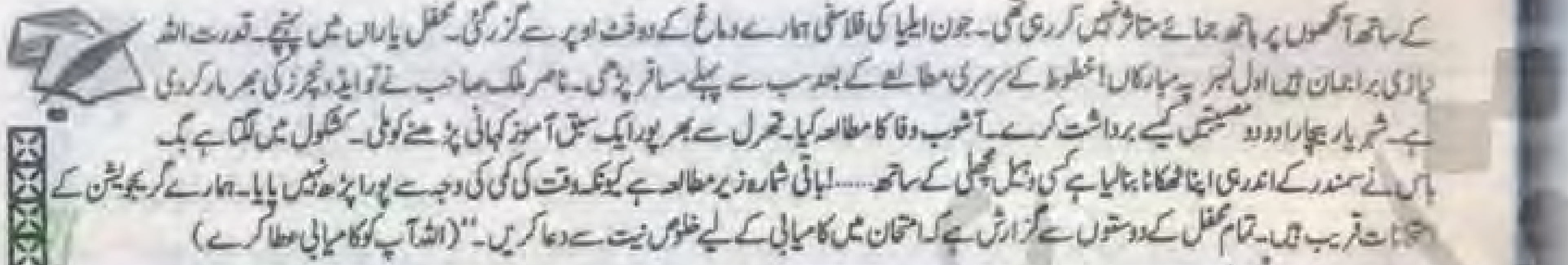
نجات دلائی (اللہ آپ کو خوش رکھے) اس ماہ کا شمارہ 19 جنوری کی صبح دس بجے ملا۔ ٹائٹل پر کیا کہوں، نہ پتا چل رہا ہے کہ میڈم ہنس رہی ہے یا رو رہی ہے البتہ کبوتروں کا انداز پیارا لگا۔ قدرت اللہ صاحب کو میری طرف سے ڈبل مبارک ایک تو کرسی صدارت کی، دوسری بیٹا پیدا ہونے کی، خدا نے کافی عرصے بعد آپ کو اولادِ نرینہ عطا کی (ہماری جانب سے بھی مبارکباد) قدرت اللہ سچ کہا آپ نے میں نے ہمایوں سعید کو بھائی کہا تو اب بھابی کی تلاش، یعنی گلے پڑا ڈھول بجانا تو پڑے گا۔ تصویر العین آپ کو بھلا کیا تکلیف ہے، شہریار کے ساتھ میڈم شکیلہ ہے۔ ماہا ایمان ڈیئر آپ نے مجھے دل سے یاد کیا اور میں آ گئی۔ توصیف صاحب ویلکم تسی وی محفل دے وچ آن دا مزہ چکھ لوتے یار بار چکھو گے اے مزہ۔ قیصر اقبال کلول کا تبصرہ بھی کافی شاندار تھا۔ عمران حیدر بلوچ کے لیے ڈھیروں دعائیں۔ آشوب وفا، حالانکہ یہ آخری صفحات والی کہانی پڑھنا میرے معمولات میں نہیں۔ ہمیشہ پہلے مسافر اور کشکول پڑھتی ہوں، بہت اچھی تحریر تھی۔ دل پر بڑا گہرا اثر چھوڑا ہے آشوب وفا نے۔ طاہر جاوید مغل کی تحریر ہو اور اچھی نہ ہو یہ بھلا کیسے ممکن ہے، خیر خواہ اچھی لگی۔ ملک صفدر حیات تو شروع سے ہی میرے فیورٹ ہیں، فتنہ ہوس زبردست لگی۔ شمع صوفیاں پڑھ کر دلی سکون ملا، شکر ہے اب یہ سلسلہ چل نکلا کہ پہلے کسی پیغمبر یا ولی کی کہانی دو حصوں پر ہوتی تھی۔ اب ایک ہی نشست میں پڑھ کر بہت اچھا لگتا ہے۔ اسیر ابلیس مریم کے خان کی دیگر کہانیوں کی طرح دلچسپ تھی۔ ہنی مون اور بڑے کھلاڑی بھی عمدہ تحریریں تھیں۔ اشعار کی محفل سے ڈاکٹر وسیم، قدرت اللہ نیازی، قیصر اعوان، ایم فضل کھرل کے اشعار بہت ہی زبردست تھے۔"

✠ **ادریس احمد خان**، ناظم آباد، کراچی سے تشریف لائے ہیں "فروری کا ڈائجسٹ ہاتھوں میں ہے۔ دیدہ زیب رنگوں سے سجا۔ سرورق شرمائی لجائی ٹائٹل گرل اور محبتوں کے ترجمان دو کبوتر دنیا و مافیہا سے بے خبر باہم پیار کی پینگیں بڑھا رہے ہیں۔ جون ایلیا کے انشائیے سے ابتدا کی۔ اس کے بعد اپنی محفل میں وارد ہوئے۔ اداریے میں حسب حال سے آگاہ ہوئے۔ خطوط میں محمد قدرت اللہ نیازی سرفہرست نظر آئے، بہت مبارک۔ دیگر دوست بھی خوش گپیوں میں معروف عمل ہیں۔ اس کے بعد محفل سے آگے بڑھ کر مسافر کے ہم رکاب ہوئے۔ شہریار کو نئے معرکے پیش آ رہے ہیں۔ دوسرا مقبول عام سلسلہ کشکول جہاں شیخ حامد کی لاش کا معاملہ حل نہیں ہوا ہے۔ تیسری کہانی ڈاکٹر ساجد امجد کی سودوزیاں تھی۔ تاریخ کے دریچوں سے آگاہی حاصل ہوئی۔ بے مثال جوانمردی اور بہادری سے مزین آہنی و پرعزم مجاہد محمد بن قاسم اور حجاج بن یوسف کے حالات زندگی سے آگاہی ہوئی۔ کاشف زبیر کی بڑے کھلاڑی میں انسانیت کی جیت ہوئی۔ ڈاکٹر شیر شاہ سید کے کیرم بورڈ نے بھی متاثر کیا۔ اولاد ماں باپ کی محبت کا موازنہ نہیں کر سکتے اور اپنی اولاد ہونے کے بعد بھی ماں باپ کے محبت بھرے سلوک سے آگاہ نہیں ہوتے۔ فتنہ ہوس بس گوارا۔ خیر خواہ نے بھی اچھا تاثر دیا۔ محفل شعر و سخن میں مسز رباب کومل کا شعر اچھا لگا۔ تنویر ریاض کی ہنی مون بھی دلچسپ تھی۔ اسیر ابلیس تحیر و تجسس سے بھرپور تھی اور خوفناک بھی رہی۔ شمع صوفیاں میں اللہ کے ولیوں کے قصے میں دلوں کو ایمان کی روشنی سے منور کرنے والی داستان سے مستفید ہوئے۔ دانش مند نے بھی محظوظ کیا اور آخری صفحات کی کہانی محی الدین نواب کی آشوب وفا بہت خوب، ویلڈن محی الدین صاحب، مبارکباد۔"

✠ **حافظ شاہد عمران**، سینٹرل جیل گوجرانوالہ سے تبصرہ کر رہے ہیں "میری طرف سے تمام عالم اسلام کو جشن ولادت رسول ﷺ مبارک ہو۔ یہ جشن مناتے ہوئے ہمیں اسوۂ حسنہ اور تعلیمات نبویؐ پر کاربند ہونے کا عزم کر لینا چاہیے۔ اسی طرح 5 فروری ہمیں اپنے کشمیری بھائیوں کی آزادی حاصل کرنے اور ان پر ہونے والے ظلم کی یاد دلاتی ہے۔ حسب معمول شمارہ 22 جنوری کو چمکتا دمکتا جیل کی کال کوٹھریوں میں اپنے فل فیشن کے ساتھ نمودار ہوا تو خوشی سے جھوم اٹھے۔ سب سے پہلے محفل یاراں میں پہنچے تو کرسی صدارت پر قدرت اللہ نیازی صاحب کو براجمان پایا۔ مبارک ہو نیازی صاحب آپ نے میدان مار لیا۔ جناب قیصر اعوان صاحب کیسے ہیں آپ؟ اللہ آپ کو سزائے موت سے بری کرے (آمین) ریاض شاہد بھائی آپ کا کیا حال ہے؟ عمران حیدر بلوچ صاحب آپ ہماری محفل سے کیوں بھاگ گئے۔ بھائی جان دوبارہ انٹری ضرور دیں۔ بیگ صاحب آپ کی بہت مہربانی کہ جنہوں نے ہم قیدیوں کو اپنی پیاری پیاری دعاؤں میں یاد رکھا۔ ہمایوں سعید آپ مجھے یہ بات بتائیں کہ یہ تمام لوگ ہاتھ دھو کر آپ کے پیچھے کیوں لگے ہوئے ہیں؟ تصویر العین صاحبہ کیا اب مسافر سے دشمنی ختم ہو گئی ہے۔ ماریہ فاروق صاحبہ آپ کی تحریر بہت ہی اچھی لگی۔ سب سے پہلے اپنی فیورٹ کہانی مسافر پر پہنچے۔ کہانی بہت ہی شاندار جا رہی ہے۔ ویسے میڈم شکیلہ آج کل شہریار کو اپنے مقاصد حل کرنے کے لیے بہ طور ہتھیار استعمال کر رہی ہے۔ اب وہ اپنی مہم سے دور ہوتا ہوا خود بھی محسوس کر رہا ہے۔ لیکن امید ہے کہ میڈم اس کا ساتھ ضرور دے گی۔ اس کے بعد کشکول پڑھی، کہانی ماحول نہیں پیدا کر سکی۔ تاریخی کہانی سودوزیاں ایک زبردست کہانی تھی۔ ضیا تسنیم کی لکھی ہوئی شمع صوفیاں نے ایمان تازہ کر دیا۔ اس کے بعد آشوب وفا بہت زبردست کہانی تھی۔ محفل شعر و سخن میں قیصر اعوان کا شعر بہت ہی اچھا تھا۔ فخر النسا، طاہرہ یاسمین آپ کے شعر بھی اچھے تھے۔"

✠ **مزمل اسلم**، لیہ سے چلے آ رہے ہیں "فروری کا شمارہ 18 جنوری کو موصول ہوا۔ خوب صورت صنف نازک شاید میرے خیالوں میں کھوئی ہوئی مسکرا رہی تھی۔ ہمارے ملک کی سیاسی صورت حال بہت ہی ابتر ہے سال کے ابتدا ہی سے لانگ مارچ کی وجہ سے ملکی صورت حال کافی خراب نظر آ رہی ہے اللہ اپنا رحم فرمائے۔ محفل دوستاں میں انٹری ماری۔ نیازی صاحب خوشی سے پھولے نہ سماتے ہوئے کرسی صدارت پر براجمان ڈھٹائی سے مسکرا رہے تھے۔ مبارکاں! قیصر صاحب میری خدا سے دعا ہے کہ وہ آپ کی ساری پریشانیوں کو ختم فرمائے۔ ماریہ فاروق محفل میں عمران حیدر کی کمی کو محسوس کرتی نظر آئیں۔ ارے بھائی کبھی کبھی محفل میں حاضری دے ہی دیا کرو۔ علی رضا صاحب آپ سوچوں میں ڈوبے کہاں چل دیے، ذرا احتیاط سے...... کہیں کسی گڑھے میں مسکراتے ہوئے نہ نظر آ گیں۔ ریاض صاحب اپنے پوتوں اور نواسوں کے لیے دعا کرتے نظر آئے۔ کافی عرصے کے بعد طاہرہ یاسمین صاحبہ اپنے یاد نہ کرنے کا گلہ کرتی ہوئی محفل میں موجود تھیں۔ مسافر میں شہریار کو میڈم نے آخر اپنی اداؤں سے مسخر کر ہی لیا۔ انتہائی سنسنی خیز صورتحال پر کہانی کو بریک لگی۔ کشکول میں لیاقت حسین کے والد قاتلانہ حملے سے بچ گئے۔ واقعی جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے۔ لیاقت حسین کا کردار اچھا لگتا ہے۔ فتنہ ہوس میں ملک صاحب نے مجرم کو آخرکار ڈھونڈ ہی لیا۔ کاشف زبیر کی بڑے کھلاڑی ایک زبردست کاوش تھی جس میں مجرمانہ ذہنیت کی خود غرضانہ سوچ کو واضح کیا گیا تھا۔ خیر خواہ میں فہد کو خدا نے اس کے اچھے کردار کا اچھا صلہ عطا فرمایا۔ اسیر ابلیس ایک پراسرار تحریر تھی، اچھی لگی۔"

✠ **ارسل کاظمی**، آزاد کشمیر سے محفل میں شریک ہوئے ہیں "سب سے پہلے تمام امت مسلمہ کو ماہ ربیع الاول کی مبارک باد۔ سرورق کی حسینہ اپنی مسکراہٹ



کے ساتھ آنکھوں پر ہاتھ جمائے متاثر نہیں کر رہی تھی۔ جون ایلیا کی فلاسفی ہمارے دماغ کے دو فٹ اوپر سے گزر گئی۔ محفل یاراں میں پہنچے۔ قدرت اللہ نیازی براجمان ہیں اول نمبر پہ مبارکاں! خطوط کے سرسری مطالعے کے بعد سب سے پہلے مسافر پڑھی۔ ناصر ملک صاحب نے تو ایڈونچرز کی بھرمار کر دی ہے۔ شہریار بیچارا دو دو مصیبتیں کیسے برداشت کرے۔ آشوب وفا کا مطالعہ کیا۔ کھرل سے بھرپور ایک سبق آموز کہانی پڑھنے کو ملی۔ کشکول میں لگتا ہے بگ باس نے سمندر کے اندر ہی اپنا ٹھکانا بنا لیا ہے کسی وہیل مچھلی کے ساتھ...... باقی شمارہ زیر مطالعہ ہے کیونکہ وقت کی کمی کی وجہ سے پورا پڑھ نہیں پایا۔ ہمارے گریجویشن کے امتحانات قریب ہیں۔ تمام محفل کے دوستوں سے گزارش ہے کہ امتحان میں کامیابی کے لیے خلوص نیت سے دعا کریں۔" (اللہ آپ کو کامیابی عطا کرے)

✠ **رانا فیصل جاوید**، علی پور سے محفل کی زینت بنے ہیں "گزشتہ دہائی سے سسپنس کا قاری ہوں۔ تبصرے کے لیے پہلی بار قلم کشائی کی ہے (خوش آمدید) شمارہ وقت پر ملا۔ ٹائٹل میں خزاں کا سا سماں تھا لیکن سوکھی ٹہنی پر بیٹھے کبوتروں کی جوڑی آنکھوں میں بہار کی آمد کا احوال لیے ہوئے تھی۔ جون ایلیا کا انشائیہ انسانی فطرت میں چھپے جھوٹ کا پردہ فاش کرتا نظر آیا۔ اداریہ ہر بار کی طرح عوام میں شعور و آگہی پیدا کرتا نظر آیا۔ الیکشن قریب ہیں عوام خصوصاً نوجوانوں کو چاہیے کہ صحیح جگہ ٹھپا لگا کر ملک و قوم کی تقدیر کو بدل ڈالیں۔ خطوط میں ماہا ایمان کے تبصرے دلچسپ ہوتے ہیں۔ محمد جاوید کے خط میں الفاظ کا چناؤ بڑا خوب صورت تھا۔ جاوید صاحب آپ بھی علی پور کے اور میں بھی۔ جان پہچان ہونی چاہیے۔ سودوزیاں میں سخت گیر، سفاک اموی گورنر و جرنیل حجاج بن یوسف کے اعمال کا احاطہ کیا گیا۔ وہ محسن ہندوستان ہے کہ اس کی بدولت ہم تک اسلام کی روشنی پہنچی۔ خانہ کعبہ پہ سنگ ریزی اور بے قصوروں کا قتل عام اس کے سفاکانہ اقدام، پڑھنے سے معلومات میں اضافہ ہوا۔ کشکول پڑھ کر ہر بار کی طرح کوفت ہی محسوس ہوئی۔ مغل انکل کی خیر خواہ نے دل جیت لیا۔ مغل انکل کا تو انداز ہی وکھرا ہے۔ قدرت اللہ نیازی کا شعر لاجواب تھا۔ مسافر ہمارے وسیب کی کہانی ہے لیکن میڈم شکیلہ کی بے ڈھنگی حرکتیں یہاں کی معاشرت سے بالکل میل نہیں کھاتیں۔ شمع صوفیاں نے اولیائے کرام کے لیے دل میں مزید احترام پیدا کیا۔ کاش خواجہ مودودؒ دور حاضر میں بھی پیدا ہو جائے۔ آشوب وفا کا موضوع تو اچھا تھا لیکن گرفت نہ ہونے کے برابر تھی۔ کہانی کا اختتام نہایت بے ڈھنگے انداز میں ہوا۔ مجموعی طور پر ماہ فروری کا شمارہ بہت خوب صورت تھا۔ مغل انکل کی تحریر لاجواب تھی۔"

✠ **ملک قیصر اعوان**، ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا سے تبصرہ کر رہے ہیں "اس ماہ کا شمارہ کسی خاص تنگ و دو کے بغیر ہی سوموار 21 فروری کو ڈبل خوشی کے ساتھ ملا۔ اس دفعہ سسپنس اور ملاقات دونوں اکٹھے میسر آئے، خیر اس دفعہ ٹائٹل انتہائی خوفناک لگا۔ کرسی وزارت پر قدرت اللہ نیازی صاحب کو براجمان پایا۔ مبارکاں شادی کی سالگرہ مبارک۔ ویسے بھائی قدرت یہ شادی والی قید بھی میرے خیال میں ہماری قید سے کچھ مختلف نہیں، آپ کیا کہتے ہیں۔ مسز تصویر العین یہ آپ کو آب حیات کہاں سے ملا۔ بھائی شیر علی خواب دیکھنے پر پابندی نہیں ہم سزائے موت کے قیدی بھی خواب ہی دیکھتے رہتے ہیں۔ مسز ماہا ایمان سال نو کی ابتدا شمع سے اس لیے کر کے دکھایا گیا ہے کہ ہر بندہ اگر ایک شمع بھی جلائے تو سوچیں کتنا اجالا ہو جائے گا۔ بہناں طاہرہ یاسمین کی واپسی اچھی لگی، اب غیر حاضری پر پنشمنٹ مل سکتی ہے۔ بھائی قیصر اقبال کلول صاحب آپ میرے ہم نام ہیں لہٰذا اگر کوئی آپ کو کچھ کہے گا تو مجھے برا لگے گا لہٰذا کسی کا نام نہ پوچھیں تو بہتر ہے جو جس نام سے آئے اسی پر اکتفا کریں۔ ابن مقبول جاوید صاحب شاید گنتی سیکھ رہے ہیں؟ بھائی جاوید بعض دفعہ حسین چہروں کا دیدار نظر تیز کرنے کے بجائے اگلے جہاں بھی پہنچا دیتا ہے۔ بھائی مزمل میں آپ کی کامیابی کے لیے دعاگو ہوں۔ محمد ہمایوں سعید محبت کرنے اور نبھانے میں انسان ٹوٹ جاتا ہے لہٰذا پرہیز کریں۔ اشعار میں نور الایمان، ڈاکٹر وسیم اور محمد کمال انور کی چوائس اچھی لگی۔ باقی کہانیوں میں کشکول سے ابتدا کی، اس بار اور تخریب میڈل چھین کر کافی خوش نظر آیا باقی کہانی اپنی رفتار کم کرتی نظر آئی۔ مسافر میں شہریار اور شکیلہ کا پریم سمجھ میں نہ آنے والی بات، باقی یہ کہانی کسی حد تک درست رستے پر جا رہی ہے۔ حسنین بلوچ بھائی اگر آزادی میں فرصت ہو تو کبھی اپنی واپسی سے ہماری گزشتہ یادوں کو تازہ ضرور کریں۔"

✠ **عدنان یوسف**، بنوں سے چلے آ رہے ہیں "اس دفعہ سرورق پر موجودہ دوشیزہ پورے خشوع و خضوع کے ساتھ ہنس اور رو رہی تھی، ہنسی کی وجہ تو معلوم نہیں لیکن رونے کی وجہ ماہا ایمان کا کھٹا اور تلخ تبصرہ تھی...... "دل جلا کے"...... وزیر اعلیٰ کی کرسی پر محمد قدرت اللہ نیازی موجود تھے۔ مبارکاں جی مبارکاں۔ ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا کے قیصر اعوان! اللہ تعالیٰ آپ کو رہائی اور عمران حیدر بلوچ کو صحت عطا فرمائیں...... ماریہ فاروقی نے ایک تیر سے دو شکار کر لیے۔ تصویر العین آپ کو دنیا میں آئے 500 صدیاں گزر چکی ہے اور ہمیں اب پتا چلا۔ ماہا ایمان کا دل سوز تبصرہ جو کہ صنف نازک کو مقابلے کے لیے آمادہ کرتا تھا، کو نوش فرمانے کے بعد دل نے باقی تبصروں کو پڑھنے سے انکار کر دیا۔ مسافر میں میڈم شکیلہ اور شہریار اب ایک ساتھ رہنے لگے ہیں۔ میڈم شکیلہ ماہا ایمان کے ناپسندیدہ کرداروں



میں شامل ہوگئی اور میرا پسندیدہ کردار بن گئی...." دل چھا گئے" محی الدین نواب صاحب کی آشوب وفا آخری صفحے تک کامیاب ترین رہی اور آخر میں جلالت اسرار کی موت نے تسکین کر ڈالا۔ کشکول میں لودھی کا کام تمام ہو گیا۔ میڈم روبی اور ڈی آئی جی کی شادی الجھا کا شکار ہو سکتی ہے۔ مختصر کہانیوں میں صفدر صدیقی کی دانش مند، تحویر ریاض صاحب کی ہنی مون اور کاشف زبیر صاحب کی بڑے کھلاڑی بے حد اچھی کہانیاں تھیں اور طاہر جاوید مغل صاحب کی خیر خواہ تو دل چھونے کی حد تک پسند آئی۔ اس دفعہ تو سسپنس صد فیصد کامیاب رہا۔"

✠ **عادل خان**، انیس خان، چارسدہ سے محفل میں شریک ہوئے ہیں "سادہ سے سرورق پر ایک حسینہ منہ چھپائے نہ جانے کیوں ہنس رہی تھی۔ جون صاحب کا انشائیہ حسب معمول بڑی مشکل سے سمجھ میں آیا۔ محفل میں داخل ہوئے تو محمد قدرت اللہ نیازی سادہ سے تبصرے کے ساتھ سربراہ تھے، مبارک ہو۔ سید علی رضا بخاری صاحب! میں بھی نواب صاحب کا بڑا فین ہوں۔ ان کی آشوب وفا لاجواب، ایک خوب صورت اور منفرد داستان تھی۔ شیر علی صاحب آپ حوصلہ رکھیں۔ خدا آپ کو اور دے گا۔ نہ جانے کب تک ہمارے ملک میں لوٹ مار کا سلسلہ جاری رہے گا اور یقیناً اس دفعہ ہمایوں سعید پاکیزہ حسن کی وضاحت کریں گے۔ ڈاکٹر وسیم حاذق صاحب! طاہرہ جی اتنی خوب صورت تو نہیں جتنی آپ نے تعریف کی تھی۔ انکل! ہمارے پیارے سسپنس کے اکتالیس سال مکمل ہو گئے ہیں۔ ہمایوں سعید صاحب اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں ضعیف العمر ہوں، بلکہ ابھی فرسٹ ایئر میں پڑھ رہا ہوں۔ ماہا ایمان جی! ہمت کرتی رہیے اور یہ سوڈا واٹر کس کی امیدوں پر پھرے گا۔ قیصر اعوان صاحب! خدا آپ کو باعزت جیل کے سلاخوں سے آزادی دلوائے اور جاوید بلوچ کے لیے بھی دعا ہے کہ خدا ان کو بھی تندرستی عطا فرمائے۔ کشکول اس دفعہ کافی تیز تھی۔ ڈاکٹر شیر شاہ سید کی تحریر میں ایک اچھا سبق تھا ہمیں اپنے بزرگوں کی قدر کرنی چاہیے۔ فتنہ ہوس نے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا۔ ضد ایک بری بلا ہے اور مسافر کا تو جواب نہیں جو اول سے آخر تک اپنے سحر میں جکڑ کر رکھتی ہے۔ شعر و سخن میں احسان اللہ بخش، قدرت اللہ نیازی، احسان سحر کے اشعار پسند آئے۔"

✠ **این ایس آر مدثر**، بلدیہ ٹاؤن، کراچی سے محفل کی زینت بنے ہیں "بہت عرصے بعد آپ کی محفل میں شامل ہو رہا ہوں۔ سرورق اچھا تھا، محترمہ موصوفہ کبوتروں کو دیکھ کر کچھ یاد آنے پر شرما رہی تھی۔ ورق ورق دیکھتے ہوئے کہانیوں کی فہرست پر نگاہ جمائی، ڈاکٹر ساجد امجد کی سودوزیاں کو دیکھا۔ یہ کیا؟ یہ تو وہی ہے جو میں نے فرمائش کی تھی یعنی سید منصور حلاج یا حجاج بن یوسف کے بارے میں لکھا جائے، بہت بہت شکریہ۔ میرے خط لکھنے کی وجہ بھی یہی تھی، میں امید کرتا ہوں جلد سید منصور حلاج کے بارے میں بھی لکھا جائے گا۔ 2 ربیع الاول بمطابق 15 جنوری کو اللہ تعالیٰ نے مجھے اپنی رحمت سے نوازا ہے، بیٹی کی پیدائش ہوئی ہے۔" (مبارکاں جی)

✠ **رائے قیصر عباس کھرل**، سینٹرل جیل، گوجرانوالہ سے تبصرہ کر رہے ہیں "اس ماہ کا شمارہ 21 تاریخ کو ملا۔ ٹائٹل پر حسینہ شاید کسی سے شرما کر منہ چھپا رہی ہے۔ اپنے خط کو نہ دیکھ کر مایوسی ہوئی لیکن پھر فوراً ہی دل نے کہا کوئی بات نہیں ٹرائی اگین (شاباش) کرسی صدارت پر اس مرتبہ قدرت اللہ نیازی صاحب قبضہ جمائے نظر آئے۔ نیازی صاحب مبارکباد۔ قیصر اعوان صاحب ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا سے اکیلے ہی نظر آئے۔ عمران حیدر بھائی کو اللہ شفائے کاملہ عطا فرمائے۔ ماریہ فاروق صاحبہ سب کو نئے سال کی مبارک باد دیتی نظر آئیں۔ طاہرہ یاسمین بھی طویل غیر حاضری کے بعد حاضر ہیں۔ ہمایوں سعید، محمد جاوید تحصیل علی پور سے شامل ہوئے اچھا لگا۔ لیکن سب سے بڑی بریکنگ نیوز یہ تھی کہ ماہا ایمان جی اس مرتبہ شامل تھیں۔ لکھتی رہا کریں، آپ کا تبصرہ اچھا ہوتا ہے۔ ساجدہ راجا فرام ہنڈواں اس بار غائب تھیں۔ کہانیوں میں سب سے پہلے مسافر پڑھی، بہت ہی زبردست۔ کہانی کی کیا ہی بات ہے۔ تھوڑی سی سلو ہو گئی ہے۔ کشکول میں لگتا ہے کہ آکٹوپس پھر سے واپس آ گیا ہے۔ سودوزیاں میں حجاج بن یوسف کی سفاکی کا نظارہ کیا۔ آشوب وفا کا دوسرا اور آخری حصہ اچھا تھا۔ شعر و سخن میں ریاض بٹ اور ایم افضل کھرل کے اشعار اچھے لگے۔"

✠ **ظفر علی**، حیدرآباد سے محفل کی زینت بنے ہیں "فروری کا شمارہ ملا اور فروری آنے سے پہلے ہی جنوری میں ختم کر لیا (کیا خوب ہے بھئی) ملک صفدر کی کہانی اس دفعہ بہت اچھی تھی اور میں سمجھتا ہوں جرم وسزا کے موضوع پر بہت اچھی کہانی ہے۔ مسافر میں میڈم شکیلہ کا کردار بہت اچھا ہے۔ شہرے اور میڈم کی جوڑی بہت اچھی لگتی ہے۔ ناصر ملک صاحب سے درخواست ہے کہ اس رومانوی جوڑے کی کچھ زیادہ پذیرائی کریں۔ چھوٹی کہانیاں سب ہی اچھی ہیں۔ کشکول اپنی جگہ پر ایک اچھی کہانی ہے۔"

✠ **زین العابدین**، نور پور تھل سے تبصرہ کر رہے ہیں "فروری کا شمارہ شدت انتظار کے بعد 19 جنوری کی ٹھنڈی شام کو ملا۔ سرورق پر حسینہ کی شوخ ادا اور کبوتروں کا انداز دل کو بھا گیا۔ انشائیہ کا مطالعہ کیا جس کی حقیقت نے متاثر کیا۔ محفل یاراں نے اپنا حق ادا کیا۔ قدرت اللہ نیازی، ماہا ایمان اور طاہرہ یاسمین کے تبصرے اچھے لگے۔ کہانیوں میں سب سے پہلے مسافر پڑھی اس کے بعد کشکول۔ دونوں کہانیوں کا اتار چڑھاؤ دلچسپ رہا۔ محی الدین نواب صاحب کے تو کیا کہنے، باقی ساری کہانیاں بھی پسند آئیں۔ محفل شعر و سخن میں قیصر اعوان اور نور الایمان کے اشعار اچھے لگے۔ یہ محفل یاراں میں شرکت کی میری پہلی کوشش ہے۔" (خوش آمدید)

✠ **محمد خواجہ**، کورنگی، کراچی سے چلے آ رہے ہیں "اب ہر پندرہ تاریخ کو سسپنس ڈائجسٹ علی الصباح میرے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ فروری کے شمارہ پر نظر پڑتے ہی ٹائٹل بڑا اچھا لگا۔ کیا خوب تخلیق ہے۔ جون ایلیا نے کیا خوب انشائیہ تحریر کیا۔ انہوں نے اس ایک صفحہ میں معاشرے کے منافقانہ اور دوغلے پن کے طوفان کی کچی اور جیتی جاگتی منظر کشی کر دی۔ اس ماہ مبارک میں ہم میلاد نبیؐ بہت جذبے اور زور و شور سے مناتے ہیں۔ بجلی کی چوری سے خوب چراغاں کرتے ہیں۔ کبھی سوچا کہ ہم اپنے پیغمبر انسانیت کی کس سنت پر عمل پیرا ہیں۔ ڈاکٹر ساجد امجد کا سودوزیاں بہت معلوماتی ہے۔ کاشف زبیر نے اس دفعہ بڑی چونکا دینے والی کہانی بڑے کھلاڑی تحریر کی۔ شروع سے آخر تک دلچسپی برقرار رہی۔ ڈاکٹر شیر شاہ کی کہانی کیرم بورڈ انسانی جذبات اور محرومی کی بہترین داستان ہے۔ ملک صفدر حیات کی کہانی فتنہ ہوس ہمیشہ کی طرح بہت عمدہ تحریر اور بڑی نصیحت آمیز ہے۔ ایک خاندان صفحہ ہستی سے مٹ گیا اور دوسرا خاندان تباہ ہو گیا۔ طاہر جاوید مغل نے خیر خواہ میں بڑا مایوس کیا۔ ہنی مون عام ڈگر سے ہٹ کر لکھی گئی داستان جس میں جرم کیے جاؤ اور موج اڑاتے جاؤ کا دعوت نامہ ہے۔ ناصر ملک کے مسافر



کی کیا بات ہے ایک دفعہ شروع کر دو تو ختم کر کے دم لو۔ مریم کے خان کی اسیر ابلیس، خوب، بہت خوب، بہت حیرت انگیز کہانی لائی ہیں لیکن انجام میں ابھی تشنگی... باقی ہے۔ محی الدین نواب نے آشوب وفا بڑی پُرزور دلنشیں خیز یہودی داستان تحریر کی۔ بہت سی باتوں کا علم ہوا جو پہلے بھی ذہن میں نہ تھیں۔ تحریریں بالکل اسی طرح ہوتی ہیں جیسے لذیذ کھانوں کے ساتھ چٹنی اور اچار کے چٹخارے۔"

✠ **رمضان پاشا**، گلشن اقبال، کراچی سے محفل میں شریک ہوئے ہیں "فروری 2013ء کا سسپنس ایک روز تاخیر سے بازار میں آیا، یہ شکایت نہیں، اطلاع ہے۔ اس بار سرورق کی آنسہ اچھی نہیں لگی، البتہ خزاں رسیدہ شاخ پر راز و نیاز میں مشغول کبوتر کا جوڑا دیکھ کر آنکھیں خوش ہو گئیں۔ انشائیہ میں حسب معمول کڑوی حقیقت بیان ہوئی ہے۔ محفل میں اول نمبر آنے والے محترم جناب قدرت اللہ نیازی صاحب کو ایک ماہ کی سلطنت کی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ ماشاءاللہ 500 سالہ آنٹی تصویر العین صاحبہ آپ نے آب حیات کی سالم بوتل نوش فرمائی ہے؟ یا کچھ پس انداز کر رکھا ہے؟ محترمہ ماہا ایمان صاحبہ آپ کس قسم کے لڈو کا ذکر فرما رہی ہیں، بور کے لڈو یا موتی چور کے۔ قیصر اقبال کلول آپ کا کہنا بالکل درست ہے کہ ضروری نہیں کہ ڈھول گلے ہی میں لٹکائیں، کھونٹی پر بھی لٹکا سکتے ہیں۔ علی پور والے محمد جاوید بھائی 1986ء کے سسپنس میں چھپا میرا تبصرہ آپ کے پاس محفوظ ہے تو اس میں کمال کیا ہے؟ آپ مجھے کیا یاد کرانا چاہتے ہیں؟ سودوزیاں پڑھ کر جگر میں سوزش ہونے لگی تھی، اس میں نہ رومان نہ مزاح، ایسی تحریر تو تاریخ دان لکھتے ہیں، بالکل خشک۔ سسپنس اور تجسس سے بھرپور کہانی بڑے کھلاڑی نے خوب لطف بہم پہنچایا۔ شکر ہے کہ اس دفعہ کشکول کا اختتام دل کو لرزا دینے والا نہیں تھا۔ کیرم بورڈ ڈاکٹر شیر شاہ سید صاحب اپنے دوست کا دکھڑا سنا کر قاری کو کیا باور کرانا چاہتے ہیں؟ فتنہ ہوس کیا خوب کہانی تھی، ہماری پولیس کو ملک صفدر حیات کے نقش قدم پر چلنا چاہیے۔ خیر خواہ ایسی انوکھی خیر خواہی پہلی بار پڑھی ہے۔ ہنی مون میں کوئی خاص لطف نہیں آیا۔ مسافر کے آخر میں کلیجہ منہ کو آ گیا۔ اسیر ابلیس ڈریکولا مارکہ ڈراؤنی کہانی بھی خوب رہی۔ دانش مند نہایت مختصر مگر بہت دلچسپ قصہ تھا۔ آشوب وفا پر تبصرہ گزشتہ ماہ کر چکا ہوں، آخری قسط پڑھنے کے بعد بھی میرا وہی موقف ہے۔ محفل شعر و سخن میں حافظ آباد کے نور الامین کا قطعہ لاجواب تھا۔ شمع صوفیاں سے پہلے کبھی خواجہ موصوف کا ذکر نہیں سنا تھا، اب کافی معلومات سے آگاہی ہوئی۔"

✠ **طاہرہ گلزار**، پشاور سے محفل میں تشریف لائی ہیں "انکل پہ مجھے بہت غصہ آ رہا ہے کہ مستقل میرے خطوط کے ساتھ یہ کاٹ چھانٹ ہو رہی ہے لیکن جون ایلیا کا انشائیہ نظر آیا پڑھ کے تھوڑا سکون ملا۔ لیکن کیا کر سکتے ہیں، ہم عوام ہیں ظلم سہنا تو ہمارا قومی نشان ہے۔ میری طرف سے سب کو ربیع الاول مبارک ہو۔ اللہ ہم سب کو آسانی اور کامیابی اپنے پیارے محبوب کے صدقے میں عطا کرے۔ قدرت اللہ اپنے گھر کے حالات بتانے لگے، قیصر اقبال کے پردے میں۔ قدرت اللہ جی آپ کی خیر نہیں اگر بھابی نے یہ خط پڑھ لیا تو آپ ہونے لگے بلیک ہول کے اندر، ہاہ، ہاہ..... قدرت اللہ کی یہ بات دل کو لگی کہ عزت اور احترام دل سے ہونا چاہیے خوف سے نہیں۔ احسان سحر یہ غلطی والا کام آپ ہی کریں نا ہمایوں کے ساتھ۔ قیصر اعوان آپ ہی بتائیں جی کہ کیوں کوئی لڑکی ہمایوں کو بھائی نہیں بناتی۔ ماریہ فاروق آپ کے محبت سے یاد کرنے کا شکریہ۔ میری دعا ہے ماریہ فاروق کہ آپ بہت اچھے مارکس سے پاس ہو۔ تصویر العین پتا نہیں ہمایوں کے ساتھ کون بچے گی لیکن ہو گی بڑی خوش قسمت۔ حمیرا رضا اللہ آپ کی مشکلات ختم کرے۔ شیر علی تو اپنے منہ میاں مٹھو بنے نظر آ رہے ہیں۔ شیر علی آپ نے سعدیہ بخاری کو باتونی ڈکشنری کہا بتائیں آپ خود کیا ہیں، بے موسم کے بینگن؟ میری سالگرہ 1-4-2013 کو ہے، گفٹ ضرور بھیجنا (گزشتہ سالگرہ مبارک) ڈاکٹر صاحب آپ کو کس حکیم نے مشورہ دیا ہے کہ عورتوں سے الجھو۔ ہائے اللہ رمضان پاشا اللہ آپ کو خوش رکھے، میں نے آپ کے ناک کا اچار ڈالنا ہے۔ ویلکم ماہا ایمان ان ظالم مردوں سے اللہ بچائے۔ ماہا جی یہ تفسیر بھائی اور بابر عباس بھائی کا کون سا درد مشترک ہے ذرا ہمیں بھی تو پتا چلے۔ میڈم شکیلہ مجھے بھی سخت ناپسند ہے۔ ماہا جی کبھی ہم پشاور والوں کے لیے بھی دعائے خیر کیا کرو۔ شکر ہے طاہرہ یاسمین کہ آپ نے اس بار انٹری مار لی۔ کاش کے کلول صاحب منظر امام کی تحریر سے کچھ سیکھو۔ ابن مقبول آپ نے بالکل صحیح فرمایا کہ محی الدین نواب کی کہانیاں جادو اثر رکھتی ہیں۔ اللہ نہ کرے کہ سعدیہ بخاری کا دل ریزہ ریزہ ہو اس کے دشمنوں کا منہ کالا ہو۔ سب سے پہلے میں نے آخری کہانی محی الدین نواب کی آشوب وفا پڑھی۔ کیا تبصرہ کروں دکھ، تکلیف اور اذیت کے درد سے تن من تڑپ کر رہ گیا۔ اس کہانی کا ایک ایک لفظ ڈائمنڈ سے بڑھ کر ہے میں سوچ سکتی ہوں کہ محی الدین نواب انکل کی حالت لکھتے وقت کیا رہی ہو گی۔ عیسائیت اور یہودیت ہمارے خلاف کیسے یکجا ہو گئے۔ ہم کب سمجھیں گے کہ سپر پاور وہ نہیں ہم مسلمانوں کو ہونا چاہیے۔ میرے دل کو کچھ ہو رہا ہے اس لیے دوسری کہانیوں پر تبصرہ نہیں کر سکتی۔ ٹائٹل اس بار لگتا ہے ہمایوں سعید پر بنا ہے۔ حسینہ اپنی وحشتی والی ہنسی چھپا کر کہہ رہی ہے کہ ہائے ہائے ہمایوں تو پھنس گیا اور ہاں، قدرت اللہ بھائی آپ کو بیٹا مبارک ہو، جو 2 جنوری کو اس دنیا میں جلوہ گر ہوا۔"

✠ **محمد ہمایوں سعید**، بنوں سے محفل میں شامل ہوئے ہیں "سرورق پہ سعدیہ بخاری کی کئی دہائی پرانی تصویر سجانے کے بعد ڈاکر انکل کسی قسم کی داد سمیٹنے کی پوزیشن میں تو ہرگز نہیں رہے۔ اداریے میں انکل نے جشن ولادت نبیؐ پر خوب صورت انداز میں روشنی ڈالی۔ بے شک آپؐ کے اسوۂ حسنہ اور تعلیمات پر عمل کرنا وقت کی اہم ضرورت ہے۔ احسان میاں! کچھ لوگ حکمرانی کرنے کے لیے پیدا ہوتے ہیں اور کچھ تمہاری طرح تاحیات عوام ہی رہتے ہیں۔ قیصر اعوان صاحب! جی ہم نے غور کیا ہے اور اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ یہ مخلوق تب بھائی بناتی ہے جب جان چھڑانا مقصود ہو۔ تصویر العین صاحبہ درست فرمایا میرے ساتھ میرے جیسی ہی بچے گی۔ شیر علی برادر! پاکیزہ حسن وہ حسن ہوتا ہے جو جذبات میں تلاطم کے بجائے عجب احترام اور عبادت کا سا انوکھا اثر چھوڑے۔ بابر عباس صاحب اب ٹائٹل گرل بھی آپ کو زہر لگنے لگی ہے۔ آپ ریٹائرمنٹ کا اعلان کیوں نہیں کر دیتے؟ ابن مقبول صاحب! اے ایم چودھری صاحب کا تعلق صنف نازک سے ہے، یہ دہشت ناک انکشاف آپ نے کس بنیاد پہ کیا؟ عدنان برادر! ایک ٹائٹل گرل پہ راتوں کی نیند، دن کا سکون، کھانا پینا، ہنسنا بولنا، گانا، کھیلنا سب قربان کر دیا؟ واہ میرے بنوں کے شیر!...... نوید صاحب آپ کے مشورے پر عمل کر کے سعدیہ صاحبہ جزوی طور پر حسد سے چھٹکارا پا سکتی ہے مگر مستقل چھٹکارا یہاں سے کوچ کرنے کے بعد ہی پائے گی۔ ماہا ایمان صاحبہ! قدرت اللہ کی تحقیق و جستجو اب اتنی جلدی ختم ہونے والی نہیں۔ اپنے لیے کسی محفوظ جگہ کا بندوبست کر لو۔ سب سے پہلے مسافر سے شروعات کی۔ ملک ناصر کے جملوں کی شگفتگی اور روانی شدت سے محسوس کی جا سکتی ہے۔ محی الدین کی آشوب وفا لاجواب رہی۔ اسرائیلی ذہنیت، عجیب و غریب عقائد، بارہ سورماؤں کی تیز رفتار کہانی کو بہت انجوائے کیا۔ کاشف زبیر کی بڑے کھلاڑی بھی توجہ حاصل کرنے میں کامیاب رہی۔ ڈاکٹر شیر شاہ سید صاحب کی کہانی کیرم بورڈ ہمیشہ کی طرح دل کو عجیب احساسات سے دوچار کر گئی۔ صفدر صدیقی کی دانش مند محبت کے خوب صورت احساسات کی



خوب صورت کہانی تھی۔ اس ماہ کی خاص الخاص کہانی طاہر جاوید مغل کی خیر خواہ رہی۔ خواتین میں تیزی سے عام ہوتی بیماری ٹھگ اور اس کے زہریلے نتائج کے گرد گھومتی یادگار کہانی رہی۔ مہوش کج مغزوں میں فہد کی خیر خواہ نکلی۔ ملک صاحب کی فتنہ ہوس ہمیشہ کی طرح جوش و جذبے کے ساتھ پڑھی۔ نگی کے معصوم و مظلوم کردار پر اتنے ظلم نے افسردہ کیا۔ ملک صاحب کی یہ عادت ہمیں بہت پسند ہے کہ وہ تفتیشی گھوڑے سرپٹ دوڑانے کے ساتھ ساتھ لوگوں کی عزت و وقار کا بھی بہت خیال رکھتے ہیں۔"

✠ **زیڈ چودھری،** ہیچو وطنی سے شریک محفل ہیں "ہم عرصہ پندرہ سال سے سسپنس ڈائجسٹ کا مطالعہ کرتے آرہے ہیں۔ سرورق پر موجود حسینہ کو شرماتا چھوڑ کر آگے بڑھ گئے۔ محفل یاراں کے اچھے تبصرے پڑھنے کو ملے۔ سب سے پہلے تاریخی کہانی کا مطالعہ کیا۔ حجاج کی شخصیت کے بہت سے نئے پہلو بھی سامنے آئے۔ تاریخی کہانیوں کی یہی خصوصیت رہی ہے کہ ان میں کئی ایسی معلومات سامنے آتی ہیں جو کہ مستند تاریخی کتب میں بھی پڑھنے کو نہیں ملتیں۔ مرحوم الیاس سیتاپوری کے بعد بھی تاریخی واقعات کے بیان کے انداز و اسلوب اور دلچسپی میں ذرہ بھر بھی کمی نہیں آئی۔ دوسری کہانیوں میں کشکول منفرد تحریر تھی۔ ملک صاحب کی فتنہ ہوس ہمیشہ کی طرح پراثر تحریر تھی۔ دانش مند میں مسٹر بیک نے دانش مندی کا مظاہرہ کیا۔ شعروں میں ریحانہ وارث، بابر نیازی کے اشعار پسند آئے۔"

✠ **مقصود الحسن طاہر،** پتوکی ضلع قصور سے تبصرہ کر رہے ہیں "کافی طویل عرصے کے بعد دوبارہ اپنی پیاری محفل میں شامل ہونے کی جسارت کر رہا ہوں۔ امید ہے دل کی گہرائیوں سے سسپنس کی حسین بیٹھک میں خوش آمدید کہا جائے گا (بالکل جناب ..... خوش آمدید .....) فروری 2013ء کا شمارہ سوات کے حسین شہر مینگورہ سے خریدا کیونکہ آج کل ہماری ڈیوٹی بھی یہیں پر ہے۔ ٹائٹل پر نظر پڑی تو ایک شرمیلی حسینہ دیکھنے کو ملی شاید اس نے کبوتروں کے جوڑے کی راز و نیاز والی باتیں سن لی ہیں۔ اپنی خطوط کی محفل میں پہنچے تو قدرت اللہ نیازی صاحب ویلکم کے لیے موجود تھے۔ بھئی ہماری طرف سے آپ کو شادی کی سالگرہ مبارک ہو اور ساتھ یہ بھی بتا دیتے کہ یہ شادی کی کون سی سالگرہ ہے۔ قیصر اعوان صاحب ہماری دعائیں بالکل آپ کے ساتھ ہیں۔ ماریہ فاروق دوستانہ ماحول ہمیشہ آپ کی صنف کی وجہ سے گڑبڑ ہوتا ہے۔ FSC کی کامیابی کے لیے ہماری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔ تصویر العین کمال ہے آپ کے شہر اوکاڑہ میں آب حیات ملتا ہے۔ شیر علی نیازی صاحب واقعی انسان اگر سوچے تو یہ معاشرہ مثالی معاشرہ بن سکتا ہے۔ ماہا ایمان جی شادی کے بعد اصل تبدیلی شروع ہوتی ہے۔ ویسے آپ کا ترلے منتوں والا کام کب سے شروع ہوا ہے؟ طاہرہ یاسمین جب تک تم کھاؤ گی نہیں تو بڑی کیسے ہو گی۔ بابر عباس صاحب اتنا بڑا رسالے کا فین اور خط اتنا مختصر لکھا۔ آپ کا خط اور محی الدین نواب صاحب کی دیوتا دونوں کا اپنا ہی مزہ ہے۔ زیب حسن صاحب اچھرہ کے بازار تو آج کل مٹی اور دھول کا منظر پیش کر رہے ہیں۔ سب سے پہلے تو کشکول کا ذکر کرنا مناسب سمجھوں گا۔ 19 قسطیں مطالعہ کر چکے ہیں اور اب بھی یہی محسوس ہوتا ہے کہ جیسے ابھی سے اسٹارٹ کیا ہو۔ انوار صدیقی صاحب کا قلم بڑھ چڑھ کر بول رہا ہے۔ ملک صفدر حیات کی تعریف نہ کرنا کنجوسی کے زمرے میں آئے گا۔ بلاشبہ وہ اپنی حاضری کا حق ادا کرے جاتے ہیں۔ ناصر ملک صاحب کی مسافر ایک خوب صورت اضافہ ہے سسپنس کی یادگار کہانیوں میں اور اب ذکر اپنے ہر دلعزیز رائٹر محی الدین نواب صاحب کا کہ جنہوں نے نئے سال کی آمد کے موقع پر اپنی پیاری کاوش آشوب وفا لکھ کر دیوتا کی یادیں تازہ کر دیں۔ میری ایک فرمائش ہے کہ آپ ہمارے پسندیدہ رائٹر سے کسی اچھوتے آئیڈیا پر جو جدید سائنس کے متعلق ہو کوئی شاہکار تخلیق کروائیں جو دیوتا کی طرح پوری دنیا پر چھا جائے۔"

✠ **حافظ محمد عرفان،** سرگودھا سے چلے آرہے ہیں "بہت خوب، اس مرتبہ ٹائٹل کی مصوری ہمیں بہت پسند آئی اور حسینہ کا ناز و انداز بہت بھایا۔ کہانیوں میں سب سے پہلے مسافر پڑھی جو انتہائی رنگین و سنگین اور تجسس سے بھرپور، انتہائی شاندار جا رہی ہے۔ ڈاکٹر ساجد امجد صاحب کی تاریخی سو دوزیاں پسند آئی اس کو بلاشبہ ڈاکٹر صاحب نے محنت سے لکھا ہے۔ انکل معراج صاحب ایک چھوٹی سی درخواست ہے، براہ کرم طاہر جاوید مغل صاحب سے سال میں کم از کم ایک بار آخری صفحات ضرور لکھوایا کریں پلیز اور اس کے علاوہ ادارہ کو روزمرہ زندگی کے مذہبی، سیاسی، سماجی اور معاشی مسائل کو اجاگر کر کے ان ..... مسائل کے حل پر مبنی کہانیاں لکھنی چاہئیں۔ محی الدین نواب صاحب کی آشوب وفا اس کی انتہائی اچھی مثال موجود ہے۔ قیصر اعوان اور باجی طاہرہ یاسمین آپ لوگوں کو سلام و دعا، آپ لوگوں سے اور انتظامیہ سسپنس سے میری گزارش ہے پلیز میری ذاتی زندگی بہت ڈسٹرب ہے آپ دعا کریں، اللہ رب العزت میرے مسائل کو حل کرے اور آپ کے بھی (آمین) محی الدین نواب، طاہر جاوید مغل، احمد اقبال، ناصر ملک، ناہید سلطانہ اختر آپ کا ادارہ کا قیمتی اثاثہ ہیں، اللہ ان کی عمر دراز کرے۔"

✠ **محمد جاوید،** علی پور سے تشریف لائے ہیں "ہم یہ سمجھنے سے یکسر قاصر ہیں کہ نائن اے ایم چودھری (9:00AM چودھری) ہماری کس گدگداتی شرارت کا شکار ہو کر اپنی نئی نویلی چار سو بیسی کی کھلم کھلا نمائش کر رہی ہیں۔ خزاں گزیدہ شاخ پر دو سپید کبوتروں کی جوڑی کا چونچ منکا دیکھنے کے بعد کیٹرنیل کریم کی اشتہاری لڑکی کا سہ صد بار توصیفی نظارہ کیا۔ محترم جون ایلیا سلام ہے ستائش اور ہمیں فخر ہے آپ کی بیچ بیانیوں کی طولانیوں پر۔ بزم پھلواری میں بھاری بھرکم نام کے مالک، محمد قدرت اللہ خان نیازی، کرسی صدارت سے بری طرح چپٹے ہوئے دکھائی دیے۔ اور بڑی منتوں اور مرادوں سے پیدا ہونے والے اکلوتے بیٹے کی پیدائش اور استادی تبصرہ رقم کرنے کی خوشی میں ست واری ست بدھائی قبول کرو (مبارکاں) احسان سحر بہت پیارا خط لکھا آپ نے خصوصاً ٹائٹل پر۔ ابرار وارث بہت بدذوق ہو یار آپ، میڈم جیسے خوب صورت اور جاندار کردار پر پتا نہیں آپ کو کیوں خارش ہو رہی ہے؟ قیصر اعوان آپ سب اسیر دوستوں بشمول حسنین بلوچ کے خدا تعالیٰ تمام کی لغزشیں معاف فرمائے اور آزادی کے دن دیکھنے نصیب فرمائے۔ تصویر العین آپ کی طویل السنی کا پڑھ کر تیقن کی حدوں کو چھوتا ہوا شک یقین میں بدل گیا کہ عمر کے حوالے سے واقعی شیطان کی ..... خالا ہیں اور مسافر کی مسافرت میں میڈم کے علاوہ نہ جانے اور کتنے ہم سفر آئیں گے لہٰذا اس فکر میں آپ کو دوہری ہونے کی ضرورت نہیں۔ سعدیہ بخاری آپ کی عدم موجودگی سے پتا چلتا ہے، میں نے آپ کے منہ پر خوب ٹھپا لگایا ہے، پلیز تواتر سے حاضری دیا کریں، ہمیں کھڑوس ہمایوں سعید اور آپ کا ناقابل یو ز حلوہ بنانا بہت اچھا لگتا ہے۔ رمضان پاشا چونکہ طاہرہ گلزار کا ہدف آج کل آپ کی ناک بنی ہوئی ہے لہٰذا میری مانو تو ناک کو ایکی نیشن کرا لو۔ ابن مقبول جاوید صاحب آپ کو ادارہ کی طرف سے محفل میں زن شماری کا ٹھیکا کب سے الاٹ ہوا ہے؟ ہمایوں سعید سوچ رہا ہوں کیوں نہ

اس بار آپ کے تبصرے پر آٹھ دس اینٹیں ہی رکھ دوں۔ آپ کا U2U رابطہ کرنا بہت ہی اچھا لگا۔ اس کے بعد یہ بھی اور اک ہوا کہ موضوع چاہے کتنا ہی ..... اچھا ہی ..... کیوں نہ ہو آپ اس پر 58:15 منٹ تک بہ آسانی گفتگو کر سکتے ہیں۔ وسیم خالق صاحب آپ کی شرارت اور دھوکے والی مثال سے ہمیں خوب اتفاق ہے۔ کشکول کی حالیہ قسط میں چمن ہی چمن رہا ویسے یہ تو کنفرم ہے کہ شیخ حامد ابھی زندہ ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے حجاج بن یوسف کی تمام اچھی بری کارستانیوں کو چند صفحات میں سمیٹ کر یقیناً مستند تاریخ کے شیدائی اور طالب علموں پر علمی احسان کیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب آپ سے التماس ہے کبھی ہمارے پڑوس تاریخی شہر اوچ شریف پر بھی ضرور لکھیں خصوصاً شمشیر زنی اور تیر اندازی میں ناقابل شکست سولہ سترہ سالہ راج کماری جسے 12 سال کے بچے نے شکست دی، کے حالات ضرور رقم کریں۔ شیخ صوفیاں جس کا ہر صفحہ روحانی لذت کمالات سے لبریز تھا، پڑھا اور روح کو روحانی سرور و انبساط حاصل ہوا۔ لاشعور میں خفیف سا احساس کہ مہوش اور فہد برساتی رات کو رومانوی ٹکراؤ اتفاق نہیں ..... بعد ازاں درست ثابت ہوا طاہر صاحب کی بہترین تخلیق خیر خواہ میں خیر خواہی کا عجیب انداز مبہوت کر گیا۔ آشوب وفا سے اگر دو سو ماؤں کی ایک لڑکی کے حصول کے لیے کشمکش کو کٹ کر دیا جائے تو بہترین کہانی کہی جا سکتی ہے۔ محمد امجد کا شعر دل میں کھب گیا۔ نور الایمان، ہنی ایمان اور خود ساختہ ماہا ایمان ایک ہی گھر کے پھول لگتے ہیں۔ ایک عورت سے عورت کی دشمنی اور حسد کے بھیانک نتائج پر حقیقی کہانی فتنہ ہوس کا انجام لرزہ خیز رہا۔ صفدر صدیقی کی دانش مند میں بے چارے ہومر کی جان گئی اور ایلس کی ادا ٹھہری۔ مترجم اور مصنفہ مریم کے خان کی تلاش اور شیطانی گماشتوں پر خوفناک تحریر اسیر ابلیس بہت پسند آئی۔ دل و دماغ کے ذائقے کو بدلنے کے لیے کبھی کبھار ایسی کہانیاں لازمی لکھی جانی چاہئیں۔"

✠ **محمد شفیق چغتائی،** اسلام آباد سے محفل میں حاضر ہوئے ہیں "سسپنس ڈائجسٹ کا گزشتہ تین دہائیوں سے مستقل قاری ہوں۔ سرورق پر کوئی بھی تصویر ہو، کوئی بھی حسینہ ہو سسپنس لکھا ہوا نظر آجائے تو بہت خوب صورت لگتا ہے۔ جون ایلیا کا انشائیہ، ملک صفدر حیات، مرزا امجد بیگ، ضیا تسنیم بلگرامی صاحبان کی تعریف سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔ ڈاکٹر ساجد امجد صاحب کی سو دوزیاں، تاریخ اسلام سے ہمیشہ کی طرح بہترین کاوش لیکن کہانی کی رفتار اتنی تیز کر پڑھتے ہوئے ایسا محسوس ہوا جیسے کسی بزرگ سے زبردستی فرمائش کر کے کہانی سنی جا رہی ہے۔ انوار صدیقی صاحب کی کشکول میں صاحب موصوف نے اپنی کہانی کو منفرد طویل سلسلہ بنانے کے لیے بہت کردار اکٹھے کر لیے ہیں۔ شیخ حامد پاکستانی، دشنو کو ہمسایہ ملک اور اسی طرح لوچن کو کسی دوسرے ملک سے بطور دلن درآمد کر لیا ہے۔ پڑھ کر ذہنی کوفت اور بوریت ہوئی جس کو دور کرنے کے لیے کاشف زبیر صاحب کی بڑے کھلاڑی دوبارہ پڑھی۔ ناصر ملک صاحب مسافر کے ساتھ کیا کر رہے ہیں۔ پچھلی قسط کے 14 اوراق فروری شمارہ کے 20 اوراق، ہیرو ماچھی نہیں مل رہا اگر سیکسی میڈم کی عجیب و غریب حرکات ہی پڑھنی ہیں تو ..... مسافر کا سارا غصہ مریم کے خان کے اسیر ابلیس نے اڑا کے رکھ دیا۔ محی الدین نواب صاحب کی آشوب وفا، کھودا پہاڑ نکلا چوہا والی بات ہوئی۔ عجیب کہانی تھی لیکن جھوٹ کا بھی اپنا ہی مزہ ہوتا ہے۔"

✠ **احمد خان توحیدی،** پاکستان اسٹیل، کراچی سے محفل کی زینت بنے ہیں "سسپنس فروری 17 جنوری صبح سورج کے ساتھ طلوع ہوا۔ انشائیہ از جون ایلیا، وطن عزیز میں سوائے دھماکوں اور دھرنوں کے کیا باقی رہ گیا ہے۔ 21 جنوری تک مطالعہ مکمل ہوا۔ 22 جنوری صبح گھر سے فون ملا۔ میرا بھانجا صوبیدار میجر ریٹائرڈ جو گاؤں کا نمبردار بھی تھا۔ تقدیر کا وار، روڈ حادثے میں خالق حقیقی سے جا ملا، ایمرجنسی میں راولپنڈی آنا پڑ گیا (اللہ آپ کو صبر اور مرحوم کو جنت میں جگہ دے) چودھری احمد خان، راولپنڈی ذاتی طور ملے۔ کافی منہ پھولا ہوا تھا کہ ہمیں مستقل رہ جانے والوں میں لگا دیتے ہیں۔ کرسی صدارت کا یاد نہیں، وجہ میری عدم موجودگی میں سسپنس دوسرے لوگ لے گئے۔ ماریہ فاروق، چمن، انگلی انگوٹھی کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ موصوفہ پرائی ہونے والی ہیں، کوئی امیدوار نہ آئے۔ دیگر ساتھیوں کو تبصرہ سامنے رکھے بغیر جواب دینے سے قاصر ہوں۔ فرمائش ہے کہ ڈاکٹر ساجد امجد صاحب، حکیم محمد سعید، مدیر تکبیر صلاح الدین، مولانا مفتی محمود، مولانا غلام غوث ہزاروی، مولانا شاہ احمد نورانی، مولانا کوثر نیازی، مولانا غلام اللہ خان، راولپنڈی والے سب کے نجی حالات لکھیں۔"

✠ **سید محی الدین اشفاق،** فتح پور، لیہ سے محفل میں چلے آرہے ہیں "سردی سابقہ ریکارڈ توڑتی ہوئی عقل کو بھی ٹھٹھرا گئی۔ سونے پہ سہاگہ روڈ زیر تعمیر، لیکن ہم بھی غضب کی سردی کو نظر انداز کر کے سسپنس تک پہنچ ہی گئے۔ ٹائٹل نارمل سا تھا۔ اداریہ میں ووٹ کے صحیح استعمال کا پڑھ کر بے اختیار آہ نکل گئی۔ اگر ہم ووٹ کا صحیح استعمال جان جائیں تو پانچ سال کسی کو کوستے نہ گزریں۔ جہاں تک ہمارے حکمرانوں کا تعلق ہے تو وہ ٹھہرے مساوات کے علم بردار، قیم کی طرح باریاں رکھی ہیں آنے جانے کی۔ پہلے تبصرے پر قدرت اللہ نیازی تشریف فرما تھے، مبارک سر۔ نظام تعلیم کے بارے میں آپ کی سوچ سے اتفاق کرتے ہیں۔ بابر عباس اور شیر علی نیازی کے تبصرے پسند آئے۔ ماہا ایمان اور تصویر العین کے ٹائٹل حسینہ پر جامع تبصرے پڑھے لیکن جو حسینہ خوب صورتی میں یکتا ہو اسے معصوم کہنا چاہیے۔ مسافر میں میڈم اور شہریار کا عشق انتہا کو پہنچ چکا ہے اور شہریار اپنی بچپن کی منگ کو بھول رہا ہے کہانی میں تیزی اور گہما گہمی ہے اور اس کی ہر قسط کا انتظار رہتا ہے۔ آخری صفحات پر محی الدین نواب کی کہانی پڑھ کر بہت مزہ آیا دوسرا اور آخری حصہ لاجواب تھا۔ محی الدین نواب انکل کی آئندہ بھی سلسلہ وار کہانی کا انتظار ہے۔ کشکول اپنا اثر کھوتی جا رہی ہے۔ کہانی ایک ہی ڈگر پر چل رہی ہے۔ طاہر جاوید مغل کی خیر خواہ پڑھی، فہد کی منگیتر نے بڑے حیران کن اور عجیب انداز میں فہد کے کردار کو پرکھا جس وجہ سے وہ اپنی محبت نہ پا سکی۔ میرے فیورٹ رائٹر کاشف زبیر صاحب نے بڑے کھلاڑی بڑی زبردست لکھی۔ اس بار سسپنس بہت اچھا تھا۔"

اب ان قارئین کے نام جن کے نامے محفل میں شامل نہ ہو سکے۔

ایم ذاکر علی خان گور چانی، واجل۔ نور العربی، ناظم آباد، کراچی۔ تصیر شہزاد، گوجرانوالہ۔ رانا حبیب الرحمن، سینٹرل جیل کوٹ لکھپت، لاہور۔ احسان شاکر، چودھوان عامر شکیل۔ کراچی ..... ناصر حسین ہرل پنجا کوٹی، گوجرانوالہ۔ چودھری احمد خان، راولپنڈی۔ منیر حسین۔ لاہور ..... حیفظہ، ملتان۔ حاشی تذیر، سمندری۔ صباحت فاروق، راولپنڈی۔ محمد طیب، نوشہرہ۔ محمد افضل خان، پشاور۔ محمد طاہر۔ جہلم ۔ محمد تقی عباس، میانوالی۔ حاجی محمد زاہد اقبال زرگر۔ نئی منڈی سنگھیکی۔

وارث

ڈاکٹر ساجد امجد



تاریخ نے ثابت کیا ہے کہ... تختِ شاہی کا حصول مقصود ہو اور مخالفتوں کی آندھی کے بغیر سفر طے ہوجائے... اقتدار پر قدرت کی خواہش ہو اور لہو آنکھوں میں نہ اترے... ایسا ممکن نہیں ہوتا۔ نظریات کا اختلاف، عقائد کی جنگ... محلاتی سازشوں کے جال اور حرص وطمع کی دلدل... گھمنڈ کی اس آندھی میں سب کچھ ممکن ہوجاتا ہے۔ ماضی کے جھرونکوں سے سکوت میں لپٹے ایسے اوراق جب زیرِ نظر آتے ہیں تو دلوں میں شور برپا کردیتے ہیں۔ عہدِ گزشتہ کا ایک درخشاں ستارہ "عادل شاہ" جسے بچپن میں ہی صفحۂ ہستی سے مٹانے کے منصوبے تیار تھے مگر خدا کی شان کہ موت کی زنجیر بھی اسے قید نہ کرسکی بلکہ دشمنوں کے عزائم نیست و نابود ہوگئے۔ اور بالآخر اس نے زندگی کے نشیب و فراز میں خود کو درست وارث ہونے کا حق ادا کردیا۔ وزیروں اور مشیروں کے ہجوم کے درمیان حقیقی حالات کا صحیح اندازہ لگانا اور عدل کے تقاضے پورے کرنا اگرچہ آسان نہ تھا مگر صلح جُو اور صاحبِ عقل یہ حکمران گہری نظر کا حامل تھا۔ کہیں شعلہ بیانی اور کہیں عاجزانہ طبیعت نے مشکلات کو آسان اور دلوں کو تسخیر کردیا۔

ماضی کا آئینہ۔ بااختیار اور بے اختیار انسانوں کے عبرت اثر واقعات

کمال خاں وکیلِ سلطنت تھا لیکن اب خود مختاری کے خواب دیکھنے لگا تھا۔ اس کا یہ خواب اس وقت تک شرمندۂ تعبیر نہیں ہوسکتا تھا جب تک کوئی طاقتور امیر اس کی مدد پر آمادہ نہ ہوجائے۔ اس کی نظر بیدر کے امیر قاسم برید پر گئی۔ قاسم برید نے بیدر کے فرماں رواں سلطان محمود بہمنی کو اس کے مکان میں قید کر کے بیدر کے خزانوں پر قبضہ کرلیا تھا۔ سلطان کی سلطانی برائے نام تھی۔ تمام امورِ سلطنت قاسم برید انجام دے رہا تھا۔ یہ شخص عادل شاہی خاندان کا سخت دشمن تھا۔ اس لیے اس سے یہ امید کی جاسکتی تھی کہ وہ کمال خاں کی سازش میں شریک ہوجائے۔ برید سازشی بھی تھا، حریص بھی اور بہادر بھی۔ اسے بہ آسانی شیشے میں اتارا جاسکتا تھا۔ اس نے قاسم برید کو خط لکھا۔

”میرے پاس ہر طرح سے سامان شاہی موجود ہے۔ بیجاپور کا والی کمسن ہے۔ کچھ پرانے امرا انتقال کر چکے ہیں کچھ میرے ساتھ ہیں آپ مجھے اپنا ہی خواہ سمجھیں اور حکام دکن میں میرا اشمار کروائیں۔“

قاسم برید نہایت گھاگ امیر تھا۔ کچی گولیاں نہیں کھیلی تھیں۔ وہ اتنی آسانی سے کمال خاں کے سر پر تاج شاہی نہیں رکھ سکتا تھا۔ اسے اپنا بھی کوئی فائدہ دیکھنا تھا۔ اس نے جواب میں لکھا۔

”یہ معاملات خطوں کے ذریعے طے نہیں ہوتے۔ اس کے لیے ہمارے، تمہارے درمیان کوئی معاہدہ عمل میں آنا چاہیے۔ میں چاہتا ہوں ہم دونوں کسی مقام پر ملاقات کریں اور باہم تحریری معاہدہ کرلیں۔“

کمال خاں تو ہر شرط ماننے پر تیار تھا۔ اس نے مقام طے کیا۔ بیدر اور بیجاپور کے درمیان ایک مقام طے ہوا۔ کمال خاں اس سازش کو خفیہ رکھنے کے لیے تن تنہا گیا جبکہ قاسم برید فوج کے ایک دستے کے ساتھ آیا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ کمال خاں سے بعض شرائط زبردستی منوانے کی پوزیشن میں تھا۔

دونوں کے درمیان معاہدہ ہوا کہ ”اسمٰعیل عادل شاہ کی آنکھیں پھوڑ دی جائیں۔ ممکن ہو تو اسے قبر میں اتار دیا جائے۔“

یہ شرط ایسی نہیں تھی کہ کمال خاں کو اعتراض ہوتا بلکہ وہ تو خود بھی یہی چاہتا تھا۔ دوسرا معاہدہ یہ ہوا کہ خواجہ جہاں کا بھائی جو قلعہ شولاپور پر قابض ہے اسے کمال خاں اپنی حراست میں لے لے۔ کمال خاں اس پر بھی خوشی خوشی تیار ہوگیا پھر قاسم برید نے یہ پیش کش کی کہ قاسم برید دینار خاں حبشی کی جاگیر اپنے قبضے میں رکھے اور اس طرح بیجاپور کا جو حصہ بچ جائے اس پر کمال خاں اپنا تسلط جمالے۔ یہ پیش کش ایسی تھی کہ کمال خاں نے چونک کر برید کی طرف دیکھا پھر اس کے محافظ دستے پر نظر ڈالی۔ اس وقت وہ قاسم برید کے نرغے میں تھا۔ معاہدہ کیے بغیر چارہ نہیں تھا۔ اس نے گردن جھکادی۔ دونوں کے درمیان تحریری معاہدہ طے پا گیا۔

کمال خاں وہاں سے لوٹا تو شام ہورہی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر شرارت بھری شوخی اتر آئی۔ یہ شام اسمٰعیل عادل شاہ کی زندگی کی بھی شام ہے۔ میں آنکھیں پھوڑ کر بھی اسے زندہ رکھنا نہیں چاہتا۔ میں تو اس کی زندگی کی شام کو آواز دوں گا لیکن ابھی نہیں۔ اس کے لیے کسی بڑے جواز کی ضرورت ہوگی۔ اس وقت تک اسے قید کرنا ہی بہتر ہوگا۔ قیدی... پرندہ اپنے بس میں ہوتا ہے کسی وقت بھی...... اسی وقت اس کے گھوڑے کو ٹھوکر لگی۔ وہ گھوڑے سے گرتے گرتے بچا۔ میں گرتے گرتے بچ گیا ہوں اس کا مطلب یہ ہے کہ اسمٰعیل کی زندگی ابھی نہ چھینی جائے۔ ابھی اسے صرف قید کیا جائے۔

قلعے تک پہنچتے پہنچتے اندھیرا ہوگیا تھا۔ قلعے میں پہنچتے ہی اس نے اپنے فرزندوں کو طلب کیا۔ وہ ابھی کسی پر کوئی راز ظاہر نہیں ہونے دینا چاہتا تھا۔ بیٹوں کو تمام حالات سے واقف کیا اور ان کے ذریعے اسمٰعیل عادل اور اس کی ماں پونجی خاتون کو قید کرلیا اور اپنے فرزندوں کو ان کی نگرانی پر مامور کیا۔

قاسم برید نے فوج کو منظم کر کے حسن آباد گلبرگہ کا رخ کیا اور کمال خاں نے شولاپور کا رخ کیا۔

تین ماہ گزر گئے تھے۔ زین خاں جو شولاپور کا وارث تھا جب بہت پریشان ہوگیا تو اس نے نظام البحری سے مدد کی درخواست کی۔ اس کی طرف سے مایوس ہونے کے بعد قلعے کو مع ساڑھے پانچ پرگنوں کے کمال خاں کی تحویل میں دے دیا۔ اس کے صلے میں اسے جان و مال کا تحفظ مل گیا۔

قاسم برید نے بھی دینار حبشی کے تمام علاقوں پر قبضہ کرلیا گلبرگہ کو اپنی قبضے ...میں لے لیا۔ دونوں نے مبارکبادوں کا تبادلہ کیا۔ کمال خاں بیجاپور لوٹ آیا۔

اب اسے اپنی تاج پوشی کے لیے راستے کے کانٹوں کو صاف کرنا تھا۔ اس نے مخلص امرا کی برطرفی کا حکم جاری کردیا۔ نہ صرف یہ بلکہ انہیں ریاست سے بھی نکال دیا۔

جب یہ خطرہ بھی ٹل گیا تو اس نے اسمٰعیل عادل شاہ کی طرف توجہ دینی چاہی لیکن اس کے مخلص احباب نے مشورہ

دیا کہ وہ پہلے اپنی تاجپوشی کا اعلان کردے اس کے بعد جو جی چاہے کرے۔ اس نے نجومیوں کو طلب کیا تاکہ وہ تخت نشینی کا مبارک وقت بتائیں۔ نجومیوں نے اس کا زائچہ بنایا اور اسے بتایا کہ مہینے کے ابتدائی پندرہ دن اس کے حق میں مفید نہیں۔ اسے اپنا تحفظ کرنا چاہیے۔ اگر اس نے پندرہ دن گزار لیے تو سولہویں دن یا اس کے بعد بے شک تخت سلطنت پر بیٹھیں۔

کمال خاں بھی دوسرے بہت سے بادشاہوں کی طرح نجومیوں پر بہت اعتقاد رکھتا تھا۔ اسے اپنی جان کی فکر ہوئی اور کسی ایسے مقام کی تلاش میں ہوا جہاں وہ خود کو محفوظ سمجھ سکے۔ ایسا مقام قلعہ ارک کے سوا کوئی دوسرا نہیں تھا۔ اس کے خیال میں یہ قلعہ ہی ایسی جگہ تھی جہاں وہ خطرے کے ایام گزار سکتا تھا۔ اس نے سلطنت کے تمام کام اپنے بیٹے صفدر خاں کے سپرد کیے اور بیماری کا بہانہ کر کے قلعے میں آگیا اور منع کردیا کہ کوئی اس سے ملنے نہ آئے۔

پونجی خاتون بدستور قید میں تھیں لیکن یہ قید ایسی تھی کہ وہ اپنے مکان میں قید تھیں۔ کہیں آجا نہیں سکتی تھیں۔ شاہی محل کی عورتیں ان کے پاس بے کھٹک آتی تھیں۔ شہزادے کا اتالیق یوسف ترک بھی شہزادے کی تربیت کے لیے آتا تھا۔ یہ رعایتیں اس لیے دی گئی تھیں کہ کسی کو شک نہ ہو۔ کمال خاں کی نیت کسی پر ظاہر نہ ہو کہ وہ شہزادے کی جان کے درپے ہے۔

ایک روز شاہی محل کی ایک عورت پونجی خاتون کے پاس آئی اور سرگوشی میں کہنے لگی۔ ”بہن، میرے میاں ایک عجیب بات بتا رہے تھے۔ وہ کہہ رہے تھے موا کمال خاں تخت پر بیٹھ جائے گا۔“

”یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ کمال خاں وکیلِ سلطنت ہے، مختار نہیں۔“

”اسی لیے تو اس نے آپ پر پابندیاں لگائی ہیں۔“ اس عورت نے طنز کیا۔ ”آپ اسے وفادار نہ سمجھیں۔“

”ہاں، یہ تو میں بھی سوچتی ہوں پھر سوچتی ہوں ہوگی کوئی مصلحت۔ ممکن ہے اسے ہماری حفاظت درکار ہو۔“

”اس نے نجومیوں کو بلوایا تھا۔“

”اچھا؟“ پونجی خاتون ذرا آگے ہو کر بیٹھ گئیں۔ ”کس لیے؟“

”تخت نشینی کا مبارک دن پوچھنے کے لیے۔“

”پھر؟“

”پھر کیا نجومیوں نے اسے بتایا کہ پندرہ دن اس کے لیے نحس ہیں۔ سولہویں دن وہ تخت پر بیٹھ جائے۔“

”اسی لیے وہ ارک کے قلعے میں چھپ کر بیٹھ گیا ہے؟“

”تو اور کیا۔“ عورت نے کہا۔ ”اچھا اب میں چلتی ہوں۔ جانے کیا کیا بتا بیٹھوں گی۔ بات باہر نکلی تو میری گردن تو گئی۔“ اس عورت کے جانے کے بعد پونجی خاتون سوچتے بیٹھ گئیں۔

”اگر کمال خاں تخت پر بیٹھ گیا تو اسمٰعیل عادل شاہ کا کیا ہوگا۔ دو فقیر تو ایک جگہ رہ سکتے ہیں، دو بادشاہ ایک مملکت میں کیسے رہیں گے۔“ یہی سوچتے سوچتے اسے نیند آگئی۔ سو کر اٹھی تو یوسف ترک شہزادے کو تعلیم دینے آیا بیٹھا تھا۔ پونجی خاتون نے اسمٰعیل کو الگ کیا اور یوسف ترک کو اعتماد میں لینے بیٹھ گئیں۔

”آپ شہزادے سے کتنی محبت کرتے ہیں؟“

”اسے میں اپنی اولاد سے بڑھ کر سمجھتا ہوں کیونکہ میرے بچوں کے سروں پر میں موجود ہوں اسمٰعیل کے والد تو رخصت ہوچکے ہیں۔“

”اگر اسمٰعیل کی کوئی جان لینے کے درپے ہو تو آپ کا ردعمل کیا ہوگا؟“

”میں اپنی جان دے کر اسے بچالوں گا۔“

”تو پھر سمجھیے وقت آگیا ہے۔ اگر میرے شوہر کے امرا میں سے کوئی ہوتا تو میں اس سے کہتی بُرے وقت میں سب ساتھ چھوڑ گئے۔ کچھ دنیا سے چلے گئے کچھ اپنے مال ومتاع کے لیے کمال خاں سے مل گئے۔ اس کے سامنے دم نہیں مار سکتے۔ وہ یہ نہیں سمجھتے کہ مال دولت سب یہیں رہ جائے گا۔ اس لیے تمہیں بتا رہی ہوں کہ کمال خان تخت وتاج کی ہوس میں اپنے مالک سے نمک حرامی کر رہا ہے اور اسمٰعیل خاں کو قتل کروانا چاہتا ہے۔ میں یہ چاہتی ہوں کہ تم اس موذی کمال کو موت کے گھاٹ اتار دو۔“

”آپ کے حکم پر اپنی جان نچھاور کرنا میرے لیے افتخار کا باعث ہوگا لیکن آپ خود سوچیے میں تنہا کمال خاں کی دکنی اور حبشی فوجوں کا کیا بگاڑ سکتا ہوں۔“

”اس کی ترکیب میرے پاس ہے۔ اگر تم ہمت کرو تو وہ بڑی آسانی سے مارا جاسکتا ہے۔ اس کے مرنے کے بعد یہی امرا جو آج غیر بنے ہوئے ہیں میرے پاس آئیں گے۔ اب اسمٰعیل بالغ ہوچکا ہے۔ وہ تخت پر بیٹھے گا اور میں بڑی آسانی سے تمہاری جان بچالوں گی۔“

”میں بجائے اسمٰعیل کے اپنا سر کٹوانے کو ترجیح دوں گا۔ آپ مجھے ترکیب بتائیے۔“

''شاہی محل میں ایک عورت ہے جو یہاں کے راز کمال خاں تک پہنچاتی ہے اس لیے ہر وقت کمال خاں کے پاس آجاسکتی ہے۔ میں اسے کمال خاں کے پاس اس کی خیریت دریافت کرنے کے لیے بھیجوں گی اور کسی بہانے سے تمہیں بھی اس کے ساتھ کردوں گی۔ کمال خاں انشااللہ تمہارا استقبال بھی کرے گا اور پان بھی پیش کرے گا۔ بس اسی وقت تمہارا خنجر اس کا کام کردے گا۔''

پونجی خاتون نے اس عورت کو بلایا اور کمال خاں کی تعریف و توصیف کرنے کے بعد اپنے اصل مقصد پر آئی۔

''میں اپنے شوہر یوسف عادل شاہ کے انتقال کے بعد ہمیشہ اسمٰعیل عادل شاہ کی طرف سے فکر مند رہی ہوں۔ یہ دھڑکا ہمیشہ لگا رہتا تھا کہ کہیں نظام الملک بحری حکومت پر قبضہ نہ کرلے لیکن کمال خاں کی وفاداری ہے کہ کسی کو اس طرف آنکھ اٹھانے کی جرأت نہیں ہوئی۔ میں ہمیشہ اس کے لیے دعا کرتی رہوں گی۔ اب سن رہی ہوں کہ کمال خاں کی طبیعت خراب ہے۔ بہن، میں نے تمہیں اس لیے بلایا ہے کہ میرے پاس یہ بارہ ہزار ہون ہیں۔ میں تمہیں یہ رقم دیتی ہوں۔ تم وہاں جاؤ اور یہ رقم کمال خاں کے سر سے اتار کر فقرا میں تقسیم کروادو اور میری دعائیں اس تک پہنچا دو۔ تمہارے سوا کوئی وہاں جا نہیں سکتا اسی لیے میں نے تمہیں بلایا ہے۔''

وہ عورت خوش ہوگئی۔ پونجی خاتون کا شکریہ ادا کیا اور رقم لے کر اسی وقت کمال خاں کے پاس جانے کے لیے تیار ہوگئی۔ وہ جیسے ہی ذرا آگے بڑھی پونجی خاتون نے اسے ٹوکا۔

''بہن، اگر تم مناسب سمجھو تو یوسف ترک کو بھی اپنے ساتھ لیتی جاؤ۔ یہ حج پر جانا چاہتے ہیں لیکن کہتے ہیں جب تک کمال خاں انہیں خوشی سے اجازت نہیں دیں گے اور رخصت نہیں کریں گے اس وقت تک انہیں خوشی نہیں ہوگی۔ انہیں اپنے ساتھ لیتی جاؤ اور کوشش کرو کہ کمال خاں اپنے ہاتھ سے پان کھلا کر انہیں رخصت کریں۔''

وہ خاتون، یوسف ترک کو اپنے ساتھ لے کر کمال خاں کے پاس پہنچ گئی۔

''آپ نے پونجی خاتون کو قید کیا ہوا ہے اس کے باوجود ان کے دل میں آپ کی طرف سے کوئی برائی نہیں۔ آپ کی نہایت تعریف کررہی تھیں۔ بارہ ہزار ہون بھی بھیجے ہیں کہ آپ کا صدقہ اتار کر فقرا میں تقسیم کردیا جائے۔ انہوں نے یوسف ترک کو بھی آپ سے ملاقات کے لیے بھیجا ہے۔ یہ فریضۂ حج ادا کرنے جارہے ہیں اور چاہتے ہیں کہ آپ انہیں اپنے ہاتھ سے پان پیش کرکے رخصت کریں۔''

''پونجی خاتون تک ہمارا پیغام پہنچا دیجیے کہ ہم ان کے جذبے کی قدر کرتے ہیں۔ ہم یوسف ترک کی محبت کے بھی قائل ہوئے۔'' کمال خاں نے یوسف ترک کو گوشہ تنہائی میں طلب کیا اور اس سے اظہار شفقت کیا۔

''ہم تمہاری اس محبت سے خوش ہوئے کہ تم ہماری اجازت کے بغیر حج پر جانے سے گریز کررہے ہو۔ ہم تمہیں بہ خوشی رخصت کرتے ہیں اور یہ درخواست بھی کرتے ہیں کہ حج ادا کرنے کے بعد جلد واپس آجانا۔ ہم تمہیں کسی اہم عہدے پر فائز کریں گے۔''

''اگر آپ اپنے ہاتھ سے مجھے پان پیش فرمائیں تو میرے لیے اعزاز ہوگا۔''

''کیوں نہیں۔''

دکن میں طریقہ یہ تھا کہ پان وصول کرنے والا چادر پھیلا کر پان وصول کرتا تھا۔ یوسف ترک نے بھی اسی روش کو اپنایا۔ اپنے دونوں ہاتھوں کو چادر کے نیچے چھپا کر پان لینے کے لیے آگے بڑھا۔ کمال خاں جونہی پان چادر میں رکھنے کے لیے آگے بڑھا۔ یوسف ترک نے اپنا خنجر کمال خاں کے سینے میں اتار دیا۔ وار اتنا بھرپور اور مہلک تھا کہ کمال خاں اسی وقت ختم ہوگیا۔ افسوس کہ یوسف ترک کو باہر نکلنے کا موقع نہ مل سکا۔ کمال خاں نے مرتے مرتے پہرے داروں کو آواز دے لی تھی۔

یہ معاملہ کمال خاں کی والدہ تک پہنچا۔ اس نے یوسف ترک اور اس عورت کو اسی وقت قتل کروادیا تاکہ کسی پر کوئی راز ظاہر نہ ہونے پائے۔ وہ کسی کو بھی یہ بتانا نہیں چاہتی تھی کہ کمال خاں مرچکا ہے۔ اس نے محل کے جھروکے میں جو تخت بچھا تھا، اس پر کمال خاں کو تکیوں کے سہارے اس طرح بٹھادیا کہ دور سے دیکھنے سے زندہ معلوم ہوتا تھا۔ تمام فوج اور نوکروں کو محل کے نچلے حصے میں بلالیا تاکہ وہ اسے وہاں بیٹھے ہوئے دیکھ سکیں اور مطمئن ہوجائیں۔

ملکہ نے کمال خاں کے بیٹے صفدر خاں کو بلوایا۔ یہ ابھی لڑکا ہی تھا اور باپ کے مرنے پر رنجیدہ بھی تھا۔ ملکہ نے اسے رونے سے منع کیا اور سمجھایا۔

''اب رونے سے کچھ حاصل نہیں۔ مرد بنو اور اپنے باپ کے قاتلوں سے انتقام لے کر تخت پر بیٹھ جاؤ۔ خاندان عادل شاہی کی اینٹ سے اینٹ بجادو۔ اسمٰعیل عادل شاہ اور اس کی ماں پونجی خاتون تمہارے باپ کے قاتل ہیں۔''

''میں اکیلا کیا کرسکتا ہوں۔'' وہ سخت خوفزدہ تھا۔

''تم اکیلے نہیں ہو، یہاں جو لوگ ہیں وہ مقابلہ کرنے کے لیے کافی ہیں۔ تم باب قلعہ بند کروا اور اپنے بہی خواہوں اور ملازمین سے کہو کہ وہ کمال خاں کے حکم کی تعمیل میں اسمٰعیل عادل کا سر کاٹ کر حاضر کریں اور خود بھی ان کے ہمراہ جاؤ۔''

باب قلعہ بند کرکے سب کو حکم دیا گیا کہ اسمٰعیل عادل شاہ کو مار ڈالا جائے۔

پونجی خاتون کو معلوم تھا کہ یوسف ترک بھاگنے میں کامیاب نہیں ہوسکا ہے لہٰذا راز کھل گیا ہوگا اور اب انتقام کے ہاتھ میری طرف بڑھیں گے۔ اس نے بہ عجلت تمام صندل خواجہ سرا کو بلوایا۔

''چوکی پر جتنے لوگ متعین ہیں انہیں مکان کے دروازے پر پہنچنے کا حکم پہنچا دو۔''

چوکی پر متعین مغل وہی تھے جن کے ساتھیوں کو کمال خاں نے ریاست بدر کردیا تھا۔ وہ موقع کی تاک میں تھے اور اب یہ موقع انہیں مل رہا تھا۔ جب یہ لوگ آگئے تو پونجی خاتون نے پس نقاب ان سے خطاب کیا۔

''کمال خاں، یوسف عادل شاہ کے احسانات بھلا کر اسمٰعیل عادل شاہ کے خون کا پیاسا ہوگیا ہے۔ وہ اسے قتل کرواکے خود تخت پر قابض ہونا چاہتا ہے۔ اب میں تم سے مدد کی طلب گار ہوں۔ اگر تم نے عادل شاہی نمک کھایا ہے اور مجھ بیوہ کے وفادار ہو تو میری مدد کرو۔ تمہیں یاد ہوگا کہ کمال خاں نے ہزاروں مغلوں کو نکال باہر کیا اور ان کی جائدادوں پر قبضہ کرلیا۔ تخت پر بیٹھتے ہی وہ تمہیں بھی نکال باہر کرے گا۔''

مغلوں نے بہ آواز بلند پونجی خاتون کی حفاظت کی قسم کھائی۔ ہتھیار سنبھالے اور محل میں داخل ہوکر ڈیوڑھی پر آگئے۔ پونجی خاتون نے مردانہ کپڑے پہنے اور شہزادے کو لے کر اوپر آگئی۔

صفدر خاں کو اپنے عہدے داروں اور امرا پر پورا اعتماد تھا۔ وہ بھی نکلا اور پونجی خاتون کے مکان پر پہنچ گیا اور دروازہ توڑنے کا حکم دیا۔ صفدر خاں کو دیکھتے ہی مغلوں نے تیروں کی بارش شروع کردی۔ اوپر چڑھی ہوئی عورتوں نے بھی پتھر پھینکنے شروع کردیے۔ تیروں کی بارش اور سنگ باری نے قلعے میں قیامت کا شور برپا کردیا۔

کمال خاں کی بیوہ اس منظر کو دیکھ رہی تھی۔ اس نے فوراً صفدر کو حکم پہنچوایا کہ جنگ بند کردو اور سپاہیوں کو حکم دو کہ بڑی توپیں لاکر محل کو ڈھادیں۔

صفدر خاں نے والدہ کی رائے سے اتفاق کیا اور بڑی توپیں لانے کا حکم جاری کیا۔

پونجی خاتون نے کمال ذہانت سے مغل سپاہیوں کو کوٹھے کے پچھلے حصے میں روپوش ہونے کا حکم دیا تاکہ صفدر خاں یہ سمجھے کہ مغل سپاہی بھاگ کھڑے ہوئے ہیں اور وہ پھر پیش قدمی کرے۔

مغلوں کے ہٹتے ہی اوپر سے تیر آنا بند ہوگئے۔ صفدر خاں اور اس کے ساتھیوں میں خوشیوں کی لہر دوڑ گئی۔ انہوں نے بھاری توپیں پہنچنے کا انتظار بھی نہیں کیا۔ تیزی سے محل کی جانب دوڑے۔ انہیں روکنے والا کوئی نہیں تھا۔ نہایت اطمینان سے دروازہ توڑا اور محل میں داخل ہوگئے۔ جب وہ دوسرا دروازہ توڑنے کے لیے ایک تنگ جگہ میں داخل ہوگئے تو مغلوں نے ان پر حملہ کردیا۔ ہر طرف سے تیر برسنے شروع ہوگئے۔ جگہ محدود تھی بھاگنے کا موقع بھی نہیں مل رہا تھا۔ صفدر خاں اپنی جان بچا کر بھاگنے کی فکر میں تھا کہ ایک تیر سنسناتا ہوا آیا اور اس کی آنکھ میں پیوست ہوگیا۔ تکلیف کی شدت سے آنکھیں بند ہوئیں تو بھاگتا ہوا اس دیوار کے پاس پہنچ گیا جہاں اسمٰعیل شاہ موجود تھا۔ اس نے جو صفدر خاں کو دیکھا تو ایک بھاری پتھر نیچے گرادیا۔ صفدر خاں اندھا تو ہو ہی چکا تھا۔ پتھر سے بچنے کے لیے ادھر ادھر بھی نہ ہوسکا۔ پتھر نے اس کا دماغ اس کے سر سے نکال کر باہر پھینک دیا۔ پچیس سال کے کڑیل نوجوان کی لاش زمین پر پڑی تھی۔

صفدر خاں کی لاش جب اس کے ساتھیوں نے دیکھی تو جنگ سے ہاتھ اٹھالیا اور لاش کو وہیں چھوڑ کر کمال خاں کے دولت خانے کی طرف بھاگے۔ یہاں پہنچ کر یہ عقدہ کھلا کہ ان کے ساتھ دھوکا کیا گیا تھا۔ کمال خاں تو پہلے ہی مارا جاچکا تھا۔ وہ سراسیمہ ہوکر قلعے سے بھاگ نکلے۔

پونجی خاتون کے مغل سپاہیوں نے کمال خاں اور صفدر خاں کے سروں کو نیزوں پر بلند کیا اور سارے شہر میں گشت کرایا۔ جو دیکھتا تھا عبرت پکڑتا تھا۔

کمال خاں کے بہی خواہوں کو ملک بدر کردیا گیا اور ان امرا کو واپس بلایا گیا جو کمال کے حکم سے ملک بدر کردیے گئے تھے۔

اسمٰعیل عادل شاہ پسر یوسف عادل شاہ نے عنان حکومت سنبھالی اور رعایا کو دیوان عام میں بلایا۔

رعایا نے اپنے نئے بادشاہ کا خیر مقدم کیا اور بادشاہ پر خیرات اتار کر تقسیم کی۔ شعرا نے قصائد پیش کیے۔ اسمٰعیل

عادل شاہ نے غیاث الدین شیرازی کو حکم دیا کہ وہ کمال خاں کی شکست اور اسمٰعیل عادل شاہ کی تخت نشینی کا احوال قلم بند کرے۔

برق رو قاصد ان نوشتوں کو لے کر دکن کے شاہی درباروں میں پہنچے۔ یہ احوال ملک کے گوشے گوشے میں پہنچ گیا۔

کمال خاں کا خاتمہ ہوا تھا۔ اس سے معاہدہ کرنے والا قاسم برید ابھی زندہ تھا۔ وہ کمال خاں کا بدلہ لینے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ اس نے محمود بہمنی کو مجبور کیا کہ وہ حکام دکن کے نام سفارشی خطوط لکھے تاکہ وہ ان کی مدد سے کمال خاں کا بدلہ لے سکے۔ محمود بہمنی اس کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بنا ہوا تھا۔ اس نے یہ خطوط لکھ دیے۔ قاسم برید نے اپنے تعلقات بھی استعمال کیے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سلطان علی قلی شاہ، علاؤالدین عماد شاہ، برہان نظام شاہ وغیرہ نے اس کی امداد کو فوج روانہ کردی۔

محمود بہمنی، قاسم برید کی ہمراہی میں اس فوج کو لے کر نکلا۔ کسی رکاوٹ کے بغیر برابر آگے بڑھتا رہا۔ اسمٰعیل عادل شاہ نے کوئی پیش قدمی نہیں کی۔ حریف اسے اسمٰعیل عادل شاہ کی کمزوری سمجھ کر تیزی سے بڑھا اور ایک مقام امیر پور پہنچ گیا۔ چاہتا تھا کہ وہ بارہ ہزار لٹوں کو لے کر دشمن پر حملہ آور ہو۔

ایک بڑی خون ریزی کے بعد امیر برید اپنی فوج کو لے کر میدان جنگ سے بھاگ گیا۔ محمود شاہ بہمنی گرفتار ہوکر اسمٰعیل عادل شاہ کے پاس پہنچ گیا۔

محمود بہمنی ہر چند کے حملہ آور ہوا تھا لیکن اسمٰعیل عادل شاہ کی بہن کا خسر تھا اور پھر اسمٰعیل یہ بھی جانتا تھا کہ محمود بہمنی امیر برید کے ہاتھوں مجبور ہے لہٰذا اس نے اسے قید میں رکھنا مناسب نہ سمجھا۔ دونوں کے درمیان ایک مرتبہ پھر قاسم برید کے متعلق باتیں ہوئیں۔ قاسم برید، محمود بہمنی کے گلے کی ہڈی بن گیا تھا۔ وہ اس سے نجات حاصل کرنا چاہتا تھا لیکن امیر برید اتنا طاقتور ہوگیا تھا کہ اس سے گلوخلاصی ممکن نہیں رہی تھی۔ اس نے اب اسمٰعیل عادل شاہ کا سہارا ڈھونڈا۔ اسمٰعیل نے اس کی درخواست کو ہمدردی سے سنا اور پانچ ہزار مغلوں کو ساتھ لے کر محمود کے ہمراہ شہر بیدر کی طرف روانہ ہوا۔

امیر برید کو یہ خبر فوراً ہوگئی۔ اس نے مال و دولت وہیں چھوڑا اور شہر سے باہر قلعے میں محبوس ہوگیا۔ اسمٰعیل عادل شاہ کچھ دن بیدر میں رہنے کے بعد لوٹ آیا۔

امیر برید نے جیسے ہی یہ دیکھا کہ اسمٰعیل عادل شاہ بیدر کے قرب و جوار سے رخصت ہوگیا ہے، وہ اپنے بہی خواہوں کے ہمراہ شہر پر چڑھ آیا۔ پہرے داروں کو حکم دیا گیا تھا کہ دروازہ نہ کھولیں۔ پہرے داروں کو سلطان محمود کے کسی حکم کی پروا نہیں رہی تھی۔ امیر برید کسی مزاحمت کے بغیر اندرون شہر داخل ہوا۔ چاروں طرف اپنے محافظین کو مقرر کیا اور اپنے سابقہ عہدے پر جلوہ افروز ہوگیا۔

یہ تمام کام راتوں رات سرانجام پاگئے۔ سلطان ایسا بے خبر تھا کہ رات کو سویا تو صبح ہی آنکھ کھلی۔ دیکھا تو معاملہ ہی الٹا تھا۔ ہر طرف امیر برید کا حکم چل رہا تھا۔ سلطان ایسی صورت حال کا اتنا عادی ہوچکا تھا کہ اس نے پروا بھی نہیں کی۔

امیر برید کی خودسری نے اس وقت ایک تنازع کی شکل اختیار کرلی جب ایران کے والی شاہ اسمٰعیل صفوی کے ایلچی بیدر آئے۔ محمود بہمنی حسب مراتب شاہانہ ان کی رخصت چاہتا تھا۔ اس کے برعکس امیر برید مذہبی اختلاف کی وجہ سے محمود کا ہم نوا نہیں تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دو سال تک یہ ایلچی اپنے ملک ایران واپس نہ جاسکے۔ ان ایلچیوں نے مجبور ہوکر ایک نوشتہ اسمٰعیل کے پاس روانہ کیا کہ ہمیں اس مصیبت سے نجات دلائی جائے۔ اسمٰعیل عادل شاہ نے محمود کو دھمکی آمیز خط لکھا۔ اس خط کو دیکھ کر امیر برید بھی ڈر گیا اور ایلچیوں کو فوراً رخصت کردیا۔

یہ ایلچی جب بیجاپور پہنچے تو اسمٰعیل عادل شاہ نے ان کا زبردست استقبال کیا۔ چاروں طرف شادیانے بجوائے گئے۔ تمام مغل سپاہیوں کو حکم ہوا کہ قزلباشوں کی طرح سرخ ٹوپی سروں پر رکھیں۔

جب ان ایلچیوں کی رخصت کا وقت آیا تو اسمٰعیل عادل شاہ بندرگاہ مصطفیٰ آباد تک انہیں رخصت کرنے آیا اور نہایت احترام سے رخصت کیا۔

جب والی ایران کو ان باتوں کا علم ہوا تو اسمٰعیل عادل شاہ کی خدمت میں نہایت قیمتی تحائف روانہ کیے۔ اب اسمٰعیل عادل شاہ کو یہ توقع ہوگئی کہ والی ایران اس کی مدد کے لیے ہر وقت حاضر رہے گا لہٰذا اس نے فتوحات کے لیے پاؤں پھیلائے۔

کمال خاں کے زمانے میں یوسف عادل شاہ کے فتح کردہ بعض علاقوں کو بیجانگر کے والی تمراج نے دوبارہ اپنے قبضے میں لے لیا تھا۔ اسمٰعیل عادل شاہ نے تمراج سے ان علاقوں کی واپسی کا مطالبہ کیا جو اس نے نہ صرف مسترد کردیا بلکہ کچھ فوج کے ساتھ بیجاپور کا رخ کیا اور دریا کے کنارے

خیمہ زن ہوگیا۔ دور دور کے علاقوں کے ہندو حکمران بھی اختلافات بھلا کر اس کے ساتھ شامل ہوگئے۔ فوج کی تعداد اتنی بڑھ گئی کہ پچاس ہزار سواروں اور چھ لاکھ پیادوں کا لشکر جمع ہوگیا۔

بے پناہ لشکر دیکھ کر اسمٰعیل عادل شاہ نے تمراج کے ساتھ معرکہ آرائی کا خیال ترک کردیا لیکن شرمناک صلح یا جنگ۔ اس کے سوا کوئی راستہ اس کے پاس نہیں تھا۔ اس کی فوج میں صرف سات ہزار سوار تھے۔ وہ دلیر انہی کو ساتھ لے کر دریا کے کنارے پہنچ گیا اور خیمہ زن ہوگیا۔ دریا کے دوسری طرف تمراج اپنی چھاؤنی ڈالے ہوئے تھا۔

اسمٰعیل عادل شاہ، شاہی خیمے میں مقیم تھا۔ اس کی بے فکری دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ اسے کوئی جلدی نہیں تھی جنگ میں تاخیر کرتا رہا۔ یہاں تک کہ بارش شروع ہوگئی۔ موسم کی دل فریبی نے دل میں چٹکیاں لیں۔ ایک روز جو کالی گھٹا اٹھ کر آئی تو شراب نوشی میں مصروف ہوگیا۔ سازندوں نے ساز چھیڑے، خوب رو معشوق حاضر ہوئے۔ سریلی آوازوں نے ایسا سماں باندھا کہ پیالوں پر پیالے اس کے حلق میں اترتے گئے۔ شراب نے اپنا اثر دکھانا ہی تھا۔ نشہ چڑھا تو دریا پار بیٹھا ہوا دشمن صاف نظر آنے لگا۔ ہاتھی پر بیٹھا اور سیاحت کے بہانے دریا کے کنارے گھومنے لگا۔ گھومتے گھومتے اچانک جی میں کیا سمائی کہ لشکر کو دریا پار کرنے کا حکم صادر کردیا۔ یہ حکم سنتے ہی مسلم لشکر حیران رہ گیا۔ برسات کا موسم تھا دریا چڑھا ہوا تھا۔ ہاتھیوں کے بس میں نہیں تھا کہ دریا پار کرتے لیکن حکم شاہی تھا کہ برقرار تھا۔

اسمٰعیل عادل شاہ نشے کی ترنگ میں ہاتھی سمیت دریا میں کود پڑا۔ اب یہ اس کی قسمت تھی کہ سلامتی سے دریا پار کر گیا۔ یہ دیکھنا تھا کہ لشکر کو بھی غیرت آئی۔ ہاتھی گھوڑے سب دریا پار کر گئے۔ ابھی پورے لشکر نے دریا پار بھی نہیں کیا تھا کہ دشمن آپہنچا۔ مغلوں نے تلواریں سونت لیں۔ دشمن تعداد میں اتنے زیادہ تھے کہ دونوں کا کوئی مقابلہ نہیں تھا مگر مغلوں نے دشمن کے سپاہیوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹنا شروع کردیا لیکن دشمن کی کثیر تعداد آڑے آئی۔ مغلوں کے پاس آلات جنگ ختم ہوگئے۔ اب فرار کے سوا کوئی راہ نہیں تھی۔ دریا پر کوئی پل وغیرہ تو تھا نہیں۔ مسلمان سپاہی دریا میں کود پڑے۔ کچھ ڈوبے کچھ دوسرے کنارے پر پہنچنے میں کامیاب ہوگئے۔ خود بادشاہ کا ہاتھی بڑی مشکل سے دریا کے پار پہنچا۔

یہ حادثہ ہی تو تھا جس سے بچ کر وہ نکل آیا تھا۔ آدھی سے زیادہ فوج کٹ چکی تھی یا ڈوب گئی تھی۔ اب یہی ہوسکتا تھا کہ بیجاپور واپس جایا جائے۔ بیجاپور آکر اس نے تمام امرا کو طلب کیا اور آئندہ کے لائحہ عمل پر بحث کی۔

''آپ لوگوں نے دیکھ لیا کہ تمراج کے پاس کتنا عظیم لشکر تھا مگر یہ سب لشکر اس کا نہیں تھا۔ تمام ہندو حکمرانوں نے متحد ہوکر ہمارا مقابلہ کیا۔ اب آپ لوگ بتائیں مجھے اپنی طاقت بڑھانے کے لیے کیا کرنا چاہیے؟''

اسد خان لاری نہایت معتبر امیر تھا۔ اس نے مشورہ دیا۔

''آپ کو چاہیے کہ آپ برہان نظام شاہ بحری کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھائیں (یہ شخص والی احمد نگر تھا) ممکن ہو تو شادی وغیرہ کے رشتے بھی استوار کیے جائیں۔ ان رشتوں سے دوستی کا رشتہ مستحکم ہوگا۔ یہ رشتہ مستحکم ہوگا تو امیر برید سے بھی بہ آسانی نمٹا جاسکتا ہے اور اس فتنے سے ہمیشہ کے لیے نجات مل سکتی ہے۔''

امرا نے اسے یہ بھی مشورہ دیا کہ وہ آئندہ اتنی شراب نہ پیے کہ اپنی اور دوسروں کی جان کو خطرے میں ڈال دے۔

''میں آپ لوگوں سے وعدہ کرتا ہوں کہ جب تک تمراج سے اپنے علاقے واپس نہیں لے لیتا شراب کو ہاتھ نہیں لگاؤں گا۔'' اس نے اس وعدے کو پورا کیا۔ یہ علاقے فتح کرنے تک شراب کو ہاتھ نہیں لگایا۔ اس کے بعد بھی تادم مرگ شراب تو پی لیکن حد سے زیادہ نہیں۔

اسمٰعیل عادل شاہ نے اسد خاں لاری کے مشورے پر لفظ بہ لفظ عمل کیا۔ اپنے ایک امیر سید احمد ہروی کو اپنا سفیر بنا کر برار بھیجا۔ سید احمد ہروی نہایت زیرک اور خوش گفتار امیر تھا۔ سید احمد ہروی سدلاپور کے مقام پر پہنچا اور برہان نظام شاہ بحری سے ملاقات کے لیے کسی مضبوط سہارے کو تلاش کرنے لگا۔ اسے معلوم ہوا کہ یہاں ایک بزرگ شاہ بابا کے نام سے ہیں۔ برہان نظام شاہ کے دربار میں ان کا بہت اثر رسوخ ہے۔ برہان شاہ ان کی کوئی بات نہیں ٹالتا۔ سید احمد ہروی ان بزرگ کی خانقاہ میں پہنچ گیا۔

''شاہ صاحب میں بیجاپور سے آپ کی خدمت میں آپ سے ملاقات کے لیے حاضر ہوا ہوں۔''

''یہ ملاقات تو محض بہانہ ہے۔ آپ کو تو کہیں اور جانا ہے۔''

''آپ روشن ضمیر ہیں بہتر جانتے ہیں۔'' سید احمد ہروی نے کہا۔ ''اسمٰعیل عادل شاہ برہان نظام شاہ سے ملاقات کا خواہاں ہے۔''

''اس ملاقات میں کوئی حرج نہیں۔ اسمٰعیل عادل شاہ خود کیوں نہیں آیا؟''

"شاید آپ سے میری ملاقات قسمت میں تھی کہ اس نے مجھے پہلے بھیج دیا۔"

"اسے بھی یہاں بلالو۔ میں برہان کو پیغام بھیج دوں گا۔"

"ایک بات اور عرض کرنی تھی۔"

"کہو۔"

"اس وقت والی بیجانگر بہت طاقت پکڑ چکا ہے۔ تمام ہندو حکمران اس کے جھنڈے تلے جمع ہو چکے ہیں جبکہ مسلمانوں میں نفاق ہے۔ خاص طور پر امیر برید کی فتنہ پردازیاں مسلمانوں کو یکجا نہیں ہونے دے رہی ہیں۔ ایسے میں اسمٰعیل عادل شاہ اور برہان نظام بحری کے درمیان پائیدار رشتہ مستحکم ہو جائے تو دکن کے حالات سدھر سکتے ہیں۔ میری آپ سے درخواست ہے کہ اگر دونوں خاندانوں میں شادی بیاہ کا رشتہ استوار ہو جائے تو یہ دوستی پائیدار رہے گی۔"

"میں اس کے لیے بھی کوشش کروں گا۔ آپ اسمٰعیل شاہ کو خط لکھ دیں۔"

"جیسا آپ نے فرمایا ہے میں ویسا ہی کروں گا۔"

اسمٰعیل عادل شاہ ایک بڑے لشکر کے ساتھ سدلا پور پہنچ گیا۔ یہاں دونوں بادشاہوں کی ملاقات ہوئی اور تحائف کے تبادلے ہوئے۔ اسی ملاقات میں عقد اور شادی کی بات چھڑ گئی۔ شاہ بابا نے اس طرف توجہ دلائی۔

"یہ ملاقات اگر ہمیشہ کے لیے قائم ہو جائے تو کتنا اچھا ہے۔" پھر انہوں نے اسمٰعیل عادل شاہ کو مخاطب کیا۔

"اگر میں تمہاری بہن کے لیے برہان نظام الملک کا رشتہ مانگوں تو کیا تم انکار کرو گے؟"

"میں آپ کی بات کیسے ٹال سکتا ہوں۔"

"اگر ہاں تو اہتمام کرو۔" شاہ بابا نے کہا۔ "برہان نظام الملک برات لے کر آئیں گے۔"

بزم طرب منعقد ہوئی۔ عقد کی رسم ادا ہوئی۔ یوسف عادل شاہ کی لڑکی مریم سلطانہ کی شادی برہان نظام شاہ بحری سے کر دی گئی۔ ایک مرتبہ پھر تحائف کے تبادلے ہوئے۔

دونوں اپنے اپنے ملکوں کی طرف روانہ ہو گئے۔

اس نکاح میں "شولاپور" کا علاقہ مریم سلطانہ کے جہیز میں دیا گیا تھا۔

دن گزرتے گئے عادل شاہ نے اس سلسلے میں بے پروائی برتی۔ برہان شاہ کی طرف سے تقاضے بڑھتے گئے۔ اس قضیے نے دونوں خاندانوں کے درمیان نفرت کی بنیاد ڈال دی۔ برہان شاہ نے کامل ایک سال انتظار کیا... اسمٰعیل عادل شاہ پر چڑھ آیا۔ شولاپور اور قلعہ کی حفا... کے لیے اپنے لشکر کو جمع کر لیا۔ اسے یقین تھا کہ اسمٰعیل... شاہ مقابلے پر ضرور آئے گا۔ اس سے لڑائی کے لیے... کی بھی مدد لے سکتا تھا۔ اس نے ارد گرد نظر دوڑائی۔... ایسے حکمران کی تلاش تھی جو طاقتور بھی ہو اور عادل... خاندان کا دشمن بھی ہو۔ اس کی نظر قاسم برید پر گئی... اسمٰعیل شاہ پہلے ہی باور کرا چکا تھا کہ قاسم برید کا خاتمہ اس... پہلی ترجیح ہے۔ قاسم برید کو بھڑکانے کے لیے یہی دلیل... تھی۔ اس نے اپنے چند امیروں کو قاسم برید کے پاس بھیج...

محمود شاہ بہمنی کو قاسم برید نے عیش و نشاط کے... سامان مہیا کر دیے تھے۔ وہ اسی پر تکیہ کیے بیٹھا تھا... کام قاسم برید کے حکم سے سرانجام پا رہے تھے۔ اس وقت... بھی برہان شاہ کے امرا محمود بہمنی کے نہیں قاسم برید... پاس بیٹھے ہوئے تھے۔

"اسمٰعیل عادل شاہ آپ کو قتل کرنے کی ہر ممکن کوشش کر رہا ہے۔ پچھلے دنوں جب برہان شاہ سے اس کی ملاقات ہوئی تھی اس میں بھی اس نے آپ کو فتنہ قرار دیا تھا۔" برہان شاہ کے ایک امیر نے بات کا آغاز کیا۔

"اور برہان شاہ نے اس کی رائے سے اتفاق... تھا۔" قاسم برید نے کہا۔

"اس وقت کی بات اور تھی۔ برہان شاہ کو اس کی... سے شادی کرنی تھی ورنہ برہان شاہ دل سے اس کے... تیار نہیں تھے۔ اسمٰعیل شاہ شولاپور کا علاقہ دینے سے بھی... لیے گریز کر رہا ہے کہ وہ چاہتا تھا پہلے آپ کے خلاف لشکر... کی جائے۔ برہان شاہ ٹال مٹول سے کام لے رہے تھے... اب وہ اسمٰعیل شاہ پر چڑھ آئے ہیں اور چاہتے ہیں آپ... اس میں شامل ہوں۔ دونوں مل کر اسمٰعیل شاہ کے علا... چھین لیں۔"

"انہیں میرا پیغام پہنچا دو۔ میں ان کی مدد کے... تیار ہوں اور بہت جلد اپنی فوجیں روانہ کر دوں گا۔"

اسمٰعیل شاہ اس صورت حال سے بہت گھبرا گیا تھا۔... کے علم میں تھا کہ حریفوں کی تعداد چالیس ہزار سواروں تک... گئی ہے۔ وہ بارہ ہزار بہادر سپاہیوں کو لے کر آگے بڑھا... حریفوں سے تقریباً دو کوس کے فاصلے پر قیام پذیر ہوا۔

برہان نظام شاہ جنگ کا آغاز کرنے میں تاخیر... کام لے رہا تھا۔ اسے امیر برید کے آنے کا انتظار تھا۔ جب... امیر برید آچکا تو اس نے لشکر ترتیب دیا۔ فوج کے درمیا...

...رکھا۔ یہ تیاریاں دیکھ کر اسمٰعیل عادل شاہ نے بھی میدان کا رخ کیا۔ اس نے نہایت کامیاب حکمت عملی اختیار کی۔ امیر برید اور برہان شاہ کے لیے الگ الگ دستے مقرر کیے۔ اس طرح وہ ایک نہیں، دو جنگیں لڑ رہا تھا۔ جنگ کا آغاز ہوا، نیزہ باز نیزوں کو جھکائے آگے بڑھے۔ دشمن کے قریب پہنچتے ہی نیزوں کو سیدھا کیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے خون کے دریا بہہ گئے۔ امیر قاسم کا مقابلہ ...سوں بہادر کر رہا تھا۔ اس کی بہادری نے ایسا سماں باندھا کہ امیر قاسم کا لشکر پیچھے ہٹتے ہٹتے نظروں سے غائب ہو گیا۔ امیر قاسم کے رفو چکر ہونے کے بعد وہ لشکر بھی فارغ ہو گیا جو امیر برید سے نبرد آزما تھا۔ اب میدان جنگ ہی میں فیصلہ ہوا کہ سب ...ل کر نظام شاہ بحری پر حملہ آور ہو جائیں۔ اس فیصلے پر اسی وقت عمل درآمد ہوا۔ اسمٰعیل عادل شاہ فوراً حملہ آور ہوا۔ میمنہ اور میسرہ کی طرف سے اس کے امرا آگے بڑھے۔ حملہ ایسا شدید تھا کہ نظام شاہ کے چھکے چھوٹ گئے۔ اس کا مددگار پہلے ہی فرار ہو چکا تھا۔ اس نے بھی اسی کی پیروی کی اور میدان جنگ سے فرار ہو گیا۔ اسمٰعیل عادل شاہ نے اشارہ کیا اور اسد خاں لاری نے بھاگنے والے کا تعاقب شروع کر دیا۔ یہ تعاقب اتنا برق رفتاری سے ہوا کہ حریف کو بھاری ساز و سامان لے جانے کی فرصت ہی نہیں ملی بلکہ ایک جگہ تو یہ ہوا کہ نظام شاہی کے پھریرے پر اسد نے قبضہ کر لیا۔ کسی حریف کے لیے اس سے بڑی ہزیمت ہو ہی نہیں سکتی تھی۔

برہان نظام شاہ لٹنے پٹنے کے بعد اپنے ملک پہنچا تو اسے اپنے ہی در و دیوار اجنبی معلوم ہو رہے تھے۔ وہ محل میں پہنچا تو مریم سلطانہ اس کی منتظر تھی۔ اس وقت اس کی حالت عجیب تھی۔ ایک طرف اس کا بھائی تھا دوسری طرف شوہر۔ اس کی اتنی ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ شوہر سے آنکھ ملاتی۔ ڈرتے ڈرتے آئی اور برہان نظام کے برابر بیٹھ گئی۔

"آپ تو خوش ہو رہی ہوں گی کہ ہمیں آپ کے بھائی سے مقابلے میں شکست ہو گئی۔"

"اگر آپ کی فتح ہوتی تو بھی مجھے دکھ ہوتا۔"

"شاید اس لیے کہ میری فتح کی صورت میں آپ کے بھائی کی شکست ہوتی۔"

"جی نہیں، دکھ اس لیے ہوتا کہ گھر کا فیصلہ میدان جنگ میں کیوں ہوا۔"

"یہ تو تمہارے بھائی کے سوچنے کی بات تھی۔"

"میں ان کی حمایت کب کر رہی ہوں بلکہ میں تو آپ سے یہ عرض کرنے والی تھی کہ آپ مجھے بیجاپور جانے کی اجازت فرما دیں۔ میں خود جا کر بات کروں گی۔"

"جانتے ہیں وہ کیا سمجھے گا؟ یہ سمجھے گا کہ میں نے شکست کھانے کے بعد آپ کا سہارا لیا ہے۔ میدان کے مرد عورتوں کا سہارا نہیں لیا کرتے۔"

"وہ کچھ نہیں کہیں گے۔ بس آپ ہمیں جانے دیں۔"

"ہمارے گھر کی عورتیں دشمن کے گھر نہیں جاتیں۔ اسمٰعیل عادل شاہ آپ کا بھائی نہیں ہمارا دشمن ہے۔ اب ہمارا اس کا سامنا میدان جنگ میں ہوگا۔"

اس کے بعد مریم سلطانہ کے لیے ممکن نہیں تھا کہ وہ اسے مزید سمجھاتی۔ برہان نظام شاہ نہایت غیور اور حساس حکمران تھا۔ اس شکست نے اسے مجبور کیا کہ وہ اسمٰعیل عادل شاہ سے شکست کا بدلہ لینے کے لیے تیاری کرتا رہے۔ اس عرصے میں اس نے قاسم برید سے بھی رابطہ کیا اور اسے آمادہ کر لیا کہ دونوں مل کر ایک مرتبہ پھر اسمٰعیل عادل شاہ پر لشکر کشی کریں۔ جب وہ تیار ہو گیا تو برہان شاہ نے بیجاپور کا رخ کیا۔ قاسم برید بھی اس سے آن ملا۔ اسمٰعیل عادل شاہ کو خبر ملی تو وہ بھی بیجاپور سے نکل آیا۔ اس نے بیجاپور سے تین کوس کے فاصلے پر برہان شاہ کو روک لیا۔ دونوں فوجیں ایک دوسرے پر ٹوٹ پڑیں۔ گھمسان کی جنگ کے بعد ایک مرتبہ پھر نظام شاہ کو شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔ اس نے فرار ہو جانے ہی میں عافیت سمجھی۔ اسد خاں لاری ایک مرتبہ پھر اس کے تعاقب میں روانہ ہوا۔ قلعہ پرندہ تک دوڑ لگاتا چلا گیا اور دشمن کے بیس ہاتھی قبضے میں لے لیے۔ ان میں ایک وہ خاص ہاتھی بھی تھا جس پر برہان نظام شاہ سوار ہوتا تھا۔

اسمٰعیل عادل شاہ نے یہ تمام ہاتھی اسد خاں لاری کو عطا کر دیے۔

اسد خاں لاری نے اسمٰعیل شاہ کو مشورہ دیا کہ وہ آئندہ کسی معرکے کے پیش نظر علاؤالدین عماد شاہ والی برار کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھائے۔ اسد خاں لاری ہی کی کوششوں سے ایک قریبی قصبے میں والی برار اور اسمٰعیل شاہ کے درمیان ملاقات ہوئی۔ اسمٰعیل عادل شاہ نے والی برار کے سامنے ایک نئے اتحاد کی ضرورت پر زور دیا اور اپنی وفاداریوں کا یقین دلا کر والی برار کو اپنا مہربان بنا لیا۔ یہ دوستی اتنی بڑھی کہ اسمٰعیل عادل شاہ نے اپنی چھوٹی ہمشیرہ خدیجہ کا عقد والی برار کے ساتھ کر دیا۔

برہان نظام شاہ کو اکیلا دیکھ کر بہادر شاہ گجراتی نے اس پر چڑھائی کر دی۔ جنگ کے بادل منڈلائے تو پرانی دشمنی بھول کر نظام شاہ نے اسمٰعیل عادل شاہ کو مدد کے لیے

پکارا۔ اسمٰعیل نے بھی یہ موقع ضائع نہیں کیا۔ اس نے چھ ہزار سپاہی نظام شاہ کی مدد کے لیے روانہ کردیے۔ نظام شاہ نے امیر برید کو بھی مدد کے لیے بلایا تھا۔ وہ بھی اپنے لشکر کے ساتھ آگیا۔ بہادر شاہ گجراتی میں اب مقابلے کی سکت نہیں تھی۔ وہ ڈر کر بھاگ گیا۔ امیر برید کی سازشی طبیعت اس موقع پر بھی اپنا رنگ دکھائے بغیر نہ رہ سکی۔ اس نے اسمٰعیل عادل شاہ کے بعض لشکریوں کو اپنے پاس بلایا اور بہلا پھسلا کر اپنی بات سننے پر رضامند کرلیا۔

''اگر تم بیجاپور پہنچ کر اسمٰعیل عادل شاہ کو گرفتار کرلو تو اس کا ملک سب لوگ برابر تقسیم کرلیں گے۔''

یہ لوگ اس وقت تو چپ رہے بلکہ نیم رضامند بھی ہوگئے کہ وہ بادشاہ کو گرفتار کرلیں گے لیکن جب بیجاپور پہنچے تو امیر برید کی پوری گفتگو اسمٰعیل شاہ کو سنادی اور امیر قاسم کی بدنیتی کا پول کھول دیا۔

''اگر اب بھی آپ نے امیر برید کا خاطر خواہ انتظام نہیں کیا تو وہ کسی وقت بہت بڑے خطرے کا باعث بن جائے گا۔ یہی سازش وہ کسی اور سے بھی کرسکتا ہے۔''

''اس کے باوجود نظام شاہ بحری، امیر قاسم کو اپنا دوست کہتا ہے۔'' اسمٰعیل شاہ طیش میں اپنی نشست سے اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ ''وہ کچھ بھی کرتا رہے لیکن میں اب امیر برید کو معاف نہیں کروں گا۔ اس کی حرکتیں ہمیشہ کے لیے ختم کردوں گا۔''

اس نے فوراً ایک قاصد روانہ کرکے نظام شاہ بحری کو پیغام بھجوایا۔ ''امیر قاسم برید کی گستاخیاں حد سے تجاوز کرچکی ہیں۔ وہ اس سے پہلے بھی عادل شاہی سلطنت کو نقصان پہنچاتا رہا ہے لیکن اس مرتبہ اس نے میرے لشکر کو براہ راست بھڑکایا اور میرا ملک چھیننے کی کوشش کی ہے۔ میں ہمیشہ اسے معاف کرتا رہا ہوں لیکن اب میں نے پختہ ارادہ کرلیا ہے کہ اسے ایسا مزہ چکھاؤں گا کہ ہمیشہ یاد رکھے گا کیونکہ مکاروں کے ساتھ شفقت سے پیش آنا اور انہیں بار بار معاف کردینا دانش مندی نہیں۔ اب میری گزارش ہے کہ آپ بھی دوستی کا ہاتھ اس کے سر سے اٹھالیں اور میرے ساتھ مل کر اسے اس کی گستاخیوں کا پھل دیں۔ اگر آپ نے اس طرف توجہ نہ دی تو وہ کسی وقت آپ سے بھی دغا کرے گا۔''

بہادر شاہ گجراتی کے حملے کے وقت اسمٰعیل عادل شاہ نے اس کی مدد کی تھی اس لیے وہ اس کا ممنون احسان تھا۔ اس لیے نظام شاہ نے اسمٰعیل عادل شاہ کے قاصد کو مثبت جواب دیا اور پیغام بھجوایا کہ وہ جو کچھ ہوسکتا ہے کرنے کو تیار ہے۔

اسمٰعیل عادل شاہ نے بارہ ہزار سپاہیوں کو ہمراہ لیا اور بیدر کی طرف روانہ ہوا۔ قاسم برید نے بیدر کی فضا میں فوجوں کا شور سنا تو اپنے فرزند علی برید کو قلعے کا محافظ بنا کر خود کسی طرف نکل گیا۔ اسمٰعیل عادل شاہ نے قلعے کو نرغے میں لے لیا اور اسے فتح کرنے کی تدبیریں کرنے لگا۔

قاسم برید کے متعلقین اور اس کے خیر خواہ سپاہیوں کی بہادری کا دور دور تک شہرہ تھا۔ اس وقت بھی انہوں نے اپنی بہادری کے جوہر دکھائے۔ یہ لوگ شہر سے نکلتے اور میدان گرم کرکے واپس پلٹ جاتے۔ گویا ایک قسم کی چھاپا مار جنگ کرتے رہے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ وقت گزاری کا ایک طریقہ تھا۔ یہ عقدہ اس وقت کھلا جب سلطان قلی قطب شاہ کی فوج بریدیوں کی مدد کے لیے پہنچ گئی۔

یہ سلطان قلی قطب شاہ وہی ہے جو اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر سمجھا جاتا ہے۔ علی برید نے دکنی فوج کے آجانے کے بعد فوج کو ترتیب دیا اور میدان میں کود پڑا۔ جنگ ابھی شروع نہیں ہوئی تھی کہ بریدیوں کی جانب سے دو نوجوان باہر نکلے۔ چہروں پر بہادری کی سرخی چمک رہی تھی۔ سر سے پاؤں تک لوہے میں ڈوبے ہوئے۔

''اگر عادل شاہی فوج میں کوئی بہادر ہے تو سامنے آئے اور ہم سے تنہا مقابلہ کرے۔''

ان کی نڈر آواز نے اسمٰعیل عادل شاہ کے خون کو گرما دیا۔

''اگر ان کی یہ خواہش ہے تو ان سے تنہا مقابلہ میں کروں گا۔''

یہ سن کر اسد خاں لاری نے سر نیاز جھکایا۔

''ابھی میں زندہ ہوں۔ آپ کیوں اپنی جان خطرے میں ڈالتے ہیں۔ اگر ہماری جانوں میں سے کسی کو گزند پہنچی تو کوئی فرق نہیں پڑے گا لیکن آپ کی جان بہت قیمتی ہے۔ مجھے مقابلہ کرنے دیں۔''

''نہیں، ان سے مقابلہ میں کروں گا۔''

امرا نے ہرچند اسے روکنا چاہا لیکن اس نے کسی کی بات نہیں مانی اور مقابلے کے لیے آگے بڑھ گیا۔ دونوں نوجوانوں کو بھی حیرت ہوئی کہ ان سے مقابلے کے لیے بادشاہ خود چلا آیا ہے۔

اسمٰعیل عادل شاہ نے دونوں کو للکارا اور تلوار کا بھرپور وار کیا۔ ان میں سے ایک نے اس وار کو اپنی تلوار پر روکا۔ دوسرے نے وار کیا۔ اسمٰعیل کی ڈھال نے اس وار کو روکا۔ اسمٰعیل نے پوری قوت سے دونوں کو پیچھے کی طرف دھکیلا۔ فریقین میں خونریز جنگ کا آغاز ہوگیا۔ دونوں اپنی تلواریں ایک ساتھ برسا رہے تھے۔ اسمٰعیل عادل شاہ انہیں بھی اپنی تلوار پر روکتا۔ کبھی جھکائی دے کر ان کے وار کو خالی جانے دیتا۔ ایک مرتبہ وہ پینترا بدل کر دائیں جانب ہوا اور اس زور سے وار کیا کہ ایک نوجوان کی تلوار دو ٹکڑے ہوکر دور جا پڑی اور دوسرے ہی لمحے اسمٰعیل شاہ کی تلوار نے ایک نوجوان کی گردن صاف کردی۔ دوسرا نوجوان ابھی تک مقابلے پر ڈٹا ہوا تھا لیکن وہ بھی زیادہ دیر تاب نہ لاسکا۔ اسمٰعیل عادل شاہ کے تابڑ توڑ حملوں نے اسے بوکھلا دیا اور اسی گھبراہٹ میں وہ بھی موت کے گھاٹ اتر گیا۔

یہ دونوں نوجوان آپس میں بھائی تھے اور اتنے بہادر کہ ہر بھائی اپنے آپ کو ایک لشکر کے برابر سمجھتا تھا۔

اسمٰعیل عادل شاہ داد و تحسین کے شور میں اپنے لشکر کی طرف پلٹا۔ سب سے پہلے اسد خاں آگے بڑھا اور اس کے گھوڑے کی رکاب کو چوم لیا پھر دوسرے امرا آئے اور بادشاہ کے سر سے خیرات اتار کر تقسیم کی۔ اتنے میں جنگ کا باقاعدہ آغاز ہوگیا تھا۔ اسمٰعیل عادل شاہ نے اسد خان لاری اور حسن عرب کو حکم دیا کہ وہ بریدیوں اور قلی قطب شاہ کی فوجوں کا مقابلہ کرنے کے لیے آگے بڑھیں۔ دونوں امیر اپنی اپنی فوجوں کو لے کر دشمن پر ٹوٹ پڑے اور دونوں فوجوں کو سخت مقابلے کے بعد مار بھگایا۔

قلی قطب شاہ اپنے علاقوں کی طرف بھاگا اور بریدی بھاگ کر قلعہ بند ہوگئے۔ اسمٰعیل عادل شاہ نے قلعے کا محاصرہ کرلیا۔

اس محاصرے کو دیکھ کر امیر برید سخت پریشان ہوا اور مدد کے لیے ایک قاصد والی برار عماد شاہ کی طرف بھیجا۔ اسمٰعیل شاہ کا اس سے پہلے ہی معاہدہ ہوچکا تھا لیکن اس قاصد سے اس نے کوئی اظہار نہیں کیا اور بہ ظاہر روانہ بھی ہوگیا۔ اس نے بیدر کے قلعے کی جانب جانے کے بجائے عادل شاہ کی قیام گاہ کا رخ کیا اور ایک کوس کے فاصلے پر ٹھہر گیا۔ عادل شاہ کو معلوم ہوا اور چند احباب کے ساتھ اس سے ملاقات کے لیے پہنچا۔

''کیا آپ امیر قاسم کی مدد کے لیے تشریف لائے تھے؟''

''میرے آنے کا مقصد تو صرف آپ کو فتح کی مبارک باد دینا ہے۔ البتہ یہ مقصد بھی ذہن میں ہے کہ امیر برید کی آپ سے صلح ہوجائے۔ ان روز روز کے جھگڑوں سے نجات تو ملے۔''

''امیر برید کی گستاخیاں اتنی ہیں کہ شمار میں نہیں آسکتیں۔ جب تک اس جنگ میں اس سے انتقام نہ لیا جائے وہ قابل معافی نہیں۔''

عماد شاہ نے اسمٰعیل عادل شاہ کو اتنا برہم دیکھا تو زیادہ زور دینا مناسب نہ سمجھا۔ عماد شاہ اس پر اتنا مہربان ہوا کہ سات روز تک اسے اپنے خیمے میں ٹھہرایا اور اس کی میزبانی کی۔ جب وہ رخصت ہونے لگا تو قیمتی تحائف اس کے ساتھ کیے۔

امیر برید اس کی رخصتی کا انتظار کررہا تھا۔ اس کے رخصت ہوتے ہی امیر برید، عماد شاہ کی خدمت میں حاضر ہوگیا۔

''کیا دکن کی قسمت میں یہی لکھا ہے کہ ہمیشہ جنگ کے بادل منڈلاتے رہیں۔''

''میں نے اسمٰعیل شاہ سے بات کی تھی لیکن وہ آپ کی طرف سے بہت برہم ہیں۔''

''یہ اس کی غلط فہمیاں ہیں جو اسے پریشان کیے ہوئے ہیں، ورنہ میں تو اس کا ہمدرد ہوں۔''

''اس کی غلط فہمیاں وقت کے ساتھ ساتھ دور ہوں گی۔''

''اس وقت تک میرے بڑھاپے کا کیا ہوگا۔ اسمٰعیل شاہ قلعے کو محاصرے میں لیے کھڑا ہے۔ میرے متعلقین سخت پریشان ہیں۔ اب میں آپ سے ملتجی ہوں کہ مجھے ان پریشانیوں سے نجات دلائیں۔''

''اب تو اس سے بچاؤ کی ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ آپ بیدر کا قلعہ اسمٰعیل عادل شاہ کے حوالے کردیں۔''

''یہ تو سراسر ناانصافی ہے۔ عادل شاہ مجھ سے انتقام نہیں لے رہا ہے، اپنی توسیع پسندی کے منصوبے پورے کر رہا ہے۔ آپ کو اس کا نہیں میرا ساتھ دینا چاہیے۔ اسے مجبور کیجیے کہ وہ بیجاپور واپس چلا جائے۔''

''وہ میرا ماتحت نہیں ہے کہ میں اسے حکم دوں۔''

''مجھے معلوم ہے آپ اس کے بہنوئی ہیں اس لیے اس کی ہم نوائی کریں گے۔''

''جب تمہیں یہ معلوم تھا تو میرے پاس کیوں چلے آئے؟''

''میں نے یہ فرض کرلیا تھا کہ آپ انصاف سے کام لیں گے۔''

''اگر میں اسمٰعیل شاہ کی رشتے داری کا حق ادا کرتا تو آپ

کے خلاف جنگ آزما ہوتا۔ میں تو درمیان کا راستہ نکال رہا ہوں اور آپ کو مشورہ دے رہا ہوں کہ آپ بیدر کا قلعہ اسمٰعیل شاہ کے حوالے کردیں۔"

"میں اسے دھمکی تصور کرتا ہوں۔"

"میں کسی کی سوچ پر پہرے نہیں بٹھا سکتا۔"

"میں اسمٰعیل شاہ سے نمٹ سکتا ہوں، اگر آپ درمیان میں نہ آئیں۔"

"میرے اور اس کے درمیان معاہدہ طے پاچکا ہے۔ میں الگ تھلگ نہیں رہ سکتا۔"

"پھر میں اپنا راستہ خود طے کروں گا۔"

امیر قاسم برید برہم ہو کر اٹھ گیا اور اپنی عارضی قیام گاہ کی طرف لوٹ گیا جو عماد شاہ کے خیمۂ خاص سے دو کوس کے فاصلے پر تھی۔ وہ عماد شاہ سے گفتگو کے بعد اتنا دلبرداشتہ تھا کہ قیام گاہ پر پہنچتے ہی شراب کا سہارا لینے پر مجبور ہوگیا۔ اس کے ساتھیوں نے بھی اسے بے فکر دیکھا تو ان لمحات کو غنیمت جان کر آرام کرنا شروع کردیا۔ گنتی کے بس چند محافظ تھے جو حفاظت کے فرائض انجام دے رہے تھے۔

کئی دن اور رات ان ہی رنگ رلیوں میں گزر گئے۔

اسمٰعیل عادل شاہ کو جب اس کے قیام کا حال معلوم ہوا تو اس نے اسد خاں لاری کو بلایا اور برید کی قیام گاہ پر شب خون مارنے کا حکم دیا۔

اسد خاں لاری امیر برید کی قیام گاہ کی طرف بڑھا۔ وہ بڑھتا چلا گیا اور قیام گاہ پر زندگی کے کوئی آثار نہ تھے۔ اس نے اپنے سپاہیوں کو آگے بڑھنے سے روک دیا۔ چند بہادر سپاہیوں کو آگے بھیجا کہ وہ جائزہ لے کر آئیں، ماجرا کیا ہے۔ وہ سپاہی آگے بڑھے تو معاملے ہی الٹا دیکھا۔ تمام لوگ نشے میں دھت بے خبر پڑے ہوئے تھے۔ ان سپاہیوں نے چند نیزے، شمشیریں اور پگڑیاں اٹھالیں۔ کسی نے کوئی مزاحمت نہ کی۔ یہ سپاہی ان چیزوں کو لے کر اسد خاں کے پاس آئے اور تمام ماجرا بیان کیا۔

"قیام گاہ کسی اجڑے قبرستان کی طرح خاموش ہے۔ ہر شخص نشے میں بے حال پڑا ہوا ہے۔ محافظ تک بے سدھ ہو کر سو رہے ہیں۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ ہم نے ان کے ہتھیار اٹھالیے اور انہیں خبر تک نہیں ہوئی۔"

اسد خاں لاری نے سپاہیوں کو حریف کی فوج کے اردگرد لگایا۔

"خبردار! کوئی آواز نہ نکالے۔ بے جان، ساکت کھڑے رہنا۔ کسی کو تمہاری آمد کی خبر نہ ہو۔"

اسد خان نے امیر برید کے خیمے کا رخ کیا۔ دیکھتا ہے کہ ادھر ادھر شراب کے برتن بکھرے پڑے ہیں۔ امیر قاسم ایک گوشے میں پلنگ پر بدمست ہاتھی کی طرح ہے۔ زمین پر اس کے محافظ خراٹے لے رہے ہیں۔

ماحول ایسا تھا کہ سب کو قتل کیا جاسکتا تھا لیکن اسد خاں نے مشورہ دیا کہ امیر قاسم کو پلنگ سمیت خیمے سے باہر لے چلو۔ سپاہیوں نے اس کا پلنگ کاندھوں پر اٹھالیا اور خیمے سے باہر آگئے۔

"ہم یہاں موجود ہر شخص کو قتل کرسکتے ہیں لیکن کسی کو قتل کرنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ ہمارا جو مقصد ہے وہ پورا ہو چکا۔ ہم نے امیر برید کو گرفتار کرلیا ہے۔ اس کو اسی حالت میں عادل شاہ کے حضور پیش کردیا جائے تو زیادہ بہتر ہوگا۔"

ساتھیوں نے اس مشورے کو قبول کیا اور امیر برید کو پلنگ سمیت کاندھوں پر لے چلے۔ کئی من چلے کلمۂ طیبہ کا ورد بھی کرتے جارہے تھے جیسے جنازہ لے کر جارہے ہیں۔

ابھی آدھا فاصلہ طے ہوا تھا کہ مسلسل جھٹکے لگنے سے قاسم برید کو ہوش آگیا۔ پہلے تو وہ اپنی حالت پر غور کرتا رہا۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ پلنگ اوپر کیسے اٹھ گیا۔ اسے ایک ہی خیال آیا کہ اس کا پلنگ جنات اٹھا کر لے جارہے ہیں۔ اس نے شور مچانا شروع کردیا۔

"ارے کوئی ہے۔ میں جنوں کے ہاتھ چڑھ گیا ہوں۔ کوئی ہے جو مجھے ان سے بچائے۔"

اس کے شور مچانے اور اچھلنے کودنے سے یہ ڈر ہونے لگا کہ وہ پلنگ سے نیچے گر جائے گا۔ سپاہیوں نے پلنگ زمین پر رکھ دیا۔ اسد خاں لاری اس کے قریب گیا اور اس سے مخاطب ہوا۔

"امیر قاسم! مجھے پہچانتے ہو؟"

"تم اسد خاں لاری ہو۔ میں تمہیں کیوں نہیں پہچانوں گا۔" امیر قاسم نے خوفزدہ آواز میں کہا۔ "کیا تمہیں بھی جنات اٹھا کر لے جارہے ہیں؟"

"جنات مجھے اٹھا کر نہیں لے جارہے ہیں بلکہ میں تمہیں لے جارہا ہوں۔ تم میرے قبضے میں ہو۔"

"اور میرے محافظ؟"

"وہ سب تمہاری قیام گاہ پر بے سدھ پڑے ہیں۔ دشمن کے اتنے قریب رہ کر مے نوشی کی یہ کثرت۔ بے وقوفی نہیں تو اور کیا ہے۔ یہ تمہاری بے وقوفی کی سزا ہے جو تمہیں مل رہی ہے۔"

امیر قاسم جیسے ہوشیار آدمی کے پاس اب کہنے کو کچھ نہیں تھا۔ شرمندہ تھا اور گردن جھکائے بیٹھا تھا۔

صبح ہوتے ہی اسد خاں لاری اپنے کارنامے کی خبر پہنچانے کے لیے اسمٰعیل عادل شاہ کے پاس پہنچ گیا۔

''آپ کا دشمن میرے قبضے میں ہے۔''

''کیا تم امیر قاسم کی بات کررہے ہو؟''

''جی، میں اسی مکار کی بات کررہا ہوں۔''

''وہ تمہارے قبضے میں کیسے آگیا؟''

اسد خاں لاری نے اسے تفصیل بتائی۔

''اسے میرے سامنے پیش کرو۔''

بادشاہ کے حکم سے امیر قاسم برید کو ہاتھ پاؤں باندھ کر بادشاہ کے سامنے پیش کیا گیا۔ بادشاہ نے اسے اپنے سامنے دھوپ میں کھڑا کیا۔

''میں بہادروں کی قدر کرتا ہوں لیکن تم نے ہمیشہ مکاری سے کام لیا ہے۔ میں تمہاری طرح مکار نہیں ہوں کہ تمہارا مقابلہ کرسکوں۔ بہتر یہی ہے کہ میں تمہارے قتل کا حکم جاری کردوں تاکہ اہل دکن کو ہمیشہ کے لیے تم سے نجات مل جائے۔''

''عادل شاہ، مجھے معلوم ہے کہ میرے گناہ بہت ہیں لیکن وہ قدم یوسف عادل شاہ نے بھی نہیں اٹھایا جو تم اٹھا رہے ہو۔ وہ ہمیشہ مجھے معاف کرتے رہے۔ تم سے بھی معافی کی استدعا کروں گا۔ تم میری جان بخش دو۔ اس کے صلے میں بیدر کا قلعہ عادل شاہی خاندان کے قبضے میں دے دوں گا۔ ساتھ ہی تمام مال وزر اور ذخیرہ سیم وطلا بھی تمہاری نذر کردوں گا۔''

''میں اس کے قتل کا حکم واپس لیتا ہوں لیکن یہ بدستور میری قید میں رہے گا تاوقتیکہ یہ اپنے بیٹوں سے بات کرکے قلعہ ہمارے حوالے نہ کردے۔''

اسمٰعیل عادل شاہ نے اسد خاں لاری کو اس کا نگراں مقرر کرکے قید کردیا۔

امیر برید نے اسد خاں لاری سے درخواست کی کہ اسے کوئی آدمی دیا جائے جس کے ذریعے وہ اپنے بیٹوں سے پیغام رسانی کرسکے۔ اسد خاں کے آدمی کے ذریعے اس نے اپنے بیٹوں کے پاس پیغام بھیجا کہ قلعہ اسمٰعیل شاہ کے حوالے کردیا جائے۔

باپ کا پیغام سن کر اور قلعے کو ہاتھ سے جاتا دیکھ کر بیٹوں کو طیش آگیا۔

''بڑھاپے نے امیر کی عقل چھین لی ہے۔ خود تو بزدلی سے گرفتار ہوگیا ہمیں بھی بزدلی کا سبق سکھا رہا ہے۔ [illegible] سے کہنا عظیم قلعے کو جسے آج تک کوئی بادشاہ فتح نہ کر[illegible] حریف کی تحویل میں دینا بے وقوفی ہے۔''

دوسرے لفظوں میں انہوں نے یہ پیغام بھیج دیا تھا جس طرح بھی ہو وہ اسیری کے دن گزارے۔

امیر برید کو بیٹوں کا جواب سن کر پہلے تو غصہ آیا [illegible] پھر ٹھنڈے دل سے سوچا تو حکمت نظر آئی۔ اس نے سوچا [illegible] بادشاہ اسمٰعیل شاہ اس کے قتل کا حکم تو واپس لے ہی چکا [illegible] اب وہ اس سے کہہ دے کہ فرزند قلعہ خالی کرنے پر تیار نہیں وہ اگر اسے قید میں رکھنا چاہتا ہے تو قید میں رکھے۔

اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ اس کے قتل کا حکم دوبارہ [illegible] جاری ہوسکتا ہے۔ اس نے یہی بات اسد خاں لاری سے [illegible] دی۔ اسد خاں نے اس کی نیت کا حال بادشاہ تک پہنچادیا۔

''امیر قاسم کی نیت میں کھوٹ آگیا ہے۔ وہ اب اپنے بیٹوں کا سہارا لے کر قلعہ ہمارے حوالے کرنے [illegible] انکاری ہورہا ہے۔''

''ٹھیک ہے اسے قید میں رہنے دو۔ رہا مت کر[illegible] جب تک اس کے حواس درست نہیں ہوجاتے۔ جب [illegible] وبند کی صعوبتیں برداشت کرے گا تو وہ اپنے بیٹوں کو [illegible] مجبور کرے گا۔''

''اس طرح تو ہم اس کی منشا پوری کردیں گے۔'' [illegible] خان نے کہا۔ ''وہ یہی تو چاہتا ہے۔ سزا وہ ہونی چاہیے [illegible] دیکھ کر اس کی ناخلف اولاد کے بھی ہوش ٹھکانے آجا[illegible]ں۔ امیر قاسم تو وہ فتنہ ہے کہ قید میں رہے یا آزاد، اپنی مکار[illegible] سے باز نہیں آئے گا۔ کوئی نہ کوئی فتنہ اٹھاتا رہے گا۔''

''ہم نے اس کے قتل کا حکم واپس لے لیا تھا لیکن افسوس کہ اس نے ہماری رحم دلی کی قدر نہیں کی۔ ہم اپنا پ[illegible] حکم واپس لیتے ہیں اور اس کے قتل کا نیا حکم جاری کر[illegible] ہیں۔ اسے مست ہاتھی کے سامنے ڈال دو۔''

اسد خاں لاری فوری حکم بجا لایا۔ ایک مست ہاتھی میدان میں لایا گیا اور امیر برید کو کچلنے کے لیے تیار کیا جا[illegible] لگا۔ امیر قاسم جس جگہ تھا وہاں سے یہ منظر صاف نظر آ[illegible] تھا۔ موت کو اپنے سامنے دیکھ کر چیخنے چلانے لگا۔ اسد خا[illegible] کے سپاہی اسے خاموش کرانے کے لیے ڈانٹ ڈپٹ [illegible] رہے تھے لیکن وہ برابر چیخے جارہا تھا۔ عام طور پر بہا[illegible] افراد ہنستے کھیلتے موت کو گلے لگالیتے ہیں لیکن اب معلوم ہو[illegible] کہ وہ بہادر نہیں ہے، سازشی ہے۔ ان سازشوں کے طفیل [illegible] اس نے اتنا بڑا رتبہ حاصل کیا ہے۔ اب سازش کا کوئی مو[illegible]

نہیں رہ گیا تھا۔ اسی لیے چلا رہا تھا۔

جب اس نے دیکھا کہ اس کے رونے اور چلانے سے کسی کا دل نہیں پگھلے گا تو اس نے اسد خاں سے التجا کی۔

''اسد خاں، تم مجھے مارنے کا ارادہ کر ہی چکے ہو تو میرے دل کی آخری خواہش پوری کردو۔ میری درخواست ہے کہ مجھے اپنے فرزندوں کے اس برج کے قریب مارا جائے جہاں وہ رہتے ہیں۔ شاید مجھے مرتے ہوئے دیکھ کر ان کے دل میں رحم آجائے اور وہ قلعہ آپ کے حوالے کردیں یا میں ان سے بات چیت کرکے کوئی آخری فیصلہ کرسکوں۔''

اسد خاں نے اس سے اتفاق کیا اور اسے برج کے قریب پہنچادیا۔

امیر برید اس حالت میں وہاں پہنچا کہ ہاتھی کی پیٹھ پر زنجیروں سے جکڑا ہوا تھا۔ بال دھول میں اٹے ہوئے اور ڈاڑھی آنسوؤں سے تر تھی۔

اس کے فرزندوں نے جب اسے اس حال میں دیکھا تو بساط الٹتی نظر آئی۔ انہوں نے سوچا کہ امیر برید کے مرنے کے بعد اسمٰعیل عادل شاہ جب چاہے گا بہ زور طاقت قلعہ چھین لے گا۔ باپ بھی ہاتھ سے جائے اور قلعہ بھی۔ اس وقت اگر قلعہ حوالے کردیا جائے تو باپ کی جان بچ سکتی ہے۔ وہ اوپر سے چیخے کہ پہلے ہمیں اسد خاں سے بات کرنے دو اس کے بعد سزا پر عمل درآمد کرنا۔

ان سے کہا گیا کہ اب جو بات کرنی ہے اسمٰعیل عادل شاہ سے کی جائے جو ابھی سزا کو ملاحظہ کرنے کے لیے تشریف لاتے ہی ہوں گے۔

کچھ دیر نہیں گزری تھی کہ اسمٰعیل عادل شاہ ہاتھی پر سوار محافظوں کے ہجوم میں گھرا ہوا برج کے قریب پہنچا اور امیر برید کے بیٹوں سے بات کی۔

امیر برید کے بیٹوں نے قلعہ حوالے کرنے کے لیے چند شرائط پیش کیں۔

اسد خاں لاری کو جس جگہ تجویز کیا جائے خاموش کھڑا رہنا ہوگا۔

بریدی خواتین واطفال سے کسی قسم کی بات چیت کرنے کی اجازت نہیں ہوگی۔

خواجہ سراؤں اور خواتین سے سامان اور مال وغیرہ کے سلسلے میں بھی کوئی باز پرس نہیں ہوگی۔

جس قسم کی پوشاک وہ زیب تن کیے ہوں مع زیورات قلعے سے نکل جانے کی اجازت ہوگی۔

اسمٰعیل عادل شاہ نے یہ تمام شرائط قبول کرلیں۔

اسد خاں لاری دروازۂ قلعہ پر مقرر ہوا اور اس بات کا محافظ ٹھہرایا گیا کہ بریدی خواتین، خواجہ سرا وغیرہ جب قلعہ سے باہر نکلیں تو انہیں کوئی شخص ایذا نہ پہنچائے اور نہ ان سے کوئی باز پرس کی جائے۔

بریدی خواتین گراں قدر زیورات، جواہرات، مال وزر اور اشرفیاں ساتھ لے کر نکلیں۔ کسی نے کوئی باز پرس نہیں کی۔ جتنی دولت وہ لے جاسکتی تھیں لے گئیں۔

بریدی مخلوق سے قلعہ خالی ہوتے ہی عادل شاہی خاندان کے سپرد کردیا گیا۔

اسمٰعیل عادل شاہ بڑے جاہ وجلال کے ساتھ قلعے میں داخل ہوا۔

اب وہ خاندان بہمنی کے تخت وتاج پر جلوہ افروز تھا۔ اس نے پہلا حکم یہ جاری کیا کہ امیر برید کو قتل نہ کیا جائے بلکہ قید میں اس طرح رکھا جائے کہ کوئی تکلیف یا گزند نہ پہنچے۔

اس حکم کے بعد اس نے اسد خاں اور ایک دوسرے امیر کے ذریعے والی برار علاؤ الدین عماد شاہ کو مدعو کیا۔ عماد شاہ نے دعوت قبول کی اور اپنی قیام گاہ سے سوار ہوکر باب قلعہ تک پہنچا جہاں اسمٰعیل شاہ بذات خود اس کے استقبال کے لیے موجود تھا۔

اسمٰعیل عادل شاہ یہ دیکھ کر حیران تھا کہ جتنا مال واسباب بریدی خواتین اپنے ساتھ لے گئی تھیں اس سے کہیں زیادہ قلعے میں اب بھی موجود تھا۔ بیش بہا ذخائر سیم وطلا، گراں قدر طلائی ظروف، عمدہ ہیرے، جواہر، موتی، بہترین پوشاکیں، لاکھوں کی نقدی۔

اس نے تمام اشیا کے ڈھیر علاؤ الدین عماد شاہ کے سامنے لگادیے تاکہ وہ جو چاہے اس میں سے اپنے لیے منتخب کرلے۔ عماد شاہ نے صرف ایک منقش خنجر اپنے لیے منتخب کیا اور ہاتھ بڑھا کر اٹھالیا۔

جب اس نے کچھ نہیں لیا تو بادشاہ نے تین لاکھ ہون عماد شاہ کے نوکروں میں بانٹ دیے۔ اپنے امرا میں بھی حسب مراتب تقسیم کیے۔ پچاس ہزار ہون کربلائے معلی بھیجے۔ جو رقم بچ گئی وہ سب کی سب فوج کے لوگوں میں تقسیم کردی۔

دربار برخاست کرکے اٹھا تو ساری رقم تقسیم ہوچکی تھی۔ خود اٹھا تو خالی ہاتھ تھا۔

عماد شاہ نے جب اسمٰعیل شاہ کو نوازشات کی طرف مائل دیکھا تو امیر برید کی سفارش کے لیے لب کشائی کی۔

"امیر برید ضعیف العمر ہے۔ قید و بند کی صعوبتیں جھیل نہیں سکے گا۔"

"یہ راستہ اس نے خود منتخب کیا ہے۔ میں نے تو ہر مرتبہ اسے معاف کیا کہ وہ اپنے شایان شان زندگی گزارے لیکن اس نے ہر مرتبہ میری تباہی کے ارادے کیے۔ میں اتنا ہی کر سکتا تھا کہ اسے قتل نہ کروں قید میں رکھوں۔ کوئی تکلیف نہ پہنچنے دوں۔"

"آج آپ کی سخاوت کو دیکھ کر مجھے یہ ہمت ہو رہی ہے کہ میں آپ سے اس کی سفارش کروں۔ اسے آزاد کر دیں کہ وہ اپنے گھر جائے۔"

"قید سے آزاد ہوتے ہی وہ پھر کوئی سازش تیار کرے گا۔"

"اب وہ ایسا نہیں کر سکے گا۔ پرندے کے پر کٹ گئے ہیں۔ مزید حفاظتی اقدام بھی کیے جا سکتے ہیں۔"

"میں اسے زندگی بھر قید میں رکھ کر سبق سکھاتا لیکن آپ کا کہا ٹال بھی نہیں سکتا۔"

اسمٰعیل عادل شاہ نے علاؤ الدین عماد شاہ کی سفارش پر امیر قاسم برید کی ساری غلطیوں کو معاف کر دیا اور کمال سخاوت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسے اپنے دربار کے امرا کی صف میں نمایاں جگہ مرحمت فرمائی اور احمد آباد بیدر کے علاوہ ساری جائداد اسے دوبارہ عطا کر دی۔

وہ صرف دماغ ہی اچھا نہیں لایا تھا قسمت بھی اچھی تھی۔

امیر برید کی سابقہ حرکتوں کو دیکھتے ہوئے اس پر یہ پابندی لگا دی کہ وہ بادشاہ کے تین ہزار سپاہیوں کے ہمراہ رہے گا۔

☆☆☆

بیجانگر کے والی تمراج کا دھیانت ہو چکا تھا۔ اس کی جگہ اس کا بیٹا رام راج گدی نشیں ہوا تھا۔ بیجانگر کے امرا و روٴسا اس کی آمرانہ حکومت کے آگے سر تسلیم خم کرنے سے انکار کر رہے تھے۔ اس کے سبب بیجانگر اور اس کے قرب و جوار کا علاقہ میدان کارزار بنا ہوا تھا۔ ارد گرد کے راجا آئے دن اس پر چڑھائی کرتے رہتے تھے۔

بیجانگر کی اس افراتفری کو دیکھتے ہوئے اسمٰعیل عادل شاہ کو "مدگل" اور "رائچور" کے وہ قلعے یاد آئے جو اس کے ہاتھ سے چلے گئے تھے۔ یہ موقع اچھا تھا۔ بیجانگر کی افراتفری سے فائدہ اٹھا کر انہیں فتح کیا جا سکتا تھا۔ اس نے اس فتح کے لیے امیر برید کا انتخاب کیا کہ وہ جائے اور عادل شاہی فوج کی مدد سے ان قلعوں کو فتح کرے۔

امیر برید نے عادل شاہی افواج کو ساتھ لے کر رائچور کے قلعے پر چڑھائی کر دی۔ کرشنا دریا کو بہ آسانی کیا اور قلعے پر قابض ہو گیا۔

اس قلعے پر ستر سال سے غیر مسلم قابض تھے۔ یہ ایسی فتح تھی جس نے اسمٰعیل شاہ کا شمار جلیل بادشاہوں میں کر دیا۔ اس خوشی میں اس نے ایک محفل منعقد کی اور بہت دن بعد شراب کو ہاتھ لگایا۔ علاؤالدین عماد شاہ بھی اس محفل میں شامل تھا۔ اسد خاں لاری اعزاز ملا کہ بادشاہ نے خود اپنے ہاتھ سے تین جام بھر کر کیے اور اپنے پاس بٹھایا اور فرزند شاہ کا خطاب عطا کیا۔

جب محفل سرور و کیف میں ڈوب گئی تو عماد شاہ امیر برید کی یاد آئی۔ اس نے سوچا کہ اگر وہ بھی اس محفل میں آجائے تو اسمٰعیل عادل شاہ کا دل اس کی طرف سے بھی صاف ہو جائے۔

"اگر اس رنگین محفل میں قاسم برید بھی شامل ہوتا اچھا ہوتا۔ بے چارے کی اب عمر ہی کتنی رہ گئی ہے وہ اس محفل سے لطف اندوز ہوتا اور آپ کا احسان مند ہوتا۔"

اسمٰعیل شاہ نے اس درخواست کو قبول کیا امیر برید کو طلب کر لیا گیا۔ ساقی نے شراب کا جام اسے پیش کیا۔

بادشاہ نے اس موقع پر عربی کی ایک ضرب المثل دہرائی جس کا ترجمہ تھا "ان میں سے چوتھا کتا ہے۔" اس کے اس جملے کو سن کر عماد شاہ تو لطف اندوز ہوا لیکن چونکہ امیر برید ہی چوتھا تھا اس لیے وہ اس لطیفے سے لطف اندوز نہ ہو سکا اور بے اختیار رونے لگا۔ اسمٰعیل عادل شاہ کو اسے رنجیدہ دیکھ کر ملال ہوا اور احساس ہوا کہ لطیفہ اس نے غلط جگہ بیان کر دیا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر امیر برید کے پاس آیا۔

"تمہارا جو میں نے دل دکھایا ہے اس کا ازالہ اسی طرح ہو سکتا ہے کہ احمد آباد بیدر میں تمہاری تحویل میں دے دوں۔ اب تو خوش ہو؟"

امیر برید کے چہرے پر ہنسی آگئی۔

امیر برید بلا کا احسان ناشناس تھا۔ بیدر کا شہر اس کی تحویل میں چلا گیا تو اس نے پھر کل پرزے نکالے اور اپنی اصلیت دکھائی۔

جس وقت امیر برید کو معافی دی گئی تھی، اسے یہ حکم بھی دیا گیا تھا کہ وہ "قلعہ ماہور" فتح کر کے علاؤ الدین عماد

شاہ کے حوالے کر دے۔ اب وہ سن رہا تھا کہ امیر برید نے قلعہ فتح کر لیا لیکن چابی ابھی تک ارسال نہیں کی تھی۔

اسمٰعیل عادل شاہ، والیٔ برار عماد شاہ کے دولت خانے پر جلوہ افروز تھا۔ قیام میزبانی میں عماد شاہ نے اپنی شان دکھانے کے لیے ہیرے اور جواہرات سے بھری ہوئی کشتیاں اس کے سامنے پیش کیں اور بڑے فخر سے اپنی امارت کا تذکرہ کیا۔

"میں نے اتنی دولت جمع کر لی ہے کہ کوئی حکمران میری طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھ سکتا۔ میں جس کو چاہوں خرید سکتا ہوں۔ بہمنی بادشاہوں کے پاس بھی اتنی دولت نہیں ہوگی جتنی میرے پاس ہے۔"

اسمٰعیل شاہ متاثر تو کیا ہوتا، عماد شاہ کی شیخی سے اسے کوفت ہوئی۔ اس نے یہ بات دل میں رکھ لی اور کسی مناسب موقع کا انتظار کرنے لگا۔

کچھ ہی عرصے بعد عماد شاہ نے اسمٰعیل عادل شاہ کے یہاں قیام کیا۔ اسمٰعیل عادل شاہ کو موقع نصیب ہو گیا تھا۔ اس نے عماد شاہ کی خاطر تواضع کے لیے ایک مجلس منعقد کی۔ دو ہزار مغلوں کی فوج نے مع تمام آلات جنگ عماد شاہ کو سلامی دی۔

سلامی لینے کے بعد دونوں ہاتھ میں ہاتھ ڈالے اپنی مسند تک آئے۔

"میں نے اپنی حکومت کے درمیان جو کچھ پایا یہی فوج کے جوان ہیں۔ میرے پاس ہیرے جواہرات سے بھری ہوئی کشتیاں نہیں ہیں لیکن رستم اور اسفند یار سے زیادہ بہادر سپاہیوں پر مشتمل یہ فوج ہی میرا سرمایہ ہے۔"

عماد شاہ فوراً سمجھ گیا کہ اسمٰعیل عادل شاہ کا یہ جواب میری بے پناہ دولت کے جواب میں ہے۔ اب وہ شرمندہ تھا۔

"آپ نے ٹھیک کہا۔ بادشاہوں کی دولت تو یہ فوج ہوتی ہے۔ آپ کی فتوحات ان فوجوں ہی کی مرہون منت ہیں۔ اگر میں بھی ہیرے جواہرات جمع کرنے کے بجائے ایسی فوج جمع کرتا تو ماہور کا قلعہ میرے ہاتھ سے نہ نکلتا۔"

"قلعہ ماہور کی فتح کا بندوبست میں نے کر دیا تھا لیکن یہاں بھی امیر برید میرے آڑے آرہا ہے۔ آپ کی سفارش پر میں نے اسے معاف کر دیا اور اپنے امیروں میں جگہ دی، یہی میری غلطی تھی۔"

"آپ نے بیدر اس کے حوالے کر کے دوسری غلطی کی۔"

"وہ سخت احسان ناشناس ہے۔ اب سنا ہے برہان نظام شاہ سے تعلقات استوار کر رہا ہے۔"

"وہ سلطان بہادر گجراتی سے معرکوں میں الجھا ہوا ہے۔ امیر برید کی مدد کو نہیں آئے گا۔"

"میرے احسانات برہان نظام شاہ پر بھی ہیں لیکن وہ بار بار امیر برید کی طرف جھک جاتا ہے۔"

"آپ اسے کم از کم دو مرتبہ شکست دے چکے ہیں۔ یہ بات وہ بھولا نہیں ہے۔ کسی وقت بھی بدلہ لے گا۔ ہوشیار رہیے گا۔"

"میں مقابلوں سے نہیں سازشوں سے ڈرتا ہوں۔ برہان نظام شاہ بار بار ان سازشوں کا حصہ بن جاتا ہے۔ اب سلطان بہادر گجراتی سے پینگیں بڑھا رہا ہے یا ایک دن یہ حال تھا کہ بہادر گجراتی سے لڑنے کے لیے مجھ سے مدد مانگی تھی۔ افسوس کہ وہ رشتہ داری کا خیال میں نہیں کرتا۔"

"اگر ان تینوں کا اتحاد ہو رہا ہے تو اہل دکن کے لیے بہت برا ہے۔"

"میں اس گٹھ جوڑ کا جواب دینے کے لیے ہر وقت تیار ہوں۔ بہت جلد آپ کو آپ کا قلعہ ماہور مل جائے گا۔"

"اس کے لیے آپ معرکہ آرائی سے کام لیں گے؟"

"مجھے امید ہے امیر برید ذرا سی سختی سے قابو آجائے گا۔"

دونوں حکمرانوں نے یہ اور دوسری باتیں کیں۔ علاؤ الدین شاہ لطف میزبانی سے فیض یاب ہونے کے بعد روانہ ہو گیا۔

اسمٰعیل شاہ کی طرف سے تقاضے بڑھنے لگے تھے۔ امیر برید کو اب شک ہو گیا تھا کہ وہ اس کے خلاف کوئی نہ کوئی کارروائی ضرور کرے گا۔ اس نے پیش بندی کے طور پر ایک قاصد برہان نظام شاہ کی طرف دوڑایا تاکہ وہ تمام صورت حال سے اسے آگاہ کرے۔

اس مرتبہ بھی برہان نظام شاہ پر امیر قاسم کا جادو چل گیا۔

جب امیر برید نے گھروں اور قلعہ کی چابی اسمٰعیل عادل شاہ کو ارسال نہیں کی تو اس نے قلعہ قندھار اور کلیان پر چڑھائی کرنے کا قصد کر لیا۔ قصد کرتے ہی سراپردہ شاہی اور دہلیز کو بیجاپور سے باہر روانہ کر دیا۔

ابھی سراپردہ روانہ ہوا تھا کہ نظام شاہ کا پیغام بر دربار میں حاضر ہوا۔ نظام شاہ نے پیغام بھجوایا تھا جسے بر سر دربار پڑھا گیا۔

''تمہیں بیجاپور سے نکلنے کی ضرورت نہیں ہے۔ امیر قاسم سے میرے تعلقات بہت اچھے ہیں اس لیے اس پر چڑھائی کا ارادہ ملتوی کر دو۔''

اسمٰعیل عادل شاہ کو اس کا یہ پیغام سخت ناگوار گزرا لیکن پھر بھی اس نے نہایت شائستگی سے جواب دیا۔

''میں آپ سے رشتہ داری کا خیال کرتے ہوئے آپ کی سفارش کو منظور کرتا ہوں۔ موسم سرما کا آغاز ہے۔ گھر میں طبیعت گھبراتی ہے۔ سلطنت کی سرحدیں ملاحظہ کرنے کے لیے نکل رہا ہوں۔ آپ یا آپ کا کوئی رئیس دل میں کسی قسم کا شک نہ لائے۔ میں جنگ کے لیے نہیں سیر و تفریح کے لیے نکل رہا ہوں۔''

اسمٰعیل عادل شاہ نے اپنا جواب قاصد کے حوالے کیا اور خود بیجاپور سے نکل گیا۔ وہ بہمن علی کے مقام پر تھا کہ اسے ایک مرتبہ پھر برہان نظام شاہ کا نہایت تذلیل آمیز پیغام موصول ہوا۔

''تمہیں میرے حکم کی خلاف ورزی نہیں کرنی چاہیے۔ بیجاپور سے ہرگز نہ نکلو۔ گھر میں آرام کرنا بہتر ہے۔ اب جو میری شان اور مرتبہ ہے اس کے پیش نظر تمہارے لیے مناسب نہیں کہ حال اور مستقبل کو ماضی کی طرح بے کار سمجھو بہادر شاہ گجراتی مجھ پر مہربان ہے لہٰذا میرے لیے یہی بہت ہے۔''

اس نے نظام شاہ کے قاصد کو اس پیغام کے ساتھ رخصت کیا۔

''اپنے آقا سے کہنا، اس وقت سے ڈرو جب اسمٰعیل عادل شاہ دلاوری کے مقام جنگ کی طرح ایک مرتبہ پھر اپنی نیزہ بازی، تلوار اور تیروں کے کرشمے ظاہر کرے۔''

اس پر بھی اس کا غصہ ٹھنڈا نہیں ہوا تو نظام شاہ کے نام ایک خط لکھ کر قاصد کے حوالے کر دیا۔

''آج تک تم نے کبھی ایسا سلوک نہیں کیا تھا۔ کیا تم نے احمد نگر کے گزشتہ واقعات کو فراموش کر دیا ہے جو ایسی نازیبا اور ناشائستہ تحریر مجھے لکھی ہے۔ اگر مندر کے بادشاہوں کے استعمال شدہ اور پرانے چتر اور سراپردہ کو حاصل کر کے تم مغرور ہو گئے ہو تو تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ یہ نشہ بالکل بے کیف ہے اور اگر خطاب شاہی سے اپنے آپ کو کوئی چیز سمجھنے لگے ہو تو یقین رکھو یہ سب کچھ وہم و گمان ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ فخر مجھے تم سے زیادہ حاصل ہے۔ تمہیں تو گجراتیوں کے بادشاہ نے یہ خطاب دیا ہے، جبکہ مجھے شہنشاہِ ایران نے جو ایک عالی نسب سید ہے یہ مرتبہ عطا کیا ہے۔

تم اپنی حرکتوں سے باز آجاؤ تمہاری بہتری اسی میں ہے، ورنہ نتائج کی ذمے داری تم پر ہوگی۔ میں ننگی تلوار ہاتھ میں لیے میدان جنگ میں موجود ہوں۔ ذرا باغ نظام سے باہر نکلو میرے مقابلے پر آؤ پھر تمہیں عادل شاہی بہادروں کی جوانمردی کا علم ہو۔''

یہ خط ہی ایسا تھا کہ برہان نظام شاہ جیسا بیٹھا تھا ویسے ہی اٹھ کھڑا ہوا۔ حکم دیا کہ سراپردۂ شاہی کو باہر نکالا جائے۔ دوسرے دن وہ خود باہر آیا اور موضع احمد پور پہنچ کر رک گیا۔ اس کے امرا اور سپہ سالار فوج بھی وہاں پہنچ گیا۔ لشکر کی فراہمی کے لیے کوششیں شروع کر دیں۔

جب فوج اس کے حسب منشا فراہم ہو گئی تو وہ وہاں سے نکلا اور عادل شاہی سرحد کی طرف روانہ ہوا۔ اسمٰعیل عادل شاہ بھی بے فکر نہیں بیٹھا ہوا تھا۔ بیجاپور وہ پہلے ہی چھوڑ چکا تھا۔ اپنی سرحدوں پر چوکس کھڑا تھا۔ اسد خان لاری کی رہنمائی میں اپنے تمام سپاہیوں کو مقرر کیا اور فریقین میں ایک خونریز معرکے کا آغاز ہو گیا۔

دونوں طرف کے جوان اس عزم کے ساتھ لڑ رہے تھے کہ اس جنگ کے بعد کوئی دوسری جنگ نہیں ہوگی۔ دونوں طرف کے سپاہیوں کے خون سے زمین لالہ زار ہو گئی۔ مورخین لکھتے ہیں کہ اس سے پیشتر تاریخ میں کوئی ایسی لڑائی نہیں ہوئی تھی۔

لڑائی اپنے عروج پر تھی۔ سورج اس منظر کو دیکھ دیکھ کر تھک چکا تھا اور اب ڈھلنے لگا تھا کہ نظام شاہی خاندان کا ایک نامی گرامی امیر خورشید خان مارا گیا۔ اس کے مرتے ہی نظام شاہ کی فوج کے قدم اکھڑ گئے۔ برہان نظام شاہ دشمنوں کے درمیان تلوار بازی کے جوہر دکھا رہا تھا لیکن اس کی فوج حوصلہ ہار چکی تھی۔ صاف نظر آرہا تھا کہ اگر نظام شاہ ضد پر اڑا رہا اور میدان سے نہ نکلا تو اس کی جان کو نقصان پہنچے گا۔

دھول مٹی کی چادر ہٹاتا ہوا اس کا ایک امیر شیخ جعفر اس کے قریب پہنچا۔

''حضور، نقشہ پلٹ چکا ہے۔ اب ہماری فوج ہمارے اختیار میں نہیں۔ اس وقت میدان چھوڑ دینا ہی مصلحت ہے۔''

''شیخ جعفر، تم مجھے بزدلی کا سبق سکھانے آئے ہو۔ میں ہرگز میدان نہیں چھوڑوں گا۔''

''حضور، آپ اکیلے کچھ نہیں کر سکتے۔ آپ کی بہادری پر کسی کو شبہ نہیں لیکن دوسری طرف باحوصلہ لشکر ہے۔ اگر آپ زندہ رہیں گے تو انتقام کے بہت سے مواقع آئیں گے۔ میری بات مانیے اور اس وقت میدان سے نکل جائیے۔''

''میں اپنے آپ سے یہ کہہ کر آیا تھا کہ فتح اپنے نام لکھوا کر لاؤں گا یا شہید ہو جاؤں گا۔ اب تک اسی فیصلے پر قائم ہوں۔'' شیخ جعفر پیچھے ہٹ گئے لیکن دوسرے سلاحداروں کو لے کر ایک مرتبہ پھر اس کے پاس پہنچے۔ اسے مجبور کر کے میدان سے باہر لائے۔ اس وقت تک تین ہزار سپاہی اس معرکے میں کام آچکے تھے۔ برہان نظام شاہ نے بہت سے گھوڑے، ہاتھی اور جنگی ساز و سامان جو استعمال ہونے سے بچ گیا تھا وہیں چھوڑا اور احمد نگر کا رخ کیا۔

اس شکست نے اس کے اعصاب اور ذہن پر بہت برا اثر ڈالا۔ اس کے امرا کو اپنی سازشیں بروئے کار لانے کا موقع مل گیا۔ اس کا ایک امیر شاہ طاہر تھا۔ اس نے خاص طور پر کلیدی کردار ادا کیا۔ اسمٰعیل عادل شاہ اور شاہ طاہر ہم مسلک تھے۔ یوسف عادل شاہ نے بھی شاہ طاہر کی کوششوں سے اس کا مسلک اختیار کر لیا اور شاہ طاہر کو بات بڑھانے میں آسانی ہوئی۔

''یوسف عادل شاہ اور اس کے بیٹے کی فتوحات کا اصل سبب ان کا مسلک تھا جس کے پیروکاران ساتھ دیتے رہے۔ اگر آپ بھی اپنے مسلک کو ریاستی درجہ دے دیں تو اس کی برکتیں آپ کو ملیں گی۔ اس کے علاوہ یہ فائدہ بھی پہنچے گا کہ شہنشاہ ایران کی ہمدردیاں بھی ساتھ ہو جائیں گی۔''

شاہر طاہر کی مسلسل کوششوں سے برہان نظام شاہ نے اس کی بات مان لی۔

پرجا تو راجا کے پیچھے ہوتی ہے۔ بادشاہ نے جو مسلک اختیار کیا، شاہی خاندان کے بہت سے افراد نے اس کی تقلید کی لیکن اس کے ساتھ بھی وہی ہوا جو یوسف عادل شاہ کے ساتھ ہوا تھا۔ اس کے امرا میں سے بہت سے اس کے خلاف ہو گئے۔ عوام میں بھی بے چینی بڑھ گئی۔ اس صورت حال کو دیکھ کر شاہ طاہر نے اسے مشورہ دیا کہ دونوں مکاتب فکر کے علما کو جمع کرے اور ان کے درمیان مناظرہ کرائے۔ اس سے عوام بھی مطمئن ہو جائیں گے کہ بادشاہ نے تحقیق اور غور و فکر کے بعد کوئی فیصلہ کیا ہے۔

برہان نظام شاہ نے شاہ طاہر کے مشورے پر عمل کیا اور احمد نگر کے تمام علما کو طلب کیا۔ یہ مناظرہ چھ مہینے تک چلتا رہا لیکن بے نتیجہ رہا۔

جب کامل چھ مہینے گزر گئے اور علما کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکے تو بادشاہ کو یقین ہو گیا کہ دونوں ہی مسلک درست ہیں جس کا جو جی چاہے اختیار کر لے۔ بادشاہ نے مجلس ختم کی اور ہر شخص کو مذہبی آزادی دے دی تاکہ مملکت انتشار کا شکار نہ ہونے پائے۔

برہان نظام نے شاہر طاہر کی منشا کے مطابق خطبہ پڑھوایا۔ سفید چتر جو اسے بہادر شاہ گجراتی کی طرف سے عطا ہوا تھا اس کا رنگ سبز کر دیا۔

عوام کا ایک بڑا طبقہ برہان نظام اور شاہ طاہر کے خلاف ہو گیا۔ شہر میں ہنگامے برپا ہونے لگے ہر شخص مسلک کے حوالے سے حساس تھا۔

ایسے میں ایک جماعت عالم پیر محمد کے گھر پہنچی اور شاہ طاہر کی شکایت کی۔ پیر محمد نے ان کی بات سن کے جواب دیا۔ ''دیکھو بھائی، یہ باتیں سمجھانے کی نہیں ہوتیں۔ ہر شخص کو اپنا مذہب عزیز ہوتا ہے۔ اگر اسے قائل کر بھی لو تو وہ اپنا عقیدہ نہیں چھوڑتا۔ ہم نے چھ مہینے تک بے نتیجہ بحث کی اور کچھ حاصل نہ ہوا۔ اب بادشاہ کو کیسے مجبور کیا جائے کہ وہ شاہ طاہر کی باتوں میں نہ آئے۔ آپ لوگ بادشاہ کے قریب رہتے ہیں آپ ہی کچھ سمجھا سکتے ہیں۔''

''بادشاہ کو تو اسی وقت سمجھایا جا سکتا ہے جب شاہ طاہر درمیان میں نہ ہو۔''

''یہ تو بہت مشکل ہے۔ بادشاہ کو یہ کیسے سمجھایا جائے کہ وہ شاہ طاہر سے نہ ملے۔''

''اب ایک ہی صورت ہے۔'' ایک امیر نے جذباتی ہوتے ہوئے کہا۔ ''شاہ طاہر کو قتل کر دیا جائے۔ نہ رہے گا بانس نہ بجے گی بانسری۔''

دوسرے امرا نے بھی اس کی تائید کی لیکن ملا پیر محمد نے اختلاف کیا۔

''برہان نظام شاہ کے ہوتے ہوئے شاہ طاہر کو قتل کرنا ممکن نہیں ہے اور اگر تم لوگ ایسا کر بھی گزرے تو بادشاہ کے انتقام سے کوئی نہیں بچ سکے گا۔ یہ سمجھ لو۔''

''پھر آپ ہی کوئی تدبیر بتائیں۔''

''میرا خیال تو یہ ہے کہ ہم پہلے برہان نظام شاہ کو معزول کریں اور اس کی جگہ شہزادہ عبدالقادر کو اپنا بادشاہ بنائیں۔ اس کے بعد شاہ طاہر کو موت کے گھاٹ اتار دیں۔''

یہ تجویز منظور تو کر لی گئی تھی لیکن اس پر عمل درآمد اتنا آسان نہیں تھا۔ ابھی فوج سے بھی کچھ لوگوں کو ہموار کرنا تھا۔

ملا پیر محمد کا مکان، ہیڈ کوارٹر بن گیا۔ نہایت رازداری سے یہ سازش آگے بڑھتی گئی۔ ہر رات یہاں لوگ جمع ہوتے تھے اور نئی نئی تجاویز پیش کی جاتی تھیں۔

اس سازش کی بڑی کامیابی یہ تھی کہ آخر وقت تک کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو سکی۔

یہ راز تو اس وقت کھلا جب ملا پیر محمد بارہ ہزار سواروں

اور پیادوں کو اپنے ساتھ لے قلعے کے دروازے کے سامنے آگیا اور قلعے کے محاصرے کی تیاریاں کرنے لگا۔

بغاوت کی خبریں اندر پہنچیں تو سراسیمگی پھیل گئی۔ بادشاہ نے فوراً حکم دیا کہ قلعے کے دروازے بند کردیے جائیں۔ دوسرا حکم یہ جاری کیا کہ برجوں پر فوج چڑھ جائے اور گولہ باری کرکے باغیوں کو نیست و نابود کردے۔ یہاں بھی ملا پیر محمد کے حمایتی موجود تھے۔ انہوں نے بادشاہ کے حکم کے مطابق گولہ باری کی ضرور لیکن جان بوجھ کر گولوں کو ادھر ادھر پھینکتے رہے۔

جب معاملے نے طول کھینچا تو بادشاہ نے شاہ طاہر کی طرف توجہ کی۔

''شاہ صاحب، آپ علم نجوم میں بڑی مہارت رکھتے ہیں۔ ذرا بتایئے تو اس ہنگامے کا نتیجہ کیا ہوگا اور اس سے کس طرح نمٹا جائے۔'' شاہ طاہر نے فوراً حساب لگا کر بادشاہ کو مشورہ دیا۔

''میرا حساب تو یہ کہتا ہے کہ قلعے کا مشرقی دروازہ کھول کر دشمن پر حملہ کرنا چاہیے۔ انشااللہ دشمن حواس باختہ ہوکر بھاگ جائے گا اور بادشاہ کو فتح حاصل ہوگی۔''

برہان نظام نے مشرقی دروازہ کھلوایا اور چار سو سواروں، ایک ہزار پیادوں اور پانچ ہاتھیوں کو ساتھ لے کر قلعے سے باہر نکلا۔

شاہ طاہر بھی ساتھ تھا۔ اس نے مٹھی بھر خاک اٹھائی۔ اس پر کچھ پڑھا اور یہ مٹھی دشمن کے رخ پر اچھال دی۔

''اب آپ کسی قاصد کو دشمن کی طرف بھیجیں اور عام منادی کرادیں کہ جو شخص بادشاہ کا فرماں بردار ہے وہ بادشاہ کی طرف آجائے اور جو غدار ہے وہ ملا پیر محمد کے ساتھ رہے۔ سلطانی غضب سے پامال ہونے کے لیے تیار ہوجائے۔''

قاصد کو بھیجا گیا۔ اس نے یہ اعلان کر دیا۔ اس اعلان میں نہ جانے کیا تاثیر تھی کہ ملا پیر محمد کے ہمراہ جتنے ساتھی تھے سب کے سب بادشاہ کی طرف آگئے۔

ملا پیر محمد اپنے چند مخصوص ساتھیوں کے ساتھ اپنی جگہ کھڑا رہ گیا۔

اب اس کے ہاتھ میں کیا رہ گیا تھا۔ اس نے گردن جھکالی۔ وہ گنتی کے ساتھیوں کے ساتھ اپنے مکان کی طرف چلا گیا۔ کمال یہ بھی ہوا کہ عام لوگ جو کئی دن سے ہنگامہ کر رہے تھے ملا پیر محمد کی حمایت میں گھر سے باہر تک نہیں نکلے۔

پیر محمد ابھی گھر پہنچے ہی تھے کہ احمد تبریزی اور خواجگی محمود ان کے گھر پہنچے اور انہیں گرفتار کرلیا۔

ملا پیر محمد کو بادشاہ کے حضور پیش کیا گیا۔

''آپ نے ہمارے خلاف ہماری رعایا کو اکسایا؟''

''میں نے کسی کو نہیں اکسایا۔ وہ آپ سے باغی ہوچکے ہیں۔''

''قلعے کے دروازے پر تو آپ آئے تھے۔''

''مجھ سے میرے ایمان کا یہی تقاضا تھا۔''

''اگر یہ آپ کی انفرادی حرکت تھی تو ہم اسے ا... خلاف بغاوت سے تعبیر کرنے میں حق بجانب ہیں۔''

''آپ جو بھی سوچیں۔ میں تو آپ کو راہ راست ... لانا چاہتا تھا۔''

''کیوں نا اس جرم کی پاداش میں آپ کو قتل کر... جائے۔''

''میں سمجھوں گا مجھے میری منزل مل گئی۔''

برہان نظام نے ملا پیر محمد کے قتل کا حکم جاری کر... لیکن پھر شاہ طاہر کی سفارش پر اسے ایک قلعے میں نظ... کر دیا گیا۔

☆☆☆

ایک سوار بے اختیار دوڑتا چلا جارہا تھا۔ اس کا ... بے جاپور کی سرحد کی طرف تھا۔ بہت سے دیکھنے والوں ... دیکھا۔ یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ اس قسم کے قا... اکثر سرحدوں پر منڈلاتے نظر آتے تھے۔

یہی قاصد جب بے جاپور میں داخل ہوا تو بھی لوگو... نے یہی سمجھا کہ کسی ریاست سے کوئی قاصد آیا ہوگا۔ محل ... دروازے پر پہنچ کر قاصد کو اپنی شناخت کرانی پڑی۔ محا... اس کے احترام میں تقریباً زمیں بوس ہوگئے تھے۔ اگر برہا... نظام شاہ خود بھی آگیا ہوتا تو یہ احترام دیکھنے میں نہ آیا ہو... لیکن یہ تو اسمٰعیل عادل شاہ کی بہن مریم سلطانہ تھی جو ا... وقت مردانہ لباس میں تھی لیکن چہرے پر آدھی نقاب تھی۔

وہ اسمٰعیل عادل شاہ کے سامنے پہنچی تو وہ بھی ا... دیکھ کر حیران رہ گیا۔

''مریم، تم اور اس حلیے میں۔ یہ طویل سفر۔ آخر ا... کیا افتاد پڑی ہے تم پر؟''

''جنگ مرد لڑتے ہیں لیکن عورتیں جنگ رکوا تو سک... ہیں۔''

''کیا مطلب ہے تمہارا؟''

''برہان نظام شاہ اور آپ کے درمیان تین جنگیں

ہوچکیں جو اس لحاظ سے بے نتیجہ ہی رہیں کہ آپ اپنے علاقے میں لوٹ آئے، برہان شاہ اپنے وطن کو لوٹ گئے۔ ایک فاتح ہوا دوسرا مفتوح۔ اب یہ سلسلہ رک جانا چاہیے۔''

''تم صرف یہ کہنے کے لیے تنہا چلی آئیں۔ اس کام کے لیے تو برہان شاہ کسی قاصد کو بھی بھیج سکتے تھے۔''

''میں ان کی فرستادہ نہیں۔ انہیں تو شاید یہ معلوم بھی نہ ہوگا کہ اس وقت میں کہاں ہوں۔''

''تم محل سے غائب رہو گی اور اسے معلوم ہی نہ ہوگا؟''

''وہ اس وقت سیر و شکار کے لیے نکلے ہوئے ہیں۔ ایک مہینے سے پہلے واپسی نہیں ہوگی۔''

''تمہارے آنے کا مقصد؟''

''نظام شاہی اور عادل شاہی خاندان میں دوستی کا نیا آغاز۔''

''تم گواہ ہو کہ میں نے ہمیشہ یہی کوشش کی ہے۔ اب بھی یہی چاہتا ہوں لیکن برہان شاہ ہمیشہ رکاوٹ بنارہا ہے۔ اگر وہ چاہتا تو تمہاری جگہ وہ آیا ہوتا۔''

''اب جبکہ اس نے اپنا مسلک تبدیل کرلیا ہے۔ یہ دوستی اور بھی ضروری ہوگئی ہے۔''

''وہ اس دوستی پر تیار ہے؟ تم تو کہہ رہی ہو تم اسے بتا کر ہی نہیں آئی ہو۔''

''احمد آباد میں ایسے لوگ موجود ہیں جو برہان شاہ کو سمجھا سکتے ہیں۔ شاہ طاہر موجود ہیں جنہیں بیچ میں ڈالا جاسکتا ہے۔ میں تو آپ سے بات کرنے آئی تھی کہ اگر آپ تیار ہیں تو میں اپنی سی کوشش کروں؟''

''میں نے ہمیشہ یہ چاہا ہے کہ علاقے میں امن ہوجائے۔''

''بس مجھے آپ کی رضامندی چاہیے تھی۔''

مریم سلطانہ نے چند روز بھائی کی میزبانی کا لطف اٹھایا اور پھر احمد آباد روانہ ہوگئی۔

برہان شاہ بہ دستور احمد آباد سے باہر تھا۔ مریم سلطانہ نے امرا کا اجلاس طلب کیا۔ اس نے یہ نہیں بتایا کہ وہ کہاں سے ہوکر آئی ہے لیکن یہ ضرور کہا کہ اگر مصالحت کی کوئی راہ نکلی تو وہ اپنے بھائی کو آمادہ کرلے گی۔ امرا نے متفق آواز میں اس کی تائید کی لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ بادشاہ کو آمادہ کرنے کے لیے ان افراد کو درمیان میں ڈالا جائے جن سے بادشاہ عقیدت رکھتا ہے تاکہ وہ ان کی بات ٹال نہ سکے۔ ان میں سے ایک تو شاہ طاہر تھے جن کی کوئی بات بادشاہ ٹالتا

قرآن مجید

س: قرآن مجید کے حروف کی کل تعداد کتنی ہے؟

ج: تین لاکھ تیس ہزار چھ سو اکہتر۔

س: ہر پارے میں کتنے رکوع ہوتے ہیں؟

ج: ایک پارہ میں پندرہ سے بیس تک رکوع ہوتے ہیں۔

س: ایک رکوع میں کتنی آیات ہوتی ہیں؟

ج: ایک رکوع میں کم و بیش دس آیات ہوتی ہیں۔

س: پورے قرآن مجید میں رکوع کی تعداد کتنی ہے؟

ج: پانچ سو چالیس۔

س: قرآن مجید کی دلہن کس سورۃ کو کہتے ہیں؟

ج: سورۃ الرحمن۔

س: قرآن مجید کی کون سی سورۃ کے آغاز میں بسم اللہ نہیں ہے؟

ج: سورۃ توبہ۔

س: قرآن مجید کی کون سی سورۃ میں دو مرتبہ بسم اللہ آئی ہے؟

ج: سورۃ النمل۔

س: آیت کے معنی کیا ہیں؟

ج: آیت کے لغوی معنی نشانی ہیں۔

س: سورۃ کے معنی کیا ہیں؟

ج: سورۃ کے معنی عربی زبان میں رفعت وعظمت کے ہیں۔

س: البقرہ سے والناس تک قرآن مجید کی سورتوں کی تعداد کتنی ہے؟

ج: ایک سو چودہ۔

قیصر خان کی معلومات گھوٹکی سے

نہیں تھا، لیکن مصیبت یہ تھی کہ شاہ طاہر اس وقت موجود نہیں تھے۔ بادشاہ کے ساتھ گئے ہوئے تھے۔

مریم سلطانہ نے اس وقت نہایت بردباری اور ذہانت کا مظاہرہ کیا۔ اس نے شاہ ایران کو خط لکھ کر تمام حالات سے آگاہ کیا اور یہ بھی لکھا کہ وہ اپنا کوئی نمائندہ برہان شاہ سے بات کرنے اور اسے سمجھانے کے لیے یہاں بھیج دیں۔

برہان شاہ سیر وشکار سے واپس آیا تو ایرانی نمائندے شیخ احمد نجفی کو محل میں مہمان دیکھا۔ اسے تعجب ہوا کہ ایرانی نمائندہ اس سے ملاقات کے لیے کیوں آیا ہے۔

شیخ احمد نے یہ بہانہ کیا کہ شاہ اسمٰعیل صفوی نے تبدیلی مذہب پر مبارکباد دینے کے لیے اسے بھیجا ہے۔ بادشاہ کے لیے اس سے زیادہ خوشنودی کی بات کیا ہو سکتی تھی۔

شیخ احمد نے باتوں باتوں میں اسمٰعیل عادل شاہ کا تذکرہ چھیڑ دیا۔ اس نے دیکھا کہ عادل شاہ کا نام آتے ہی برہان شاہ کا چہرہ متغیر ہو گیا۔

''حضرت صفوی یہ چاہتے ہیں کہ آپ میں اور عادل شاہ میں مضبوط رشتہ اتحاد قائم ہو جائے۔''

''اس نے بار بار حملہ آور ہو کر یہ موقع ہاتھ سے نکال دیا ہے۔''

''اسے سمجھایا جا سکتا ہے۔''

''یہ ضمانت کون دے سکتا ہے کہ موقع ملتے ہی وہ اپنی اصلیت پر اتر نہیں آئے گا؟''

''اس مرتبہ آپ کے اور اس کے درمیان اکیلے مصالحت نہیں ہوگی بلکہ دونوں جانب سے با اثر افراد ضمانت لیں گے۔''

برہان شاہ کے دل پر شکست کے زخم تازہ تھے۔ حالانکہ ایک سال گزر چکا تھا۔ وہ مصالحت کا نہیں بلکہ انتقام کا راستہ تلاش کر رہا تھا لیکن جب اس نے دیکھا کہ شاہ طاہر بھی یہی مشورہ دے رہے ہیں تو اس نے سر نیاز جھکا دیا۔

شیخ احمد اور شاہ طاہر یہاں سے بیجاپور گئے اور اسمٰعیل عادل شاہ کو بھی آمادہ کر لیا۔

احمد آباد اور بیجاپور کی سرحدوں پر جشن کا سماں تھا۔ خیمے آراستہ کر دیے گئے تھے۔ ہاتھی کھڑے جھوم رہے تھے۔ دونوں طرف کی فوجیں اپنی اپنی سرحدوں کے اندر کھڑی تھیں لیکن آج ان کے درمیان جنگ نہیں تھی۔ ہتھیار ضرور تھے لیکن انہیں چلنا نہیں تھا۔

سب سے پہلے اسمٰعیل عادل شاہ اپنے خیمے سے نکلا اور برہان شاہ کے خیمے میں آیا۔ دونوں بغل گیر ہوئے اور عہد کیا کہ آئندہ دونوں دوست بن کر رہیں گے۔ اس کے بعد برہان شاہ بیجاپور کی سرحد میں داخل ہوا اور عادل شاہ کے خیمے میں جا کر بیٹھا۔ عادل شاہ نے ضیافت کا انتظام کیا تھا۔ امرا اکابرین اس میں شریک ہوئے۔ یہاں جو باتیں ہوئیں ان میں ایک یہ بھی تھی کہ قلی قطب شاہ کے وہ علاقے جو سلطان محمد شاہ نے اسے عطا کیے تھے انہیں فتح کر کے عادل شاہی اور نظام شاہی خاندان ایک دوسرے کے شریک کار اور ہمدرد ہو جائیں۔

برہان شاہ، قلی قطب شاہ سے اس لیے پرخاش رکھتا تھا کہ جس زمانے میں بہادر شاہ گجراتی نے برہان شاہ پر حملہ کیا تو قلی قطب شاہ نے بہادر شاہ گجراتی کا ساتھ دیا تھا۔ اسمٰعیل عادل شاہ کے دل میں اس لیے کدورت تھی کہ قلی قطب شاہ امیر برید کے کہنے پر عادل شاہ کے خلاف نبرد آزما ہوا تھا۔

قلی قطب شاہ ترک تھا۔ سلطان محمد شاہ کے عہد میں دکن آیا اور محمد شاہ کے ترکی غلاموں کے گروہ میں شامل ہوا۔ وہ علم حساب میں بڑی مہارت رکھتا تھا اور نہایت خوش [illegible] تھا۔ لہٰذا اسے شاہی محلات کا حساب نویس مقرر کر دیا گیا۔ پھر وہ برابر ترقی کرتا رہا۔ اس کی ترقی نے اس وقت رفتار پکڑی جب اسے تلنگانہ کی خدمت پر مامور کیا گیا۔

تلنگانہ کا علاقہ بیگموں کی جاگیر تھا۔ جب یہاں کی رعایا نے سرکشی اختیار کی۔ محصول ادا کرنے سے انکار کر دیا۔ اس علاقے کے چوروں اور لٹیروں نے اپنی جولان گاہ بنا لیا تو سلطان محمد شاہ نے کسی امیر کو وہاں بھیجنے کا ارادہ کیا جو وہاں کے انتظامات سنبھال سکے۔

قلی قطب اس وقت وہاں بیٹھا ہوا تھا جب بیگمات کے درمیان تلنگانہ کی باتیں چھڑی ہوئی تھیں۔ ایک بیگم نے یہ خوش خبری سنائی کہ بہت جلد تلنگانہ کا انتظام ٹھیک ہو جائے گا۔

''بادشاہ سلامت کسی نامور امیر کو تلنگانہ بھیجنے والے ہیں۔''

''کسے بھیج رہے ہیں؟''

''ابھی کوئی نام سامنے نہیں آیا ہے لیکن یہ مجھے معلوم ہے کہ وہ کسی نہ کسی کو بھیجیں گے ضرور۔''

''دیکھو کوئی دیانت دار امیر ہو، ورنہ ہوگا تو یہ کہ آدھی آمدنی وہ اپنے پاس رکھے گا، آدھی ہمیں بھیجے گا۔'' قلی قطب یہ باتیں سن رہا تھا۔ اس کے دل نے انگڑائی سی لی۔ اس نے بیگمات سے کہا۔

''اگر اس مہم پر مجھے بھیج دیا جائے تو میں تمام

انتظامات اس خوبی سے انجام دوں گا کہ کسی کو کوئی شکایت نہیں رہے گی۔'' تمام بیگمات اس کی دیانت اور امانت داری سے بہت خوش تھیں اور سمجھتی تھیں کہ وہ یہ کام بہ خوبی انجام دے لے گا۔ ایک بیگم نے بادشاہ سے اس کی سفارش کی۔ بادشاہ بھی اس کی صلاحیتوں سے واقف تھا۔ سلطان محمد شاہ نے اسے اس خدمت پر مامور کر دیا۔

سلطان قلی اپنے ساتھیوں کے ہمراہ تلنگانہ کی طرف گیا۔ اس نے باغیوں سے مذاکرات کیے اور ان میں سے بہت سوں کو اپنا بہی خواہ بنا لیا اور پھر ان کی مدد سے سرکشوں کو ایسا سبق پڑھایا کہ باغیوں کا نام ونشان تک مٹ گیا۔ چوروں اور لٹیروں کا خاتمہ ہو گیا۔

اس کی شجاعت اور بہادری کا ایسا شہرہ ہوا کہ اردگرد کے علاقوں سے بھی غنڈوں اور لٹیروں کا صفایا ہو گیا۔

سلطان محمد شاہ اس سے اتنا خوش ہوا کہ اسے امارت کے درجے پر فائز کر کے اسے گول کنڈہ اور اس کے مضافات کا جاگیردار بنا دیا۔ کچھ عرصے بعد اسے اس علاقے کا سپہ سالار بنا دیا۔

جب سلطان محمود بہمنی کی سلطنت زوال پذیر ہوئی تو قلی نے بادشاہت کا دعویٰ کیا اور اپنے آپ کو قطب شاہ کا خطاب دے کر خود مختار حکومت قائم کر لی اور اب تک وہاں کا بادشاہ چلا آتا تھا۔

مصالحت کی اس پالیسی نے یہ بھی کیا تھا کہ اسمٰعیل عادل شاہ کے تعلقات امیر برید سے خوش گوار ہو گئے تھے۔ دونوں نے ملاقات کی اور باہم یہ طے ہوا کہ تلنگا پہنچ کر قلعہ نل کنڈہ کو فتح کیا جائے۔ یہ اسی عہد نامے کا حصہ تھا جو برہان شاہ کے ساتھ طے ہوا تھا کہ قلی قطب کے علاقوں کو فتح کیا جائے گا۔

اب اسمٰعیل عادل شاہ کو برہان شاہ کی طرف سے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ اسمٰعیل شاہ اور امیر برید نے باہم مل کر تلنگانہ کا رخ کیا۔

سب سے پہلے قلعہ نل کنڈہ اسمٰعیل عادل شاہ کی حراست میں آیا۔ قلی قطب شاہ گول کنڈہ میں تھا، اس نے کسی مصلحت کے تحت وہاں سے خود نکلنا مناسب نہ سمجھا۔ البتہ اہل قلعہ کی حفاظت کے لیے اپنے سواروں اور پیادوں کا لشکر روانہ کیا۔

یہ تعداد کچھ نہ ہوتے ہوئے بھی عادل شاہ کی فوج سے کہیں زیادہ تھی لیکن عادل شاہ کے پاس اسد خاں لاری جیسا جانباز سپہ سالار موجود تھا جو قلعہ کے محافظوں سے جنگ کرتا اور ہر روز فتح حاصل کرتا رہا۔

قطب شاہی فوج روز حملے کرتی تھی اور پھر گھبرا کر پیچھے ہٹ جاتی تھی۔ قطب شاہ گول کنڈہ میں پریشان بیٹھا تھا۔ اب وہ یہ سوچنے لگا تھا کہ اگر تلنگانہ فتح ہو گیا تو عادل شاہ واپس نہیں جائے گا بلکہ آگے بڑھتے ہوئے گول کنڈہ تک آ جائے گا۔ اسے اب تلنگانہ کو چھوڑ کر دارالخلافہ کی فکر کرنا چاہیے۔ اس نے گول کنڈہ کی حفاظت کے لیے تلنگانہ سے اپنی آدھی فوج بلا لی۔

اب قلعہ نل کنڈہ کی فتح بہت آسان ہو گئی تھی لیکن اسمٰعیل عادل شاہ کی علالت نے سارا کھیل بگاڑ دیا۔ وہ جب سے یہاں آیا تھا بیمار چلا آ رہا تھا لیکن اب تو یہ حالت ہو گئی تھی کہ چلنے پھرنے سے بھی معذور ہو گیا تھا۔ تمام امرا سخت پریشان تھے اور جنگ کی طرف سے ان کا دھیان ہٹ گیا تھا۔

یہ رازداری بھی برتی جا رہی تھی کہ دشمن کو کسی طرح بھی عادل شاہ کی علالت کا علم نہ ہو سکے۔

جب عادل شاہ کی حالت بہت غیر ہو گئی تو اس نے امیر برید اور اسد خاں کو طلب کیا۔

''میری علالت طول پکڑتی جا رہی ہے۔ نقاہت اتنی ہو گئی ہے کہ تم دیکھ رہے ہو چلنے پھرنے سے بھی معذور ہو گیا ہوں۔ علاج معالجے کی بھی یہاں زیادہ سہولتیں میسر نہیں ہیں۔ یہاں کا موسم بھی مجھے راس نہیں آ رہا ہے۔ میں نے سوچا ہے خاموشی سے حسن آباد گلبرگہ چلا جاؤں۔''

''تو کیا محاصرہ ختم کر دیا جائے؟'' امیر برید نے پوچھا۔

''میری معلومات کے مطابق اہل قلعہ اور محافظ تنگ آ چکے ہیں۔ قلعہ کسی وقت بھی ہمارے اختیار میں آ سکتا ہے۔'' اسد خاں نے کہا۔

''میرا ہرگز یہ منشا نہیں کہ محاصرہ ختم ہو۔ میں تو یہ چاہتا ہوں کہ آپ دونوں تلنگانہ کی جنگ میں مصروف رہیں اور میں خود حسن آباد گلبرگہ کا رخ کروں۔''

رات کے اندھیرے میں اسے پالکی میں سوار کیا گیا اور خاموشی سے میدان جنگ سے نکال دیا گیا۔ اسے اس کے کہنے کے مطابق حسن آباد گلبرگہ لے جایا جاتا تھا لیکن موت اس کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ سفر کی صعوبت برداشت نہ کر سکا۔ پالکی اٹھانے والے مزدور اسے زندہ سمجھ کر نہ جانے کتنی منزلوں تک چلتے رہے۔ ایک جگہ پہنچ کر پالکی کے اندر جھانک کر دیکھا۔ شک ہوا تو آوازیں دیں۔ جواب میں خاموشی کے سوا کچھ نہ تھا۔ جو امرا ساتھ چل رہے تھے انہوں نے سواروں کو

واپس دوڑا دیا کہ اسد خاں لاری کو اطلاع کر دیں۔

دھوپ ابھی نکلی تھی کہ سوار یہ خبر لے کر آ گئے کہ سایہ اٹھ گیا ہے۔ اسد خاں لاری بڑا تجربہ کار امیر تھا۔ اس نے عادل شاہ کی موت کو اس طرح چھپا لیا جیسے اس کی بیماری چھپائی تھی۔ سواروں کے ساتھ خود سوار ہوا۔ امیر برید سے یہ بہانہ کیا کہ عادل شاہ نے اسے طلب کیا ہے۔

رات پھر آ گئی تھی۔ اسد خاں لاری نے لاش کو قصبہ کوکی بھیج دیا تاکہ وہ یوسف عادل شاہ کی قبر کے برابر جگہ پا سکے۔

وہ جس طرح گیا تھا اسی طرح واپس آ گیا۔

دو دن بعد کہنہ مشق امرا کو طلب کیا۔ ان میں امیر قاسم برید بھی تھا۔

''میں یہ اطلاع آپ تک پہنچا دوں کہ اسمٰعیل عادل شاہ اب ہم میں نہیں رہے۔'' یہ خبر سنتے ہی تمام امرا پر سکتہ سا طاری ہو گیا۔

''یہ خبر افسوس کی ضرور ہے لیکن ہمیں ہمت سے کام لینا ہے۔ عادل شاہ کے جانشین کا انتخاب کرنا ہے تاکہ عادل شاہی خاندان کسی انتشار سے بچ جائے۔''

''اس میں تو کوئی دقت پیش نہیں آئے گی کیونکہ اسمٰعیل عادل شاہ نے شہزادہ ملوخاں کے حق میں پہلے ہی وصیت کر دی تھی۔'' امیر برید نے کہا۔

''میں بھی اسی کے حق میں ہوں لیکن مجھے ڈر ہے کہ شہزادہ ابراہیم عادل شاہ اس تقرری پر خوش نہیں ہوگا۔ میں نہیں چاہتا کہ اس غیر علاقے میں شہزادے آپس میں لڑ پڑیں۔ یہاں فیصلہ کرنا دانش مندی نہیں۔''

اب شہزادوں کو بھی بلا لیا گیا اور انہیں اطلاع دے دی گئی۔

''اب میں یہ چاہتا ہوں۔'' اسد خاں نے کہا۔ ''قلعہ نل کنڈہ کو خیر باد کہیں۔ زندگی رہی تو پھر کبھی فتح کر لیں گے۔ فی الحال گلبرگہ چلتے ہیں۔ عادل شاہ کی والدہ پونجی خاتون بھی وہاں موجود ہیں اور فیض رسانی کے لیے حضرت خواجہ گیسو دراز بندہ نواز کا مزار بھی ہے۔ جانشینی کا معاملہ وہیں چل کر طے کرتے ہیں۔'' تمام شہزادوں نے اس پر اتفاق کیا۔

گلبرگہ پہنچ کر اسد خاں لاری نے مرحوم بادشاہ کی وصیت کو پورا کیا اور ملوخاں کو تخت نشین کر دیا۔ ابراہیم خاں کو قلعہ مرج میں نظر بند کر دیا تاکہ وہ ہنگامہ کھڑا نہ کرے۔

اسد خاں اپنی جاگیر پر چلا گیا اور پونجی خاتون نئے بادشاہ کی نگرانی کرنے لگیں۔

قدرت نے ملوخاں کو اقتدار سونپ دیا تھا لیکن وہ اس کی حفاظت نہ کر سکا۔ بادشاہ بنتے ہی رنگ رلیوں میں گم ہو گیا۔ پونجی خاتون کی باتیں بھی اس پر اثر انداز نہیں ہو رہی تھیں۔

اس کی عادتیں اتنی افسوس ناک تھیں کہ صرف چھ مہینے بعد پونجی خاتون یہ سوچنے لگیں کہ ملوخاں کا تختہ الٹ کر ابراہیم عادل شاہ کو بادشاہ بنا دیا جائے۔ انہوں نے اسد خاں لاری کو لکھ بھیجا کہ جس طرح بھی ہو ملوخاں سے تخت چھین لیا جائے۔

اسد خاں لاری پہلے ہی ان تمام حالات سے آگاہ تھا اور محض پونجی خاتون کی مروت سے چپ تھا۔ جب ادھر سے ہی اجازت مل گئی تو اس نے سپاہی ساتھ لیے اور بیجاپور کا رخ کیا۔ وہ بے دھڑک قلعہ ورگ پہنچ گیا۔ وہ کوئی غیر تو تھا نہیں کہ کوئی اسے روکتا۔ اس کے ارادے بھانپ کر کچھ محافظ سامنے آئے جنہیں اسد خان کے سپاہیوں نے تلواروں پر رکھ لیا۔

ملوخاں کسی مزاحمت کے بغیر گرفتار کر لیا گیا۔ وہ اس لیے بھی مزاحمت نہ کر سکا کہ وہ اس وقت بھی نشے میں تھا۔

شہزادہ ابراہیم کو قید سے نکالا گیا اور تخت عادل شاہی پر بٹھا دیا گیا۔

پونجی خاتون کی رضامندی سے ملوخاں کی آنکھوں میں گرم سلائیں پھروا دی گئیں۔

ابراہیم عادل شاہ نہایت دلیر بادشاہ ثابت ہوا۔ عنان حکومت سنبھالنے کے بعد تادم مرگ معرکہ آرائیوں میں مصروف رہا اور عادل شاہی خاندان کو عروج بخشتا رہا۔

ابراہیم عادل شاہ نے اپنے والد کے مذہب کو چھوڑ کر حنفی مسلک اختیار کیا۔ علاوہ ازیں یہی وہ بادشاہ ہے جس نے فارسی کی روش چھوڑ کر ہندی کو سرکاری زبان بنایا۔

تخت نشینی کے ایک سال بعد ہی اس نے ہندوؤں کی ریاست ''بیجانگر'' کو فتح کر لیا۔

ماخذات

تاریخ فرشتہ، ترجمہ مشفق خواجہ۔ طبقات اکبری، ترجمہ محمد ایوب قادری، بساتین السلاطین، مرزا ابراھیم زبیری

غمِ قیدِ حیات

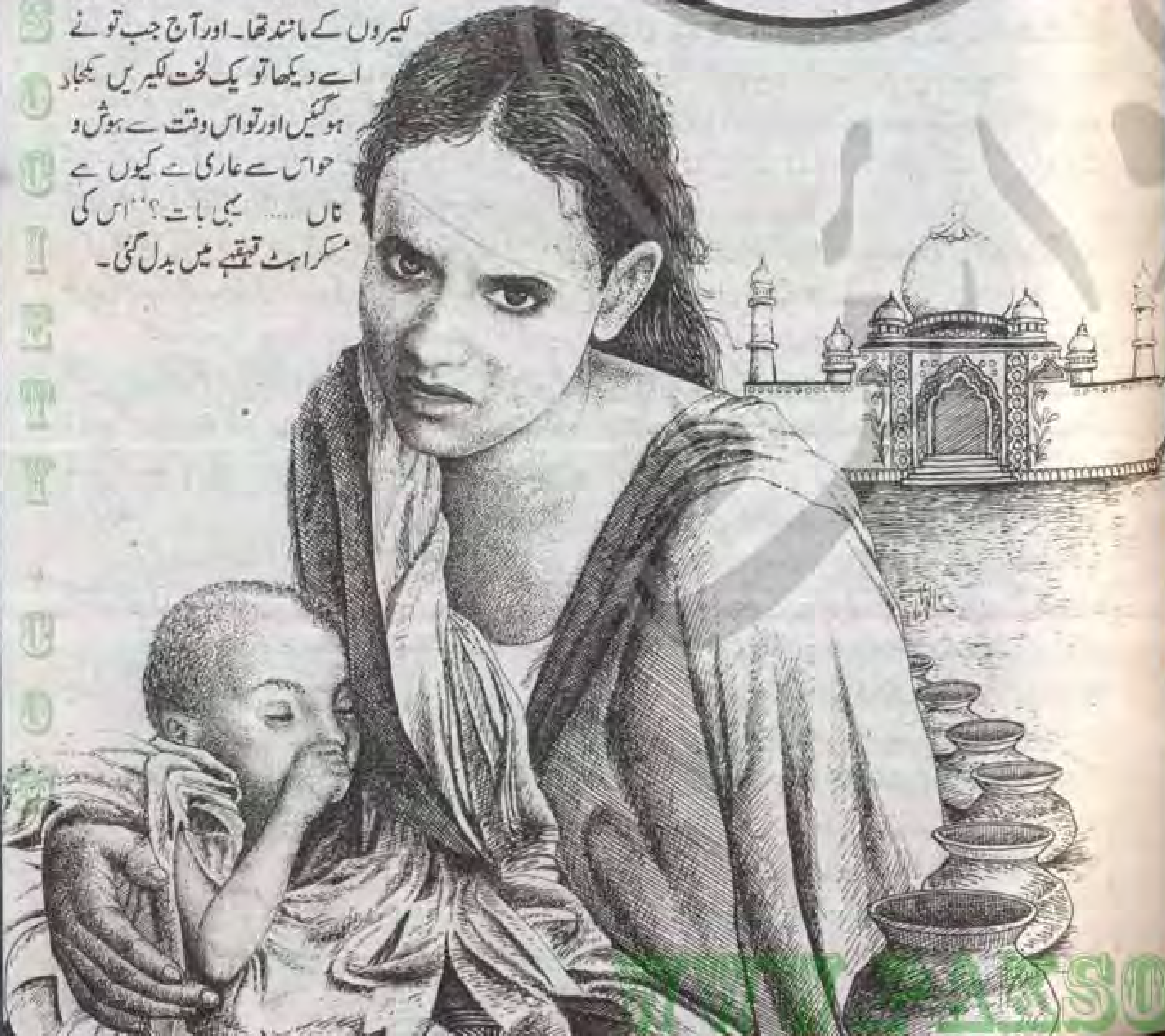
ایم اے راحت

یہ بھی کیسا عجیب مثلث ہے جب ایک جیتی جاگتی "حیات"... "غم" کی "قید" میں جا ٹھہرے... محض سانس کی آمد و رفت پلکیں جھپکانے پر مجبور کر دے اور سوچ فقط انتقام کے تانے بانے بنتی رہے تو آخر میں زندگی صرف چار حرفی لفظ بن کر ایک تماشا بن جاتی ہے۔ قسمت کے ایک ایسے ہی پھیر میں وہ بھی آ گئی تھی مگر آخر کب تک... بالآخر ایک دن وہ دائرہ ٹوٹ ہی گیا۔

غمِ زندگی، غمِ بندگی، غمِ دو جہاں کی کھلی تفسیر

عرشی نے چائے کی پیالی نفاست سے شمائل کے سامنے رکھی اور بڑے اطمینان سے اس کی سامنے بیٹھی۔ شمائل کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

''یقیناً تو آج پھر کسی حسین و جمیل نوجوان کا تذکرہ کرنے کے لیے تیار ہو رہی ہے جس کے پیکر کو خوابوں میں تراشا ہوگا۔ وہ پیکر تیرے تصورات میں بکھری لکیروں کے مانند تھا۔ اور آج جب تو نے اسے دیکھا تو یک لخت لکیریں یکجا ہو گئیں اور تو اس وقت سے ہوش و حواس سے عاری ہے کیوں ہے ناں..... یہی بات؟'' اس کی مسکراہٹ قہقہے میں بدل گئی۔



عرشی نے چونک کر اسے دیکھا اور اس کے انداز گفتگو سے چڑ گئی۔

''جی نہیں ...... آپ اپنی ذہانت کے بارے میں ہمیشہ خوش فہمی کا شکار رہی ہیں۔'' اس نے تلملا کر کہا۔

''میں کیا کروں، عرشی؟ تو نے خود اپنی پوزیشن خراب کر رکھی ہے۔ جب بھی تجھے کسی پسند آنے والے نوجوان کا تذکرہ کرنا ہوتا ہے۔ پہلے تو چائے بناتی ہے پھر بڑے پیار سے مجھے دیکھتی ہے اور پھر ایک سرد آہ، پھر کر شروع ہو جاتی ہے۔ اس وقت ساری علامات وہی ہیں۔ خاص طور سے تیرا بایاں گال، میں کیا کروں عرشی، تیرا بایاں گال پھڑک کر مجھے وقت سے پہلے خطرے کا احساس دلا دیتا ہے۔ خیر چائے عمدہ ہے۔ ہاں تو وہ تازہ بدنصیب کون ہے؟'' شمائل نے مسخرے پن سے کہا اور عرشی مزید بلبلا اٹھی۔

''آخر آپ اپنے آپ کو سمجھتی کیا ہیں شہزادی صاحبہ! خوامخواہ لوگوں نے آپ کا دماغ خراب کر رکھا ہے۔ ہم تو دل کی بات کہنے کے لیے بے چین رہتے ہیں اور آپ مذاق اڑانے کے علاوہ کچھ نہیں کرتیں۔''

''میں ان باتوں میں تیری پذیرائی نہیں کر سکتی۔ عرشی! میں تجھے یونیورسٹی کی ان بیوقوف لڑکیوں میں نہیں دیکھ سکتی جن کی طرف اٹھنے والی نگاہوں میں تمسخر ہوتا ہے۔ یہاں پر ہم کسی کا تقدس، کسی کی امانت ہیں۔ اور جو ایک بار کسی کا اعتماد مجروح کرتے ہیں۔ ساری زندگی کسی کو اعتماد نہیں دے سکتے۔''

''اللہ کی پناہ ...... یہ خوبصورت الفاظ، یہ تقریریں مجھے محفوظ رکھا کرو ورنہ ضرورت کے وقت ان کا ذخیرہ ختم ہو جائے گا۔ کس نے کہا تم سے کہ میں ایسی کوئی بات کرنے جا رہی ہوں۔'' عرشی نے پیشانی پر ہاتھ مار کر کہا۔

''تیرے داہنے گال نے جو کبھی جھوٹ نہیں بولتا۔'' شمائل سنجیدگی سے بولی۔

''اللہ کی مار ...... میرے اس داہنے گال پر، میں تو پروفیسر عسکری کا تذکرہ کرنے جا رہی تھی۔''

''پروفیسر عسکری! کیا تذکرہ ہے ان کا؟'' شمائل چونکی اور غور سے عرشی کو دیکھنے لگی۔

''کوئی خاص بات نہیں، بس مجھے تو وہ پروفیسر اخروٹ معلوم ہوتا ہے۔ میرا دل چاہتا ہے کہ اسے اسی نام سے پکاروں، تمہارا کیا خیال ہے؟''

''ہاں ...... وہ اخروٹ ہی کے مانند ہے، اوپر سے سخت اندر سے نرم اور میٹھا۔ لیکن اس کی ذہانت عالمگیر ہے۔ میں اس سے بڑی عقیدت رکھتی ہوں۔ بہت کم لوگ ایسے ہوتے ہیں عرشی، جن کے نام کے ساتھ کوئی خلش وابستہ نہیں ہوتی۔'' شمائل نے کہا۔

''مجھے تو اس کے نام سے ہی اختلاف ہے۔ بھلا کوئی تک ہے عسکری جو اس کے چہرے اور بدن سے بالکل میل نہیں کھاتا۔ چہرے پر معصومیت، نزاکت اور بدن پہلوانوں جیسا۔'' عرشی، شمائل سے بدلہ لینے لگی۔ وہ جانتی تھی کہ شمائل پروفیسر عسکری کی بے حد عزت کرتی ہے اور اس سے بہت متاثر ہے۔

''میں نے نہ تو کبھی اس کے چہرے پر غور کیا اور نہ کبھی نام اور بدن پر۔ میں تو ہمیشہ اس کی آنکھوں کی چمک اور آواز کے زیر و بم پر غور کرتی ہوں۔ اس کے ذہن میں علم و آگہی کا سمندر موجزن ہے عرشی لیکن میں جانتی ہوں یہ صرف انتقامی کارروائی ہے۔ اصل بات کچھ اور ہے۔ چل اب جلدی سے بتا دے کیا کہنے جا رہی تھی۔ تجھے میری قسم!'' شمائل مسکرا دی۔

''جینا حرام کر دیا ہے تو نے قسمیں دلا، دلا کر۔ ارے اسی عرشان کی بات کر رہی تھی۔'' عرشی زچ ہو کر بولی۔

''سبحان اللہ! یہ نام تمہارے ہونٹوں تک بھی پہنچ گیا۔'' شمائل نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

''خدا کی قسم کوئی خوبی نہیں کمبخت میں۔ اس میں ایک ایسی بے پناہ کشش ہے کہ ذہن اس کے بھنور میں پھنس جاتا ہے۔ حالانکہ صورت سے دیہاتی معلوم ہوتا ہے۔'' عرشی نے کہا۔

''اور تم بھی اس کی بے پناہ کشش کا شکار ہو گئی ہو۔'' شمائل نے سنجیدگی سے کہا۔ ''دیکھو عرشی! اگر تمہارے دل میں شمائل کی محبت ہے تو تمہیں اس کی قسم، تم اپنا نام ان احمق لڑکیوں کے ساتھ نہ لکھوانا جو تعلیمی ماحول کی پیشانی پر داغ ہیں۔''

''ایسی کوئی بات ممکن بھی نہیں ہے مس شمائل، وہ بے شمار رقیبوں کے درمیان گھرا ہوا ہے۔'' عرشی نے کہا۔

''پھر وہ تمہارے ذہن سے چمٹا تمہارے بیڈ روم تک کیسے چلا آیا؟''

''توبہ توبہ، تم تو بال کی کھال نکالنے لگتی ہو۔ میں تو اس کا تذکرہ صرف اس لیے کرنے بیٹھ گئی تھی کہ آج اس سے ملاقات ہو گئی تھی۔ بڑے نرم لہجے میں بڑی پر اخلاق

گفتگو کرتا ہے اور یہی اس کی شخصیت کا حسن ہے۔ اس کے علاوہ اس کی نگاہ میں کوئی تاثر نہیں ہوتا۔ اب لڑکیاں خود ہی گدھی بن جائیں تو اس میں اس کا کیا قصور؟''

''بے شک لیکن تم تو ایسی نہیں ہو۔''

''ہرگز نہیں ......'' عرشی نے وثوق سے کہا۔

''چنانچہ آیندہ اس سے ملاقات نہیں کرو گی۔ سر راہ مل جائے تو چند اخلاقی جملوں کے علاوہ کوئی بات نہیں ہوگی۔'' شمائل نے کہا۔ اور عرشی ناک سکیڑ کر بڑبڑانے لگی۔

☆☆☆

''یورپ میں بہت کچھ ہے افضال احمد لیکن یہ حسن کہاں۔ وہاں ہر چیز اتنی آسانی سے دستیاب ہو جاتی ہے کہ نگاہوں میں اس کی وقعت نہیں رہتی۔ عورت یورپ کی ارزاں ترین شے ہے۔ نمک کے حصول میں دشواری ہوتی ہے، عورت کے حصول میں نہیں... لیکن یہاں کا تو باوا آدم ہی نرالا ہے۔ میں نے ان مضبوط جسموں والی لڑکیوں کو غور سے دیکھا تھا افضال احمد لیکن کسی کم بخت کی آنکھوں میں ایسے تاثرات نظر نہیں آئے جیسے وہ مجھ سے متاثر ہو۔ ویسے تم بھی تو جوان آدمی ہو یار! کچھ گر سکھاؤ یہاں کے اپنے وطن میں آ کر تو ابھی تک پیاسے ہیں۔ یورپ میں اتنی مشکلات کہاں تھیں۔''

''اوہ سرکار! شہروں کی بات دوسری ہے۔ وہاں کے لوگ ایسی باتوں کی زیادہ پروا نہیں کرتے۔ لیکن ان دیہاتوں میں ذرا خیال رکھیں سرکار۔ آپ کا نمک خوار ہوں اس لیے آپ کو آگاہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ ان پہاڑوں میں سب سے قیمتی چیز عزت سمجھی جاتی ہے۔ یہ لوگ ہر طرح کے گناہ معاف کر سکتے ہیں لیکن ان کی عزت پر آنچ آ جائے تو...... تو سرکار۔''

''کیا بیوقوفی کی باتیں کر رہے ہو افضال احمد یہ لوگ چند روپے کمانے کے لیے اپنی لڑکیوں کو اتنے سخت کام پر لگا سکتے ہیں۔ درختوں کی کٹائی معمولی کام تو نہیں ہے۔ اگر ان میں سے کسی کو ایک سال کا معاوضہ ایک دن میں مل جائے تو کون راضی نہ ہوگا۔'' شیرزاد نے مکروہ انداز میں کہا۔

''محنت تو دنیا کے کسی حصے میں بری نہیں سمجھی جاتی سرکار۔ اگر یہ ایسے ہی ہوتے تو تین روپے کے بجائے تین سو روپے کیوں نہ کماتے۔'' بوڑھے افضال احمد نے کہا۔

''بڈھے تو میرا ملازم ہے۔ ان لوگوں کا وفادار بننے کی کوشش کیوں کر رہا ہے۔ کیا تو نہیں جانتا کہ میری زبان کی ایک جنبش تیرے بے سہارا بڑھاپے کو جہنم بنا سکتی ہے۔''

''جانتا ہوں سرکار! لیکن تیس سال سے نمک کھا رہا ہوں۔ نمک حرامی نہیں کر سکتا۔ اگر آپ کو کچھ ہو گیا تو بڑے صاحب کو جواب دہ میں ہی ہوں گا۔''

''نہ مجھے کچھ ہوگا نہ بڑے سرکار تک بات پہنچے گی۔ میں نے تجھے راز دار بنانے کی کوشش کی تھی لیکن ...... البتہ تیری زبان بند رہے گی۔ ورنہ افضال احمد ...... میں ڈیڈی سے بہت مختلف طبیعت رکھتا ہوں۔'' شیرزاد نے خونخوار نگاہوں سے افضال احمد کو دیکھا۔

''چھوٹے سرکار! آپ کے ولایت جانے سے بہت پہلے سے ہم آپ کے نوکر ہیں۔ گودوں میں کھلایا ہے آپ کو ...... یہ زبان آپ کے برے کے لیے کبھی نہیں کھلے گی۔ بڑا بن کر آپ کو سمجھایا ہے۔ [illegible] مان گئے۔ یہ ہمارا گاؤں ہے۔ ہم یہیں پیدا ہوئے ہیں اس لیے ان لوگوں کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ جو کچھ کہا آپ کے بھلے کے لیے کہا۔'' افضال احمد نے کہا۔

''افضال احمد ہم یورپ میں جوان ہوئے ہیں۔ وہاں کی رنگین زندگی چھوڑ کر اس جہنم میں آنا پڑا ہے۔ شہر میں ڈیڈی کی طرف سے سخت نگرانی ہوتی ہے۔ ان دیہاتوں میں اس لیے آئے تھے کہ جنگل کے پھولوں کو گلے کا ہار بنائیں گے اگر یہاں بھی ناکام رہے تو اس پورے جنگل کو آگ لگا دیں گے، سمجھے۔''

''یہ کام تو صرف خدا کر سکتا ہے سرکار، صرف خدا۔'' افضال احمد نے کہا لیکن اتنی آہستہ سے کہا کہ شیرزاد نہ سن سکا۔ افضال احمد اپنے کاموں میں مصروف ہو گیا تھا۔

شیرزاد، ازل شاہ کا بیٹا تھا۔ ازل شاہ کی جوانی زیادہ بہتر نہیں رہی تھی۔ اور وہ عمر کی اس منزل میں سنبھل گئے تھے جو سنبھلنے کی عمر نہیں تھی۔ اور اس کے بعد ان کی ذات لوگوں کی شکایات سے پاک ہو گئی۔ چار بیٹے تھے۔ جن میں شیرزاد تیسرے نمبر پر تھا۔ ازل شاہ نے تمام بیٹوں کو اعلیٰ تعلیم دلائی تھی اور سب نے مختلف حیثیت حاصل کی تھیں شیرزاد کو شروع ہی سے یورپ بھیج دیا گیا تھا لیکن جب وہ واپس آیا تو ازل شاہ کو احساس ہوا کہ شیرزاد وہ نہیں بن سکا جو وہ بنانا چاہتے تھے۔ وہ ایک اوباش اور عیاش نوجوان تھا۔ ازل شاہ پریشان ہو گئے اور بیٹے کی اصلاح کے لیے جتن شروع کر دیے۔ لیکن شیرزاد نے کوئی کام کر کے نہ دیا۔ تب ازل شاہ نے اسے شہر کی رنگینیوں سے دور اپنی اس جاگیر پر بھیج دیا جہاں جنگلوں کی کٹائی ہو رہی تھی۔ یہاں افضال احمد ان کے کام کا نگران تھا۔

پہلے یہ شخص شہر میں ازل شاہ کے پاس ہی تھا لیکن چونکہ اس علاقے سے تعلق رکھتا تھا جہاں کام ہو رہا تھا اس لیے ازل شاہ نے اسے یہاں بھیج دیا اور اب شیرزاد بھی یہیں آ گیا تھا۔

لیکن شیرزاد کی شیطانی فطرت نے ان علاقوں کو اس لیے قبول کیا تھا کہ اس نے ان پہاڑی بستیوں کے حسن کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا تھا۔ وہ جنگلی پھولوں کو سونگھنے کا تصور لے کر آیا تھا۔ لیکن کافی عرصہ گزر گیا تھا اور اسے کوئی کامیابی نصیب نہیں ہوئی تھی۔ چالاک آدمی تھا، ماحول کو سمجھے بغیر کوئی ایسی حرکت کرنا نہیں چاہتا تھا جو مصیبت بن جائے۔ بڑی سوچ وبچار کے بعد اس نے بوڑھے افضال احمد کو رازدار بنانے کی کوشش کی تھی لیکن افضال احمد کی گفتگو بڑی مایوس کن تھی۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ چند روپے روز پر دن بھر مشقت کرنے والے نوٹوں کی جھلکیاں دیکھ کر سب کچھ بھول جانے پر آمادہ نہ ہوں۔ افضال احمد کی بات کسی طرح اس کے حلق سے نہیں اترتی تھی۔ کافی غور وخوص کے بعد اس نے فیصلہ کیا کہ خود ہی کوشش کرے گا، یہ سب اس کے غلام تھے۔ ہاں تھوڑی سی احتیاط مناسب ہوگی۔ دوسرے ہی دن اس نے اپنی کاوشیں شروع کر دیں۔ آج صبح وہ گیا، اس نے جنگلوں میں گھس کر کام والوں کو دیکھا اُس کی نگاہوں میں محنت کشوں کے قوی ہیکل جسموں کو دیکھ کر چکا چوند پیدا ہو رہی تھی۔ ان مضبوط جسموں سے خوف کھانا قدرتی بات تھی۔ کام کرنے والوں میں مرد عورتیں بھی تھے۔ وہ جس طرف جاتا ہاتھ سلام کے لیے اٹھ جاتے۔

تب اس کی نگاہ ایک دوشیزہ کی جانب اٹھ گئی۔ درخت کی ایک ٹہنی سے اس کا گورا گورا ہاتھ زخمی ہو گیا تھا اور سرخی، سفیدی کا امتزاج بے حد حسین لگ رہا تھا۔ لڑکی دوپٹے کے پلو سے خون پونچھ رہی تھی۔

''ارے تمہارا ہاتھ...... زخمی ہو گیا۔'' اس نے آگے بڑھ کر خوبصورت ہاتھ پکڑ لیا لیکن لڑکی نے تڑپ کر ہاتھ چھڑا لیا تھا۔

''سلام مالک......'' وہ میٹھی آواز میں بولی۔

''سلام...... سلام...... ہاتھ ادھر لاؤ...... میں زخم دیکھوں۔ اس طرح کام کیوں کرتی ہو کہ چوٹ لگ جائے۔'' شیرزاد نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ پکڑنے کی کوشش کی لیکن لڑکی مسکراتی ہوئی پیچھے ہٹ گئی۔

''نہیں مالک! یہ بھی کوئی چوٹ ہے۔ ذرا سا خون نکلے گا ٹھیک ہو جائے گا۔ ہم لوگ اپنا ہاتھ کسی غیر کے ہاتھ میں نہیں دیتے۔''

''عجیب لڑکی ہے۔ خون بہے جا رہا ہے اور...... کیا نام ہے تمہارا؟''

''پلوشہ، مالک۔'' لڑکی نے جواب دیا۔

''یہ کام تمہارے بس کا نہیں ہے۔ افضال احمد سے مل لینا۔ مجھے مکان پر کام کرنے کے لیے ایک لڑکی کی ضرورت ہے۔ تمہیں یہاں سے ساٹھ روپے ملتے ہیں ناں۔ میں تمہاری تنخواہ ڈھائی ہزار ماہوار لگوا دوں گا۔ جاؤ آج کی مزدوری پوری کر کے گھر جاؤ۔''

''شیروں کو جنگل ہی پسند ہوتا ہے مالک چاہے ان کے لیے سونے کے پنجرے بنوا دو۔ ہم گھروں میں کام نہیں کرتے۔ بس ہمارے لیے یہ ساٹھ روپے ہی کافی ہیں۔ زیادہ کی ضرورت ہی نہیں۔ ہم پورا کام کریں گے۔ بغیر محنت کے مزدوری اور بھیک میں کیا فرق رہ جاتا ہے۔'' لڑکی نے کہا۔ اور پھر سے آری سنبھال لی۔

شیرزاد لاجواب ہو کر رہ گیا۔ وہ خاموشی سے لڑکی کو گھورتا رہا۔ اور پھر ایک جھٹکے سے مڑا لیکن عقب سے افضال احمد کو دیکھ کر اس کا پارہ ہائی ہو گیا۔ افضال احمد کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔

''آپ کو خوشی ہوئی ہوگی سرکار، آپ کے نوکر محنت کش ہیں۔ بھکاری نہیں ہیں۔'' افضال احمد نے بہ دستور مسکراتے ہوئے کہا۔

''تم کیا کر رہے ہو۔ یہاں؟'' وہ غرایا۔

''آپ کے پیچھے آ گیا تھا سرکار، میں نے سوچا کہیں آپ کو میری ضرورت نہ ہو۔''

''دفع ہو جاؤ۔'' شیرزاد غصے میں ہونٹ چباتے ہوئے بولا۔ اور پھر پاؤں پٹختا ہوا اپنی جیپ کی طرف بڑھ گیا۔ غصے کے مارے اس کا برا حال تھا اور اس کے ذہن میں خطرناک منصوبوں کے جال بن رہے تھے۔

☆☆☆

شمائل نے کار ریورس کی تو اس کا پچھلا پہیہ فٹ پاتھ پر چڑھ گیا اور کمانی فٹ پاتھ پر اکھڑے ہوئے ایک پتھر پر ٹک گیا۔ اس نے ریورس گیئر نکال کر اسے فرسٹ گیئر میں آگے بڑھانے کی کوشش کی لیکن پتھر کی وجہ سے ایک پہیہ اٹھا رہ گیا تھا اس لیے کار آگے نہ بڑھ سکی۔

اس نے زور زور سے ایکسی لریٹر دبایا لیکن بے سود کار ٹس سے مس نہ ہوئی۔ کئی منٹ تک وہ کوشش کرتی رہی۔ سخت دھوپ پڑ رہی تھی اور کار میں شدید تپش تھی۔ ایک سہیلی

نے دوپہر کے کھانے پر مدعو کیا تھا۔ گو ہاسٹل میں رہتی تھی لیکن استعمال کے لیے ایک کار اس کے پاس موجود تھی اور وہ خود ہی ڈرائیو کرتی تھی۔ اس وقت پونے دو بجے تھے حالانکہ وعدے کے مطابق ایک بجے پہنچنا تھا لیکن کچھ ایسی ناگزیر مصروفیات پیش آ گئیں کہ وہ اتنی لیٹ ہو گئی۔

چوکیدار کا دور دور تک پتا نہیں تھا۔ یونیورسٹی کا وقت بھی ختم ہو گیا تھا اور قرب وجوار میں کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ بے چینی سے ادھر ادھر دیکھنے لگی اور جب کوئی نظر نہیں آیا تو دوبارہ کار میں بیٹھ کر اسے ریورس گیئر میں ڈال کر جھٹکے دینے لگی پھر اچانک ہی اس نے عقب نما آئینے میں وہ انسانی سایہ دیکھا تھا۔ کار کو ایک جھٹکا لگا اور وہ پتھر سے نیچے اتر گئی غالباً اس شخص نے صورت حال سمجھ کر اس کی مدد کی تھی اور اپنی بہترین جسمانی قوت سے کام لے کر کار کو پتھر سے نیچے اتار دیا تھا۔

''بہت بہت شکریہ جناب! لیکن آپ نمودار کہاں سے ہو گئے؟'' اس نے ممنونیت اور کسی قدر پُرمزاح انداز میں کہا۔

''اس درخت کے عقب میں پڑھ رہا تھا کہ آپ کی کار کی غراہٹ سنی غالباً آپ نے نئی نئی چلانا سیکھی ہے۔'' نوجوان نے معاً اس سے کہا۔ لیکن اس کے الفاظ شمائل کو اپنی ہتک محسوس ہوئے اور وہ برداشت نہ کر سکی۔

''جی ہاں۔ ایسی ہی بات ہے، آپ کو اس محنت کا کیا معاوضہ پیش کروں؟''

''جی!'' ایک لمحے کے لیے نوجوان کے چہرے پر تعجب کے آثار ابھرے پھر وہ مسکرا دیا۔ ''یہ تو میرا فرض تھا خاتون! آپ پریشان تھیں اور یہاں کوئی اور موجود نہیں تھا اس لیے۔''

''اور اب آپ منتظر ہیں کہ میں آپ سے آپ کے بارے میں پوچھوں، اپنے بارے میں بتاؤں، آپ سے دوسری ملاقات کا وعدہ کروں اور دور تک مڑ مڑ کر آپ کو دیکھتی رہوں۔ لیکن افسوس اس شدید گرمی میں یہ سب ممکن نہیں ہے۔ میں اخلاقاً بھی ایسا نہیں کر سکتی۔ خدا حافظ!''

''خدا حافظ!'' نوجوان نے بھی مسکراتے ہوئے کہا۔ حالانکہ شمائل کے الفاظ غیر مناسب تھے لیکن اس کی پیشانی شکن آلود نہیں ہوئی تھی۔ شمائل آگے بڑھ گئی لیکن نوجوان کی بے شکن پیشانی اور ہلکی سی مسکراہٹ اس کے ذہن سے چپکی رہی جانے کیوں۔

جس سہیلی کے ہاں وہ مدعو تھی۔ اس نے اس کے دیر سے آنے کی سخت شکایت کی۔ عرشی پہلے ہی یہاں پہنچ چکی تھی لیکن اس دلچسپ ماحول کے باوجود وہ پُراعتماد مسکراہٹ بار بار اس کے ذہن میں ابھرتی رہی کتنے شفاف اور سادہ سے نقوش کا چہرہ تھا۔

جلد ہی اس چہرے سے دوسری ملاقات ہوئی۔ کچھ بیرونی لوگوں کو مدعو کیا گیا تھا اور یونیورسٹی کے ایک فنکشن میں ان سے گفتگو کرنی تھی۔ سوالات کرنے والوں میں عرشان کا نام سن کر عرشی اچھل پڑی تھی۔ شمائل نے چونک کر اسے دیکھا۔

''وہی عرشان جس کی دھوم ہے آج کل، تم نے سنا ہوگا۔ لڑکوں کے سالانہ مقابلہ تقریر میں اس نے پہلا انعام حاصل کیا ہے۔''

''میں نے نہیں سنا۔ لیکن تو نے پھر اس کا نام لیا۔'' شمائل نے عرشی کو گھورا۔

''دیکھو شمائل! میں نے تم سے وعدہ کیا تھا۔ ان لڑکیوں میں نہیں شامل ہوں گی جو آج کل اس کے گرد چکرا رہی ہیں لیکن کسی کی صفت بیان کرنا بھی بری بات ہے کیا؟''

''نہیں اس میں کوئی برائی نہیں ہے۔'' شمائل نے مطمئن ہو کر کہا اور پھر وہ اس مذاکرے میں محو ہو گئیں۔ مہمان آ چکے تھے 'بڑے بڑے لوگ تھے اور ان کے سامنے نوجوانوں کی ایک ٹیم پہنچ گئی اور اس ٹیم میں ایک صورت دیکھ کر شمائل چونکی، اسی وقت عرشی بول پڑی۔

''وہ لائیننگ والے بش کوٹ اور پینٹ میں ملبوس عرشان ہے۔'' شمائل نے کوئی جواب نہیں دیا۔ گہری آنکھوں والے نوجوان کے چہرے پر وہی مسکراہٹ چسپاں تھی جو کسی تیز لکیر کے مانند اکثر شمائل کے ذہن سے گزر جاتی تھی اور وہ ایک کسک سی محسوس کرنے لگتی تھی۔

''تو یہ عرشان ہے۔'' اس نے سوچا اور عرشی کو صاف کہہ دیا' واقعی خطرناک نوجوان ہے۔ اس سے محفوظ رہا جائے تو بہتر ہے' لیکن حالات شمائل کے خلاف جا رہے تھے۔ گفتگو شروع ہوئی اور چند ساعت کے بعد صرف عرشان ہی عرشان باقی رہ گیا۔ اس نے اس طرح ان لوگوں کو گھیرا کہ بوڑھی پیشانیاں عرق آلود ہو گئیں۔ جھینپی جھینپی مسکراہٹیں اور عرق آلود پیشانیوں کے سوا کچھ نہیں رہ گیا۔ شمائل کو سخت شرمندگی ہونے لگی۔ جس شخص سے اس نے ایسی گھٹیا گفتگو کی تھی اس کی ذہانت کا یہ عالم تھا۔ عرشی اور تمام ہی لوگ عرشان میں کھوئے ہوئے تھے۔ اس نے اپنی بائیں سمت دیکھا۔ تیسری سیٹ پر پروفیسر عسکری بیٹھے ہوئے

تھے۔شمائل چونک پڑی۔
تھوڑی دیر کے بعد مہمان چت ہو گئے۔ ایک معمر مہمان نے کھڑے ہو کر عرشان کو سینے سے لگا لیا اور درازی عمر کی دعا دی۔ پھر اس نے 50 ہزار روپے کا ایک چیک عقیدت کے طور پر عرشان کو پیش کیا۔ اس نے اعتراف کیا تھا کہ وہ لوگ اس نوجوان کی جادو بیانی میں گم ہو کر اپنے وقت کو بھی بھول گئے تھے۔
عرشان نے شکریہ کے ساتھ چیک قبول کر لیا۔ لوگ منتشر ہونے لگے تھے۔ عسکری کی نگاہ شمائل پر پڑی تو شمائل نے انہیں سلام کیا اور ان کے پاس پہنچ گئی۔
''کیسی ہو بیٹی؟'' پروفیسر نے مشفقانہ مسکراہٹ کے ساتھ پوچھا۔
''ٹھیک ہوں سر! آپ کافی دنوں سے ہماری کلاس کی جانب تشریف نہیں لائے۔''
''معاف کیجیے گا۔ کیا میں آپ کی گفتگو میں مداخلت کر سکتا ہوں۔'' عقب سے عرشان کی آواز ابھری اور شمائل پلٹ پڑی عرشان پروفیسر عسکری کی جانب متوجہ تھا۔ ''سر چند لمحات درکار ہیں۔''
''کیا بات ہے عرشان میاں، پہلے تو میری طرف سے مبارکباد قبول کرو۔''
''شکریہ سر! آپ نے ایک دن ایک فنڈ جاری کرنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا میرا خیال ہے اس حقیر سی رقم سے اس کی ابتدا کی جائے، میں جب چھٹیوں میں گھر جاؤں گا تو شاہجہانی خانم سے اس فنڈ کے لیے امداد طلب کروں گا۔ اس وقت تک اگر چند ضرورت مندوں ہی کا بھلا ہو جائے تو ہم دیر کیوں کریں۔'' عرشان نے کہا۔
''اوہ......'' پروفیسر عسکری نے پر عقیدت نگاہوں سے عرشان کو دیکھا۔ ''شکریہ بیٹے۔ تم نے میرے ایک اور دیرینہ خواب کی تکمیل کی ہے خدا تمہیں اس کا اجر عطا فرمائے۔ خدا کی قسم، اچانک ہی میری زندگی کے ایک اہم مشن کی تکمیل کی ابتدا ہو گئی ہے۔''
''سر، میں بھی اس فنڈ کے بارے میں تفصیلات معلوم کر سکتی ہوں۔'' شمائل نے درمیان میں مداخلت کی اور عرشان نے چونک کر اسے دیکھا پھر سلام کیا۔ شمائل نے بادل ناخواستہ جواب دیا تھا۔ وہ نجانے کیوں اسے مبارکباد بھی پیش نہ کر سکی۔ حالانکہ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ بھی اپنی عقیدت کا اظہار کر دے۔
''شمائل بیٹے! میں محدود وسائل رکھنے والا ایک خوفزدہ سا انسان ہوں۔ لیکن عرشان سے میں بہت بے تکلف ہوں۔ معاف کرنا تم دونوں کا تعارف تو ہو گا۔''
''جی ہے۔'' شمائل بے اختیار مسکرا دی۔ عرشان کی مسکراہٹ تو کبھی ختم ہی نہ ہوتی تھی۔
''تو میں نے ایک دن عرشان سے تذکرہ کیا تھا کہ یونیورسٹی میں ایسے بیشمار نوجوان ہیں جو بے پناہ مسائل کا شکار ہیں... اور بعض اوقات انہی مسائل سے ان کی صلاحیتیں داغدار ہوتی ہیں، ہم ایسے نوجوانوں کو تلاش کر کے ان کے چھوٹے چھوٹے مسائل حل کریں گے تاکہ وہ اپنی تعلیم مکمل کر کے ملک کے لیے کارآمد شہری بن سکیں۔ اسی سلسلے میں، میں نے ایک فنڈ جمع کرنے کی کوشش کی تھی لیکن شمائل بیٹے، ماحول بے حد خوفناک ہے۔ تنگدست انسان کا خلوص مشکوک ہوتا ہے، جاننے والوں کی بات دوسری ہے اس لیے خیال کی حد سے آگے نہ بڑھ سکا تھا۔''
''بہت ہی پاکیزہ خیال ہے سر! میں اس فنڈ کے لیے پچاس ہزار کی پیشکش کرتی ہوں۔ گھر سے رقم منگوانے میں تھوڑی دیر لگے گی لیکن آپ یہ رقم میرے نام لکھ لیں۔''
''آج تو تم دونوں نے مسرتوں کے خزانے میری گود میں ڈال دیے ہیں۔ تو تم دونوں کے نام سے میں اس مشن کی ابتدا کرتا ہوں۔''
''سر، میں دوسرے لوگوں کو بھی اس کے لیے تیار کروں گی۔''
''ضرور بیٹی...... لیکن صاحب ظرف ہونا ضروری ہے۔ اس کا وعدہ کرو کہ کم ظرف انسان سے اس میں شرکت کے لیے نہیں کہو گی۔''
''وعدہ سر......''
''اور ہاں...... اس سلسلے میں ایک جامع پروگرام کے لیے میں تم دونوں کو پھر تکلیف دوں گا۔'' پروفیسر نے کہا اور پھر کسی کے پکارنے پر اس طرف بڑھ گئے۔
''عرشان صاحب! میری جانب سے بھی اپنی عمدہ گفتگو پر مبارکباد قبول فرمائیے۔''
''شکریہ مس شمائل۔''
''آپ کا قیام بھی ہاسٹل ہی میں ہے؟''
''جی ہاں۔''
''اس دن گرمی اور جھنجلاہٹ دونوں کا شکار تھی اس لیے کچھ غلط بات کر گئی تھی جس کے لیے معافی چاہتی ہوں۔''
''کوئی بات نہیں۔'' وہ سیر چشمی سے بولا۔ اور اب اس کے پاس رکنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ عرشی بھی نزدیک ہی

تھی اور ساری گفتگو سن رہی تھی بعد میں اس نے ناک میں دم کر دیا۔ اور شمائل نے صاف گوئی سے اسے سب کچھ بتا دیا۔ البتہ یہ بات صاف چھپا گئی کہ وہ اس سے پہلے ہی دن سے متاثر ہے۔
آج عسکری صاحب نے اپنے گھر چائے پر دونوں کو مدعو کیا تھا اور وہ اس وقت اپنی گاڑی میں جا رہی تھی کہ تھوڑی دور چل کر ہی اسے ٹھٹک جانا پڑا۔ عرشان سڑک کے کنارے پریشان کھڑا تھا۔ ایک لمحے کے لیے اس نے سوچا کہ آنکھ بچا کر نکل جائے لیکن ضمیر نے اس کی اجازت نہیں دی۔ کشمکش کے عالم میں اس نے کار کی رفتار سست کی اور عرشان کے نزدیک پہنچ گئی۔ عرشان اسے دیکھ کر مسکرا دیا تھا۔
''غالباً آپ بھی پروفیسر عسکری کے گھر جا رہی ہیں۔''
''جی ہاں۔'' شمائل نے مختصراً جواب دیا۔
''میرا خیال ہے، اب مجھے آپ کے ساتھ ہی نکل جانا چاہیے بڑی دیر سے رکشا یا ٹیکسی کا انتظار کر رہا ہوں۔'' عرشان نے بڑی بے تکلفی سے کہا۔
لیکن اس کے انداز میں کوئی کھوٹ نہیں تھا۔ شمائل نے دوسری سمت کا دروازہ کھول دیا اور عرشان اس کے نزدیک بیٹھ گیا۔ شمائل نے کار آگے بڑھا دی۔ لیکن عرشان کی اس قدر قربت کو وہ عجیب سا محسوس کر رہی تھی۔ پھر عرشان نے ہی نہایت بے تکلفی سے شمائل کو مخاطب کیا۔
''آپ کا تعلق کسی خاصے بڑے گھرانے سے معلوم ہوتا ہے۔ جس کا مظہر یہ کار اور اس دن آپ کی طرف سے خاصی بڑی رقم کی پیشکش ہے۔ ویسے یہ حقیقت ہے کہ پروفیسر عسکری نے نہایت عمدہ بات سوچی ہے۔ آپ یقین کریں شمائل بہت سے لڑکے اور لڑکیاں ایسے ہیں جنہیں تعلیم کا شوق ہے لیکن ان کے مسائل ان کی ذہنی صلاحیتوں کو زنگ آلود کر دیتے ہیں اور وہ اپنا مستقبل کھو بیٹھتے ہیں۔''
''آپ کا خیال درست ہے عرشان صاحب۔'' شمائل نے آہستہ سے کہا۔
''خدا کرے پروفیسر عسکری کا یہ مشن کامیاب ہو جائے۔ لیکن ہمارے پروگرام یہیں ختم نہیں ہو جاتے مس شمائل! ابھی پروفیسر عسکری سے مل کر ہمیں یہ بھی تو طے کرنا ہے کہ ان لوگوں کو کس طرح تلاش کیا جائے؟ ظاہر ہے ان کی خودداری مجروح نہیں کی جا سکتی۔''
''درست......'' شمائل نے سامنے دیکھتے ہوئے کہا۔
''یہ کام کس طرح ہو؟''
''یہ گفتگو تو ہم پروفیسر کے سامنے بھی کر سکتے ہیں، آپ

علاج

ایک عورت نے اپنی سہیلی سے سر درد کی شکایت کی تو سہیلی نے مشورہ دیا۔
''جب میرے سر میں درد ہوتا ہے تو میرا شوہر بڑے پیار سے سر دباتا ہے اور اتنی محبت کا اظہار کرتا ہے کہ دیکھتے ہی دیکھتے درد غائب ہو جاتا ہے، میرے خیال سے تم بھی یہ نسخہ آزما کر دیکھو......''
''ہاں، ہاں ضرور...... تمہارا شوہر کب تک گھر آئے گا؟'' عورت نے اشتیاق سے پوچھا۔

●●● ✻✻✻ ●●●

حسب توفیق

ایک نوجوان ایک مہنگے اور فیشن ایبل علاقے کے بڑے ڈیپارٹمنٹل اسٹور میں داخل ہوا اور سیلز گرل سے بولا۔ ''میں اپنی منگیتر کے لیے کوئی اچھا سا تحفہ خریدنا چاہتا ہوں۔''
''یہ سلیپنگ گاؤن لے جائیں، چار ہزار روپے کا ہے۔'' سیلز گرل نے مشورہ دیا۔
''نہیں نہیں، یہ تو بہت مہنگا ہے۔'' نوجوان بولا۔
''تو پھر یہ میک اپ کٹ لے جائیں صرف ڈھائی ہزار روپے کی ہے۔''
''یہ بھی مہنگی ہے، اس سے کم قیمت کوئی چیز دکھائیں۔''
''یہ پرفیوم لے جائیں، سات سو روپے کا ہے۔'' سیلز گرل بولی۔
''یہ بھی میری گنجائش سے زیادہ ہے۔ اس سے بھی سستی کوئی چیز دکھائیے۔'' نوجوان نے فرمائش کی۔
''تو پھر ایسا کریں، یہاں سے کوئی چیز خریدنے کے بجائے کونے والے موچی سے اپنی منگیتر کے جوتوں میں نئی ایڑیاں لگوا دیں۔'' سیلز گرل نے شیریں لہجے میں مشورہ دیا۔

مرسلہ: ماہا ایمان، حافظ آباد

کچھ اپنے بارے میں بتایئے۔'' شمائل نے نجانے کس طرح یہ الفاظ کہے' اسے سخت حیرت ہوئی تھی۔

''اپنے بارے میں' میں آپ کو کیا بتاؤں مس شمائل! ان بے شمار نوجوانوں کے مانند ہوں جو یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ ایک چھوٹے سے پہاڑی دیہات کا باشندہ ہوں۔ طویل عرصہ سے اپنے دیہات سے دور حصول علم میں کوشاں ہوں۔ چھٹیوں میں چلا جاتا ہوں تو کچھ لوگ خوش ہوجاتے ہیں۔ پھر واپس آجاتا ہوں۔''

''آپ کے والد کیا کرتے ہیں؟'' شمائل نے سوچا کہ جب بات شروع ہوچکی ہے۔ تو پھر اسے ادھورا چھوڑنا مناسب نہیں تھا۔

''ان کی آسمانی مصروفیات نامعلوم ہیں۔ کیونکہ زمین سے انہوں نے اپنا تعلق ختم کرلیا ہے۔'' عرشان نے کسی قدر ظرافت سے کہا اور شمائل نے ایک لمحے کے لیے ونڈ اسکرین سے نگاہیں ہٹا کر اسے دیکھا اور پھر جلدی سے سامنے دیکھنے لگی۔

''تو کیا وہ......'' اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''ہاں اس دنیا کو ناپسند کرکے انہوں نے دوسری دنیا کا رخ اختیار کرلیا۔ اور ان کے تذکرے سے میری آواز میں بھراہٹ یا تاسف یوں نہیں ہے کہ میں نے کھلی آنکھوں سے انہیں دیکھا ہی نہیں۔ شفقت کا وہ لمس جس کا تذکرہ کتابوں میں اور لوگوں کی داستانوں میں ملتا ہے۔ اگر مجھے بھی نصیب ہوا ہوتا تو شاید میری آواز میں اتنی بیباکی نہ ہوتی۔''

''والدہ ہیں......؟''

''ہاں ...... میں انہیں بے حد چاہتا ہوں۔ اس کائنات میں سب سے زیادہ اگر میں انہیں اتنا نہ چاہتا تو ان کے اصولوں سے بھی کبھی اتفاق نہ کرتا۔ انہی اصولوں سے اتفاق کرتے ہوئے میں نے عرشان تشکیل کیا ہے۔ ورنہ ماحول سے ہٹی ہوئی زندگی بہت کچھ بدل دیتی ہے۔ بدلنے کی خواہش میرے ذہن میں بھی جاگتی ہے لیکن ...... لیکن میں اصولوں کے اس قطب مینار کو بہت چاہتا ہوں جس کا نام ماں نہیں ''شاہجہانی خانم'' ہے۔ اس قطب مینار کی آخری منزل بادلوں میں گم ہے۔'' عرشان کی آواز میں کھویا کھویا پن تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ بھول گیا ہو کہ وہ کسی سے گفتگو کررہا ہے۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ صرف اپنے احساسات سے ہمکلام ہو...... اس کی ذات کا یہ پہلو بھی شمائل کے لیے بہت پرکشش تھا اور وہ عرشی کی بات سے اتفاق کیے بغیر نہ رہ سکی کہ عرشان کی ذات میں ایک ایسی انوکھی کشش ہے جو مقابل کو مسحور کردیتی ہے۔

لیکن افسوس وہ اس سلسلے میں مزید گفتگو نہ کرسکی' ان کی منزل آگئی تھی۔ اس نے سوچا کہ پھر کسی وقت اس کے بارے میں پوری تفصیل ضرور معلوم کرے گی۔

☆☆☆

بوڑھے افضال احمد نے کئی بار سوچا کہ ان حالات سے بڑے سرکار کو مطلع کرے اور اپنی وفاداری کا قرض ادا کرے لیکن محبت اسے روکتی تھی۔ جب انہیں ان حرکتوں کا علم ہوگا تو وہ سخت پریشان ہوجائیں گے اور نمک خوار کی وفا پریشانی برداشت نہیں کرسکتی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ کسی طرح شیرزاد کو خود بخود احساس ہوجائے کہ ان تلوں سے تیل نہیں نکل سکتا۔

پہاڑوں کی یہ محنت کش لڑکیاں اپنے غریب والدین کا غرور ہیں۔ وہ دن رات اسی کوشش میں مصروف تھا۔ لیکن جب سے شہر سے تین لفنگے قسم کے آدمی شیرزاد کے دوستوں کی حیثیت سے یہاں آکر مقیم ہوئے تھے، افضال احمد کی ہمت جواب دیتی جارہی تھی۔ اب اس عمارت میں شراب کی بو بھی پھیلتی اور قرب وجوار کی کاروباری عورتوں کے پھیرے بھی ہوتے جو اس خاندان میں کبھی نہیں ہوئے تھے اور افضال احمد اپنے آقا زادے کی ان حرکتوں سے سخت پریشان ہوگیا تھا۔

دوسری طرف شیرزاد کو یقین ہوگیا تھا کہ جب تک افضال احمد زندہ ہے اس کی دال نہیں گلے گی۔ اس نے بارہا محسوس کیا کہ افضال احمد اس کی نگرانی کرتا ہے۔ جہاں وہ کسی لڑکی کے قریب پہنچا افضال احمد آموجود ہوا۔ بلکہ شیرزاد کا تو خیال تھا کہ اس نے ان لڑکیوں کو کسی نہ کسی طرح ہوشیار بھی کردیا ہے۔

''حسن ہی حسن۔ لیکن یار کنوئیں بھرے پڑے ہیں اور تم پیاس کا رونا رو رہے ہو۔'' شیرزاد کے ایک اوباش دوست نے درخت کاٹنے والی لڑکیوں کو للچائی ہوئی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا جن کے جسموں کا ایک ایک نقش صحت وجوانی سے بھرپور تھا۔

''کم بخت افضال احمد راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔'' شیرزاد نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

''کون افضال احمد؟''

''ہے ایک شخص۔''

''وہ...... تمہارا بوڑھا ملازم۔''

''ہاں......''

''ملازم اور رکاوٹ؟''

''اوہ ...... اوہ ازل شاہ صاحب کا منہ چڑھا ہے۔'' شیرزاد نے نفرت سے کہا۔

''اسے شہر بھجوا دو ...... بے ایمانی کا الزام لگا دو اس پر ہم سب نے خود دیکھا ہے کہ وہ درخت کاٹنے والے مزدوروں سے اپنا کمیشن وصول کرتا ہے۔ بھلا مالک کی موجودگی میں یہ کیسے ممکن ہے۔'' دوست نے مکاری سے مسکراتے ہوئے کہا۔

''نہیں یار، وہ بے حد ایماندار ہے۔ ڈیڈی یقین نہیں کریں گے اور پھر وہ کم بخت جاکر ہماری پول بھی کھول سکتا ہے۔''

''کتنی عمر ہوگی اس کی؟'' دوست نے پوچھا۔

''یہ ہی کوئی پچاس پچپن سال ...... کیوں؟'' شیرزاد نے پوچھا۔

''اوہ اس عمر میں تو انسان کو ریٹائرڈ ہوجانا چاہیے۔ کیا ضروری ہے ڈیئر کہ افضال احمد اب اس دنیا میں رہے۔ یہاں چاروں طرف گہری کھائیاں بکھری پڑی ہیں۔ کسی بھی گھائی سے اس کا پیر پھسل سکتا ہے۔ دیکھوناں ...... بوڑھا آدمی ہے۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اور شیرزاد چونک کر اسے دیکھنے لگا۔

''یہ کام میرے ذمے میری جان!''

اور اس دوپہر شیرزاد بذات خود درختوں کی کٹائی کے کام کی نگرانی کررہا تھا کہ ایک مقامی آدمی نے غمناک لہجے میں ...... افضال احمد کے گھائی میں گر جانے کی اطلاع دی ایک شخص نے اسے اپنی آنکھوں سے گھائی میں گرتے دیکھا اور دوسرے لوگوں کو اطلاع دی۔ یہ شخص شیرزاد کا دوست تھا جس نے غمزدہ لہجے میں بتایا۔

غمزدہ شیرزاد نے اپنے وفادار ملازم کے سوگ میں کام بند کردیا۔ اور پھر وہ افضال احمد کے جنازے کے ساتھ ساتھ پیدل چل کر اس کی دفن گاہ تک گیا، وہ بہت افسردہ تھا۔ اور لوگ دیکھ رہے تھے کہ مالک کا بیٹا ان کا کتنا ہمدرد اور غمگسار ہے۔ اس نے آدھے دن کی چھٹی ہونے کے باوجود پورے دن کی مزدوری بھی دی تھی۔ دوسرے دن سے سارے کام بہ دستور شروع ہوگئے۔

افضال احمد کی موت کا سوگ پیٹ تو نہیں بھر سکتا تھا۔ ہاں تیسرے دن جب اس کا سوئم تھا تو مالک نے پورے دن کی چھٹی پوری مزدوری کے ساتھ دے دی اور یوں اس کے گن گائے جانے لگے۔ اس کے بارے میں مزدوروں کی رائے بہت اچھی تھی۔

لیکن ایک دن ہنگامہ ہوگیا، یہ ہنگامہ حمیدہ نے کیا تھا۔ حمیدہ درمیانی عمر کی عورت تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ شیرزاد نے اسے دو سو روپے روز کی پیش کش کی اور کہا کہ اسے کٹائی کا کام بھی نہیں کرنا پڑے گا۔ وہ عورتوں کی نگرانی کرے گی۔ حمیدہ خوشی سے تیار ہوگئی تو شیرزاد نے اسے اپنے گھر بلا کر اس کی خاطر مدارات کی اور پھر اس نے بڑی شرمناک بات کہی۔ اس نے کہا کہ دو سو روپے تو حمیدہ کو مزدوری کے ملیں گے لیکن وہ چاہے تو دو سو، تین سو روپے روزانہ بھی کما سکتی ہے۔ حمیدہ نے حیرت سے پوچھا کہ کس طرح تو شیرزاد نے کہا کہ کٹائی کا کام کرنے والی لڑکیوں کو بہلا پھسلا کر شیرزاد کے گھر پہنچایا جائے۔ ان لڑکیوں کی ضرورتیں بھی پوری کی جائیں گی اور حمیدہ کو ہر نئی لڑکی کے آنے پر انعام بھی دیا جائے گا۔ حمیدہ نے یہ بات اپنے شوہر کو بتاتے ہوئے کہا کہ اس نے اس بات پر شیرزاد کے منہ پر ایک تھپڑ بھی رسید کیا اور تھوک بھی دیا اور پھر چلی آئی۔

حمیدہ کے شوہر نے یہ بات دوسرے لوگوں کو بھی بتائی۔ حمیدہ کے جھوٹ بولنے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ چنانچہ لوگ جمع ہوکر شیرزاد کی رہائش گاہ پر پہنچ گئے۔ شیرزاد نے حیران سی صورت کے ساتھ ان کا استقبال کیا۔

''حمیدہ کیا کہہ رہی ہے مالک؟'' حاتم علی نے پوچھا۔

''کیا بات ہے، حاتم علی؟''

''جو کچھ وہ کہہ رہی ہے۔ ٹھیک ہے مالک؟'' حاتم علی کی آنکھیں سرخ ہورہی تھیں۔

''حاتم علی اپنے بات کرنے کا انداز ٹھیک کرو اور بتاؤ کیا بات ہے؟'' شیرزاد بھی کچا نہیں تھا۔ اور حاتم علی نے حمیدہ کا الزام دہرا دیا۔

''کہاں ہے۔ حمیدہ کو... میرے سامنے لاؤ ...... اس نے بڑی غلط حرکت کی ہے اتنی سی بات کے لیے اس نے مجھ پر اتنا بڑا الزام لگایا ہے۔ حمیدہ کے بیٹے کی کیا عمر ہے حاتم علی؟''

''حمیدہ کا بیٹا۔ چودہ پندرہ سال کا ہے لیکن ......''

''وہ میرے پاس آئی تھی، کہنے لگی کہ مالک! میرے بیٹے کو بھی کام پر لگا دو۔ میری گزر نہیں ہوتی ...... میں نے کہا کہ حمیدہ تیرا بیٹا بہت چھوٹا ہے۔ تب وہ ضد کرنے لگی اور میں نے بھی غصے سے انکار کردیا۔ تب وہ مجھے دھمکیاں دیتی چلی گئی کہ میں نے اچھا نہیں کیا۔ وہ مجھ سے انتقام لے گی۔ کیا تم لوگ ان حرکتوں سے مجھے اس بات پر مجبور کرسکتے ہو۔''

سب حیرت سے ایک دوسرے کی شکلیں دیکھنے لگے اور حاتم علی نے حمیدہ کے شوہر جلال دین سے کہا۔ ''کیوں

جلال دین مالک کے ساتھ یہ حرکت؟
جلال دین بھی بغلیں جھانکنے لگا۔ تب حاتم علی ہاتھ جوڑ کر بولا۔ ''اگر یہ بات ہے مالک تو ہم سب شرمندہ ہیں۔ تم مالک ہو جسے چاہو نوکری پر رکھو جسے چاہو نکال دو لیکن مالک ہماری عزت زندگی سے زیادہ قیمتی ہے، ہم کبھی تمہارے پاس نہ آتے اگر بات عزت کی نہ ہوتی۔''

اور وہ چلے گئے۔ شیرزاد کا چہرہ غصے سے سرخ ہوگیا تھا ''عزت کے لیے جیتے ہیں۔ گدھے کہیں کے جبھی تو اور آسائشوں سے محروم ہیں۔

''لیکن اب ہوگا کیا شیرزاد؟ کیا ان پتھروں سے سر پھوڑتے رہو گے؟'' شیرزاد کے ایک دوست نے کہا۔

''میں لعنت بھیج دوں گا اس کام پر اس علاقے پر...... بھلا یہ کوئی رہنے کی جگہ ہے۔ صاف کہہ دوں گا ڈیڈی سے کہ ان جنگلیوں کے ساتھ میرا گزارہ ممکن نہیں ہے۔''

دوسرے دن ہی اس نے ازل شاہ کو فون پر بتایا کہ افضال احمد کی اتفاقیہ موت کے بعد وہ یہاں کے حالات سنبھالنے سے قاصر ہے کسی اور کو یہاں فوراً بھیج دیا جائے تاکہ وہ واپس آسکے۔

''چلنے سے پہلے کچھ نہیں کرو گے۔ شیرزاد؟'' ایک دوست نے پوچھا۔

''کیا مطلب؟''

''جانا تو ہے ہی۔ انگلیاں ٹیڑھی کرلو، جو بھی پسند آجائے کم از کم یہ تو نہیں سوچو گے کہ ان پہاڑوں سے کچھ حاصل نہ ہوسکا۔''

''نہیں یار وحشی لوگ ہیں۔ گڑبڑ کردیں گے۔''

''تو پھر ہمیں ہی اجازت دے دو۔''

''تم کیا تیر مارو گے؟''

''اجازت دو تو مار کر دکھادیں۔'' وہ سب اپنی اپنی ڈینگیں ہانکنے لگے۔ شیرزاد بور ہوکر اٹھ گیا تھا۔ لیکن دوسرے دن جب وہ جنگلوں کی جانب جارہا تھا۔ راستے میں گل نور نظر آئی۔ بستی کی سب سے حسین لڑکی جو دودھ کے طرح سفید اور شاخ گل کی طرح نازک تھی۔ لمبے لمبے بال دو چوٹیوں میں گندھے ہوئے تھے اور آنکھوں میں دو پاکیزہ کنول کھلے ہوئے تھے۔ اس نے نخوت سے شیرزاد کو دیکھا۔

''گاڑی کیوں روک دی بابو جی!'' اس نے متانت سے پوچھا۔

''کہاں جارہی ہو، تم کیا اسی بستی میں رہتی ہو؟''

''ہاں...... اسی بستی میں رہتی ہوں۔ اور بیکار گفتگو نہیں کرتی۔ جہاں جارہے ہو جاؤ، میں شیر خان کی بیٹی ہوں سمجھے...... بس اب دفعان ہو جاؤ۔'' اس نے کہا اور آگے بڑھ گئی۔

''اگر تم اتنے ہی شریف رہے تو اس ملک میں تمہارا گزارہ نہیں ہوگا۔ اٹھالو اسے، دور دور تک کوئی نہیں ہے کچھ تو کرو...... کم از کم کچھ کرنے کی عادت ہی پڑ جائے گی۔'' شیرزاد کے دوستوں نے اسے اکسایا۔

''یار نجانے یہ کون ہے۔ بستی کے تمام لوگ ہی مزدور پیشہ نہیں ہیں۔ بہت سے ایسے ہیں جو خود بھی خاصی اہمیت کے حامل ہیں۔'' شیرزاد نے کسی قدر ہچکچائے ہوئے انداز میں کہا۔

''تب پھر ٹھیک ہے۔ شیرزاد، ہمارا وقت کیوں ضائع کررہے ہو۔'' اس کے دوست بور ہوکر بولے۔

''یار ہمت نہیں پڑتی۔''

''تو پھر ہمیں اجازت دو...... ہم ہی کچھ ہمت کرلیتے ہیں۔'' وہ لوگ بولے اور شیرزاد بھی بالآخر ان کے فریب میں آگیا۔

''ٹھیک ہے چلو اٹھالو۔ لیکن ذرا چاروں طرف نگاہ رکھو۔'' اس نے کہا اور جیپ آگے بڑھادی۔

گل نور آہستہ خرامی سے پراطمینان انداز میں آگے بڑھ رہی تھی۔ جیپ اس کے قریب پہنچی اور دفعتاً شیرزاد کے ساتھی جیپ سے اتر کر اس پر ٹوٹ پڑے۔ انہوں نے گل نور پر قابو پانے کے لیے پہلے اس کا منہ بند کیا اس کے بعد اس کے کومل بدن کو بازوؤں میں اٹھا کر جیپ کے نزدیک پہنچ گئے۔ گل نور سخت جدوجہد کررہی تھی۔ لیکن وہ نازک اندام سی حسینہ ان وحشیوں سے اپنے آپ کو نہیں چھڑا سکی اور جیپ تیزی سے واپس پلٹ گئی۔

شیرزاد آج تک اپنی فطری بزدلی کی وجہ سے گاؤں کی لڑکیوں میں سے کسی پر ہاتھ نہیں ڈال سکا تھا۔ لیکن بالآخر آج اس کے دوستوں نے اسے بہکا دیا اور اس نے اپنی تقدیر پر گہری سیاہی پھیر لی۔ گل نور کو لیے ہوئے وہ لوگ ایک عمارت میں پہنچے اور شیرزاد اپنے دوستوں کی مدد سے اسے ایک ویران کمرے میں لے آیا۔ نور گل بپھری ہوئی شیرنی کی طرح مدافعت کے لیے تیار تھی۔ وہ بھی خوں خوار نگاہوں سے شیرزاد کو دیکھ رہی تھی۔

''تو نے...... تو نے شیر خان کی عزت پر ہاتھ ڈالا ہے۔ وحشی کتے، یاد رکھ...... شیر خان تجھے قبر کی گہرائیوں میں بھی نہیں چھوڑے گا۔ مجھے چھوڑ دے ورنہ تیرا پورا خاندان

سکون کی زندگی نہیں گزار سکے گا۔ دیکھ مجھے چھوڑ دے، مجھے یہاں سے جانے دے۔'' نور گل کے تیور اتنے خراب تھے کہ شیرزاد نروس ہونے لگا۔

''اسے بند کردو شیرزاد! آؤ باہر آؤ......'' شیرزاد کے دوستوں نے کہا۔ شیرزاد ان کے ساتھ باہر نکل آیا۔ ''یہ کیا کیفیت ہورہی ہے تمہاری۔''

''یار کیا کروں وہ بڑی خوفناک باتیں کررہی ہے۔ میرا خیال ہے اسے چھوڑ دو۔ خوامخواہ کوئی مصیبت کھڑی نہ ہوجائے۔'' شیرزاد نے خوفزدہ لہجے میں کہا۔

''فضول آدمی ہو تم، اسے ہمارے حوالے ہی کردو۔''

''میرا خیال ہے اسے شربت حوصلہ پلاؤ۔ چلو، یہ تو بالکل ہی انگریز نکلا ولایت میں رہ کر یار میرا بالکل ہی بزدل ہوگیا۔'' دوستوں نے کہا اور پھر شراب کے چند پیگ نے شیرزاد کے ذہن کو ہوش سے بیگانہ کردیا اور وہ پھر دوبارہ گل نور کے کمرے میں داخل ہوگیا۔ اس وقت گل نور فرش پر چاروں خانے چت پڑی تھی۔ اس نے دیواروں سے سر ٹکرایا تھا اور بے ہوش ہوگئی تھی۔

''اوہ...... اس نے تو میری مدد خود کردی۔ شکریہ لڑکی...... شکریہ۔'' شیرزاد اس کا لباس نوچنے لگا۔ اس نے گل نور کا ہوش میں آنا ضروری نہیں سمجھا تھا لیکن اس کی دست درازیوں نے گل نور کو پھر بیدار کردیا، اس نے پوری قوت سے مدافعت کی لیکن شیرزاد دیوانہ ہوچکا تھا۔ گل نور خود کو اس کی گرفت سے نہیں چھڑا سکی۔ اس کی دل خراش چیخیں گونجتی رہیں اور پھر وہ نڈھال ہوگئی۔

☆☆☆

گلاب چرواہے نے ایک ٹیلے سے یہ منظر دیکھا تھا۔ اس کی بکریاں ٹیلے کے دوسری طرف چر رہی تھیں اور وہ خود ٹیلے پر ایک ایسی چٹان پر لیٹا ہوا تھا جو سایہ دار تھی اور ایک انسان کو پناہ دے سکتی تھی۔ شیر خان کی بیٹی کو وہ دور سے ہی پہچان لیتا تھا اور شیرزاد کو بھی۔ خود اس کا باپ ٹھیکیدار کا ملازم تھا اور درختوں کی کٹائی کا کام کرتا تھا۔ جبکہ وہ خود شیر خان کی بھیڑیں بکریاں چراتا تھا۔ جیپ واپس مڑی تو وہ دیوانہ وار بستی کی طرف بھاگا۔ لیکن بستی نزدیک تو نہیں تھی۔ جب وہ بستی میں پہنچا تو اس کا سانس بری طرح پھولا ہوا تھا۔ شیر خان کا مکان بستی کا سب سے اونچا مکان تھا۔ اس کی بے شمار...... زمینیں تھیں اور وہ بستی کا سب سے متمول آدمی تھا۔ نیک غیور نفس گل نور اس کی اکلوتی بیٹی تھی اور پوری بستی کی عزت، سب ہی اس سے پیار کرتے تھے۔

''کیا بات ہے گلاب! یہ کیا حالت ہورہی ہے تیری؟'' شیر خان کے ایک نوکر نے دروازے پر اس سے پوچھا۔

''مالک کہاں ہے...... کہاں ہے؟'' گلاب کے منہ سے بہ مشکل آواز نکلی۔

''اندر موجود ہے۔ لیکن...... لیکن ہوا کیا...... کیا بکریوں پر کوئی درندہ آپڑا؟''

''مجھے مالک سے ملادو...... دیر کرو گے تو مالک کے عتاب کا شکار ہوجاؤ گے۔'' گلاب نے کہا اور نوکر نے پریشانی سے گردن ہلائی۔

''عجیب باتیں کررہا ہے تو۔ اچھا میں مالک کو اطلاع کرتا ہوں۔'' وہ اندر چلا گیا۔ گلاب خان بڑی بے چینی سے اس کی واپسی کا انتظار کرنے لگا۔ پھر نوکر واپس آکر بولا۔ ''میں نے اندر کہہ دیا ہے۔ مالک غسل کررہے ہیں۔''

''آہ...... مجھے اندر جانے دو۔ مجھے اندر جانے دو۔'' وفادار شخص یہ غلیظ بات کسی دوسرے کو نہیں بتانا چاہتا تھا۔ کافی دیر کے بعد شیر خان تک اس کی رسائی ہوسکی۔

''بہت دیر کردی مالک، بہت دیر کردی۔ جلدی چلو، آہ...... میں بدنصیب کسی دوسرے کو تو یہ بات نہیں بتاسکتا تھا۔ مالک کی عزت کا سوال تھا۔'' گلاب خانے ہاتھ ملتے ہوئے کہا اور شیر خان چونک پڑا۔

''کیا بات ہے گلاب؟''

''گل نور...... گل نور۔'' گلاب کے منہ سے بہ مشکل نکلا اور شیر خان اچھل پڑا۔

''کیا ہوا گل نور کو؟'' اس کی آواز گرجدار تھی۔

''وہ کتے...... وہ چاروں کتے اسے زبردستی پکڑ کر لے گئے ہیں۔ مالک وہ اسے جیپ میں ڈال کر لے گئے ہیں۔''

''کون......؟'' شیر خان کی آنکھیں خون اگلنے لگیں۔

''ٹھیکیدار کا بیٹا اور اس کے ساتھی۔ گل نور پگڈنڈی پر جارہی تھی۔ وہ نیچے اترے اور...... اور میں نے بہت دور سے انہیں دیکھا تھا۔ مالک جیپ ٹھیکیدار کے بنگلے کی طرف جارہی تھی۔'' گلاب خان نے کہا اور شیر خان دوڑتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔

چند لمحات کے بعد اس کا گھوڑا زمین سے پیٹ لگائے ٹھیکیدار کی رہائش گاہ کی طرف دوڑ رہا تھا جو بستی سے کافی دور تھی۔ رائفل اس کے ہاتھ میں تھی اور ہونٹ بھینچے ہوئے تھے۔ اس کے ذہن میں طوفان گرج رہے تھے۔ گل نور اس کی جنت کا واحد پھول تھی۔ اس کی آنکھوں کی چمک، اس کی

سر بلندی، اس کی پیشانی کا غرور جس کے سامنے بستی کے ہر آدمی کی نظر جھک جاتی تھی۔ ٹھیکیدار کتے کی یہ مجال......! وہ سوچ رہا تھا۔

عمارت کے آہنی پھاٹک سے شریفوں کے مانند گزرنا کیا معنی رکھتا تھا۔ گھوڑے نے ایک زقند لگائی اور پھاٹک سے گزر گیا۔ تب شیر خان نیچے اترا اور رائفل سیدھی کیے اندر داخل ہو گیا۔ پھر اس کے حلق سے گرجدار آواز نکلی۔

''گل نور۔''

اور اس آواز نے عمارت میں موجود لوگوں کو لرزا کر رکھ دیا۔ شیر زاد کا نشہ ہرن ہو گیا۔ گل نور اس سے چند گز کے فاصلے پر بے سدھ پڑی تھی۔ وہ جلدی سے اٹھ گیا۔ لباس وغیرہ درست کیا لیکن اتنی دیر میں شیر خان اس کے سر پر پہنچ گیا تھا۔

شیر زاد نے اس دیوہیکل سردار کو دیکھا اور اس کا دل دھڑکنا بھول گیا۔ وہ ایک لمحے کے لیے خود کو موت کی وادیوں میں محسوس کرنے لگا۔ شیر خان کی وحشت ناک نگاہوں نے اندر کا منظر دیکھا۔ اسے دیر ہو چکی تھی، اس کی جنت کا پھول مسلا جا چکا تھا۔ غرور کی زندگی ختم ہو چکی تھی۔ عزت کی کچلی ہوئی لاش سامنے پڑی تھی۔ اس کے دفاع میں جہنم کے شعلے بلند ہو گئے۔ ''ٹھیکیدار!'' اس کے حلق سے ہزاروں آوازیں نکلیں اور اس نے رائفل سیدھی کر لی۔ لیکن اسی وقت عقب سے کئی دھماکے ہوئے اور شیر خان ڈگمگا گیا۔ رائفل اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی اور اس نے دونوں ہاتھ پھیلا دیے۔ پھر اس کے حلق سے خون کی پھوار ابل پڑی اور وہ اوندھے منہ زمین پر آ رہا۔

شیر زاد کے دوست پستولیں سنبھالے ہوئے اندر آ گئے تھے۔ شیر زاد کا چہرہ دھواں ہو رہا تھا۔ ''میں کہتا رہا کہ کوئی گڑبڑ ہو جائے گی، اب...... اب کیا ہو گا۔''

''فوراً یہ علاقہ چھوڑ دو شیر زاد! فوراً نکل چلو یہاں سے ورنہ ایک بھی زندہ نہیں بچے گا۔''

''چلو......'' شیر زاد بولا۔ اور تھوڑی دیر بعد وہ چاروں جیپ میں سوار ہو کر اندھا دھند بھاگے جا رہے تھے۔

بستی والوں کو پورا دن کچھ پتا نہیں چل سکا۔ پھر جب شیر خان کی لٹی ہوئی عزت اس کی لاش گھوڑے کی پشت پر ڈالے بستی میں داخل ہوئی تو کہرام مچ گیا۔ گل نور کی زبان خاموش تھی۔ سب نے پوچھا لیکن گل نور خاموش رہی۔ البتہ گلاب چرواہا اب اپنی زبان بند نہ رکھ سکا تھا۔

بپھرے ہوئے غیور لوگوں کا ہجوم ٹھیکیدار کی رہائش گاہ پر پہنچا۔ مگر وہ خالی تھی۔ تھوڑی دیر میں وہ صرف ملبے کا ڈھیر رہ گئی اور پھر اس پورے جنگل کو آگ لگا دی گئی جو ٹھیکیدار کی ملکیت تھا۔ لوگ اس سے زیادہ غضب کا اظہار نہیں کر سکتے تھے۔

''افسوس شیر خان کا خون بے قیمت گیا۔''

گل نور کسی بے جان پتھر کے مانند خاموش تھی۔ لیکن کون جانتا تھا کہ اس پتھر کے سینے میں کتنے آتش فشاں کھول رہے ہیں۔

☆☆☆

عرشی نے بڑے اہتمام سے چائے کی پیالی شمائل کے سامنے رکھی اور دوسری پیالی خود لے کر بیٹھ گئی۔ اس کا بایاں گال پھڑ پھڑا رہا تھا۔ شمائل نے کتاب بند کی تو اس کی آنکھوں میں مسکراہٹ رقصاں تھی۔

''تم...... تم پھر مذاق اڑاؤ گی لیکن...... لیکن۔'' عرشی نے جھینپتے ہوئے انداز میں کہا۔

''کون ہے وہ اور کہاں تک پہنچ گیا ہے؟'' شمائل نے سنجیدہ لہجے میں کہا اور عرشی چونک پڑی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آج شمائل کو کیا ہو گیا ہے۔ کہیں یہ کوئی چال نہ ہو۔ لیکن دل کا راز شمائل کے علاوہ کسی اور سے کہہ بھی تو نہیں سکتی تھی۔

''شمائل...... عادل کو جانتی ہو؟ وہ...... وہ چاہتا ہے کہ چھٹیوں میں اپنے والدین کے ساتھ میرے گھر آئے۔ عادل بڑا اچھا انسان ہے۔ یقین کرو، یونیورسٹی کے دوسرے لڑکوں سے مختلف۔'' عرشی نے کہا۔ اور گہری گہری سانسیں لینے لگی۔

''اس کے بعد پڑھنے کا ارادہ نہیں ہے اس کا؟''

''نہیں۔ اس کے والد کا بزنس ہے۔ ان کی خواہش ہے کہ وہ اب ان کا کاروبار سنبھالے۔''

''تم نے اندازہ لگا لیا ہے عرشی کہ وہ سنجیدہ ہے، یونیورسٹی کے رنگین مزاج جوانوں کی طرح صرف تفریح پسند تو نہیں؟''

''ایک بار اس سے ملو گی تو خود اندازہ کر لو گی۔ شمائل یقین کرو وہ بالکل مختلف قسم کا نوجوان ہے۔'' عرشی نے کہا۔

''مجھے اس سے ملواؤ عرشی، لیکن دوسروں کی نگاہوں سے دور رہ کر۔ بس میں چاہتی ہوں کہ لوگوں کی زبانوں پر ان کی اپنی تراشی ہوئی کہانیاں نہ ہوں۔''

عرشی نے شمائل کے بستر پر چھلانگ لگا دی اور بری طرح اس سے چمٹ گئی۔ اگر چائے کی پیالی الگ نہ ہوتی تو یقیناً اوندھ گئی ہوتی۔ عرشی، شمائل کو چوم رہی تھی...... ''خدا

کی قسم شمائل مجھے اپنے والدین کا اتنا خوف نہیں تھا۔ جتنا تمہارا۔ مجھے یقین دلا دو شمائل کہ یہ الفاظ تم نے ہی کہے ہیں۔''

''ہاں...... عرشی ہم لوگ بے حد عجیب ہیں۔ ہمارے ذہن گنہگار نہیں ہوتے لیکن ادوار کی بھول بھلیاں ہمارے لیے ناقابل فہم ہوتی ہیں۔ کم بخت دل انسان کے وجود میں ناقابل تسخیر شے ہوتی ہے۔ میں ایک شریفانہ اقدام پر کیسے نکتہ چینی کر سکتی ہوں۔''

''شمائل...... شمائل...... میری پیاری شمائل، اپنے خیالات میں اس تبدیلی کی وجہ مجھے نہیں بتاؤ گی، بولو۔ مجھے اپنا اعتماد نہیں دو گی۔''

''میں تجھے جانتی ہوں عرشی، تیری چاہت پر مجھے ناز ہے۔ لیکن میرے دل کی کوئی کہانی نہیں ہے۔ ہاں دل کی بات پوچھتی ہو تو وہ سنجیدہ ہو چکا تھا ایک ذات سے اور وہ ہے عرشان۔''

''عرشان؟'' عرشی اچھل پڑی۔

''ہاں...... وہ میرے وجود پر مسلط ہو چکا ہے۔ میں اس کے سامنے اپنی ذات کے اندر ہار چکی ہوں۔''

''یہ ہار تو زندگی کی سب سے بڑی جیت ہوتی ہے شمائل! جب ہم کچھ زندگیوں کا سکون بنتے ہیں۔ اور کچھ زندگیاں ہمارے لیے سکون مہیاں کرتی ہیں۔ اس لیے کوئی جذبہ غیر فطری نہیں کہلاتا ہے۔''

''خود عرشان کا کیا خیال ہے؟'' عرشی نے سوال کیا۔

''ہمارے خیالات سینے کی قید میں پوشیدہ ہیں۔ اعضا قباحت کر جاتے ہیں ورنہ دل زبان کا تعاون حاصل نہیں کر سکتا۔''

''زبان تو یوں بھی ان معاملات میں بے مصرف ہے۔ خدا کرے تمہاری زندگی میں بھی پھول ہی پھول ہوں۔'' عرشی نے پرخلوص انداز میں کہا اور شمائل پیار بھری نگاہوں سے اسے دیکھتی رہی۔

عرشان اور شمائل نے پروفیسر عسکری کی بھرپور مدد کی تھی۔ ان دونوں نے محتاط انداز سے چند لوگوں کو اپنا ہمنوا بنایا تھا۔ شمائل کی مطلوبہ رقم آ گئی تھی جو اس نے پروفیسر عسکری کو پیش کر دی تھی۔

پروفیسر عسکری نے اب تک تین ایسے نوجوانوں کو تلاش کر لیا تھا جو امداد کے مستحق تھے۔ انہیں آج تک خبر نہیں ہوئی تھی کہ ان کے پوشیدہ مددگار کون ہیں، بڑی سکون بخش جدوجہد تھی۔

بہر حال دو دن کے بعد یونیورسٹی بند ہونے والی تھی





اور شمائل اور عرشان دونوں نے کہا تھا کہ وہ واپسی پر اس فنڈ میں مزید اضافہ کریں گے۔ آج کل بیشتر نوجوان اپنے گھروں کو جانے کی تیاریاں کر رہے تھے جو ہاسٹل میں رہتے تھے۔

شمائل نے عرشان سے ملاقات کی۔ ''آپ کب جائیں گے عرشان صاحب؟''

''بس پرسوں شمائل!''

''آپ کا سفر تو خاصا طویل ہے۔ ویسے کبھی سرحد آئے تو آپ کا گاؤں ضرور دیکھیں گے۔''

''ضرور مس شمائل، میری خواہش ہے کہ آپ انہی چھٹیوں میں آ جائیں۔''

''اگر ممکن ہو سکا تو ضرور آؤں گی، ایک بار پھر پتا ذرا تفصیل سے سمجھا دیں۔'' شمائل نے کہا اور عرشان اسے مکمل تفصیل بتانے لگا۔

''ویسے اگر ہو سکے تو آپ مجھے تار دے دیں۔ میں آپ کو وہاں اسٹیشن پر مل جاؤں گا۔''

''بہتر! یوں بھی اس بار میرا تفریحی پروگرام ضرور بنے گا کیونکہ پچھلے سال کہیں نہیں جا سکے تھے۔'' شمائل نے کہا۔

''ہاں پہاڑوں اور دیہاتوں کی زندگی میں بے پناہ حسن ہے۔ تو پھر میں شدت سے انتظار کروں گا۔''

''میں ضرور آؤں گی۔'' شمائل نے جواب دیا۔

☆☆☆

ٹھیکے دار کے جنگل کو آگ لگے تین مہینے گزر چکے تھے۔ کسی نے پلٹ کر خبر نہیں لی تھی۔ کون ٹھیکیدار کی تلاش میں جاتا، کس کے دل کو لگی تھی، خود گل نور نے بھی کوشش نہیں کی تھی وہ بس خاموش تھی۔ ہاں...... اس نے اپنے باپ کی ذمے داریاں سنبھال لی تھیں۔ زمینوں کی بے پناہ آمدنی تھی۔ شیر خان سادہ زندگی گزارنے کا عادی تھا ورنہ دولت کی اس کے پاس کمی نہیں تھی۔ گل نور کی بچپن ہی سے بستی میر علی کے ایک نوجوان سردار گل سے بات پکی ہو چکی تھی۔ سردار گل بھی اعلیٰ خاندان کا چشم و چراغ تھا۔ لیکن ان دنوں وہ ملک سے باہر گیا ہوا تھا اور اس کوشش میں مصروف تھا کہ خود کو گل نور کے قابل بنائے۔

چوتھے مہینے گل نور کی خاص ملازمہ خدیجہ بی نے گل نور میں کچھ تبدیلیاں دیکھیں اور وہ ششدہ رہ گئی۔ بستی کے جرگے کے سردار دلدار خان پوری بستی کا باپ تھا اور گل نور کا سب سے بڑا ہمدرد ملازمہ کو دیکھ کر اس نے اسے احترام سے اپنے پاس بٹھایا۔

''کیا بات ہے، بی بی؟''

''مالک! گل نور پر جو بیتی ہے سب کو معلوم ہے اور سب جانتے ہیں کہ وہ کلیوں کے طرح معصوم ہے۔ اس کی ذات کا ہر داغ اس کی بے گناہی کا رہن ہے۔ لیکن بدبختی نے اس کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ مالک وہ...... وہ حاملہ ہے۔''

''کیا کہہ رہی ہو بی بی!'' سردار بھونچکا رہ گیا اور پھر بولا۔ ''ناممکن!''

''ناممکن بات نہیں ہے مالک، وہ بے گناہ بچی اس حادثے کا شکار ہو چکی ہے۔''

''اوہ...... یہ تو...... بڑے گناہ کی بات ہے اگر ہم اس سے کہیں کہ گناہ کے پھل کو زندگی سے محروم کر دے لیکن گل نور کی طرف اٹھنے والی نگاہوں اور انگلیوں کو ہم کیسے روکیں گے، تم نے اس سے بات کی خدیجہ بی بی۔''

''نہیں مالک......''

''ہوں...... بدنصیب خودکشی ہی کر لے تو بہتر ہے۔ بہرحال میں ایک کوشش کروں گا۔ گل نور کا منگیتر سردار گل ساری باتوں کو جاننے کے باوجود قبول کر لے تو اس بدنصیب کی زندگی کے کچھ لمحے سکون پذیر ہو سکتے ہیں۔''

سردار گل کو گل نور سے عشق تھا۔ سردار کی باتیں اس نے غم و اندوہ کے جذبات کے دوران سنیں اور اس کا دل محبت سے پھٹ پڑا۔ ''وہ تو بے گناہ ہے سردار، اس سے قبل اسے میری اتنی ضرورت نہ تھی جتنی اب ہے۔ میں ساری دنیا کی طرف سے آنکھیں بند کر لوں گا، میں اسے وہی عزت وہی مقام دوں گا سردار جو بیویوں کا ہوتا ہے۔ کیا آپ کی اجازت سے میں اس سے ملاقات کر لوں؟''

''تمہاری رگوں میں دوڑتا ہوا خون مقدس خون ہے سردار گل اسی بستی کی کسی آنکھ میں تمہارے وقار احترام میں دھندلاہٹ پیدا ہوئی تو وہ آنکھ بصارت سے محروم کر دی جائے گی۔ یہ جرگے کے سردار کا وعدہ ہے۔ جاؤ اس بے سہارا کو سہارا دو۔''

گل نور نے پتھرائی ہوئی نگاہوں سے سردار گل کو دیکھا پہلے جب کبھی سردار گل آتا تو اس کی آنکھوں میں ستارے اتر آتے تھے، اس کا انگ انگ گیت گانے لگتا تھا لیکن اس بار اس کے نقوش پتھرائے ہوئے تھے۔ اس کے ہونٹ مسکراہٹ سے نا آشنا رہے تھے۔

''بابا کی موت میرے لیے بھی اتنی ہی غم ناک ہے۔ گل نور، جتنی تمہارے لیے، وہ تمہارا ہی نہیں میرا بھی باپ تھا میں اس کے خون کا بدلہ لوں گا۔ میں ٹھیکیدار کے بیٹے کو تلاش کر کے اسے نیست و نابود کر دوں گا۔''

''شکریہ سردار گل۔ لیکن یہ سب کچھ غیر فطری ہوگا۔ یہ ذمے داری خون کی ہوتی ہے۔'' گل نور نے سرد آواز میں کہا۔

''کیا ہوا جو میں ان کا خون نہیں ہوں۔ ان کو اپنا باپ تو سمجھتا تھا۔''

''بستی کے دوسرے لوگوں کے لیے بھی بابا نے بہت کچھ کیا تھا سردار گل۔''

''دوسروں میں اور مجھ میں فرق ہے گل نور۔''

''اب وہ فرق نہیں رہا۔ سردار گل۔''

''اور میں اس لیے آیا ہوں گل نور کہ تمہارا غم تقسیم کر لوں۔ گل نور اب میں تمہیں اپنی زندگی میں شامل کرنا چاہتا ہوں۔''

گل نور کے ہونٹوں پر زہر بکھر گیا، اسے مسکراہٹ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ ''تم شاید بستی کے دوسرے لوگوں سے نہیں ملے۔ تم نے شاید صرف بابا کی موت کی خبر سنی ہے۔ گل نور کی موت کے بارے میں تمہیں نہیں معلوم سردار گل۔''

''مجھے سب معلوم ہے...... گل نور۔ لیکن اگر کوئی بے رحم ہاتھ کسی کلی کو شاخ سے توڑے تو کیا کلی کا قصور ہوتا ہے۔ میں تمہیں اتنا ہی مقدس اور پاک سمجھتا ہوں۔''

''اس کے علاوہ بھی کچھ ہے سردار گل۔''

''ہاں...... تمہاری کوکھ میں سانسیں لینے والے مکروہ وجود کا بھی علم ہے مجھے، میں کبھی تم سے اس بارے میں کوئی سوال نہیں کروں گا گل نور۔''

''وہ بھی مرد تھا سردار گل جس نے میری ذات کے لیے زندگی کو زخم بنا لیا۔ تم بھی مرد ہو، تمہارے پیکر میں مرد کی ذات بلندی اور عظمت کا مظہر ہے میں وعدہ کرتی ہوں سردار گل کو جب مرد تصور کروں گی تو تمہاری ذات مجھے برگد کے تناور اور سایہ دار درخت کے مانند محسوس ہوگی اور میں مرد سے نفرت نہیں کروں گی۔ میں یاد رکھوں گی سردار گل کہ میرے مرد نے مجھے بے گناہ سمجھا اور مجھے اپنانے کی پیشکش کی اور یہی تصور قبر کی گہرائیوں میں میرے لیے سکون کا باعث ہوگا کہ میں نے اس تناور رخت کی جڑ میں سوراخ نہیں کیا۔ بس اس سے زیادہ میرے لیے اور کوئی بات نہیں ہے، اپنی زندگی کو سکون کی راہوں پر ڈال دو سردار گل۔ میں اپنے مرد کے لیے کوئی معصوم اور ان چھوئی لڑکی چاہتی ہوں جو اس کی ذات کے درخت میں کوئی سوراخ نہ رہنے دے۔ اگر دے سکتے ہو تو مجھے یہ یقین دے جاؤ کہ میرے لیے اپنی زندگی کے بہتر راستے تلاش کر لو گے۔''

''میں اپنا فرض نہیں بھولوں گا گل نور میں تمہارا سہارا بنوں گا۔'' سردار گل نے جذباتی لہجے میں کہا۔

''تمہاری ذات ہمیشہ میرے تصورات کی پشت پناہ رہے گی۔ سردار گل۔ میری درخواست ہے کہ میرے زخموں کے لیے ناسور نہ بنو...... اور اپنی عظمت کے چراغ ہمیشہ میرے دل کے گوشوں میں منور رہنے دو، اس سے زیادہ میں نہ کچھ کہوں گی اور نہ سننا پسند کروں گی۔''

بستی کے سردار اور بڑوں نے گل نور کو بہت سمجھانے کی کوشش کی لیکن وہ صرف شکایتی نگاہوں سے سردار گل کو دیکھتی رہی پھر آہستہ سے بولی۔

''میں نے تو سوچا تھا کہ سردار گل تم مجھے دوسروں کے سامنے شرمندہ نہ کرو گے۔'' اور سردار گل نے اسی دن بستی چھوڑ دی اور پھر وہ دوبارہ کبھی اس بستی میں نہیں آیا۔

☆☆☆

اونچے اونچے سر بہ فلک پہاڑوں کی چوٹیاں برف کی سفید چادر اوڑھے کھڑی خود کو وبرتر ظاہر کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ میدانوں میں سبزے اور سفیدی کے امتزاج نے حسین مناظر پھیلا دیے تھے۔ پتلی پتلی پگڈنڈیاں برف کی نمی سے گیلی ہو رہی تھیں اور ان پر چلنے والی جیپ کی رفتار بہت سست تھی۔

عرشان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ ڈرائیور بابا سے اس نے بہت سے سوالات کر ڈالے تھے۔ حویلی کے ایک ایک فرد کا حال پوچھا تھا اور اتنے دن کی غیر موجودگی میں پیش آنے والے ایک ایک واقعے کی تفصیل پوچھ چکا تھا۔ جیپ اب بستی کے نزدیک پہنچ گئی تھی۔

تھوڑی دیر بعد جیپ حویلی میں داخل ہو گئی۔ عرشان کی نگاہوں نے حویلی کے صدر دروازے پر کسی کو تلاش کرنے کی کوشش کی اور پھر دل کی ایک کسک کے ساتھ اس نے آنکھیں پھیر لیں۔ اس دروازے پر کبھی کوئی نہیں ملا تھا حالانکہ اس کے دل کی پکار تھی کہ شاجہانی خانم صرف ایک بار، پوری زندگی میں ایک بار اس دروازے پر مل جائیں۔ اس کی منتظر، اس کے لیے آنکھوں میں پیار کی قندیلیں جلائے لیکن یہ خواہش ایک ناکام وجود رکھتی تھی۔

یہاں آکر اس کے دل کے کنول ہمیشہ مرجھائے رہتے۔ نجانے کیوں اتنی عمر گزرنے تک وہ شاجہانی خانم کے واجبی سے رویے کا عادی نہیں ہو سکا تھا۔ شاجہانی خانم بس اصولوں کے ایک انبوہ کا نام تھا۔ لیکن اس کے باوجود عرشان

اقوال زریں

☆ بدکلامی جانوروں کو بھی پسند نہیں
(گوتم بدھ)

☆ میں شکست کے لفظ سے آشنا نہیں
(قائداعظمؒ)

☆ بڑا بننے کے لیے چھوٹا ہونا پڑتا ہے
(مستنصر حسین تارڑ)

مرسلہ: بابر عباس، گلیانہ روڈ کھاریاں

انہیں پیار کرتا تھا۔ اس نے ماں کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کبھی نہیں دیکھی تھی۔ بس ایک اصول تھا، چلتا پھرتا اصول جسے ماں کہا جاسکتا تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ ماں کا لمس کیا ہوتا ہے اس نے کبھی شاہجہانی خانم کے ہونٹوں سے اپنے لیے محبت کا اظہار نہیں سنا تھا۔ وہ دنیا کی تمام ماؤں سے مختلف تھیں لیکن عرشان دوسروں کے لیے بے حد اہم تھا۔

شاہجہانی خانم اس کے ہر شوق کی تکمیل کے لیے بے اندازہ دولت خرچ کرتی تھیں۔ اس کے ہونٹوں کی ہر جنبش دوسروں کے لیے ایمان کا درجہ رکھتی تھی۔ لیکن وہ نہیں ملتا تھا جو عرشان کی طلب تھی۔ اس کے بازو کئی بار ماں کی آغوش میں جانے کے لیے ہمکے تھے لیکن اس آغوش کا لمس آج تک اسے نصیب نہیں ہوا تھا۔

اسے آئے ہوئے کئی گھنٹے گزر گئے تھے لیکن وہ جانتا تھا کہ رات کے کھانے سے قبل شاہجہانی خانم سے ملاقات نہیں ہوگی۔ ایک افسردہ سی سانس لے کر وہ اپنی آرام گاہ کے بستر پر لیٹ گیا۔ اس کے اندر آج عجیب سے جذبے جنم لے رہے تھے۔

حسب معمول رات کے کھانے پر اس نے شاہجہانی خانم کو دیکھا۔ سفید چادر، سفید چشمہ، سفید بال۔ چہرے پر وہی مقدس جلال۔ وہ احترام کے لیے اٹھ گیا۔

"بیٹھو......" ایک سرد اور کسی بھی جذبے سے عاری آواز سنائی دی اور وہ بیٹھ گیا۔ اگر اس آواز میں کوئی تبدیلی ہوتی تو وہ دل کا بوجھ زبان تک لاتا۔ یہ آواز تو ہمیشہ کی طرح پتھروں کی آواز تھی۔

"کیسے ہو؟"

"ٹھیک ہوں۔"

"تعلیمی مشاغل"

"حسب معمول۔" وہ بھی جل کر مختصر سوالات کے مختصر جواب دے رہا تھا۔

"یونیورسٹی کا ماحول کیسا ہے؟"

"وہ بھی حسب معمول ہے۔ ہمارے ہاں ایک پروفیسر عسکری ہیں۔ انہوں نے ایک تحریک شروع کی ہے۔ ایسے نوجوانوں کی مدد کے لیے ایک ادارہ قائم کیا ہے جو ہونہار ہونے کے باوجود اپنے مسائل کی بنا پر تعلیمی سرگرمیاں جاری نہیں رکھ سکتے۔ میں نے اس ادارے کو کچھ رقم پیش کرنے کا وعدہ کیا ہے؟"

"کیا دینا چاہتے ہو؟"

"فوری طور پر کم از کم دس لاکھ روپے۔ اس کے بعد بھی ہم ان کی مدد کرتے رہیں گے۔"

"کل بھجوا دیے جائیں گے۔ ویسے تمہارا تو یہ آخری سال ہے۔"

"جی!"

"کھانا شروع کرو۔" وہی سنجیدہ لہجہ ابھرا۔ اور کھانا شروع ہوگیا۔

"اس کے علاوہ زندگی میں کوئی تبدیلی رونما ہوئی؟"

"کوئی خاص نہیں۔"

"عام......؟"

"میں نے ایک لڑکی کو مدعو کیا ہے۔ کسی دن یہاں آجائے گی۔ آپ اسے دیکھ لیں۔ میں اس سے شادی کا خواہش مند ہوں۔" ان الفاظ کی ادائیگی بغاوت کا درجہ رکھتی تھی۔ کھانے کی طرف بڑھتے ہوئے ہاتھ رکے، رکے رہے۔ پھر اپنے عمل میں مصروف ہوگئے۔

"کب آئے گی؟" مختصر سوال۔

"کسی بھی دن اطلاع دے گی۔" عرشان نے جواب دیا۔

اس کے بعد کوئی سوال و جواب نہیں کیا گیا۔ عرشان کو اس بات سے بھی تکلیف ہوتی تھی لیکن وہ اس تکلیف کا عادی تھا۔

جب شائل کی آمد کا علم ہوا تو وہ خوشی سے دیوانہ ہوگیا۔ سارے کام اس نے خود کیے تھے۔ رات کے کھانے پر شاہجہانی خانم کو بھی اس کے بارے میں اطلاع دی لیکن اس بات پر کسی جذبے کا اظہار نہیں ہوا۔ ہاں نوکروں کو ہدایت کردی گئی کہ مہمان کے لیے دیدہ و دل فرش راہ کردیے جائیں۔

شائل کے فرشتوں کو بھی گمان نہیں تھا کہ عرشان کی نگری ایسی حسین ہوگی، اس کی مالی حالت کا بھی شائل کو یہاں آکر اندازہ ہوا تھا۔ عرشان نے اسے اسٹیشن سے لاتے ہوئے راستے میں اپنی ماں کے بارے میں مختصر بتادیا تھا تاکہ شائل محسوس نہ کرے۔

لیکن شاہجہانی خانم سے ملاقات کے بعد شائل نے بے حد پسندیدگی کا اظہار کیا تھا۔ "وہ ایک انوکھی شخصیت کی مالک ہیں۔ عرشان، یقین کرو مجھے تو ان سے بڑی عقیدت ہوگئی ہے۔ تعجب یہ ہے کہ انہوں نے میرے بارے میں کچھ نہیں پوچھا۔"

"ہاں۔ یہ ان کی سرشت ہے۔ لیکن میں انہیں بتاچکا ہوں۔" عرشان مسکرانے لگا۔

"کیا بتاچکے ہو؟"

"یہی کہ...... یہی کہ ان کے بعد اس حویلی کی باگ ڈور ان کا درجہ جسے سنبھالنا ہے وہ لڑکی آرہی ہے۔" عرشان نے کہا اور شائل کے کان سرخ ہوگئے۔ پھر یہ سرخی گالوں تک پہنچی اور پھر آنکھوں کا خمار بن گئی۔

شب و روز گلزار بن گئے تھے۔ شاہجہانی خانم کسی تفریح میں مزاحم نہیں تھیں۔ پوری آزادی تھی۔ سارے سارے دن پہاڑیوں اور مرغزاروں میں بسر ہوتے۔ شائل نے ایک دن بتایا کہ اس نے بھی سرسری طور پر اپنے والد سے اس کا تذکرہ کردیا ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ وہ کسی دن یونیورسٹی میں عرشان سے ملاقات کریں گے اور عرشان کے پورے چہرے پر روشنی پھیل گئی۔

پھر شائل واپس گئی تو شاہجہانی خانم نے اسے بے شمار تحائف سے نوازا لیکن انداز بہ دستور بے جان تھا۔ عرشان جاننا چاہتا تھا کہ شاہجہانی خانم کا اس کے مستقبل کے بارے میں کیا خیال ہے۔ شائل کے جانے کے بعد وہ یونہی اداس ہوگیا تھا۔ اس ماحول میں دم گھٹنے لگا تھا اور ایک دن یہ گھٹن پھٹ پڑی۔

"میں آپ سے کچھ ذاتی گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔"

"کرو۔"

"کھانے کی میز اس کے لیے مناسب جگہ نہیں ہوتی۔" عرشان کے انداز میں بغاوت تھی۔ آنکھیں اٹھیں، جھک گئیں۔

"رات کو نو بجے میرے کمرے میں آجانا۔" اس دن نو ہی نہیں بج رہے تھے۔ نہ جانے کس طرح نو بجے اور عرشان ایک اجنبی جگہ ماں سے ملاقات کرنے کے لیے پہنچا۔ اس نے طویل عرصے کے بعد اس سادہ سی خواب گاہ کو دیکھا جو ساری آسائشوں سے پاک تھی۔ اسے بیٹھنے کی پیشکش کی گئی اور وہ بیٹھ گیا۔

"شائل کیسی لڑکی ہے؟"

"اچھی ہے!"

"آپ کو پسند آئی؟"

"ہاں۔ تعلیم ختم کرنے کے بعد آپ کو اپنے معمولات میں کچھ تبدیلیاں کرنا پڑیں گی۔"

"میرے مستقبل کے بارے میں اگر کوئی فیصلہ کیا گیا ہے تو میں اس سے ابھی آگاہ ہونا چاہتا ہوں۔"

"تمہاری ذات کی گہرائیوں میں ایک قرض کی دستاویز چھپی ہوئی ہے۔ تم ان قبائل کی ریت سے واقف ہو؟"

لسانیات

س: یہ بتایئے کہ تر کی زبان کن حروف تہجی پر مشتمل ہے؟
ج: رومن۔
س: کیا آپ جانتے ہیں کہ روسی زبان میں کتنے حروف تہجی ہوتے ہیں؟
ج: 28
س: یہ بتایئے کہ دنیا کے کس ملک میں سب سے زیادہ انگریزی زبان بولی جاتی ہے؟
ج: امریکا۔
س: کیا آپ روس کی دوسری زبان کا نام جانتے ہیں؟
ج: فارسی۔
س: یہ بتایئے کہ روئے عالم کی زبان کسے کہا جاتا ہے؟
ج: موسیقی کو۔
س: یہ بتایئے کہ اردو زبان کے وہ کون سے حروف تہجی ہیں جو کسی بھی لفظ کے شروع میں نہیں آتے؟
ج: ژ اور ڑ
س: کیا آپ جانتے ہیں کہ انگریزی زبان کا وہ کون سا حرف ہے جو جملے کے درمیان میں بھی بڑا لکھا جاتا ہے؟
ج: آئی۔
س: یہ بتایئے کہ انگریزی حروف تہجی کا کون سا حرف سب سے زیادہ استعمال ہوتا ہے؟
ج: E
س: حروف تہجی کے اعتبار سے دنیا کی سب سے بڑی زبان کون سی ہے؟ اور حروف تہجی کی تعداد؟
ج: کمبوڈیا کی زبان روتوکاس۔ 74 حروف
س: سب سے پہلے کس قوم نے حرف ابجد ایجاد کیے تھے؟
ج: مصری قوم۔
س: اردو کے حروف تہجی کی تعداد کتنی ہے؟
ج: 37
س: ان دو زبانوں کے نام بتائیں جنہیں مردہ زبانیں کہا جاتا ہے؟
ج: یونانی اور لاطینی۔
س: دنیا کی اس بڑی زبان کا نام بتائیں جس میں حروف تہجی نہیں ہوتے؟
ج: چینی زبان۔
س: یہ بتایئے کہ "عورت" کس زبان کا لفظ ہے؟
ج: عربی۔
س: یہ بتایئے کہ دنیا میں سب سے زیادہ کون سی زبان بولی جاتی ہے؟
ج: چینی زبان۔
س: ان پانچ زبانوں کے نام بتائیں جن کو رومانس لینگویجز کہا جاتا ہے؟
ج: اطالوی، فرانسیسی، پرتگیزی، اسپینی۔ رومانوی (رومانیہ)

مرسلہ: محمد زریان سلطان، کراچی

''کون سی ریت؟ کیسا قرض؟''

''اس کے جواب کے لیے تمہیں ایک کہانی سنانی پڑے گی، کیا تم تیار ہو؟''

''ہاں...... میں فیصلہ کن گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔''

''کہانی مختصر ہوگی اور اس کے وہ حصے حذف کر دیے جائیں گے جو غیر ضروری ہیں۔ یہ کہانی ایک پہاڑی لڑکی گل نور کی ہے جو ایک درندے کی ہوس کا شکار ہوئی اور اپنی زندگی میں زندگی سے محروم ہوگئی۔ شیر خان کی بیٹی کی عزت اور شیر خان کی زندگی چھین کر وہ درندہ دہشت سے جنگل میں روپوش ہوگیا۔ لوگوں نے کہا کہ کاش شیر خان کا بیٹا ہوتا جو اس درندے سے انتقام لیتا۔ گل نور جو موت کی وادیوں کی طرف جارہی تھی لیکن پھر لوٹ آئی۔ اس نے اپنی زندگی کا ایک مقصد ترتیب دیا اور تم وجود میں آئے۔ تمہاری پرورش ایک مقصد ذہن میں رکھ کر کی گئی ہے عرشان...... اور اب اگر تمہاری رگوں کا خون جوان ہو چکا ہے تو اس خون کا قرض ادا کرو، اپنے دشمن کو موت کے گھاٹ اتار کر جب تم واپس آؤ گے تو گل نور تمہیں زندہ ملے گی۔ وہ بہت کچھ بھول جائے گی۔ وہ سب کچھ بھول جائے گی اور صرف یہ یاد رکھے گی کہ عرشان نے اس کی کوکھ سے جنم لے کر اس کا مشن پورا کر دیا ہے۔ عرشان اس کی اولاد ہے اور اس کا اعتماد ہے، باقی کچھ نہیں ہے۔ وہ خلش مٹ جائے گی عرشان جس نے گل نور...... تمہاری شاہجہانی خانم کو زندگی کی ہر دلچسپی سے دور کر دیا ہے۔''

عرشان تعجب سے شاہجہانی خانم کی صورت دیکھ رہا تھا جیسے اس کے ذہن سے ایک بہت بڑا بوجھ اتر گیا ہو، شاہجہانی خانم سے آج تک جو شکایات تھیں، اچانک دور ہوگئیں۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔ گو یہ کہانی اس کے ذہن میں واضح نہیں ہوئی تھی لیکن وہ شاہجہانی خانم کا دکھ سمجھ گیا تھا۔ وہ اس کی خواہش جان گیا تھا۔ شاہجہانی خانم نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا اور پتھریلے عضلات میں نمایاں تبدیلی محسوس ہوئی۔

''اس کہانی کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے عرشان؟''

''صرف یہ کہ ایک ماں اپنے خون سے بے خبر کیوں رہی آج تک، اس نے اپنے اس خون کی جوانی پہلے کیوں محسوس نہیں کی؟ ماؤں کے لیے اولاد سب سے بڑا غرور ہے۔ تیرا غرور مجھ پر قرض ہے شاہجہانی خانم، مجھے میرے دشمن کی پہچان بتا، مجھے اس کا ٹھکانا بتا۔''

''آج سے بارہ سال پہلے مجھے اس کا ٹھکانا معلوم تھا۔ مگر اب اس نے وہ جگہ چھوڑ دی ہے۔ ہاں تازہ اطلاع کے مطابق وہ آج کل بنجالی کے جنگلات کی کٹائی کرتا ہے اور اکثر وہاں آتا رہتا ہے۔''

''کیا نام ہے اس کا؟''

''شیر زاد!'' شاہجہانی خانم نے جواب دیا۔

☆☆☆

پروفیسر عسکری کی خوشیوں کا ٹھکانا نہیں تھا۔ شائل 50 ہزار اور عرشان کی طرف سے دس لاکھ آئے تھے۔ یونیورسٹی کھلی تو نئے پروگرام کے تحت اس ادارے کے قیام کا اعلان کر دیا گیا اور دعوت دی گئی کہ لوگ اس سے استفادہ کریں۔ جن لوگوں کو گمنام رہ کر مدد دی گئی تھی۔ وہ ان فرماؤں کے عقیدت مند بن گئے تھے اور یونیورسٹی کھلنے کے بعد اسی تقریب میں عرشان اور شائل کی ملاقات ہوئی تو شائل نے محسوس کیا کہ عرشان کسی قدر پژمردہ ہے۔

تقریب کے بعد دونوں یکجا ہوئے۔ شائل نے خوشی کا اظہار کیا تھا۔ پھر اس نے عرشان سے اس کی بدلی ہوئی کیفیت کے بارے میں پوچھا۔

''زندگی کی ڈور کچھ الجھ گئی ہے شائل، تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔''

''کیا ہوا عرشان؟''

''میری زندگی میری اپنی نہیں شائل، اس پر ایک چھوٹا سا قرض ہے جسے پورا کرنے کے بعد ہی میں اپنی سانسوں کو اپنا سمجھ سکتا ہوں۔ بولو...... شائل، اس قرض کی ادائیگی تک خود کو میرے انتظار کے لیے تیار کر سکتی ہو؟''

''کیسی باتیں کر رہے ہو عرشان، شائل اپنی زندگی میں صرف تمہیں قبول کرے گی اور کسی کو نہیں۔''

''وعدہ......'' عرشان خوش ہوگیا۔

''پکا وعدہ۔'' شائل نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دیا۔ پھر بولی۔ ''عرشان صاحب اس قرض کے بارے میں ہمیں بھی کچھ بتائیے۔''

''شائل ایک بہت بڑی امانت تمہارے سپرد کر رہا ہوں۔ تم نے میری ماں کو زندگی سے بہت دور محسوس کیا ہوگا۔ اس کی ایک بنیاد ہے، یہ قبائلی لوگ انتقام کی آگ میں اپنا سرمایہ، اپنی ذات کو فنا کر دیتے ہیں۔ میری ماں پر اس کے باپ کا انتقام قرض ہے اور یہ قرض صرف اس کا بیٹا اتار سکتا ہے۔ اس سال میں فائنل میں نہیں بیٹھ سکوں گا۔ شائل، میں اپنی ماں کے ذہن کا بوجھ اتار دینا چاہتا ہوں۔'' عرشان

نے کہا اور شائل کا چہرہ پریشانی کی تصویر بن گیا۔

''لیکن اس طرح تو تم ایک بڑا خطرہ مول لو گے۔''

''ماں کو اس کا اصلی روپ دینے کے لیے دنیا کا ہر خطرہ مول لے سکتا ہوں شائل اور پھر یہ تو صدیوں کی ریت ہے۔ میں اس ریت کو کیسے توڑ سکتا ہوں۔''

شائل دیر تک سر جھٹکتی رہی لیکن عرشان نے جواب دیا کہ میں یہ قرض اتارنے کے بعد ہی زندگی کا تصور کر سکتا ہوں۔

''تو تم اس سال فائنل میں نہیں بیٹھو گے؟''

''ناممکن ہے شائل اس ذہنی انتشار کے عالم میں؟''

''تب پھر میں بھی واپس جارہی ہوں۔ میں بھی آئندہ سال ہی فائنل میں بیٹھوں گی۔''

''تم میرے لیے ایک سال ضائع کر دو گی شائل، مجھے تمہاری اپنایت سے بہت تقویت ملے گی۔''

''خدا کی قسم تمہارے بغیر نہیں بیٹھوں گی، تم کب جارہے ہو؟''

''صرف تم سے ملنے آیا تھا۔ کل ہی چلا جاؤں گا۔''

''لیکن تمہارا دشمن کون ہے؟''

''افسوس اس کی تفصیل نہیں بتا سکتا۔ تم عورت ہو، اپنی محبت میں کام بگاڑ بھی سکتی ہو۔''

''تم سے ملاقات بھی نہیں ہوگی عرشان میں تمہارے گاؤں آؤں گی۔''

''بیکار ہے، میں تمہیں وہاں نہیں ملوں گا۔ ہاں، اگر تم چاہو تو تمہارے پاس آجاؤں۔ میں تمہارے گھر آؤں گا شائل! مجھے اپنا مکمل پتا دو۔''

''وعدہ۔''

''ہاں، شائل طویل عرصہ تک میں تم سے جدا نہیں رہ سکتا۔ کام ہوگیا۔ تو میری خوش بختی ویسے درمیان میں کسی دن تمہارے گھر ضرور آؤں گا۔'' عرشان نے کہا اور شائل نے اپنا پورا پتا دہرا دیا۔

''شکریہ شائل! تمہاری ذات کے تصور سے میری جدوجہد میں روانی رہے گی اور میں اپنا کام جلد از جلد انجام دے دوں گا۔''

شائل سر جھکا کر سوچ میں ڈوب گئی۔ دیر تک وہ پریشان صورت بنائے بیٹھی رہی پھر گردن اٹھا کر بولی۔

''ٹھیک ہے، عرشان لیکن کاش شاہجہانی خانم اس دشمن کو بھول سکتیں۔ دشمنی کی یہ ریت اچھی تو نہیں ہے۔ کسی نے سالہا سال قبل تمہارے نانا کو قتل کیا تھا اور اس کا بدلہ تم اتنے عرصے کے بعد لو گے پھر اس کی اولاد اپنے باپ کا بدلہ لے گی، اس طرح تو یہ سلسلہ چلتا رہے گا۔ تمہارے نانا کا کیا نام تھا؟''

''شیر خان۔'' عرشان نے جواب دیا۔

''بہر حال میں تمہارے لیے دعاؤں کے سوا اور کیا کر سکتی ہوں، کل تم روانہ ہو جاؤ گے۔ میرے گھر کب تک آؤ گے۔''

''جس قدر جلد ممکن ہو سکا۔''

☆☆☆

''لیکن تمہارے اس فیصلے کی بنیاد تو ضرور ہوگی شائل۔'' شیر زاد نے پریشان لہجے میں کہا اور بیٹی کی صورت دیکھنے لگا۔ شائل کی یہ پریشانی اس کے لیے ناقابل برداشت تھی، وہ اسے بے پناہ چاہتا تھا۔

''ڈیڈی آپ کو یاد ہے میں نے ایک بار کہا تھا کہ اولاد کو ساری دنیا میں اپنے والدین پر اعتماد کرنا چاہیے۔ کیا یہ فرض صرف اولاد پر عائد ہوتا ہے۔''

''نہیں بیٹے اعتماد کے جواب میں اعتماد ضروری ہے۔''

''تو پھر میں آپ کو اپنی زندگی کی ایک سب سے بڑی حقیقت بتا رہی ہوں۔ میں نے آپ سے عرشان کا تذکرہ کیا تھا؟''

''ہاں اور یہ بھی کہ تم اس سے ملاقات کراؤ گی۔''

''ہاں ڈیڈی کہا تھا، لیکن عرشان کو ایک الجھن پیش آگئی ہے اور وہ اس بار فائنل میں نہیں بیٹھ رہا۔ اس لیے میں نے بھی اس سال پڑھائی کا ارادہ ملتوی کر دیا ہے۔''

''اوہ...... اسے ایسی کیا الجھن پیش آگئی ہے؟''

''میں نے آپ کو عرشان کے گھر کے حالات سنائے تھے۔ اس کی ماں کی عجیب و غریب شخصیت کے بارے میں بھی بتایا تھا۔ دراصل وہ ایک کیس تھا ڈیڈی، وہ قبائلی ہیں اور ان کے ہاں دشمنیاں چلتی ہیں۔ اس کی ماں یعنی شاہجہانی خانم کے باپ شیر خان کو کسی نے قتل کر دیا تھا۔ شیر خان کا کوئی بیٹا نہیں تھا اس لیے وہ لوگ اس کے قتل کا انتقام نہیں لے سکے اور اب یہ ذمے داری عرشان کے کاندھوں پر ڈالی گئی ہے۔ اس نے کہا ہے کہ اب وہ اس قرض کو اتارنے کے بعد ہی زندگی کے بارے میں سوچ سکتا ہے۔''

''کیا نام تھا اس شخص کا۔ کیا نام لیا تم نے؟'' شیر زاد کا دل بیٹھنے لگا۔

''شیر خان۔''

''کون سی بستی کے لوگ ہیں وہ؟''

''عرشان نے ایک بار اپنی قبائلی بستی کا نام جام نگر بتایا تھا، کیوں؟'' شائل نے پوچھا۔ شیر زاد سے اس کی

حالت چھپائے نہیں چھپ رہی تھی۔ ایک پرانا گناہ کسی بھیانک عفریت کے مانند اس کے سامنے آن کھڑا ہوا تھا۔ جام نگر کے جنگلات کی کٹائی، گل نور کی آبروریزی اور شیر خان کا قتل...... سب کچھ یاد آگیا تھا۔ بڑی مشکل سے اس نے اس عذاب سے چھٹکارا پایا تھا لیکن گناہ اور خون چھپ نہیں سکتا۔ آج شیر خان کا نواسا اس پرانے انتقام کے لیے نکل کھڑا ہوا تھا۔ عمر کے اس دور میں جب اس کے قویٰ مضمحل ہوگئے تھے اور وہ کسی سے جان بھی نہیں بچا سکتا تھا، ایک نوجوان دشمن اس کے سامنے آگیا تھا۔

''آپ کچھ پریشان ہوگئے، ڈیڈی؟'' شمائل کی آواز نے اسے چونکا دیا۔

''ہاں پریشانی کی بات ہی ہے۔ تم نے ایک ایسے شخص کا انتخاب کیا ہے جس کی زندگی کی کوئی ضمانت نہیں ہے۔ ممکن ہے، وہ اپنے دشمن پر قابو نہ پاسکے۔''

''ہم سب اس کے لیے دعا کریں گے ڈیڈی؟''

''تم جاتو شمائل، مجھے سوچنے دو۔ تمہارے انتخاب سے میں خوش نہیں ہوں۔ براہ کرم مجھے سوچنے دو۔'' شیر زاد نے کہا اور شمائل سنجیدہ نگاہوں سے دیکھتی ہوئی چلی گئی۔

لیکن نگاہوں میں بڑی سختی تھی، لاتعداد دھمکیاں تھیں۔ شیر زاد اس وقت ان نگاہوں پر توجہ نہیں دے سکتا تھا۔ اسے تو اپنے سر پر انتقام کی تلوار لٹکتی نظر آرہی تھی اور وہ اس قدر مضبوط الحواس ہوگیا تھا کہ شمائل سے اس نے عرشان کے بارے میں اور کچھ بھی نہیں پوچھا تھا۔ بس وہ اپنی جان بچانے کی فکر میں لگ گیا تھا۔ اسے یقین ہوگیا تھا کہ عرشان کی ماں وہی گل نور ہے، شیر خان کی بیٹی...... اب کیا ہوگا؟ ہمیشہ کا بزدل شیر زاد ساری رات نہیں ہوسکا۔

اس کے ذہن میں ہزاروں منصوبے بن رہے تھے۔ پھر ایک ترکیب اس کی سمجھ میں آگئی۔ حالانکہ اس میں سخت خطرہ تھا لیکن خطرہ تو اب اس کی پوری زندگی کو تھا، اس کا سکون تو عرشان کے نام سے ہی رخصت ہوگیا تھا۔ دوسرے دن خاموشی سے وہ کہیں جانے کی تیاریاں کرنے لگا۔

☆☆☆

بیس گھنٹے کی سخت اذیت کے بعد شیر زاد کو شاہجہانی خانم کے حضور طلب کرلیا گیا۔ دشمن کے گھر میں بیس گھنٹے کا انتظار جتنا کربناک تھا، شیر زاد جانتا تھا، ہر لمحے یہی خطرہ تھا کہ کوئی گولی کسی طرف سے آئے گی اور اس کا جسم خون اگلنے لگے گا۔ لیکن اسے اطلاع ملی تھی کہ شاہجہانی خانم مقررہ اوقات ہی میں کسی سے مل سکتی ہیں۔ ناوقت کسی ملاقاتی سے ملاقات ان کے اصول کے خلاف ہے۔

ملاقات کے کمرے میں وہ شاہجہانی خانم کا ا... کرنے لگا یہاں زندگی اور موت کا فیصلہ تھا لیکن ... انتظار کی اذیت سے بچنے کے لیے اس نے یہی بہتر ... کہ زندگی کے لیے جدوجہد کرے ورنہ موت تو آنی ہے ...

پھر ایک طویل عرصے کے بعد اس نے ... بل کھانے، لہرانے والی حسینہ کو دیکھا۔ جس کے بدن کی ... اسے آج بھی یاد تھی، جس کی جوانی کو وہ نہیں بھول سکا ... ایک وقار کا پیکر ایک سنگی مجسمہ اس کے سامنے کھڑا ... اسے حیرت سے دیکھ رہا تھا۔

''میں...... میں شیر زاد ہوں۔'' اس نے خوف ... کانپتے ہوئے کہا لیکن شاہجہانی خانم نے کوئی جواب ... دیا۔ زہریلا ناگ اس طرح بل سے نکل آئے گا، اسے گمان ... بھی نہ تھا۔ اس کے ذہن میں دیر تک بادل گرجتے رہے ... آہستہ آہستہ وہ پرسکون ہوگئی۔ یہ سکون اسے طویل مجاہدے کے بعد ملا تھا۔

''کانپ کیوں رہے ہو شیر زاد، کیا گناہ کی اذیت روح کا کوڑھ بن گئی ہے یا کوئی اور خوف تمہیں یہاں لے آیا ہے؟'' گل نور کی پاٹ دار آواز ابھری۔

''عمر کا آخری حصہ کفاروں کا دور ہوتا ہے۔ روح کا کرب مجھے تمہارے پاس لایا ہے۔ گل نور، میں تم سے معافی مانگنے آیا ہوں یقین کرو، جو کچھ ہوا اس میں مجھ سے زیادہ میرے برے دوستوں کا ہاتھ تھا۔ آج میں تمہاری چھت کے نیچے ہوں اور قبائلیوں کے اصولوں کو جانتا ہوں۔ اس گھر کی چہار دیواری میں مجھے موت کی سزا نہیں دی جائے گی۔ مجھے یقین ہے کہ تم یہاں مجھ سے انتقام نہیں لوگی۔''

''انتقام...... انتقام کا خیال تمہیں کس طرح آیا شیر زاد؟'' پتھریلے چہرے میں پھر سے جان پڑ گئی تھی۔

''میں جانتا ہوں، تمہارا بیٹا۔ عرشان میری تاک میں لگ گیا ہے اور مجھ سے اپنے نانا کا انتقام چاہتا ہے۔''

''اوہ...... تو عرشان کے پیروں کی آواز تمہارے کانوں تک پہنچ گئی۔''

''ہم ایک عجیب حادثے سے دوچار ہوئے ہیں گل نور! میری بیٹی شمائل اور تمہارا بیٹا آپس میں ایک دوسرے کو چاہتے ہیں، وہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ زندگی گزارنے کا فیصلہ کرچکے ہیں۔ شمائل نے اتفاقیہ طور پر مجھے بتایا کہ اس کے محبوب عرشان کی زندگی کا مشن کیا ہے۔''

''شمائل......'' شاہجہانی خانم نے بھنویں سکیڑ کر پوچھا۔

''ہاں...... وہ ایک بار یہاں آبھی چکی ہے۔'' شیر زاد ... رحم طلب نگاہوں سے گل نور کو دیکھتے ہوئے جواب دیا ... اور پتھروں میں زلزلہ آگیا۔ ایک خوفناک گڑگڑاہٹ گل نور کے وجود میں بیدار ہوگئی۔ دیر تک اس زلزلے کا شکار رہی ... ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

''شمائل تمہاری بیٹی ہے شیر زاد؟''

''ہاں گل نور، وہ میری بیٹی ہے، میری اکلوتی بیٹی ہے۔ میں نے اس کی ماں کی موت کے بعد اسے ماں بن کر پرورش کیا ہے۔ میں اس کی پیشانی پر فکر و رنج کی ایک شکن دیکھتا ہوں تو میرا دم گھٹنے لگتا ہے۔ گل نور ان دونوں کی محبت کے واسطے ہر رنجش کو بھلا دو۔''

''افسوس شیر زاد۔ تم نے ہمیں آخری شکست بھی ... دی وہ بچی تو ہمیں بھی بہت پسند ہے، آہ۔ شیر زاد! تم نے ہم سے ہمارا سب کچھ چھین لیا۔ ہم نے تو عرشان کے جوان ہونے کا شدید انتظار کیا تھا۔ ہم نے تو اس کی ذات میں اپنا سکون سمو دیا تھا لیکن تم نے ہم سے...... تم نے ہم ...ے۔'' شاہجہانی خانم نے سر جھکا لیا اور دیر تک غم و اندوہ میں ڈوبی رہی۔

شیر زاد کی آنکھوں میں امید کے چراغ روشن ہوگئے۔ ''وہ جوانی کی ایک بھول تھی۔ میں اس گناہ کے بعد برسوں بے سکون رہا ہوں۔ تم اندازہ نہیں کرسکتیں۔ مجھے کتنی ٹھوکریں کھانی پڑیں۔ اب عمر کے اس دور میں مجھے میرے ضمیر کی تسکین دے دو گل نور، میں بھیک مانگ رہا ہوں۔''

''بس کرو شیر زاد، جاؤ بیٹی کو بیاہنے کی تیاریاں کرو۔ اس سے قبل کہ ہمارا دل ہمارے ذہن کی بغاوت پر حاوی ہوجائے، شمائل کو ہمارا سکون بنا دو۔ ہم کوئی اہتمام نہیں کریں گے۔ برات لے کر تمہارے گھر آئیں گے، نکاح ہوگا۔ دو دن تمہارے پاس رہیں گے اور پھر...... پھر......'' شاہجہانی خانم خاموش ہوگئی۔

''مجھے اعتراض نہیں ہے گل نور، میں تم سے اس قدر شرمندہ ہوں کہ بیان نہیں کرسکتا۔ کاش...... میں اپنی پیشانی سے شرمندگی کا یہ داغ مٹا سکتا۔''

''بس گزری ہوئی باتوں کے زخم نہ کریدو شیر زاد۔ آج سے ٹھیک چھ دن کے بعد ہم مختصر سی برات کے ساتھ پہنچ جائیں گے۔ تم اپنے دوستوں کو مدعو کرسکتے ہو۔ بعد میں جو ہنگامے چاہو کرلینا اس وقت ہمارے دل کی آگ کو سرد کرنے کے انتظامات کرو۔''

''مجھے اجازت دو گل نور۔'' شیر زاد بہ مشکل تمام مسرت کو دبا کر بولا اور گل نور نے گردن ہلا دی۔ آج اس کی آنکھوں میں ایک نئی چمک جاگ اٹھی تھی۔

☆☆☆

عرشان تین دن تک جنگلوں میں چکراتا رہا۔ لیکن ابھی تک اسے ٹھیکیدار کا نشان نہیں مل سکا تھا۔ اس دوران اس نے ٹھیکیدار کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش بھی کی تھی، لیکن زیادہ کامیابی نہیں ہوئی۔ یہاں سے اس کے اپنے علاقے کا فاصلہ زیادہ نہیں تھا۔ چنانچہ آج اس نے گھر جانے کا فیصلہ کیا تھا۔ اب تو زندگی کا یہ اہم مشن پورا کرنے کے بعد ہی کچھ اور سوچا جائے گا۔ شمائل کی یاد اس کے دل میں چٹکیاں لیتی۔ لیکن اس نے دل کو بہت تسلیاں دی تھیں۔ وہ شاہجہانی خانم کو نئی زندگی دینے کا خواہاں تھا۔

وفادار شوہر

ہفتہ کی رات تھی۔

وہ کلب کے ہنگاموں میں رات تین بجے تک مگن رہا۔

گھر پہنچا تو اس کی بیوی ابھی تک جاگ رہی تھی۔ اس نے شوہر کو دیکھا تو پوچھا۔ ''آج کلب میں کیا شغل رہا؟''

''آج کلب میں عجیب و غریب واقعہ پیش آیا۔ تمبولا شروع ہونے سے پہلے سیکریٹری نے اعلان کیا کہ جو شخص کھڑا ہو کر سب کے سامنے اس امر کا دعویٰ کرے کہ جب سے اس کی شادی ہوئی ہے اس نے اپنی بیوی سے بے وفائی نہیں کی تو اس کی خدمت میں یہ نیا ہیٹ پیش کیا جائے گا۔''

''تو پھر کیا ہوا؟''

''ڈارلنگ تم سن کر حیران ہوگی کہ سارے مجمع میں سے کسی بھی شخص نے اس امر کا دعویٰ نہیں کیا۔''

''مگر تم نے کیوں دعویٰ نہیں کیا؟''

''میں نے؟...... میں تو کھڑے ہو کر اعلان کرنے ہی والا تھا کہ یکایک مجھے خیال آیا کہ یہ ہیٹ میرے سائز کا نہیں!''

(جاوید، کراچی)

جب وہ بستی پہنچا تو رات کے کھانے پر وہ خود بخود شاجہانی خانم کے سامنے پہنچ گیا اور اس نے ان کے انداز میں حیرت انگیز تبدیلی دیکھی۔ آج شاجہانی خانم اسے دیکھ کر خوش ہوئی تھیں۔

''ہمیں شدت سے تمہارا انتظار تھا عرشان، اچھا ہوا تم آگئے؟''

''میں تین دن سے ان جنگلات میں بھٹک رہا ہوں شاجہانی خانم، لیکن کم بخت ٹھیکیدار وہاں آیا ہی نہیں۔''

''اب اس کی ضرورت نہیں رہی عرشان، قدرت نے ہمارا انتقام خود بخود لے لیا، وہ مر چکا ہے۔''

''کیا......؟'' عرشان چونک پڑا۔

''ہاں، وہ بدبخت اپنی موت مر گیا۔''

''تو...... تو...... پھر...... تو پھر......؟'' عرشان کی سانسیں بے ترتیب ہونے لگیں۔

''تم نے اپنا وعدہ پورا کرنے کی پرخلوص کوشش کی عرشان، میں اب اپنا وعدہ پورا کروں گی۔ آج سے چوتھے دن تمہاری برات شمائل کے گھر جائے گی۔ میں اس کے باپ سے بات کرچکی ہوں۔ اگر تم آج بھی نہ آتے تو پھر میرے آدمی تمہاری تلاش میں پھیل جاتے، مجھے اندازہ تھا کہ تم کہاں ملو گے۔''

''شاجہانی خانم......'' عرشان کا دل چاہا کہ دوڑ کر ان سے لپٹ جائے لیکن ان کے سرد جذبات نے اس وقت بھی اس کی پذیرائی نہیں کی تھی۔

☆☆☆

شمائل کو اس کایا پلٹ پر سخت حیرت تھی۔ اس نے بار بار باپ سے پوچھا کہ یہ سب کیسے ہوا اور ہر بار شیرزاد کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

''میں اپنی بیٹی کی اداسی کس طرح دیکھ سکتا تھا۔ اس سے پہلے کبھی تجھے اداس رہنے دیا۔ تیرے دل کا حال مجھے معلوم ہوا تو میں شاجہانی خانم کے پاس پہنچا، انہیں سمجھایا اور وہ مان گئیں۔ میری خواہش ہے شمائل کہ تو زندگی کی کسی محرومی سے آشنا نہ ہو۔'' شیرزاد نے کہا۔

لیکن شمائل کو اس اچانک تبدیلی پر یقین نہیں آرہا تھا۔ اس نے خود عرشان کو سمجھانے کی کتنی کوشش کی تھی لیکن وہ نہیں مانا تھا۔ ممکن ہے، شاجہانی خانم کے احکامات سے روگردانی کی جرأت نہ کرسکا ہو۔ لیکن اس مسرت افزا احساس کو اس کا ذہن قبول نہیں کررہا تھا۔ اسے یقین ہی نہیں آرہا تھا لیکن وقت مقررہ پر شیرزاد کے دوست احباب دور دراز سے آگئے

اور پھر برات بھی آگئی۔ اس نے عرشان کو دیکھا، آہستہ آہستہ اسے یقین آنے لگا، لیکن وہ سخت حیران تھی کیسی شادی تھی، اس شادی میں شادی کے تمام امور نظرانداز کردیا گیا تھا۔

اتنی جلد بازی کیوں کی گئی تھی۔ نہ وہ دلہن بنی، نہ اس کے ہاتھوں میں مہندی رچی۔ نہ اسے پھولوں سے سجایا گیا۔ بس ایک سادہ سے لباس میں اسے مہمانوں کے درمیان لے آیا گیا جہاں عرشان بھی موجود تھا، شاجہانی خانم بھی اور دوسرے لوگ بھی۔ قاضی صاحب بھی آگئے، نکاح کی رسم کی تیاریاں کی جانے لگیں۔

شاجہانی خانم کے ہونٹوں پر ایک پراسرار مسکراہٹ تھی۔ شیرزاد کسی قدر بے چین نظر آرہا تھا۔ مہمانوں کی نگاہوں میں بھی تعجب تھا۔ سب سوچ رہے تھے کہ اس قدر زیادہ سادگی...... پہلے کبھی کسی شادی میں نہیں دیکھی۔ ضرور کوئی خاص بات ہے اور اس خاص بات کا انکشاف یوں ہوا کہ نکاح کے کاغذات کی تیاری ہورہی تھی۔ قاضی صاحب نے لکھا ''مسماۃ شمائل، بنت شیرزاد کا عقد عرشان ولد...... ولدیت کیا لکھی جائے گی۔''

''شیرزاد......!'' شاجہانی خانم کی پاٹ دار آواز گونجی۔

''اوہ...... آپ کے شوہر کا نام بھی شیرزاد ہی ہے۔ شیرزاد مرحوم؟''

''نہیں قاضی صاحب! نہ وہ میرا شوہر ہے نہ مرحوم...... عرشان کا باپ بھی یہی شیرزاد ہے، یہ جو آپ کے سامنے موجود ہے، ہاں...... زندگی میں کبھی ایسے دلچسپ موڑ بھی آجاتے ہیں۔ عرشان، اسی شیرزاد کا ناجائز بیٹا ہے۔ میں نے اس کے بعد شادی نہیں کی۔''

''شاجہانی خانم...... شاجہانی خانم...... شاجہانی خانم...... یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔'' شیرزاد دل پر ہاتھ رکھ کر کھڑا ہوگیا۔

''جھوٹ نہیں کہہ رہی شیرزاد! جس سے چاہو تصدیق کرلو...... لیکن تم جیسے انسانوں کے لیے یہ کون سی اہم بات ہے، تمہارے ہاں اخلاق اور رشتے کیا حیثیت رکھتے ہیں۔'' شاجہانی خانم نے کہا اور پھر مہمانوں کی طرف دیکھ کر مسکرائی۔

''معزز شیرزاد کی جوانی بڑی رنگین رہی ہے صاحبو! اور ان کی رنگین مزاجی کا ایک ثبوت یہ نوجوان ہے۔ اتفاقات نے ان دونوں بہن بھائیوں کو یکجا کردیا تو میں رخنہ اندازی کیوں کرتی۔''

''گل نور...... گل نور...... تم...... تم یہ سب کچھ نہیں کرسکتیں۔ تم میری عزت سے نہیں کھیل سکتیں۔'' شیرزاد دیوانہ وار آگے بڑھا، لیکن اسی وقت شاجہانی خانم نے لباس سے پستول نکال لیا۔

''بزدل شیرزاد، وقت سے پہلے موت کو آواز نہ دو...... ورنہ...... ورنہ......'' شاجہانی خانم کے دانت بھنچ گئے۔

اور شیرزاد کی ٹانگیں جواب دے گئیں۔ وہ زمین پر ہی بیٹھ گیا۔ شمائل اور عرشان سکتے کے عالم میں تھے اور پھٹی پھٹی نگاہوں سے شاجہانی خانم کو دیکھ رہے تھے۔ تب وہ مسکرا کر بولی۔

''تو صاحبو! شیرزاد نے آپ کے سامنے مجھے گل نور کے نام سے پکارا ہے۔ گل نور جام نگر نامی بستی کے ایک معزز شخص شیرخان کی بیٹی تھی اور شیرزاد ایک بڑے ٹھیکیدار کا بیٹا جو جنگلوں میں صرف اس لیے گیا تھا کہ پہاڑ کی معصوم جوانیوں کو ہوس کا نشانہ بنائے۔ اس نے گل نور کو دیکھا اور اسے اپنے دوستوں کی مدد سے اغوا کرکے اس کی آبرو لوٹ لی۔ شیرخان اپنی عزت پر شہید ہوگیا اور یہ وہاں سے بھاگ آیا۔

لوگوں نے کہا کہ اگر شیرخان کا کوئی بیٹا ہوتا تو اس کا انتقام لیتا۔ گل نور دل مسوس کر رہ گئی۔ لیکن جب اسے یہ معلوم ہوا کہ اس کے پیٹ میں شیرزاد کا گناہ موجود ہے، تو وہ انتقام کی آگ میں جھلنے والی وقت کے فیصلے کا انتظار کرنے لگی۔ وقت نے اسے بیٹا دیا۔ شیرزاد کے گناہ کے پھل کا نام عرشان ہے۔ عرشان نے میرے پیٹ سے جنم لیا تھا لیکن میں یہ کیسے بھول سکتی تھی کہ وہ شیرزاد کا گناہ ہے۔ گل نور نے اس گناہ کو ایک گناہ کی حیثیت سے پروان چڑھایا اور اسے شیرزاد سے انتقام لینے کے لیے تیار کرلیا لیکن حالات نے ایک اور موڑ لیا۔ شیرزاد کی بیٹی اس کے بیٹے کو چاہنے لگی اور میرے ذہن کی پیاس بجھ گئی۔

صاحبو! شیرخان کی بیٹی نے زندگی کی جن اذیتوں کا مزہ چکھا ہے۔ عظیم شیرزاد اس سے کیوں محروم رہے۔ اسی لیے جب یہ موت کے خوف سے گڑگڑاتا ہوا میرے پاس پہنچا اور اس نے انتقام کے اس رشتے کو ختم کرنے کے لیے اپنی بیٹی کی پیشکش کی تو میں نے اس کی یہ پیشکش قبول کرلی۔ میں نے سوچا کہ شیرزاد کی تصویر کشی کے لیے کوئی اہتمام تو ہو۔ تو اس وقت آپ جیسے معزز لوگ موجود ہیں۔ یہ شیرزاد ہے اور یہ اس کے دونوں بچے ہیں۔ میں بہن بھائیوں کو ایک مقدس رشتے میں منسلک کرنے کا گناہ تو نہیں کرسکتی تھی لیکن شیرزاد کے لیے میں نے ایک ایسی سزا سوچی جو میرے خیال میں کافی ہے۔ باپ کو اگر بیٹی کی ڈولی کی جگہ اس کا جنازہ اٹھانا پڑے تو اس باپ کی بقیہ زندگی یقیناً اس دلکش اذیت سے دوچار ہوجائے گی جس کا گل نور شکار رہی ہے۔

ہاں، شیرزاد! اب تم اپنے سینے پر بیٹی کا زخم کھاؤ۔'' شاجہانی خانم نے پستول کا رخ شمائل کی طرف کردیا اور اسی وقت عرشان کھڑا ہوگیا۔

''شاجہانی خانم...... شاجہانی خانم...... شمائل تو...... شمائل تو بے قصور۔''

''تو نہیں بول رہا عرشان، شیرزاد کا گندا خون بول رہا ہے۔ تیرے منہ سے تیرے باپ کی آواز بلند ہورہی ہے۔ کیوں شیرزاد بالکل تمہاری طرح بول رہا ہے ناں؟''

''میں شمائل کو نہیں مرنے دوں گا شاجہانی خانم...... وہ...... وہ...... بے قصور ہے۔'' عرشان نے شمائل کو سینے سے لپٹا لیا۔

''بات تو شیرزاد کی اولاد کی ہے۔ خواہ وہ کسی کے پیٹ سے ہو۔ دُہرا غم بھی برا نہیں رہے گا۔'' شاجہانی خانم نے یکے بعد دیگرے دو گولیاں چلائیں جو عرشان کی پشت میں پیوست ہوگئیں۔ عرشان نے شمائل کا سہارا لیا تھا۔

مہمان گھبرا کر کھڑے ہوگئے۔ شاجہانی خانم نے مزید دو فائر کیے اور اس بار دونوں گولیاں شمائل کے بدن میں پیوست ہوگئیں۔ شاجہانی خانم نے ایک قہقہہ لگایا۔

''اب اس پستول میں صرف دو گولیاں باقی ہیں شیرزاد! میں ان میں سے ایک گولی کا احسان تجھ پر بھی کرسکتی تھی لیکن دشمنوں پر احسان نہیں کیے جاتے، ابھی تو اس اذیت کا مزہ بھی تو چکھ جو میں نے ایک طویل عرصے تک برداشت کی ہے۔ ابھی تو تجھے اپنی اولاد کے جنازوں کو کاندھا بھی دینا ہے لیکن میں اس غم میں بھی تیرا ساتھ نہ دوں گی۔ شاجہانی خانم نے پستول کا رخ اپنے دل کی طرف کیا اور باقی گولیاں بھی چلادیں۔ اس کی کربناک چیخ ابھری۔ جو بعد میں ایک قہقہہ بن گئی۔

''سنو لوگو...! عورت کو اس طرح نہ توڑو کہ اس کے دل کے سارے جذبے ختم ہوجائیں۔ وہ نہ ماں بن سکے، نہ بیوی اور نہ محبوبہ، اسے کچھ تو رہنے دو۔ اسے...... اسے......''

شاجہانی خانم کے جسم سے خون ابل پڑا اور وہ آہستہ آہستہ زمین پر بیٹھ گئی۔

''اسے اس کے مقام پر رہنے دو، ورنہ...... ورنہ...... ورنہ وہ ختم ہوجاتی ہے اور...... اور......'' بقیہ الفاظ اس کے حلق میں گھٹ گئے اور گردن زمین پر ڈال دی۔

☆

کشکول

انوار صدیقی

قسط 20

اسرار اور تحیر کے پردے میں لپٹا ایک منفرد طویل سلسلہ

زندگی کی داستان بھی کتنی عجیب ہے... جو کہیں احساسات کا آئینہ ہے تو کہیں حادثات کا مجموعہ... کسی کو سنوارنا کسی کو بکھیرنا اس زندگی کا مشغلہ... یوں کہیں گلشن کہیں ویرانہ اس کا مزاج ٹھہرا... زندگی کو برتنے والا یہ انسان... زندگی سے کہیں زیادہ عجیب فطرت کا مالک نکلا جو کہیں ہوش ربا حسن کے طلسم کدوں میں قید ہے تو کہیں بیابانوں کی سرگوشیوں میں گم... انہی تجربات، احساسات اور حادثات کے زیر اثر اس کی شخصیت تعمیر، تخریب کے مراحل سے گزرتے ہوئے سنورتی یا بکھرتی رہتی ہے۔ کبھی محبت کی شبنمی پھوار اس کے دل میں گل و گلزار کھلاتی ہے تو کبھی نفرت کی زہریلی آگ میں وہ خود بھسم ہو کے بھی پشیمان نہیں ہوتا ایسے میں مخالف ہوائیں انسان کو بے وزن پتوں کی طرح اپنی مرضی کی سمت میں اڑا لے جاتی ہیں۔ جہاں جرائم کے بے تاج بادشاہ بے بسی کو پیروں تلے روند کر خوش ہوتے ہیں، جہاں روپ بہروپ کی اس دنیا میں بھکاری بھی ہیں اور کھلاڑی بھی... محیر العقول واقعات اور ذہنی کرشمہ سازیوں سے مزین... ایک منفرد اور جداگانہ اسلوب کی صورت سسپنس کے صفحات پر... صرف آپ کے لیے۔

گذشتہ اقساط کا خلاصہ

کشکول کی داستان لیاقت حسین کے گرد گھومتی ہے جس کا تعلق نوشہرہ کے شہر جہانگیرہ سے تھا، اس کے باپ سردار سرفراز خان نے اپنی پگ کبھی نہیں دی تھی، شادی کے معاملے میں بھی اس نے لیاقت حسین کا رشتہ اس لڑکی سے کرنا چاہا جہاں اس نے زبان دے رکھی تھی۔ لیاقت حسین نے جو تعلیم کے زیور سے آراستہ تھا۔ باپ کے سامنے زبان نہیں کھولی۔ اس نے فرحین نامی لڑکی کو زبان دے رکھی تھی۔ لیاقت حسین کی ماں کو بھی فرحین کا رکھاؤ پسند تھا چنانچہ لیاقت حسین نے ماں کی دعائیں لیں، فرحین سے شادی کے بعد شہر آ گیا جہاں اس نے اپنے دوست گل خان کی کچی بستی میں رہنا پسند جو قدیم قبرستان سے متصل تھی۔ فرحین نے ایک رات قبرستان میں ایک سیاہ فام دراز قد شخص پرتاب بھوشن کو برہنہ حالت میں کوئی پراسرار عمل کرتے دیکھا تو وہ خوفزدہ ہو گئی۔ دوسرے دن لیاقت حسین کو فرحین کی نشاندہی والی قبر سے ایک لیموں ملا جس میں سفلی کے گندے عمل والی جان لیوا سوئیاں پیوست تھیں۔ لیاقت حسین نے گل خان کے منع کرنے کے باوجود خدا کا نام لے کر لیموں سے سوئیاں نکال کر پھینک دیں۔ گل خان لیاقت حسین کو ایک بزرگ کے پاس لے جاتا ہے لیکن وہاں تک ان کی رسائی نہیں ہوتی۔ گل خان واپسی کے لیے رکشا لینے جاتا ہے تو جب ایک نابینا شخص سے لیاقت حسین کی ملاقات ہوتی ہے۔ نابینا کے اصرار پر لیاقت حسین جب دوبارہ بزرگ کی چھولداری کی سمت جاتا ہے تو نہ کوئی ان دونوں کو دیکھتا ہے نہ روکتا ہے۔ نابینا خود چھولداری کے باہر رک کر لیاقت حسین کو اندر جانے کو کہتا ہے جہاں ایک بزرگ ہستی آنکھیں بند کیے استغراق میں محو تھی۔ بزرگ ہاتھ کے اشارے سے لیاقت حسین کو بلاتا ہے۔ ایک چٹکی خاک اٹھا کر لیاقت حسین کے منہ میں ڈال دیتا ہے۔ بعد میں نابینا لیاقت حسین کو سخت تاکید کرتا ہے کہ وہ خاک کی اس چٹکی کا ذکر کبھی زبان پر نہ لائے یہ ہدایت دے کر نابینا نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ خاک کی وہ چٹکی خداوند کریم کا کرشمہ ثابت ہوتی ہے۔ لیاقت حسین کو ہر آنے والے خطرے کا احساس لاشعوری طور پر ہو جاتا ہے۔ اسی کیفیت میں وہ اس کا توڑ بھی تلاش کر لیتا ہے لیکن شعوری طور پر وہ بات اسے یاد نہیں رہتی۔ لیاقت حسین جس بستی میں رہتا تھا وہاں ایک دو منزلہ مکان میں آگ کے شعلے بھڑکتے ہیں تو کوئی اندر جانے کی ہمت نہیں کرتا جہاں ایک ضعیف عورت موجود تھی۔ اس کے قریبی عزیز دار بھی مایوسی کے عالم سے دوچار تھے جب لیاقت حسین اس موقع پر اللہ کا نام لے کر اندر جاتا ہے اور بوڑھی عورت کو زندہ سلامت نکال لاتا ہے۔ اسی عورت کے بیٹے کے ذریعے لیاقت حسین کی رسائی سیٹھ عثمان تک ہوتی ہے جہاں اسے بطور ڈرائیور ملازم رکھ لیا جاتا ہے۔ سیٹھ

اور ان کی اہلیہ راحیلہ بیگم سلجھے ہوئے ہمدرد لوگ تھے۔ سیٹھ عثمان کاروباری شخص تھا۔ کاروباری میدان میں شیخ حامد بظاہر سب کا دوست تھا لیکن در... طور پر مافیا کا مقامی سرغنہ اور انڈرورلڈ کا ایک خطرناک فرد تھا جو پولیس کو مطلوب خطرناک مجرموں کی پشت پناہی کر کے ان کو اپنے اشاروں پر ... شیخ حامد کا خاص آدمی "بلیک ٹائیگر" تھا۔ وہ بھی اسی پاس ورڈ پر ہر حکم کی تعمیل کرتا تھا لیکن براہ راست وہ بھی شیخ حامد کی اصلیت سے ناواقف تھا۔ ... کے مخالفین میں سرفہرست میڈم روبی تھی جو اس سے اپنے شوہر خالد ریاض کی موت کا انتقام لینا چاہتی تھی۔ اس مقصد کے لیے میڈم روبی نے بھی ... کی تنظیم سے تین خطرناک افراد ڈوما، لوچن اور سیاہ فام ہاشم کی خدمات حاصل کر رکھی تھیں۔ ان افراد کو سیون اسٹار کے پاس ورڈ سے احکا... جاتے تھے۔ افضل خان شیخ حامد کا ملازم اور خاص آدمی تھا جو ہر کام میں آگے آگے رہتا تھا۔ وہ اپنے دفتر کی ایک ساتھی شبنم کو پسند کرتا ہے لیکن ... کہ شبنم بھی اندرونی طور پر میڈم روبی سے گٹھ جوڑ کر چکی ہے۔ وہ بھی شیخ حامد سے اپنی مرحوم ماں کا قرض چکانے کی خاطر موقع کی تلاش میں تھی۔ ... اپنے کارندوں کے ذریعہ میڈم روبی کو اغوا کرا کے اس کی مخرب اخلاق تصویریں حاصل کرنے کی پلاننگ کرتا ہے۔ لیاقت حسین کی بیوی فرحین کو اغوا کراتا ہے مگر لیاقت حسین کی ماورائی قوتیں ہر موقع پر اس کے آڑے آجاتی ہیں۔ ان ہی ریشہ دوانیوں میں افضل خان بھی زیر عتاب آجاتا ہے۔ ... اسے شیخ حامد کے اشارے پر اپنے فلیٹ پر لے آتی ہے۔ بعد میں وہ شبنم کے کہنے پر ایک اور بڑے تاجر رستم علی آغا خانی اور اس کی بیوی کی قابل اعتراض تصاویر ریوالور کی نوک پر حاصل کرلیتا ہے۔ ایماندار آئی جی عظیم احمد کے ریٹائر ہونے کے بعد اس کی جگہ آغا منظور احمد نیا آئی جی مقرر ہوتا ہے۔ وہ شیخ حامد کے اوپر تک تعلقات ہونے کے سبب اس کا راستہ کاٹنے کی حماقت نہیں کرتا۔ ایک ڈی ایس پی سراج ہے جو شیخ حامد کو خوش فہمی کا شکار کرنے کی خاطر کچھ رقم اس کے اصرار پر لے لیتا ہے لیکن اسے فوراً ہی آئی جی عظیم احمد کے حوالے کر دیتا ہے۔ سراج ایماندار اور فرض شناس آفیسر ہے۔ نئے ایس پی اورنگ زیب کے آجانے کے بعد اس کے ہاتھ اور مضبوط ہو جاتے ہیں۔ چونکہ اورنگ زیب کے بھی کچھ تعلقات مرکز سے تھے اس لیے وہ کسی کے دباؤ میں نہیں آتا۔ اسی بنا پر اس کی اور شیخ حامد کی ٹھن جاتی ہے۔ اسی دوران شیخ حامد کی بیوی صبا بیگم جو شوہر کی عیاشیوں سے تنگ آچکی تھی خودکشی کرلیتی ہے۔ وہ شیخ حامد کے بارے میں بہت ساری اہم باتوں کو تحریری شکل دے کر سراج کو آخری بار فون کرتی ہے تاکہ وہ اس کی تحریر کو لے جائے۔ سراج وہ تحریر حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے لیکن شیخ حامد کو مرنے والی کے موبائل سے اس بات کا علم ہو جاتا ہے کہ اس نے مرنے سے پیشتر آخری کال سراج کو کی تھی۔ سراج کو قابو کرنے کی خاطر وہ اس کی بیوی الماس کو اغوا کرا لیتا ہے مگر لیاقت حسین کی ماورائی قوت بروقت سراج ہی کے ذریعے الماس کو رسوائی سے بچا لیتی ہے۔ ایس پی اورنگ زیب صبا بیگم کی خودکشی کی تفتیش شروع کرتا ہے۔ انسپکٹر دانش جس کے پاس صبا بیگم کی اہم فائل تھی سراج کو بھی اس سے آگاہ کر دیتا ہے۔ مگر شیخ حامد کو اس کی اطلاع اپنے زرخرید ڈی ایس پی لودھی سے ملتی ہے۔ وہ اس پورے تھانے کو دانش سمیت آگ لگوا دیتا ہے۔ لودھی معمولی زخمی ہونے کے باوجود اسپتال میں داخل ہو جاتا ہے۔ سیٹھ عثمان حالات سے دور اور محفوظ رہنے کی خاطر اپنی رہائش کے لیے دوسری کوٹھی خرید کر اپنا ہیڈ آفس بنا لیتا ہے۔ اسی کوٹھی کی انیکسی میں لیاقت حسین اور فرحین بھی رہائش اختیار کرتے ہیں۔ شیخ حامد ایک موقع پر لیاقت حسین کو بھی اغوا کرا لیتا ہے۔ اس موقع پر لیاقت حسین کا ہم شکل (ہمزاد) لیاقت حسین کو نکل جانے کا موقع فراہم کرتا ہے۔ پرتاب بھوشن جو سفلی کا ماہر تھا، نیبو والے عمل کی ناکامی کے بعد لیاقت حسین کو مار ڈالنے کی خاطر برابر اپنی شیطانی قوتوں سے کام لیتا ہے مگر رحمانی قوتیں اسے کامیاب نہیں ہونے دیتیں۔ پھر بھی وہ باز آنے کو تیار نہیں ہوتا۔ دریں اثنا میڈم روبی سیون اسٹار کے پاس ورڈ سے سیاہ فام ہاشم اور جہانگیر بٹ عرف جگا کو شیخ حامد کی رہائش گاہ پر ... کرنے کا حکم دیتی ہے جس سے شیخ حامد اور چراغ پا ہو جاتا ہے۔ اسی دوران وہ اپنی ذاتی سیکریٹری کنول سے شادی کر کے اس کو پوش علاقے کے ایک ... میں رکھتا ہے۔ بعد میں شیخ حامد کو پے در پے دو جھٹکے لگتے ہیں۔ ایک طرف ایس پی اورنگ زیب تھانے میں آگ لگنے کی واردات میں ملوث پا کر لودھی کو معطل کرا دیتا ہے۔ دوسری جانب میڈم روبی کے ایجنٹ ہاشم اور ڈوما شیخ حامد کے اہم ترین آدمی "بلیک ٹائیگر" کو گھیر کر موت کے گھاٹ اتار دیتے ہیں۔ سراج جو لیاقت حسین کی ماورائی قوتوں کا بذات خود تماشا دیکھ چکا تھا، کچھ دنوں کے لیے سیٹھ عثمان (جو سراج کا کلاس فیلو بھی رہ چکا تھا) سے اس کی خدمات حاصل کر لیتا ہے۔ اب اورنگ زیب، سراج اور لیاقت حسین مل جل کر شیخ حامد کو گھیرنے کی پلاننگ کرتے ہیں۔ دوسری جانب جہانگیر بٹ عرف جگا سابق پڑوسی اور پولیس کے ریٹائرڈ ہیڈ کانسٹیبل امداد علی سے ملاقات کرتا ہے جس نے جگا کو کسی جرم کی سزا بھگتنے کے بعد غلط راستہ اختیار کرنے کے بجائے فرنیچر کا کاروبار کرنے کی خاطر رقم فراہم کی تھی۔ سیاہ فام ہاشم کو سیون اسٹار کی جانب سے بگ باس کو ختم کرنے کی اجازت مل جاتی ہے لیکن ایک غلطی کی وجہ سے اسے خودکشی کرنی پڑتی ہے۔ اسی دوران رستم علی آغا خانی کو فون پر دھمکی ملتی ہے جسے اس کا لڑکا دارا سن لیتا ہے۔ دارا اپنے دوست سابق ... عاطف کو حالات سے باخبر کر دیتا ہے۔ اورنگ زیب اور سراج اسپتال سے ملازمہ گلابو کی خودکشی کی تفتیش کر کے واپس لوٹ رہے تھے جب لیاقت اچانک گاڑی کا رخ پھیر دیتا ہے۔ وہ ایسا نہ کرتا تو سب موت کے منہ میں چلے جاتے۔ لیاقت حسین کی بروقت کارروائی سے کسی قسم کا جانی نقصان نہیں ہوا البتہ سراج معمولی زخمی ہوا۔ دوسری جانب شیخ حامد کی کنول سے شادی کی سہاگ رات کی ساری کارروائی مووی کیمرے کے ذریعے محفوظ کرلی گئی تھی۔ لیاقت حسین فرحین کے رشتے دار کی موت کی خبر سن کر اسے گاؤں بھیج دیتا ہے۔ دوسری جانب جگا... اپنے سرپرست امداد علی کے پاس پہنچ کر صورت حال سے آگاہ کرتا ہے امداد علی اسے فی الحال صبر کی تلقین کرتا ہے۔ شبنم اور افضل خان کے فلیٹ سے شبنم کو اغوا کرلیا جاتا ہے۔ شیخ حامد کی کوٹھی پر حملہ ہوتا ہے جس پر وہ چراغ پا ہوتا ہے اور پولیس کے سربراہ کو سخت سست سناتا ہے اور اورنگ زیب ملزمان کو گرفتار کر کے سخت پوچھ گچھ کرتا ہے جس کے نتیجے میں کئی انکشافات سامنے آتے ہیں خاص طور پر یہ کہ وہ جگا کا آدمی ہے اور اس نے یہ کارروائی کسی بیوہ کے کہنے پر کی تھی۔ جبکہ سراج کی بیوی الماس کے اغوا کی کوشش ناکام بنانے کی کوشش میں پولیس لیاقت حسین کو گرفتار کرلیتی ہے اور اس پر تشدد کیا جاتا ہے۔ ایس پی اورنگ زیب اینڈ کمپنی شیخ حامد کے خلاف گھیرا تنگ کرتی ہے۔ شبنم کے اغوا کا ڈراما بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی تھا، اورنگ زیب نے شبنم سے مل کر اسے اعتماد میں لیا اور وہ ان کا ساتھ دینے پر راضی ہو گئی۔ دوسری جانب شیخ حامد کے ایجنٹ نے اسے الماس کے اغوا میں لیاقت حسین کے سبب ناکامی کی اطلاع دی اور بتایا کہ پولیس لیاقت حسین کو گرفتار کر کے لے گئی ہے جہاں ایس پی اورنگ زیب نے اس کارروائی کو ڈکیتی کی واردات کا رنگ دے کر رپورٹ بنائی ہے۔ گاؤں سے فرحین نے فون پر اطلاع دی

... کے ذریعے اسے معلوم ہوا ہے کہ لیاقت کے باپ کی کسی سیٹھ سے کاروباری بدمزگی ہوئی ہے۔ لیاقت حسین جان گیا کہ سیٹھ عثمان سے ہی معاملہ ہوا ہے۔ لیاقت نے ان سے مل کر اپنی اصلیت ظاہر کرتے ہوئے گلے شکوے دور کرا دیے۔ واپسی پر لیاقت پر قاتلانہ حملے کی ناکامی پر بچ جانے والے زخمی حملہ آور کو اپنی تحویل میں لے کر تمام کارروائی پر اپنے قابل اعتماد افسر کو ہدایت دی۔ حملہ آور سے حاصل ہونے والی معلومات کے مطابق بلیک ٹائیگر کے بعد ... کام کرنے والے ایجنٹ کی بنیادی حیثیت تھی جو انڈرورلڈ میں اسلم ڈنکا کے نام سے جانا جاتا تھا۔ شیخ حامد کے رہائشی گاہ پر لوچن اور ڈوما ... تباہ کر دیا تھا۔ اسی حملے کے دوران ڈوما مارا گیا جبکہ لوچن کو ایس پی اورنگ زیب نے اپنی تحویل میں لے لیا تھا۔ اس کے علاوہ شیخ حامد کے ... انہیں بھی طابوت میں بند کر کے اس کی حویلی کے سامنے ڈال دی گئی تھیں اور کنول نے فون کر کے کسی اجنبی کی دھمکی آمیز کال کی اطلاع دی تھی۔ شیخ حامد نے طیش کے عالم میں ڈی آئی جی آغا منظور سے جواب طلبی کرتا ہے اور ایس پی اورنگ زیب کے رویے کی شکایت مرکزی وزیر داخلہ سے کرتا ہے۔ ... اورنگزیب معذرت کر کے اس سے کچھ دن کی مہلت طلب کرتا ہے اور ناکامی کی صورت میں شیخ حامد کو فیصلے کا اختیار دیتا ہے۔ دوسری جانب لیاقت حسین کو سیٹھ عثمان اپنے آفس کا سپروائزر بنا کر اس کی تنخواہ میں اضافہ کر دیتا ہے۔ لیاقت اپنی خوشی میں فرحین کو یاد کرتا ہے، اور اسی دوران پلید پرتاب بھوشن اپنے عمل کے ذریعے پجارن مدھو کو فرحین کے روپ میں لیاقت حسین کے پاس بھیجتا ہے لیکن یہاں بھی غیبی طاقت اسے بچا لیتی ہے۔ جبکہ ثریا کے مشورے پر میڈم آغا منظور کے دل میں اپنے متعلق جذبات کے تحت اس سے ملاقات کا اہتمام کرتی ہے۔ یہ ملاقات ان دونوں کے مابین رشتے کی آمادگی پر منتج ہوتی ہے۔ لیاقت حسین اپنے باپ سے معافی کا خواستگار ہوا اور اس کے باپ نے اسے معاف کر دیا۔ دوسری جانب افضل خان غیر معمولی حالات میں دوسری جگہ منتقل کر دیا جاتا ہے اور اورنگزیب اس کی پاداش میں شبنم پر الزام لگا کر اسے بگ باس کے حوالے کرنے کا عندیہ دیتا ہے جو کہ اس کی ایک چال بھی ہو سکتی ہے۔ افضل خان اور شبنم دوبارہ بگ باس کی تحویل میں چلے گئے۔ افضل خان، اسلم ڈنکا کی زیر نگرانی بگ باس کے احکامات کا پابند تھا یہاں اس سے جگا کو اس کے سرپرست امداد علی کے ذریعے پھانسنے کا کام لیا گیا۔ کیونکہ جگا کے نام سے بگ باس کو چند تصویریں موصول ہوئی تھیں جن میں اس کے کنول کے ساتھ سہاگ رات کے مناظر واضح تھے۔ دوسری جانب لوچن کی ملاقات زخمی قیدی سے کرائی گئی جہاں اس نے اسے دیال سنگھ عرف وشنو کے طور پر شناخت کرلیا۔ لیاقت حسین گاؤں سے فرحین کو واپس لے آیا، اس کی ماں نے اسے حفاظت کے لیے ایک تعویز دیا جبکہ میڈم روبی شیخ حامد کے انجام میں اپنا حصہ ڈالنے کے لیے بے چین تھی۔ شیخ حامد کے خلاف برسرپیکار گروپ میں ماسٹر مائنڈ کا کردار اورنگ زیب ادا کر رہا تھا جبکہ بعض معاملات میں سراج بھی لاعلم تھا، ملٹری انٹیلی جنس بھی اس اہم معاملے میں انوالو تھی اور شیخ حامد کے خلاف گھیرا تنگ سے تنگ تر ہوتا جارہا تھا جبکہ اس کا ذہن مختلف الجھنوں کا شکار تھا۔ شیخ حامد کے گرد گھیرا تنگ ہو گیا اگرچہ اس نے شبنم اور اسلم ڈنکا کو ختم کرنے کی کوشش کی لیکن اسے ناکامی کا سامنا ہوا۔ بالآخر بگ باس نے ہیلی کاپٹر میں فرار ہونے کی کوشش کی مگر سمندر برد ہو گیا، البتہ لاش نہ مل سکی۔ دوسری جانب وشنو اور لوچن کرنل احتشام کی گرفت سے فرار ہو گئے۔ اورنگ زیب اور سراج آدمی کے تعاون سے مجرموں کے گرد جال بن رہے تھے۔ لیاقت حسین اپنے والد کی شہر آمد پر خوش تھا مگر اسی دوران ان پر قاتلانہ حملہ ہو گیا۔ حملہ کرانے والے کا کچھ پتا نہ چل سکا۔ لیاقت حسین کی ماں نے جو کہ خود بھی لیاقت کی طرح ماورائی قوتوں کے زیر سایہ ہے، کچھ مبہم تفصیلات فراہم کیں لیکن مکمل معلومات حاصل نہ ہو سکیں۔ اورنگ زیب ہنوز یہ ماننے پر تیار نہیں کہ شیخ حامد مر چکا ہے۔ حالانکہ اس کے اعزاز میں ایک تقریب میں اسے فوجی اعزاز بھی دیا گیا۔ میڈم روبی لوچن سے کنٹریکٹ بڑھانا چاہتی ہے۔ ایک غیر یقینی کی کیفیت ہے اسی دوران لودھی بھی اورنگ زیب سے ملتا ہے لیکن اس کے بعد اس کا وحشیانہ قتل ہو جاتا ہے اور اس کے تانے بانے آکٹوپس یعنی بگ باس سے ملتے ہیں، میڈم روبی ڈی آئی جی سے نکاح پر تیار ہو گئی اور اس کا اعلان بھی کر دیا گیا۔ سرفراز خان واپس جانے پر بضد ہے لیکن اسے پندرہ دن کے لیے روک لیا گیا۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

دوسروں کے مقابلے میں رستم علی آغا خانی کے ذہن سے کسی ایسے خطرے کا احساس بھی جاتا رہا جو اسے رہ رہ کر پریشان کرتا رہتا تھا۔ اس وقت وہ اپنے آفس میں بیٹھا آنے والی ڈاک دیکھ رہا تھا جب ایک بڑا لفافہ کھولتے ہی اس کا سارا سکون پل بھر میں غارت ہو گیا۔ بڑے لفافے کے اندر موجود ایک بادامی رنگ کے لفافے پر آکٹوپس کی ربر اسٹیمپ پر نظر پڑتے ہی اس کے وجود میں کسی آنے والے خطرے کی سرد لہر دوڑ گئی۔

آکٹوپس کے بارے میں ایس پی اورنگ زیب کی ایک پریس کانفرنس کے دوران دی گئی وضاحت بیشتر لوگوں کے علم میں آگئی تھی، اورنگ زیب نے اس کانفرنس میں ایک رپورٹر کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا تھا کہ شیخ حامد کی شخصیت اس کے اپنے حلقوں کے لوگوں کے لیے بھی اتنی ہی خطرناک تھی جتنی پانی کے اندر رہنے والے آکٹوپس کی ہوتی ہے۔

بادامی لفافہ کھولنے سے پیشتر اس نے اپنی لیڈی اسٹینو کی سمت دیکھا جو اسی کے کمرے میں کارنر ٹیبل پر بیٹھی ایک خاص لیٹر ٹائپ کرنے میں مصروف تھی۔ اس کا کمرا علیحدہ تھا لیکن جن اہم ڈرافٹ پر سیکریٹ لکھا ہوتا تھا وہ انہیں باس کے حکم کے مطابق اسی کے کمرے میں بیٹھ کر ٹائپ کرتی تھی۔

ایک لمحے کو رستم علی نے سوچا کہ لیڈی اسٹینو کو کچھ دیر کے لیے کسی بہانے سے باہر بھیج دے لیکن پھر کسی خیال سے اس نے اپنا ارادہ ترک کر دیا، ٹیبل پر رکھا ہوا پانی کا گلاس اٹھا کر اس نے دو لمبے لمبے گھونٹ لیے پھر ریوالونگ چیئر کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کرلیں، اس کے ذہن میں ایک ہی سوال گردش کر رہا تھا۔ کسی کاروباری ڈاک میں آکٹوپس کی ربر اسٹیمپ والے لفافے کی... کیا اہمیت

ہوسکتی ہے؟ وہ اسی سوچ میں ڈوبا ہوا تھا جب اسٹینو کی آواز نے اسے چونکا دیا۔

"سر...... آپ اسے ایک نظر دیکھ لیں تو میں اسے یہیں بیٹھ کر لفافے میں بند کر کے میل کر دیتی ہوں۔"

"میز پر چھوڑ جاؤ...... میں تم کو بعد میں بلا لوں گا۔"

"سر......" اسٹینو نے اس کے چہرے پر ایک نظر ڈال کر دبی زبان میں پوچھا۔ "آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟"

"آں...... ہاں۔" رستم علی نے سنبھل کر کہا۔ "ایک کاروباری مسئلے پر غور کر رہا تھا۔ آئی ایم، آل رائٹ۔"

اسٹینو کے جانے کے بعد ہی اس نے بادامی لفافہ کھولا تو دل کی دھڑکنیں بھی تیز تر ہونے لگیں، وہ اس کی اور اس کی بیوی کی وہ شرمناک تصویریں تھیں جو اسی کی خواب گاہ میں ریوالور کی زد پر اتاری گئی تھیں، ان تصویروں کے بائیں جانب بھی آکٹوپس کی ربر اسٹیمپ لگی ہوئی تھی، تصویروں کے ساتھ ایک ٹائپ شدہ پیغام بھی تھا۔ رستم علی نے تصویریں سمیٹ کر دراز میں رکھیں پھر ٹائپ شدہ پیغام پڑھنے لگا۔

"رستم علی آغا خانی...... تم نے آکٹوپس کے بارے میں جو اخباری تراشے دیکھے ہیں اسے ذہن سے نکال دو آکٹوپس اس کاکروچ کے مقابلے میں زیادہ سخت جان ہوتا ہے جو مرنے کے بعد بھی دیر تک اپنی ٹانگیں ہلاتا رہتا ہے۔ تمہاری دفتری مصروفیات کا ایک ایک لمحہ میری نظروں میں ہے۔ اورنگ زیب سے تمہارا میل جول تمہارے کسی کام نہیں آسکتا۔ اس دو کوڑی کے ایس پی کے کہنے پر تم نے آکٹوپس کے بارے میں جو رپورٹ تھانے میں بھیجی، اس کے بارے میں بھی لاعلم نہیں ہوں۔

اپنا، اپنے کاروبار اور اپنے گھر والوں کا بھلا چاہتے ہو تو آئندہ کوئی حماقت نہ کرنا ورنہ تمہارا یا تمہارے جوان بیٹے دارا کا انجام بھی ڈی ایس پی لودھی سے زیادہ مختلف نہ ہوگا۔"

خط کی عبارت کے ساتھ ساتھ رستم علی کی دھڑکنیں بھی دل کی گہرائیوں میں ڈوب رہی تھیں۔ اس نے گلاس میں بچا ہوا پانی اٹھا کر ایک ہی سانس میں پی ڈالا۔ آنے والی تصویروں اور ٹائپ شدہ پیغام کو دوبارہ بڑے لفافے میں رکھ کر تیزی سے اٹھا، ملحقہ ریسٹ روم میں جا کر اس نے موصول ہونے والی شرمناک تصویروں اور خطرناک پیغام کو اپنی تجوری کے مخصوص خانے میں محفوظ کیا پھر دوبارہ اپنے کمرے میں آگیا، خاصی دیر تک وہ اپنے ذہن میں ابھرنے والے سوالات پر غور کرتا رہا...... تصویریں اور پیغام بھیجنے والا کون تھا؟...... کیا شیخ حامد کا منحوس وجود ابھی ختم نہیں ہوا تھا؟...... اگر نہیں تو پولیس اور ملٹری انٹیلی جنس کے ذمے دار افسران نے کس ثبوت کی بنا پر اسے مردہ قرار دیا تھا؟ کیا شیخ حامد کے بجائے وہ اس کا کوئی خاص آدمی جو مخرب اخلاق تصویریں ہاتھ آجانے کے بعد اس سے ناجائز فائدہ اٹھانا چاہتا تھا؟ یا دفتر کا کوئی ایسا کارندہ کسی مخالف گروپ کے افراد کو اندر کی باتیں بتا رہا تھا۔ ایس پی اورنگ زیب ایک ایماندار اور نڈر پولیس آفیسر قابل اعتماد بھی تھا...... تو کیا اس سے مل کر صورت حال کے بارے میں گفتگو کرنا مناسب ہوتا لیکن...... اگر اس کی بجائے بھی آکٹوپس کی ربر اسٹیمپ استعمال کرنے والے کو ...... تو وہ اپنی دھمکی کو عملی جامہ بھی پہنا سکتا تھا؟ موجودہ صورت حال کے پیش نظر کیا خاموشی ہی اس کے حق میں بہتر تھی؟

رستم علی آغا خانی اپنی سوچوں میں غرق تھا جب ...... کے قدموں کی آہٹ نے اسے چونکا دیا، اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا، سامنے اس کا جوان بیٹا دارا موجود تھا۔

"کیا بات ہے ڈیڈ......!" اس نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے سنجیدگی سے پوچھا۔ "آپ اس وقت......"

"نہیں...... ایسی کوئی بات نہیں ہے۔" رستم علی نے سنبھل کر جواب دیا۔ "ایک کاروباری مسئلے پر غور کر رہا تھا۔"

"سوری...... میں نے آپ کو ڈسٹرب کر دیا۔"

"میرا خیال ہے کہ اس وقت تم کوئی خاص بات کرنے کے ارادے سے آئے ہو۔" رستم علی نے دارا کو مسکرا کر دیکھا۔

"یس ڈیڈ......" دارا نے کہا۔ "دراصل میں دو ...... روز کے لیے عاطف کے ساتھ شکار پر جانا چاہتا ہوں، ...... گھر پر ہی رہے گی۔"

"عاطف......" رستم علی نے اس نام کو دُہرایا پھر ...... خیال کے تحت پوچھا۔ "تم شاید ملٹری کے ریٹائرڈ ...... عاطف کی بات کر رہے ہو؟"

"جی ہاں...... اس نے ابھی کچھ دیر پہلے مجھے ساتھ چلنے کی دعوت دی ہے۔"

"میری طرف سے اجازت ہے لیکن ایک شرط ہے۔"

"وہ کیا؟"

"تم مجھے عاطف کا موبائل نمبر دے کر جانا تاکہ تم دونوں کی خیریت دریافت کرتا رہوں۔"

دارا نے اسی وقت میجر عاطف کے موبائل نمبر کا ...... لکھ دیے پھر جانے کے ارادے سے اٹھنے لگا تو رستم علی نے دبی زبان میں پوچھا۔ "اگر میری اطلاع غلط نہیں ہے تو ...... نے شاید ہمارے کسی کاروباری مخالف کے سلسلے میں بھی عاطف کو کوچ میں ڈالا تھا۔"

"یس ڈیڈ......" دارا نے سنجیدگی سے اقرار کرتے ہوئے کہا۔ "وہ میرا ہر اعتبار سے بہترین، مخلص اور قابل ...... دوست ہے۔"

"ایک دو سرسری ملاقات میں، میں نے بھی اس کے بارے میں یہی اندازہ لگایا ہے...... ٹھیک ہے، تم جاؤ لیکن خیال رکھنا۔"

"ڈونٹ وری ڈیڈ۔"

دارا کے جانے کے بعد رستم علی آغا خانی خاصی دیر تک کسی ذہنی کشمکش میں مبتلا رہا پھر اس نے میز کے سائڈ میں لگا ہوا سوئچ دبا کر باہر دروازے پر لگی سرخ لائٹ کو آن کر دیا جس کا مقصد یہی تھا کوئی بھی شخص اس کے بلائے بغیر اندر نہ آئے۔ اس کے بعد اس نے دراز سے ایک نئی سم نکال کر دوسرے موبائل میں ڈالی پھر میجر عاطف کے نمبر ڈائل کرنے لگا۔ دو گھنٹی کے بعد دوسری جانب سے خود عاطف نے کال ریسیو کی تھی۔

"دارا بتا رہا تھا کہ تم اور وہ شکار پر جا رہے ہو؟"

"گڈ آفٹر نون انکل......" اس بار بڑی سعادت مندی سے کہا گیا۔ "آپ مطمئن رہیں، میں اپنے سے زیادہ دارا کا خیال رکھوں گا۔"

"مائی سن...... میں اس وقت تم سے ایک نئی سم لگا کر بات کر رہا ہوں۔ اس کا علم دارا کو نہیں ہونا چاہیے۔"

"آئی سی...... میرا خیال اگر غلط نہیں ہے تو آپ نے اس وقت مجھے کسی خاص کام کے لیے کال کیا ہے۔"

"یو آر رائٹ......" رستم علی نے بہ دستور مدھم آواز میں کہا۔ "مجھے یقین تھا کہ نئی سم کے حوالے پر تم ضرور یہی نتیجہ اخذ کرو گے۔"

"آپ حکم دیں انکل...... میں کوشش کروں گا کہ آپ کے لیے دارا سے زیادہ قابل اعتماد ثابت ہو سکوں۔"

"مجھے ایک مخصوص چیز ایک مخصوص آدمی تک پہنچانی ہے۔ مجھے یقین ہے اس کام کے لیے میں تم پر اعتماد کر سکتا ہوں۔"

"ہنڈریڈ پرسنٹ" دوسری طرف سے ٹھوس لہجے میں کہا گیا۔ "آپ جس وقت حکم دیں، میں آپ کی خدمت میں حاضر ہو جاؤں گا۔"

"تم لوگ شکار کے لیے کب روانہ ہو رہے ہو؟"

"کل صبح نکلنے کا پروگرام ہے۔"

"گڈ...... میں کوشش کروں گا کہ وہ چیز تمہیں کسی ذریعے سے آج ہی پہنچا دوں اور...... اگر جانے سے پہلے تم اسے آج رات ہی کسی وقت مطلوبہ شخص تک پہنچا دو تو زیادہ مناسب ہوگا لیکن...... اسے خاص آدمی تک پہنچانے کے لیے بھی تمہیں کسی خاص اور بااعتماد شخص کا انتخاب کرنا ہوگا۔"

"آئی سی۔" دوسری جانب سے بے حد سنجیدگی سے پوچھا گیا۔ "انکل، میرا خیال ہے کہ آپ اس وقت کچھ ڈسٹرب ہیں؟"

"ہاں...... لیکن اگر تم میرا کام کر دو تو میری پریشانی بڑی حد تک ختم ہو جائے گی۔"

"وہ چیز کسے پہنچانی ہوگی؟"

"اس کا نام بھی تمہیں ایک علیحدہ لفافہ میں مل جائے گا۔" رستم علی نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔ "اس کو پڑھ کر اسی وقت ضائع کر دینا اور ایک بات کا خاص خیال رکھنا، دارا کو کسی بات کی خبر نہ ہو۔"

"ٹھیک ہے انکل...... میں آج گھر پر ہی رہوں گا۔ آپ کی بھیجی ہوئی چیز بھی آج رات ہی مطلوبہ آدمی تک پہنچا دی جائے گی۔"

"تھینک یو مائی سن......" رستم علی نے لمبی سانس لے کر کہا پھر رابطہ منقطع کر دیا۔ اس کی کشادہ پیشانی پر ایک بار پھر آڑھی ترچھی لکیروں کے جال ابھرنے اور مٹنے لگے، یہ اس کی اضطرابی کیفیت کی دلیل تھی۔

☆☆☆

سرفراز خان کے جانے کے بعد سیٹھ عثمان نے لیاقت حسین کی ذمے داریوں میں بھی اضافہ کر دیا تھا۔ اب "ماربل ایکسپورٹرز" کے دیکھ بھال کی ذمے داری بھی اسی کو سنبھالنا تھی۔ سرفراز خان کے جانے کے دو دن بعد ہی سیٹھ عثمان نے اسے اپنے کمرے میں بلا کر کہا تھا۔ "لیاقت حسین میں نے تمہیں ماربل کے کاروبار کے سلسلے میں کچھ ضروری باتیں کرنے کی خاطر بلایا ہے۔"

"آپ کی مہربانیاں پہلے ہی بہت ہیں، میں شاید مرتے دم تک......"

"نہیں......" سیٹھ عثمان نے اسے فوراً ہی ٹوک دیا۔ "دفتر میں صرف کاروباری باتیں کرنا مناسب ہوتا ہے۔ جذباتی گفتگو کرنا کاروباری اصول کے بھی خلاف ہے۔"

"آپ حکم دیں، میں کسی بات سے انکار نہیں کروں گا۔" لیاقت حسین سنبھل کر بیٹھ گیا تو سیٹھ عثمان نے اسے نئی ذمے داری کے سلسلے میں پہلے کچھ اہم باتیں اور ہدایتیں دیں پھر کچھ توقف سے کہا۔ "تم جانتے ہو کہ سرفراز خان نے مجھے

اس کاروبار میں برابر کے نفع ونقصان کی شرط رکھی تھی جس کے لیے قانونی دستاویز بھی تیار ہوچکی ہے۔''

''میرے خیال میں بابا نے جو کچھ کیا وہی مناسب تھا اس لیے کہ اب آپ نے اپنا ماربل کا کام بھی بابا کے ساتھ شامل کرلیا۔''

''گڈ......'' سیٹھ عثمان نے مسکرا کر جواب دیا۔ ''میں نے تمہیں اس وقت یہی خاص بات سمجھانے کی خاطر بلایا ہے...... میرا جو کام پہلے تھا تم اسے اب بھی الگ ہی تصور کرو گے۔''

''میں سمجھا نہیں صاحب۔''

''میں نے اپنے منیجر کو ہدایت کردی ہے کہ وہ میرے ماربل کے کاروبار کے سلسلے میں تمہیں تمام باتیں تفصیل سے سمجھا دے گا۔ فی الحال تم یہ سمجھو کہ مجھے اس کاروبار میں جو اوسط منافع ہوتا رہا ہے میں خود کو صرف اسی کا حق دار سمجھوں گا۔ اس کے بعد شرائط کے مطابق جو کل منافع ہوگا اس میں سے میرا اوسط منافع نکالنے کے بعد جو بھی بچے گا وہ تمہارا ہوگا۔''

''لیکن شرط نامے میں تو ایسی کوئی بات نہیں ہے جو آپ بتا رہے ہیں۔''

''تم بھول رہے ہو لیاقت حسین کہ یہ بات تمہاری موجودگی میں طے ہوگئی تھی کہ میں اپنا نفع یا نقصان جسے چاہے دے سکتا ہوں۔''

''آپ مرضی کے مالک ہیں جناب لیکن......''

''اس سلسلے میں اگر تمہیں مزید کچھ کہنا ہے تو بیگم صاحبہ سے بات کرلینا۔'' سیٹھ عثمان نے بہ دستور سنجیدگی سے کہا۔ ''مجھے اب تم سے صرف ایک بات کرنی ہے کہ پہلی فرصت میں تم اپنا بینک اکاؤنٹ کھول لو۔''

اس کے بعد بات جاری نہ رہ سکی اس لیے کہ آفس منیجر کچھ کاروباری فائلیں لے کر آگیا تھا۔ لیاقت حسین نے بھی فوری طور پر کچھ کہنا مناسب نہیں سمجھا، یہ بھی جانتا تھا کہ اسے راحیلہ بیگم سے اس ضمن میں بات کرنے کو کیوں کہا گیا تھا؟ ویسے بھی اس نے راحیلہ بیگم سے کھل کر بات کرنی مناسب نہیں سمجھی تھی۔ یہ اس تہذیب کے بھی منافی تھا جس میں اس کی پرورش ہوئی تھی۔

سیٹھ عثمان کے کمرے سے نکل کر وہ باہر آیا تو چپراسی نے اسے بتایا کہ راحیلہ بیگم نے اسے کسی کام سے بلایا ہے۔ لیاقت حسین نے حکم کی تعمیل میں دیر نہیں کی۔ وہ قدم اٹھاتا بنگلے پر پہنچا تو فرحین دروازے پر ہی بنی ٹھنی کھڑی تھی۔ لیاقت حسین کو دیکھ کر اس نے چھیڑنے والے انداز میں منہ بنا کر کہا۔

''تم کدھر تھا ڈرائیور...... ہمیں شاپنگ کرنے جانا ہے۔''

''میں آگیا ہوں میڈم، آپ ابھی چل کر شاپنگ موج میلا کرلو، میں رات کو دل پشوری کرلوں گا۔''

راحیلہ بیگم سامنے آگئیں تو وہ دونوں ہی سنبھل گئے تھے۔ شاپنگ سینٹر جاتے ہوئے راحیلہ بیگم نے لیاقت سے دبی زبان میں کہا۔ ''اگر برا نہ مانو تو ایک بات کہوں؟''

''آپ حکم دیں...... میں آپ کی یا صاحب کی بات کا برا مانوں...... یہ کیسے سوچ لیا آپ نے؟''

''فرحین نہیں مانی ورنہ میں اس وقت دوسرے ڈرائیور کو بلا لیتی۔'' راحیلہ بیگم نے محتاط انداز اختیار کیا۔ ''اب تمہاری دفتری مصروفیات بڑھ گئی ہیں اس لیے اچھا نہیں لگتا۔''

''اس کا بھی ایک حل ہے میرے پاس۔'' لیاقت حسین نے کسمسا کر بڑی تابعداری سے اپنا فیصلہ سنا دیا۔ ''میں دفتر سے اپنا کام ختم کردوں گا اس کے بعد تو آپ کو مجھے بلانا برا نہیں لگے گا؟''

''میرا یہ مطلب نہیں تھا لیکن......''

''آپ مالکن ہیں، جو چاہے فیصلہ سنا دیں۔ میں نے آپ کا نمک کھایا ہے، انکار کی جرأت نہیں کروں گا۔''

''تو غلط سمجھ رہا ہے لیاقت، بیگم صاحبہ کا مطلب......''

''تو درمیان میں نہ بول۔'' لیاقت نے فرحین کو جھڑک دیا۔ ''یہ میرا اور بیگم صاحبہ کا معاملہ ہے۔''

''سمجھنے کی کوشش کرو لیاقت حسین۔'' راحیلہ بیگم نے بڑی اپنایت سے کہا۔ ''میں اور عثمان دونوں تمہاری عزت کرتے ہیں۔ تم نے ہمارے ساتھ جو سلوک کیا ہے اس کا کوئی بدل ممکن ہی نہیں ہے مگر دفتر کے دوسرے لوگ میں نہیں چاہتی کہ وہ......''

''میں نے آپ کے سامنے کبھی زبان نہیں کھولی بیگم صاحبہ لیکن ایک بات میری بھی سن لیں، جب تک آپ کے گھر کا دانہ پانی قسمت میں لکھا ہے میں آپ لوگوں کی خدمت سے منہ نہیں موڑ سکتا۔ میرے ہوتے آپ کسی اور ڈرائیور کے ساتھ جائیں یہ مجھے منظور نہیں ہے۔''

راحیلہ بیگم لاجواب ہوگئیں۔ لیاقت حسین کے جملے ان کے ذہن میں گونج رہے تھے، اس نے کئی موقعوں پر اپنی جان پر کھیل کر ان کی جان بچائی تھی۔ سیٹھ عثمان بھی اس کی جاں نثاری کو کبھی فراموش نہیں کر سکتے تھے، جن حالات سے مقابلہ کرکے وہ ان کی ملازمت پر آمادہ ہوا تھا وہ بھی ان

کی خودداری کا ثبوت تھا۔ ملازمت کے دوران اس نے کبھی اپنے والد کا ذکر نہیں کیا تھا۔ اپنے خاندانی پس منظر کو زبان پر نہیں لایا تھا۔ اس کے علاوہ بھی اس کے اندر وہ تمام خصوصیات موجود تھیں جو کسی سچے، نیک، ایماندار اور کسی عبادت گزار مسلمان کا طرۂ امتیاز ہوتی ہیں۔

''ٹھیک ہے لیاقت حسین۔'' انہوں نے لیاقت حسین کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے بڑی اپنایت سے کہا۔ ''میں دوبارہ تمہیں کسی بات کے لیے مجبور نہیں کروں گی۔''

لیاقت حسین، راحیلہ بیگم کا جواب سن کر کھل اٹھا۔ فرحین اس موقع پر بھی اسے چھیڑنے کی خاطر کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن اچانک ہی جو کچھ ہوا، اس سے وہ بھی بوکھلا گئی تھی۔

گاڑی اس وقت ایک مصروف شاہراہ سے گزر رہی تھی جب بائیں جانب سے گزرنے والی ایک گاڑی نے اچانک ہی خطرناک انداز میں سائڈ ماری پھر اسی رفتار سے بائیں جانب والے قریبی موڑ پر نکل گئی۔ لیاقت حسین بھی اس اچانک افتاد سے گڑبڑا گیا مگر اس کے اوسان خطا نہیں ہوئے تھے ورنہ گاڑی سامنے سے آنے والے ایک لوڈنگ ٹرک سے ٹکرا جاتی۔ اس نے فوری طور پر اسٹیئرنگ پر اپنی گرفت مضبوط کرلی تھی۔ پھر بھی گاڑی لوڈنگ ٹرک سے رگڑ کھاتی ہوئی کسی بڑے حادثے سے بال بال بچ گئی۔ فرحین کے منہ سے نکلنے والی چیخ بھی بہت زوردار تھی، راحیلہ بیگم بھی سہم کر رہ گئیں۔ جو کچھ ہوا وہ اسے اتفاق سمجھنے پر آمادہ نہیں تھیں۔ جس گاڑی نے سائڈ ماری تھی، اس کے بعد فوراً ہی بائیں جانب مڑ کر نظروں سے اوجھل ہونے کا مطلب یہی تھا کہ وہ کسی ایسے ہی موقع کا منتظر تھا جب اپنے ناپاک ارادے میں کامیابی کے ساتھ ہی فرار ہونے میں بھی کامیاب ہوجاتا لیکن لیاقت حسین کی مہارت اور بروقت ذہانت ایک بار پھر کام آگئی، البتہ ٹرک سے معمولی رگڑ لگنے کے بعد بھی گاڑی کی باڈی اور پچھلے بمپر کو خاصا نقصان پہنچا تھا۔ لیاقت حسین نے اس ہجوم سے نکلنے کے بعد اپنی گاڑی بھی اگلے موڑ سے گھما کر فٹ پاتھ کے ساتھ روک لی۔ نیچے اتر کر وہ گاڑی کی ٹوٹ پھوٹ دیکھنے میں مصروف ہوگیا۔ اس کے چہرے سے جو کیفیت عیاں تھی وہ اس بات کی ترجمانی کر رہی تھی کہ اگر اس کے اختیار میں ہوتا تو وہ سائڈ مارنے والے ڈرائیور کو گولی مارنے سے بھی دریغ نہ کرتا۔ اسے بھی یقین تھا کہ کسی دشمن نے یہ سب کچھ جان بوجھ کر کیا ہے چنانچہ اس نے سب سے پہلے موبائل نکال کر سراج کو اس کی اطلاع دی، ساتھ یہ بھی بتا دیا کہ اس حادثے سے قبل اس کے اور راحیلہ بیگم کے درمیان کیا گفتگو ہو رہی تھی۔

''میں جانتا ہوں لیاقت حسین کہ تمہارے جذبات کو ٹھیس پہنچی ہوگی۔ بہرحال دوبارہ ایسا نہیں ہوگا۔''

''تمہاری حاضر دماغی نے ایک بار پھر ہمیں کسی بڑے حادثے سے بچا لیا۔''

''گناہ گار نہ کریں بیگم صاحب..... موت اور زندگی صرف اوپر والے کے اختیار میں ہے۔''

راحیلہ بیگم کچھ اور کہنا چاہتی تھیں کہ ان کے موبائل پر سراج کی کال موصول ہوئی۔

''آپ کو کیسے علم ہوا؟''

''ابھی لیاقت حسین نے بتایا ہے لیکن افسوس کہ وہ گاڑی کے نمبر نہیں نوٹ کرسکا۔''

''میں نے اس کی بس ایک جھلک دیکھی تھی۔'' راحیلہ بیگم نے کہا۔ ''وہ ڈارک گرے کلر کی نئی ٹویوٹا تھی جس پر شوروم کا عارضی نمبر نظر آ رہا تھا۔''

''گڈ..... میرے لیے یہ بھی بہت ہے۔ اب آپ کا کیا پروگرام ہے؟''

''گھر واپس جاؤں گی۔''

''لیاقت حسین نے حادثے کی اطلاع کے ساتھ ہی بڑی محبت سے آپ کی شکایت بھی کی ہے۔'' سراج نے بے تکلفی سے کہا۔

''اوہ...... مجھے اپنی غلطی کا احساس ہے۔'' راحیلہ بیگم نے لیاقت حسین پر ایک نظر ڈال کر جواب دیا۔ ''آئندہ خیال رکھوں گی۔''

''ایک درخواست اور کروں گا...... آئندہ جب آپ کو کہیں آنا جانا ہو تو مجھے اس کی اطلاع ضرور دے دیا کریں، موجودہ حالات میں یہ ضروری ہے۔''

''آئی، سی۔'' راحیلہ بیگم نے قدرے سنجیدگی سے پوچھا۔ ''کیا آکٹوپس کے بارے میں اورنگ زیب صاحب کا شبہ درست ثابت ہو رہا ہے؟''

''ابھی یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا لیکن احتیاط پھر بھی شرط ہے۔''

سراج سے گفتگو کا سلسلہ ختم ہونے کے بعد راحیلہ بیگم نے شوہر کو بھی اس حادثے کی اطلاع دی پھر لیاقت حسین سے بولیں۔ ''مجھے خوشی ہے لیاقت حسین کہ تم نے سراج بھائی سے میری شکایت کی۔ یہ بھی اپنایت کی دلیل ہے۔''

لیاقت حسین نے محض سر کی جنبش سے اپنے جذبات کا اظہار کیا پھر گاڑی چلانے میں مصروف ہوگیا۔ البتہ فرحین

ابھی تک وحشت زدہ سی نظر آ رہی تھی۔

☆☆☆

ٹیکسی ملز ایریا کے درمیان بنے ہوئے ایک دومنزلہ مکان کے سامنے پہنچ کر روک دی گئی۔ پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے شخص نے جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک بڑا نوٹ نکال کر ڈرائیور کی جانب بڑھا دیا۔

''میرے پاس چینج نہیں ہے جناب۔''

''ٹھیک ہے۔'' مسافر نے بے پروائی سے جواب دیا پھر اتر کر نیچے آگیا۔

اس کے جسم پر جینز کی تنگ پتلون اور چیک کی بش شرٹ نظر آ رہی تھی۔ نیچے اتر کر اس نے جیب سے سگریٹ کا پیکٹ اور لائٹر نکالا پھر اس وقت تک وہیں رکا رہا جب تک ٹیکسی گھوم کر نظروں سے اوجھل نہیں ہوگئی اس کے بعد وہ آہستہ آہستہ قدم بڑھاتا دومنزلہ عمارت کی پشت پر آگیا جہاں زیادہ تر سرونٹ کوارٹر ہی تعمیر تھے۔ اس نے ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ قریب یا دور کوئی بھی نظر نہیں آیا۔

وہ مکانوں کے ساتھ ساتھ قدم اٹھاتا رہا پھر ایک ایسے مکان کے سامنے پہنچ کر رک گیا جس کے دروازے پر ایک لیٹر بکس بھی نظر آ رہا تھا۔

اس نے ادھر ادھر نظر دوڑائی اس کے بعد نہایت اطمینان سے دو سیڑھیاں چڑھ کر دروازے پر مخصوص انداز میں دستک دینے لگا، چند منٹ خاموشی رہی پھر اندر سے کسی نے بھاری آواز میں پوچھا۔ ''کون ہے؟''

''ماسٹر......'' جواب بہت مختصر لیکن معنی خیز انداز میں دیا گیا۔

''رات کے گیارہ بجے کے بعد مجھے دروازہ کھولنے سے منع کیا گیا ہے اور اس وقت......''

''رات کے پونے بارہ بج رہے ہیں۔'' ماسٹر کہنے والے نے سرسراتی آواز میں جواب دیا۔ ''مجھے ایک ضروری کام سے بھیجا گیا ہے۔''

''میں مجبور ہوں ماسٹر...... اوپر کے حکم کو ٹالنا میرے اختیار میں نہیں ہے۔'' دوسری طرف سے روکھے لہجے میں کہا گیا۔

''تم جانو...... میں جا رہا ہوں لیکن کام نہ ہونے کی تمام تر ذمے داری اب تمہارے کاندھوں پر ہوگی۔'' ماسٹر کہنے والے نے زیرلب مسکرا کر کہا۔ پھر بڑبڑاتا ہوا واپس لوٹ گیا۔ اب اس کے قدم مکان کی پشت کی جانب بڑھ رہے تھے۔ پچھلی گلی میں بھی اس وقت سناٹا ہی تھا۔ مطلوبہ مکان کے عقب میں پہنچ کر دوسری سگریٹ جلانے کے بہانے رکا۔ کن انکھیوں سے اس نے دائیں بائیں کا جائزہ لیا پھر اس نے بڑی مہارت سے قدرے جھک کر خود کو اوپر کی جانب اچھالا، مکان کی عقبی دیوار آٹھ فٹ بلند تھی لیکن ایک ہی جست میں وہ اس تک پہنچ گیا، چند لمحے وہ دیوار سے چپکا رہا پھر اس نے لٹکے ہی لٹکے دوبارہ اپنے جسم کو حرکت دی اور پلک جھپکتے میں وہ دیوار کے اوپر پہنچ گیا۔ اس کے بعد دوسرے ہی لمحے وہ مکان کے صحن میں تھا جو اس وقت سنسان ہی نظر آ رہا تھا۔ ایک کمرے کے دروازے پر پڑے پردے کی ایک جھری سے اندر سے مدھم پاور کی روشنی پھوٹ رہی تھی۔ وہ قدم بڑھاتا پچھلے حصے کے وارنڈے میں کھلنے والے دروازے کی طرف گیا۔ جیب سے اس نے ایک مخصوص تار نکال کر تالے کے سوراخ میں ڈالا پھر اسے دو تین بار ادھر ادھر کرنے کے بعد ہی ہلکی سی آواز سن کر اس کے ہونٹوں پر ایک خونریز مسکراہٹ پھیل گئی۔ نہایت آہستہ سے اس نے دروازہ کھولا۔ ربر سول جوگر کی وجہ سے اس کے قدموں کی آواز بھی گھٹ کر رہ گئی تھی۔ اندر پہنچ کر اس نے نہایت خاموشی سے دروازہ بند کیا پھر اس دوسرے دروازے کے قریب جا کر رک گیا جس میں مدھم سی روشنی نظر آ رہی تھی۔

''سچ بتا...... ابھی کون آیا تھا۔'' کسی عورت کی تجسس بھری آواز آنے والے کے کانوں میں گونجی۔

''ایک بار کہہ تو دیا کہ اس نے ماسٹر کا حوالہ دیا تھا لیکن میں نے اوپر کے حکم کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اسے ٹال دیا۔'' کسی مرد کی ہانپتی ہوئی آواز سنائی دی۔ ''تیری موجودگی کا بھی خیال تھا۔''

''کہیں وہ میرے گھر والے کا کوئی مخبر تو نہیں تھا؟'' عورت نے اپنے خدشے کا اظہار کیا۔

''کیوں حماقت کی بات کر رہی ہے...... تیرا اجھڑوس مرد اس وقت مشینوں سے جتا ہوگا، صبح سات بجے سے پہلے اس کی واپسی نہیں ہوگی، کیوں اپنا اور میرا مزہ کرکرا کر رہی ہے۔''

اندر سے پھر ملی جلی گھٹی گھٹی آوازیں ابھرنے لگیں، مرد کی آواز خاص طور پر رفتہ رفتہ بلند ہو رہی تھی لیکن پھر دونوں ہی کو جیسے یکلخت سانپ سونگھ گیا...... ٹارچ کی تیز روشنی میں دونوں کے حرکت کرتے برہنہ جسم اس طرح ساکت ہوگئے جیسے کوئی برقی قوت سے چلنے والی مشین بجلی کے یکلخت چلے جانے سے ایک دم ٹھپ ہوگئی ہو۔ دونوں کی نظریں ایک ساتھ ہی دروازے کی جانب اٹھی تھیں۔ عورت نے جلدی سے اپنی اوڑھنی جسم پر ڈال لی، مرد نے

چادر گھسیٹ کر تہبند کی طرح لپیٹ لی پھر وہ تیزی سے اٹھا۔ ایک لمحے کو خوف زدہ نظر آنے والا اب بڑے اعتماد سے آنے والے کو گھور کر بولا۔

"تم شاید وہی شخص ہو جس نے ماسٹر کا حوالہ دیا تھا لیکن...... اس طرح چوروں کے انداز میں اندر داخل ہونے کی جرأت تم نے کیسے کی؟"

"ماسٹر کا حوالہ دینے کے بعد تمہارا یہ سوال بھی تمہاری ہی طرح احمقانہ معلوم ہو رہا ہے۔" آنے والے نے سپاٹ لہجے میں کہا پھر تحکمانہ انداز میں سہمی ہوئی ادھیڑ عمر کی عورت کو گھورتے ہوئے بولا "اس کم ذات کو ہاتھ پیر باندھ کر ڈال دو، تمہیں وقتی طور پر بے ہوش کرنا میری ذمّے داری ہوگی۔"

"تم اچھا نہیں کر رہے ہو۔" مرد نے مزاحمت کی کوشش کی۔ "اگر باس کو علم ہو گیا تو وہ تمہیں کبھی معاف نہیں کرے گا۔"

"وقت ضائع کرنے کی حماقت نہ کرو......" آنے والے نے غرا کر کہا۔ "صرف جو کہا گیا ہے اس کی تعمیل کرو...... ورنہ مجھے تمہاری موت کی بھی کوئی پروا نہیں ہوگی۔"

"تم نے ماسٹر کا حوالہ دیا ہے تو پھر تمہاری آمد کا کوئی خاص مقصد بھی ضرور ہوگا۔" کوارٹر میں نے رہنے والے نے سوال کیا لیکن...... پھر جو بھی ہوا اتنا آناً فاناً ہوا کہ عورت نے بھی اپنی آواز گھونٹنے کے لیے سہمے ہوئے انداز میں اپنے منہ پر دوسرا ہاتھ بڑی مضبوطی سے جما لیا۔ آنے والے نے اچانک ہی برق رفتاری سے لپک کر ایسا نپا تلا ہاتھ گھمایا تھا کہ دوسرے فریق کے ہاتھ سے چادر بھی چھوٹ گئی۔ وہ بے ہوش ہو کر فرش پر اوندھا گیا تھا۔ پھر اس نے عورت کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں خون کے شعلے لپک رہے تھے۔

"نن...... نن...... نہیں۔ مجھے مت مارنا...... تت...... تم جو کہو گے مم...... مانوں گی۔" عورت گھگیانے لگی۔

جینز والا مسکراتا ہوا اس کے قریب آ گیا، اس کی اوڑھنی گھسیٹ کر دوبارہ اس کے جسم کو کسی کپڑے کی قید سے یکسر آزاد کر دیا۔ چند لمحے تک اس کے ننگے وجود کو حقارت بھری نظروں سے گھورتا رہا پھر اس کا ہاتھ دوبارہ برق رفتاری سے گھوما تو عورت بھی منہ سے کوئی آواز نکالے بغیر فرش پر اوندھ گئی۔

ان دونوں سے فارغ ہو کر جینز والے کو اس زمیں دوز کمرے کو تلاش کرنے میں زیادہ وقت نہیں لگا جو ایک خاص میکنزم سے کھلتا تھا۔ بہ ظاہر وہ ایک دیوار گیر کلارک تھا جس کے اندر اس چور میکنزم کو تلاش کر لینا ہر شخص کے لیے ممکن نہیں تھا جسے وائرلیس کے اصول پر استعمال کیا جاتا تھا۔ تہ خانے میں کیسی بے شمار چیزیں تھیں جو...... مرد کے لیے بہت کارآمد ثابت ہو سکتی تھیں لیکن جینز والے نے صرف ایک مخصوص لفافے پر اکتفا کیا جو لکڑی کی ایک الماری میں رکھے ہوئے کاغذات کے ڈھیر کے نیچے پڑا تھا۔ لفافہ کھول کر ایک نظر دیکھتے ہی اس کے چہرے پر خون تمتمانے لگا لیکن اس وقت اس نے کسی جذباتی حرکت کا اظہار نہیں کیا، جیب سے لائٹر نکال کر اس نے لفافے اور اس کے اندر موجود چار عدد تصویروں کو جلا کر راکھ کیا پھر نہایت اطمینان سے سگریٹ جلا کر اس کا کش لگاتا ہوا اوپر آ گیا۔ کوارٹر سے واپسی کے وقت اس نے مکان کا صدر دروازہ ہی استعمال کیا تھا پھر وہاں سے مرکزی سڑک تک آنے پر اسے بہ مشکل پندرہ منٹ لگے تھے۔

☆☆☆

لوچن سوتے سے اچانک اس طرح ہڑبڑا کر جاگا تھا جیسے کسی بچھو نے اسے ڈنک مار دیا ہو، فوری طور پر اس کی نظر وشنو کے خالی بیڈ پر پڑی تو وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ سب سے پہلے اس نے اٹھ کر واش روم میں جھانکا جو خالی ملا۔ فوری طور پر اس نے وشنو کو موبائل پر کال کیا لیکن دوسری جانب سے "پاورڈ آف" کا ریکارڈڈ میسج سننے کے بعد اس کی پیشانی شکن آلود ہو گئی۔

وہ اس بات سے بہ خوبی واقف تھا کہ وشنو انٹرپول کو بھی مطلوب تھا لیکن ابھی تک وہ ان کے ہاتھ نہیں لگا تھا۔ ہر بڑے مجرم کی طرح وہ میک اپ کے فن میں بھی اتنی مہارت رکھتا تھا جس کے بعد گھر کے لوگ بھی شاید اس کو شناخت نہ کر سکتے، شیخ حامد کا تحفظ مل جانے کے بعد اسے کسی بات کی فکر بھی نہیں تھی۔

لوچن یہ بھی جانتا تھا کہ کرنل احتشام اور ایس پی اورنگ زیب نے اگر ان دونوں کو فرار کا موقع فراہم کیا تھا تو ان کی طرف سے غافل بھی نہ ہوں گے، کچھ ماہر کمانڈوز بھی ان کی نگرانی پر ضرور مامور ہوں گے لیکن ان تمام باتوں کے باوجود لوچن کو اس بات کی فکر لاحق تھی کہ وشنو کہاں چلا گیا؟

اسے اچھی طرح یاد تھا کہ تقریباً ساڑھے نو بجے ڈائننگ روم سے واپسی کے بعد اس نے وشنو کی خواہش پر روم سروس سے کافی طلب کی تھی، کافی پینے سے قبل وہ منہ دھونے کے ارادے سے واش روم میں گیا تھا۔ غالباً اسی دوران وشنو نے کسی سوچی سمجھی اسکیم کے تحت کافی میں کوئی ایسی خواب آور چیز گھول دی تھی جس کی وجہ سے لوچن کافی پینے کے تقریباً پندرہ بیس منٹ بعد ہی اتنا غفیل ہو گیا تھا اور...... اس وقت جب رات کے ساڑھے بارہ بجے اس کی آنکھ کھلی تو وشنو اپنے بستر پر نہیں تھا لیکن اس کا مختصر سامان بدستور الماری میں موجود تھا۔

لوچن پر وشنو کے فرار کی ذمّے داری بھی عائد نہیں ہوتی تھی۔ اسے صرف وشنو کے قریب رہ کر اس کی نقل و حرکت کی ذمّے داری سونپی گئی تھی جس کی اطلاع وہ اورنگ زیب کو دیتا رہا تھا۔ بہرحال، اس کی وقتی جھلاہٹ کا سبب صرف اتنا تھا کہ وشنو اسے ڈاج دے کر صاف نکل گیا تھا۔ اسے اس بات کی امید بھی تھی کہ وشنو ان لوگوں کو ڈاج نہیں دے سکے گا جو اس کی نگرانی پر مامور ہوں گے لیکن اس کا یہ یقین بھی اس وقت بکھر ہو گیا جب کمرے کا دروازہ کھلا اور اندر آنے والا وشنو کے سوا کوئی اور نہیں تھا، لوچن کو جاگتے دیکھ کر وشنو کے چہرے پر ایسی ہی مسکراہٹ ابھری تھی جیسے وہ اس کی بے بسی کو دیکھ کر اپنی برتری پر خوشی کا اظہار کر رہا ہو۔

"کہاں چلے گئے تھے؟" لوچن نے سرسری انداز میں پوچھا، اس نے فوری طور پر کسی ردعمل کا مظاہرہ نہیں کیا۔

"اپنی ایک پرانی مجبوری کو ختم کرنے گیا تھا جو میرے پیروں کی بیڑی بنی ہوئی تھی۔" وشنو نے آرام کرسی پر بیٹھ کر اپنی خوشی کا اظہار کیا۔ "اب میں کسی کے ہاتھوں بلیک میل نہیں ہو سکوں گا۔"

"یہ تمہارا ذاتی معاملہ ہے جس سے مجھے کوئی سروکار نہیں۔" لوچن شانے اچکا کر بولا۔ "مجھے اس بات کی فکر تھی کہ کہیں تم ان لوگوں کے ہتھے نہ چڑھ گئے ہو جو ہماری نگرانی سے غافل نہیں ہوں گے۔"

"ایک دوست کی حیثیت سے میں تمہاری اس فکر کی قدر کرتا ہوں لیکن تم یہ کیوں بھول رہے ہو کہ میک اپ میں ہماری ماں بھی ہمیں اکثر نہیں پہچان سکتی......" وشنو نے لوچن کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ "میں نگرانی کرنے والوں کی ناک کے نیچے سے سینہ تان کر گزر گیا تھا لیکن اس وقت میں ایسے میک اپ میں تھا کہ شاید تم بھی مجھے وشنو ماننے سے انکار کر دیتے۔"

"اونٹ جب تک پہاڑ کے نیچے نہ آئے خود کو سب سے بڑا ہی سمجھتا ہے۔" جواب میں لوچن نے بھی اسے اپنی برتری کا احساس دلاتے ہوئے کہا۔ "مجھے تمہاری فکر کسی اور وجہ سے تھی۔"

"میں سمجھا نہیں......" وشنو نے اسے وضاحت طلب نظروں سے دیکھا۔

"اسے ایک اتفاق ہی سمجھو کہ وقت اور حالات نے ہم دونوں کو ملا دیا ہے۔ ان لمحات میں یہی چاہوں گا کہ ہم ایک دوسرے پر اپنی سبقت کا اظہار کرنے کے بجائے صرف دوستوں کی طرح رہیں۔" لوچن کے تیور تیکھے ہو گئے۔ "آئندہ خیال رکھنا۔"

"تم بھی شاید ٹھیک ہی کہہ رہے ہو...... میں نے بھی خود کو کبھی کسی کا پابند نہیں سمجھا۔" وشنو نے محتاط انداز میں کہا۔ "میں بھی یہی چاہوں گا ہم جب تک ساتھ رہیں ہمارے بیچ دوستی ہی کا تعلق برقرار رہے۔"

"تم ابھی اپنی کسی ذاتی مجبوری کی بات کر رہے تھے؟" لوچن نے مسکرا کر دریافت کیا۔

"ہاں!...... میں نے غلط نہیں کہا تھا۔" وشنو نے خلا میں گھورتے ہوئے جواب دیا۔ "وہ کلونت کی کچھ گندی تصویریں تھیں جو کسی کے ہاتھ لگ گئی تھیں۔ میں نے اب انہیں جلا کر راکھ کر دیا ہے۔"

"حیرت ہے......" لوچن نے اسے سوالیہ نظروں سے گھورا۔ "جب تم کلونت کو اپنے ہاتھوں سے ذبح کر چکے تھے تو اب تمہیں کس بات کی فکر تھی؟"

"تم...... تم ان باتوں کو......" وشنو نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ کر کہا۔ "کوئی اور بات کرو میرے دوست۔"

"کافی منگاؤں...... میرا مطلب ہے کہ تم کچھ کچھ اداس نظر آ رہے ہو، ایسے لمحوں میں کافی سکون بخش ہوتی ہے۔"

"منگا لو......" وشنو نے چبھتے ہوئے انداز میں جواب دیا۔ "اس بار میں اس میں کوئی ایسی دوا نہیں شامل کروں گا جو تمہیں بے ہوش کر دے، میں نے پہلے جو کیا اس پر شرمندہ ہوں مائی ڈیئر لیکن...... وہ میری ضرورت تھی، اس کے بغیر غالباً تم مجھے جانے بھی نہ دیتے۔"

لوچن نے وشنو کے چہرے کا بہ نظر غور جائزہ لیا، کلونت کا نام سن کر وہ ہمیشہ کی طرح اس وقت بھی جذباتی ہو گیا تھا، اس نے کھلے دل سے اپنی شرمندگی کا اظہار کر دیا تھا۔ لوچن نے ریسیور اٹھا کر روم سروس کو کافی کا آرڈر دیا پھر اس نے وشنو کو کریدنے کی خاطر خلا میں گھورتے ہوئے کہا تھا۔

"پولیس اور ملٹری کے بڑے بڑے دماغ بھی ابھی تک شیخ حامد یا آکٹوپس کے سلسلے میں قیاس آرائی کر رہے ہیں کہ وہ زندہ ہے یا مر گیا۔"

"تمہارا کیا خیال ہے......؟" وشنو نے مسکرا کر پوچھا۔

"میری ذاتی معلومات کے مطابق اس کا تعلق بھی انڈر ورلڈ سے تھا۔ وہ زندہ ہے یا مر گیا؟ اس سے میری

صحت پر کوئی فرق نہیں پڑے گا۔"

"مجھے بھی اپنا ہم خیال ہی سمجھو۔" وشنو نے اس بار قدرے سنجیدگی سے جواب دیا۔ "ہم اپنی ضرورت ہی کی خاطر دوسروں کے لیے خود کو خطرات میں ڈالتے ہیں۔ مجرم ماں کی کوکھ سے جنم نہیں لیتا۔ وقت اور حالات ہی انسان کو اچھے یا برے راستے پر ڈالنے کے ذمے دار ہوتے ہیں۔"

"ایک بات پوچھوں؟" لوچن سنبھل کر بیٹھ گیا۔

"ضرور پوچھو...... وشنو تم سے غلط بیانی نہیں کرے گا۔"

"اگر آکٹوپس زندہ ہوا تو کیا تم اب بھی اس کے لیے کام کرو گے؟"

"ہاں...... بالکل اسی طرح جس طرح تم کسی معاہدے کو پورا کرنے کی خاطر ایک عورت کے لیے کام کر رہے ہو...... میری بات کو غلط نہ سمجھنا میرے دوست۔ ہم دونوں کا تعلق ان لوگوں میں سے ہے جو کبھی کسی معاہدے کی مدت پوری ہونے سے پیشتر اپنے وعدے سے منہ نہیں پھیراتے۔"

لوچن کوئی معقول جواب دینے کے لیے پر تول رہا تھا جب دروازے پر دستک ہوئی، وشنو نے اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ ہوٹل کا کارندہ مطلوبہ کافی لے کر آیا تھا۔ لوچن کافی بنانے میں مصروف ہو گیا لیکن وشنو کی کہی ہوئی بات کا ایک ایک لفظ اس کے کانوں میں گونج رہا تھا۔

وشنو نے جو کہا وہ غلط بھی نہیں تھا......!

اس وقت سراج دفتر جانے کے بجائے سیدھا اورنگ زیب کے آفس پہنچا تھا۔ وہ راستے ہی میں تھا جب اسے اورنگ زیب کی کال موصول ہوئی تھی چنانچہ اس نے گاڑی کا رخ اسی طرف موڑ دیا۔ اورنگ زیب اسے باہر ہی منتظر ملا تھا، اسی کی فہمائش پر سراج نے اپنی گاڑی ایک طرف پارک کی پھر وہ بھی اورنگ زیب کے ساتھ بیٹھ گیا۔ اس نے محسوس کیا تھا کہ اورنگ زیب اس وقت یا تو موڈ میں نہیں تھا یا اس کا ذہن کسی اہم دفتری کام کے سلسلے میں الجھا ہوا نظر آ رہا تھا۔ کچھ دیر خاموشی رہی پھر سراج نے گفتگو کی ابتدا کی۔

"اس وقت کہاں کا ارادہ ہے؟"

"ڈی آئی جی صاحب نے طلب کیا ہے۔" اورنگ زیب نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ "یہ ہدایت بھی ملی ہے کہ میں اکیلا ان کی خدمت میں پیش ہوں۔"

"ایسی صورت میں کیا میرا آپ کے ہمراہ جانا......"

"فکر مت کرو...... میں خود تمہیں ڈی آئی جی کے کمرے میں نہیں لے جاؤں گا۔"

سراج نے خاموشی اختیار کی۔ اسے علم تھا کہ اورنگ زیب نے اپنے ذاتی معاملات میں کبھی کسی آفیسر کی دخل اندازی قبول نہیں کی تھی۔ اس وقت بھی اگر اس نے سراج کو ساتھ لیا تھا تو اس کا مقصد بھی ڈی آئی جی کو یہ احساس دلانا ہوگا کہ دفتری احکامات سے ہٹ کر وہ اس کی چودھراہٹ قبول کرنے کو تیار نہیں ہے۔ ہوا بھی ایسا ہی تھا۔ ڈی آئی جی آفس کے احاطے میں داخل ہو کر اس نے اپنی گاڑی انسپکٹر ٹریفک کے دفتر کے عین سامنے روکی تھی۔ سراج خاموشی سے اورنگ زیب کے ساتھ ہی باہر آ گیا۔ راستے میں اس نے مختصر انداز میں راحیلہ بیگم کی کار کو ٹکر مار کر فرار ہونے کی واردات سے بھی آگاہ کر دیا تھا۔

"آپ نے کیوں زحمت اٹھائی سر؟" ٹریفک انسپکٹر نے کرسی سے اٹھتے ہوئے انکساری کا اظہار کیا۔ "کوئی کام درپیش تھا تو ایک فون کر دیتے۔"

"شکریہ انسپکٹر!" اورنگ زیب مسکرا کر بولا۔ "میں اس وقت مسٹر سراج کے ساتھ ایک کام سے نکلا تھا کہ ڈی آئی جی کی کال آ گئی۔ اس لیے تم میری خاطر مسٹر سراج کی آؤ بھگت کرو۔ میں فارغ ہو کر آتا ہوں۔"

اورنگ زیب ورانڈے میں قدم اٹھاتا ڈی آئی جی کے کمرے کی سمت روانہ ہو گیا، انسپکٹر ٹریفک نے سراج کے ساتھ کچھ وقت گزارنا بھی اپنے لیے اعزاز ہی سمجھا۔ ایک ہی محکمے میں ہوتے ہوئے اسے بخوبی علم تھا کہ سراج بھی اورنگ زیب ہی کی طرح ان ایماندار اور دبنگ افسروں میں شمار کیا جاتا تھا جو اپنے فرائض دیانتداری سے انجام دینے کے عادی تھے۔

دوسری جانب اورنگ زیب حسب معمول باہر کھڑے کانسٹیبل کے سیلوٹ کا جواب دیتا ہوا ڈی آئی جی کے کمرے میں داخل ہوا جہاں اس وقت تین اخبار کے سینئر رپورٹر بھی موجود تھے۔ تینوں کے ڈی آئی جی سے ذاتی مراسم بھی تھے شاید اسی لیے کسی پریس کانفرنس کے بجائے ان تینوں کو کسی خاص مقصد سے بلایا گیا تھا۔

اورنگ زیب کے سلام کا جواب دیتے وقت ڈی آئی جی کے چہرے پر بس ایک پل کے لیے مسکراہٹ ابھری پھر...... اس نے اورنگ زیب کو بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے تینوں رپورٹرز کی جانب دیکھتے ہوئے قدرے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "آکٹوپس...... آکٹوپس...... آکٹوپس!...... اب یہ نام اور اس کی مہر کو دہشت پھیلانے کی خاطر خوف کی علامت کے طور پر استعمال کیا جا رہا ہے۔

میرا خیال ہے کہ چھوٹے موٹے بدمعاش بھی اب اس نام سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کر رہے ہیں جس کا فوری تدارک وقت کی اہم ضرورت ہے۔"

"آپ کا خیال درست ہے۔" ایک رپورٹر نے جواب دیا۔ "اس کا سدباب اشد ضروری ہے ورنہ یہ وبا بھی کسی متعدی مرض کی طرح پورے شہر کو اپنی لپیٹ میں لے سکتی ہے۔"

"لیکن ہم میڈیا کے لوگ اس ضمن میں کیا روک تھام کر سکتے ہیں؟" دوسرے نے ڈی آئی جی سے سوال کیا۔ "جو خبریں ہمیں اپنے یا پولیس کے ذرائع سے ملتی ہیں ہم انہی کو تھوڑی سی ترمیم اور اضافہ کے بعد عوام کے سامنے پیش کر دیتے ہیں۔"

"پولیس نے اب تک مسٹر لودھی کے سلسلے میں کیا پیش رفت کی ہے......؟" تیسرے نے اپنی معلومات کے لیے دریافت کیا۔

"کچھ مخصوص نام پولیس کے نوٹس میں آئے ہیں جس کی چھان بین کی جا رہی ہے۔" ڈی آئی جی نے روایتی جواب دیا پھر کرسی پر کسمسا کر بولا۔ "میرا خیال ہے کہ اگر اخبارات آکٹوپس کی ضمن میں خبروں کی اشاعت بند کر دیں تو اس نام سے فائدہ اٹھانے والوں کی حوصلہ شکنی بھی بڑی حد تک ہو جائے گی۔"

"اس کے لیے آپ کو آفیشلی طور پر پریس کانفرنس کرنا ضروری ہے۔" ایک رپورٹر نے کہا۔ "صرف ہم تین اخباروں کی خاموشی سے کام نہیں چلے گا، شام کے اخبارات کو اور کھل کھیلنے کا موقع مل جائے گا، ہمارے مالکان بھی اس کو پسند نہیں کریں گے۔"

ڈی آئی جی کچھ جواب دینا چاہتا تھا کہ دوسرے رپورٹر نے چبھتے ہوئے انداز میں پوچھا۔ "کیا مسٹر لودھی کے علاوہ بھی کسی واردات میں آکٹوپس کا علامتی نشان ملا ہے جو پولیس کے ذرائع ہمیں دینے سے گریز کر رہے ہیں؟"

اورنگ زیب نے سوال کرنے والے رپورٹر کو غور سے دیکھا لیکن کچھ بولا نہیں، بہ دستور خاموش تماشائی کی طرح بیٹھا رہا۔ ویسے اس کے ذہن میں رستم علی آغا خانی کا وہ بند لفافہ ضرور ابھرا تھا جو براہ راست نہیں بلکہ ملٹری کے ریٹائرڈ میجر عاطف کے خفیہ ذرائع سے اس تک پہنچایا گیا تھا۔ عین ممکن تھا کہ وہ خبر کسی ذریعے سے لیک بھی ہو گئی ہو۔ بہرحال ڈی آئی جی کی موجودہ جھلاہٹ کی صرف ایک ہی وجہ اس کے ذہن میں ابھری تھی۔ شاید میڈم روبی نے سراج اور اس سے گفتگو کرنے کے بعد اپنی شادی کے سلسلے میں ایسی کوئی بات ضرور کر دی تھی جو ڈی آئی جی کے ارمانوں پر اوس بن کر طاری ہو گئی تھی۔

"محترم......" ڈی آئی جی نے خاص طور پر اس اخباری نمائندے کو مخاطب کیا جس نے پولیس ذرائع کی رازداری کے شبہے کا اظہار کیا تھا۔ "آپ کے ذہن میں یہ خیال کس وجہ سے ابھرا کہ ہم کچھ خبریں...... خاص طور پر آکٹوپس کے سلسلے میں آپ تک نہیں پہنچاتے؟ اگر ایسی بات ہوتی تو میں اس وقت خصوصی طور پر آپ حضرات کو زحمت نہ دیتا۔"

"ہمارے ذہن بھی انسائیکلوپیڈیا ہوتے ہیں جناب، جن میں ساری معلومات محفوظ ہوتی ہیں۔" رپورٹر نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔ "مجھے معلوم ہے ایک زمانے میں شیخ حامد اور سیٹھ عثمان کے درمیان کچھ کاروباری معاملات کی وجہ سے ٹھن گئی تھی۔ کسی ٹرک نے ان کی گاڑی کو اس وقت ٹکر مار کر تباہ کر دیا تھا جب وہ کچھ دیر پہلے ہی گاڑی سے اتر کر ایک سپر اسٹور میں گئے تھے۔ ان کا ڈرائیور لیاقت حسین گاڑی کو دور لے گیا تھا اور وہ بھی موت کی لپیٹ میں آتے آتے بال بال بچا تھا۔" رپورٹر نے اپنی بات جاری رکھی۔ "ہمیں اپنے ذرائع سے اطلاع ملی ہے کہ کل دوبارہ کسی نئی اور ان رجسٹرڈ گاڑی نے اس وقت سیٹھ عثمان کی گھریلو استعمال والی کار کو خطرناک طور پر ایک ایسی مصروف روڈ پر سائڈ ماری تھی جہاں کوئی بڑا حادثہ بھی پیش آ سکتا تھا۔ اس بار بھی میری ذاتی اطلاع کے مطابق لیاقت حسین ہی گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا جس نے سامنے سے آنے والے لوڈنگ ٹرک سے کار کو تباہ ہونے سے بچا لیا۔ اب وہ گاڑی ایک ورکشاپ میں کھڑی ہے۔ کیا آپ کو اس کی اطلاع نہیں ملی؟"

"جی نہیں...... میں یہ بات اس وقت آپ ہی کی زبانی سن رہا ہوں۔" ڈی آئی جی نے رپورٹر کو جواب دینے کے بعد اورنگ زیب کی سمت دیکھ کر پوچھا۔ "کیا آپ کو اس بات کی اطلاع ہے؟"

"یہاں سے جانے کے بعد براہ راست سیٹھ عثمان سے کنفرم کروں گا۔" اورنگ زیب نے دیدہ و دانستہ گول مول جواب دیا۔

"حیرت ہے......" رپورٹر نے خاص طور پر اورنگ زیب کی طرف گھوم کر چبھتے ہوئے انداز میں کہا۔ "یہ بات سب جانتے ہیں کہ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ مسٹر سراج اور سیٹھ عثمان

کلاس فیلو رہ چکے ہیں اور ادھر کچھ عرصے سے آپ اور مسٹر سراج ایک ساتھ ہی نظر آتے ہیں۔‘‘

’’میں آپ کی بات سے انکار نہیں کروں گا میرے دوست۔‘‘ اورنگ زیب نے بے تکلفی سے کہا۔ ’’لیکن مسٹر سراج کا میرے ساتھ نظر آنا قطعی آفیشل ہے، میں مل جل کر کام کرنے کا عادی ہوں۔ دفتری معاملات کے علاوہ سراج سے میری ذاتی دوستی بھی ہے، میں اکثر اپنا فالتو وقت اسی کے گھر پر گزارتا ہوں آپ اپنی معلومات میں میری نجی مصروفیات کا بھی اضافہ کرلیں۔ میں میڈیا سے کوئی بات چھپانے کا عادی بھی نہیں ہوں۔‘‘

’’میرا خیال ہے کہ آپ کو شاید اس وقت میری بات اچھی نہیں لگی۔‘‘ رپورٹر نے پہلو بدل کر کہا۔ ’’اگر ایسا ہے تو میں......‘‘

’’پلیز، مائی ڈیئر......‘‘ اورنگ زیب نے اس کا جملہ کاٹ کر کہا۔ ’’میڈیا کی کوئی تنقید مجھے بری نہیں لگتی بشرطیکہ وہ تخریبی نہ ہو۔ اس جملے کی مزید وضاحت کردوں کہ ’’کالی بھیڑیں‘‘ ہمارے علاوہ میڈیا گروپس میں بھی ہیں جو بلیک میلنگ کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتیں۔‘‘

’’میں کالی بھیڑوں کے سلسلے میں آپ کی تفصیلی وضاحت کی قدر کرتا ہوں۔‘‘ رپورٹر کا لہجہ معنی خیز تھا جسے اورنگ زیب نے مسکرا کر ٹال دیا لیکن ڈی آئی جی اپنی کرسی پر کسمسا کر رہ گیا تھا۔ اس نے دوبارہ رپورٹرز کی توجہ اپنی جانب کرنے کی خاطر کہا۔

’’آکٹوپس کے معاملے میں میرا ذاتی خیال بھی یہی ہے کہ پریس کانفرنس بلائی جائے۔ بہرحال، ملٹری انٹیلی جنس اور پولیس کے بیشتر افسران کا یہی خیال ہے کہ شیخ حامد اور ہیلی کاپٹر سے اس کے ساتھ چھلانگ لگانے والا، دونوں کا اب کوئی وجود باقی نہیں رہا۔‘‘

’’میڈیا نے بھی یہی تشہیر کی تھی لیکن آپ کے مسٹر اورنگ زیب نے ایک سوال کے جواب میں......‘‘

’’یہ میرا قطعی ذاتی خیال ہے جو ممکن ہے غلط بھی ہو۔‘‘ اورنگ زیب درمیان میں بول پڑا۔ ’’لیکن میں اب بھی یہی کہوں گا کہ جب تک میں اپنی نظروں سے اس کی لاش نہیں دیکھ لیتا اس کی موت کا یقین بھی نہیں کرسکتا۔‘‘

’’آپ کی اس منطق کے پیچھے کوئی نہ کوئی وجہ بھی ہوگی۔‘‘ ایک رپورٹر نے سوال کیا۔

’’میری منطق میرا وہم بھی ہوسکتی ہے مائی ڈیئر...... اس کے باوجود میں فی الحال اس میں کوئی ردوبدل نہیں کرسکتا۔‘‘

کچھ دیر اسی موضوع پر بات ہوتی رہی پھر ڈی آئی جی نے کہیں جانے کا بہانہ کرکے رپورٹرز کو رخصت کردیا۔ اس کے بعد اس نے ایک لمبی سانس لے کر اورنگ زیب کی طرف دیکھا، مدھم لہجے میں بولا۔

’’میں نے اس وقت آپ کو دو مقاصد کی خاطر بلایا تھا۔ ایک یہ کہ آپ میری اور میرے پاس آنے والے اخباری نمائندوں کی بات بھی سن لیں دوسرے یہ کہ مجھے ایک ذاتی کام میں آپ کی مدد کی ضرورت بھی درپیش ہے، اسی غرض سے میں نے آپ سے تنہا آنے کی درخواست کی تھی۔‘‘

’’اگر میں آپ کے کسی کام آسکا تو یہ میری خوش قسمتی ہوگی۔‘‘ اورنگ زیب سنبھل کر بیٹھ گیا۔

’’لودھی کے وحشیانہ قتل کے سلسلے میں غالباً میڈم روبی نے مسٹر سراج اور آپ سے بھی کچھ گفتگو کی تھی۔‘‘

’’آئی۔سی۔‘‘ اورنگ زیب نے مسکرا کر جواب دیا۔ ’’میرا اندازہ اگر غلط نہیں ہے تو شاید میڈم نے اپنی انگیجمنٹ کے سلسلے میں آپ سے براہ راست بھی کچھ گفتگو ضرور کی ہے۔‘‘

’’یو آر رائٹ......‘‘ ڈی آئی جی نے کرسی سے ٹیک لگاتے ہوئے دوستانہ انداز اختیار کیا۔ ’’مجھے یقین ہے کہ سراج اور ان کی مسز اس معاملے میں میڈم کو ہموار کرسکتے ہیں اور...... آکٹوپس کے سلسلے میں آپ کو بھی میری خاطر اپنے اندر کچھ لچک پیدا کرنی ہوگی۔‘‘

’’اگر اجازت ہو تو آپ کے اس ذاتی مسئلے کا ایک ریڈی میڈ حل فوری پیش کردوں۔‘‘ جواب میں اورنگ زیب نے بھی بے تکلفی سے کہا۔

’’پلیز......‘‘

’’آپ ایک دو دن میں کسی بھی تقریب کا بہانہ کرکے میڈم، سراج اور الماس کو اپنے دولت خانے پر انوائٹ کرلیں، آپ کے بے حد اصرار پر میں بھی شریک ہوجاؤں گا۔ مجھے قوی امید ہے اس پارٹی کے بعد آپ کا مسئلہ حل ہوجائے گا۔‘‘

ڈی آئی جی نے اس تجویز کو فوری طور پر قبول کیا تو اورنگ زیب نے اٹھ کر بڑی گرمجوشی سے اس سے ہاتھ ملایا اور...... ’’وش یو گڈ لک!‘‘ کہتا ہوا واپسی کی اجازت حاصل کرکے کمرے سے باہر آگیا۔

’’آج آپ کو کس مقصد سے طلب کیا گیا تھا؟‘‘ واپسی میں سراج نے اورنگ زیب کو سنجیدہ دیکھ کر پوچھا۔

’’کوئی اہم بات تھی؟‘‘

’’اہم نہیں بلکہ سنگین ترین سمجھو......‘‘

’’خیریت......؟‘‘

’’فی الحال یہ سمجھ لو کہ میں اس وقت ایک موٹا تازہ بکرا ذبح کرکے آیا ہوں اس لیے تھکن محسوس ہورہی ہے۔‘‘

’’میں سمجھا نہیں......‘‘

جواب میں اورنگ زیب نے ڈی آئی جی کی میڈم کے سلسلے میں کسمپرسی کی کیفیت کچھ ایسے دل گرفتہ انداز میں بیان کی کہ سراج بھی اپنی بے اختیار ہنسی کو ضبط نہ کرسکا۔

راستے بھر اپنے ذہن کو ریفریش کرنے کی خاطر اورنگ زیب ڈی آئی جی اور میڈم روبی کے موضوع پر مختلف زاویوں سے گفتگو کرتا رہا لیکن دفتر پہنچنے کے بعد اپنی سیٹ پر بیٹھتے ہی اس نے گہری سنجیدگی اختیار کرلی۔ ڈیوٹی کانسٹیبل کو بلا کر اس نے ملاقات کے لیے آنے والوں کے سلسلے میں کچھ ضروری ہدایتیں دیں پھر اس کے جانے کے بعد سراج سے پوچھا۔

’’مسز عثمان کو کل جو حادثہ پیش آتے آتے رہ گیا، اس کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟‘‘

’’میں شوروم والے سے ملا تھا۔ اس کا بیان ہے کہ دو جوان جو بہ ظاہر کھاتے پیتے گھرانے کے لگتے تھے، وہ گاڑیاں دیکھنے آئے تھے۔ ان میں ایک نے گاڑی کی ٹرائی لینے کی بات کی تھی۔ دوسرا بہ طور ضمانت شوروم پر بیٹھا رہا پھر وہ بھی کارندوں کی نظر بچا کر نو دو گیارہ ہوگیا۔ بعد میں گاڑی میں بھی کوئی ٹوٹ پھوٹ نہیں پائی گئی۔ سوائے اس حصے کہ جو لوڈنگ ٹرک سے رگڑ گیا تھا۔‘‘ سراج نے مزید تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔ ’’ہوسکتا ہے کہ یہ ایک اتفاقیہ حادثہ ہو جس کے بعد دونوں نوجوان پولیس سے دامن بچانے کی خاطر گاڑی چھوڑ کر فرار ہوگئے ہیں۔ بہرحال میں نے اسٹیئرنگ پر ملنے والے نشانات حاصل کرلیے ہیں۔‘‘

’’کیا مسز عثمان کا بھی یہی خیال ہے؟‘‘

’’انہوں نے کوئی بات یقین سے نہیں کہی البتہ لیاقت حسین کا کہنا ہے جو کچھ ہوا وہ اتفاق نہیں ہوسکتا۔ سب کچھ کسی سوچی سمجھی اسکیم کے تحت کیا گیا تھا۔‘‘

’’میں لیاقت حسین کے خیال کی تائید کروں گا۔‘‘ اورنگ زیب نے نہایت سنجیدگی سے کہا۔ ’’اگر اسٹیئرنگ پر وہ نہ ہوتا تو خدانخواستہ جانی نقصان بھی ہوسکتا تھا۔‘‘

’’لیکن مسز عثمان کو نقصان پہنچا کر وہ کیا فائدہ حاصل کرسکتے تھے؟‘‘

جواب سن کر اورنگ زیب کے ہونٹوں کو ایک لمحے کو جنبش ہوئی پھر وہ بڑی دیر تک کسی سوچ میں غرق رہنے کے بعد بولا۔ ’’سمندر کی تہ میں چھپ کر سکون حاصل کرنے والی مخلوق بھی اکثر حبس اور گرمی کی شدت سے گھبرا کر باہر آجاتی ہے۔ آکٹوپس کو نہایت سخت جان تصور کیا جاتا ہے، وہ بھی سمندر کے نچلے حصوں میں رہ کر اپنی خونخوار ٹانگوں سے شکار کرتا ہے مگر میں......‘‘ اورنگ زیب کچھ کہتے کہتے رکا پھر میز پر دونوں کہنیاں ٹکا کر سرسراتے لہجے میں بولا۔ ’’میں اس وقت جس آکٹوپس کی بات کررہا ہوں وہ بھی اب سمندر کی تہوں سے نکل کر اوپر آنے کی کوشش کررہا ہے۔‘‘

’’کیا مطلب......؟‘‘ سراج نے پہلو بدل کر اورنگ زیب کو وضاحت طلب نظروں سے دیکھا۔ جواب میں اورنگ زیب نے اٹھ کر الماری سے ایک لفافہ نکال کر اس کے سامنے ڈال دیا۔ سراج نے اسے کھول کر دیکھا۔ ’’برہنہ فوٹوز کو اس نے فوری طور پر پلٹ کر رکھ دیا تھا لیکن اس پر آکٹوپس کی مہر اور پھر ٹائپ شدہ پیغام پڑھنے کے بعد اس کی پیشانی پر بھی آڑی ترچھی لکیریں ابھرنے لگیں۔

’’پہلے لودھی کو اس کی غداری کی سزا دی گئی۔ اس کے بعد رستم علی کو زبان بند رکھنے اور پولیس سے دور رہنے کی خاطر یہ تصویریں بھیجی گئیں، پھر مسز عثمان کو حادثہ بھی پیش آتے آتے رہ گیا...... نہیں مائی ڈیئر سراج، نہیں...... واقعات جس تسلسل اور تیزی سے سامنے آرہے ہیں اسے محض اتفاق نہیں کہا جاسکتا...... بڑے مجرم پولیس کو اپنی برتری کا احساس دلانے کی خاطر اسی قسم کی چھچھوری حرکتیں کرنے کے عادی ہوتے ہیں۔‘‘

’’یہ تصویر اور خط آپ کو کس طرح ملا؟‘‘ سراج نے سوال کیا۔

’’تمہارا کیا خیال ہے؟‘‘

’’مجھے کم از کم رستم علی آغا خانی سے یہ توقع نہیں ہے کہ وہ دریا میں رہ کر براہ راست کسی بڑے مگرمچھ سے بیر مول لینے کی غلطی کرسکتا ہے۔‘‘

’’تمہارا اندازہ صد فیصد درست ہے۔ سربند لفافہ مجھے جس شخص کے ذریعے ملا ہے وہ ابھی تک مجرموں کی نظروں میں نہیں ہے ورنہ آئندہ شکار وہی ہوتا۔‘‘

’’آئی۔سی۔‘‘ سراج نے ہونٹ کاٹتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔ ’’میرا خیال ہے کہ اب ہماری طرف سے بھی جوابی کارروائی کا وقت آگیا ہے۔‘‘

’’مجھے تمہارا جواب سن کر خوشی ہوئی...... آکٹوپس یا

اس کے کسی ہمزاد کو سامنے لانے کا ایک ہی موثر طریقہ ہے۔"
"وہ کیا......؟"
"ہمیں ایسے تالابوں کو پانی کی موجودگی سے محروم کرنا پڑے گا جہاں چھپ کر وہ سانس لے رہا ہے۔"
اورنگ زیب نے خلا میں گھورتے ہوئے ایسے جذباتی انداز میں یہ بات کہی کہ سراج بھی گڑبڑا کر رہ گیا، اس کی نگاہوں میں مچلنے والی سرخی کچھ خطرناک عزائم کی غمازی کر رہی تھی۔ سراج ان تاثرات کو سمجھنے کی کوشش کرتا رہا پھر وہ کچھ کہنے کا ارادہ کر رہا تھا جب اورنگ زیب نے دراز سے دوسرا موبائل نکالا جسے وہ اپنے خاص خاص ذرائع سے کوڈ ورڈز میں بات کرنے کے لیے استعمال کرتا تھا۔
موبائل پر کسی کے نمبر پنچ کرنے کے بعد وہ خلا میں گھورتا رہا پھر دوسری جانب سے رابطہ قائم ہونے کے بعد یکلخت آواز بدل کر کوڈ ورڈز میں کہا۔ "اٹ از سرجن انچارج آف اسپیشل وارڈ...... یس!...... کوالیفائڈ ٹیم از ریکوائرڈ...... ہارٹ...... کڈنی...... تو...... ویٹ فار نائٹ کال...... او۔کے...... اوور۔"
کال ختم کرنے کے بعد بھی اورنگ زیب کے چہرے کے تاثرات میں کھنچاؤ کی کیفیت باقی رہی تو سراج نے ماحول کی اس گھٹن اور تناؤ کو دور کرنے کی خاطر بے تکلفی سے پوچھا۔
"آپ کی یہ لاطینی زبان اور مخصوص کوڈز میری سمجھ میں کب آئیں گے؟"
"شاید کبھی نہیں اس لیے...... کہ تم صرف ایک ڈیوٹی مائنڈڈ پولیس آفیسر ہو۔"
"بات اب بھی میری ناقص عقل میں پوری طرح نہیں سمائی۔"
"پولیس ٹریننگ کے بعد میں نے چھ ماہ تک فوجی ٹریننگ بھی اپنے شوق سے کی تھی۔" اورنگ زیب نے قدرے ریلیکس ہو کر کہا۔ "پاسنگ آؤٹ پریڈ کے بعد مجھے بیسٹ کیڈٹ کے اعزاز سے بھی نوازا گیا۔ اس روز ٹریننگ دینے والے استاد نے مجھے دو باتیں بڑے گر کی بتائی تھیں جو آج بھی عملی زندگی میں میری رہنمائی کرتی ہیں۔ اس سخت ٹرینر کی زبان سے وہ باتیں سن کر مجھے حیرت بھی ہوئی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ جب تک انسان کسی کی ماں سے رشتہ قائم نہیں کرتا وہ اسے "باپ" نہیں کہتا۔ دوسری نصیحت بھی اس وقت میرے لیے ناقابل فہم ہی تھی۔ استاد نے کہا تھا کہ پتر! اگر دنیا میں لاقانونیت نہ ہوتی تو قانونی محکمے بھی عالم وجود میں نہ آتے۔"
"موجودہ صورت حال سے ان دونوں مثالوں کا کیا تعلق ہے؟" سراج نے کسمسا کر سوال کیا۔
"فی الحال میں اس کی وضاحت نہیں کروں گا۔" اورنگ زیب نے موضوع بدل کر کہا۔ "الماس کا اب خاص خیال رکھنا، مسز عثمان کے بعد اس کا نمبر بھی آ سکتا ہے۔ خود اپنی آنکھیں بھی کھلی رکھنا۔ جو بات میرے ذہن میں کسی کن کھجورے کی طرح کلبلا رہی ہے اس کے پیش نظر ہم دونوں بھی کسی کی ہٹ لسٹ پر ضرور ہوں گے۔"
"ایک بات کی وضاحت اور چاہوں گا۔"
"پوچھو......"
"کیا لودھی کے قتل کے بعد جو سلسلہ شروع ہوا ہے اس کے مزید جاری رہنے کے امکانات ہیں؟"
"امکانات کچھ ایسے ہی نظر آ رہے ہیں۔" اورنگ زیب نے معنی خیز انداز میں کندھے اچکا کر جواب دیا پھر وہ اپنے مخصوص موبائل کی طرف متوجہ ہو گیا جس پر کسی آنے والی کال کی اطلاع کے طور پر نیلی پیلی لائٹ جل بجھ رہی تھی۔
"ہیلو......" اورنگ زیب نے موبائل آن کر کے کان سے لگا لیا، اس کے چہرے پر پھر سنجیدگی مسلط ہونے لگی، زبان سے پھر بے ربط جملے ادا ہونے لگے۔ "میں سمجھ رہا ہوں...... نہیں، ایسا مت کرنا...... ابھی اس کے درمیان میں آنے کی ضرورت نہیں ہے...... ایس او ایس کے اصول کا خیال ہمیشہ کارآمد ثابت ہوتا ہے...... ڈونٹ وری...... او کے، میں خیال رکھوں گا...... تو...... ون بائی ون...... فرنٹ لائن سے دور ہی رہنا...... بائی۔"
سراج ایک بار پھر ہونقوں کی طرح اورنگ زیب کی شکل دیکھتا رہا۔ کال ختم ہوئی تو اس نے دیدہ و دانستہ مسکرا کر ڈی آئی جی اور میڈم روبی کا مسئلہ چھیڑتے ہوئے کہا۔
"مجھے فضا میں بارود کی جو مہک محسوس ہو رہی ہے اس کے تحت ضروری ہے کہ ڈی آئی جی کا مسئلہ بھی اونٹ کی طرح کسی کروٹ بیٹھ جائے ورنہ میڈم اگر ہتھے سے اکھڑی تو پھر آسانی سے نہیں مانے گی۔"
"تم گھر پہنچو گے تو شاید الماس تمہیں اس سلسلے میں کوئی تازہ خبر ضرور سنائے گی۔ ڈی آئی جی اب تک میرے اندازے کے مطابق میڈم اور الماس دونوں کو فون کھڑکھڑا چکا ہوگا۔"
"اس دعوت میں آپ کو خاص طور پر آکٹوپس کے سلسلے میں اپنی رائے میں کچھ لچک بھی پیدا کرنے پڑے گی۔"
"کوشش کروں گا کہ میں نیوٹرل ہی رہوں۔ ویسے

میری ذاتی خواہش ہے کہ اب ان دونوں کا گھر آباد ہوجائے۔“

”میرے لیے اب کیا حکم ہے؟“ سراج نے دستی گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے پوچھا۔

”تم اب آفس جاسکتے ہو، میں نے تمہیں خاص طور پر رستم علی کی طرف سے موصول ہونے والا لفافہ دکھانے کی غرض سے بلایا تھا۔“ اورنگ زیب نے جاتے جاتے وقت سراج کو کچھ مخصوص کام بھی سونپے جن کو سن کر وہ چونکا لیکن کچھ کہے بغیر مسکراتا ہوا رخصت ہوگیا۔

☆☆☆

تیزی اور تسلسل سے پیش آنے والے حیران کن واقعات نے افضل خان کو ذہنی طور پر بری طرح الجھا رکھا تھا۔ سابقہ باتیں اس وقت بھی اس کے ذہن میں گونج رہی تھیں۔ اخبارات میں بگ باس کے سمندر برد ہونے کی خبر سن کر اس نے سکون ہی کا سانس لیا تھا لیکن ابھی وہ مکمل آزادی نہیں حاصل کرسکا تھا۔

ملٹری انٹیلی جنس کے ہاتھوں پھنسنے کے بعد اس نے بھی امداد علی اور جگا کی طرح وعدہ معاف گواہ بننا قبول کرلیا تھا، اپنا بیان بھی ریکارڈ کرادیا تھا جس کے بعد اسے اسپتال منتقل کردیا گیا تھا اور اب اس وقت وہ اس فلیٹ میں تھا جو اسے بگ باس نے دے رکھا تھا۔ اس فلیٹ میں رہائش اختیار کرنے کا حکم اسے ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ سراج نے عین اس وقت سامنے آکر سنایا تھا جب وہ اسپتال سے رخصت ہورہا تھا۔ سراج نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا تھا۔

”افضل خان...... میں تمہیں ایک نئی زندگی کی مبارک باد دیتا ہوں لیکن ایک بات ذہن نشین کرلو کہ اب تم صرف اور صرف ہمارے کہنے پر عمل کروگے دوسری صورت میں تمہارا انجام کیا ہوگا، یہ تم خود بھی سمجھ سکتے ہو۔“

”مجھے منظور ہے لیکن ایک شرط پر۔“

”سوری......“ سراج نے زہرخند سے جواب دیا۔ ”تم اب اس پوزیشن میں نہیں ہو کہ کوئی شرط منوا سکو۔“

”آپ اسے میری درخواست سمجھ لیں۔“ افضل خان نے فوری طور پر کینچلی بدل لی تھی۔

”کیا کہنا چاہتے ہو؟“

”میں قید رہ کر زندگی نہیں گزار سکتا۔ مجھے آزاد فضا میں بھی سانس لینے کی اجازت ہونی چاہیے۔“

”میری طرف سے اجازت ہے لیکن یہ بھی بتادوں کہ تمہارے بگ باس کے کچھ شکاری کتے اب بھی دور دور رہ کر بھونک رہے ہیں۔ ہوسکتا ہے وہ تمہارا پولیس کے لیے کام کرنا پسند نہ کریں۔ ایسی صورت میں تمہاری زندگی کو خطرہ بھی پیش آسکتا ہے۔“

”یہ میرا مسئلہ ہوگا۔ آپ جانتے ہیں کہ میں خطرات سے کھیلنے کا عادی رہا ہوں۔“

”او۔کے“ سراج نے کہا۔ ”دو چار روز تک تم عین تک ہی محدود رہو۔ میں فائنل جواب تمہیں فوری طور پر دینے کی پوزیشن میں بھی نہیں ہوں۔“

”ایک بات اور بتادیں تو ہمیشہ آپ کا احسان مند رہوں گا۔“ افضل خان نے بل کھا کر دریافت کیا۔ ”ساحل سمندر پر اس وقت مجھ پر گولی کس نے چلائی تھی جب میں جگا اور امداد علی کو قابو کرچکا تھا۔“

”تم ایک اہم بات بھول رہے ہو افضل خان۔“ سراج نے کچھ سوچ کر جواب دیا۔ ”محبت اور جنگ میں تمام حربوں کا استعمال جائز ہوتا ہے، وہ فائر بھی تمہارے بگ باس نے تمہیں راستے سے ہٹانے کی خاطر کرایا تھا۔“

”اوہ...... ڈبل کراس۔“ افضل خان کسی زخمی درندے کی طرح بل کھانے لگا۔

”یہ بات تمہیں پہلے ہی سمجھ لینی چاہیے تھی کہ تمہارا ڈرٹی بگ باس جن لوگوں کے نام اپنی فہرست سے نکال دیتا تھا ان کو دوبارہ قبول کرنا اس کی سرشت کے منافی تھا۔ حالانکہ تم اس کے دست راست بھی رہ چکے تھے۔“

”اب سارا گیم کچھ کچھ میری سمجھ میں آرہا ہے لیکن شبنم نے ڈبل رول کیوں ادا کیا؟“

”شبنم کو غلط مت سمجھو افضل خان۔“ سراج نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔ ”بگ باس کی ملازمت اس نے کسی اور وجہ سے قبول کی تھی۔“

”اور وجہ...... اور وجہ کیا ہوسکتی ہے؟“

”میڈم روبی کی طرح شبنم کا کچھ حساب بھی تمہارے ڈرٹی بگ باس کی طرف نکلتا تھا لیکن اسے کوئی موقع نہ مل سکا کہ وہ حساب چکتا کرسکتی۔“

”آپ کو اتنے اندر کی باتوں کا علم کس طرح ہوا؟“

”مجھے بہت سی ایسی باتیں بھی معلوم ہیں جن کی گہرائی تک شاید تمہارے فرشتے بھی کبھی نہ پہنچ سکیں۔ کل تک شبنم بھی شکاری کتوں کے اشارے پر چلنے کے لیے مجبور تھی لیکن اب اسے تحفظ دینے کی ذمے داری بھی میں تمہیں سونپ رہا ہوں۔“ سراج نے کہا۔ ”آج شام تک وہ بھی اپنا ضروری سامان لے کر تمہارے پاس آجائے گی اور...... تم فکر نہ

کرنا...... ہمارے سادہ لباس والے تمہاری نگرانی اور حفاظت پر مامور ہوں گے۔“

افضل خان اس وقت بھی سراج کی باتوں پر سنجیدگی سے غور کر رہا تھا جب دروازے پر کسی نے دستک دی۔ آنے والی شبنم کے سوا کوئی اور نہیں تھی۔ اس کے ہاتھ میں دو بیگ بھی تھے جس میں اس نے شاید اپنی ضرورت کی چیزیں رکھی ہوئی تھیں...... اندر آنے کے بعد اس نے افضل خان کو گہری نظروں سے دیکھا پھر رندھی ہوئی آواز میں بولی۔

”مجھے تم سے کوئی شکوہ نہیں ہے افضل خان...... حالات کے پیش نظر تم نے سراج صاحب سے جس شبے کا اظہار کیا میں اس کے بارے میں تمہارے دل کا میل نہیں دھوسکتی۔ تمہاری طرح فی الوقت میں بھی انہی کے حکم کی تعمیل میں یہاں آئی ہوں۔ کوشش کروں گی کہ تمہارا کھویا ہوا اعتماد دوبارہ حاصل کرسکوں۔“

”جب بگ باس کی زندگی میں مجھے اسپتال سے نکالا گیا اس وقت تم کس کے اشارے پر مجھے اپنے فلیٹ پر لے گئی تھیں؟“

”اس وقت تمہاری طرح میں بھی بگ باس کے اشاروں پر عمل کرنے پر مجبور تھی۔“ شبنم نے صاف گوئی سے جواب دیا۔

”تم نے کہا تھا کہ اگر میں رستم علی آغا خانی کے خلاف بلیک میلنگ اسٹف فراہم کرنے میں کامیاب ہوگیا تو بگ باس مجھے دوبارہ میرا کھویا ہوا مقام دیدے گا؟“

”ہاں...... اس نے مجھ سے یہی کہا تھا۔“

”تم نے اس کی ملازمت کیوں اختیار کی تھی؟“

”اگر میں نے تمہیں پہلے نہیں بتایا تو اب سن لو کہ بگ باس نے میری ماں کو بھی بے عزت کرنے کے بعد مار دیا تھا۔“ شبنم کے چہرے پر خون کی سرخی گہری ہونے لگی۔ ”میں کسی ایسے موقعے کی تلاش میں تھی جب میں اس زہریلے ناگ کا سر اس طرح کچل سکتی کہ کسی اور کو اس کی بھنک نہ ملتی۔“

افضل کچھ دیر اسے مختلف زاویوں سے کریدتا رہا پھر اس کے قریب آکر بولا۔

”میرے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟“

”کس پہلو سے دریافت کررہے ہو؟“ شبنم نے دبی زبان میں کہا۔ ”مجھے تمہاری بہت ساری نجی مصروفیات کا علم بھی ہے۔“

”لیکن میں نے کبھی تمہیں کسی شکایت کا موقع نہیں دیا۔“

”ہاں...... میں اس سے انکار نہیں کروں گی۔“

”ایک بات اور معلوم کرنا چاہوں گا۔ کیا موجودہ حالات میں ہم پولیس پر بھروسا کرسکتے ہیں؟“

”اس کے علاوہ ہمارے پاس کوئی متبادل راستہ بھی نہیں ہے۔“

”مسٹر سراج نے کہا تھا کہ بگ باس کے کچھ شکاری کتے اب بھی میری ٹانگ گھسیٹنے کی کوشش ضرور کریں گے۔“

”دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں افضل خان...... اس لیے میں فی الحال کھل کر کچھ نہیں کہہ سکتی لیکن اتنا ضرور جانتی ہوں کہ پولیس کے علاوہ بھی کوئی پارٹی ہے جو ہمیں اپنے اشاروں پر چلانا چاہتی ہے۔ تمہیں بھی یاد ہوگا کہ جب میں اسپتال میں تم سے ملنے آئی تھی تو بڑے ڈاکٹر نے کس قدر روکھے پھیکے لہجے میں وہاں سے چلے جانے کو کہا تھا۔“ شبنم نے سنجیدگی سے کہا پھر کچھ سوچ کر افضل خان کو وہ بات بھی تفصیل سے سنادی جب جبرو اسے اسلم ڈنکا کے پاس لے گیا تھا۔ افضل خان تفصیل سننے کے دوران بار بار مختلف انداز میں پہلو بدلتا رہا پھر بڑے زہریلے انداز میں بولا۔

”کیا تمہیں یقین ہے کہ بگ باس تمہارے معاملے میں بھی ایسی گھٹیا اسکیم بنا سکتا تھا؟“

”اس میں یقین نہ کرنے کی کیا بات ہے۔“ شبنم نے بہ دستور سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”کچھ دنوں اورنگ زیب کی تحویل میں رہنے کے بعد شاید بگ باس نے مجھے بھی اپنی فطرت کے مطابق راستے سے ہٹانے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ جبرو کے ساتھ بھی ایسا ہی گیم پلے کرنے کا ارادہ رہا ہوگا لیکن جبرو نے اسلم ڈنکا کو سب کچھ کھل کر بتادیا تھا اس کے بعد...... اتفاق ہی سمجھو کہ کسی ایجنسی نے بروقت کارروائی کی اور میں اس کے نتیجے میں ابھی تک محفوظ ہوں۔“

”تم...... تم آئندہ بھی محفوظ ہی رہو گی۔“ اس بار افضل خان نے شبنم کی آنکھوں میں دور تک جھانکتے ہوئے کہا۔ ”شاید اس لیے کہ ہم ایک دوسرے کی ضرورت ہیں۔ کیا تمہیں اس بات کا اندازہ نہیں ہے کہ روز اول سے میں نے خاص طور پر تمہارے سلسلے میں محتاط رویہ کیوں اختیار کر رکھا تھا؟“

”میں تمہاری بات سمجھ رہی ہوں افضل لیکن فی الحال ہمیں کچھ عرصے ساتھ رہ کر ایک دوسرے کو اور سمجھ لینا چاہیے۔“

”اگر یہ تمہاری خواہش ہے تو میں اس پر کوئی اعتراض بھی نہیں کروں گا۔“ افضل خان نے اس بار خاصی بے تکلفی سے جواب دیا پھر آگے بڑھ کر اس نے دونوں

ہاتھ شبنم کے کاندھوں پر رکھ دے۔ شبنم نے جواب میں اسے محبت بھری نظروں سے دیکھا پھر اپنا سامان درست کرنے میں مصروف ہوگئی۔

٭٭٭

شیخ حامد کی سیل شدہ کوٹھی پر مستقل رات کی ڈیوٹی کرنے والے دونوں کانسٹیبل اس وقت بھی شکلوں سے بے زار ہی نظر آرہے تھے۔ وہ باری باری کوٹھی کا راؤنڈ لگانے کے بعد کچھ دیر ستانے کے بہانے ایک ساتھ بیٹھ جاتے تھے۔ اب بھی وہ راؤنڈ لگانے کے بعد بید کی پرانی کرسیوں پر بیٹھے تو ایک نے اپنی جھلاہٹ کا اظہار کر ہی دیا۔ ”آخر ہم کب تک اس طرح روکھی پھیکی حالت میں بیگار بھگتاتے رہیں گے؟“

”رات کی مستقل ڈیوٹی سے میں بھی تنگ آچکا ہوں۔“ دوسرا بولا۔ ”سب جانتے ہیں کہ صرف تنخواہ سے ہمارا گزارا نہیں ہوتا۔ رات کی ڈیوٹی میں ویسے بھی دس خطرے ہوتے ہیں۔ دن میں چھ چھ گھنٹے کی ڈیوٹی کرنے والے زیادہ عیش کرتے ہیں۔“

”تمہارا کیا مشورہ ہے؟...... کیا ہم اوپر والوں سے بات کریں۔“

”نہیں...... تم بھی جانتے ہو کہ ہماری ڈیوٹی ایس پی صاحب کے اشارے پر لگائی گئی ہے ایسا نہ ہوتا تو ہم ہیڈ کانسٹیبل کی مٹھی گرم کر کے بھی ڈیوٹی تبدیل کرا سکتے تھے۔“

”سیل شدہ عمارت کے اندر کون سا قارون کا خزانہ رکھا ہوگا ہم جس کی حفاظت پر تعینات کیے گئے ہیں؟“ دوسرے نے دل برداشتہ انداز میں تلملا کر کہا۔ ”ہم کو آٹے میں نمک ملانے کی سزا مل رہی ہے۔ نمک میں آٹے کی چٹکی ڈال رہے ہوتے تو ایسا نہ ہوتا۔ ہم بھی اس وقت گھروں پر آرام سے ٹانگیں پسارے خراٹے لے رہے ہوتے۔“

”ایک آئیڈیا ہے میرے ذہن میں۔“ پہلے نے سرسراتے لہجے میں کہا۔ ”ہوسکتا ہے کہ پولیس اسپتال کے بڑے ڈاکٹر کا چپراسی ہماری مشکل آسان کرا دے، سب جانتے ہیں کہ بیماری کا جھوٹا سرٹیفکیٹ جاری کرنے کے لیے ڈاکٹر اسی کے ذریعے رقمیں وصول کرتا ہے۔ اس حرام کے تخم نے بھی عہدے اور ضرورت کے اصولوں پر مختلف ریٹ باندھ رکھے ہیں۔“

”ایسی صورت میں بھی ہم دونوں میں سے کوئی ایک ہی فائدہ اٹھا سکتا ہے۔“

”میرے ذہن میں ایک آئیڈیا اور بھی ہے۔ کیوں نہ ہم اس پر عمل کریں۔“ اس نے اپنی بات جاری رکھی۔ ”براہ راست ایس پی صاحب سے مل کر کہیں کہ اب ہماری رات کی مشقت ختم کر کے چھ گھنٹے والی ڈیوٹی لگا دیں۔“

”اور اگر انہوں نے بھی سرخ جھنڈی دکھا دی تو......؟“

”امید پر دنیا قائم ہے۔ ایک ٹرائی کر کے دیکھ لینے میں کوئی نقصان بھی نہیں ہے۔“

پھر وہ دونوں باتوں میں مصروف تھے کہ ایک ٹیکسی آکر ان کے قریب رکی، اس سے اترنے والے دو کانسٹیبل ہی تھے جنہوں نے ہاتھ میں ایک تھیلا بھی اٹھا رکھا تھا، آنے والے پہرا دینے والوں کے لیے یا تو نئے تھے یا کسی دوسرے تھانے سے تبادلہ ہو کر آئے تھے۔ ٹیکسی سے اتر کر وہ دونوں ان کے قریب آگئے۔ ٹیکسی دور کھڑی رہی۔

”ادھر کیسے آنا ہوا اتنی رات کو؟“ ڈیوٹی دینے والے ایک کانسٹیبل نے آنے والوں سے پوچھا۔

”سر منڈاتے ہی اولے پڑ گئے۔“ آنے والے نے کہا۔ ”آج ہی دوسری چوکی سے تبدیل ہو کر آئے تھے، کچھ دیر پہلے ہیڈ کانسٹیبل نے ادھر رات کی ڈیوٹی پر بھیج دیا۔ شاید تم نے اس کو کہا ہوگا، ہمارا واقف نہیں تھا اس لیے اس نے ادھر بھیڑ دیا۔ اب تم دونوں جا کر عیش کرو۔“ اس کو اپنا دکھڑا سنانے کے بعد ذرا قریب آکر کہا۔ ”ٹیکسی والے کو ہم نے قابو کر رکھا ہے، تم اسی پر بیٹھ کر جہاں مرضی چلے جاؤ، کرایہ ایک دمڑی بھی نہ دینا سالے کو......“

”جاتے جاتے اپنی رہائی کی خوشی میں منہ بھی میٹھا کرلو۔“ دوسرے آنے والے نے مٹھائی کا ڈبا تھیلے سے نکال کر کہا۔ ”رات گزارنے کی خاطر ہم اور بھی چیزیں ساتھ لائے ہیں۔“

ڈیوٹی دینے والوں نے بڑے شوق سے لڈو کھائے پھر ایک ہنس کر بولا۔ ”اس کو کہتے ہیں چھپر پھاڑ کر دینا۔ ابھی ہم اپنے تبادلے کی بات ہی کر رہے تھے کہ تم آگئے۔“

”ہم بھی زیادہ دن نہیں رکیں گے دوست۔“ آنے والے نے ایک آنکھ جھپکا کر جواب دیا۔ ”ایس پی کی ایمانداری اپنی جگہ لیکن ہم نے ڈی آئی جی آفس کے ایک دو بندوں کا بھتہ باندھ رکھا ہے۔ وہ ہمارا کام کرنے سے نہیں موڑ سکتے۔“

چاروں جلد ہی بے تکلف ہو گئے پھر ڈیوٹی دینے والا ایک سپاہی اندر سے اپنا سامان سمیٹنے گیا تو واپس نہیں آیا۔ دوسرا اسے دیکھنے کی خاطر ڈگمگاتا ہوا اٹھا لیکن وہ بھی سنبھل نہ سکا۔ ہاتھ جما کر نیچے بیٹھ تو گیا لیکن پھر وہ بھی سیدھا ہو کر لمبا لیٹ گیا۔ آنے والے دونوں سپاہیوں نے ایک دوسرے کو مسکرا کر دیکھا پھر ایک نے سرسراتے لہجے میں کہا۔

”ایک مرحلہ تو آسانی سے طے ہوگیا۔ اب ان دونوں کو اٹھا کر ادھر باہر ہی کہیں قریب ڈال دو، اس طرح کہ عارضی طور پر کسی آنے جانے والے کو نظر بھی نہ آئیں۔“

ٹیکسی ڈرائیور بھی اتر کر دونوں کی مدد کی خاطر آگیا۔ دونوں بے ہوش کانسٹیبلوں کو ڈنڈا ڈولی کر کے سڑک کی دوسری جانب خالی پلاٹ پر ڈال دیا گیا پھر دراز قد والے نے تھیلا اٹھا کر ٹیکسی ڈرائیور کو ساتھ آنے کا اشارہ کرتے ہوئے اپنے ساتھی سے کہا۔

”تم ادھر باہر کا خیال رکھنا۔ ایک ذرا بھی خطرہ ہو تو مخصوص سگنل کے ذریعے اشارہ کر دینا۔“

”ٹھیک ہے لیکن...... دروازے پر جو سیل لگی ہے اس کا کیا کرو گے؟“

”روشن دانوں کے شیشے زیادہ قیمتی نہیں ہیں۔ انہیں بھی کاٹنے کا سامان ہے میرے پاس۔“

”دیکھ بھال کر سب کام نمٹانا۔ باس کا یہی حکم ہے کہ پولیس کا سارا محکمہ مل کر بھی اس واردات کی تہ تک نہ پہنچ سکے۔ سسٹم پر رینج سیٹ کرنے کا دھیان بھی رکھنا۔ قریب کے بنگلوں کو کوئی نقصان نہ پہنچے۔“

”آخر یہ سب کس مقصد کی خاطر کیا جارہا ہے؟“ جو ٹیکسی ڈرائیور کی یونیفارم میں تھا، اس نے پہلی بار زبان کھولی۔

”ہم اس پوزیشن میں نہیں ہیں کہ کیوں، کس لیے اور مقصد جاننے والی بات کرسکیں۔“ دراز قد والے نے خشک اور سرد لہجہ اختیار کیا۔ ”صرف جو باس نے حکم دیا ہے اس پر عمل کرنے کا دھیان رکھو۔ کرید کرنے کی بھنک باس کے کانوں تک پہنچ گئی تو ہمارا انجام بھی اچھا نہ ہوگا۔“

اس کے بعد کسی نے زبان کھولنے کی غلطی نہیں کی، دراز قد والا ٹیکسی ڈرائیور کا ہاتھ تھام کر کوٹھی کے اندر داخل ہوگیا، باہر نظر آنے والے تیسرے شخص نے صدر پھاٹک کے آس پاس لیفٹ رائٹ شروع کردی۔ اس کے ذہن میں کئی سوالات گردش کر رہے تھے جو قابل غور تھے لیکن وہ بھی جانتا تھا کہ باس کی طرف سے جاری کیا جانے والا حکم آخری ہوتا ہے، اس میں کسی ترمیم اور اضافے کی گنجائش نہیں ہوتی۔ چوں و چرا کرنے والوں کے ساتھ بھی کوئی رعایت نہیں کی جاتی۔ اصل باس کون تھا؟ ابھی انہیں اس کا علم بھی نہیں ہوسکا تھا۔ ان کو جو تنخواہ ملتی تھی وہ بھی خاصی معقول تھی۔ مہینے میں ایک دو کام ہی انجام دینے پڑتے تھے لیکن ان کی پلاننگ اتنی مہارت سے کی جاتی تھی کہ ابھی تک پولیس کے ماہرین بھی اس کا کوئی توڑ دریافت نہیں کر سکے تھے۔

جب تک شیخ حامد زندہ تھا، ان کا ایک محتاط اندازہ یہی تھا کہ وہی اس ٹیم کو خفیہ طور پر استعمال کرتا تھا لیکن اس کی موت کی خبر عام ہونے کے بعد ٹیم کے اکثر ورکر یہ سوچنے پر مجبور ہوگئے تھے یا تو بگ باس مرا نہیں ہے یا پھر اس کی بدروح نے اس کی گدی سنبھال رکھی ہے۔ دونوں صورتوں میں اوپر سے ملنے والے احکامات کی بجا آوری ان پر فرض تھی لیکن کچھ باتیں ایسی درمیان میں آجاتی تھیں جس سے ان کی عقل بھی دنگ رہ جاتی تھی۔

سیل بند کوٹھی اندر سے تباہ کرنے کا فیصلہ بھی اگر شیخ حامد یا اس کی بدروح نے کیا تھا تو اس میں بھی کوئی نہ کوئی مصلحت ضرور ہوگی۔ ممکن ہے پولیس اور خصوصاً اورنگ زیب کی پوزیشن کو عوام کی نظروں سے گرانے کی خاطر ایک سوچی سمجھی اسکیم کے تحت یہ سب کچھ کیا جارہا ہو؟ وہ اپنے خیالوں سے الجھ رہا تھا جب اس کے موبائل پر کال ریسیو ہوئی، اس نے روشن اسکرین پر نمبر دیکھ کر کال ریسیو کرنے میں دیر نہیں لگائی۔ کال اس دراز قد والے کی تھی جو ٹیکسی والے کے ساتھ اندر گیا تھا۔

”کوئی نیا حکم؟“

”میں نے گھوم پھر کر تمام ممکن جگہوں کو کھنگال لیا ہے، بہ ظاہر کسی تہ خانے کا کوئی راستہ نہیں مل سکا۔“

”جانتا ہوں۔“ اس نے سرسراتے لہجے میں جواب دیا۔ ”اگر اس کو تلاش کرنا آسان ہوتا تو اب تک پولیس بھی اسے تلاش کرنے میں کامیاب ہوچکی ہوتی۔“

”پھر...... تمہارا کیا مشورہ ہے......؟“

”اوپر والوں سے بات کر کے دیکھ لو......؟“

”تم شاید بھول رہے ہو...... ہمیں کسی کو کال کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ صرف اوپر سے ملنے والے احکام پر عمل کرنا فرض ہے۔“

”ایسی صورت میں جہاں جہاں شبہ ہو وہاں بھی کام کی چیز فٹ کر کے آجاؤ...... ہوسکتا ہے تہ خانے کا راستہ بھی اس کی زد میں آجائے۔“

”میرا بھی یہی خیال ہے......“ دوسری جانب سے سلسلہ منقطع کر دیا گیا۔

باہر ڈیوٹی دینے والا جو اس وقت پولیس کی یونیفارم میں تھا پھر اپنے خیالوں سے الجھنے لگا۔ اگر وہ سب شیخ حامد

ہی کے خفیہ کارندے تھے تو پھر عمارت میں کسی تہ خانے کا راستہ تلاش کر لینا ان کے لیے بھی اتنا ہی مشکل تھا جتنا پولیس کے لیے ثابت ہو چکا تھا ورنہ بگ باس اتنی آسانی سے نظروں میں آئے بغیر چھومنتر ہو کر ہیلی کاپٹر تک بھی نہ پہنچا ہوتا۔ اس کے بعد اس کی اور اس کے ساتھی کی لاش کا نہ ملنا بھی پولیس کے لیے ایک معما ہی تھا۔ ملٹری کے بڑوں اور پولیس کے ذمے داروں نے اس کی موت کو تسلیم کر لیا تھا۔ ایک ایس پی اورنگ زیب ہی تھا جو مرغے کی ایک ٹانگ کی طرح اپنی ضد پر قائم تھا۔

چالیس منٹ بعد دراز قد والا بھی ٹیکسی ڈرائیور کے ساتھ باہر واپس آ گیا۔ تھیلا اب کے پاس نہیں تھا، صرف ایک ریموٹ نما ڈیوائس تھی جو اس کے ہاتھ میں نظر آ رہی تھی۔

''کیا سارا کام مکمل ہو گیا؟'' باہر والے نے اس کے قریب آ کر سوال کیا۔

''ہاں...... ہمیں اب فوری طور پر یہاں سے کچھ دور نکل چلنا چاہیے۔''

''ٹھیک ہے لیکن...... تم نے اس بات کا دھیان تو ضرور رکھا ہوگا کہ تباہی صرف اندر اندر ہو۔ پاس پڑوس میں صرف افراتفری ہونی چاہیے۔ یہی حکم ملا تھا۔''

دراز قد والے نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ہاتھوں میں ربڑ کے دستانے ہونے کی وجہ سے یہی یقین تھا کہ ان کے فنگر پرنٹس کسی کو نہیں مل سکیں گے۔ وہ سب وقت ضائع کیے بغیر ٹیکسی میں بیٹھ گئے جس کے بعد وہ بھی حرکت میں آ گئی لیکن تقریباً تین فرلانگ دور جانے کے بعد اسے دوبارہ روک دیا گیا۔

دراز قد والے نے ادھر ادھر دیکھا، آس پاس کوئی فرد نہیں تھا، رات کے اس پچھلے پہر میں سب ہی اپنے نرم و گرم بستر میں پڑے خراٹے لینے میں مصروف ہوں گے۔ اطراف سے پوری طرح مطمئن ہونے کے بعد ہی دراز قد والے نے ریموٹ نما ڈیوائس کا رخ اپنی مطلوبہ عمارت کی طرف کیا پھر اس کے واحد سرخ بٹن کو دبا دیا۔ دوسرے ہی پل پے درپے ہونے والے دھماکوں کے ساتھ بنگلوں اور دوسری رہائشی عمارتوں کی لائٹیں بھی آن ہونا شروع ہو گئیں۔

ڈرائیونگ سیٹ پر نظر آنے والے نے اگلے ہی لمحے گاڑی کو گیئر میں ڈالا پھر آہستہ آہستہ ایکسی لریٹر پر اس کے پیر کا دباؤ بھی بڑھتا ہی رہا۔

☆☆☆

یہ پہلا موقع تھا جب سول پولیس کے ساتھ ملٹری انتظامیہ کے ماہرین بھی شیخ حامد کی کوٹھی پر ہونے والے دھماکے کے سلسلے میں جائے حادثہ سے ضروری شہادتیں حاصل کر رہے تھے۔ قرب و جوار کی کوٹھیوں میں رہائش پذیر افراد بھی سراپا احتجاج بن گئے۔ شیخ حامد کی زندگی میں ان افراد نے کبھی اس کی کوٹھی کی طرف آنکھ اٹھانے کی بھی غلطی نہیں کی تھی لیکن اب ان سب کا ایک ہی مطالبہ تھا کہ اس کوٹھی کو جڑ سے ختم کر کے وہاں بچوں اور خواتین کا پارک تعمیر کر دیا جائے۔

بہرحال، کوٹھی میں ہونے والے پراسرار دھماکوں نے سب ہی کے ذہنوں میں کوئی نہ کوئی سوالیہ نشان بنا دیا تھا۔ دھماکے کے لیے استعمال ہونے والا آتش گیر مادہ کم طاقت کا تھا جس نے محض کوٹھی کے اندر کے حصوں کو کھنڈر بنانے میں تو موثر کردار ادا کیا تھا لیکن باہر کے ڈھانچے کو زیادہ ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہونے سے بچا لیا تھا۔ یہ معما بھی سب کے ذہنوں میں کلبلا رہا تھا کہ محض کوٹھی کے اندر تباہی کا کیا مقصد تھا؟ اس ضمن میں بھی یہی خیال کیا جا رہا تھا کہ وہاں کوئی ایسی اہم چیز یقیناً موجود تھی جسے تباہ کر دینا ضروری سمجھا گیا۔ اس کے ساتھ ہی یہ خیال بھی ذہنوں میں کلبلانا شروع ہو گیا کہ جب شیخ حامد مر چکا تھا تو پھر اس کے خلاف باقی رہ جانے والے ثبوت بھی پولیس کے لیے کیوں کر کام آ سکتے تھے؟

اخباروں نے بھی شیخ حامد کے حوالے سے ان دھماکوں کی خبروں کو بڑھا چڑھا کر چھاپا تھا، ڈیوٹی پر تعینات دونوں کانسٹیبل ہر چند کہ کوٹھی کے سامنے میدان سے بے ہوشی کی حالت میں ملے تھے لیکن ان کو بھی زیر حراست رکھا گیا تھا، جو کہانی وہ بتا رہے تھے ان کی روشنی میں بھی بے شمار کہانیاں جنم لے رہی تھیں۔ ایک دو اخبارات نے اورنگ زیب کے اس مفروضے کو بھی باکس کی صورت میں صفحہ اول پر شائع کیا تھا کہ ''آکٹوپس ابھی مرا نہیں...... سمندر کی تہوں میں کہیں چھپا سانس لے رہا تھا۔''

دن بھر کی چھان بین کے بعد کوٹھی کو دوبارہ لاک کر کے اس پر پہرے کی خاطر پولیس کی نفری میں بھی اضافہ کر دیا گیا تھا اور...... اس وقت آئی جی آفس کے کانفرنس ہال میں بھی پولیس کے ذمے دار افسران سر جوڑے بیٹھے اسی منحوس کوٹھی کے بارے میں گرما گرم بحث کر رہے تھے۔ نئے آنے والے آئی جی نے بھی اس حادثے کا خاص نوٹس لیا تھا۔ ڈی آئی جی اور اس کی ٹیم کے افسران بھی

الجھے الجھے نظر آ رہے تھے لیکن اورنگ زیب اس وقت بھی ہمیشہ کی طرح سنجیدہ اور مطمئن نظر آ رہا تھا۔ چہرے پر ایک ذرا سا تناؤ بھی نہیں تھا۔

''موجودہ حادثے کی تفصیل آپ تمام حضرات کے علم میں ہے۔'' آئی جی نے ساؤنڈ پروف کمرے میں موجود تمام افسران کو دیکھتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔ ''اس سے پیشتر کہ میں حادثے کے سلسلے میں گفتگو کروں، آپ حضرات کو یہ بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ چھٹی سے واپسی کے بعد کچھ ذاتی بنیادوں پر میں نے قبل از وقت ریٹائرمنٹ کی درخواست کی تھی جسے میرے سابقہ بے داغ ریکارڈ، کارکردگی اور حکومت کی ترجیحات کی بنا پر قبول نہیں کیا گیا اور مجھے پہلی بار آپ کے صوبے میں تعینات کر دیا گیا۔ ہو سکتا ہے کہ آپ کے لیے میں نیا ہوں لیکن ایک ہی محکمے میں ہونے کے سبب میں بیشتر افسران کے بارے میں خاصی واقفیت رکھتا ہوں۔ ویسے بھی جو افسران اچھی ریپوٹیشن اور نمایاں کام انجام دیتے ہیں ان کے نام حکومت کی لسٹ پر بھی موجود ہوتے ہیں۔'' آئی جی نے میز پر رکھے گلاس سے دو گھونٹ پانی پی کر بات جاری رکھی۔ ''آپ کے صوبے میں ڈیوٹی رپورٹ کرنے سے پیشتر میں نے ایک بار پھر حکومت سے خصوصی درخواست کی ہے کہ میری ریٹائرمنٹ کی درخواست پر از سر نو غور کیا جائے اس لیے عین ممکن ہے کہ میں آپ کے درمیان زیادہ عرصے نہ رہوں لیکن جب تک ہوں آپ مجھے اپنا دوست ہی سمجھیں اور میرے ساتھ تعاون کریں۔ آپ کے تعاون کے بغیر میری کامیابی بھی سوالیہ نشان بن سکتی ہے۔''

آئی جی نے سامنے بیٹھے ہوئے افسران پر نظر ڈالی پھر تھوڑے توقف سے بولا۔ ''موجودہ حادثے کی تفصیل میں نے اخباروں میں دیکھ لی ہے۔ شیخ حامد کی حقیقت جان لینے کے بعد اسمبلی اور سینیٹ میں بھی اس کی گونج اکثر سنائی دیتی ہے، بہرحال...... ڈی آئی جی صاحب نے مجھے جو بریفنگ دی ہے اس کے مطابق شیخ حامد کی رہائش گاہ کو ضروری چھان بین کے بعد ہی سیل کر دیا گیا تھا اور پولیس کانسٹیبلوں کی راؤنڈ دی کلاک ڈیوٹی بھی لگا دی گئی تھی۔''

''جی ہاں......'' ڈی آئی جی نے جو بائیں ہاتھ کی کرسی پر ساتھ ہی بیٹھا تھا دوبارہ تصدیق کی۔

''شیخ حامد کے کیس کو کون دیکھ رہا تھا؟'' آئی جی نے ڈی آئی جی سے سوال کیا۔

''میرے ساتھ اس ٹیم میں ایس پی اورنگ زیب اور ڈی ایس پی سراج بھی شریک تھے۔ ہمارے یہ دونوں افسران قابل اعتماد اور اچھی کارکردگی کے مالک ہیں، ان کی سابقہ ریپوٹیشن بھی بے داغ ہے۔''

''گڈ......'' آئی جی نے خوشی کا اظہار کیا پھر اس کی نظروں کا زاویہ بدل کر اورنگ زیب کی جانب ہو گیا، ایک لمحہ خاموش رہنے کے بعد اس نے براہ راست اورنگ زیب کو مخاطب کیا۔ ''آئی ایم پراؤڈ آف یو ینگ آفیسر...... میں نے آپ کے بارے میں پہلے بھی بہت کچھ سن رکھا ہے۔''

''تھینک یو سر......'' اورنگ زیب نے مختصر جواب دیا۔

''آپ کا اس حادثے کے بارے میں ذاتی خیال کیا ہے......؟ ایک سیل شدہ کوٹھی کو، جس کی چھان بین پوری طرح کی جا چکی تھی، اسے اندر سے تباہ کرنے سے کسی کا کیا مقصد ہو سکتا ہے؟''

''یہ حادثہ جیسا کہ سب کے علم میں ہے کل رات پیش آیا ہے۔'' اورنگ زیب نے مائک میں کہا۔ ''جو سپاہی وہاں تعینات تھے وہ بے ہوشی کی حالت میں ملے ہیں اور اس وقت پولیس اسپتال میں زیر علاج ہیں...... میں خود بھی ابھی کوئی آخری رائے قائم نہیں کر سکا ہوں لیکن ایک دو روز میں کوئی نہ کوئی کلیو ایسا ضرور مل جائے گا جو ہماری رہنمائی کے لیے کارآمد ثابت ہو سکتا ہے۔''

''آئی ایگری ود یو لیکن ایک سوال پھر بھی ہے کہ کسی کو ایسا کرنے سے کیا فائدہ حاصل ہو سکتا ہے؟''

''میں فوری طور پر اس کا کوئی جواب دینے سے قاصر ہوں۔'' جواب بے حد صاف گوئی اور بغیر کسی ہچکچاہٹ کے دیا گیا۔

''میں نے اخباروں میں ایک بات اور بھی پڑھی تھی......'' آئی جی نے دوستانہ انداز میں زیر لب مسکرا کر کہا۔ ''شاید آپ واحد آفیسر ہیں جس نے ابھی تک شیخ حامد یا آکٹوپس کو مردہ تسلیم نہیں کیا ہے۔''

''میں نے یہ بھی نہیں کہا کہ وہ زندہ ہے...... صرف یہ کہا تھا کہ جب تک میں اس کی لاش کو اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لوں، ذاتی طور پر مطمئن نہیں ہو سکتا۔''

''انٹرسٹنگ!'' آئی جی جواب سن کر مسکرایا پھر سنجیدگی سے بولا۔ ''ہر آفیسر کی طرح آپ نے فوری طور پر کوئی نہ کوئی رائے تو قائم کی ہوگی موجودہ حادثے کے بارے میں؟''

''میں اسے صرف وقتی خیال ہی کے طور پر عرض کروں گا۔'' اورنگ زیب سنبھل کر بولا۔ ''یہ بات بیشتر ہائی آفیشل کے علم میں ہے کہ شیخ حامد نے ہمیشہ دہشت گردوں،

خطرناک قاتلوں اور پولیس کو مطلوب خطرناک مجرموں کی پشت پناہی کی ہے۔ آکٹوپس یا شیخ حامد کا اثر و رسوخ خاصا اوپر تک تھا اس لیے ہمارے آفیسران بھی چشم پوشی سے کام لیتے رہے۔"

ڈی آئی جی اور دوسرے ایس پیز بھی کسمسانے لگے۔ اورنگ زیب نے اپنی بات جاری رکھی۔

"ہر شخص کو اپنی کرسی کی فکر ہوتی ہے سر...... بہرحال، میرا ذاتی خیال ہے کہ شیخ حامد نے جن خطرناک مجرموں کی پرورش کر رکھی تھی اب شاید وہ پولیس کی توجہ ہٹا کر دوسری طرف واردات کرنے کے پرانے ہتھکنڈوں کو اختیار کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔"

"ہو بھی سکتا ہے......" آئی جی نے سرسری انداز میں کہا پھر ادھر ادھر نظر ڈالتے ہوئے بولا۔ "ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ سراج کون ہیں؟"

ڈی آئی جی کچھ جواب دینا چاہتا تھا لیکن اورنگ زیب نے دوبارہ اپنا مائک آن کر کے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"سر...... یہ آپ کی پہلی میٹنگ تھی اس لیے ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ مسٹر سراج کو ہماری مخصوص ٹیم میں شامل ہونے کے باوجود پروٹوکول آفیسر نے اپنے جائز اختیارات کا استعمال کرتے ہوئے اندر آنے کی اجازت نہیں دی۔"

"ویری سیڈ!" آئی جی نے اپنی نشست پر کسمسا کر ڈی آئی جی کی سمت دیکھا۔

"اس کی اطلاع مجھے یہاں آنے کے بعد ملی تھی۔" ڈی آئی جی نے وضاحت کی۔ "پروٹوکول آفیسر نے اس ضمن میں معذرت بھی کر لی ہے۔"

"آئی۔ سی......" آئی جی نے شانے اچکا کر اس موضوع کو بدلتے ہوئے دوبارہ افسروں کی طرف دیکھ کر کہا۔ "اس حادثے کی وجوہات خواہ کچھ ہوں، ہم اسے نظرانداز نہیں کر سکتے۔ کوٹھی کی تباہی مسٹر اورنگ زیب کے خیال کے مطابق شیخ حامد کے گرگوں کی حرکت بھی ہو سکتی ہے، ہمیں بہرحال اپنی آنکھیں کھلی رکھنی ہوں گی۔ اب شیخ حامد زندہ نہیں ہے اس لیے اس کی اوپر تک رسائی کو بھول کر آپ حضرات اپنے اپنے علاقوں کو کھنگالیں اور پولیس کو مطلوب مجرموں کو جلد از جلد گرفتار کرنے کی بھرپور کوشش کریں۔ میں اس ضمن میں آپ کو تحریری حکم نامہ بھی روانہ کر دوں گا تاکہ آپ کی راہ میں اوپر سے کوئی رکاوٹ نہ ہو۔"

"میں تمام افسران کی طرف سے آپ کو بھرپور تعاون کا یقین دلاتا ہوں۔" ڈی آئی جی نے سنجیدگی سے کہا۔ "آپ کی سرپرستی رہی تو کوئی افسر بھی کوتاہی کا ثبوت نہ دے گا۔"

"گڈ......" آئی جی نے خوشی کا اظہار کیا پھر اس نے دوبارہ اورنگ زیب کی جانب دیکھا۔ "مجھے یقین ہے آپ کے پاس شیخ حامد کی جرائم پیشہ ٹیم کی کوئی نہ کوئی فائل ضرور ہو گی۔"

"نو سر......" اورنگ زیب نے صاف گوئی سے جواب دیا۔ "لیکن سینٹرل ریکارڈ آفس میں ایسے تمام جرائم پیشہ افراد کی فہرستیں مع تصاویر اور دیگر کوائف کے ضرور مل جائیں گی۔"

"تباہ شدہ کوٹھی کے سلسلے میں اب آپ نے کیا لائحہ عمل طے کیا ہے؟"

"ہمیں وہاں اپنی سیکیورٹی کے انتظامات کو اور ٹائٹ کرنا پڑے گا، وقتی طور پر میں نے پولیس کی نفری میں اضافہ کر دیا ہے۔"

"ون منٹ......" آئی جی نے کچھ سوچ کر سوال کیا۔ "کیا شیخ حامد کے کچھ قریبی عزیز دار بھی اس شہر میں موجود ہیں؟"

"ہو بھی سکتے ہیں لیکن جب سے میں نے یہاں کی رپورٹ کی ہے ایسا کوئی دور یا قریب کا عزیز دار سامنے نہیں آیا۔" اورنگ زیب نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

"میری اطلاع کے مطابق شیخ حامد کے سلسلے میں ملٹری انٹیلی جنس کے کرنل احتشام بھی ذاتی دلچسپی لے رہے ہیں؟"

"یس سر...... کرنل احتشام نے اس خیال کا اظہار بھی کیا تھا کہ شیخ حامد اس وقت انڈر ورلڈ مافیا کے نمبر ون کی حیثیت سے شمار کیا جاتا ہے۔"

"اوہ...... پھر تو ہمیں یہ بھی دیکھنا ہو گا کہ شیخ حامد کے غرق ہونے کے بعد کہیں مافیا کے دوسرے بڑے تو یہاں اپنا تسلط قائم کرنے کی کوشش نہیں کر رہے......؟" آئی جی نے پہلی بار اپنی پریشانی کا اظہار کیا۔

"ڈونٹ وری سر...... جب تک میں موجود ہوں آپ یا اس محکمے میں ہوں ایسا نہیں ہو سکے گا۔" اورنگ زیب نے ٹھوس لہجے میں جواب دیا۔ "شیخ حامد یا آکٹوپس کے بارے میں، میں خود کو ایس پی سمجھنے کے بجائے ایسا محب وطن سمجھتا ہوں جو کسی درمیانی رکاوٹ یا قانونی تقاضوں کو یکسر نظرانداز کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتا۔"

"مجھے آپ کا جواب سن کر خوشی ہوئی۔" آئی جی نے اسے سراہتے ہوئے کہا۔ "جب تک میں اس سیٹ پر ہوں

آپ کو بھی کسی قسم کی رکاوٹ نہیں ہو گی۔"

"تھینک یو سر......"

اورنگ زیب سے گفتگو ختم کرنے کے بعد آئی جی نے باری باری ہر ایس پی سے اس کے علاقے کے بارے میں مختلف سوالات کیے پھر اس نے سب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"میں چاہوں گا کہ جب تک میری ریٹائرمنٹ کا آخری فیصلہ نہیں ہو جاتا، آپ تمام حضرات قانون کی بالادستی کو قائم کرنے میں اپنا اپنا بھرپور کردار ادا کریں۔ اس ضمن میں اگر آپ میں سے کسی کو کوئی دشواری پیش آئے تو وہ ڈی آئی جی صاحب سے رجوع کرے یا اگر چاہے تو براہ راست مجھے بھی اپنی پریشانیوں سے آگاہ کر سکتا ہے۔"

اس کے بعد ڈی آئی جی نے بھی حسب دستور تمام افسران اور عملے کی جانب سے آئی جی کو اپنے بھرپور تعاون کا یقین دلایا۔ پھر وہ ریفریشمنٹ کے لیے اٹھ رہے تھے جب ڈی آئی جی کے موبائل پر ایک ایس ایچ او کی کال موصول ہوئی۔ ڈی آئی جی نے تلملا کر موبائل آن کر لیا۔ اس وقت اسے کسی ایس ایچ او کا کال کرنا اچھا نہیں لگا تھا۔

"کیا بات ہے......؟" اس نے سرد لہجے میں دریافت کیا۔

"شیخ حامد کی بیوی کنول کو دوبارہ اغوا کر لیا گیا ہے سر...... اس کی ماں نے شاید مزاحمت کی کوشش کی ہو گی اس لیے اسے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا ہے...... میں اس وقت موقع واردات سے ہی آپ کو اطلاع دے رہا ہوں...... اگر آپ مناسب سمجھیں تو ایس پی اورنگ زیب صاحب کو بھی آگاہ کر دیں۔ انہوں نے یہاں جو آدمی تعینات کیے تھے ان میں سے بھی دو زخمی ہیں، ایک کو میں نے فوری طور پر اسپتال روانہ کرا دیا ہے۔ ابھی تک میں نے کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگایا ہے۔"

"وہیں ٹھہرو...... میں اورنگ زیب کو بھیج رہا ہوں، کسی چیز کو ہاتھ بھی مت لگانا۔"

ایس پی اورنگ زیب اس اطلاع کے ملتے ہی آئی جی سے اجازت لے کر رخصت ہو گیا۔ آئی جی کے چہرے پر نظر آنے والی سنجیدگی بھی کچھ اور گہری ہو گئی۔

⁂⁂⁂

ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ سراج اطلاع ملتے ہی پوش علاقے کے اس بنگلے پر پہنچ گیا جہاں سے کنول کو اغوا کیا گیا تھا لیکن تفتیش کا باقاعدہ مرحلہ اورنگ زیب کے آنے کے بعد ہی شروع ہوا...... کا غذات کی تیاری علاقے کا ایس ایچ او کر رہا تھا۔ ضروری کارروائی کے لیے متعلقہ افراد بڑی احتیاط سے اپنی اپنی کارروائی کرنے میں مصروف تھے۔

اورنگ زیب نے پورے بنگلے میں گھوم پھر کر محض سرسری نظر ڈالی تھی۔ اس کی توجہ خاص طور پر کنول کی ماں کی خون آلود لاش پر تھی، اسے کچھ تشدد کے بعد گولی مار کر ہلاک کیا گیا تھا۔ کنول کے کمرے کی قیمتی اشیا جوں کی توں ملی تھیں، اغوا کرنے والوں نے ان کی طرف کوئی توجہ نہیں دی تھی۔

ضابطے کی کارروائی مکمل ہونے کے بعد اورنگ زیب نے مقتولہ کی لاش اٹھائے جانے سے پہلے اپنے اسپائی کیمرے سے صرف اس کے چہرے کا کلوزاپ لیا تھا، اس کے بعد ایس ایچ او نے مکان کو باہر سے سیل کرا دیا...... پاس پڑوس کے دور ہائشی افراد کا بیان بھی قلمبند کیا گیا۔ ان کا کہنا تھا کہ انہوں نے فائرنگ کی آواز نہیں سنی تھی۔ یہ بیان اس بات کی وضاحت کرتا تھا کہ کنول کو اغوا کرنے والوں نے سائیلنسر لگا ہوا اسلحہ استعمال کیا ہو گا۔

ضروری کارروائی کے بعد اورنگ زیب سراج کے گھر آ گیا۔ الماس کو حسب معمول کافی بنانے کا کہہ کر وہ لاؤنج کے ایک صوفے پر نیم دراز ہو گیا۔ سراج اس کے قریب ہی بیٹھ گیا۔ وہ اورنگ زیب کے چہرے پر طاری تھکن اور سنجیدگی کو بہ غور دیکھ رہا تھا۔ الماس کافی لے کر آئی تو اس نے بھی ایسا ہی محسوس کیا پھر...... سراج کے اشارے پر اورنگ زیب سے گفتگو کا آغاز بھی اسی نے کیا تھا۔

"نئے آئی۔ جی صاحب کی میٹنگ کیسی رہی؟"

"ہر کہ آمد، عمارت نو ساخت، والی بات سب ہی نے محسوس کی تھی۔"

"مجھے آپ سے ایک شکوہ بھی کرنا ہے۔" الماس نے شوخی سے کہا۔

"جانتا ہوں۔" اورنگ زیب نے مسکرا کر کہا۔ "میں نے خاص طور پر تمہاری شکایت نئے آئی جی کے کانوں تک بھی پہنچا دی تھی۔ پروٹوکول آفیسر نے ڈی آئی جی کے استفسار پر اس کی معذرت بھی طلب کر لی ہے۔"

"کنول کے اغوا کے بارے میں آپ نے کیا نتیجہ اخذ کیا ہے؟" سراج نے سنجیدگی سے دریافت کیا۔

"تمہارا کیا خیال ہے؟ کنول کے اغوا میں کون لوگ ملوث ہو سکتے ہیں؟" اورنگ زیب نے سراج کا عندیہ معلوم کرنے کی کوشش کی۔

"ہو سکتا ہے کہ اس میں آکٹوپس کے کچھ پالتو شکاری

کتوں کا ہاتھ ہو جو کم از کم آکٹوپس کی زندگی میں کنول کی طرف نظریں اٹھانے کی جرأت بھی نہیں کر سکتے تھے۔"
"اور کچھ......؟"
"آئی۔سی۔" سراج نے اورنگ زیب کے سوال پر چونک کر کہا۔ "کنول کے اغوا کی واردات میں آکٹوپس کا وہ علامتی نشان نہیں ملا جو ادھر تواتر سے نظر آرہا تھا۔"
"گڈ......" اورنگ زیب نے اسے تعریفی نظروں سے دیکھا پھر کافی کا ایک گھونٹ لے کر بولا۔ "اس بات کو میں نے بھی خاص طور سے نوٹ کیا تھا۔"
"ایک سوال میرے ذہن میں بھی کلبلا رہا ہے۔" سراج نے پہلو بدل کر دریافت کیا۔ "آپ نے خاص طور پر مرنے والی کے چہرے کا کلوز اپ ہی کیوں لیا...... جبکہ ہمارے کیمرا مین مختلف زاویوں سے تصاویر لے چکے تھے۔"
اورنگ زیب نے اس سوال پر بھی سراج کو تحسین آمیز نظروں سے دیکھا پھر کچھ توقف سے بولا۔ "تم نے شاید ان پھٹی پھٹی حیران نظروں کے تاثرات پر غور نہیں کیا جو مقتولہ کی نگاہوں میں جم کر رہ گئے تھے۔"
"اوہ......" سراج نے تیزی سے کہا۔ "شاید کنول کو اغوا کرنے والوں کو دیکھ کر اسے تعجب ہی ہوا ہوگا اور...... غالباً اسی وجہ سے اس غریب کو موت کا شکار ہونا پڑا۔"
"میں تمہاری زبان سے یہی الفاظ سننا چاہتا تھا۔"
"تخم تاثیر صحبت کا اثر والی مثال صادق آرہی ہے۔" سراج نے انکساری سے کام لیا۔ "اب لگے ہاتھوں ایک بات اور بتا دیں۔ آکٹوپس کے بنگلے میں ہونے والے پراسرار دھماکوں سے کسی کو کیا حاصل ہو سکتا ہے؟"
"آکٹوپس...... آکٹوپس!...... خدا کے لیے میرے سامنے اب اس کا ذکر نہ کریں ورنہ مجھے رات سوتے میں بھی اسی منحوس آبی جانور کی خطرناک سونڈیں ہی لہراتی نظر آئیں گی......" الماس نے بے تکلفی سے احتجاج کیا۔ "ہمارے پاس گفتگو کے لیے اور بھی بہت سارے موضوع ہیں۔"
"یو آر ہنڈرڈ پرسنٹ رائٹ۔" اورنگ زیب نے بڑی سنجیدگی سے الماس کی بات کی تائید کرتے ہوئے سراج کو گھورا۔ "میں نے تم کو راستے میں بھی منع کیا تھا کہ آفیشل باتیں گھر پر نہ کیا کرو۔"
"دوسرا کوئی ٹاپک ہے تمہارے ذہن میں؟" سراج نے الماس سے دریافت کیا۔
"کیوں نہیں......" الماس نے اس بار مسکرا کر کہا۔ "آپ حضرات یہ کیوں فراموش کر رہے ہیں کہ کل ہمیں کسی کی دعوت میں چلنا ہے جہاں گڈے اور گڑیا کی شادی کی تاریخ بھی طے کرنی ہے۔"
گڈے اور گڑیا والی بات سن کر اورنگ زیب اپنی ہنسی ضبط نہ کر سکا۔
"بکرا ذبح کرنے کا سہرا بھی آپ کے سر......" سراج نے اورنگ زیب سے کہا۔
"اور کل سب سے زیادہ اہم کردار بھی آپ کو ادا کرنا ہے۔" الماس نے اورنگ زیب کو مسکرا کر دیکھا۔ "وہاں کم از کم مرغے کی ایک ٹانگ والی مثال کو کسی کا گھر آباد کرنے کی خاطر فراموش کر دیجیے گا...... اگر آپ نے وہاں بھی منحوس آکٹوپس کے ون پرسنٹ بھی زندہ ہونے کی بات کی تو ہنڈرڈ پرسنٹ اوس بن کر ڈی آئی جی کے ارمانوں پر گرے گی۔ یہ سراسر زیادتی ہوگی اس غریب کے ساتھ جو نہ جانے کتنے ارمانوں سے کل کی دعوت کا اہتمام کر رہا ہوگا۔"
"ٹھیک ہے...... میں وہاں آکٹوپس کا ذکر ہی نہیں کروں گا۔" اورنگ زیب نے الماس کو بڑی اپنائیت سے دیکھتے ہوئے کہا۔
"آپ نہ کریں لیکن روبی تو اس کے زندہ یا مردہ ہونے کی تصدیق آپ ہی سے کرے گی۔" الماس نے بڑے بھولپن سے اورنگ زیب کو آمادہ کرنے کی خاطر کہا۔ "کسی دشمن کے زخموں پر بھی محبت سے مرہم لگانا بھی عبادت ہے۔ یہاں تو دو گھروں کو آباد کرنے کا مسئلہ در پیش ہے...... پلیز۔"
"او۔کے......" اورنگ زیب نے کسمسا کر جواب دیا۔ "تمہاری خاطر لیپا پوتی کرنے کی کوشش ضرور کروں گا۔"
"یہ ہوئی نا بات۔" الماس کچھ دیر بعد اسی موضوع پر بات کرنے کے بعد کافی کے برتن سمیٹ کر اٹھ گئی تو سراج اور اورنگ زیب کے درمیان دوبارہ کنول کے اغوا کے امکانات کی گفتگو چھڑ گئی۔

☆☆☆

اس کا سویا ہوا ذہن آہستہ آہستہ جاگنے لگا...... ذہن پر طاری غنودگی چھٹ رہی تھی، اس کے دماغ میں گزری ہوئی باتوں کا دھندلا دھندلا عکس ابھر رہا تھا پھر وہ کسی عورت کی کربناک چیخ کی آواز تھی جسے سن کر اس کی مزاحمت نے دم توڑ دیا، آنے والوں نے فوراً ہی جکڑ لیا تھا اس کی ناک پر رومال رکھا گیا جس سے پھوٹنے والی خوشبو اتنی تیز اور زود اثر تھی کہ اس کا ذہن اندھیروں میں ڈوبتا چلا گیا تھا اور اب...... اس کی ذہنی قوتیں دوبارہ بتدریج بکھرے ہوئے تانے بانے کو جوڑ رہی تھیں۔
اس وقت رات کے نو بجے تھے جب وہ کھانا کھا کر اوپر جانے کے لیے پَر تول رہی تھی۔
"نیچے سو جاؤ بیٹی......" ماں نے اس سے درد بھری آواز میں کہا تھا۔ "اوپر کب تک بستر پر کروٹیں بدل بدل کر کسی کا انتظار کرتی رہو گی۔"
"انتظار ہی تو زندگی کا واحد سہارا ہے ماں، جس دن یہ بھی ٹوٹ گیا، جسم اور روح کا تعلق بھی ختم ہو جائے گا۔"
"لیکن وہ......وہ......" ماں کچھ کہتے کہتے رک گئی تھی۔
"تم چپ کیوں ہو گئیں ماں؟" اس نے سرد آہ بھر کر ماں کو مخاطب کیا۔ "دل میں جو ہے وہ کہہ ڈالو۔"
"وہ......وہ مر چکا ہے میری بچی۔" ماں نے ہونٹ چباتے ہوئے مدھم آواز میں کہا۔ "انسان جو بوتا ہے ایک نہ ایک دن اسے وہی کاٹنا بھی پڑتا ہے اس کے اعمال کی سزا کا وقت آگیا تھا اس لیے وہ ایسا غرق ہوا کہ جنازہ بھی نصیب نہ ہوا۔"
"تم اس کے کن اعمال کی باتیں کر رہی ہو......؟" وہ ماں کے قریب آگئی۔ "دوسروں کے لیے وہ کیسا ہی سہی لیکن میرے ساتھ اس نے کوئی برائی نہیں کی تھی، وہ...... وہ چاہتا تو دوسری لڑکیوں کی طرح میرے ساتھ بھی زبردستی عارضی رشتہ قائم کر سکتا تھا لیکن...... وہ مجھے دلہن بنا کر لایا ہے۔"
"جانتی ہوں...... یہ بھی ایک فریب تھا۔" ماں کے لہجے میں یکلخت تناؤ کی کیفیت پیدا ہونے لگی۔ "باپ کو درندگی کا نشانہ بنا کر بیٹی سے نکاح کرنے والا بالآخر اپنے برے انجام کو پہنچ گیا لیکن میرے دل کی آگ ابھی سرد نہیں پڑی۔"
"یہ...... یہ تم کیا کہہ رہی ہو ماں۔" اس نے حیرت سے ماں کا منہ دیکھا۔ "اگر وہ میرے باپ کا قاتل تھا تو پھر تم نے اس سے میری شادی......"
"اس کے گریبان تک پہنچنے کے لیے یہی ایک راستہ نظر آیا تھا مجھے لیکن افسوس...... میری حسرت دل کی دل ہی میں رہ گئی لیکن خدا کی لاٹھی اپنا کام کر گئی۔"
ماں کے جملے اس کے کانوں میں صدائے بازگشت بن کر گونج رہے تھے جب وہ تینوں اجنبی آندھی اور طوفان کی طرح اندر آگئے تھے۔ ایک نے اسے قابو کرنے کی کوشش کی، ایک نے اس کی ماں کو ہاتھ تھام کر بے دردی سے کمرے میں دھکیل دیا۔ تیسرا دروازے پر جما کھڑا رہا۔
"تم......" اس نے اپنے اوپر ہاتھ ڈالنے والے کو حقارت سے دیکھا۔ "نمک حرام...... کتے...... کیا وہ زندہ ہوتے تو...... تو میرے قریب آنے کی کوشش کر سکتا تھا؟"
"اب بھی نہیں کر سکتا لیکن جو حکم دیا گیا ہے، اسے ٹال بھی نہیں سکتا۔" اس نے سرد لہجے میں غرا کر کہا۔ "شرافت سے میرے ساتھ نکل چلو ورنہ ہمیں مجبوراً تمہیں یہاں سے اٹھا کر کہیں اور پہنچانے کا حکم ملا ہے۔"
"اب......اب اس کے بعد حکم دینے والا کون رہ گیا ہے؟" اس نے ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی۔ "دور ہو جا مجھ سے۔"
"حماقت مت کرو ورنہ تم کو کسی بکری کی طرح دبوچ کر بھی اٹھالے جائیں گے۔"
کنول وہ جملہ سن کر دیوانی ہو گئی، اس نے خود کو آخری دم تک بچانے کی ٹھان لی تھی لیکن اسی لمحے اس کی ماں کی کربناک چیخ اس کے کانوں میں گونجی، وہ جس کے شکنجے سے نکلنے کی خاطر جدوجہد کر رہی تھی اس نے اسے بے آواز آتشی اسلحے سے گولی مار دی تھی۔ کنول نے دم توڑتی ماں کی پھٹی پھٹی نظروں اور اس کے سینے سے ابلنے والے خون کے فوارے کو دیکھا تو وہ وحشت زدہ ہو گئی۔ ماں کا آخری سہارا بھی اٹھ جانے کے بعد اسے اپنی سونی زندگی کا احساس اتنی شدت سے ہوا کہ اس کا پورا وجود برف کی طرف سرد ہو گیا۔ اسی ایک کمزور لمحے میں آنے والے نے اسے پوری طرح دبوچ لیا پھر...... رومال کی خوشبو نے اس کے سوچنے سمجھنے کی ساری قوتیں بھی سلب کر دی تھیں۔
اسے یاد نہیں تھا کہ اس منحوس سانحے کو گزرے کتنا وقت گزر چکا ہے لیکن جب اس نے بے ہوشی کا خمار ٹوٹنے کے بعد ہڑبڑا کر آنکھیں کھولیں تو تیز روشنی میں اس کی آنکھیں چندھیا گئیں اور کچھ دیر بعد دوبارہ آنکھ کھولی تو اس نے خود کو ایک نہایت آرام دہ کمرے میں نرم و گرم بستر پر پایا۔ ادھر ادھر نظریں دوڑائیں۔ اس کے سوا کمرے میں اور کوئی نہیں تھا، ایک لمحہ وہ حالات کا جائزہ لیتی رہی پھر اس نے اٹھنے کا ارادہ کیا تو کسی خفیہ مائک سے ایک زنانی آواز سنائی دی۔
"آپ آرام کریں میڈم۔ ہم آپ کے لیے راحت بخش شربت لا رہے ہیں۔"
کنول نے کوئی جواب نہیں دیا لیکن اس کا ذہن اب جاگ رہا تھا، وہ آنے والے سے زور آوری کرنے کا سوچ رہی تھی جب ایک خوب صورت ادھیڑ عمر کی عورت مسکراتی ہوئی سامنے آگئی۔ اس نے ہاتھ میں جو ٹرے اٹھا رکھی تھی اس میں ملک شیک کے علاوہ خوب صورتی سے تراشے ہوئے

فروٹ بھی موجود تھے۔ کنول کے قریب آکر ٹرے کو مسہری کے ساتھ والی میز پر رکھ دیا گیا جس کے قریب دو آرام کرسیاں بھی رکھی تھیں۔

''تم...... تم کون ہو......؟'' کنول نے اسے مخاطب کیا۔

''آپ کی طرح ایک عورت ہوں۔'' وہ مسکرا کر بولی۔ ''فی الحال اپنی خادمہ ہی سمجھیں۔''

''مجھے یہاں کس لیے لایا گیا ہے؟''

''اس کا جواب دینے کا اختیار نہیں ہے مجھے۔'' عورت نے سنبھل کر جواب دیا۔

''تم اتنی بے اختیار بھی نظر نہیں آتیں جتنا خود کو ظاہر کر رہی ہو۔'' اس نے حقارت سے ادھیڑ عمر کی عورت کو گھورا۔

''آپ مالک ہیں۔ جو چاہے کہہ سکتی ہیں۔'' عورت نے کنول کو سر سے پاؤں تک دیکھا پھر الٹے قدموں لوٹ گئی۔

وہ عورت کے جانے کے بعد بستر سے اتر کر نیچے آگئی، گزرے ہوئے لمحوں کا ہولناک تصور اور آنے والے لمحوں کا تصور اس کے معصوم خیالوں میں نشتر کے مانند چبھ رہا تھا جب مائک پر پھر وہی لرزتی آواز ابھری۔

''آپ نہا دھو کر لباس تبدیل کر لیں میڈم۔ فریش ہو کر ہلکا پھلکا ناشتا بھی کر لیں اور...... جو وقت گزر گیا اسے فراموش کرنے کی کوشش کریں۔''

''شٹ اپ......'' کنول نے نفرت کا اظہار کیا۔ وہ جانتی تھی کہ اگر وہ مائک پر کسی کی آواز سن رہی تھی تو دوسری جانب اس کی آواز بھی ضرور سنی جا رہی ہوگی۔

''آپ کی ناراضگی بجا ہے میڈم لیکن جو کچھ سانحا پیش آیا آپ اسے ہمارے لوگوں کی مجبوری سمجھ کر درگزر کرنے کی کوشش کریں۔''

''تم کس مجبوری کا رونا رونے کی کوشش کر رہی ہو......؟'' کنول نے بہ دستور نفرت سے سوال کیا۔

''آپ کی والدہ کی موت!'' تھوڑے توقف سے جواب ملا۔ ''انہوں نے ہمارے کسی آدمی کو شناخت کر لیا تھا۔ اسے چیلنج بھی کیا۔ یہی ان کی غلطی تھی، ایسی صورت میں ہم کوئی ایسا ثبوت نہیں چھوڑ سکتے تھے جو ہمارے لیے بعد میں دشواریاں پیدا کرے۔''

''تمہارا تعلق کس گروہ سے ہے؟'' کنول نے کچھ سوچ کر دریافت کیا۔

''آپ نہا دھو کر ناشتے سے فارغ ہو کر کچھ دیر آرام کر لیں پھر...... آپ کو آپ کے بہت سارے سوالات کا جواب بھی مل جائے گا۔''

''اگر میں تمہاری پیشکش ٹھکرا دوں تو......؟''

''ہم پھر بھی آپ کے کسی حکم کو ماننے سے انکار نہیں کر سکتے۔''

کنول نے سختی سے ہونٹ بھینچ لیے، جو صورت حال درپیش تھی وہ اسے سمجھنے سے قاصر تھی، اسے زبردستی اغوا کیا گیا تھا؟ کسی مجبوری کے تحت اس کی ماں کا سایہ اس کے سر سے اٹھا دیا گیا تھا؟ اس کی پوزیشن بہ ظاہر محکوم کی سی تھی پھر...... اس کو حاکموں کی طرح کیوں برتا جا رہا تھا؟ کچھ دیر تک وہ ذہن کی گتھیوں کو سلجھاتی رہی پھر اس نے گھوم کر کمرے کا جائزہ لیا جس میں ایک اٹیچ باتھ روم کے ساتھ مختصر ڈریسنگ اسپیس میں کپڑوں کی ایک الماری بھی تھی۔ اس نے یونہی الماری کو کھول کر دیکھا تو دنگ رہ گئی، اس میں جتنے لباس تھے سب اس کے پسندیدہ تھے۔

عام حالات میں شاید وہ اس صورت حال کو ضرور انجوائے کرتی لیکن ماں کی موت کے احساس نے اس کو الجھا رکھا تھا، وہ کمرے میں واپس آگئی، تادیر ٹہلتی رہی۔ حالات پر غور کرتی رہی پھر اس نے ذہن کو تازگی بخشنے کی خاطر غسل خانے میں جا کر کپڑوں کی قید سے خود کو آزاد کر کے فوارے کے نیچے کھڑا دیا، نیم گرم پانی نے اس کے الجھے ہوئے ذہن کو کچھ تازگی بخشی تو اسے زندگی کا احساس ہوا۔ ستر پوشی کی خاطر اس نے الماری سے ایک لباس نکال کر پہنا پھر کمرے میں آگئی، زندگی کو برقرار رکھنے کی خاطر اس نے مختلف فروٹ کے دو چار پیس حلق کے نیچے اتارے، شربت کے کچھ گھونٹ لیے پھر دوبارہ اٹھ کر ٹہلنے لگی، اسے جن حالات میں رکھا گیا تھا وہ حیران کن تھے۔ خاص طور پر ایسی صورت میں کہ جب کسی خدشے کے پیش نظر اس کی ماں کو راستے سے ہٹا دیا گیا تھا۔

آخر وہ کون لوگ تھے......؟ اگر انہیں اس کی ماں سے کوئی خطرہ لاحق ہو گیا تو کیا وہ ان میں کسی کو شناخت کر کے ان کے لیے دشواریاں نہیں پیدا کر سکتی تھی؟...... کیا وہ اپنی ماں کے قاتلوں کو فراموش کر سکتی تھی؟ اور...... اس کی ماں نے پہلی بار اس پر ایک عجیب تلخ حقیقت کا انکشاف کیا تھا...... وہ جو اس کا مجازی خدا تھا...... وہی اس کے باپ کا قاتل کیوں تھا؟...... لیکن، اگر ماں نے سچ کہا تھا تو اس کے رشتے کی مانگ کیوں بھری تھی......؟ کیا مقصد تھا اس کا؟...... وہ کیا ایسا کرنا چاہتی تھی؟ کیا اس کے ذہن میں انتقام کا کوئی طریقہ تھا۔ جس پر عمل کرنے سے پیشتر ہی وہ بھی موت کا شکار ہو گئی؟

کنول کے ذہن میں مختلف سوالات گڈمڈ ہو رہے

تھے۔ اس کا ذہن کسی آخری نتیجے کو اخذ کرنے کی کوششوں میں الجھ رہا تھا جب وہ دروازے کی سمت سے ابھرنے والی قدموں کی آواز سن کر چونکی۔ اس نے تیزی سے نظروں کا زاویہ بدل کر اس سمت دیکھا۔ نو وارد کی شخصیت بھی اس کے لیے کسی پراسرار معمے سے کم نہیں تھی۔

وہ ادھیڑ عمر کا تھا لیکن اس کی صحت قابل رشک تھی۔ اس کے جسم پر اس وقت نائٹ سوٹ نظر آ رہا تھا۔ چہرے پر بڑی مقطع چقطع ڈاڑھی تھی جس کے زیادہ تر بال سفید ہی تھے۔ پیشانی پر سیاہی مائل نشان بھی موجود تھا۔ اس کے ساتھ ہی کنول نے اعلیٰ قسم کی شراب کی خوشبو کمرے میں پھیلتی محسوس کی۔

دونوں ایک دوسرے کو تہ غور دیکھتے رہے پھر کنول نے خود کو سنبھال کر پوچھا۔

''کون ہو تم......؟''

''گھبراؤ مت...... تمہیں میرے ہی اشارے پر یہاں لایا گیا ہے۔'' ادھیڑ عمر والے نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ وہ لب و لہجہ کنول کے لیے مانوس نہیں تھا۔

''اوہ......'' کنول نے نفرت کا اظہار کیا۔ ''میری بے قصور ماں کو بھی شاید تمہارے ہی اشارے پر مارا گیا ہے؟''

''نہیں!...... وہ وقت اور حالات کے تقاضوں کا شکار ہو گئی۔''

''مجھے یہاں کیوں لایا گیا ہے......؟''

''اس لیے کہ تم مجھے پسند ہو......'' آنے والے نے نہایت سنجیدگی سے کہا۔ ''اور جو چیز مجھے پسند ہو اسے حاصل کر لینا میری فطرت ہے۔''

''تم کسی کمزور عورت کی مجبوری سے فائدہ اٹھانے کو اپنی مردانگی سمجھتے ہو؟''

''فضول بات مت کرو......'' وہ کنول کو سرتاپا دیکھ کر معنی خیز انداز میں بولا۔ ''میرا پہلو گرم کرتی رہو...... اس کے عوض تم بھی لوگوں پر اپنا حکم چلانے کے قابل ہو جاؤ گی۔''

''مم...... میں...... بازاری عورت نہیں ہوں۔'' کنول نے اسے حقارت سے مخاطب کیا۔ ''ہاں، ماں کی طرح تم مجھے بھی گولی مارنے کے بعد اپنے ناپاک مقصد میں ضرور کامیاب ہو سکتے ہو۔''

''ایسا نہیں ہوگا میری جان...... تم ہنستی مسکراتی میری بانہوں میں آؤ گی۔'' وہ قدم اٹھاتا کنول کے قریب آ گیا۔ ''میرا شمار ان شکاریوں میں مت کرو جو مچان پر بیٹھ کر شکار کھیلتے ہیں۔''

''تم شاید میری حقیقت سے پوری طرح واقف نہیں ہو؟'' کنول نے سنبھل کر کہا۔ ''میں جس کی امانت ہوں اگر وہ زندہ ہوتا تو تم شاید میرا تصور کرتے ہوئے بھی خوف سے لرز اٹھتے۔''

''اوہ...... سمجھا، تم شاید آکٹوپس کی بات کر رہی ہو لیکن......'' اس نے کنول کے کچھ اور قریب آکر سرسراتے لہجے میں کہا۔ ''تم یہ کیوں بھول رہی ہو کہ ایس پی اورنگ زیب نے اس کے بارے میں کیا کہا تھا؟...... اس نے کہا تھا کہ آکٹوپس سمندر کا ایسا خطرناک عذاب ہے جو آسانی سے ختم نہیں ہوتا۔''

کنول نے اپنے مقابل کھڑے ہوئے شخص کا آخری جملہ سنا تو اس کے اندر ایک سنسنی سی پھیل گئی۔ وہ جملہ اس نے بدلی ہوئی آواز میں کہا تھا۔ وہ آواز کنول کے لیے غیر مانوس بھی نہیں تھی۔ وہ صد فیصد شیخ حامد ہی کی آواز تھی۔

☆☆☆

ڈی آئی جی نے میڈم روبی سے منگنی کی اس تقریب کا خاصا اہتمام کیا تھا۔ ڈائننگ روم کو رنگا رنگ گلاب کے پھولوں سے سجایا گیا تھا، ڈائننگ ٹیبل کے درمیان میں بڑے اور نفیس گلدان میں بھی گلاب کے پھول اور کلیاں نظر آ رہی تھیں، اس دعوت میں اس نے سراج، الماس، اورنگ زیب کے علاوہ سراج کے حوالے سے از خود سیٹھ عثمان اور راحیلہ بیگم کو بھی مدعو کیا تھا۔

تقریب کا وقت آٹھ بجے تھا لیکن سیٹھ عثمان اور راحیلہ بیگم وہاں سب سے پہلے پہنچے تھے، مین گیٹ پر خود ڈی آئی جی نے ان کا استقبال کیا تھا پھر وہ گیٹ پر ہی تھے جب اورنگ زیب، سراج اور الماس بھی آ گئے۔ سیٹھ عثمان اور راحیلہ بیگم کو وہاں پہلے سے دیکھ کر الماس دوڑ کر راحیلہ بیگم سے گلے لگی تھی، سراج نے سیٹھ عثمان سے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''آپ اس وقت یہاں کسی ذاتی کام سے آئے ہیں؟''

''یس......'' ڈی آئی جی نے درمیان میں آکر جواب دیا۔ ''چھوٹے بھائی کی تقریب ہو اور بڑا بھائی اور بھابی موجود نہ ہوں؟ یہ بھلا کیسے ممکن ہو سکتا تھا۔''

''سر......'' سراج نے مسمسی صورت بنا کر کہا۔ ''یہ کاروباری لوگ ہیں۔ ہم پولیس والوں سے دوستی بڑھانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے......''

''اگر سراج بھائی یہ کہہ رہے ہیں تو میں اس کی تائید کروں گی۔'' راحیلہ بیگم نے شوخ انداز میں برجستہ سراج کی ٹانگ گھسیٹی تو سراج لاجواب ہوگیا۔

''ول سیڈ......'' ڈی آئی جی نے مسکرا کر راحیلہ بیگم کو دیکھا پھر سب اسی قسم کی چھیڑ چھاڑ کرتے لان میں آگئے جہاں بیٹھنے کا انتظام تھا۔ سراج کی شوخی...... راحیلہ بیگم کا محبت بھرا جواب اور الماس کا بات بات پر راحیلہ بیگم کی تائید کرنا۔ اس چھیڑ چھاڑ نے ماحول کو خاصا بے تکلف بنا دیا تھا۔

''مسٹر سراج......'' ڈی آئی جی نے بھی اس نوک جھوک سے لطف اندوز ہوتے ہوئے سراج سے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ اب آپ اپنی ہار تسلیم کرلیں، اسی میں بہتری ہے۔''

اورنگ زیب نے اس موقع پر ایک خاص پالیسی اختیار کرلی تھی، کبھی وہ راحیلہ بیگم کی بات کی تائید کرتا اور کبھی سراج کا ساتھ دینے کی خاطر اس کی حمایت میں ایک دو جملے کہنے سے بھی گریز نہ کرتا۔ گفتگو کا رنگ جاری تھا جب میڈم روبی کی گاڑی آگئی۔ ڈی آئی جی نے اس کا خیر مقدم بڑے والہانہ انداز میں کیا جسے سب ہی نے محسوس کیا، میڈم کے ساتھ تھریسا بھی تھی، وہ لان پر آئے تو سب ہی اٹھ کھڑے ہوئے، راحیلہ بیگم نے خاص طور پر میڈم روبی کو گلے لگا کر اپنے قریب ہی بٹھالیا۔ رسمی تعارف کے بعد محفل میں دوبارہ بے تکلفی کا رنگ گھلنے لگا، اس دوران باوردی بیرے نے ڈرنکس کی ٹرے لاکر سب کو سرو کیا پھر آدھے گھنٹے بعد سب ہنستے بولتے ڈرائنگ روم میں آگئے۔ روبی نے سفید شلوار قمیص پر سفید موتیوں کا سیٹ پہن رکھا تھا جس میں وہ سب سے منفرد نظر آرہی تھی۔ کھانے کی میز پر بھی ہنسی مذاق کا سلسلہ جاری رہا لیکن سراج گفتگو سے زیادہ مختلف ڈشوں سے انصاف کرنے میں بھی مگن تھا جب میڈم روبی نے اسے چھیڑنے کی خاطر کہا۔

''سراج صاحب...... سب لوگ ہنس بول رہے ہیں مگر آپ اس وقت بھی کھانے میں لگے ہیں۔''

''خدا کے لیے......'' سراج نے کن انکھیوں سے باری باری ڈی آئی جی اور الماس کی طرف دیکھتے ہوئے میڈم سے درخواست کی۔ ''اس وقت تو سراج بھائی کہہ کر مخاطب کریں ورنہ ملازمت کے ساتھ گھر کا سکون بھی خطرے کی زد میں آجائے گا۔'' جملہ اس معصومیت اور برجستگی سے کہا گیا کہ سب ہی بے اختیار ہنسنے لگے۔

کھانے کے بعد وہ ڈرائنگ روم میں آگئے، بے تکلفی سے چھیڑ چھاڑ کا سلسلہ جاری تھا جب راحیلہ نشست سے اٹھ کھڑی ہوگئیں۔ روبی نے جوان کے والے صوفے پر الماس کے ساتھ بیٹھی تھی حیرت سے

''یہ آپ کہاں جانے کے لیے پر تول رہی

''کسی کو گھر لانے کی خاطر تھوڑی بہت دھوپ تو کرنی ہی پڑتی ہے۔'' وہ جواب دے کر ہوئی روبی کے قریب گئیں تو روبی اور الماس دونوں کھڑی ہوگئیں، ڈی آئی جی وقتی طور پر اپنی نشست کسمسانے لگا۔ راحیلہ بیگم نے پرس کھول کر سبز مخملی کیس ہیرے کی ایک قیمتی انگوٹھی نکال کر روبی کو پہناتے ہوئے بڑی اپنائیت سے کہا۔

''تمہاری منگنی کی اس خوب صورت تقریب میں ایک بڑی بہن کی طرف سے......''

الماس کے ساتھ دوسروں نے بھی اٹھ کر تالیاں بجائیں، روبی کی آنکھیں نمناک ہونے لگیں۔ اس نے اختیار ہوکر راحیلہ بیگم کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔ موقع پر اورنگ زیب نے ڈی آئی جی کی طرف دیکھ کر بار پھبتی کسی۔

''سر...... پولیس والے تو موقعے کی تلاش میں ہیں۔ آپ تو پھر ڈی آئی جی ہیں۔ راحیلہ بہن نے داغ کردی ہے تو آپ بھی پیچھے کیوں رہیں؟''

اورنگ زیب کا جملہ سن کر روبی بھی مسکرا دی آئی جی بھی اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ اس نے بھی جیب سے کی انگوٹھی نکال لی...... روبی کے قریب جا کر بڑی انکسار سے مسکرا کر پوچھا۔

''اجازت ہے......؟''

روبی کے جواب دینے سے پہلے ہی راحیلہ بیگم اس کا ہاتھ تھام کر ڈی آئی جی کے سامنے کردیا، ڈی آئی جی نے بڑے ارمانوں سے منگنی کی انگوٹھی پہنائی تو ڈرائنگ سب کی تالیوں سے گونج اٹھا۔ ڈی آئی جی کے بعد الماس نے بھی ایک انگوٹھی روبی کو پہنائی تھی۔ کچھ دیر تک یہ ہنگامہ جاری رہا پھر سب لوگ اپنی اپنی نشستوں پر بیٹھ گئے تو روبی نے سنبھل کر اورنگ زیب کی سمت دیکھا۔ پھر بڑے واضح انداز میں بولی۔

اس پر اسرار اور تحیر آمیز سلسلے کے مزید واقعات آیندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں



کم نصیب

کاشف زبیر

مقدر کے بھید سمجھنا ہر کس و ناکس کی بات نہیں... جانے کب کس پر کس انداز سے مہربان ہو جائے اور کب کس کے پیروں تلے سے زمین کھینچ لے، وہ بھی اس برفانی موسم میں جیسے اچانک جھلستے سورج کے سامنے آگیا تھا مگر... سارا قصور اس کے گھمنڈ کا تھا۔ جس نے اسے نہ تین میں چھوڑا نہ تیرہ میں۔

گھر میں آئی لکشمی کو جلا کر خاکستر کردینے والے بیوقوف کا قصہ

ایلن ڈائل اور میرا ساتھ تقریباً تیس برسوں پر محیط تھا۔ ایلن ڈائل ایک معروف مصنف اور ناول نگار تھا۔ میرا نام مورس ڈین ہے اور میں ایلن کا پبلشر تھا۔ پچیس برس پہلے اس کا اولین ناول میں نے ہی شائع کیا تھا اور اس کے بعد آنے والے پچیس برس تک ہمارا تقریباً روز کا ساتھ تھا، کوئی دن ایسا نہیں جاتا تھا جب میری اس سے فون پر گفتگو نہ ہوئی ہو اور ہر مہینے ہماری ملاقات لازمی ہوتی تھی، میں جب انڈیانا جاتا تو ایلن کے ولا میں ٹھہرتا تھا۔

اسی طرح وہ جب کولمبس آتا تو میرے گھر رکتا تھا۔ اس لیے جب مجھے اس کی موت کی اطلاع ملی تو مجھے دلی افسوس ہوا تھا، اس لیے نہیں کہ اب مجھے اس کا کوئی ناول شائع کرنے کا موقع نہیں ملے گا بلکہ اس لیے کہ میرا اس سے کاروبار سے ہٹ کر ایک دلی تعلق بن گیا تھا۔

میرا پبلشنگ ہاؤس اوہائیو کے شہر کولمبس میں تھا اور ایلن ڈائل اس کی پڑوسی ریاست انڈیانا میں اپنے خوب صورت ولا میں رہتا تھا۔ ویسے اس کا تعلق نیویارک سے تھا۔ عمر کے تیس برس اس نے نیویارک میں گزارے تھے اور وہ ان تیس برسوں کو اپنا تاریک دور قرار دیتا تھا کیونکہ یہاں اسے سوائے ناکامیوں اور دکھوں کے کچھ نہیں ملا تھا۔ اس کی شادی ناکام رہی اور اس کا اکلوتا بھائی مارلن ڈائل اس سے جھگڑا کر کے اس سے ہمیشہ کے لیے لاتعلق ہو گیا تھا۔ میں مارلن سے کبھی ملا نہیں لیکن اس کے بارے میں سن کر میری رائے تھی کہ وہ ان لوگوں میں سے ہے جو اپنی ہر ناکامی کا ذمے دار دوسروں کو قرار دیتے ہیں۔

قدرت ہر شخص کو ایک مخصوص کام کے لیے پیدا کرتی ہے۔ اس میں شک نہیں ہے کہ بہت سارے لوگ بہت سارے کام کامیابی سے کر لیتے ہیں لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ بعض لوگ صرف وہی کام کامیابی سے کر پاتے ہیں جس کے لیے قدرت نے انہیں اس دنیا میں بھیجا ہوتا ہے۔ ایلن ڈائل بھی ایسے ہی لوگوں میں سے ایک تھا۔ قدرت نے اسے صرف لکھنے کے لیے پیدا کیا تھا لیکن اس نے کامرس کی تعلیم حاصل کی اور پچیس سال کی عمر تک ایک بینک میں وقت گزاری کرتا رہا۔ کیونکہ اسے احساس تھا کہ یہ کام اس کے بس سے باہر ہے، اس نے بینک کی نوکری چھوڑ دی اور ایک انویسٹمنٹ فرم میں کام کرنے لگا۔ یہاں بھی اس کا دل نہیں لگا اور اس نے دو سال بعد یہ نوکری بھی چھوڑ دی۔

ستائیس سال کی عمر میں اس نے پہلی بار کچھ لکھا۔ یہ ایک مختصر کہانی تھی جو اس نے ایک ماہانہ رسالے میں بھیج دی مگر کہانی مسترد ہو کر واپس آ گئی۔ بہر حال اس نے ہمت نہیں ہاری اور دوسری کہانی لکھی، پھر تیسری اور پھر چوتھی اور اس کے بعد یہ سلسلہ نامعلوم تعداد تک جاری رہا۔ اصل بات یہ تھی کہ اسے لکھنے میں لطف آنے لگا تھا اور مسلسل ناکامیوں کے باوجود اس کا جذبہ ماند نہیں پڑا تھا۔ ایک سال بعد اس کی اولین کہانی ایک رسالے نے شائع کی اور اس کا اسے کوئی معاوضہ نہیں ملا کیونکہ کہانی کسی قدر رد و بدل کے بعد شائع کی گئی تھی۔ اس کے بعد بھی اس کی چھوٹی موٹی کہانیاں ناقابل ذکر انداز میں شائع ہوتی رہی تھیں۔ ان دنوں اس کی شادی ناکامی کے دہانے پر کھڑی تھی۔ اتفاق سے اس کی کوئی اولاد نہیں ہوئی تھی ورنہ اس کی بیوی اتنی آسانی سے اسے چھوڑنے کا فیصلہ نہ کرتی اور کچھ صبر سے کام لیتی تو ایلن ڈائل کے ساتھ اچھے دن بھی دیکھ لیتی۔ اس وقت تو یہ حال تھا کہ گھر کا خرچ بھی وہی چلا رہی تھی کیونکہ ایلن کو سوائے کہانیاں لکھنے کے اور کوئی کام نہیں تھا، اس لیے اس کی بیوی اب مزید اس کے ساتھ رہنے کے لیے تیار نہیں تھی اور اس نے طلاق کے لیے عدالت سے رجوع کر لیا تھا۔

جب ایلن سے میری اولین ملاقات ہوئی تو اس کی اپنی بیوی سے علیحدگی ہو چکی تھی۔ اس کی خواہش تھی کہ میں اس کی مختصر کہانیوں کا مجموعہ شائع کروں۔ میں نے یہ غور ان کہانیوں کا مطالعہ کیا اور میں نے محسوس کیا کہ اگر میں نے انہیں مجموعے کی صورت میں شائع کیا تو مجھے کتاب پر کیا جانے والا خرچہ بھی مشکل سے واپس ملے گا اس لیے میں نے کتاب شائع نہ کرنے کا فیصلہ کر لیا لیکن ساتھ ہی ان کہانیوں کے مطالعے سے میں نے ایک بات محسوس کی تھی اور میں اس سلسلے میں ایلن ڈائل سے بات کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے میں نے اسے کولمبس آنے کی دعوت کے ساتھ ٹرین کا فرسٹ کلاس ٹکٹ بھی بھیجا تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ اس کی مالی حالت نہایت خراب تھی اس لیے صرف دعوت دینے سے کام نہیں چلتا۔ میرا اندازہ درست نکلا تھا۔ دو دن بعد وہ میرے گھر پر تھا۔ میں نے اسے میزبانی کی پیشکش بھی کی تھی۔

خلاف توقع ایلن ڈائل مختصر قامت کا اور چہرے سے ناخوش نظر آنے والا شخص ثابت ہوا۔ حالانکہ اس کی کہانیوں میں مزاح اچھا خاصا پایا جاتا تھا۔ شاید مسلسل ناکامیوں اور تکلیفوں نے اس کے تاثرات پر بھی قبضہ جما لیا تھا۔ اسے یہاں بلانے سے پہلے میں نے صاف بتا دیا تھا کہ میں اس کی کہانیوں کا مجموعہ شائع نہیں کر سکتا اور اسے ایک اور معاملے میں زحمت دے رہا ہوں۔ وہ میری بیوی سوزن اور دو بیٹوں ٹیری اور مارٹی سے مل کر خوش ہوا تھا۔ کھانے کے بعد ہم کافی پینے کے لیے لان میں آ گئے۔ یہاں سناٹا اور سکون تھا۔ ایلن نے تعریفی انداز میں کہا۔

''تمہارا گھر بھی خوب صورت ہے اور گھر والے بھی۔''

''ہاں، یہ سب سوزن کا کمال ہے، مجھے تو کام سے فرصت نہیں ملتی۔'' میں نے کہا۔

''کاش مجھے بھی سوزن جیسی کوئی عورت ملی ہوتی۔'' ایلن نے سرد آہ بھری۔ ''تو شاید میں اتنا ناکام نہ ہوتا۔''

''ناکامی کی وجہ اچھی بیوی کا نہ ملنا نہیں ہے۔'' میں نے اسے تسلی دی۔ ''بلکہ تمہارا غلط سمت میں کام کرنا ہے۔''

وہ چونکا۔ ''تمہارا مطلب ہے کہ میں نے لکھ کر غلطی کی ہے۔''

''نہیں، تم نے مختصر کہانیاں لکھ کر غلطی کی ہے۔ اصل میں تم ناول کے آدمی ہو۔''

وہ یوں ہنسا جیسے میں نے کوئی احمقانہ بات کر دی ہو۔ ''میری چھوٹی کہانیاں کوئی شائع نہیں کرتا، ناول کون شائع کرے گا؟''

''ناول شائع ہو گا اگر تم نے لکھ لیا۔ تم کہانی کو پھیلا کر لکھتے ہو اور جب اسے مختصر کرنے کی کوشش کرتے ہو تو کہانی خراب ہوتی ہے۔''

ایلن ڈائل سوچ میں پڑ گیا پھر اس نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ ''دراصل میں نے ناول لکھنے کی کئی بار کوشش کی لیکن ہر بار درمیان میں ترک کر دیا۔''

''اچھا!'' میں نے دلچسپی سے کہا۔ ''کیا تم ایسا کوئی ادھورا مسودہ رکھتے ہو؟''

''کم سے کم تین مسودے ایسے ہی پڑے ہیں۔''

''کیا تم ان کا آئیڈیا بتا سکتے ہو؟''

اس نے کافی اور اس کے بعد وہسکی پر تینوں آئیڈیاز بیان کیے۔ مجھے تینوں آئیڈیاز ہی اچھے لگے۔ میں نے کچھ مشورے دیے اور طے ہوا کہ وہ ایک مسودے پر کام کر کے، اسے مکمل کر کے مجھے بھیجے گا اور میں پڑھ کر فیصلہ کروں گا۔ وہ دو دن میرے پاس رہا اور میں اسے قائل کرنے میں لگا رہا کہ اسے ناول لکھنا چاہیے۔ ایلن کے خیال میں وہ زود نویس تھا اور زود نویس کبھی اچھے ناول نگار نہیں بن سکتے۔ اس کے برعکس میرے پاس ایسے ناول نگاروں کی ایک فہرست تھی جو زود نویس تھے۔ بہر حال وہ جاتے ہوئے بھی تذبذب میں تھا کہ وہ ناول نگار بن سکتا ہے یا نہیں؟ دو مہینے بعد اس نے مجھے پہلا مسودہ مکمل کر کے بھیجا اور اسے پڑھنے کے بعد مجھے اپنی رائے درست لگی تھی۔ ناول بہت اچھا تو نہیں تھا لیکن اسے ایک اچھا اور کامیاب ناول کہا جا سکتا تھا جس کی کہانی اور زبان و بیان میں کوئی جھول نہیں تھا۔

میں نے کسی قدر رد و بدل کے بعد اسے شائع کیا اور خلاف توقع ناول میری امیدوں سے بڑھ کر کامیاب رہا۔ ایلن ڈائل کو اس کا مالی فائدہ تو اتنا نہیں ہوا تھا لیکن اس ناول نے اسے قارئین کے حلقے میں روشناس کرا دیا تھا۔ اس لیے اس کا دوسرا ناول جو دوسرے ادھورے مسودے کی تکمیل تھا، زیادہ کامیاب رہا اور اس کے معاوضے نے ایلن ڈائل کو متوسط طبقے سے اٹھا کر اوپری طبقے میں پہنچا دیا تھا۔ وہ سچ مچ زود نویس ثابت ہوا تھا، ابھی اس کا دوسرا ناول بیسٹ سیلر کے ابتدائی دس ناولوں میں شامل تھا کہ اس نے تیسرا ناول بھی مکمل کر کے مجھے بھیج دیا۔ یہ مزید کامیاب رہا تھا اور اس کا پیپر بیک ایڈیشن نکال کر میں نے بھی خاصی دولت کمائی تھی۔ ایلن ڈائل تو ملینیر ہو گیا تھا۔ اس کے بعد ہی وہ انڈیانا منتقل ہو گیا۔ اس نے وہاں ولا خرید لیا اور ٹھاٹ سے رہنے لگا۔

ابتدائی کامیابی کے بعد ایلن نے اتنی تیز رفتاری سے ناول لکھنا شروع کیے کہ بعض اوقات انہیں تواتر سے شائع کرنا مسئلہ بن جاتا تھا۔ اس وجہ سے مجھے اضافی اسٹاف رکھنا پڑا اور اسی وجہ سے مجھے دوسرے ناول نگاروں کی تخلیقات کی طرف توجہ دینے کی اتنی فرصت نہیں ملتی تھی مگر میں ناخوش نہیں تھا کیونکہ ایلن ڈائل کامیاب تھا تو اس کی کامیابی میں مجھے بھی شیئر مل رہا تھا۔ اس کے باوجود سال میں چار یا پانچ ناول شائع کرنا آسان نہیں تھا۔ کیونکہ میں جلد بازی میں معیار پر سمجھوتا کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ ہر نئے ناول کے آئیڈیے پر ہم دونوں مل کر کام کرتے تھے اور جب آئیڈیا مکمل ہو جاتا تو ایلن اس پر کام شروع کر دیتا تھا۔ مسودے کی تکمیل کے بعد میں اپنی ٹیم کے ساتھ اس کا جائزہ لیتا اور پھر خامیوں اور کمزور حصوں کی نشان دہی کرتا۔ ایلن میں یہ اچھی بات تھی کہ وہ زیادہ بحث نہیں کرتا تھا اور اگر اپنی غلطی محسوس کرتا تو جلد اسے مان لیتا تھا اور اسے درست کر دیتا تھا۔ اس سے کام میں آسانی ہوتی تھی۔ آنے والے بیس سال ہم دونوں کے لیے نہایت مصروفیت کے گزرے تھے۔ اس دوران میں ایلن ڈائل نے کوئی چوراسی ناول لکھے اور میں نے شائع کیے۔ ان بیس سالوں میں ایلن نے تنہا زندگی گزاری تھی۔ اس نے اپنی زندگی سے عورت کا خانہ نکال دیا تھا۔ اس نے کئی بار مجھ سے کہا کہ اب وہ شادی کی غلطی نہیں کرے گا اور اپنی لائف اور دولت کو بغیر وائف کے انجوائے کرے گا۔

مگر روزیلا نے اس کے تمام خیالات اور عزائم غلط ثابت کر دیے۔ مجھے اچانک پتا چلا کہ ایلن نے شادی کر لی ہے۔ میں حیران تھا لیکن بہر حال ایلن نے کوئی انوکھا کام نہیں کیا تھا بلکہ اس نے اب تک شادی نہ کر کے انوکھا کام کیا۔ وہ کروڑ پتی بن چکا تھا اور ایسی آسامیوں پر خواتین یوں منڈلاتی ہیں جیسے شیرے پر مکھیاں اور ان کے پاس

ایسے حربوں کی بھی کوئی کمی نہیں ہوتی جن کے سامنے مرد حضرات بالآخر ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ یقیناً ایلن کے پیچھے بھی بے شمار خواتین راشن پانی لے کر لگی ہوں گی۔ ایلن نے شادی خاموشی سے کی مگر میڈیا کو اس کی بھنک پڑ گئی اور انہوں نے اس کے وِلا پر دھاوا بول دیا تھا، میں صبح ناشتے کے دوران ٹی وی دیکھ رہا تھا تب مجھے پتا چلا اور میں نے فوراً ایلن کا نمبر ملایا مگر وہ بند جا رہا تھا۔ وِلا کال کرنے پر اس کے بٹلر نے بتایا کہ ایلن اپنی بیوی کے ساتھ ہنی مون منانے بہاماز جا چکا ہے۔ وہ کہاں ہے اور واپسی کب ہوگی؟ اس کا کچھ پتا نہیں تھا۔

مجھے فوری طور پر اگلے ناول کے مسودے کی فکر لاحق ہو گئی جس کے بارے میں ہم متفق ہو چکے تھے اور میں نے اسے شائع کرنے کی تیاری بھی شروع کر دی تھی مگر ایلن غائب تھا اور اس کی واپسی پورے ایک مہینے بعد ہوئی تھی، جیسے ہی مجھے اس کی آمد کی اطلاع ملی، میں فوری طور پر انڈیانا روانہ ہو گیا۔ پچاس سال کی عمر میں طویل ہنی مون آدمی کا کیا حال کر دیتا ہے اس کا صحیح معنوں میں اندازہ مجھے ایلن کی حالت دیکھ کر ہوا۔ وہ مزید کمزور اور زرد ہو گیا تھا۔ بہرحال اچھی بات یہ تھی کہ اس نے ناول مکمل کر لیا تھا اور سفر کے دوران اسے جہاں موقع ملتا، وہ اس پر کام کرتا رہا تھا۔ میں مسودہ لے کر واپس آیا تو مجھے خدشہ تھا کہ ہنی مون ایلن کی طرح اس کی تحریر کی صحت پر بھی اثر انداز نہ ہوا ہو لیکن ناول ہمیشہ کی طرح شاندار اور جاندار تھا۔

شادی کے بعد اس پہلی ملاقات میں، میں نے محسوس کیا کہ ایلن اتنا خوش نہیں ہے جتنا کہ اسے ہونا چاہیے۔ دوسری ملاقات اس سے نیویارک میں ہوئی جہاں وہ ناول کی فروخت کے افتتاح کی تقریب میں آیا۔ میں نے وِلا میں روزیلا کو دیکھا تھا۔ وہ نہایت حسین اور دلکش عورت تھی لیکن اس کے حسن میں نرمی کے بجائے سختی تھی جیسے ہیرا خوب صورت ہوتا ہے لیکن ساتھ ہی دنیا کی سخت ترین چیز بھی ہے۔ روزیلا کا حسن بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ اگر وہ شوبزنس میں ہوتی تو نہایت کامیاب ویمپ بن سکتی تھی، اس کے چہرے کے تاثرات کچھ ایسے ہی تھے۔ دوسری ملاقات میں ایلن کو موقع ملا کہ وہ مجھ سے حال احوال کہہ سکے کیونکہ روزیلا یہاں نہیں تھی۔ اس نے اعتراف کیا کہ روزیلا نے اس کے حواس پر قبضہ کر لیا تھا۔ اس نے نہ صرف اس سے شادی کر لی بلکہ اسے اپنی نصف دولت، جائداد اور آمدنی کا حصے دار بنا لیا تھا، اب وہ مستقبل میں جو کماتا اس کا نصف حصہ روزیلا کو بنا کسی محنت کے حاصل ہو جاتا۔ ساتھ ہی اس نے اسے اپنا واحد وارث بھی مقرر کر دیا تھا۔

مجھے اس سے غرض نہیں تھی کہ روزیلا نے ایلن کے ساتھ کیا کیا تھا، مجھے یہ فکر تھی کہ وہ اب بھی اسی رفتار سے ناول لکھ سکے گا یا نہیں؟ اگر وہ ناول کم لکھے گا تو ظاہر ہے کم شائع کروں گا اور بزنس کے لیے یہ کوئی اچھی بات نہیں تھی۔ میرا اندیشہ درست ثابت ہوا جب اگلے چار مہینے پہلے مجھے اگلا ناول نہیں ملا تھا۔ یک لخت ایلن کے لکھنے کی رفتار میں سستی آ گئی تھی۔ ظاہر ہے روزیلا نامی چڑیل اس کی جان چھوڑتی تو وہ کوئی کام کرتا، وہ صرف اس کی دولت پر ہی نہیں قابض ہوئی تھی بلکہ اس کا خون بھی چوس رہی تھی۔ میں یہ مسودہ لینے اس کے محل نما گھر پہنچا تو وہ مجھے مزید کمزور اور بیمار سا نظر آیا تھا۔ خوش قسمتی سے اس بار بھی روزیلا وہاں نہیں تھی، وہ شاپنگ کے لیے پیرس گئی ہوئی تھی۔ میں نے مشورہ دیا۔

''ایلن تم کچھ کرو ورنہ زیادہ سے زیادہ ایک سال میں تم اس دنیا سے گزر جاؤ گے۔''

اس نے ٹھنڈی سانس لی اور نفی میں سر ہلایا۔ ''میرے دوست، اب یہ ممکن نہیں ہے۔ میں کچھ نہیں کر سکتا۔ میں نے اپنا سب کچھ اس کے نام کر کے اپنے ہاتھ پاؤں کٹوا لیے ہیں۔''

''تم وصیت تبدیل کر سکتے ہو۔''

''وہ قابل تبدیل نہیں ہے۔'' ایلن دکھ سے بولا۔ ناولوں میں چالاکی اور ذہانت دکھانے والا ایلن اتنا سادہ لوح نکلے گا، یہ میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔ لیکن یہ اس کا مسئلہ نہیں تھا، اکثر لکھنے والے اپنی ساری ذہانت لکھنے میں صرف کر دیتے ہیں اور عام زندگی کے لیے ان کے پاس زیادہ عقل باقی نہیں رہتی۔ کچھ ایسا ہی ایلن کے ساتھ بھی تھا۔ روزیلا صرف حسین ہی نہیں نہایت شاطر ذہانت رکھنے والی عورت بھی تھی۔ اس نے کسی مکڑی کی طرح ایلن کو اپنے حسن کے جال میں جکڑا تھا لیکن اسے معلوم تھا کہ یہ جال عارضی ہے اور شادی کے بعد ایلن کی آنکھیں کچھ نہ کچھ کھل جائیں گی اس لیے اس نے پہلے ہی نہ صرف ایلن سے اپنا حصہ دولت، جائداد اور آمدنی کے بارے میں شرائط طے کیں بلکہ چالاکی سے کام لیتے ہوئے ناقابل تنسیخ وصیت بھی اپنے نام کرا لی۔ ایلن نے مجھ سے کہا۔

''مجھے اب مارلن کا خیال آ رہا ہے۔ وہ ہمیشہ کا بدنصیب رہا ہے اور اب میں نے بھی اس کے ساتھ زیادتی کی ہے۔''

ایلن نے مجھے مارلن کے بارے میں سب بتایا تھا۔ وہ دو ہی بھائی تھے۔ مارلن، ایلن سے دس سال چھوٹا تھا۔ عمروں کا یہ فرق ان کے درمیان بھائیوں والی بے تکلفی میں حائل رہا اور وہ شروع سے دریا کے دو کناروں کی طرح رہے جو ساتھ ساتھ مگر دور دور رہتے ہیں۔ ان کا باپ گلین ڈائل ایک معمولی درجے کا پراپرٹی ایجنٹ تھا۔ وہ ساری عمر دوسروں کے ساتھ کام کرتا رہا۔ وہ اپنی محنت سے بڑے سودے تلاش کرتا تھا لیکن اس کا اصل فائدہ دوسرے اٹھاتے تھے اور اس کے ہاتھ کچھ نہیں آتا تھا۔ تنگدستی کے باوجود اس نے ایلن اور مارلن کی پرورش اچھے انداز میں کی اور ان کی جائز ضروریات ممکن حد تک پوری کرنے کی کوشش کی تھی۔ ان کی ماں ایک سادہ مزاج گھریلو عورت تھی، اس نے دو تین بار ملازمت کر کے شوہر کا ہاتھ بٹانے کی کوشش کی لیکن باہر کی دنیا اس کے لیے نہیں تھی اس لیے وہ ہر بار سہم کر واپس گھر کی پناہ گاہ میں آ گئی۔

جن دنوں ایلن ہائی اسکول کے بعد کالج میں آیا تو اس کی ماں نمونیا کا شکار ہو گئی۔ مارلن اس وقت صرف آٹھ سال کا تھا۔ یہ اس کی پہلی بدقسمتی تھی، جب اسے ماں کی اشد ضرورت تھی تب وہ ماں سے محروم ہو گیا۔ باپ اور بھائی دونوں صبح کے جاتے تو شام اور بعض اوقات رات کو گھر آتے تھے۔ ایلن اپنا خرچ اٹھانے کے لیے شام کے وقت ایک بار میں کام کرتا تھا۔ اس دوران میں مارلن اکیلا ہوتا۔ اس کی توجہ تعلیم سے ہٹ گئی اور وہ غلط لڑکوں کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے لگا۔ باپ اور بھائی دونوں کو اس کی آوارگی کی اطلاع نہیں تھی۔ پندرہ سال کی عمر تک وہ نہ صرف سگریٹ پینے لگا تھا بلکہ شراب اور چرس کا بھی عادی ہو چکا تھا۔ ایلن تعلیم مکمل کر کے اپنی پہلی ملازمت کر رہا تھا۔ اسی دوران وہ شادی کر کے الگ رہنے لگا۔ اسے مارلن سے محبت تو تھی لیکن اس کے پاس اتنا وقت نہیں ہوتا تھا کہ وہ مارلن کے بارے میں جاننے کی کوشش کرے کہ مارلن درحقیقت کیا کر رہا ہے؟ گلین بیوی کے مرنے کے بعد زیادہ پینے لگا تھا اور اس کا بیشتر وقت اور آمدنی شراب کی نذر ہونے لگی تھی۔ بس وہ کسی نہ کسی طرح اپنا گزارہ کر رہا تھا، اسے بھی مارلن کی پروا نہیں تھی۔

مارلن کی دوسری بدقسمتی اس وقت سامنے آئی جب وہ کسی وجہ سے سدھر کر تعلیم پر توجہ دینے لگا اور اس نے ہائی اسکول اچھے نمبروں سے پاس کر لیا تھا۔ اب اسے کسی کالج میں داخلہ مل جاتا تو وہ اپنی زندگی بنا سکتا تھا مگر ان ہی دنوں گلین فوت ہو گیا۔ وہ شراب پی کر گاڑی چلا رہا تھا کہ اس نے سامنے سے آنے والے ٹرک سے کار ٹکرا دی اور موقع پر ہی ہلاک ہو گیا۔ ایلن خود تنگ دستی میں گزارہ کر رہا تھا۔ مارلن کی مدد کرنے والا کوئی باقی نہیں رہا تھا۔ اب وہ آگے تعلیم حاصل کرتا یا پھر غم روزگار میں پڑتا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ وہ نہ تعلیم حاصل کر سکا اور نہ کوئی ڈھنگ کا روزگار اپنا سکا۔ وہ واپس انہی راہوں میں لوٹ گیا۔ جب تک ایلن کو پتا چلا بہت دیر ہو چکی تھی۔

اس نے مارلن کو راہ راست پر لانے کی کوشش کی لیکن اب مارلن اس کے لیے تیار نہیں تھا۔ وہ ایلن سے نفرت کرنے لگا تھا کیونکہ جب اسے سہارے کی ضرورت تھی تو ایلن نے اسے نظر انداز کر دیا تھا اور اب وہ اس کے لیے پریشان تھا۔ اس کا ایلن سے جھگڑا ہوا اور وہ نیویارک چھوڑ کر شکاگو چلا گیا جہاں اس کے کچھ دوست منشیات کا دھندا کر رہے تھے۔ وہ ان کے ساتھ شامل ہو کر منشیات کا کام کرنے لگا اور اس کے بعد اس نے ایلن سے رابطہ نہیں کیا۔ میں نے ایلن سے پوچھا۔ ''تم نے بھی اس سے رابطہ نہیں کیا؟''

ایلن نے سر ہلایا۔ ''رابطہ تو نہیں کہہ سکتے لیکن میں اس سے بے خبر نہیں ہوں۔ درحقیقت وہ جرائم کی دنیا میں بھی ناکام رہا ہے اس کے دوست دولت میں کھیل رہے ہیں اور وہ غربت میں زندگی بسر کر رہا ہے۔ میں اسے ہر مہینے ہزار ڈالرز بھیجتا ہوں، نامعلوم ٹرسٹ کی طرف سے۔ میں اس سے زیادہ دوں گا تو مجھے خوف ہے کہ وہ منشیات اور شراب استعمال کر کے قبل از وقت ہی موت کو گلے لگا لے گا۔''

''یعنی وہ تمہارے بارے میں نہیں جانتا کہ اس کا بھائی ایلن ڈائل اب امریکا کا جانا پہچانا ناول نگار بن چکا ہے؟''

''ہو سکتا ہے وہ جانتا ہو۔''

''تب اس نے تم سے رابطہ کیوں نہیں کیا؟''

''وہ بہت ضدی بھی ہے، وہ کبھی خود مجھ سے رابطہ نہیں کرے گا۔'' ایلن نے گہری سانس لے کر کہا۔ ''اسی خوف سے میں نے بھی اس سے رابطہ نہیں کیا کہ کہیں وہ مجھے دھتکار نہ دے۔''

اس وقت ایلن پچاس سال کا تھا تو مارلن چالیس کا ہو گا، اس کا مطلب تھا کہ وہ تقریباً جوان ہی تھا۔ یہ عبرت ناک تضاد تھا کہ ایک بھائی نے مسلسل محنت کر کے اپنا مقام بنا لیا تھا اور دوسرا بھائی کچھ نہیں کر سکا تھا۔ وہ عام شخص جیسی کامیابی بھی حاصل نہیں کر سکا تھا۔ دیکھا جائے تو ایلن کو بھی

سوائے دولت اور شہرت کے کچھ نہیں ملا۔ پہلی بیوی اچھی عورت تھی لیکن وہ غربت سے تنگ آکر اسے چھوڑ گئی اور دوسری بار اسے بیوی کے نام پر ایک چڑیل مل گئی جو اب اس کا خون پی رہی تھی اور ایلن اس کی عیاشی کے لیے کام کررہا تھا۔ مگر وہ پھر بھی اپنے بھائی سے بہت بہتر رہا تھا کہ اس نے جس شعبے میں چاہا کامیابی حاصل کرلی تھی۔ بہرحال یہ ایلن کا ذاتی مسئلہ تھا، میرا مسئلہ یہ تھا کہ وہ وہ ناول نگاری کا سلسلہ پہلے کی طرح جاری رکھے اور اس میں کمی نہ آنے دے۔ مگر شادی کے بعد دوسرے ناول نے بتادیا تھا کہ اب وہ پہلے کی طرح کام نہیں کرسکے گا۔

اس سے اگلا ناول کوئی پانچ مہینے بعد ملا تھا پھر آنے والے پانچ سالوں میں، میں نے ایلن کے صرف نو ناول شائع کیے جو اس کی سابقہ رفتار کو دیکھتے ہوئے کچھ بھی نہیں تھے۔ یہ نو ناول بھی کامیاب رہے تھے۔ مجھے اور ایلن کو ان سے خاصا فائدہ ہوا تھا لیکن بیس ناولوں کا فائدہ یقیناً نو ناولوں سے زیادہ ہوتا۔ اگر ایلن پہلے جیسی رفتار سے لکھ رہا ہوتا تو ان پانچ سالوں میں بیس سے پچیس ناول آرام سے لکھ سکتا تھا۔ میں اس دوران میں جتنی بار اس سے ملا وہ مجھے پہلے سے کمزور اور زیادہ بیمار لگا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ اسے کیا تکلیف تھی لیکن وہ بیمار ضرور تھا۔ اس کی اچانک موت کا سن کر مجھے دھچکا لگا تھا اور میں نے فوری طور پر انڈیانا جانے کی تیاری شروع کردی۔ اس سے پہلے میں نے ولا کال کرکے ایلن کے بٹلر کم سے اس کی آخری رسومات کی ادائیگی کے بارے میں پوچھا۔ اس نے بتایا۔

”مسٹر ڈائل کی آخری رسومات منگل کے دن صبح نو بجے ادا کی جائیں گی، آپ چاہیں تو پیر کی شام کو یہاں تشریف لاسکتے ہیں۔“

دوسرے لفظوں میں بٹلر نے مجھے بتادیا تھا کہ اس سے پہلے یہاں آنے کی زحمت نہ کروں۔ لیکن میں روزیلا سے ملنا چاہتا تھا حالانکہ میں اس عورت کو سخت ناپسند کرتا تھا جس نے بالآخر ایک اچھے انسان اور بہترین ناول نگار کو قبر میں پہنچادیا تھا۔ مگر اس سے ملنا ضروری بھی تھا۔ ایلن کی تمام دولت و جائداد کی وارث وہی تھی اور اس میں اس کے لکھے ناول بھی تھے جن کے ایڈیشن شائع ہوتے رہتے تھے اور ظاہر ہے ان کی آمدنی روزیلا کے حصے میں آتی۔ یعنی اب اس سے میرا کاروباری تعلق بنتا تھا۔ جس طرح میں اسے ناپسند کرتا تھا اسی طرح وہ بھی مجھے ناپسند کرتی تھی لیکن مجھے امید تھی کہ آنے والے کاروباری تعلق کو مدنظر رکھتے ہوئے وہ مجھ سے ملنے سے انکار نہیں کرے گی۔ میرے پاس [illegible] کا ذاتی نمبر تھا لیکن آج تک مجھے اس پر کال کرنے کا [illegible] نہیں ہوا تھا۔ آج سے پہلے اس کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ میں نے اس کا نمبر ملایا۔

”مسز ڈائل، میں مورس بات کررہا ہوں۔“

”اب میں روزیلا ہوں۔“ اس نے سرد لہجے میں [illegible]

میں نے بحث سے گریز کیا۔ ”اوکے مس روزیلا [illegible] میں تم سے پیر سے پہلے ملنا چاہتا ہوں۔ تم جانتی ہو [illegible] والے دنوں میں ہمارا ملنا جلنا رہے گا۔“

”ہاں، میں جانتی ہوں۔“ اس کے لہجے کی سرد[illegible] میں ذرا کمی آئی تھی۔ ”ایسا کرو تم اتوار کو آجاؤ۔“

میں اتوار کی صبح انڈیانا پولس کے ائرپورٹ پر [illegible] تھا، یہاں سے ایک ٹیکسی نے مجھے ایلن کے ولا پہنچا[illegible] اب روزیلا کی ملکیت تھا۔ اس سے پہلے میں جب یہاں آتا تو ایلن خود یا کم مجھے لینے ائرپورٹ آتے تھے۔ [illegible] نے اطلاع دی کہ روزیلا بیوٹی پارلر گئی تھی اور اس کی واپسی لنچ کے بعد ہوتی۔ بٹلر کم آئن کا تعلق چین سے تھا لیکن [illegible] اس حد تک کہ اس کا پردادا چین سے امریکا آیا تھا۔ کم [illegible] نام اور نقوش کے لحاظ سے چینی تھا ورنہ باقی ہر لحاظ سے امریکی ہی تھا۔ روزیلا کی عدم موجودگی میں مجھے موقع ملا [illegible] میں اس سے کچھ سوالات کرسکوں۔ میں نے پہلا سوال [illegible] کی موت کے بارے میں کیا۔ میں نے ذرا چالاکی سے [illegible] لیا اور یوں ظاہر کیا جیسے مجھے ایلن کی بیماری کا علم تھا۔ [illegible] ایلن کی موت کا سن کر شاک لگا، کیا اس کی حالت اتنی خراب ہوگئی تھی؟“

”آپ جانتے ہوں گے جناب، کینسر کا آخری [illegible] تھا۔“ کم نے بتایا۔ ”چھ مہینے پہلے ہی ڈاکٹرز نے [illegible] جواب دے دیا تھا۔“

”ہاں، یہ تو میرے علم میں ہے کہ اسے کینسر [illegible] تھا۔“ میں نے اپنی حیرت چھپاتے ہوئے کہا۔ ”مگر [illegible] نہیں تھا کہ وہ لاعلاج مرحلے میں داخل ہوگیا ہے۔“

”مسٹر ڈائل خود سے بے پروا تھے۔“ کم نے [illegible] لہجے میں کہا۔ اسے اپنے مالک کی موت کا دکھ تھا۔ [illegible] نے بہت تاخیر سے ڈاکٹرز کو دکھایا۔ وہ بس دن رات [illegible] میں لگے رہتے تھے۔“

”کام میں؟“ مجھے پھر حیرت ہوئی۔ ”لیکن [illegible] دنوں تو وہ بہت کم کام کررہا تھا۔“

”نہیں جناب۔“ کم نے نفی میں سر ہلایا۔ ”[illegible] دن بارہ سے چودہ گھنٹے کام کررہے تھے اور بعض اوقات تو کھانا بھی اسٹڈی میں کھاتے تھے۔“

میرے لیے یہ حیران کن اطلاع تھی کہ ایلن ان دنوں معمول سے زیادہ کام کررہا تھا لیکن وہ کیا کررہا تھا؟ کیونکہ اس کا آخری مسودہ مجھے تین مہینے پہلے ملا تھا اور اس کے بعد مجھے کوئی چیز نہیں ملی تھی۔ میرا دل چاہا کہ ایلن کی اسٹڈی دیکھنے کی خواہش کا اظہار کروں لیکن پھر میں رک گیا۔ اگر کم انکار کردیتا تو بلاوجہ کی خفت اٹھانی پڑتی۔ یہ کام روزیلا کی موجودگی میں بھی کیا جاسکتا تھا۔ بلکہ یہی زیادہ بہتر تھا اس عورت کا کوئی بھروسا نہیں تھا کہ مجھ پر شک کرتی یا کوئی الزام لگا دیتی۔ میں نے پوچھا۔ ”ایلن ان دنوں زیادہ کام کررہا تھا؟“

”نہیں جناب، یہ معمول تو شادی کے چند مہینے بعد سے جاری تھا۔“

کم کی بات نے میری حیرت کو مزید بڑھا دیا تھا۔ یعنی ایلن گزشتہ ساڑھے چار سال سے بہت زیادہ لکھ رہا تھا۔ سوال یہ تھا کہ وہ بہت زیادہ لکھ رہا تھا تو اس کا کام مجھے کیوں نہیں ملا حالانکہ میں اس کا واحد پبلشر تھا۔ میرے علاوہ کسی اور پبلشر نے آج تک اس کا لکھا ایک ناول بھی شائع نہیں کیا تھا۔ حالانکہ میرا اس سے کوئی معاہدہ نہیں تھا۔ وہ چاہتا تو کسی اور پبلشر کو بھی اپنا ناول دے سکتا تھا لیکن اس نے ہمیشہ مجھے ترجیح دی۔ اس بار میں بے چین ہوگیا اور میں نے ہمت کرکے کم سے کہا۔ ”کیا میں ایلن کی اسٹڈی دیکھ سکتا ہوں؟“

”نہیں جناب!“ اس نے معذرت آمیز لہجے میں کہا۔ ”وہ لاک ہے اور اس کی چابی اب مادام کے پاس ہے۔“

گویا روزیلا نے چالاکی سے کام لیا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ ایلن کے وہ مسودے جو اس نے مجھے نہیں بھیجے تھے، یہاں موجود تھے۔ میں نے حساب لگایا تو ایلن کے لکھے کم سے کم بیس ناول موجود ہونے چاہیے تھے۔ پھر مجھے خیال آیا کہ وہ اس طرح سے کام کیوں کررہا تھا؟ اس نے اپنی صحت برباد کرلی تھی اور خود کو کینسر جیسا روگ لگا لیا تھا، کیا اس لیے کہ اس کے مرنے کے بعد بھی روزیلا کو معقول آمدنی ہوتی رہے اور اس کی آسائشوں میں کوئی کمی نہ آئے؟ مگر وہ روزیلا سے نفرت کرنے لگا تھا جس نے اسے اپنے حسن کے جال میں جکڑ کر بے وقوف بنایا تھا اور اب اس کی دولت پر عیش کررہی تھی۔ خاصا پیچیدہ سا معما تھا۔ میں نے کم سے کئی سوالات مزید کیے اور اس نتیجے پر پہنچا کہ ایلن نے جو لکھا وہ ضائع نہیں کیا تھا کیونکہ اس کے برقی ڈسٹ بن کی صفائی بھی کم کے ذمے تھی اور اس کا کہنا تھا کہ اس کی صفائی کی نوبت مہینے بعد جاکر کہیں آتی تھی۔

ایلن الیکٹرانک ٹائپ رائٹر پر لکھتا تھا اور اس نے کبھی کمپیوٹر استعمال کرنے کی کوشش نہیں کی۔ ویسے وہ کمپیوٹر استعمال کرتا تھا لیکن لکھتا وہ ٹائپ رائٹر پر ہی تھا۔ اس کا یہ ٹائپ رائٹر گزشتہ بیس سال سے اس کے پاس تھا اور اب وہ کمپنی بھی بند ہوگئی تھی جو ٹائپ رائٹر بناتی تھی۔ کیونکہ کمپیوٹر کے رواج کے بعد دنیا سے ٹائپ رائٹر کا استعمال تقریباً ختم ہوتا جارہا تھا اس لیے ایلن نے احتیاطاً اسی قسم کے کوئی نصف درجن ٹائپ رائٹر خرید کر رکھے ہوئے تھے تاکہ کسی میں خرابی ہو تو اسے لکھنے میں مسئلہ نہ پیش آئے۔ وہ اپنے لکھنے کے حوالے سے بہت محتاط اور ہر چیز کا خیال رکھنے والا شخص تھا۔

میں واپس نشست گاہ میں آگیا اور کم میری خاطر تواضع میں لگ گیا۔ روزیلا دو بجے آئی، وہ ہمیشہ کی طرح تر و تازہ، حسین اور ہیرے کی طرح سخت لگ رہی تھی۔ اس نے مسکرانے کی کوشش نہیں کی۔ رسمی تعزیت کے بعد میں مطلب کی بات پر آگیا۔ ”مجھے تم سے ناولوں کے بارے میں بات کرنی ہے جن کے حقوق اشاعت میرے پاس ہیں۔“

”اچھا!“ اس نے حیرت سے کہا۔ ”میرا تو خیال ہے یہ حقوق میرے پاس ہیں؟“

”نہیں، میرا اور ایلن کا ہمیشہ یہی معاہدہ ہوتا تھا کہ ناول کے دائمی اشاعتی حقوق میرے پاس ہوں گے اور وہ ہر ایڈیشن پر رائلٹی حاصل کرے گا۔“

اب تک روزیلا کا رویہ خاصا سرد تھا لیکن میرے انکشاف کے بعد اس کے انداز میں واضح تبدیلی آئی تھی۔ وہ اچانک ہیرے سے ریشم جیسی نرم عورت بن گئی۔ اس کے تاثرات بدل گئے اور وہ مسکرانے لگی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اس نے کوئی سوئچ دبایا تھا اور سرتاپا بدل گئی تھی۔ میں اس کی اس تبدیلی پر دنگ رہ گیا تھا۔ اب میری سمجھ میں آیا کہ اس نے ایلن کو کس طرح قابو کیا تھا۔ جو عورت اپنے اوپر اس حد تک قادر ہو اس کے لیے کسی بھی مرد کو قابو کرنا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ اس نے شیریں لہجے میں کہا۔ ”یہ تو مجھے معلوم ہی نہیں تھا۔“

”اب تمہیں معلوم ہوگیا ہے، کیونکہ تم ہی ایلن کی وارث ہو اس لیے رائلٹی تمہیں ملے گی۔“

”یہ رائلٹی کتنی ہوگی؟“ اس کا لہجہ مزید شیریں ہوگیا۔

"اندازاً تین سے چار لاکھ ڈالرز سالانہ۔"

وہ بجھ گئی۔ "بس تین چار لاکھ ڈالرز سالانہ۔"

"ہاں، کیونکہ یہ پرانے ناول ہیں۔ ان کی مانگ اتنی نہیں ہوتی کہ ایک حد سے زیادہ قیمت رکھی جاسکے۔ اسی وجہ سے رائلٹی بھی کم ہوتی ہے اور ان کی فروخت بھی کوئی بہت زیادہ نہیں ہوتی ہے۔"

وہ بے چین ہوگئی۔ "لیکن یہ تو بہت کم ہے، اس میں تو میرا گزارا نہیں ہوگا۔"

گزشتہ پچیس برس میں ایلن ڈائل نے اپنے ناولوں سے کم سے کم پانچ سو ملین ڈالرز کمائے تھے اور یہ معمولی رقم نہیں ہوتی۔ اسے اس دولت کا کم سے کم نصف بچانا چاہیے تھا یعنی روزیلا کے پاس ڈھائی سو ملین ڈالرز کی دولت موجود تھی اور وہ فکرمند ہورہی تھی کہ تین چار لاکھ ڈالرز سالانہ میں اس کا گزارا نہیں ہوگا۔ روزیلا کے تاثرات اور اس کی بات سے مجھے احساس ہوا کہ وہ کسی مشکل صورت حال سے دوچار ہے۔ "روزیلا، اگر تم چاہو تو مجھ پر اعتماد کرسکتی ہو، تم جانتی ہو ایلن سے صرف میرا کاروباری تعلق نہیں تھا بلکہ ہم اچھے دوست بھی تھے۔ اگر تمہیں ضرورت ہو تو میں تمہاری ہر مدد کے لیے تیار ہوں۔"

وہ ہچکچائی پھر اس نے کہا۔ "میں درحقیقت بڑی مشکل میں ہوں...... یوں سمجھ لو کہ ایلن کے مرنے سے میں شدید مالی بحران میں آگئی ہوں۔"

"وہ کیسے۔۔۔ میرا خیال ہے کہ ایلن نے جو کمایا ہے اس کا نصف حصہ تو بچایا ہوگا اور یہ نصف بھی ڈھائی سو ملین ڈالرز سے کم نہیں ہوگا۔"

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔" روزیلا ندامت سے بولی۔ "اگر میں حد سے زیادہ فضول خرچ نہ ہوتی تو آج میرے پاس اتنی ہی دولت ہوتی مگر اب میرے پاس اس ولا اور شاید ایک ملین ڈالرز کے بینک اکاؤنٹ کے سوا کچھ باقی نہیں رہا ہے۔"

میرا سر گھوم گیا تھا۔ روزیلا نے کتنی بے دردی سے ایلن کی دولت اڑائی تھی کہ صرف پانچ سال میں اس نے ڈھائی سو ملین ڈالرز اڑا دیے تھے۔ اگر اس کے پاس سچ مچ صرف ایک ملین ڈالرز تھے تو اس کا مطلب تھا وہ دیوالیا ہونے کے قریب تھی۔ ایلن کا یہ ولا جو تقریباً دس ہیکٹر رقبے پر پھیلا ہوا تھا اس کی دومنزلہ عمارت میں تیس سے زیادہ کمرے تھے۔ یہاں ایک مکمل ٹینس کورٹ، دو عدد سوئمنگ پول، انڈور کھیلوں کی جگہ، منی گولف کورس اور وسیع وعریض گیراج شامل تھا جس میں بیک وقت نصف درجن کھڑی کی جاسکتی تھیں۔ اس کی مالیت کسی طرح بھی ڈالرز سے کم نہیں تھی اور اس ولا کا سالانہ خرچ ہی ایک ڈالرز سے زیادہ تھا۔ اب روزیلا کے پاس اسے فرو دینے کے سوا اور کوئی راستہ نہیں تھا۔ یہی سوچ کر نکلی جارہی تھی۔ کیونکہ وہ اس اسٹیٹس کی عادی ہوگئی اس سٹیج سے نیچے آنا اس کے لیے محال تھا۔ اس سے آ اس کے لیے موت ہوتی۔ اس جیسی عورت کے لیے حیثیت سے کم تر ہو کر جینا ممکن نہیں تھا۔

میں نے سوچ کر کہا۔ "مس روزیلا، تمہاری واقعی خراب ہے اور اگر تمہیں کہیں سے فوری آمدنی نہ اس ولا سے بھی ہاتھ دھولوگی۔"

"نہیں۔" اس نے دردناک لہجے میں کہا۔ اس ہیرے کی عورت مٹی کی طرح ٹوٹ پھوٹ رہی تھی۔

"تم جانتی ہو ایلن گزشتہ ساڑھے چار سال بہت زیادہ کام کررہا تھا؟"

اس نے سر ہلایا۔ "بہت زیادہ۔۔۔ اکثر میری کی ملاقات ہفتے بھر بعد ہوتی تھی۔"

"لیکن ان سالوں میں اس نے مجھے صرف نو بھیجے۔۔۔ میرے حساب سے اسے کم سے کم تیس ناول چاہیے تھے۔"

"تیس ناول!" اس کے چہرے پر آگئی۔ "اس کا مطلب ہے ایلن کے کم سے کم بیس ایسے ہیں جو شائع نہیں ہوئے ہیں۔"

میں نے سر ہلایا۔ "بالکل...... اور تم شاید جانتی ہو کہ کوئی مصنف، مصور، گلوکار یا اداکار مر جائے تو اس متعلق چیزوں کی ویلیو دگنی ہوجاتی ہے۔"

روزیلا نے فوراً مطلب کی بات کی۔ "یعنی ایلن ناولوں کا معاوضہ دوگنا ہوجائے گا؟"

"اگر تم نے یہ ناول اشاعت کے لیے مجھے دیے تو بہ خوشی سابق معاوضے سے دوگنا پیش کرنا پسند کروں گا۔"

"کیا مجھے اس سے زیادہ بھی مل سکتا ہے؟"

"مل تو سکتا ہے۔" میں نے محتاط انداز کہا۔ "لیکن اس میں رسک بھی ہوگا، ممکن ہے کوئی نیا تمہیں زیادہ معاوضہ دیدے لیکن وہ ناول کو اس طرح نہ کرسکے جس طرح میں شائع کرتا ہوں۔ اس سے ڈائل کی ساکھ پر برا اثر پڑے گا اور ممکن ہے بنا اشا باقی مسودے ضائع چلے جائیں۔"

"دوسرا پبلشر کس طرح شائع کرے گا؟"

"یہ کاروباری گر ہیں تم نہیں سمجھ سکتیں۔" میں نے ٹالنے کے لیے کہا اور پھر موضوع بدل دیا۔ "بہرحال پہلے تو ان غیر مطبوعہ ناولوں کو تلاش کرنا ہے، وہ آخر ہیں کہاں اس کے بعد ہی تم کچھ کرسکتی ہو۔"

"میں نے اب تک اس کی اسٹڈی نہیں دیکھی ہے۔"

"تمہیں پہلی فرصت میں وہاں دیکھنا چاہیے بلکہ تم چاہو تو میں تمہاری مدد کرسکتا ہوں۔"

روزیلا بے دلی سے مانی تھی بہرحال وہ مجھے ایلن ڈائل کی اسٹڈی میں لے گئی اور اندر جانے سے پہلے اس نے مجھے خبردار کیا۔ "یہاں موجود ہر چیز اب میری ملکیت ہے اس لیے بغیر اجازت تم کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگاؤ گے اور نہ یہاں سے کچھ اٹھاؤ گے۔"

میں نے اقرار کیا کہ میں وہاں کی کوئی چیز نہیں چھیڑوں گا۔ ایلن کی اسٹڈی اتنی ہی شاندار تھی جتنی کہ ہونی چاہیے تھی۔ اس میں تقریباً ایک لاکھ کی کتابوں کی لائبریری کے ساتھ ایک جدید ترین کمپیوٹر اور اس کے لوازمات بھی تھے۔ اس کے لکھنے کی میز الگ تھی، یہ چھوٹی سی مہاگنی کی بنی میز تھی جس کے ساتھ مہاگنی سے بنی نرم گدی والی کرسی بھی تھی۔ مخصوص ٹائپ رائٹر کا گولڈن ایڈیشن سامنے رکھا تھا اور وہ اس طرح صاف ستھرا اور چمکتا دمکتا ہوا تھا کہ بیس سال پرانا لگ ہی نہیں رہا تھا۔ ایک طرف الماری میں ایسے چھ ٹائپ رائٹر ترتیب سے رکھے تھے اور ان میں سے کسی کو استعمال کرنے کی نوبت نہیں آئی تھی۔ ایک طرف دو عدد فولادی الماریوں میں ایلن کا تمام کام موجود تھا۔ ان الماریوں کے لاک کی چابیاں اسی گچھے میں تھیں جس میں اسٹڈی کی چابی تھی اور ایلن یقیناً انہیں حفاظت سے رکھتا تھا۔ پہلی الماری میں اس کے ان ناولوں کے مسودوں کی فوٹو کاپیاں تھیں جو میں نے شائع کیے تھے۔ مجھے بھیجنے سے پہلے ایلن ہر مسودے کی دو مکمل فوٹو کاپیاں بناتا تھا۔ میں نے باری باری سب کو چیک کیا لیکن وہ سب شائع شدہ مسودے تھے۔ پھر روزیلا نے دوسری الماری کھولی۔ اسے تقریباً خالی پا کر ایک لمحے کو میرا دل بھی رکا تھا۔ یہاں کچھ نہیں تھا اور جو تھا وہ اصل میں اس کی ان مختصر کہانیوں کے مسودے تھے جو کہیں شائع نہیں ہوئی تھیں اور ان کی تعداد دو درجن سے زیادہ نہیں تھی۔ وہ ناول کہیں نہیں تھے جن کے ہونے کا میں نے سوچ رکھا تھا اور ایسا لگ رہا تھا کہ میں نے غلط سوچا تھا۔ دل تو میرا بھی بیٹھا جارہا تھا لیکن روزیلا کی حالت زیادہ خراب تھی اور شاید وہ دھاڑیں مار کر رونے پر غور کر رہی تھی۔ اس نے چلا کر کہا۔ "کہاں ہیں وہ ناول؟"

"مجھے کیا پتا۔" میں نے گڑبڑا کر کہا۔ "یہ بتاؤ کہ ایلن کے انتقال کے بعد اسٹڈی کی کسی چیز کو چھیڑا تو نہیں گیا؟"

"بالکل بھی نہیں۔ وہ ایک ہفتے سے اسپتال میں داخل تھا اور اس دوران میں یہ چابیاں میرے پاس رہی ہیں۔ پھر کوئی ان مسودوں کو حاصل کر کے کیا کرے گا، اپنے نام سے تو شائع کرانے سے رہا۔"

میں نے روزیلا کے ساتھ مل کر پوری اسٹڈی کھنگال ڈالی۔ حد یہ کتابوں کی الماریوں میں بھی دیکھ لیا حالانکہ وہ شیشے کی تھیں اور باہر سے ہی سب کچھ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ روزیلا نے رونے والے لہجے میں کہا۔ "یہاں کچھ نہیں ہے، میرا خیال ہے ایلن نے کوئی ناول ایسا نہیں لکھا ہے جو اس نے تمہیں نہ بھیجا ہو۔"

"روزیلا، تمہارا اور اس کا پانچ سال کا ساتھ تھا جبکہ میں اسے پچیس سال سے جانتا ہوں۔ میں کئی بار ایک ہفتہ اس کے ساتھ رہا ہوں اور مجھے معلوم ہے وہ کتنی دیر کام کرتا تھا تو ایک ناول مکمل ہوجاتا تھا۔ جن دنوں وہ سال میں چار پانچ ناول مکمل کرتا تھا اس وقت بھی وہ دن بھر میں دس گھنٹے سے زیادہ کام نہیں کرتا تھا۔ جبکہ آخری ایام میں وہ بارہ سے چودہ گھنٹے کام کررہا تھا۔"

"تمہارے خیال میں اگر وہ زیادہ لکھ رہا تھا تو اس کا یہ لکھا ہوا کہاں ہے؟"

"کیا ایلن یہاں سے کوئی پارسل بھیج رہا تھا؟"

"یہ تو کم ہی بتا سکتا ہے۔" روزیلا نے کہا۔

"اسے بلاؤ۔" میں نے کہا تو روزیلا نے انٹرکام پر اسے طلب کیا، وہ اسٹڈی میں داخل ہوا۔

"کم! ایلن ڈاک یا کوریئر کے ذریعے کچھ چیزیں بھیجتا رہا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"جی جناب۔" اس نے ادب سے کہا۔ "سب سے زیادہ وہ آپ کو بھیجتے تھے۔"

"اس کے علاوہ اور کسے بھیجتے تھے؟"

"یہ بتانا مشکل ہے۔ ایک مخصوص کوریئر کمپنی کا آدمی یہاں آتا تھا اور وہ ان کے پارسل بھی لاتا تھا اور وہ جو چیز بھیجنا چاہتے تھے وہ لے جاتا تھا۔ میرا کام صرف اسے اسٹڈی تک پہنچانا اور پھر واپس باہر تک چھوڑنا تھا۔ جب وہ اندر ہوتا تو میں اندر نہیں آتا تھا۔"

کم کی بات سن کر مجھے خیال آیا۔ "کم، وہ جو چیزیں

لے جاتا ہوگا ان کی رسید بھی دیتا ہوگا۔"

"بالکل جناب، وہ نیلے رنگ کے کاغذ پر رسید دیتا تھا جس پر پارسل کی تفصیل لکھی ہوتی تھی۔"

"ایلن وہ رسیدیں کہاں رکھتا تھا؟"

"اپنی میز کی دراز میں جناب۔" کم نے مہاگنی کی بڑی میز کی طرف اشارہ کیا۔ روزیلا نے آگے بڑھ کر درازیں کھول کر دیکھنا شروع کر دیں اور پھر اس نے ایک چھوٹا سا بنڈل برآمد کرلیا۔ یہ نیلے رنگ کی کوریئر رسیدوں پر مشتمل تھا۔ اس نے کم سے کہا۔

"تم جاسکتے ہو شکریہ۔"

کم سر جھکا کر چلا گیا، اس کے جاتے ہی روزیلا نے یہ تمام رسیدیں کھول کر میز پر پھیلا دیں۔ ان کی تعداد سو سے بھی زیادہ تھی۔ میں نے سب سے نیچے والی رسید اٹھا کر دیکھی، اس پر پونے پانچ سال پہلے کی تاریخ تھی اور اس پر باب میک آرتھر کا نام اور اس کے دفتر کا پتا لکھا تھا۔ باب میک آرتھر، ایلن کا وکیل تھا۔ میں نے اس رسید کو الگ کر دیا۔ پھر باب کو کیے جانے والے پارسلوں کی رسیدیں الگ کرنے لگا تھا۔ رفتہ رفتہ واضح ہونے لگا کہ باب کو جانے والے پارسلز کی تعداد کہیں اور کیے جانے والے پارسلز سے زیادہ ہی تھی۔ ان میں ان نو ناولوں کے ساتھ ساتھ تقریباً ایک درجن دوسرے پارسلوں کی رسیدیں بھی تھیں جو ایلن نے مجھے بھیجے تھے۔ ان کے علاوہ کچھ عام اداروں یا افراد کو بھیجے جانے والے پارسل بھی شامل تھے۔ مجموعی طور پر باب کو کیے جانے والے پارسلوں کی تعداد تیس کے قریب تھی۔ میں نے روزیلا کی توجہ اس طرف دلائی۔

"آخر ایلن باب کو کیا بھیج رہا تھا؟"

روزیلا، جو دکھی بیٹھی تھی۔ اس نے چونک کر کہا۔ "تمہارا مطلب ہے کہ ایلن نے ناولوں کے مسودے باب کو بھیج دیے ہیں۔"

"ہوسکتا ہے آخر ایک آدمی اپنے وکیل کو کیا چیز بھیج سکتا ہے؟"

روزیلا پر امید ہوگئی۔ "تم اس سے فون کر کے معلوم کر سکتے ہو۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "اول تو وہ مجھے بتائے گا نہیں دوسرے آج اتوار کا دن ہے۔ البتہ تم اسے کال کرو یا خود چل کر معلوم کرو تو شاید وہ بتا دے۔ تم بہرحال ایلن کی وارث ہو۔"

روزیلا نے سوچا اور بولی۔ "میرا خیال ہے ہمیں خود چل کر اس سے بات کرنی چاہیے، فون پر تو ممکن ہے وہ مجھے بھی ٹال دے۔ اگر بتانے والی کوئی بات ہوتی تو وہ وصیت سے متعلق دوسری باتوں کی طرح ازخود ہی مجھے بتا چکا ہوتا۔"

پہلی بار مجھے روزیلا میں ذہانت کی جھلک نظر آئی تھی۔ واقعی اگر یہ بتانے والی بات ہوتی تو باب پہلے ہی ذکر کر چکا ہوتا۔ بہرحال یہ ایک مفروضہ تھا کہ ایلن نے اپنے مسودات باب کو بھیج دیے تھے اور اس نے باب کو کیوں بھیجے تھے، یہ بات اب صرف باب ہی بتا سکتا تھا۔ یہ سوچ کر میرا دل ڈوبنے لگا تھا کہ کہیں ایلن نے ان مسودوں کو کسی اور پبلشر کو دینے کا فیصلہ تو نہیں کرلیا تھا۔ اگر ایسا تھا تو یہ میرے لیے ذاتی طور پر بہت بڑا نقصان ہوتا۔ میرا پبلشنگ ہاؤس ایلن کے ناولوں پر چل رہا تھا۔ یوں سمجھ لیں کہ میری ستر فیصد آمدنی ایلن کی وجہ سے تھی اور اگر اس کے ناول مجھے نہ ملتے یا میرا مفروضہ غلط ثابت ہوجاتا کہ ایلن نے کچھ ناول لکھے بھی تھے تو آنے والے دن میرے لیے بہت سخت ثابت ہو سکتے تھے۔ مجھے کاروبار کو پہلے والی سطح تک لانے کے لیے بہت زیادہ محنت کرنا پڑتی۔ فی الحال میرے پاس ایسا کوئی مصنف نہیں تھا جس کی تخلیقات شائع کر کے میں اتنی آمدنی حاصل کرسکتا۔

باب کی رہائش انڈیانا پولس میں تھی۔ روزیلا نے گیراج سے ایلن کی پسندیدہ مرسیڈیز نکلوائی۔ اس نے کم کو ساتھ لے جانے کے بجائے خود ڈرائیونگ کا فیصلہ کیا تھا۔ میں اس کے ساتھ بیٹھا تھا۔ آدھے گھنٹے بعد ہم باب کے شاندار پینٹ ہاؤس میں تھے۔ یہ ایک بائیس منزلہ عمارت کا آخری فلور تھا۔ ایک مخصوص لفٹ نے ہمیں اپارٹمنٹ تک پہنچایا۔ باب حیران تھا کہ روزیلا کو اس کی ایسی کیا ضرورت پیش آگئی جو وہ یہاں چلی آئی تھی۔ بہرحال اس نے انٹرکام پر روزیلا کی آواز سن کر لفٹ نیچے بھیج دی تھی۔ البتہ مجھے دیکھ کر اس نے سرد تاثر دیا لیکن روزیلا سے اس کا رویہ نرم تھا۔ اس نے ہمیں ڈرنک پیش کیا اور بولا۔ "میں تمہارے لیے کیا کرسکتا ہوں مسز ڈائل۔"

روزیلا نے اس کے سامنے مسز ڈائل نہ ہونے پر اصرار نہیں کیا اور شیریں و مغموم لہجے میں بولی۔ "آج میں ایلن کی اسٹڈی میں بیٹھی اس کی یادوں سے دل بہلا رہی تھی کہ مجھے اس کی دراز سے کچھ کوریئر سلپس ملیں۔ اس نے پچھلے پانچ سالوں میں تمہیں کوئی تیس پارسل کیے۔"

"یہ درست ہے۔" باب نے اعتراف کیا۔

"لیکن تم نے مجھ سے ان کا ذکر نہیں کیا۔"

"ہاں، کیونکہ ان سے تمہارا کوئی تعلق نہیں تھا۔ میں ایلن کی واضح ہدایات کے مطابق کام کررہا تھا۔"

"وہ واضح ہدایات کیا تھیں؟" میں نے پوچھا تو باب نے ناگواری سے میری طرف دیکھا۔

"میرا خیال ہے مسٹر مورس، تمہیں یہ سوال کرنے کا حق حاصل نہیں ہے۔"

"لیکن مجھے تو ہے۔" ایلن نے جلدی سے کہا۔ "اس سوال کو تم میری طرف سے سمجھ لو۔"

باب سوچ میں پڑ گیا، میں نے روزیلا کی طرف دیکھا۔ "مسٹر باب سے پوچھو کہ کیا ایلن نے اسے رازداری سے کام لینے کو کہا تھا؟"

روزیلا نے اس کی طرف دیکھا تو وہ ہچکچا کر بولا۔ "نہیں، مسٹر ڈائل نے ایسا کوئی حکم نہیں دیا تھا۔"

"تب تمہیں بتانے میں کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔"

باب نے گہری سانس لی۔ وہ تقریباً ستر برس کا لیکن صحت مند اور سرخی مائل رنگت کا حامل بوڑھا تھا۔ "پونے پانچ سال پہلے مسٹر ڈائل نے مجھے پہلا پارسل اس ہدایت کے ساتھ بھیجا تھا کہ میں اسے اپنے پاس محفوظ کرلوں اور وہ آئندہ بھی جو پارسل خاص ہدایات کے ساتھ بھیجیں وہ بھی محفوظ کرلوں۔ پہلے پارسل کے ساتھ ایک سیل بند لفافہ بھی تھا۔ اس لفافے کے بارے میں مسٹر ڈائل کی ہدایات تھیں کہ ان کے انتقال کے بعد اس لفافے کو کھولا جائے اور مخصوص پارسلز کے بارے میں ان کی وصیت پر عمل کیا جائے۔ لہٰذا میں نے ایسا ہی کیا۔"

"تم نے کیا، کیا؟" روزیلا بے تابی سے بولی۔

"مسٹر ڈائل نے مجھے کوئی تیس پارسل بھیجے تھے اور جیسے ہی ان کے انتقال کی خبر آئی میں نے لفافہ کھول لیا اور اس میں ان پارسلوں کے بارے میں جو ہدایات تھیں، ان پر عمل کیا۔"

"وہی تو پوچھ رہی ہوں تم نے کیا، کیا؟" روزیلا چلا اٹھی تھی۔

"میں نے ان سارے پارسلوں کو کھولا اور ان میں جو کاغذات کے بنڈل تھے ان کو ایک کارٹن میں بند کر کے اس کارٹن کو مسٹر ڈائل کے بھائی مسٹر مارلن ڈائل کے پتے پر روانہ کردیا۔"

روزیلا اچھل کر کھڑی ہوگئی۔ اس نے چیخ کر کہا۔ "تمہیں اور ایلن کو اس کا کوئی حق نہیں تھا۔ تم نہیں جانتے کہ اس کی ہر چیز کی وارث میں ہوں۔"

"آپ ان کی دولت، آمدنی اور جائداد کی وارث ہیں۔ لیکن یہ مسودات اس زمرے میں نہیں آتے ہیں۔" باب نے نرم لیکن حتمی لہجے میں کہا۔ "مسٹر ڈائل نے کوئی خلاف وصیت کام نہیں کیا ہے۔"

"یہ غلط ہے، وہ مسودات بھی میری ملکیت تھے۔" روزیلا آپے سے باہر ہو رہی تھی۔ "میں تمہیں عدالت میں کھینچ لوں گی۔"

"آپ سب کچھ کرنے کے لیے آزاد ہیں۔" باب نے شائستگی سے کہا۔ "لیکن آپ یہاں چیخنے چلانے سے گریز کریں۔ میں ایک بار پھر آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں نے مسٹر ڈائل کی ہدایت پر عمل کر کے کوئی خلاف قانون یا خلاف وصیت کام نہیں کیا ہے۔"

روزیلا برہم تھی اور شاید وہ باب کو مزید سناتی کہ میں نے مداخلت کی۔ "میرا خیال ہے مسٹر باب درست کہہ رہے ہیں، یہ خود قانون کے ماہر ہیں اور کوئی غیر قانونی حرکت نہیں کر سکتے۔ میرا خیال ہے ہمیں اس سلسلے میں مسٹر مارلن ڈائل سے بات کرنی چاہیے۔"

باب میری بات سے خوش ہوا تھا۔ "آپ نے بالکل ٹھیک کہا مسٹر مورس، مسز ڈائل کو مسٹر مارلن ڈائل سے بات کرنی چاہیے۔"

اچانک مجھے خیال آیا۔ "مسٹر باب، ایلن نے تمہیں پانچ سال پہلے وہ لفافہ دیا تھا اس کا مطلب ہے اس میں موجود مارلن ڈائل کا پتا بھی پانچ سال پہلے کا ہوگا۔"

"درست ہے۔"

"لیکن اگر مارلن ڈائل اب اس پتے پر نہیں ہوا......؟"

"اول تو یہ میرا مسئلہ نہیں ہے، میرا کام مسٹر ڈائل کے احکامات کی تعمیل کرنا تھا وہ میں نے کر دی۔ اگر اس دوران میں پتا بدل جاتا تو مسٹر ڈائل اس کے ذمے دار ہوتے لیکن انہوں نے مجھے اس سلسلے میں کوئی ہدایت نہیں دی تھی۔ دوسرے کچھ دیر پہلے مجھے کوریئر کمپنی کی طرف سے اطلاع ملی ہے کہ پارسل ڈیلیور کر دیا گیا ہے، مسٹر مارلن ڈائل نے اسے خود وصول کر لیا ہے۔"

"پتا کیا ہے؟"

باب نے وہ ای میل کھولی جس میں کوریئر کمپنی کی طرف سے اسے پارسل ڈیلیور ہونے کی اطلاع ملی تھی۔ اس نے مارلن ڈائل کا پتا نوٹ کیا اور روزیلا کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے کاغذ ہاتھ میں لے کر بلند آواز سے پتا پڑھا۔ یہ شکاگو کے نواح کا پتا تھا۔ باب کے تاثرات بتا رہے تھے کہ اب وہ ہمیں یہاں سے رخصت کرنا چاہتا ہے اس لیے ہم اس کا شکریہ ادا کر کے باہر آئے اور روزیلا نے میرا شکریہ ادا کیا۔ "تم نے بروقت مجھے روک لیا ورنہ میں غصے میں بات بگاڑنے جا رہی تھی۔"

"تو میرا اندازہ درست تھا، ایلن نے ناول لکھے اور انہیں جمع کرتا رہا اس وصیت کے ساتھ کہ اس کے مرنے کے بعد وہ اس کے بھائی کو بھیج دیے جائیں۔"

"اس آوارہ گرد شرابی کو۔" روزیلا نے تلخ لہجے میں کہا۔ "مجھے معلوم ہے ایلن مجھ سے نفرت کرتا تھا اور اس نے جان بوجھ کر پانچ سالوں میں صرف نو ناول لکھے تاکہ اس کی آمدنی میں سے مجھے کم سے کم حاصل ہو اور تیس ناول وہ اپنے شرابی اور نشے کے عادی بھائی کے نام کر گیا۔"

میں نے اس کی طرف دیکھا۔ "تم ایک بار پھر غصے میں آ رہی ہو۔ تم نے شاید غور نہیں کیا، ان تیس ناولوں کی ممکنہ آمدنی پانچ سو ملین ڈالرز ہو سکتی ہے۔"

"پانچ سو ملین ڈالرز۔" اس کے منہ سے نکلا۔ "میرے خدا... اتنی دولت..."

جب سے مجھے ناولوں کے بارے میں پتا چلا تھا میرے دماغ میں ایک قسم کی کھچڑی پک رہی تھی اور میں ایک نتیجے پر پہنچ گیا تھا۔ میں نے روزیلا سے کہا۔ "اگر تم اسے حاصل کرنا چاہتی ہو تو تمہیں ہوشیاری سے کام لینا ہوگا۔"

"وہ کیسے؟"

"میرا خیال ہے ہمیں فوری طور پر مارلن ڈائل سے ملنا چاہیے اس سے پہلے کہ وہ ان مسودوں کی اہمیت سمجھے اور کسی پبلشر سے ان کا سودا کر لے۔"

"وہ کیسے؟" روزیلا پریشان ہو گئی تھی۔ "کل سے ایلن کی آخری رسومات میں شرکت کے لیے لوگ آنا شروع ہو جائیں گے۔"

میں نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ سہ پہر کے چار بج رہے تھے۔ میں نے روزیلا سے کہا۔ "یہ تمہارے اور میرے لیے بھی بہت اہم موقع ہے۔ میں اگر ان ناولوں کو حاصل کر سکا تب بھی کسی نہ کسی طرح اپنا کام چلا لوں گا لیکن اگر یہ تمہارے ہاتھ سے نکل گئے تو تم کہیں کی نہیں رہو گی۔"

"مسٹر مورس، تم کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"یہی کہ ہمیں فوری طور پر مارلن سے ملنا چاہیے اور کسی طرح اس سے یہ مسودات حاصل کرنے چاہئیں۔ چاہے اس کے لیے اسے منہ مانگی قیمت دینا پڑے۔"

روزیلا سوچ میں پڑ گئی پھر اس نے ہچکچا کر

کہا۔ "میں نے بتایا تا کہ میرے بینک اکاؤنٹ میں ایک ملین ڈالرز کی رقم ہے۔"

"تمہارے لیے یہ چھوٹی رقم ہے لیکن ایک فاقہ کش آدمی کے لیے یہ بہت بڑی رقم ہے۔"

روزیلا پرامید ہو گئی۔ "تو کیا وہ ایک ملین ڈالرز کے عوض مجھے یہ مسودے دے دے گا؟"

"کوشش کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے بشرطیکہ ہم فوری روانہ ہو جائیں۔ وہ یہاں سے کوئی دو سو کلومیٹرز دور رہتا ہے تمہاری مرسیڈیز ہمیں تین گھنٹے میں وہاں پہنچا دے گی اور اگر ہم نے چند گھنٹوں میں اس سے معاملہ کر لیا تو کل صبح وہاں سے واپس آ سکتے ہیں۔ اس دوران میں تمہارے کسی اہم کام میں کوئی حرج نہیں ہوگا۔"

روزیلا فوراً تیار ہو گئی۔ معاملہ پانچ سو ملین ڈالرز کا تھا اس کے لیے وہ ایلن کی تدفین بھی چھوڑ سکتی تھی۔ ہم فوری روانہ ہو گئے۔ نومبر کا آخر ہونے کی وجہ سے موسم نہایت سرد تھا۔ انڈیانا میں سرما کی پہلی برف باری ہو چکی تھی اور مزید برف باری کی پیش گوئی تھی لیکن ہائی وے صاف تھی۔ البتہ جیسے جیسے ہم شمال کی طرف بڑھ رہے تھے موسم مزید سرد ہوتا جا رہا تھا، اس کا پتا کار میں لگے تھرمامیٹر سے چل رہا تھا جو کار سے باہر کا درجۂ حرارت بتا رہا تھا۔ چھ بجے جب ہم شکاگو کے قریب تھے تو درجۂ حرارت منفی دو ڈگری سینٹی گریڈ تھا۔ ہمیں شکی ڈولور نامی قصبے تک جانا تھا۔ یہ مشی گن جھیل سے کچھ دور تھا۔ راستے میں ایک گیس اسٹیشن سے میں نے علاقے کا بڑا اور تفصیلی نقشہ خرید لیا، اس میں شکی ڈولور موجود تھا اور اس تک جانے والی سڑکوں کی بھی وضاحت کی گئی تھی۔ سات بجے ہم قصبے کے پاس پہنچ گئے تھے لیکن ہم دونوں کا بھوک سے برا حال تھا اس لیے متفقہ طور پر فیصلہ کیا گیا کہ مارلن ڈائل کے گھر جانے سے پہلے پیٹ پوجا کر لی جائے۔

روزیلا نے ہائی وے کے ساتھ ایک ریستوران کے سامنے کار روکی۔ وہ جس طبقے سے تعلق رکھتی تھی یہ ریستوران اس کے معیار کا نہیں تھا لیکن پیٹ تو بہرحال بھرنا تھا۔ لیکن یہاں کا کھانا اچھا ثابت ہوا۔ جب ہم وہاں سے نکلے تو روزیلا نے ڈرائیونگ میرے سپرد کر دی۔ وہ مسلسل تین گھنٹے سے ڈرائیو کر رہی تھی اور تھک گئی تھی۔ مارلن ڈائل کے گھر کی تلاش آسان ثابت نہیں ہوئی تھی۔ میرا خیال تھا کہ وہ شکی ڈولور میں کہیں رہتا ہوگا لیکن جب ہم قصبے پہنچے اور وہاں ایک بار سے مطلوبہ پتے کے بارے میں پوچھا تو بارٹینڈر نے وہاں دیوار پر آویزاں نقشے کی مدد سے ہمیں بتایا کہ ہم کس طرح مطلوبہ پتے پر پہنچ سکتے ہیں۔ یہ آبادی سے ہٹ کر جنگل میں تھا لیکن قصبے کی حدود میں ہی آتا تھا۔

جنگل میں راستہ کچا تھا اور اس پر مرسیڈیز ڈگمگاتی ہوئی چل رہی تھی۔ مجھے ڈر تھا کہ اس کا ٹائر نرم زمین میں نہ پھنس جائے یا پنکچر نہ ہو جائے۔ اس صورت میں اچھی خاصی مصیبت پڑ جاتی۔ روزیلا اس دوران میں مسلسل مارلن ڈائل کو برا بھلا کہہ رہی تھی جو اتنی واہیات جگہ رہتا تھا۔ بالآخر ہم اس جھونپڑے نما مکان کے پاس پہنچ گئے جس کی چھت پر اور آس پاس برف جمی تھی۔ ظاہر ہے کسی نے اسے صاف کرنے کی زحمت ہی گوارا نہیں کی تھی۔ برف کی وجہ سے کچا راستہ بھی کیچڑ زدہ ہو رہا تھا۔ روزیلا کی مرسیڈیز کا حشر نشر ہو گیا تھا۔ جیسے ہی میں نے کار روکی، روزیلا نے ڈیش بورڈ کے خانے میں ہاتھ ڈال کر ایک چھوٹا سا ریوالور نکال لیا۔ میں چونکا۔ "یہ کس لیے؟"

"مجھے اس شخص پر اعتبار نہیں ہے۔" وہ بولی۔ "وہ بدمعاش بھی ہے۔"

"لیکن وہ ہمارے ساتھ کوئی بدمعاشی نہیں کر سکتا، ہم اس کے فائدے کی بات کرنے آئے ہیں۔"

"وہ منشیات کا عادی بھی ہے، ہمیں اس کے ہر ردعمل کے لیے تیار رہنا چاہیے۔" روزیلا نے کہا تو مجھے اس کے انداز سے خطرے کی بو آنے لگی تھی۔

"دیکھو اگر تم یہ ریوالور اسے دھمکانے کے لیے لے جا رہی ہو تو بہتر ہے اسے یہیں چھوڑ دو۔"

"ممکن ہے وہ لالچ میں نہ آئے۔" روزیلا نے عجیب سے لہجے میں کہا اور کار سے اتر گئی۔ اس کا انداز اور یہ ریوالور دیکھ کر میں نے پچھتانا شروع کر دیا تھا کہ میں نے اسے یہاں آنے کی تجویز کیوں دی تھی اور پھر اس کے ساتھ کیوں چلا آیا۔

وہ نہایت خطرناک عورت ثابت ہو رہی تھی۔ جو عورت ایک بدمعاش کے گھر ہتھیار لے کر جائے اسے خطرناک نہیں تو اور کیا کہیں گے۔ اس نے جاتے ہوئے اگنیشن سے چابی نکال لی تھی اس لیے مجبوراً مجھے کار سے اتر کر اس کے پیچھے جانا پڑا تھا۔ اتنی دیر میں وہ کاٹیج کے دروازے تک پہنچ گئی تھی۔ یہاں شاید بجلی نہیں تھی کیونکہ مکان تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا سوائے سامنے والی کھڑکی کے جس سے ہلکی سی روشنی جھلک رہی تھی۔ روزیلا نے اس کے برابر میں موجود دروازے پر دستک دی تھی۔ ایک منٹ تک کوئی جواب نہیں ملا تو روزیلا نے دوبارہ زوردار دستک دی۔ کار سے باہر آنے کے بعد

مجھے صحیح معنوں میں سردی کی شدت کا اندازہ ہوا تھا۔ اگرچہ میں نے گرم سوٹ اور اس کے اوپر اوور کوٹ بھی پہن رکھا تھا اس کے باوجود میں کانپ رہا تھا۔ اب روزیلا کے پیچھے کھڑا بے چینی سے دروازہ کھلنے کا منتظر تھا تاکہ اندر جاسکوں۔ اندر یقیناً باہر سے بہتر ماحول ہوتا۔

بالآخر تیسری بار دستک دینے پر اندر سے کسی نے نشے میں ڈوبی آواز میں کہا۔ ”کون ہے... ؟“ تیسرا لفظ ایک ناقابل بیان گالی کی صورت میں تھا۔

”مسٹر مارلن ڈائل دروازہ کھولو۔“ روزیلا نے کہا۔ ”ہم تم سے ملنے آئے ہیں۔“

ممکن ہے روزیلا کی جگہ میں نے آواز دی ہوتی تو مارلن دروازے تک آنے کی زحمت ہی نہ کرتا۔ مگر روزیلا کی سریلی آواز جس میں اس نے جان بوجھ کر ایک سیکسی تاثر بھی شامل کیا تھا، اثر کر گئی اور مارلن ڈائل نے بے دھڑک دروازہ کھول دیا۔ وہ سامنے کھڑا نشے میں جھول رہا تھا اور اسے دیکھ کر مجھے حیرت کا جھٹکا لگا تھا کیونکہ وہ کہیں سے بھی ایلن سے مشابہ نہیں تھا۔ وہ لمبا تڑنگا اور کسی قدر مٹاپے کی طرف مائل جسم کا مالک تھا۔ اس کے بال بڑے اور بے ترتیب تھے۔ صاف لگ رہا تھا کئی ہفتوں سے انہیں دھونے یا کنگھی کرنے کی زحمت نہیں کی گئی تھی۔ اس کے چہرے پر کئی دن کی بڑھی ہوئی شیو تھی اور کسی قدر موٹے نقوش کے ساتھ وہ صورت سے ہی جرائم پیشہ لگ رہا تھا۔ اس نے حیرت سے روزیلا کو دیکھا غالباً وہ اسے پہچان گیا تھا۔

”تم!“ اس نے کڑے لہجے میں کہا۔ ”یہاں کیوں آئی ہو؟“

”میں تم سے ملنے آئی ہوں تمہارے فائدے کے لیے۔“ روزیلا نے اپنی مسکراہٹ کا جادو جگا کر کہا۔ ”کیا تم ہمیں اندر آنے کو نہیں کہو گے؟“

”یہ کون ہے؟“ مارلن نے مجھے گھورا۔

”یہ میرا دوست ہے۔“ روزیلا نے جلدی سے کہا۔ غالباً وہ میری شناخت ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی۔

مارلن نے سر ہلایا اور دروازے سے ہٹ گیا۔ ”جلدی اندر آؤ، اتنی دیر میں کیبن سرد ہوگیا ہے۔“

ہم اندر آئے ایک طرف میز پر لیمپ جل رہا تھا اور اس کے سامنے آتشدان میں آگ روشن تھی مگر یہ آگ مدھم تھی۔ وہاں اضافی لکڑی بھی نظر نہیں آرہی تھی۔ سامان نہ ہونے کے برابر تھا۔ یہ ایک کمرے کا کیبن تھا جس میں بیڈ روم بھی تھا، کچن بھی اور ڈائننگ ٹیبل بھی نظر آرہی تھی۔ کھڑکیوں پر جہاں شیشے نہیں تھے وہاں اس نے کے ٹکڑے لگا رکھے تھے۔ لکڑی کا فرش بھی جگہ جگہ سے رہا تھا۔ مارلن کے جسم پر تقریباً چیتھڑا ہو جانے والا لباس اور یہ بھی شاید اس نے مہینے بھر سے پہن رکھا تھا کیونکہ سے نہایت ناگوار بو آرہی تھی۔ تقریباً نصف ارب مالیت کی متوقع دولت کا مالک نہایت عسرت کے عالم زندگی بسر کر رہا تھا۔ شاید اس کے پاس ایک وقت کھانے کی رقم بھی نہیں تھی۔ میری نظریں وہاں کسی کار تلاش کر رہی تھیں جن میں ایلن کے لکھے تیس ناولوں مسودے ہو سکتے تھے لیکن اب تک مجھے وہاں ایسی کوئی نظر نہیں آئی تھی۔ روزیلا کیبن کے بجائے مارلن کا جائزہ رہی تھی، اس نے کہا۔

”لگتا ہے تم ہماری آمد سے خوش نہیں ہو۔“

”اس شخص کو میں نہیں جانتا۔“ اس نے صاف گو سے کہا۔ ”لیکن تم سے میں بالکل خوش نہیں ہوں۔“

”کیوں؟“ روزیلا اس کے سامنے بیٹھ گئی۔ مارلن ایک کرسی پر بیٹھ گیا تھا لیکن اس نے ہمیں بیٹھنے کو نہیں تھا۔ روزیلا کے سوال پر اس نے پہلے میز پر رکھی گھٹیا درجے کی شراب کی بوتل سے ایک گھونٹ لیا اور ذرا آگے جھک کر بولا۔

”کیونکہ تم میرے بھائی کی بیوہ ہو اور اس سے مجھے شدید نفرت تھی صرف اس سے نہیں بلکہ اس سے وابستہ شخص اور ہر چیز سے نفرت ہے۔“

”ٹھیک ہے، تمہیں اپنے بھائی سے نفرت تھی۔“ روزیلا نے نہایت ہوشیاری سے کہا۔ ”لیکن وہ اس دنیا سے گزر ہے۔ بہرحال اس نے اپنے کیے کی تلافی کر دی ہے۔“

مارلن چونکا۔ ”تلافی کر دی ہے... وہ بھلا کیسے؟“

میں نے عقب سے روزیلا کا شانہ دبایا۔ شکر ہے اس نے سمجھ لیا اور بات کا رخ بدل دیا۔ ”اچھا یہ بتاؤ کہ تمہیں اس سے نفرت کیوں ہے کیونکہ اس نے کبھی تمہارے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کی، ہاں وہ تم سے بے پروا ضرور رہا اسے اس کا بھی افسوس تھا اور وہ تلافی کرنا چاہتا تھا۔“

”افسوس!“ مارلن نے زہریلے لہجے میں کہا۔ ”وہ تو خوش ہوتا ہوگا میری اس حالت پر... وہ بچپن سے مجھ سے نفرت کرتا تھا۔“

”یہ غلط فہمی ہے تمہاری۔“ روزیلا نے زور دے کر کہا۔ ”میں پانچ سال سے ایلن کے ساتھ تھی، اس نے تمہارے خلاف نفرت کا اظہار نہیں کیا۔“

”تم غلط کہہ رہی ہو۔“ وہ بے یقینی سے بولا۔ ”اگر

مجھ سے نفرت نہیں کرتا تھا تو اس نے میری مدد کیوں نہیں کی۔ مجھے اس طرح غربت کی چکی میں پستے کیوں دیکھتا رہا؟''

''تم اس سے لڑ کر الگ ہوئے تھے۔ اسے خوف تھا کہ اگر اس نے تم سے رابطہ کیا تو تم پھر اس سے لڑو گے۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ تم دونوں کے تعلقات اس حد تک بگڑ جائیں کہ واپسی کی کوئی راہ باقی نہ رہے۔ اس کے باوجود اسے تمہارا خیال تھا۔''

''بلکہ وہ تمہاری مدد بھی کرنا چاہتا تھا۔'' میں نے لقمہ دیا۔ ''تمہیں ہر مہینے ہزار ڈالرز وہی بھیجتا تھا جس سے تمہاری گزر اوقات ہوتی تھی۔''

ہزار ڈالرز کا سن کر مارلن کے چہرے پر حیرت نمودار ہوئی۔ ''لیکن وہ ہزار ڈالرز تو مجھے ایک ٹرسٹ کی طرف سے ملتے تھے۔''

''ایسے کسی ٹرسٹ کا کوئی وجود نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔ ''وہ ایلن ہی بھیجتا تھا۔ صرف اسی خوف سے اپنے نام سے نہیں بھیجتا تھا کہ تم لینے سے انکار نہ کر دو۔''

''میں بھلا کیوں انکار کرتا۔'' مارلن نے فوراً کہا۔ اس کو دیکھ کر اب مجھے لگ رہا تھا کہ ایلن بے چارہ بلاوجہ اپنے بھائی سے خوف زدہ رہا تھا، اس میں خودداری اور حمیت نام کی کوئی چیز نہیں تھی اور اگر ایلن کبھی اس کی مدد کرتا تو وہ یوں لپک کر آتا جیسے کتا ہڈی پر آتا ہے۔ بہرحال ایلن نے مرتے وقت اپنی بے پروائی کی تلافی کر دی تھی اور اس نے اپنے بھائی کو بیش قیمت تحفہ دیا تھا البتہ مجھے وہ تحفہ یہاں کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔

''اس کا مطلب ہے ایلن بے چارہ بلاوجہ ڈرتا رہا تھا۔ وہ سمجھتا تھا تم بہت خوددار ہو اور اس کی مدد اس کے منہ پر دے مارو گے۔'' روزیلا بولی۔

مارلن نے گہری سانس لی۔ ''شاید جوانی میں ایسا ہی تھا اگر اس وقت ایلن میری مدد کی کوشش کرتا تو میں ایسا ہی کرتا لیکن پھر حالات نے سارے کس بل نکال دیے۔ یقین کرو اگر یہ ہزار ڈالرز نہ ملتے تو میں بہت پہلے فاقوں سے ہلاک ہو گیا ہوتا۔ لیکن اب بھی وہ وقت دور نہیں ہے تم میری حالت دیکھ رہے ہو۔ اس جگہ کی بجلی کٹ چکی ہے اور مجھے آتشدان میں جلانے کی لکڑی بھی جنگل سے چرانی پڑتی ہے کیونکہ یہاں جنگل سے لکڑی کاٹنے پر پابندی ہے۔''

''تمہاری مشکلات کا دور گزر گیا ہے۔'' میں نے کہا تو مارلن کے حلق سے کچھ ایسی آوازیں نکلیں جیسے وہ رو رہا ہو۔ مگر وہ ہنس رہا تھا، اس نے بوتل سے ایک طویل گھونٹ لیا اور دوبارہ ہنسنے لگا۔ روزیلا بولی۔

''اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟''

''ہنسنے کی بات تو ہے...... میرے بھائی نے میرے لیے ایک سینٹ اپنی وصیت میں نہیں چھوڑا اور تم کہتے ہو کہ میری مشکلات کا دور گزر گیا ہے۔ اب تو ہزار ڈالرز بھی بند ہو جائیں گے۔'' آخری جملہ اس نے کراہنے کے انداز میں کہا تھا۔

''یہ ٹھیک ہے کہ ایلن نے تمہارے لیے دولت اور جائداد میں سے کچھ نہیں چھوڑا ہے۔'' روزیلا نے نرمی سے کہا۔ ''لیکن وہ تمہارے لیے اس سے...''

اس سے پہلے کہ روزیلا اسے حقیقت سے آگاہ کرتی، میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ ''کیا تمہیں ایلن کے وکیل باب کی طرف سے کوئی کارٹن نہیں ملا؟''

اس نے ایک گھونٹ لے کر رونے والے انداز میں کہا۔ ''ملا ہے، آج صبح ہی آیا ہے۔''

''اس کارٹن میں تمہارے لیے خوش نصیبی کا پیغام ہے۔'' میں نے کہا۔ ''ہم تم سے اس کارٹن کا سودا کرنے آئے ہیں۔''

مارلن چونک کر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ ''سودا کرنے آئے ہو؟... اس کارٹن کا؟''

''ہاں۔'' روزیلا بھانپ گئی کہ میں کیا چاہتا ہوں۔ درحقیقت مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ وہ مسودے مجھے کس کے توسط سے ملتے ہیں لیکن میں انہیں مارلن جیسے وحشی اور اجڈ انسان کے قبضے میں رہنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا، ان مسودوں پر میرے مستقبل کا بھی انحصار تھا اگر انہیں نقصان ہوتا تو یہ نقصان اصل میں مجھے ہوتا۔ میں نے حوصلہ کر کے مارلن کو پیشکش کی۔ ''اگر تم چاہو تو اس کارٹن کے تمہیں ایک لاکھ ڈالرز مل سکتے ہیں۔''

مارلن کا منہ کھل گیا۔ ''ایک لاکھ ڈالرز...... اس ردی کے؟''

اس بار روزیلا نے کہا اور نہایت روانی سے جھوٹ بولا۔ ''ہاں، ویسے وہ ردی ہی ہے، ایلن لکھنے کے دوران بیکار کاغذ ایک طرف رکھتا جاتا تھا، یہ پچھلے سال سے جمع شدہ وہی کاغذات ہیں لیکن میرے لیے ایلن کی نشانی ہیں۔''

''تم کہتے ہو کہ وہ مجھ سے نفرت نہیں کرتا تھا جبکہ مرتے مرتے بھی وہ میرے ساتھ مذاق کر گیا۔ اس نے ساری عمر میں جو ردی جمع کی تھی وہ مجھے بھیج دی۔'' مارلن کا لہجہ بدل گیا۔

''تم سمجھے نہیں......'' میں نے جلدی سے کہا۔ ''ایلن بہت بڑا مصنف تھا اس کا یہ ردی لکھا ہوا بھی قیمت رکھتا ہے، اگر ان کاغذات کو نیلامی میں رکھا جائے تو ان کی بڑی قیمت مل سکتی ہے۔''

''لیکن تم کہاں نیلامی کے چکروں میں پڑو گے، یہ آسان کام نہیں ہے۔'' روزیلا بولی۔ ''اس لیے تم ایک لاکھ ڈالرز لے لو اور یہ کاغذات ہمارے حوالے کر دو۔''

''ایک لاکھ ڈالرز۔'' وہ ہنسا اور اس نے بوتل منہ سے لگا کر ایک خاصا طویل گھونٹ بھرا۔ جب یہ گھونٹ اس کے حلق سے اتر گیا تو اس نے پھر رونے والے انداز میں کہا۔ ''میں ایک لاکھ ڈالرز نہیں لے سکتا۔''

روزیلا کا چہرہ بگڑ گیا، اس نے میری طرف دیکھا اور غرا کر بولی۔ ''مجھے پہلے ہی معلوم تھا یہ لالچ پر اتر آئے گا۔''

''ایک لاکھ ڈالرز مناسب ہیں۔'' میں نے دل پر جبر کر کے اپنی زندگی کا سب سے بڑا جھوٹ بولا اور خدا سے معافی بھی مانگی کہ ہم پانچ سو ملین ڈالرز کی چیز صرف ایک لاکھ ڈالرز میں حاصل کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ مارلن بہ دستور پینے اور رونے کے انداز میں ہنسنے میں مصروف تھا، ایسا لگ رہا تھا کہ وہ کارٹن کی حقیقی مالیت سے واقف ہو گیا تھا اور اب ہم سے کھیل رہا تھا، انکار کرنے سے پہلے ہمیں ذلیل کر رہا تھا۔

''اگر ایک لاکھ ڈالرز مناسب نہیں ہیں تو تم کیا چاہتے ہو؟'' روزیلا بولی۔ اس کی حالت سے لگ رہا تھا جیسے مارلن نے ایک لاکھ ڈالرز سے انکار کر کے اس کی بہت بڑی حق تلفی کی ہو۔

''ایک لاکھ ڈالرز بہت ہیں۔'' مارلن نے خاصی دیر بعد کہا۔ ''لیکن ایلن ٹھیک کہتا تھا۔''

''کیا ٹھیک کہتا تھا؟''

''یہی کہ میں بدنصیب ہوں۔'' اس نے پھر رونے جیسی آواز میں کہا تو میرا دل دھڑک اٹھا تھا۔

''کیا مطلب...... اس معاملے میں بدنصیبی کہاں سے آ گئی؟''

''مارلن! وہ کارٹن کہاں ہے؟'' روزیلا بھی بے چین ہو گئی تھی۔

مارلن نے بوتل میز پر پٹخ دی اور چلا کر بولا۔ ''میں سچ مچ بدنصیب ہوں... وہ کارٹن اب کہیں نہیں ہے۔''

اس بار میرا دل بھی دھڑکنا بھول گیا، روزیلا کی حالت بھی مختلف نہیں تھی۔ میں نے بہ مشکل کہا۔ ''کیا مطلب... وہ کہاں گیا؟''

''آج سردی بہت تھی اور دو دن سے بارش والی برف باری ہو رہی تھی۔ جنگل کی لکڑی بہت گیلی تھی۔ اگر آتشدان نہیں جلاتا تو صبح تک میں سردی سے مر جاتا۔''

''تم نے کارٹن میں موجود کاغذات کا کیا، کیا؟'' روزیلا چیخ کر بولی، ساتھ ہی اس نے ریوالور نکال لیا تھا۔ ''ذلیل آدمی، بتاؤ تم نے کارٹن کا کیا کیا؟...... ورنہ میں تمہارا بھیجا اڑا دوں گی۔''

مارلن نے ریوالور کا کوئی اثر قبول نہیں کیا تھا۔ اب وہ پاگلوں کی طرح ہنسنے لگا پھر اس نے آتشدان کی طرف دیکھا۔ میں اس کی بات سمجھ رہا تھا لیکن میرا ذہن اسے قبول کرنے کو تیار نہیں تھا۔ میں نے اس سے کہا۔ ''کیا تم نے ان کاغذات کو پڑھنے کی زحمت نہیں کی ہے۔''

''میں نے انہیں نہیں دیکھا، وہ کاغذات محض ردی کے بنڈل تھے۔ انہیں دیکھ کر میں یہی سمجھا کہ ایلن نے مرتے مرتے بھی مجھ سے مذاق کیا ہے، وہ بتا گیا ہے کہ اس کے پاس میرے لیے سوائے اس ردی کے اور کچھ نہیں ہے لہٰذا میں نے وہ سارے کاغذات گیلی لکڑیوں کو آگ دکھانے کے لیے جلا دیے۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ ان کی اتنی اہمیت ہو سکتی ہے۔''

''تم نے انہیں جلا دیا۔'' روزیلا نے چیخ کر کہتے ہوئے فائر کر دیا تھا۔ اگر میں بروقت اس کا ہاتھ اوپر نہ کر دیتا تو ریوالور کی گولی مارلن کے سر میں لگتی۔ اس سے پہلے کہ وہ دوسری گولی چلاتی۔ میں نے روزیلا کے ہاتھ سے ریوالور چھین لیا۔

''تم پاگل ہو گئی ہو، ابھی گولی اسے لگ جاتی تو...؟''

''ہاں میں پاگل ہو گئی ہوں۔'' روزیلا نے چیخ کر کہا اور پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ سچی بات ہے، دل تو میرا بھی یہی چاہ رہا تھا مگر میں مرد ہونے کے ناتے مجبور تھا، رو نہیں سکتا تھا۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ میں نے روزیلا کا ہاتھ پکڑ کر اسے اٹھایا اور ہم باہر نکل آئے۔ مارلن تو بدنصیب تھا ہی اُس کی بدنصیبی میں اب ہم بھی شامل ہو گئے تھے۔



میٹھا زہر

مرزا امجد بیگ

عہدِ جدید ہو یا عہدِ قدیم... نیکی اور مفاد پرستی کی دوستی کبھی نہیں رہی۔ کوئی انسانیت کے رشتے نبھاتا رہے اور کوئی کسی کی سادگی سے فائدہ اٹھاتا رہے، ایسا ہوتا تو ہے مگر... تادیر نہیں... مگر اس غلطی کا احساس ہونے تک زندگی میں بہت سے تغیرات رونما ہوچکے ہوتے ہیں۔ یہاں بھی نیکی کچھ یوں گلے پڑی کہ پھانسی کے پھندے تک لے گئی لیکن ایسے میں بیگ صاحب کسی فرشتے کے مانند حاضر تھے۔

کبھی ہمدردی اور کبھی مدد کی لاٹھی سے ہانکنے والے ایک سود خور کا احوال

میں آفس جانے کی تیاری کر رہا تھا کہ معین صاحب کا فون آگیا۔ معین اختر ایک سرکاری محکمے میں چیف اکاؤنٹنٹ تھے۔ محکمے کا ذکر کرنا مناسب نہیں ہوگا، بس اتنا ہی ذہن میں رکھیں کہ معین صاحب سے میری خاصی پرانی یاداللہ تھی۔

ریسیور میں مانوس آواز سن کر میں نے کہا۔ ''ہیلو...... معین صاحب! کیسے ہیں آپ...... معین صاحب! اتنی صبح کیسے یاد کرلیا...... کوئی خاص بات......؟''

''بات تو خاص ہی ہے بیگ صاحب۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولے۔ ''میرے ایک کولیگ، کسی مصیبت میں گرفتار ہوگئے ہیں اسی لیے آپ کو فون کیا ہے۔''

گویا ان کی مصیبت کا تعلق کسی قانونی معاملے سے ہے۔ ''میں نے کہا۔ ''میں غلط تو نہیں سمجھ رہا......؟''

''نہیں بیگ صاحب...... آپ بالکل ٹھیک سمجھ رہے ہیں۔'' وہ تائیدی انداز میں بولے۔ ''اور اسے اس مصیبت سے چھٹکارا پانے کے لیے قانونی مدد کی ضرورت ہے۔''

''مصیبت کی نوعیت کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

معین صاحب نے جواب دیا۔ ''اعجاز صاحب پر قتل کا الزام عائد کیا گیا ہے۔''

''اوہ......!'' میں ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔ ''اعجاز صاحب یعنی آپ کے دوست اس وقت کہاں ہیں...... میرا مطلب ہے، وہ پولیس کسٹڈی میں ہیں یا جیل کی دیواروں کے پیچھے......؟''

''وہ اس وقت پولیس کی تحویل میں ہیں۔'' معین صاحب نے بتایا۔ ''انہیں گزشتہ رات ان کی رہائش گاہ سے گرفتار کیا گیا ہے...... عین ممکن ہے، آج اعجاز صاحب کو عدالت میں پیش کرکے پولیس ریمانڈ حاصل کرنے کی کوشش کرے۔''

''جی ہاں...... یہ عین ممکن ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اگر اعجاز صاحب کو پچھلی رات گرفتار کیا گیا ہے تو آج انہیں یقیناً عدالت میں پیش کیا جائے گا۔''

''میں نے اسی لیے آپ کو صبح صبح زحمت دی ہے کہ آپ آج دن میں کسی وقت ملزم کی بیوی سے ملاقات کرلیں بیگ صاحب! یہ کیس آپ ہی کو ہینڈل کرنا ہے۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے اثباتی انداز میں جواب دیا۔ ''آپ نے کہا ہے تو میں انکار نہیں کرسکتا...... اس کیس کے

حوالے سے آپ کو اور بھی جو کچھ معلوم ہے، وہ مجھے بتادیں۔"

"میں جتنا جانتا تھا وہ آپ کو بتا دیا۔" وہ بات ختم کرنے والے انداز میں بولے۔ "باقی کی معلومات آپ کو اعجاز صاحب کی بیگم سے حاصل ہو جائیں گی۔"

"او کے معین صاحب!" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "آپ مسز اعجاز کو دوپہر کے بعد میرے دفتر بھیج دیں۔ میں ان سے بات کرلوں گا۔"

"تھینک یو بیگ صاحب......!"

میں نے ریسیور کریڈل کردیا۔

©©©

عدالتی بکھیڑوں سے فارغ ہونے کے بعد میں نے لنچ کیا اور اپنے آفس چلا آیا۔ جب میں اپنے چیمبر کی طرف بڑھ رہا تھا تو میں نے وزیٹنگ لابی میں ایک خاتون کو بیٹھے ہوئے دیکھا۔ اس کے ساتھ بارہ سال کا ایک لڑکا بھی تھا۔ اس خاتون نے مجھے سلام کیا۔ میں نے سر کی خفیف جنبش سے اس کے سلام کا جواب دیا اور اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔

تھوڑی دیر بعد میری سیکریٹری نے اس خاتون کو اندر بھیج دیا۔ میں نے پیشہ وارانہ مسکراہٹ کے ساتھ ان کا استقبال کیا۔ وہ میری میز کے سامنے بچھی کرسیوں پر بیٹھ چکے تو میں نے رسمی علیک سلیک کے بعد سوالیہ نظر سے خاتون کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"جی فرمائیں...... میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں؟"

"میرا نام نفیسہ بیگم ہے۔" عورت گہری سنجیدگی سے اپنا تعارف کراتے ہوئے بولی۔ "آج صبح معین صاحب نے آپ کو فون کیا تھا......!"

"آپ مسز اعجاز ہیں؟" میں نے اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے پوچھ لیا۔

"جی ہاں!" نفیسہ بیگم نے اثبات میں گردن ہلائی۔ "یہ میرا بیٹا شعیب ہے۔" اس نے اپنے ساتھ آئے ہوئے بارہ سالہ لڑکے کی جانب اشارہ کیا۔ "اس سے چھوٹی دو بچیاں ہیں۔ میں انہیں گھر پر چھوڑ کر آئی ہوں۔"

"معین صاحب نے بتایا تھا کہ آپ کے شوہر اعجاز کو پولیس نے گزشتہ رات قتل کے الزام میں گرفتار کرلیا ہے؟" میں نے کاغذ قلم سنبھالتے ہوئے کہا۔

"جی ہاں!"

اس نے گمبھیر انداز میں گردن ہلائی۔ "وکیل صاحب! ہم بیٹھے بٹھائے ایک بہت بڑی مصیبت میں پھنس گئے ہیں۔"

"مقتول کون تھا......!" میں نے استفسار کیا۔ "اور آپ کے شوہر کے ساتھ اس کا کیا تعلق تھا؟"

"مقتول کا نام رفیق شاہ معلوم ہوا ہے جو ناظم آباد کے علاقے میں رہتا تھا۔" نفیسہ بیگم نے بتایا۔ "اور...... میں سمجھتی ہوں، اعجاز کی اس کے ساتھ نہ تو کوئی دوستی تھی اور نہ ہی دشمنی۔"

"نہ دوستی، نہ دشمنی...... نہ تعلق، نہ واسطہ......!" میں نے نفیسہ بیگم کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "پھر رفیق شاہ کے قتل کے الزام میں آپ کے ہی شوہر کو کیوں گرفتار کیا گیا...... اس کا کوئی تو سبب ہوگا؟"

"سبب ہے!" وہ اٹل انداز میں بولی۔ "اور اس سبب کا نام ہے، نگینہ بیگم!"

"نگینہ بیگم......!" میں نے زیرِلب دُہرایا۔ "یہ کون ذاتِ شریف ہیں......؟"

"یہ ذاتِ شریف نہیں بلکہ ذاتِ بدمعاش ہیں۔" نفیسہ بیگم نے زہرخند لہجے میں کہا۔

"کیا مطلب ہے آپ کا؟" میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"جی ہاں، میں سچ کہہ رہی ہوں۔" وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولی۔ "مجھے پورا یقین ہے کہ اس عورت کی وجہ سے اعجاز اس مصیبت میں پھنسے ہیں......"

"ذرا اس نگینہ بیگم کی تاریخ اور جغرافیہ بیان کریں؟" میں نے کہا۔

وہ ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔

"نگینہ ایک بیوہ عورت ہے۔ ادھر نیو کراچی میں رہتی ہے۔ اس کی ایک جوان بیٹی بھی ہے۔ اعجاز کا نگینہ کے گھر میں آنا جانا تھا۔ رفیق شاہ بھی ادھر آیا کرتا تھا اور اعجاز کی وہاں آمد کو ناپسند کرتا تھا۔ میں نے اعجاز کو کئی بار سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ نگینہ بیگم سے زیادہ تعلقات نہ بڑھائیں۔ مجھے وہ عورت ٹھیک نہیں لگتی لیکن وہ ہر بار وعدہ کرتے کہ اب وہاں نہیں جاؤں گا اور پھر وہ چند روز بعد وعدہ توڑ کر نگینہ کے گھر پہنچ جاتے تھے۔ اب انہیں اپنی غلطی کا احساس ہو رہا ہے لیکن...... وقت گزرنے کے بعد پچھتانے کا کیا فائدہ۔ آج صبح عدالت بھی گئی تھی جب پولیس انہیں عدالت لائی تھی۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی ان کی آنکھیں نم ہوگئیں، روتے ہوئے لہجے میں بولے...... نفیسہ! کاش میں تمہاری بات مان لیتا تو...... آج اس وبال میں نہ پھنستا......!"

وہ بھرائی ہوئی آواز میں اپنی بات پوری کر کے خاموش ہوئی تو میں نے پوچھا۔ "یہ مان لیا کہ آپ کے شوہر اعجاز کا مقتول رفیق شاہ کے ساتھ کوئی تعلق واسطہ نہیں تھا مگر رفیق شاہ اور نگینہ بیگم میں تو ربط ضبط ہوگا جو وہ نگینہ بیگم کے گھر جایا کرتا تھا۔ آپ اس بارے میں کیا کہیں گی؟"

نفیسہ بیگم سے گفتگو کے دوران میں میرا قلم مسلسل مصروف تھا اور میں اہم پوائنٹس کو رف پیڈ پر نوٹ کرتا جارہا تھا۔ میرے سوال کے جواب میں اس نے بتایا۔

"میں نے آج تک نہ تو نگینہ بیگم کو دیکھا ہے اور نہ ہی رفیق شاہ کو اس لیے میں ان کے بارے میں وثوق کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتی۔ بس، میرا دل یہ کہتا ہے کہ نگینہ بیگم کوئی اچھی عورت نہیں ہوسکتی......!"

"دل کی زبان عدالت کی سمجھ میں نہیں آتی نفیسہ صاحبہ اس لیے ہمیں زمینی حقائق کو مدنظر رکھ کر آگے بڑھنا پڑتا ہے۔" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "آپ یہ تو بتا ہی سکتی ہیں کہ آپ کے شوہر اور نگینہ بیگم کے بیچ کس نوعیت کا تعلق تھا جو وہ اکثر و بیشتر اس کے گھر پہنچ جایا کرتے تھے؟"

"ہمدردی کا رشتہ۔" اس نے جواب دیا۔ "نگینہ کے مرحوم شوہر وہاب دین کے ساتھ اعجاز کی جان پہچان رہی تھی اس لیے وہ وہاب کی بیوہ اور یتیم بچی کو دیکھنے ان کے گھر چلے جایا کرتے تھے۔"

"یہ جان پہچان والی بات آپ کو اعجاز صاحب نے بتائی تھی یا یہ آپ کی تحقیق ہے؟" میں نے کریدنے والے انداز میں پوچھا۔

"انہوں نے ہی بتائی تھی۔" وہ بولی۔ "میری اس معاملے میں کوئی تحقیق نہیں ہے۔ ویسے میں دعوے کے ساتھ یہ بات کہہ سکتی ہوں کہ اعجاز بہت ہی ہمدرد اور گداز دل انسان ہیں، کسی کو تکلیف میں نہیں دیکھ سکتے۔ اپنا، غیر کوئی بھی ہو، مصیبت کے وقت وہ اس کی مدد کو دوڑ پڑتے ہیں۔ بعض لوگ تو اپنی نقلی پریشانی کا رونا رو کر انہیں بے وقوف بھی بناتے ہیں اور کچھ نہ کچھ اینٹھ لیتے ہیں۔ بہرحال...... اعجاز ایسے ہی ہیں، ان کی اسی نرم دلی اور خدا ترسی کی وجہ سے ہم مصیبت میں آگئے ہیں۔"

"کیا مقتول رفیق شاہ کے بارے میں اعجاز آپ سے بات کیا کرتے تھے؟" میں نے سوال کیا۔ "میں دراصل مقتول کے حوالے سے معلومات حاصل کرنا چاہتا ہوں......؟"

"ایک آدھ بار انہوں نے مقتول کا تذکرہ کیا تو تھا اور وہ بھی سرسری انداز میں۔" وہ ذہن پر زور دیتے ہوئے بولی۔ "میں نے بھی زیادہ کریدنا مناسب نہیں سمجھا۔"

"اور وہ کس قسم کا تذکرہ تھا......؟"

"یہی کہ...... رفیق شاہ کی وجہ سے نگینہ بہت پریشان ہے۔" نفیسہ بیگم نے بتایا۔ "وہ بدذات، نگینہ کے لیے دردِ سر بنا ہوا ہے۔"

"نفیسہ بیگم! اعجاز نے مقتول کے لیے "بدذات" کے الفاظ استعمال کیے تھے اور آپ کا دل یہ بھی کہتا تھا کہ نگینہ بیگم کوئی اچھی عورت نہیں اس کے باوجود بھی آپ نے اپنے شوہر کو اس پھڈے والی جگہ پر جانے سے نہیں روکا...... کیوں؟"

"میں نے انہیں روکنے اور سمجھانے کی کوشش کی تھی۔" وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔ "چند دن کے لیے وہ باز آجاتے تھے، پھر یہ سلسلہ شروع ہو جاتا تھا۔"

"اگر آپ نے سختی برتی ہوتی تو شاید یہ سلسلہ رک جاتا۔"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں وکیل صاحب!" وہ سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولی۔ "واقعی، میں نے سختی نہیں کی تھی اور اس کی بھی ایک خاص وجہ تھی......"

"کیسی وجہ؟" میں نے چونک کر اسے دیکھا۔

"مجھے اعجاز پر اندھا اعتماد ہے۔" وہ بڑے فخر سے بولی۔ "اس لیے بھی میں ان پر کبھی سختی نہیں کرتی۔ وہ اپنی انسان دوستی اور خدائی فوجداری کے جذبے کے باعث اکثر و بیشتر مشکلات میں پڑتے رہتے ہیں اور ان مشکلات سے نکل بھی آتے ہیں لیکن میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ ایک دن وہ قتل کے مقدمے میں پھنس جائیں گے......!"

بات ختم کرتے کرتے اس کی آواز رندھ گئی۔ میں نے پوچھا۔

"واردات کب اور کہاں پیش آئی......؟"

"پچھلی رات کو...... نگینہ بیگم کے گھر میں......!" اس نے جواب دیا۔ "اعجاز رات کو گھر آئے۔ کھانا کھایا اور سونے کے لیے لیٹ گئے۔ یہ ان کا روز کا معمول ہے۔ وہ رات کے کھانے کے بعد بیڈ پر لیٹے لیٹے تھوڑی دیر ٹی وی دیکھتے ہیں اور پھر سو جاتے ہیں لیکن گزشتہ رات معمول کے خلاف پیش آیا......" وہ سانس ہموار کرنے کے لیے تھمی پھر اضافہ کرتے ہوئے بولی۔

"ہم سونے کے لیے لیٹ چکے تھے۔ البتہ بچے سو چکے تھے۔ آدھی رات کے وقت پہلے ہمارے گھر کی اطلاعی گھنٹی بجی پھر بڑے طوفانی انداز میں دروازہ دھڑدھڑایا

جانے لگا۔ یہ بڑی عجیب و غریب صورت حال تھی۔ لگتا تھا، باہر بھونچال آ گیا ہو۔ اعجاز افراتفری میں اٹھے اور انہوں نے جیسے ہی دروازہ کھولا، تین پولیس والے گھر کے اندر گھس آئے۔ پولیس والوں نے صرف ایک ہی سوال کیا۔ اعجاز حسین کون ہے؟ اعجاز نے جواب دیا، میں ہوں اعجاز حسین۔ پولیس والوں نے انہیں فوراً گرفتار کرلیا۔ پھر انہوں نے گاڑی کی تلاشی لی اور گاڑی کے ڈیش بورڈ میں سے ایک ریوالور بھی برآمد کرلیا۔ پولیس والوں کا دعویٰ ہے کہ رفیق شاہ کو اسی ریوالور سے قتل کیا گیا ہے۔ انہوں نے مذکورہ ریوالور کو قبضے میں کیا اور اعجاز کو گرفتار کر کے اپنے ساتھ لے گئے۔''

''کیا وہ ریوالور اعجاز کی ذاتی ملکیت تھا یا......؟'' میں نے ایک فوری خیال کے تحت سوال کیا۔

''جی ہاں، پولیس نے گاڑی کے ڈیش بورڈ میں سے جو ریوالور برآمد کیا وہ اعجاز کا ذاتی ریوالور تھا۔'' اس نے اثبات میں جواب دیا۔ ''اعجاز کے پاس اس اسلحے کا لائسنس بھی ہے......''

''جب پولیس والے اعجاز کو گرفتار کر کے اپنے ساتھ لے جا رہے تھے تو آپ نے ان سے کوئی بات، کوئی سوال نہیں کیا تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''میں تو ان سے سیکڑوں سوالات کرنا چاہتی تھی......'' وہ بے بسی سے بولی۔ ''لیکن انہوں نے مجھے اس کا موقع ہی نہیں دیا......!''

میں نے اصرار کیا۔ ''انہوں نے کچھ تو کہا ہوگا؟''

میں یہ ساری کرید اس لیے کر رہا تھا کہ اس کیس کے پس منظر کو اچھی طرح سمجھ لوں تاکہ آگے چل کر مجھے کسی اچانک مشکل کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ ملزم کی اہلیہ نفیسہ بیگم نے میرے سوال کے جواب میں بتایا۔

''انہوں نے مجھ سے صرف اتنا کہا کہ میرے شوہر نے رفیق شاہ نامی ایک شخص کو نگینہ بیگم کے گھر میں قتل کر دیا ہے...... اعجاز اس سے پہلے رفیق شاہ کو خطرناک نتائج کی دھمکیاں بھی دے چکا تھا......'' وہ متوقف ہوئی پھر روہانسی آواز میں اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولی۔

''یہ ہو سکتا ہے کہ اعجاز نے کبھی رفیق شاہ کو ڈرانے اور نگینہ بیگم کو ہراساں نہ کرنے کے سلسلے میں کوئی دھمکی وغیرہ دی ہو لیکن مجھے پورا یقین ہے کہ وہ کسی کی جان نہیں لے سکتے۔ دوسروں کی ہمدردی اور دکھ میں پریشان ہو جانے والا شخص کسی کا قتل کیسے کر سکتا ہے وکیل صاحب...... مجھے شک ہے کہ انہیں کسی سوچی سمجھی سازش کے تحت اس کیس میں پھنسانے کی کوشش کی جا رہی ہے......!''

''جو بھی سازش ہوگی وہ بہت جلد کھل کر سامنے آجائے گی۔'' میں نے تسلی بھرے انداز میں کہا۔ ''آپ کو فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔ معین صاحب نے اس کیس کے لیے خاص طور پر سفارش کی ہے تو سمجھیں، اعجاز کا کیس اب میرے ہاتھ میں ہے۔ آپ کو اگر اس حوالے سے کوئی اور اہم بات معلوم ہو تو مجھے بتا دیں تاکہ ابھی سے تیاری شروع کی جا سکے......!''

''مجھے جو کچھ معلوم تھا وہ میں نے آپ کو بتا دیا ہے۔'' وہ بڑی سادگی سے بولی۔ ''اس سے زیادہ اگر آپ کو کچھ جاننا ہے تو آپ اعجاز سے مل لیں۔''

''اعجاز صاحب سے ایک بھرپور ملاقات تو ازحد ضروری ہے۔'' میں نے پرمعنی انداز میں کہا۔ ''میں آج ہی تھانے جا کر ان سے ملوں گا۔''

نفیسہ بیگم اپنے ہینڈ بیگ کی جانب ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولی۔ ''معین صاحب نے مجھے بتا دیا تھا کہ آپ خاصے مہنگے وکیل ہیں لیکن فکر نہ کریں، میں فیس میں رعایت نہیں کراؤں گی۔ بس، آپ پوری دل جمعی سے اعجاز کا کیس لڑیں اور جلد از جلد انہیں باعزت رہائی دلوا دیں۔''

''اگر آپ فیس میں رعایت کرواتیں، میں پھر بھی دلجمعی ہی سے کیس لڑتا۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''کیونکہ یہ میرے پیشے کا تقاضا ہے۔''

وہ ستائشی نظر سے میری جانب دیکھنے لگی۔ نفیسہ بیگم کی عمر چالیس کے اریب قریب نظر آتی تھی۔ وہ ایک خوش شکل اور جاذب نظر عورت تھی۔ اس کے لیے ''گریس فل لیڈی'' کے الفاظ زیادہ مناسب تھے۔ اپنی وضع قطع، رکھ رکھاؤ اور پہناوے سے وہ خوش حال اور کھاتے پیتے گھر کی عورت نظر آتی تھی۔

''جی وکیل صاحب......؟'' اس نے سوالیہ نظر سے میری جانب دیکھا۔

میں اس کی نظر کی تہ میں پہنچ گیا اور اسے اپنی فیس کے اماؤنٹ سے آگاہ کر دیا۔ اس نے گن کر رقم میرے حوالے کر دی اور میں نے بغیر گنے مذکورہ رقم کو اپنے کوٹ کی جیب میں ڈالا پھر کہا۔

''نفیسہ بیگم! فیس تو آپ نے ادا کر دی۔ اس کے علاوہ کیس کے سلسلے میں جو بھی عدالتی اخراجات ہوں گے، بھی یقیناً آپ ہی کو دینا ہیں لیکن میں یہاں ایک اہم امر کی جانب آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہوں گا......''

''وہ کیا......؟'' وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھنے لگی۔

میں نے کہا۔ ''آئندہ پیشی پر، ریمانڈ کی مدت پوری ہو جانے کے بعد پولیس اس کیس کا چالان عدالت میں پیش کر دے گی۔ اس موقع پر مجھے اعجاز کی ضمانت کے لیے زور لگانا ہوگا اور آپ کو اس سے پہلے کسی معتبر اور معزز ضمانتی کا بندوبست کرنا ہے۔''

''وہ میں کرلوں گی، آپ بے فکر ہو جائیں۔'' وہ بڑے اعتماد سے بولی۔

اور میں واقعی بے فکر ہو گیا۔

آئندہ پانچ منٹ کے اندر میں نے نفیسہ بیگم کو فیس کی وصولی کی رسید بنا کر دے دی۔ اس نے رسید کو بہ غور دیکھا اور اس میں درج اماؤنٹ کے فگر کو دہراتے ہوئے بولی۔

''آپ کی نگاہ تو بہت تیز ہے وکیل صاحب!''

''نگاہ کو تیز رکھنا پڑتا ہے......'' میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''ورنہ کورٹ میں دال نہیں گلتی۔''

اس نے تعریفی انداز میں مجھے دیکھا اور کہا۔ ''اچھا تو مجھے اجازت دیں......''

''ٹھیک ہے، اب ہماری ملاقات کورٹ ہی میں ہوگی۔'' میں نے حتمی لہجے میں کہا، پھر پوچھا۔ ''پولیس نے کتنے دن کا ریمانڈ حاصل کیا ہے؟''

''ایک ہفتے کا......!'' نفیسہ بیگم نے جواب دیا۔

❀❀❀

اسی روز میں آفس سے فارغ ہو کر اعجاز سے ملنے متعلقہ تھانے پہنچ گیا۔ پولیس کسٹڈی میں ریمانڈ پر کسی ملزم سے ملاقات کے لیے کیسے کیسے حربے آزمانا پڑتے ہیں اس کا ذکر پہلے بھی کئی بار کیا جا چکا ہے لہٰذا صرف اتنا بتاتا چلوں کہ میں نے تھانے میں جا کر ایف آئی آر کی نقل حاصل کی اور اعجاز حسین سے ایک مختصر مگر سود مند ملاقات کرلی۔

اعجاز حسین کی عمر پچاس سے متجاوز تھی۔ وہ سانولے رنگ کا ایک دراز قامت شخص تھا۔ جسم مائل بہ فربہی اور سر کے بال نصف سے زیادہ غائب۔ اس نے آنکھوں پر نظر کا چشمہ لگا رکھا تھا اور شکل سے خاصا معصوم اور سیدھا سادا بلکہ کسی حد تک احمق دکھائی دیتا تھا۔ وہ بندۂ خدا کہیں سے بھی تیز نظر نہیں آتا تھا۔ اس کی آنکھوں اور چہرے پر چالاکی یا شاطر پن کا فقدان تھا۔

ایف آئی آر کے مطابق، رفیق شاہ کو اعجاز حسین کے ریوالور سے قتل کیا گیا تھا۔ تین چار افراد نے فائرنگ کی آواز بھی سنی تھی اور ان معتبر افراد نے ملزم کو جائے وقوعہ سے فرار ہوتے ہوئے بھی دیکھا تھا۔ یہ صورت حال خاصی گمبھیر تھی۔

میں نے لگ بھگ آدھا گھنٹا اعجاز حسین سے سوال و جواب کیے اور اس گفتگو میں چند کارآمد باتیں بھی پتا چلیں تاہم میں سردست ان کا ذکر نہیں کروں گا۔ عدالتی کارروائی کے دوران میں مناسب مقامات پر انہیں بیان کیا جائے گا۔

واپسی پر میں تھانا انچارج سے ملا اور پوچھا۔

''جناب! آپ کی تفتیش کیا کہتی ہے؟''

اس نے طنزیہ نظر سے مجھے دیکھا اور کہا۔ ''ابھی تک تو تفتیش خاموشی سے جاری و ساری ہے۔ جب یہ بولے گی تو اس کی آواز آپ کو بھی سنائی دے گی۔ تھوڑا انتظار کرلیں......!''

''مطلب یہ کہ آپ کچھ بھی نہیں بتائیں گے......!'' میں نے تھانا انچارج کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے شاکی لہجے میں کہا۔

''آپ ابھی آدھا پونا گھنٹا ملزم کے ساتھ لگا کر آئے ہیں۔'' وہ خشک انداز میں بولا۔ ''یقیناً اس دوران میں آپ نے ملزم کے دماغ کا جوس نکال دیا ہوگا اور وہاں سے بیش بہا معلومات سمیٹ کر لوٹے ہیں آپ۔ میں نے آپ سے کوئی سوال کیا......؟''

''جناب انچارج صاحب!'' میں نے بے تکلفی سے کہا۔ ''میں نے آپ کو کب سوال کرنے سے منع کیا ہے...... آپ پوچھیں، کیا پوچھنا چاہتے ہیں؟''

''جی شکریہ...... بہت مہربانی آپ کی......!'' وہ رکھائی سے بولا۔

میں نے حیرت سے آنکھیں پھیلائیں۔ ''یہ کیا بات ہوئی؟''

''آپ وکیل صفائی ہیں اور ہم استغاثہ!'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''دریا کے دو ایسے کنارے جو پہلو بہ پہلو چلتے دکھائی دیتے ہیں مگر کبھی آپس میں مل نہیں سکتے اس لیے......'' لمحاتی توقف کر کے وہ اپنی میز پر پھیلی ہوئی چیزوں کے ساتھ مصروف ہو گیا اور بیزار کن انداز میں بولا۔

''اس لیے آپ جا کر اپنا کام کریں اور ہمیں ہمارا کام کرنے دیں۔ جب تفتیش مکمل ہوگی تو اس کیس کا چالان عدالت میں پیش کر دیا جائے گا۔ پھر ساری صورت حال خود بہ خود آپ کے سامنے آجائے گی۔''

میں اس بدلحاظ اور کھرے تھانے دار کے پاس سے اٹھا اور گاڑی میں بیٹھ کر اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

آیندہ چند روز مختلف نوعیت کی بھاگ دوڑ میں گزر گئے۔ پولیس اپنی کسٹڈی میں آئے ہوئے ملزم اعجاز حسین سے تفتیش کرتی رہی اور میں اپنے موکل اعجاز حسین سے حاصل ہونے والی معلومات کی روشنی میں اپنی سوچ اور سوچ کے گھوڑے دوڑا کر کیس کی تیاری میں مصروف تھا۔ اعجاز حسین سے حوالات میں ہونے والی ملاقات کے اختتام پر میں نے وکالت نامے اور دیگر ضروری کاغذات پر اس کے دستخط کرا لیے تھے لہٰذا اب وہ میرا موکل اور میں اس کا وکیل تھا...... وکیل صفائی!

ریمانڈ کی مدت پوری ہونے کے بعد پولیس نے عدالت میں چالان پیش کر دیا۔ اسی روز میں نے اپنے وکالت نامے کے ساتھ ہی ملزم کی درخواست ضمانت بھی عدالت میں دائر کر دی۔ نفیسہ بیگم نے اپنے شوہر کے لیے شخصی ضمانت کا انتظام کیا تھا اور ضمانتی شخصیت اس وقت عدالت کے کمرے میں موجود تھی۔ میں اس شخص کو اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ کوئی اور نہیں بلکہ معین اختر صاحب تھے...... چیف اکاؤنٹنٹ معین اختر!

عدالت کی کارروائی کا آغاز ہوا اور میں نے ملزم کی ضمانت کے حق میں بولنا شروع کیا۔

"جناب عالی! میرا موکل اس معاشرے کا ایک معزز شخص ہے۔ اسے ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت قتل کے اس مقدمے میں پھنسانے کی کوشش کی گئی ہے۔ میں ملزم کے محکمے کے اندر سے اور اس کے محلے میں سے درجن بھر ایسے افراد عدالت میں پیش کر سکتا ہوں جو اس کے نیک چلن ہونے اور ایمانداری کی گواہی دیں گے اور...... سب سے بڑی مثال تو معین اختر ہی ہیں جو ملزم کی ضمانت کے لیے اس وقت عدالت کے کمرے میں موجود ہیں۔"

"اگر یہ کوئی چوری، ڈکیتی یا خرد برد کا کیس ہوتا تو ملزم کی ایمانداری کو زیر بحث لایا جا سکتا تھا۔" وکیلِ استغاثہ نے زہریلے لہجے میں کہا۔ "لیکن یہ تو قتل کا مقدمہ ہے۔ ایک قیمتی انسانی جان گئی ہے لہٰذا ملزم کی ضمانت منظور کرنا انصاف کے اصولوں کے منافی ہوگا۔"

"اس میں کسی شک و شبہے کی گنجائش نہیں کہ ایک انسان موت سے ہمکنار ہوا ہے۔" میں نے معتدل انداز میں کہا۔ "لیکن مقتول کی موت میں میرے موکل کا کوئی ہاتھ نہیں۔ وہ اس معاشرے کا ایک معزز فرد ہے اور اس کا پولیس ریکارڈ بالکل صاف ہے......" میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

"اس لیے معزز عدالت سے میری استدعا ہے کہ وہ میرے موکل کی درخواست ضمانت کو منظور کرتے ہوئے اسے شخصی ضمانت پر رہا کر دے تاکہ انصاف کے تقاضے پورے ہو سکیں۔"

"انصاف کے تقاضے تو اس وقت پورے ہوں گے جب معزز عدالت ملزم کی درخواست ضمانت کو رد کر دے گی۔" وکیل استغاثہ نے درخواست ضمانت کے خلاف دلائل دیتے ہوئے کہا۔ "اگر کسی شخص کا پولیس ریکارڈ صاف ہو تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں لیا جا سکتا کہ وہ زندگی میں کبھی کوئی جرم نہیں کرے گا...... کسی بھی انسان کا پولیس ریکارڈ کسی بھی وقت داغ دار ہو سکتا ہے۔"

"میں وقت آنے پر یہ ثابت کر سکتا ہوں کہ میرے موکل کو ایک سوچی سمجھی اسکیم کے تحت اس کیس میں ملوث کرنے کی سازش کی گئی ہے......!" میں نے درشت لہجے میں کہا۔

"آپ کو اپنے موکل کی بے گناہی ثابت کرنے سے کس نے روکا ہے میرے فاضل دوست۔" وکیل استغاثہ نے میری جانب دیکھتے ہوئے استہزائیہ انداز میں کہا۔ "ابھی تو اس مقدمے کی عدالتی ابتدا ہوئی ہے۔ آپ کو اپنے جوہر آزمانے کا پورا موقع دیا جائے گا۔ آپ دل چھوٹا نہ کریں......" اس نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر روئے سخن جج کی جانب موڑتے ہوئے بولا۔

"جناب عالی! مقتول رفیق شاہ کو ملزم کے ریوالور سے موت کے گھاٹ اتارا گیا ہے۔ اس واردات کے وقت جائے وقوعہ پر ملزم کی موجودگی بھی ثابت شدہ ہے۔ استغاثہ کے پاس نصف درجن ایسے گواہ ہیں جنہیں معزز اور معتبر ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ انہوں نے جائے واردات پر فائرنگ کی آواز سنی تھی اور ملزم کو افراتفری کے عالم میں وہاں سے فرار ہوتے دیکھا تھا۔ علاوہ ازیں استغاثہ ایسے گواہوں کو بھی عدالت کے سامنے لائے گا جو اس حقیقت سے واقف ہیں کہ ملزم نے مقتول کو کئی بار سنگین نتائج کی دھمکیاں بھی دی تھیں لہٰذا میں عدالت سے پرزور اپیل کرتا ہوں کہ ملزم کی درخواست ضمانت کو نامنظور کرتے ہوئے اس کیس کو آگے بڑھایا جائے۔ دیٹس آل یور آنر......!"

جج نے ملزم کی ضمانت کی درخواست کو رد کرتے ہوئے پندرہ روز بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کرنے کا اعلان کر دیا۔

"دی کورٹ از ایڈ جارنڈ......!"

⊙⊙⊙

مجھے اس بات سے تعجب نہیں ہوا تھا کہ عدالت نے میرے موکل کی درخواست ضمانت کو نامنظور کر دیا تھا۔ فوج داری مقدمات میں کسی ملزم کی ضمانت کرانا اور وہ بھی پہلی ...... جوئے شیر لانے کے مترادف ہوتا ہے پھر اعجاز حسین کے کیس میں نگینہ بیگم اور اس کی بیٹی فوزیہ کا نام بھی استغاثہ کے گواہوں کی فہرست میں شامل نظر آتا تھا اور تین چار افراد نے اعجاز کو جائے وقوعہ سے فرار ہوتے ہوئے بھی دیکھا تھا اور پولیس کے پاس اس امر کا بھی ٹھوس ثبوت موجود تھا کہ مقتول رفیق شاہ کو ملزم کے ریوالور ہی سے قتل کیا گیا تھا۔ ان گمبھیر حالات کی روشنی میں ضمانت کا سوال ہی پیدا ہوتا دکھائی نہیں دیتا تھا۔

نفیسہ بیگم کو اگرچہ درخواست ضمانت کے رد ہونے سے دھچکا سا لگا تھا لیکن معین صاحب نے اسے حالات کی نزاکت اور واقعات کی حقیقت سے بڑی اچھی طرح آگاہ کر دیا تھا۔ وہ اس وضاحت کے بعد خاصی مطمئن ہو گئی تھی۔

آگے بڑھنے سے پہلے میں پوسٹ مارٹم اور میڈیکل ایگزامنر کی رپورٹس کا ذکر کرتا چلوں۔ ان رپورٹس کے مطابق مقتول رفیق شاہ کی موت آٹھ نومبر کی رات نو اور دس بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی۔ اس پر اعشاریہ تین دو کیلی بر کے ریوالور سے دو فائر کیے گئے تھے جن میں سے ایک گولی اس کی گردن میں دھنس گئی تھی اور دوسری گولی نے اس کی کھوپڑی کے پرخچے اڑا دیے تھے لہٰذا فوری طور پر اس کی موت واقع ہو گئی تھی۔ یہ اتنا اچانک اور مہلک وار تھا کہ مقتول رفیق شاہ کو چیخنے چلانے یا تڑپنے کا موقع ہی نہیں ملا اور وہ جائے واردات پر ہی دم توڑ گیا۔

آیندہ پیشی پندرہ روز بعد تھی اور میں ان پندرہ دنوں کو بڑی مہارت کے ساتھ استعمال میں لانا چاہتا تھا۔ دیگر نوعیت کی بھاگ دوڑ کے علاوہ میں نے ایک رسکی اسٹیپ بھی لیا۔ ایک روز میں دفتر سے فارغ ہونے کے بعد نگینہ بیگم سے ملنے چلا گیا۔

نگینہ بیگم کی رہائش نیو کراچی کے علاقے میں تھی۔ میں نے اعجاز حسین سے اس کے گھر کا ایڈریس اچھی طرح سمجھ لیا۔ وہ لگ بھگ ایک سو تیس گز کا ایک متوسط سا مکان تھا۔ اس زمانے میں آج کل کی طرح نیو کراچی ابھی اتنا آباد نہیں ہوا تھا۔ نگینہ کا گھر بھی نیو کراچی کے اس حصے میں تھا جس کی تعمیر کو تین چار سال سے زیادہ کا عرصہ نہیں گزرا تھا۔ نگینہ کا گھر ڈھونڈنے میں مجھے کسی دقت کا سامنا نہیں ہوا تھا۔

میں نے اطلاعی گھنٹی بجائی اور ایک طرف ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ اس وقت رات کے نو بج رہے تھے۔ یہ جاتے ہوئے نومبر کی تاریخیں تھیں۔ دن تو ابھی تک گرم ہی چل رہا تھا البتہ رات میں فضا خوشگوار خنکی سے بھر جاتی تھی۔ اسے ٹھنڈ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ یہ بڑا سہانا سماں تھا۔

چند لمحات کے بعد دروازہ کھلا اور ایک نوجوان لڑکی نے باہر جھانکا۔ اس نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا اور پوچھا۔ "جی...... آپ کو کس سے ملنا ہے؟"

لڑکی کی عمر بیس بائیس سال سے زیادہ نہیں تھی۔ وہ ایک خوب صورت اور پرکشش لڑکی تھی۔ میرے ذہن میں خیال ابھرا کہ وہ نگینہ کی بیٹی فوزیہ ہوگی۔

میں نے زیر لب مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "مجھے نگینہ سے ملنا ہے۔ کیا یہ انہی کا گھر ہے؟"

"جی گھر تو انہی کا ہے لیکن امی اس وقت گھر پر نہیں ہیں۔" وہ گلی میں ادھر ادھر دیکھتے ہوئے بولی۔ "آپ کون ہیں اور امی سے آپ کو کیا کام ہے......؟"

بولنے پر وہ خاصی باتونی اور شوخ ثابت ہوئی۔ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "آپ مجھے نہیں جانتی ہو لیکن میں آپ کو جانتا ہوں...... آپ فوزیہ ہو نا؟"

"کمال ہے، آپ مجھے جانتے ہیں۔" اس نے حیرت بھرے انداز میں آنکھیں گھمائیں۔ "آپ کون ہیں...... آپ کا نام کیا ہے؟"

"میرا نام مرزا امجد بیگ ہے۔" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "اور میں ایک ایڈووکیٹ ہوں......"

"ایڈووکیٹ...... یعنی وکیل!" اس نے قدرے بلند آواز میں کہا۔ "امی نے کہیں آپ کو کسی مشورے کے لیے تو نہیں بلایا۔ آج کل ہم ایک مصیبت میں پھنسے ہوئے ہیں۔"

"آپ کی امی نے خود تو مجھے نہیں بلایا البتہ میں آپ لوگوں کی مصیبت کے بارے میں سن کر ہی حاضر ہوا ہوں۔" میں نے موقع محل کی مناسبت سے دروغ گوئی کا سہارا لیتے ہوئے کہا۔ "آپ کی امی کب تک واپس آئیں گی؟"

"میرا خیال ہے، وہ واپس آنے ہی والی ہیں......!" اس نے ایک مرتبہ پھر گلی میں دور تک جھانکا۔ "وہ کافی دیر سے گئی ہوئی ہیں۔"

"تو ٹھیک ہے......" میں نے مڑتے ہوئے کہا۔ "میں اپنی گاڑی میں بیٹھ کر ان کی واپسی کا انتظار کر لیتا ہوں۔"

"ارے نہیں وکیل صاحب......" وہ جلدی سے

بولی۔ ”آپ باہر کیوں بیٹھیں گے۔ امی آتی ہی ہوں گی۔ آپ اندر ڈرائنگ روم میں آجائیں۔“

میں فوزیہ کے ساتھ ڈرائنگ روم میں پہنچ گیا۔

وہ ایک اوسط درجے کا ڈرائنگ روم تھا۔ اس نے مجھے ایک صوفے پر بٹھایا اور بولی۔ ”آپ امی کا انتظار کریں۔ میں آپ کے لیے چائے بنا کر لاتی ہوں۔“

اس سے پہلے کہ میں اسے منع کرتا، وہ ڈرائنگ روم سے نکل گئی۔ وہ فرنیچر اور وہاں موجود دیگر اشیا نہ تو بہت زیادہ قیمتی تھیں اور نہ ہی گئی گزری۔ انہیں مناسب اور متناسب کہا جاسکتا تھا۔

تھوڑی ہی دیر بعد فوزیہ چائے کے ساتھ واپس آگئی۔ ٹرے میں چائے کے ساتھ بسکٹ بھی تھے۔ اس نے یہ دونوں چیزیں میرے سامنے میز پر سجا دیں پھر ہمارے درمیان گفتگو کا سلسلہ چل نکلا۔ میں نے پوچھا۔

”آپ کی امی کہاں گئی ہیں؟“

”وہ گلشن اقبال تک گئی ہیں۔“ اس نے جواب دیا ”انکل مراد سے ملنے......!“

”مجھے پتا چلا ہے، پچھلے دنوں آپ لوگوں پر ایک بہت بڑی مصیبت آکر گزری ہے۔“ میں نے چائے کی چسکی لیتے ہوئے کہا۔

”گزری کہاں ہے وکیل صاحب...... آپ نے اپنا نام کیا بتایا تھا......؟“ وہ بولتے بولتے مجھ سے پوچھ بیٹھی۔

جو لوگ بہت زیادہ باتونی ہوتے ہیں ان کی یادداشت اکثر گڑبڑ کر جاتی ہے۔ میں نے بھی فوزیہ کے اسی وصف کو ذہن میں رکھتے ہوئے اسے گھیرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ وہ خاصی شوخ وشنگ اور اوور کانفیڈنٹ لڑکی تھی۔

”میرا نام مرزا امجد بیگ ہے۔“ میں نے اپنا تعارف دُہرایا۔

”کیا میں آپ کو صرف بیگ صاحب کہہ سکتی ہوں؟“

”کیوں نہیں۔“ میں زیرلب مسکرایا۔ ”اکثر لوگ مجھے ”بیگ صاحب“ کہہ کر ہی پکارتے ہیں......“

”بیگ صاحب...... تو میں آپ کو بتا رہی تھی کہ آپ نے جس مصیبت کا ذکر کیا ہے نا، وہ ابھی گزری کہاں ہے۔“ وہ بڑی رسان سے بولی۔ ”پولیس نے ہمیں بہت تنگ کر رکھا ہے۔ آپ کسی طرح ہمیں اس جھنجٹ سے نکال دیں...... آپ ایسا کرسکتے ہیں نا؟“

”کیوں نہیں!“ میں نے بڑے اعتماد سے کہا۔ ”میں اسی لیے تو آپ کی امی سے ملنے آیا ہوں۔ جب تک مجھے حالات کی تفصیل معلوم نہیں ہوگی، میں کوئی لائحہ عمل کرسکوں گا......“ میں نے لمحاتی توقف کرکے ایک سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

”آپ کی امی تو ابھی گھر میں موجود نہیں ہیں۔ تک آپ ہی مجھے اس معاملے سے آگاہ کریں۔ میں ہے، اس گھر میں کسی کا قتل ہوگیا تھا......؟“

”آپ نے بالکل ٹھیک سنا ہے بیگ صاحب“ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے گہری سنجیدگی سے بولی۔ ”اس وقت جس صوفے پر بیٹھے ہوئے ہیں نا...... قتل اسی ہوا تھا۔ رفیق شاہ کو کسی نے دو گولیاں مار کر موت کے اتار دیا تھا۔“

”کس نے......؟“ میں نے سادگی سے پوچھا۔

”مم...... مجھے نہیں پتا جی......“ وہ گڑبڑا کر بولی۔

”کیا قتل کے وقت آپ گھر کے اندر موجود تھیں؟“ میں نے پوچھا۔

”میں گھر میں ہی تھی لیکن اپنے کمرے کے تھی۔“ اس نے جواب دیا۔ ”میں فائرنگ کی آواز سن اپنے کمرے سے نکلی تو صحن میں امی سے ملاقات ہو انہوں نے مجھے بتایا کہ رفیق شاہ کو کسی نے ڈرائنگ روم قتل کردیا ہے......“

”صرف کسی نے یا...... آپ کی امی نے کسی شخص کا نام بھی لیا تھا؟“

”انہوں نے...... ”کسی نے“ کے الفاظ ہی استعمال کیے تھے۔“ اس نے بتایا۔

”لیکن میری معلومات کے مطابق پولیس نے شاہ کے قتل کے الزام میں کسی اعجاز حسین نامی آدمی کو گرفتار تھا۔“ میں نے اس کا ذہن پڑھنے کی غرض سے کہا۔ ”عدالت میں اعجاز حسین کے خلاف مقدمہ چل رہا ہے۔“

”جی یہی حقیقت ہے۔“ وہ ذومعنی انداز میں بولی۔

”یعنی آپ بھی یہی سمجھتی ہیں کہ اعجاز حسین نے شاہ کو قتل کیا ہے؟“ میں نے اس کی آنکھوں میں ہوئے پوچھا۔

”میں تو ایسا نہیں سمجھتی بیگ صاحب!“ وہ معصومیت سے بولی۔ ”لیکن میرے کچھ سمجھنے یا نہ کیا ہوتا ہے۔“

”کیا مطلب ہے آپ کا؟“ میں نے ٹھہرے لہجے میں کہا۔ ”آپ مجھ سے کچھ چھپانے کی کوشش کر ہیں......!“

”ایسی بات نہیں ہے بیگ صاحب......“ وہ الجھ گئی۔

میں نے کریدا۔ ”پھر کیسی بات ہے؟“

”وہ بات دراصل یہ ہے کہ......“ وہ ٹھہر ٹھہر کر بتانے لگی۔ ”اس روز اعجاز صاحب شام ہی سے ہمارے گھر میں موجود تھے۔ اعجاز صاحب اور امی صحن میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ میں اپنے کمرے میں ایک ناول پڑھ رہی تھی۔ فائرنگ کی آواز نے مجھے ناول چھوڑ کر باہر نکلنے پر مجبور کردیا۔ ڈرائنگ روم سے ملحق امی کا بیڈروم ہے اور اس کے ساتھ میرا بیڈروم جڑا ہوا ہے۔ میرے بیڈروم کا ایک دروازہ امی کے بیڈروم میں کھلتا ہے اور دوسرا صحن میں۔ میں چونکہ اپنے کمرے میں جانے سے پہلے امی اور اعجاز صاحب کو صحن میں بیٹھے ہوئے دیکھ چکی تھی لہٰذا میں فوراً دروازہ کھول کر صحن میں نکل آئی۔ وہاں امی سے میری ملاقات ہوگئی اور انہوں نے مجھے بتایا کہ رفیق شاہ کو کسی نے ڈرائنگ روم میں قتل کردیا ہے۔ اس کے بعد......!“

وہ سانس درست کرنے کے لیے متوقف ہوئی تو میں نے پوچھا۔ ”اس کے بعد کیا؟“

”اس کے بعد......“ وہ اپنے بیان کو آگے بڑھاتے ہوئے بولی۔ ”اس کے بعد پولیس کو ایسے گواہ مل گئے جنہوں نے اعجاز صاحب کو افراتفری کے عالم میں یہاں سے فرار ہوتے دیکھا تھا۔ پولیس نے اعجاز صاحب کو فیڈرل بی ایریا میں ان کے گھر سے گرفتار کرلیا اور ان کی گاڑی سے وہ ریوالور بھی برآمد کرلیا جس سے فائر کرکے رفیق شاہ کو قتل کیا گیا تھا۔“

”گویا حالات وواقعات پوری طرح اعجاز حسین کی مخالفت میں تھے۔“ میں نے متاسفانہ لہجے میں کہا۔ ”ورنہ آپ کی نظر میں اعجاز صاحب قصوروار نہیں ہیں؟“

”جی، میں تو ایسا ہی سمجھتی ہوں۔“ وہ بڑے وثوق سے بولی۔ ”اعجاز صاحب ایسے آدمی نہیں ہیں جو کسی کے خون میں ہاتھ رنگ لیں۔ وہ تو انتہائی ہمدرد اور مددگار انسان ہیں۔ انہوں نے کئی مواقع پر ہماری مدد کی ہے۔ وہ ابو کے پرانے جاننے والوں میں سے ہیں۔ ابو کے انتقال کے بعد جب سب نے ہمارا ساتھ چھوڑ دیا تھا تو اللہ نے اعجاز صاحب کو رحمت کا فرشتہ بنا کر ہمارے گھر بھیج دیا۔ وہ پچھلے ایک سال سے ہمارے گھر آرہے تھے۔ انہوں نے کئی کڑے مواقع پر ہماری اخلاقی اور مالی مدد بھی کی ہے۔“

”آپ کی نظر میں اعجاز حسین بہت اچھے انسان تھا۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”لیکن آپ کا نام استغاثہ کے گواہوں کی فہرست میں بھی شامل ہے۔ جب آپ کو گواہی کے لیے کٹہرے میں کھڑا کیا جائے گا تو وہاں بھی آپ اعجاز صاحب کی خوبیاں بیان کریں گی یا ان کے خلاف گواہی دیں گی؟“

”میں تو وہی کہوں گی جو سچ ہے۔“ وہ مضبوط لہجے میں بولی۔ ”لیکن......!“

وہ الجھن زدہ انداز میں بات نامکمل چھوڑ کر مجھے دیکھنے لگی۔ میں نے پوچھا۔ ”لیکن کیا؟“

”لیکن یہ کہ......“ وہ بہ دستور الجھے ہوئے لہجے میں بولی۔ ”کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ میرا اور امی کا نام گواہوں کی فہرست سے نکل جائے...... پولیس کو جو بھی تحقیق اور تفتیش کرنا ہے، کرتی رہے۔ ہماری جان چھوڑے......!“

”ایسا ہونا ممکن نہیں ہے۔“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”میں ایک وکیل ہوں اور قانون کے دائرے میں رہتے ہوئے آپ کو مشورہ دوں گا۔“

وہ ہمہ تن گوش ہوگئی۔ میں نے کہا۔ ”قتل کی واردات آپ کے گھر کے ڈرائنگ روم میں ہوئی ہے لہٰذا پولیس آپ ماں بیٹی کی جان نہیں چھوڑے گی۔ آپ کے بیانات بھی انہوں نے لیے ہوں گے اور عدالت میں پیش ہوکر آپ کو گواہی بھی دینا ہوگی کیونکہ استغاثہ کے گواہوں کی فہرست میں آپ دونوں کا نام شامل ہے لیکن میری سمجھ میں ایک بات نہیں آرہی......!“

میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑا تو اس نے اضطراری لہجے میں پوچھا۔ ”کون سی بات بیگ صاحب......؟“

”یہی کہ آپ بیان دینے سے اتنا گھبرا کیوں رہی ہیں۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ”آپ نے رفیق شاہ کو قتل نہیں کیا اور نہ ہی اس کے قتل میں آپ لوگوں کا ہاتھ ہے پھر عدالت میں جاکر جج کے روبرو سچ بولنے میں پریشانی کیا ہے؟“

”پریشانی یہ ہے بیگ صاحب کہ......“ وہ متذبذب انداز میں بولی۔ ”پولیس ہم لوگوں سے اس قسم کا بیان اور گواہی دلوانا چاہتی ہے جو سراسر اعجاز صاحب کے خلاف جائے اور میں ایسا نہیں چاہتی۔ اعجاز صاحب کے ہم پر اتنے احسانات ہیں کہ ان کے خلاف زبان کھولتے ہوئے ہمیں شرم آنا چاہیے......“

”آپ کو پریشان ہونے یا پولیس کے دباؤ میں آنے کی ضرورت نہیں۔“ میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ”پولیس جو کرتی ہے اسے کرنے دیں۔ آپ لوگ اپنے ضمیر

کی آواز کو نہ دبائیں۔ عدالت کے اندر گن پوائنٹ پر بیان نہیں لیا جاتا۔ آپ کی نظر میں جو سچ ہے، وہی جج کے روبرو بیان کریں۔ اللہ سچ بولنے والوں کا ساتھ دیتا ہے۔"

وہ خاصی مطمئن اور پرسکون نظر آنے لگی۔ میں نے اس کی مزید تسلی کے لیے کہا۔ "ڈرنے یا گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ میں تمام وقت عدالت کے کمرے میں موجود رہوں گا...... آپ لوگوں کی مدد کے لیے۔"

"جی...... بہت بہت شکریہ!" اس کا چہرہ کھل اٹھا۔

میں نے پوچھا۔

"یہ رفیق شاہ کس قسم کا بندہ تھا؟"

"انتہائی واہیات اور بے ہودہ......" وہ نفرت آمیز لہجے میں بولی۔ "مجھے ایسی بھوکی نظر سے دیکھتا تھا جیسا کچا ہی چبا ڈالے گا۔"

"کیا اس بات کا آپ کی امی کو پتا نہیں؟" میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ "ایسے غلیظ انسان کو وہ گھر میں گھسنے ہی کیوں دیتی تھیں......؟"

"ہماری مجبوری تھی......!" وہ بے چارگی سے بولی۔

میں نے پوچھا۔ "کیسی مجبوری؟"

وہ تامل کرتے ہوئے بولی۔ "کسی برے وقت میں امی نے اس منحوس سے کچھ رقم ادھار لی تھی جو وقت مقررہ پر ہم واپس نہیں کر سکے اور اس خبیث انسان نے سود در سود لگا کر اصل رقم کو چار گنا کر ڈالا تھا......" وہ لمحے بھر کو متوقف ہوئی پھر ٹوٹے ہوئے لہجے میں بولی۔

"وہ اپنی رقم کا تقاضا کرنے ہی گھر پر آتا تھا اور امی اس ڈر سے کہ وہ دروازے پر کھڑا ہو کر شور مچائے گا، اسے گھر میں بلا کر ڈرائنگ روم میں بٹھاتی تھیں اور تسلی دلاسا دے کر وہیں سے لوٹا دیتی تھیں کہ ہم بہت جلد اس کی رقم لوٹا دیں گے۔"

"میں نے سنا ہے، وقوعہ کی رات بھی مقتول اسی غرض سے یہاں آیا تھا؟" میں نے اندھیرے میں ایک تیر چھوڑا۔

"مجھے اس کی آمد کے بارے میں کچھ خبر نہیں۔" وہ برا سا منہ بناتے ہوئے بولی۔ "ظاہر ہے، وہ اسی مقصد سے آیا ہوگا۔ میں اس وقت کمرے میں تھی۔"

"اور کیا یہ بھی سچ ہے کہ اعجاز حسین نے مقتول رفیق شاہ کو قتل وغیرہ کی دھمکی دی تھی؟" میں نے فوزیہ سے استفسار کیا۔

"دھمکی کا تو مجھے پتا نہیں البتہ اعجاز صاحب رفیق شاہ اور امی کے بیچ ایک سیٹلمنٹ کروانے کی کوشش میں ضرور تھے۔" اس نے بتایا۔ "اسی سلسلے میں ان کی رفیق شاہ [illegible] تلخ کلامی بھی ہوئی تھی۔"

"اگر آپ مائنڈ نہ کریں تو میں آپ کے گھر کو [illegible] دیکھ سکتا ہوں؟"

"اس میں مائنڈ کرنے والی کون سی بات ہے [illegible] اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ "آپ ہمارے سچے خیر خواہ ہیں [illegible] اس مصیبت سے نجات دلانا چاہتے ہیں...... آپ [illegible] میرے ساتھ......"

آئندہ پانچ منٹ کے اندر میں نے نگینہ بیگم کے گھر کا تفصیلی جائزہ لے لیا۔

وہ واپسی میں دوبارہ ڈرائنگ روم کا رخ کرنے والی تھی کہ میں نے اپنی رسٹ واچ پر نگاہ ڈالتے ہوئے تشویش بھرے لہجے میں کہا۔

"اوہ...... مجھے تو اس وقت سوسائٹی پہنچنا تھا۔ باتوں ہی باتوں میں وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا۔" پھر میں نے فوزیہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "مجھے اجازت دیں۔ میں آپ کی امی سے پھر مل لوں گا...... میرا اس وقت جانا بہت ضروری ہے۔"

فوزیہ مجھے تھوڑی دیر اور روکنا چاہتی تھی لیکن میں اسے تسلی تشفی دے کر گھر سے نکل آیا۔ میں نے نگینہ کی غیر موجودگی میں، فوزیہ کی زبانی معلومات کا ایک خزانہ حاصل کر لیا تھا۔ میں اپنے ذہن میں جو پلان لے کر یہاں آیا تھا وہ بالکل فیل ہو گیا تھا اور پلان کا فلاپ ہونا میرے حق میں بے انتہا سودمند رہا تھا۔ اگر نگینہ گھر میں موجود ہوتی تو یقیناً میں اتنی گراں قدر معلومات حاصل نہیں کر سکتا تھا۔ بہر حال، میری اس گھر میں آمد چھپنے والی نہیں تھی۔ فوزیہ یقیناً اپنی ماں کو میرے بارے میں بتاتی اور نگینہ بیگم میرا نام سنتے ہی سمجھ جاتی کہ میں نے اس کی غیر موجودگی میں ہاتھ دکھا دیا تھا۔ وہ وکیل صفائی کی حیثیت سے مجھے جانتی تھی کیونکہ پچھلی پیشی پر وہ عدالت میں موجود تھی۔

میں نے آئندہ کی فکر کو جوتے کی نوک پر مارا اور گاڑی کو اپنے گھر کی جانب بڑھا دیا۔ کل کیا ہونا ہے، یہ کوئی نہیں جانتا اور نہ ہی ہونے والی بات کو بدل سکتا ہے لہٰذا اس کی فکر میں گھلنے کا کیا فائدہ......!

⊙⊙⊙

آئندہ پیشی پر اس مقدمے کی باقاعدہ سماعت کا آغاز ہوا۔

جج نے فرد جرم پڑھ کر سنائی۔ ملزم نے صحت جرم سے انکار کر دیا۔ اس کے بعد ملزم کا باقاعدہ بیان ریکارڈ کیا گیا۔ میرے موکل نے معزز عدالت کے روبرو وہی بیان دیا جو وہ اس سے پہلے اپنی گرفتاری پر پولیس کو دے چکا تھا۔ تاہم کسٹڈی کے دوران میں پولیس نے ملزم سے اقبال جرم کروالیا تھا۔ ریمانڈ کی مدت کے دوران میں پولیس کے تشدد سے بچنے کے لیے عموماً ملزم اقبالی بیان پر دستخط کر دیتے ہیں لیکن ملزم کے اس اقبالی بیان کی عدالت کی نظر میں کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔ عدالت گواہوں کے بیانات اور بعد ازاں ان بیانات پر دونوں جانب کے وکلا کی بحث کے نتیجے میں کسی نتیجے پر پہنچ کر فیصلہ سناتی ہے۔

ملزم کے حلفیہ بیان کی تکمیل کے بعد وکیل استغاثہ نے میرے موکل کو جرح کی چکی میں پیس ڈالا لیکن ملزم نے نہایت ہی صبر و تحمل کے ساتھ ہر سوال کا مدلل اور مختصر جواب دیا۔ یہ دیکھ کر مجھے بے حد خوشی ہوئی کہ اعجاز حسین نے میری ہدایات کی روشنی میں وکیل استغاثہ کو فیس کیا تھا۔

اپنی باری پر میں اکیوزڈ باکس کے قریب پہنچا اور سوال و جواب کا سلسلہ کچھ اس انداز میں شروع کیا۔ "مسٹر اعجاز! اس مقدمے کی ایف آئی آر اور چالان کی رپورٹ میں بڑے واضح الفاظ میں لکھا ہے کہ رفیق شاہ کو آپ کے ریوالور سے موت کے گھاٹ اتارا گیا ہے۔ آپ اس حوالے سے کیا کہیں گے؟"

"پولیس والے جو دعویٰ کر رہے ہیں وہ میری سمجھ میں بالکل نہیں آیا۔" وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ "میں تو صرف اتنا جانتا ہوں کہ میں نے رفیق شاہ کو قتل نہیں کیا......"

"پولیس نے جب آپ کو آپ کے گھر واقع فیڈرل بی ایریا سے گرفتار کیا تو اسی وقت آپ کی گاڑی کی تلاشی بھی لی گئی تھی۔" میں نے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ "پھر وہیں پر آپ کی گاڑی کے ڈیش بورڈ میں سے پولیس نے ایک ریوالور برآمد کر لیا تھا۔ جب آپ کے پڑوسیوں کی موجودگی میں پولیس نے ریوالور کے چیمبر چیک کیے تو ان میں سے دو گولیاں چلی ہوئی پائی گئی تھیں۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ مقتول رفیق شاہ کی موت آپ کے ریوالور سے چلنے والی گولیوں ہی سے واقع ہوئی ہے۔ آپ اس بارے میں کیا کہتے ہیں......؟"

"یہ سچ ہے کہ جب پولیس نے میری گرفتاری کے وقت ریوالور چیک کیا تو اس کے دو چیمبرز خالی تھے جبکہ میں نے ریوالور کو فل لوڈ کر کے ڈیش بورڈ میں رکھا تھا۔" وہ الجھن زدہ لہجے میں بولا۔ "مجھے شک ہے کہ یہ ساری گڑبڑ پولیس والوں نے خود ہی کی ہے......"

"مسٹر اعجاز! اپنی یادداشت کو پکاریں......" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "اور معزز عدالت کو بتائیں کہ وقوعہ کی رات نگینہ بیگم کے گھر پر کیا حالات پیش آئے تھے؟"

"یہ آٹھ نومبر کا واقعہ ہے۔" وہ ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ "میں اس وقت نگینہ بیگم کے گھر میں موجود تھا۔ رات کے نو بجے ہوں گے یا پانچ دس منٹ اوپر۔ میں اور نگینہ بیگم گھر کے صحن میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ نگینہ کی بیٹی فوزیہ اپنے کمرے کے اندر تھی۔ اچانک اطلاعی گھنٹی بجی۔ نگینہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

"میں جا کر دیکھتی ہوں......!" یہ کہہ کر وہ گھر کے بیرونی دروازے کی جانب بڑھ گئی۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ واپس آئی اور بتایا۔ "رفیق شاہ آیا ہے......!"

میں نے کہا۔ "تم ادھر ہی رکو۔ میں جا کر اس سے بات کرتا ہوں۔ کیا وہ باہر دروازے پر ہے......؟"

"نہیں...... میں نے اسے اندر ڈرائنگ روم میں بٹھایا ہے۔"

"میں تو کہتا ہوں، اس شیطان کو تم نے ہی سر چڑھایا ہے۔" میں نے اٹھ کر کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ "ایسے لوگوں کو گھر کے اندر گھسانے کی کیا ضرورت ہے۔"

"اب تو میں نے اسے اندر بلا لیا ہے......"

"کوئی بات نہیں، اگر ڈرائنگ روم میں بٹھا ہی دیا ہے تو میں اسے سمجھانے کی کوشش کرتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "اگر وہ انسان کی اولاد ہوا تو بات اس کی عقل میں آجائے گی۔"

میرے منع کرنے کے باوجود بھی نگینہ بیگم نہیں مانی اور اس بات پر مصر رہی کہ رفیق شاہ خاصا غصے میں ہے۔ میں خود ہی اسے جا کر ٹھنڈا کرتی ہوں۔ مجھے نگینہ کے اس رویے پر بہت افسوس ہوا۔ میں اس عورت کو سود خور رفیق شاہ کے چنگل سے آزاد کرانے کی کوشش کر رہا تھا اور وہ اس معاملے میں مجھے نظر انداز کر کے رفیق شاہ کی خوشامد کرنے چلی گئی تھی۔ میرا موڈ خراب ہو گیا تھا لہٰذا میں نے فوراً وہاں سے جانے کا فیصلہ کر لیا۔ میں نے ابھی صحن عبور کیا ہی تھا کہ یکے بعد دیگرے دو گولیاں چلنے کی آواز ابھری۔ اس اچانک فائرنگ نے مجھے چونکا دیا کیونکہ فائرنگ کی آواز گھر کے اندر یا بیرونی حصے سے آتی سنائی دی تھی۔ میں یہ دیکھنے کے لیے باہر کی طرف لپکا کہ کہیں اس سود خور شیطان نے نگینہ بیگم ہی کا کام تمام تو نہیں کر دیا......" وہ لمحے بھر کے لیے

متوقف ہوا پھر ایک گہری سانس لیتے ہوئے بولا۔

''گھر کے صحن سے ڈرائنگ روم تک جانے کے لیے دو راستے ہیں۔ ایک تو ڈرائنگ روم کا صحن میں کھلنے والا دروازہ ہے جو اندر سے بند تھا۔ دوسرا راستہ اختیار کرنے کے لیے ایک بیڈروم میں سے گزرنا پڑتا ہے۔ یہ نگینہ بیگم کا بیڈروم ہے۔ میں اسی راستے کی جانب لپکا اور میں نے جیسے ہی مذکورہ بیڈروم میں قدم رکھا، سامنے سے نگینہ بیگم آتی دکھائی دی۔ وہ ڈرائنگ روم کے اندرونی دروازے سے نکل کر بیڈروم میں داخل ہوئی تھی۔ وہ بے حد حواس باختہ اور گھبرائی ہوئی لگ رہی تھی۔ میں نے اضطراری لہجے میں پوچھا۔

''کیا ہوا...... یہ فائرنگ کی آواز کیسی تھی......؟''

''کک...... کسی نے...... رفیق شاہ کو قتل کر دیا ہے......'' وہ بکھرے ہوئے لہجے میں بولی۔

''کس نے......؟'' بے ساختہ میری زبان سے نکلا۔

''مم...... مجھے نہیں پتا......'' وہ لرزتی ہوئی آواز میں بولی۔ ''اس کی لاش ادھر ڈرائنگ روم میں پڑی ہے......''

میں نگینہ کے بیڈروم میں کھلنے والے ڈرائنگ روم کے دروازے تک پہنچا اور ڈرائنگ روم کے اندر نگاہ دوڑائی۔ رفیق شاہ خون میں لت پت ایک صوفے پر پڑا تھا۔ وہ بیٹھے بیٹھے ایک طرف لڑھک گیا تھا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ میں رفیق شاہ کی لاش کا ہیبت ناک منظر دیکھ کر پریشان ہو گیا تھا اور فوری طور پر میرے ذہن میں یہی آیا کہ مجھے وہاں سے رفوچکر ہو جانا چاہیے۔ اس موقع پر نگینہ بیگم نے بھی مجھے یہی مشورہ دیا کہ میں فوراً منظر سے ہٹ جاؤں لیکن...... اب احساس ہو رہا ہے کہ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ بدحواسی میں کیے گئے اس فیصلے نے مجھے اس کیس میں پھنسا دیا ہے۔''

''آپ کے ذہن میں یہ خیال کیوں آیا کہ آپ کو جائے وقوعہ سے رفوچکر ہو جانا چاہیے؟'' ملزم کے خاموش ہونے پر میں نے سوال کیا۔ ''اور اب آپ کو اپنی غلطی کا احساس کس حوالے سے ہو رہا ہے......؟''

''غلطی کا احساس اس حوالے سے کہ جب میں افراتفری کے عالم میں نگینہ بیگم کے گھر سے نکلا اور اپنی گاڑی میں بیٹھ کر وہاں سے رخصت ہوا تو چند لوگوں نے مجھے دیکھ لیا تھا۔ اس سے پہلے انہوں نے نگینہ بیگم کے گھر کے اندر فائرنگ کی آواز بھی سنی تھی لہٰذا میری پوزیشن اس کیس کی مناسبت سے خاصی کمزور اور مشکوک ہو گئی۔'' وہ میرے سوال کے جواب میں وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''اور جہاں تک فوری طور پر جائے وقوعہ سے میرے رفوچکر ہونے کا تعلق ہے تو...... مجھے خدشہ تھا کہ رفیق شاہ کے قتل کا شبہ مجھ پر کیا جائے گا۔''

''آپ کو یہ خدشہ کس بنیاد پر تھا......؟'' میں نے پوچھا۔

''مقتول اکثر و بیشتر میرے خلاف الٹی سیدھی باتیں کرتا رہتا تھا۔''

''مثلاً کون سی الٹی سیدھی باتیں؟''

''یہی کہ میں نے اسے کئی بار قتل کی دھمکی دی ہے......''

''تو کیا یہ حقیقت نہیں ہے؟''

''ہرگز نہیں۔'' وہ پوری قطعیت سے بولا۔

میں نے سوال کیا۔ ''پھر حقیقت کیا ہے؟''

''میں نے دوچار بار نرمی سے اور ایک آدھ بار سختی سے رفیق شاہ کو سمجھانے کی کوشش کی تھی۔'' اعجاز حسین نے جواب دیا۔ ''میرے اسی سمجھانے کو وہ ''قتل کی دھمکی'' سے تعبیر کرتا رہا ہے۔''

''آپ مقتول کو کیا سمجھانے کی کوشش کر رہے تھے؟'' میں نے کریدنے والے انداز میں پوچھا۔

''یہی کہ وہ نگینہ بیگم کے ساتھ کوئی سیٹلمنٹ کر لے۔''

''کس قسم کا سیٹلمنٹ؟''

''نگینہ بیگم نے دو سال پہلے مقتول سے پچاس ہزار روپے قرض لیے تھے۔ گھر کی خریداری میں کچھ رقم کم پڑ رہی تھی جو اس نے قرضے کی صورت میں لے لی۔'' اعجاز حسین وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''مقررہ وقت میں نگینہ بیگم جب قرض کی رقم واپس نہ کر سکی تو رفیق شاہ نے سود در سود شامل کر کے اس رقم کو دو لاکھ تک پہنچا دیا۔ ظاہر ہے، نگینہ بیگم اتنی بڑی رقم کیسے ادا کر سکتی تھی۔ میں اسی سلسلے میں ان دونوں کے بیچ کوئی سیٹلمنٹ کرانا چاہتا تھا۔ میں نے مقتول کو یہ سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ وہ قرض کی رقم کو ایک لاکھ فکس کر لے اور ماہانہ قسط باندھ کر وصول کرتا رہے۔ اسی طرح اس کا نقصان بھی نہیں ہوگا اور نگینہ بیگم کو بھی آسانی رہے گی لیکن رفیق شاہ نے میری تجویز ماننے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ وہ ایک ہی نقطے پر اٹکا ہوا تھا کہ سود ڈیڑھ لاکھ پہلے اور اصل پچاس ہزار بعد میں۔ نہ ایک پیسا کم اور نہ ایک پیسا زیادہ...... اور اگر فکس ہی کرنا ہے تو دو لاکھ کا اماؤنٹ کرو...... اور اس کی قسطیں اس طرح باندھو کہ ایک سال کے اندر اندر اس کا قرض ادا ہو جائے۔ میرے خیال میں یہ نگینہ بیگم کے بس میں نہیں تھا۔''

"اس سارے واقعے سے لگتا ہے کہ آپ کے دل میں نگینہ بیگم کے لیے بہت زیادہ ہمدردی چھپی ہوئی ہے۔" میں نے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔ "اس کا کوئی خاص سبب؟"

"سبب بس اتنا سا ہے کہ......" وہ گمبھیر انداز میں بولا۔ "نگینہ بیگم میرے ایک پرانے واقف کار وہاب دین کی بیوہ ہیں۔ وہاب نے کسی زمانے میں میرے ساتھ بہت اچھا سلوک کیا تھا۔ بس، یہی خیال ذہن میں رہتا تھا اور میں چند روز بعد ان ماں بیٹی کو دیکھنے چلا جاتا تھا اور جس حد تک ممکن ہوتا، میں ان کی مدد بھی کر دیا کرتا تھا۔"

"اور اب......" میں نے ڈرامائی لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا۔ "استغاثہ کے گواہوں کی فہرست میں ان ماں بیٹی کا نام دیکھ کر آپ کو کیسا محسوس ہو رہا ہے......؟"

اعجاز حسین کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ پھیل گئی۔

میں نے استفسار کیا۔ "آپ کو یہ تو علم ہے نا...... کہ کسی کیس کے ملزم اور استغاثہ کے درمیان کس نوعیت کا رشتہ ہوتا ہے؟"

"بڑی اچھی طرح معلوم ہے۔" اس نے اثبات میں گردن ہلائی اور اس کے ہونٹوں پر موجود معنی خیز مسکراہٹ اور گہری ہو گئی۔ ایک بوجھل سانس خارج کرتے ہوئے اس نے اضافہ کیا۔ "میں نے اس ماں بیٹی کے ساتھ جو سلوک کیا وہ میرا ظرف تھا، وہ جو کچھ کریں گی، یہ ان کا ظرف ہوگا۔"

"او کے......!" میں نے زاویۂ سوالات کو تبدیل کرتے ہوئے پوچھا۔ "وقوعہ کی رات نگینہ بیگم کے گھر میں کل کتنے افراد موجود تھے؟"

"میں اور نگینہ بیگم صحن میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے؟" اس نے بتایا۔ "فوزیہ اپنے کمرے کے اندر موجود تھی اور رفیق شاہ، نگینہ سے ملنے آیا تھا اور...... پھر چند منٹ کے اندر ہی مارا گیا۔"

"آپ کے خیال میں رفیق شاہ کو کس نے قتل کیا ہوگا؟"

"میں اس سلسلے میں کوئی بھی اندازہ قائم کرنے سے قاصر ہوں۔"

"آپ اپنا ریوالور عموماً کہاں رکھتے ہیں؟" میں نے جرح کے سلسلے کو سمیٹتے ہوئے اپنے موکل اور اس کیس کے ملزم سے سوال کیا۔

"گاڑی کے ڈیش بورڈ میں۔" اعجاز حسین نے جواب دیا۔

"وقوعہ کی رات جب آپ نگینہ بیگم سے ملنے آئے تو کیا اس وقت بھی آپ کا ریوالور ڈیش بورڈ کے اندر ہی ہوا تھا؟"

اس نے اثبات میں جواب دیا۔

میں نے پوچھا۔ "کیا آپ اپنی گاڑی کو لاک کر کے نگینہ بیگم کے گھر کے اندر گئے تھے؟"

"جی ہاں...... مجھے اچھی طرح یاد ہے۔" اس نے پورے وثوق سے جواب دیا۔ "میں گاڑی کو لاک کر کے اندر گیا تھا۔"

"اور جب وہاں سے آپ افراتفری کے عالم میں روانہ ہوئے تو کیا آپ کو اپنی گاڑی لاک ہی ملی تھی......؟"

اس سوال پر اعجاز حسین نے چونک کر میری طرف دیکھا پھر ہونٹ بھینچتے ہوئے بولا۔ "میرا خیال ہے، اس وقت گاڑی لاک نہیں تھی......"

"صرف خیال ہے یا آپ کو اس بات کا یقین ہے؟"

"یقین ہے!" وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

میں نے جرح کا سلسلہ ختم کر دیا۔

وکیل استغاثہ نے جج سے درخواست کی کہ گواہوں کے بیانات کا سلسلہ شروع کیا جائے۔ استغاثہ کی طرف سے کم و بیش دس گواہوں کی فہرست عدالت میں دائر کی گئی تھی لیکن میں یہاں پر انہی گواہوں اور ان کے بیانات کا ذکر کروں گا جو کسی حوالے سے اہمیت کے حامل ہوں گے۔

اس سے پہلے کہ استغاثہ کے گواہوں کے بیانات کا آغاز ہوتا، میں نے جج سے استدعا کی۔

"جناب عالی! میں انکوائری آفیسر سے چند سوالات کرنا چاہتا ہوں۔"

کسی بھی کیس کا تفتیشی افسر یعنی انکوائری آفیسر پیشی پر عدالت میں حاضر رہتا ہے اور اس کی حیثیت استغاثہ کے گواہ ایسی ہوتی ہے۔ جج کے اشارے پر آئی۔ او وٹنس باکس میں آ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ عہدے کے اعتبار سے سب انسپکٹر تھا۔

"آئی او صاحب!" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے جرح کا آغاز کیا۔ "پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق مقتول کو دو گولیاں لگی تھیں۔ ایک گردن پر اور دوسری کنپٹی سے تھوڑا اوپر کھوپڑی میں...... کیا آپ اس رپورٹ سے اتفاق کرتے ہیں؟"

"سو فیصد......!" وہ بڑے اعتماد سے بولا۔

"اور انہی گولیوں کی وجہ سے مقتول رفیق شاہ ہلاک ہوا تھا؟"

"جی...... بالکل!"

"سر والی گولی نے کھوپڑی کے پرخچے اڑا دیے تھے اور......" میں نے سنسناتے ہوئے انداز میں کہا۔ "اور دوسری گردن میں دھنس گئی تھی۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا......؟"

"نہیں جناب...... آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" اس نے تائیدی انداز میں جواب دیا۔

"اور یہ کہ...... دونوں گولیاں مقتول کے جسم کے بائیں حصے میں لگی تھیں...... یعنی بائیں کنپٹی کے اوپر اور گردن کے بائیں جانب......!" میں نے بہ دستور آئی او کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "آپ نے جائے وقوعہ پر مقتول کی لاش کا تفصیلی معائنہ کیا ہوگا۔ اگر میں کچھ بھول رہا ہوں تو مجھے ٹوک دیجیے گا۔"

"آپ بالکل درست فرما رہے ہیں۔" اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔

"آپ نے یقیناً جائے وقوعہ کا نقشہ بھی تیار کیا ہوگا......!" میں نے استفسار کیا۔ "اور آپ کو ڈرائنگ روم کی ایک ایک چیز، ایک ایک زاویے کا بہ خوبی علم ہوگا؟"

"جی ہاں...... یقیناً!" وہ پورے یقین سے بولا۔

"مجھے اور کچھ نہیں پوچھنا جناب عالی!" میں نے اپنی جرح ختم کر دی۔

اس کے ساتھ ہی عدالت کا مقررہ وقت ختم ہو گیا۔ جج نے ایک ہفتہ بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کر دی۔

☼☼☼

آئندہ پیشی پر استغاثہ کے گواہوں کے بیانات کا سلسلہ شروع ہوا جیسا کہ میں پیچھے بتا چکا ہوں، استغاثہ کی جانب سے لگ بھگ درجن بھر گواہوں کی فہرست داخل کی گئی تھی مگر یہاں پر نہایت ہی اہم گواہوں کا احوال بیان کیا جائے گا۔

سب سے پہلے عنایت اللہ نامی ایک شخص گواہی کے لیے پیش ہوا۔ عنایت اللہ ملزم اعجاز حسین کا پڑوسی تھا۔ وہ اپنا حلفیہ بیان ریکارڈ کرا چکا تو وکیل استغاثہ جرح کے لیے کٹہرے کے پاس چلا گیا۔

"عنایت اللہ صاحب!" وکیل استغاثہ گواہ کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔ "جب ملزم کو گرفتار کیا گیا اس وقت آپ موقع پر موجود تھے؟"

"جی ہاں، موجود تھا۔" اس نے اثبات میں جواب دیا۔ "میں شور کی آواز سن کر گھر سے باہر نکلا تھا پھر پتا چلا کہ میرے پڑوسی اعجاز حسین نے کسی کو قتل کر دیا ہے اور پولیس اسے پکڑنے آئی ہے۔"

وکیل استغاثہ سائڈ میں رکھی چوبی میز کی طرف گیا اور وہاں سے سیلوفین بیگ کے اندر رکھے ہوئے آلۂ قتل کو اٹھا لایا۔ آلۂ قتل اور دیگر ضروری اشیا سیلوفین بیگز میں محفوظ کر لی جاتی ہیں اور انہیں عدالت کے کمرے ہی میں رکھنا لازمی ہوتا ہے۔

وکیل استغاثہ نے مذکورہ بیگ استغاثہ کے گواہ کو دکھاتے ہوئے کہا۔ "یہ وہ ریوالور ہے جس سے فائرنگ کر کے مقتول رفیق شاہ کو موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ یہ ریوالور ملزم کی ملکیت ہے۔ آپ اس ریوالور کے بارے میں کیا جانتے ہیں......؟"

"میں اس ریوالور کے حوالے سے صرف اتنا جانتا ہوں کہ پولیس نے یہ ریوالور میری نظر کے سامنے اعجاز صاحب کی گاڑی میں سے برآمد کیا تھا۔" گواہ نے جواب دیا۔

"اس وقت ملزم کی گاڑی کہاں کھڑی تھی؟"

"اس کے گھر کے اندر۔"

"ریوالور گاڑی کے کس حصے سے برآمد کیا گیا تھا؟"

"ڈیش بورڈ میں سے......!"

وکیل استغاثہ نے پوچھا۔ "کیا پولیس نے آپ کے سامنے ریوالور کو چیک کیا تھا؟"

"جی ہاں......" وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "اس وقت میرے علاوہ بھی چند افراد وہاں موجود تھے۔ ہم سب کے سامنے ہی پولیس کے افسر نے ریوالور چیک کیا تھا۔"

"اس چیکنگ کا نتیجہ کیا نکلا تھا؟"

"اس کی چیکنگ سے پتا چلا تھا......" وہ آلۂ قتل کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "کہ اس میں سے دو گولیاں فائر کی گئی ہیں......"

وکیل استغاثہ نے مزید ایک دو سوالات کرنے کے بعد جرح ختم کر دی تو میں جج کی اجازت حاصل کر کے وٹنس باکس کے قریب پہنچ گیا۔ میں نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور استغاثہ کے گواہ عنایت اللہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

"عنایت اللہ! آپ کو ملزم کے پڑوس میں یا ملزم کو آپ کے پڑوس میں رہتے ہوئے کتنا عرصہ ہوا ہے......؟"

وہ چند لمحے سوچنے کے بعد بولا۔ "کم از کم، دس سال

تو ہو ہی گئے ہیں......!''

''ان دس سالوں میں......'' میں نے اسی کے انداز میں کہا۔ ''آپ کا کم از کم، دس بار تو ملزم سے واسطہ پڑا ہی ہوگا؟''

''دس بار کیا، دس ہزار مرتبہ پڑا ہوگا۔'' اس نے جواب دیا۔

''آپ نے ملزم کو ملتے جلتے اور دیگر معاشرتی معاملات میں کیسا پایا ہے؟'' میں نے پوچھا۔ ''آپ اس کے کردار کے بارے میں کیا کہیں گے؟''

''میں نے اعجاز حسین کو ہر معاملے میں سچا اور کھرا پایا ہے۔''

''کیا آپ کا دل گواہی دیتا ہے کہ ملزم نے کسی شخص کو موت کے گھاٹ اتار دیا ہوگا......؟'' میں نے وٹنس باکس میں کھڑے استغاثہ کے گواہ عنایت اللہ سے سوال کیا۔

''جی...... دل تو نہیں مان رہا......'' وہ ہچکچاہٹ آمیز لہجے میں بولا۔ ''مگر حالات و واقعات اسے قاتل ثابت کر رہے ہیں۔''

''حالات و واقعات ...... اسے قاتل گردان رہے ہیں۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''ابھی یہ بات ثابت نہیں ہوئی۔''

وہ خالی خالی نظروں مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے اگلا سوال کیا۔ ''عنایت اللہ صاحب! ابھی تھوڑی دیر پہلے آپ نے وکیل استغاثہ کی جرح کے جواب میں معزز عدالت کو بتایا ہے کہ پولیس نے آپ کی نگاہ کے سامنے آلۂ قتل کو ملزم کی گاڑی میں سے برآمد کر کے چیک کیا تھا اور اس میں سے دو گولیاں چلی ہوئی پائی گئی تھیں...... آپ نے کیسے یقین کر لیا کہ مذکورہ ریوالور میں سے صرف دو گولیاں ہی فائر کی گئی تھیں؟''

''اس لیے...... اس لیے کہ ریوالور کے دو چیمبرز خالی نظر آرہے تھے۔'' گواہ نے جواب دیا۔

''آپ کو معلوم ہے، ریوالور کے کتنے چیمبرز ہوتے ہیں؟''

''چھ...... میرا خیال ہے چھ چیمبرز ہوتے ہیں۔''

''اس کا مطلب ہے، آپ نے ریوالور کے چار چیمبرز بھرے ہوئے دیکھے تھے؟''

''جی ہاں۔'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''جب میرے سامنے پولیس نے ریوالور چیک کیا تو اس کے چار چیمبرز کے اندر گولیاں موجود تھیں۔''

''عنایت اللہ صاحب!'' میں نے سنسناتے ہو...
لہجے میں استفسار کیا۔ ''کیا آپ نے اس واردات سے ... ملزم کا ریوالور چیک کیا تھا...... میرا مطلب ہے، وقوعہ کی رات جب ملزم نگینہ بیگم کے گھر کی طرف جا رہا تھا تو کیا آپ کو اس کے ریوالور کے چیمبرز دیکھنے کا موقع ملا تھا......؟''

اس نے ایک لمحہ الجھن زدہ انداز میں مجھے دیکھا... جواب دیا۔ ''نہیں......!''

''اس کا مطلب ہے، آپ وثوق کے ساتھ نہیں کہہ سکتے کہ جب وقوعہ کی رات ملزم جائے واردات پر پہنچا تو ... کا ریوالور پوری طرح بھرا ہوا تھا؟'' میں نے تیز نظروں سے استغاثہ کے گواہ کو گھورا۔

''ظاہر ہے جناب، میں نے اس وقت ریوالور چیک تھوڑی کیا تھا کہ وہ خالی ہے یا بھرا ہوا۔'' وہ بے بسی کے عالم میں بولا۔ ''مجھے تو یہ بھی پتا نہیں وہ کب وہاں گیا تھا... میں اس بارے میں وثوق کے ساتھ کیسے کہہ سکتا ہوں؟''

''اس کا مطلب ہے، یہ بھی ممکن ہے کہ ریوالور کے چیمبرز میں شروع سے چار گولیاں ہی بھری ہوں......؟''

''یہ نہیں ہوسکتا جناب!'' وہ بے ساختہ بول اٹھا۔

''کیوں نہیں ہوسکتا؟'' میں نے بھی اسی بے ساختگی سے پوچھا۔

''اس لیے کہ......'' وہ سرسراتی ہوئی آواز میں بولا۔ ''ملزم نے اس موقع پر، اپنے ریوالور کے دو چیمبرز خالی دیکھ کر بڑی حیرت سے کہا تھا...... دو گولیاں کہاں چلی گئیں... اس کا واضح مطلب یہی ہے کہ اس کے ریوالور کے تمام چیمبرز بھرے ہوئے تھے۔''

''ملزم کے یہ الفاظ کہ...... دو گولیاں کہاں چلی گئیں؟...... اس امر پر دلالت کرتے ہیں کہ وہ دو گولیاں اس نے فائر نہیں کی تھیں۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''آپ اس سلسلے میں کیا کہتے ہیں؟''

''میں بھلا کیا کہہ سکتا ہوں......!''

''کیا آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ ملزم نے وہ دو گولیاں رفیق شاہ کو قتل کرنے کے لیے فائر کی تھیں؟'' میں نے خاصے جارحانہ انداز میں پوچھا۔

''یہ میں کیسے کہہ سکتا ہوں جناب!'' وہ الجھے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''جب میں نے اپنی آنکھوں سے ... کی واردات کرتے ہوئے نہیں دیکھا تو اتنی بڑی بات کیسے کہہ دوں......!''

''تو آپ نے اس کیس کے حوالے سے صرف ...

دیکھا......'' میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ''جو پولیس نے آپ کو دکھانے کی کوشش کی......''

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میں نے جرح موقوف کر دی۔

عنایت اللہ کے بعد، یکے بعد دیگرے محمد اکرم اور حفیظ خان کو گواہی کے لیے کٹہرے میں لایا گیا۔ یہ دونوں افراد بھی ملزم اعجاز حسین کی گلی ہی میں رہتے تھے اور ان کے سامنے پولیس نے نہ صرف اعجاز حسین کو ہتھکڑی لگائی تھی بلکہ اس کی گاڑی کے ڈیش بورڈ میں سے آلۂ قتل بھی برآمد کیا تھا۔ ان دونوں کے بیانات، عنایت اللہ کے بیان کا عکس تھے لہٰذا انہیں ضابطۂ تحریر میں لانے کی میں ضرورت محسوس نہیں کرتا۔

اس کے بعد مقتول رفیق شاہ کے دو قریبی دوستوں کو گواہی کے لیے پیش کیا گیا۔ وہ دونوں مقتول کے زبردست حمایتی تھے اور دونوں کے بیانات میں بیشتر چیزیں مشترک تھیں لہٰذا میں ان میں سے صرف ایک کا بیان آپ کی نذر کرتا ہوں۔ فرید احمد اور توفیق علی نامی استغاثہ کے ان گواہان میں سے فرید احمد کا بیان قدرے اہم تھا لہٰذا اسی کا احوال ملاحظہ کیجیے۔

فرید احمد کی عمر تیس اور پینتیس کے درمیان رہی ہوگی۔ وہ ایک عام سا شخص تھا۔ اپنی وضع قطع اور بول چال سے ان پڑھ معلوم ہوتا تھا۔ مجھے معلوم ہوا کہ وہ بندہ کسی فیکٹری وغیرہ میں کام کرتا تھا۔

فرید نے سچ بولنے کا حلف اٹھانے کے بعد اپنا بیان ریکارڈ کرا دیا۔ وکیل استغاثہ گھما پھرا کر دس منٹ تک گواہ سے مختلف سوالات کرتا رہا پھر اپنی باری پر میں وٹنس باکس کے قریب چلا گیا۔ میں نے گواہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اس طرح جرح کا آغاز کیا۔

''فرید صاحب! آپ مقتول کو کب سے جانتے تھے؟''

''وہ میرا پرانا دوست تھا۔'' اس نے گہری سنجیدگی سے جواب دیا۔ ''ہماری جان پہچان کو بیس سال سے زیادہ عرصہ گزر چکا ہے۔''

''ویری گڈ!'' میں نے سرسری انداز میں کہا پھر پوچھا۔ ''پتا چلا ہے، آپ کسی فیکٹری وغیرہ میں کام کرتے تھا...... آپ کے کام کی نوعیت کیا ہے؟''

''میں ایک ٹیکسٹائل مل میں کام کرتا ہوں۔'' استغاثہ کے گواہ نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ''اور کام کی نوعیت یہی ہے کہ میں کپڑا بنانے والی ایک مشین کو چلاتا ہوں......''

''اور آپ کے دوست مقتول رفیق شاہ کا کیا ذریعہ معاش تھا؟''

''شاہ جی کاروبار کرتا تھا......''

''کس قسم کا کاروبار؟''

''مختلف قسم کے کاروبار۔'' اس نے جواب دیا۔ ''زیادہ تر وہ چیزوں کی خرید و فروخت کا کام کرتا تھا۔''

''آپ مقتول کے دیرینہ دوست تھے۔'' میں نے اسے گھیرنے کی غرض سے کہا۔ ''اس کے مزاج اور عادات سے تو آپ اچھی طرح واقف ہوں گے......؟''

''جی ہاں، بڑی اچھی طرح!'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''وہ بہت ہی عمدہ انسان تھا، دوسرے انسانوں سے ہمدردی رکھنے والا۔ وہ ہر مشکل، پریشانی میں لوگوں کے کام آتا تھا۔''

''اور یہ ''کام آنا'' عموماً مال یعنی روپے کی شکل میں ہوتا تھا؟'' میں نے تیکھے لہجے میں دریافت کیا۔

''وکیل صاحب! روپیہ پیسا ایک ایسی چیز ہے کہ جس سے زندگی کے بیشتر مسائل حل ہوجاتے ہیں۔'' اس نے فلسفیانہ انداز میں جواب دیا۔ ''شاہ جی عام طور پر لوگوں کی مالی مدد ہی کیا کرتا تھا۔''

''اور یہ مالی مدد قرض کی صورت میں ہوتی تھی؟''

''ظاہر ہے، کوئی ایسے ہی تو اپنا روپیہ اٹھا کر کسی کو نہیں دے دیتا۔'' وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔

''پھر وہ اپنے پیسے کی وصولی بھی کرتا تھا...... ہیں نا؟'' میں نے پوچھا۔

وہ بولا۔ ''یہ تو اس کا حق بنتا تھا۔''

''اور یہ وصولی سود در سود ہوتی تھی؟''

''پیسے کے کاروبار میں انسان منافع تو لیتا ہی ہے۔''

''گویا مقتول لوگوں کو سود پر پیسا دینے کا کاروبار کرتا تھا؟''

اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''جی ہاں!''

''مقتول نے نگینہ بیگم کو بھی ایک بھاری رقم قرض دے رکھی تھی؟''

''جی...... پچاس ہزار روپے۔'' اس نے جواب دیا۔

''اور وہ نگینہ بیگم سے دو لاکھ وصول کرنے کا خواہاں تھا؟''

''ظاہر ہے، جب نگینہ بیگم نے وقت مقررہ پر شاہ جی کی رقم واپس نہیں کی اور دن پر دن گزرتے چلے گئے تو منافع کی رقم میں بھی اضافہ ہوتا چلا گیا تھا۔'' وہ مقتول کے حق میں

گواہی دیتے ہوئے بولا۔ ''دو سال میں پچاس ہزار کی رقم منافع کی رقم کے ساتھ مل کر دو لاکھ بن گئی تھی۔''

''منافع ...... یا سود کی رقم؟'' میں نے گواہ کو تیز نظر سے گھورا۔

''آپ کوئی بھی نام دے دیں۔'' وہ بے پروائی سے بولا۔ ''ایک ہی بات ہے۔''

''کیا یہ صحیح ہے کہ ملزم، مقتول اور نگینہ بیگم کے بیچ رقم کے لین دین کے سلسلے میں کوئی سیٹلمنٹ کرانا چاہتا تھا۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ ''اور ملزم کی یہی مثبت کوشش ملزم اور مقتول کے درمیان تنازع کا سبب بن گئی تھی؟''

''کوشش یا سازش؟'' جواب دینے کے بجائے الٹا اس نے مجھ ہی سے پوچھ لیا۔

میں نے چونک کر گواہ کی طرف دیکھا۔ ''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ......'' وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔ ''ملزم ان دونوں کے بیچ کسی مصالحت یا مفاہمت کی کوشش نہیں کر رہا تھا بلکہ اپنا الو سیدھا کرنے کے لیے اس نے ایک اسکیم تیار کی تھی۔''

''کیسا الو اور کون سی اسکیم......؟'' میں نے جھنجلاہٹ بھرے انداز میں استفسار کیا۔

''اب آپ میری زبان کھلوا ہی رہے ہیں تو سنیں!'' وہ برہمی سے بولا۔ ''یہ جو آپ کا موکل ہے نا...... یہ ڈبل گیم کھیل رہا تھا۔''

''ڈبل گیم...... کیا مطلب؟''

''ایک طرف اس نے نگینہ بیگم کو آسرا دے رکھا تھا کہ اگر وہ اس کی بات مان لے تو یہ رفیق شاہ سے اس کی جان چھڑا دے گا۔'' گواہ نے تلخ لہجے میں بتایا۔ ''اور دوسری جانب یہ رفیق شاہ کو ایک لاکھ پر آمادہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔''

''یہ بات تو میں بھی جانتا ہوں کہ میرا موکل مقتول کے ساتھ ایک لاکھ میں مک مکا کرنے کی کوششوں میں مصروف تھا اور اس رقم کی ادائیگی بھی آسان قسطوں میں چاہتا تھا تاکہ نگینہ بیگم کے لیے کوئی دشواری پیدا نہ ہو......'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''لیکن نگینہ کو آسرا دینے اور اس سے کوئی بات منوانے کا قصہ سمجھ میں نہیں آیا؟''

''میں سمجھاتا ہوں۔'' وہ بڑے بزرگوں کے مانند بولا۔ ''دراصل، آپ کا موکل نگینہ کی بیٹی فوزیہ پر ریجھ گیا تھا۔ اس نے نگینہ سے کہا تھا کہ اگر وہ فوزیہ کی شادی اس سے کرنے پر تیار ہو جائے تو وہ رفیق شاہ کی رقم جیسے تیسے ادا کر کے اس کو نجات دلا دے گا۔ یہ ہے کل کہانی جناب......!''

''لیکن ملزم تو ایک شادی شدہ شخص ہے۔'' میں نے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔ ''اور اس کے تین بچے بھی ہیں......؟''

''کیا کسی شادی شدہ اور تین بچوں کے باپ کے لیے دوسری شادی کی ممانعت ہے؟'' اس نے بڑے عجیب سے لہجے میں سوال کیا۔ ''آپ کا قانون اس سلسلے میں کوئی قید لگاتا ہے......؟''

''قانون میں ایسا کچھ نہیں ہے۔'' میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''میں نے آپ سے یہ سوال ذاتی حیثیت میں پوچھا تھا۔ بہرحال......'' میں نے لمحاتی توقف کیا پھر جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

''فرید صاحب! ملزم اور مقتول کی باہمی چپقلش کے بارے میں آپ کیا کہیں گے؟''

''ظاہر ہے، ملزم کو نگینہ کے گھر میں، مقتول کا آنا جانا ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا۔'' وہ معنی خیز انداز میں بولا۔ ''یہ کباب میں ہڈی والی بات تھی۔''

''کباب میں ہڈی......'' میں نے چونک کر گواہ کی جانب دیکھا۔ ''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟''

''میں ٹھیک کہہ رہا ہوں وکیل صاحب!'' وہ اصراری لہجے میں بولا۔ ''ایک جانب تو ملزم فوزیہ کو حاصل کرنے کے لیے نگینہ کو اپنی مٹھی میں کرنے کی کوشش کر رہا تھا تو دوسری طرف نگینہ نے دو لاکھ کی رقم ہڑپ کرنے کے لیے رفیق شاہ کو مختلف قسم کے سبز باغ دکھا رکھے تھے۔''

''مثلاً...... کون سے سبز باغ؟'' میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔ ''آپ تو ایک پر ایک انکشاف کیے جا رہے ہیں۔''

''میرا اشارہ فوزیہ کی طرف ہے......'' وہ ذو معنی انداز میں بولا۔

''سبز باغ...... فوزیہ......!'' میں نے ڈرامائی لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا۔ ''کہیں آپ کا یہ مطلب تو نہیں کہ مقتول رفیق شاہ نگینہ کی بیٹی فوزیہ میں دلچسپی رکھتا تھا اور نگینہ نے مقتول کو اس حوالے سے کوئی امید دلا رکھی تھی......؟''

''جی ہاں...... میرا بالکل یہی مطلب ہے۔'' وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔

''اگر ایسی بات تھی تو پھر مقتول اور ملزم کے درمیان

...کوئی سوال نہیں اٹھتا تھا۔'' میں نے سوچ میں ڈوبے ...لہجے میں کہا۔ ''نگینہ بیگم ملزم کو صورت حال سے آگاہ ...اور وہ اپنا راستہ بدل لیتا...... نہ کباب رہتا اور نہ ہی ...کے اندر ہڈی......؟''

...اتنا آسان نہیں تھا۔'' وہ پرخیال انداز میں بولا۔

''اس میں مشکل کیا تھی؟'' میں نے پوچھ لیا۔

''یہ بات تو طے ہے اور مقتول نے مجھے اس حوالے ...کئی بار بتایا تھا کہ نگینہ بیگم فوزیہ اور مقتول کے ملاپ کے ...لیے راضی تھی اور اس کام کے لیے اس نے مقتول سے مزید ...لاکھ کا مطالبہ بھی کیا تھا لیکن......'' وہ لمحاتی توقف کے بعد ...ذکر کرتے ہوئے بولا۔

''لیکن سارا مسئلہ تو فوزیہ کا تھا۔''

''فوزیہ کا کیا مسئلہ تھا؟''

''فوزیہ، رفیق شاہ کو پسند نہیں کرتی تھی......''

''اوہ......!'' میں نے مصنوعی تفکر کی اداکاری کی ...حالانکہ فوزیہ کی زبانی یہ سچائی پہلے ہی مجھ تک پہنچ چکی تھی۔ ...تو...... اس کا مطلب ہے......'' میں نے سرسراتی ہوئی ...آواز میں کہا۔ ''فوزیہ، ملزم میں دلچسپی رکھتی تھی......؟''

''میں اس بارے میں وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔'' ...دوسری لہجے میں بولا۔ ''البتہ، یہ حقیقت ہے کہ ملزم بری ...طرح فوزیہ پر فریفتہ تھا اور وہ اس حقیقت سے بھی واقف تھا ...کہ مقتول کا ٹارگٹ بھی فوزیہ ہی ہے لہٰذا وہ مقتول سے سخت ...کھانے لگا تھا۔ مقتول کا نگینہ کے گھر آنا اسے بڑا ناگوار ...گزرتا تھا اور اسی لیے ملزم نے مقتول کو دو تین مرتبہ یہ دھمکی ...دی تھی کہ وہ نگینہ کے گھر آنا جانا چھوڑ دے ورنہ اسے ...نقصان اٹھانا پڑے گا اور پھر ملزم کا کہا ہوا حرف بہ حرف سچ ...ثابت ہوا...... وہ میرے دوست رفیق شاہ کی جان لے کر ...رہا......!'' افسوس ناک انداز میں گردن ہلاتے ہوئے ...اس نے بات ختم کر دی۔

میں نے پوچھا۔ ''کیا ملزم نے آپ کے سامنے ...مقتول کو سنگین نتائج کی دھمکی دی تھی؟''

''نہیں......!'' گواہ نے جواب دیا۔ ''مجھے رفیق شاہ ...نے اس واقعے کے بارے میں بتایا تھا۔''

''رفیق شاہ اب اس دنیا میں باقی نہیں رہا جو آپ ...کے بیان کی تصدیق کے لیے اس سے پوچھا جائے۔'' میں ...نے گواہ کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔ ...''بہرحال...... آپ نے نگینہ اور فوزیہ کے حوالے سے جو ...انکشافات کیے ہیں ان کے لیے بہت شکریہ۔ ان

دونوں کا نام استغاثہ کے گواہوں کی فہرست میں شامل ہے۔ ان کی باری پر میں یہ تمام ترسنسنی خیز سوالات ان ماں بیٹی سے ضرور پوچھوں گا......"

وہ یک ٹک مجھے دیکھتا چلا گیا۔

عدالت کا مقررہ وقت ختم ہونے میں چند منٹ باقی رہ گئے تھے۔ اس قلیل مدت میں کسی اور گواہ کو بھگتنا ممکن نہیں تھا لہٰذا جج نے تاریخ دے کر عدالت برخاست کرنے کا اعلان کر دیا۔

"دی کورٹ از ایڈجارنڈ......!"

ⒸⒸⒸ

اگلی پیشی پر نگینہ کا ایک پڑوسی ظفر علی گواہی دینے کے لیے عدالت میں حاضر ہوا۔ وہ اپنا حلفیہ بیان ریکارڈ کرا چکا تو وکیل استغاثہ اسے مختلف طریقوں سے گھس کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کرنے لگا کہ رفیق شاہ کا قتل کرنے کے بعد ملزم بڑے افراتفری کے عالم میں، جائے وقوعہ سے فرار ہوا تھا۔ ظفر علی نے نہ صرف یہ کہ نگینہ بیگم کے گھر کے اندر فائرنگ کی آواز سنی تھی بلکہ اس نے ملزم کو وہاں سے اپنی گاڑی میں بیٹھ کر فرار ہوتے ہوئے بھی دیکھا تھا۔

وکیل استغاثہ نے ظفر علی کی جاں بخشی تو میں بری طرح اس سے لپٹ گیا۔ ظفر علی کی عمر چالیس سے متجاوز تھی۔ وہ سانولے رنگ کا ایک دراز قامت شخص تھا۔ اس کے سر کے بال بڑی تیزی سے رخصت ہو رہے تھے۔ میری معلومات کے مطابق وہ کسی سرکاری محکمے میں ملازمت کرتا تھا۔

"ظفر صاحب!" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اپنے مخصوص انداز میں جرح کا آغاز کیا۔ "آج کل آپ کون سا ٹانک استعمال کر رہے ہیں؟"

وہ میرے اس عجیب وغریب سوال پر چونکا اور پوچھ بیٹھا۔ "جی، ٹانک...... میں سمجھا نہیں......؟"

"میرا مطلب ہے ہیئر ٹانک!" میں نے وضاحت کرنے والے انداز میں کہا۔ "آپ کے بالوں کا معاملہ خاصا مشکوک اور مخدوش نظر آرہا ہے۔"

"اوہ...... تو آپ کا اشارہ اس جانب تھا۔" وہ اپنے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا پھر کہا۔ "جاتی ہوئی بہار کا غم کیا کریں......"

"ٹھیک ہے، ہم فی الحال غم اور ماتم کو پیچھے چھوڑ کر اس کیس پر توجہ دیتے ہیں۔" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا پھر پوچھا۔ "کیا یہ بات درست ہے کہ آپ نے وقوعہ کی رات نگینہ بیگم کے گھر میں فائرنگ کی آواز سنی تھی؟"

"جی ہاں...... اس میں کسی شک وشبے [...] نہیں۔"

"آپ اس وقت کہاں تھے؟"

"میں اپنے گھر سے باہر نکل رہا تھا۔" [...]

"مجھے قریبی جنرل اسٹور سے کوئی سودا لانا تھا۔"

"آپ کا گھر...... جائے وقوعہ یعنی نگینہ [...] سے کتنے فاصلے پر واقع ہے؟" میں نے استفسار کیا۔

"بس، ایک دو مکان کے فرق سے ہمارے [...] سامنے ہیں۔"

"تو جب آپ اپنے گھر سے باہر نکل کر جنرل [...] کی طرف جانے کا ارادہ کر رہے تھے تو آپ نے [...] کے گھر کے اندر فائرنگ کی آواز سنی......" میں نے [...] آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا پھر پوچھا۔ "ذرا [...] بتائیں، فائرنگ کی آواز کتنے بجے سنائی دی تھی؟"

"میرا خیال ہے، اس وقت رات کے سوا [...] تھے۔" اس نے جواب دیا۔ "میں نو بجے والے خبر[...] ہیڈ لائنز دیکھنے کے بعد ہی گھر سے نکلا تھا۔"

"فائرنگ کی آواز سننے کے بعد آپ نے [...]" میں نے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ [...] "مطلب ہے، اس فائرنگ پر آپ کا ردعمل کیا تھا۔"

"ردعمل...... میں گھبرا گیا تھا۔" اس نے جو[اب میں] بتایا۔ "اور اپنے گھر کے دروازے پر رک کر نگینہ بیگم [کے گھر] کی طرف دیکھنے لگا تھا۔"

"ظفر صاحب! آپ نے وکیل استغاثہ [کے] سوال کے جواب میں بتایا ہے کہ اس فائرنگ کے فوراً [بعد آپ] نے ملزم کو نگینہ بیگم کے گھر سے نکلتے دیکھا تھا۔" میں [نے پوچھا۔] "آپ کو ملزم کے ہاتھ میں کوئی شے بھی دکھائی دی تھی؟"

"جی ہاں...... میں نے یہی بیان دیا ہے۔"

"کیا آپ ملزم کو شکل سے پہچانتے تھے؟"

"جی پہچانتا تھا۔" اس نے اثبات میں گردن [ہلائی] پھر کٹہرے میں کھڑے میرے موکل اعجاز حسین کی [طرف] اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "یہ شخص اکثر نگینہ بیگم کے [گھر آتا] جاتا رہتا تھا۔ اس کی کریم کلر مزدا کار نگینہ کے [گھر کے سامنے] میں نے کئی بار کھڑی دیکھی ہے۔"

"ٹھیک ہے...... تو آپ ملزم اور اس کی گاڑی [کو اچھی] طرح پہچانتے تھے۔" میں نے سلسلۂ سوالات [آگے] بڑھاتے ہوئے کہا۔ "لہٰذا جب وقوعہ کی رات [ملزم] نے افراتفری کے عالم میں، نگینہ بیگم کے گھر سے [نکل کر]

[گا]ڑی کی جانب بڑھتے دیکھا تو آپ کو اس کی شناخت میں کسی [دق]ت کا سامنا نہیں کرنا پڑا......؟"

"آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" اس نے تائیدی [انداز میں] کہا۔ "مجھے واقعی ملزم کو پہچاننے میں کوئی مشکل پیش [نہیں] آئی تھی۔"

"اور آپ کو اس وقت ملزم کے ہاتھ میں جو شے نظر آئی تھی، اس کے بارے میں کیا کہیں گے؟"

"میں پہلے تو یہی سمجھا تھا کہ وہ کوئی پائپ کا ٹکڑا ہے۔" اس نے جواب دیا۔ "مگر بعد میں خیال آیا کہ وہ [ریو]الور ہو سکتا ہے۔"

"بعد میں خیال آیا...... بعد میں کب؟"

"نگینہ بیگم کو دیکھ کر......"

"نگینہ بیگم کو دیکھ کر...... کیا مطلب؟"

"میرا مطلب ہے......" وہ وضاحت کرتے ہوئے [بو]لا۔ "جب ملزم بھاگتے ہوئے نگینہ بیگم کے گھر سے نکلا تو [اس] کے ایک ہاتھ میں، میں نے ایک سیاہ سی دھاتی چیز دیکھی [تھ]ی۔ یہ شخص اپنی گاڑی میں بیٹھ کر آناً فاناً میں وہاں سے روانہ ہو گیا تو میں حقیقت حال جاننے کے لیے نگینہ بیگم کے گھر کی جانب بڑھا۔ میں جیسے ہی نگینہ بیگم کے دروازے کے قریب پہنچا، وہ مجھے نظر آگئی۔ وہ بے حد گھبرائی ہوئی تھی۔ میں نے پوچھا۔

"کیا ہوا...... ابھی میں نے آپ کے گھر اندر فائرنگ کی آواز سنی تھی؟"

"اندر کسی نے رفیق شاہ کو قتل کر دیا ہے......" نگینہ بیگم نے روہانسی آواز میں بتایا۔

میں رفیق شاہ کو بھی اچھی طرح جانتا تھا۔ میں نے نگینہ بیگم سے پوچھا۔ "رفیق شاہ کو کس نے قتل کیا ہے؟"

"کچھ سمجھ میں نہیں آرہا......" وہ لرزتی ہوئی آواز میں بولی۔

"ابھی آپ کے گھر سے وہ بندہ دوڑتا ہوا نکلا تھا جو کریم کلر کی مزدا کار میں آپ سے ملنے آتا ہے۔ میں اس کا نام نہیں جانتا......"

"آپ اعجاز حسین کی بات کر رہے ہیں۔" نگینہ بیگم نے کہا۔ "میں بھی اعجاز ہی کو دیکھنے کے لیے دروازے تک آئی تھی۔ اعجاز اور رفیق شاہ دونوں گھر میں موجود تھے۔ پھر فائرنگ کی آواز ابھری۔ میں بھاگتی ہوئی ڈرائنگ روم میں پہنچی۔ وہاں رفیق شاہ کی لاش پڑی تھی اور اعجاز مجھے کہیں نظر نہیں آرہا تھا اسی لیے میں اسے دیکھنے باہر کی طرف لپکی تھی۔"

ثبوت

ایک فقیر نے قریب سے گزرتے ایک شخص کو دیکھ کر صدا لگائی۔

"اندھے فقیر کو ایک روپیہ دیتا جا۔"

اس شخص نے ایک نظر فقیر کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "روپیہ تو میں دے دوں مگر اس کا کیا ثبوت ہے کہ تم واقعی اندھے ہو۔"

فقیر نے ایک درخت کی طرف انگلی کرتے ہوئے کہا۔ "وہ سامنے آم کا درخت تمہیں نظر آرہا ہے۔"

"ہاں نظر آرہا ہے؟" اس شخص نے جواب دیا۔

"تو اس سے بڑا کیا ثبوت دوں وہ مجھے نظر نہیں آرہا۔" فقیر نے بے بسی سے جواب دیا۔

مرسلہ: محمد نعمان، کراچی

میں نے نگینہ بیگم سے کہا۔ "آپ نے جس شخص کا نام اعجاز حسین بتایا ہے نا، وہ اپنی گاڑی میں بیٹھ کر یہاں سے فرار ہو گیا ہے اور میں نے اس کے ہاتھ میں کوئی سیاہ رنگ کی چیز بھی دیکھی ہے......"

نگینہ بیگم نے چونک کر مجھے دیکھا اور تشویش ناک لہجے میں بولی۔ "اعجاز کے ہاتھ میں کہیں کوئی پستول وغیرہ تو نہیں تھا......"

جب ہی مجھے بھی خیال آیا کہ میں جس شے کو پائپ کا ٹکڑا سمجھ رہا تھا وہ کوئی گن بھی ہو سکتی تھی۔ یہ ہے سارا ماجرا جناب......!"

"ہوں......!" میں نے گمبھیر انداز میں کہا۔ "پھر کیا آپ نے نگینہ بیگم کے گھر کے اندر جا کر دیکھا تھا کہ وہاں کی صورت حال کیا ہے؟"

"جی ہاں...... نگینہ بیگم مجھے اپنے ساتھ اندر لے گئی تھی۔"

"اندر جا کر آپ نے کیا دیکھا؟"

"میں نگینہ کے ساتھ ڈرائنگ روم میں پہنچا۔" گواہ نے بتایا۔ "اور وہاں ایک صوفے پر رفیق شاہ کی لاش پڑی دیکھی۔"

"لاش پڑی دیکھی......!" میں نے اسی کے الفاظ دہرائے۔ "کیا رفیق شاہ کو دیکھتے ہی آپ کو اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ اس دار فانی سے کوچ کر چکا ہے؟"

"جی ہاں، اس کی حالت اس بات کا منہ بولتا ثبوت تھی۔"

"کیا حالت......؟" میں نے کریدا۔

"مطلب یہ کہ رفیق شاہ کی کھوپڑی پاش پاش نظر

آرہی تھی۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔'' اس کے جسم کا بالائی حصہ خون میں تربہ تر دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے اس کی ایسی کیفیت سے یہی اندازہ قائم کیا کہ رفیق شاہ زندگی کی قید سے آزاد ہوچکا ہے۔''

''ظفر صاحب! آپ کی یادداشت کیسی ہے؟''

میں نے اچانک ایک مختلف سوال کیا تو وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔'' یادداشت تو میری بہت اچھی ہے وکیل صاحب!''

''ویری گڈ!'' میں نے ستائشی نظر سے اس کی طرف دیکھا اور کہا۔'' ذرا سوچ کر بتائیں، جب آپ نے نگینہ بیگم کے گھر میں فائرنگ کی آواز سنی تو اس کے بعد بھی اندر کسی نوعیت کی آواز ابھری تھی......''

لمحاتی سوچ بچار کے بعد اس نے بڑے وثوق سے جواب دیا۔'' نہیں جناب......!''

''کیا واقعی؟'' میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

''جی ہاں...... میں بھلا غلط بیانی کیوں کروں گا۔''

''مجھے یقین نہیں آرہا......!'' میں نے نفی میں گردن ہلائی۔

''کیا آپ مجھے جھوٹا سمجھ رہے ہیں......؟''

''میں نے ایسی تو کوئی بات نہیں کی......!''

''پھر آپ کو کس بات کا یقین نہیں آرہا؟'' وہ مستفسر ہوا۔

''اس بات کا یقین نہیں آرہا کہ فائرنگ کی آواز کے بعد نگینہ بیگم کے گھر کے اندر کسی قسم کی آواز نہ ابھری ہو......'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''تو آپ کے خیال میں فائرنگ کے بعد نگینہ بیگم کے گھر کے اندر کس قسم کی آواز ابھرنا چاہیے تھی؟'' اس نے بالآخر مجھ ہی سے پوچھ لیا۔

میں نے نہایت ہی سادہ الفاظ میں وضاحت کردی۔

''اس گھر کے اندر دو لیڈیز بھی موجود تھیں نگینہ بیگم اور فوزیہ۔'' میں نے گواہ کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔'' یہ کیسے ممکن ہے کہ گھر کے اندر فائرنگ ہو اور اس پر عورتیں چیخیں نہیں۔ جب آپ نے فائرنگ کی آواز سنی، اس کے فوراً بعد آپ کو ان دونوں میں سے کسی ایک کے چیخنے کی آواز تو ضرور سنائی دینا چاہیے تھی مگر ایسا کچھ نہیں ہوا تھا۔''

''واقعی...... میں نے ان کے چیخنے کی آواز بالکل نہیں سنی۔'' وہ حیرت سے آنکھیں پھیلاتے ہوئے بولا۔

''ہوتا ہے بعض اوقات انسان کو قبل از وقت اور کبھی وقت گزر جانے کے بہت بعد خیال آتا ہے۔'' میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔'' ظفر صاحب! اگر آپ نے جائے وقوعہ پر عورتوں کے چیخنے کی آواز نہیں سنی تو پریشان ضرورت نہیں۔ دیکھیں، میں بھلا آپ کے انکشاف یا پریشان ہوا ہوں......؟''

''انکشاف۔'' وہ متذبذب لہجے میں بولا۔ کون سا انکشاف کیا ہے؟''

''بھئی، یہی کہ جب ملزم نگینہ بیگم کے گھر سے اپنی گاڑی کی جانب بڑھ رہا تھا تو آپ نے اس میں سیاہ رنگت کی کوئی شے دیکھی تھی۔ پہلے آپ اسے کا کوئی ٹکڑا سمجھے۔ جب نگینہ بیگم نے آپ کو بتایا کہ اندر رفیق شاہ کا قتل ہوگیا ہے تو آپ کو خیال آیا ہاتھ میں پائپ کا ٹکڑا نہیں بلکہ کوئی آتشیں ہتھیار ریوالور تھا؟''

وہ ندامت آمیز انداز میں نگاہ چرا کر ادھر ادھر لگا۔ اس کا واضح مطلب یہی تھا کہ پائپ یا ریوالور بات اس نے پولیس کے ایما پر اپنے بیان میں شامل کی میں نے جرح کے سلسلے کو اختتام کی طرف لاتے ہوئے

''ظفر علی صاحب، آپ نگینہ بیگم کے ساتھ جب کے اندر گئے اور آپ نے ڈرائنگ روم کے ایک حصے رفیق شاہ کو مردہ حالت میں پڑے دیکھا تو کیا نگینہ فوزیہ بھی آپ کو کہیں نظر آئی؟''

''جی ہاں۔'' اس نے اثبات میں گردن ہلا بولا۔'' وہ بھی گھر کے اندر موجود تھی اور نگینہ بیگم کی حد پریشان بھی۔'' میں نے دو چار مزید سوالات کر ختم کردی۔

عدالت کے مقررہ وقت کے ختم ہونے میں ابھی گھنٹا باقی تھا، تاہم استغاثہ کا مزید کوئی گواہ سردست نہیں لہٰذا جج نے اگلی تاریخ دے کر عدالت برخاست

میں نے اپنے کاغذات پر نگاہ دوڑاتے ہوئے ''جناب عالی! میری معلومات کے مطابق، نگینہ بیگم اور بیٹی فوزیہ کے سوا استغاثہ کے باقی تمام گواہان جاچکے ہیں چنانچہ معزز عدالت سے میری پرزور کہ آئندہ پیشی پر مذکورہ دونوں گواہان کو احکامات صادر کیے جائیں تاکہ اس کیس کو جلد از جلد بنایا جاسکے۔ دیٹس آل یور آنر۔''

جج نے متعلقہ عدالتی عملے اور وکیل استغاثہ کو کی کہ اگلی پیشی پر نگینہ بیگم اور اس کی صاحب ضرور عدالت میں حاضر کیا جائے۔

⊛⊛⊛

آئندہ پیشی بڑی سنسنی خیز ثابت ہوئی تھی۔ اس لیے بھی کہ اس پیشی پر استغاثہ کے آخری دو گواہان نگینہ بیگم اور اس کی بیٹی فوزیہ کو شہادت کے لیے لایا گیا تھا بلکہ اس لیے بھی کہ اس دن کی عدالتی کارروائی نے اس کیس کو نتیجہ خیز بنا دیا تھا۔ فوزیہ اس روز پہلی مرتبہ عدالت آئی تھی۔ سب سے پہلے اسی کا بیان ہوا۔

جب فوزیہ کا بیان مکمل ہوا تو وکیل استغاثہ جرح کے لیے اس کے قریب چلا گیا۔ وہ پندرہ بیس منٹ تک مختلف زاویوں سے سوالات کرکے عدالت کو یہ باور کروانے کی کوشش میں مصروف نظر آیا کہ ملزم اعجاز حسین بہت ہی غصیلا شخص تھا اور وہ مقتول رفیق شاہ کو سخت ناپسند کرتا تھا وغیرہ وغیرہ۔

اپنی باری پر میں وٹنس باکس کے قریب پہنچا اور گواہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔'' مس فوزیہ! میں آپ کے گھر کا مختصر سا خاکہ بیان کرتا ہوں۔ اگر میں کہیں غلطی کروں تو آپ مجھے ٹوک دیجیے گا۔''

''آپ کیوں غلطی کریں گے وکیل صاحب!'' وہ شاکی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔'' آپ تو وہاں آچکے ہیں۔''

میں اس کے شکوے کا سبب سمجھ گیا۔ وہ اس امر پر مجھ سے خفا دکھائی دیتی تھی کہ اس رات میں نے اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے موجودہ کیس میں اپنی حیثیت کو چھپا کر اسے ہلکا سا بے وقوف بنایا تھا۔ بہرحال، میں نے اس موقع پر اس کی خفگی یا شکایت کو دور کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''میں یقیناً آپ کے گھر میں آچکا ہوں گا مگر یہ عدالت ہے۔ فیصلہ اس کیس کا چونکہ عدالت نے کرنا ہے لہٰذا اس تفصیل کو دُہرانا اور آپ سے تصدیق کروانا بہت ضروری ہے۔'' وہ مختصر نظر سے مجھے دیکھتی چلی گئی۔ میں نے بولنا شروع کیا۔

''فوزیہ صاحبہ! آپ کا گھر لگ بھگ ایک سو تیس گز کے پلاٹ پر بنا ہوا ہے۔ داخلی دروازے سے اندر آئیں تو پانچ فٹ کی ایک راہداری میں قدم پڑتا ہے جس کے دائیں سرے پر ایک کامن واش روم بنا ہوا ہے۔ سامنے پہلو بہ پہلو دو دروازے نظر آتے ہیں۔ دائیں جانب آپ کی والدہ کے بیڈروم کا دروازہ ہے اور بائیں طرف ڈرائنگ روم کا دروازہ ہے۔ ڈرائنگ روم کی ایک کھڑکی بیرونی راہداری میں کھلتی ہے اور دوسری نگینہ بیگم کے بیڈروم میں۔ ڈرائنگ روم کا دوسرا دروازہ عقبی جانب صحن میں کھلتا ہے۔ کیا میں صحیح کہہ رہا ہوں؟''

''جی ہاں۔'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔

''نگینہ بیگم کے بیڈروم سے ایک دروازہ آپ کے بیڈروم میں اور دوسرا صحن میں وا ہوتا ہے۔ آپ کے بیڈروم کے اختتام پر کچن بنا ہوا ہے۔ آپ کے بیڈروم کی ایک کھڑکی اور ایک دروازہ صحن میں کھلتا ہے۔ صحن اگرچہ زیادہ بڑا نہیں لیکن بہرحال وہ صحن ہے جہاں سات کرسیاں ڈال کر بڑے آرام سے بات چیت کی جاسکتی ہے۔ آپ کے گھر کی بناوٹ دوسرے گھروں سے کافی مختلف ہے...... ہیں نا؟''

''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' اس نے تصدیقی انداز میں کہا۔

''مس فوزیہ! جس وقت رفیق شاہ کا قتل ہوا آپ کہاں تھیں؟'' میں نے گواہ سے پوچھا۔

''میں اپنے بیڈروم میں تھی۔''

''اور آپ کی والدہ؟''

''وہ اعجاز صاحب کے ساتھ صحن میں بیٹھی باتیں کررہی تھیں۔''

''آپ کے بیڈروم کا ایک دروازہ صحن کی طرف کھلتا ہے۔'' میں نے کہا۔'' آپ کو نگینہ بیگم اور اعجاز حسین صحن میں بیٹھے نظر آرہے تھے؟''

''جی نہیں میں نے کھڑکی اور بیڈروم کا دروازہ بند کر رکھا تھا۔''

''آپ کو کیسے پتا چلا کہ رفیق شاہ کو کسی نے قتل کردیا ہے؟''

''مجھے یہ بات امی نے بتائی تھی۔''

''آپ کے کمرے میں آکر؟''

''نہیں۔'' اس نے نفی میں گردن ہلائی اور بولی۔'' فائرنگ کی آواز سن کر میں اپنے کمرے سے نکلی تھی۔ صحن میں امی سے ملاقات ہوگئی۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ رفیق شاہ قتل ہوگیا ہے پھر میں نے امی کے ساتھ ڈرائنگ روم میں جاکر اس کی لاش بھی دیکھ لی۔''

''ایک بات بتائیں فوزیہ صاحبہ۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔'' فائرنگ کی آواز سن کر آپ کی چیخ وغیرہ کیوں نہیں نکلی تھی؟''

''اس کا سب سے بڑا سبب تو یہ ہے کہ جب فائرنگ ہوئی، اس وقت میں اپنے بیڈروم کے اندر تھی۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بتانے لگی۔'' میں تو یہی سمجھی تھی کہ باہر کہیں گولیاں چلی ہیں اور یہ بات تو بالکل میرے علم میں نہیں تھی

کہ رفیق شاہ ہمارے گھر میں موجود ہے۔ جب میں اپنے بیڈروم میں گئی تھی تو اس وقت میرے علاوہ امی اور اعجاز صاحب ہی گھر میں تھے۔“

”مس فوزیہ! آخری دو سوالات۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”اس کے بعد میں اپنی جرح ختم کر دوں گا لیکن......“ میں نے ڈرامائی انداز میں توقف کیا پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

”یہ دونوں سوالات انتہائی حساس اور ذاتی نوعیت کے ہیں لہٰذا بہت ہی سوچ سمجھ کر جواب دیجیے گا۔ آپ کے جواب کی بڑی اہمیت ہے۔“ وہ ہمہ تن گوش ہوگئی۔

میں نے پوچھا۔ ”مس فوزیہ! اس بات میں کس حد تک صداقت ہے کہ ملزم آپ سے شادی کرنا چاہتا تھا؟“

اس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات ابھرے۔

”یہ...... یہ آپ کیا...... کیا کہہ رہے ہیں۔ میرے علم میں تو ایسی کوئی بات نہیں۔ آپ کو کس نے بتایا ہے؟“

”پچھلی ایک پیشی پر استغاثہ کے گواہ فرید احمد نے آپ کی ذات کے حوالے سے دو انکشافات کیے تھے۔“ میں نے بڑی رسان سے جواب دیا۔ ”فرید احمد، مقتول رفیق شاہ کا گہرا دوست ہے۔“

”دو انکشافات۔“ فوزیہ نے الجھن زدہ انداز میں زیرِ لب دُہرایا پھر مجھ سے پوچھا۔ ”دوسرا انکشاف کون سا ہے وکیل صاحب؟“

”دوسرا انکشاف یہ کہ آپ کی والدہ نگینہ بیگم آپ کی شادی مقتول رفیق شاہ سے کر کے قرض والی رقم سود در سود یعنی دو لاکھ روپے کا قصہ ختم کروانے کی کوشش میں تھی۔“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

”بہ خدا۔“ وہ دونوں ہاتھوں سے اپنے سر کو تھامتے ہوئے بولی۔ ”ایسی کوئی کہانی میرے علم میں نہیں ہے۔ آپ اس سلسلے میں امی سے پوچھیں۔“

”آپ نے کہا اور میں نے مان لیا۔“ میں نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے کہا۔ ”اب یہ دونوں سوالات میں آپ کی امی سے کروں گا۔“ پھر میں نے روئے سخن جج کی جانب موڑتے ہوئے کہا۔

”مجھے کچھ اور نہیں پوچھنا جنابِ عالی۔“

فوزیہ کو باہر بھیج کر نگینہ بیگم کو اندر بلا لیا گیا۔ عدالت کے کمرے میں ایک وقت میں صرف ایک گواہ کو پیش کیا جاتا ہے تاکہ اس کے بیان اور بعد ازاں اس پر ہونے والی جرح سے دوسرے گواہ کی شہادت متاثر نہ ہو مثلاً ابھی فوزیہ کے ساتھ جو سوال و جواب کیے گئے تھے ان سے نگینہ بیگم مطلق بے خبر تھیں۔

وکیل استغاثہ نے نگینہ بیگم کو فارغ کیا تو میں جج کی اجازت حاصل کر کے وٹنس باکس کے قریب پہنچ گیا۔ نگینہ بیگم کی عمر پینتالیس سال کے آس پاس تھی لیکن اس نے خود کو بہت سنبھال کر رکھا ہوا تھا۔ وہ ایک جوان بچی کی ماں تھی اور خود بھی جوان ہی نظر آتی تھی۔ میں گواہوں والے کٹہرے کے پاس پہنچا تو وہ میری جانب دیکھ کر طنزیہ مسکرائی۔ میں اس کی مسکراہٹ کا مطلب تو بہ خوبی جانتا تھا مگر میں نے اس پر کوئی ردِعمل ظاہر کرنا مناسب نہ جانا اور اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔

”نگینہ بیگم!“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اسے مخاطب کیا۔ ”کیا یہ بات درست ہے کہ آپ نے مقتول رفیق شاہ سے کچھ رقم ادھار لے رکھی تھی؟“

”جی ہاں، میں نے مکان کی خریداری کے لیے اس سے پچاس ہزار روپے قرض لیا تھا۔“

”لیکن اپنی موت سے چند لمحے پہلے تک تو وہ آپ سے دو لاکھ روپے کا طلب گار تھا؟“ میں نے تیکھے لہجے میں کہا۔

”اس نے پچاس ہزار کی اصل رقم میں سود شامل کر کے دو لاکھ بنا دیے تھے۔“ وہ برا سا منہ بناتے ہوئے بولی۔

”اتنا زیادہ سود؟“ میں نے حیرت سے آنکھیں پھیلائیں۔ ”آپ نے مقتول سے کتنا عرصہ پہلے سود پر رقم لی تھی؟“

”یہی کوئی دو سال پہلے۔“ اس نے جواب دیا۔ ”اللہ ان سود خوروں کو غارت کرے۔ رائی کا پہاڑ بنا دیتے ہیں۔“

”کیا میں تو کہنے میں حق بہ جانب ہوں گا کہ......“ میں نے ڈرامائی انداز میں کہا۔ ”اللہ نے آپ کی سن لی؟“

”جی...... میں کچھ سمجھی نہیں؟“ وہ سوالیہ نظروں سے مجھے تکنے لگی۔

”آپ کی خواہش تھی کہ اللہ سود خوروں کو غارت کرے۔“ میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ”اور رفیق شاہ قتل ہو گیا۔“

”میں نے تو وہ بات محاورتاً کہی تھی۔“ وہ جلدی سے بولی۔ ”ورنہ میرے ذہن میں ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ رفیق شاہ کے قتل اور سود کے نظام کا آپس میں کوئی تعلق نہیں ہے۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے سرسری انداز میں کہا۔ ”لیکن مقتول اور آپ کی صاحب زادی فوزیہ کا تو آپس میں کوئی نہ کوئی تعلق ضرور تھا؟“

”کیا مطلب ہے آپ کا؟“ وہ گھور کر مجھے دیکھنے لگی۔

”میں ایک ٹرائی اینگل یعنی مثلث کی بات کر رہا ہوں۔“ میں نے گہری سنجیدگی سے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ”جس کا ایک زاویہ تھا مقتول رفیق شاہ، دوسرا زاویہ تھا آپ کی صاحب زادی فوزیہ اور تیسرا زاویہ تھا، دو لاکھ رقم...... آپ ان دو لاکھ روپے کے عوض فوزیہ کی شادی مقتول سے کرنے کے بارے میں فیصلہ کر چکی تھیں...... کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟“

”جی ہاں...... آپ بالکل غلط کہہ رہے ہیں۔“ وہ غصیلی نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ ”یہ بکواس بات آپ کو کس نے بتائی ہے؟“

”استغاثہ کے ایک گواہ اور مقتول کے دوست فرید احمد نے۔“ میں نے نگینہ بیگم کے سوال کے جواب میں کہا۔ ”میں نے یہی سوال آپ کی صاحب زادی سے بھی کیا تھا۔ اس نے اپنی لاعلمی ظاہر کر کے آپ سے پوچھنے کا مشورہ دیا تھا۔ میں نے فوزیہ ہی کے مشورے پر آپ سے استفسار کیا ہے۔“

”یہ ٹھیک ہے کہ میں قرض کی رقم کی وجہ سے سخت پریشان تھی جو روز بہ روز بڑھتی ہی جا رہی تھی۔“ وہ معتدل انداز میں بولی۔ ”لیکن میں نے فوزیہ کے حوالے سے مقتول کو کوئی پیش کش نہیں کی تھی۔“

”اور اسی سلسلے میں آپ ملزم کے بارے میں کیا کہیں گی؟“ میں نے چبھتے ہوئے انداز میں پوچھا۔

”اب آپ نے کی ہے نا کام کی بات۔“ وہ اپنے بدن کا بوجھ ایک پاؤں سے دوسرے پاؤں پر منتقل کرتے ہوئے بولی۔ ”ملزم، فوزیہ سے شادی کرنے میں دلچسپی رکھتا تھا اور اس بات کے لیے بھی تیار تھا کہ اگر میں راضی ہو جاؤں تو وہ رفیق شاہ کی رقم اپنی جیب سے ادا کر دے گا۔“ نگینہ بیگم کی اس ادا سے کھل کر سامنے آ گیا تھا کہ وہ اپنے محسن اعجاز حسین کے لیے اپنے دل میں ذرا سی بھی ہمدردی نہیں رکھتی تھی ورنہ وہ اس قسم کی بات ہرگز نہ کرتی۔ حقیقت یہ تھی کہ ملزم ان ماں بیٹی کا سچا خیر خواہ تھا اور اپنے دل میں ان کے لیے احترام اور خلوص کا جذبہ رکھتا تھا۔ میں نے نگینہ بیگم کو جرح کی چکی میں ڈالتے ہوئے پوچھا۔

”نگینہ بیگم! کیا آپ اس بات کی تردید کریں گی کہ پچھلے ڈیڑھ سال سے ملزم بڑے تواتر کے ساتھ ہر دوسرے تیسرے دن آپ کے گھر جاتا رہا تھا؟“

”یہ بات بالکل درست ہے۔“ وہ بے پروائی سے بولی۔ ”لہٰذا میں تردید نہیں کروں گی۔“

"اب ذرا جلدی سے یہ بھی بتا دیں کہ ملزم کی آپ لوگوں کے ساتھ کیسی رشتے داری ہے؟" میں نے طنزیہ انداز میں سوال کیا۔

"کوئی رشتے داری نہیں ہے۔" وہ بے زاری سے بولی۔

میں نے کہا۔ "پھر آپ کے گھر ملزم کی آمد و رفت کیا معنی رکھتی ہے؟"

"وکیل صاحب! بات دراصل یہ ہے کہ ......" وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ "ہم لوگ تو اس بندے کو بالکل نہیں جانتے تھے۔ جب فوزیہ کے باپ کا انتقال ہوا تو اس کے کچھ ہی عرصے کے بعد اس شخص نے ہمارے گھر آنا شروع کر دیا۔ خود کو وہاب دین کا دیرینہ دوست ظاہر کیا اور ہمارا خیال رکھنے کے بہانے اس نے ہمارے گھر کے چکر لگانے شروع کر دیے پھر نوبت یہاں تک پہنچی کہ...... ہم تو چھوڑتے ہیں مگر کمبل ہمیں نہیں چھوڑتا۔"

"آپ کے برعکس آپ کی صاحب زادی فوزیہ ملزم کے لیے اپنے دل میں نرم گوشہ رکھتی ہیں۔ اس کی کیا وجہ ہے؟" میں نے استفسار کیا۔

"فوزیہ نادان اور بے وقوف ہے، لوگوں کے مکر و فریب اور چھل بازیوں کو نہیں سمجھ پاتی۔" وہ پرخیال انداز میں بولی پھر مجھ پر چوٹ کی۔ "آپ کو تو اس بات کا بہ خوبی اندازہ ہوگا کہ بہلا پھسلا کر فوزیہ کی زبان سے کچھ بھی اگلوانا کس قدر آسان ہے۔"

میں نے اس کی چوٹ کو خندہ پیشانی سے برداشت کیا پھر پوچھا۔ "چند روز پہلے فوزیہ نے بتایا تھا کہ ملزم گاہے بہ گاہے آپ کی مالی مدد بھی کرتا رہتا تھا۔ اس بات میں کس حد تک صداقت ہے؟"

"صرف اس حد تک کہ یہ بات درست ہے کہ میں نے ملزم کے اصرار پر چند روپے رکھ لیے تھے۔" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ "اس وقت مجھے پیسوں کی اشد ضرورت تھی لیکن اب میں سوچتی ہوں کہ یہی میری غلطی تھی۔ اس شخص نے دو تین بار، دو چار ہزار دے کر یہ سوچنا شروع کر دیا کہ میں اس کی بات ماننے لگوں گی۔ یہ اپنی پلاننگ کے ساتھ رفتہ رفتہ آگے بڑھ رہا تھا۔ بالآخر ایک روز یہ کھل کر سامنے آ گیا اور اس نے واضح الفاظ میں مجھ سے کہا کہ اگر میں فوزیہ کی شادی اس سے کر دوں تو وہ میرا سارا قرض ادا کر دے گا۔"

"کیا فوزیہ، ملزم کی اس خواہش سے آگاہ تھی؟"

"میرا خیال ہے...... نہیں۔" وہ بڑے وثوق سے بولی۔ "میں نے کبھی فوزیہ سے اس موضوع پر بات نہیں کی تھی۔"

"ملزم نے کب آپ سے اپنی خواہش کا اظہار کیا تھا؟"

"وقوعہ سے ایک ماہ پہلے۔"

"آپ نے اسے کیا جواب دیا تھا؟"

"میں نے صاف انکار کر دیا تھا۔"

"اس کے باوجود بھی آپ کے گھر میں اس کی آمد و شد جاری تھی؟" میں نے پوچھا۔

"میں اسے دوٹوک منع نہیں کر سکتی تھی۔"

"کیوں منع نہیں کر سکتی تھیں؟" میں نے زور دے کر پوچھا۔

"یہ شخص ایک معاملے میں میری ڈھال بنا ہوا تھا۔"

"کس معاملے میں؟" میں نے سرسراتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ "کہیں آپ کا اشارہ مقتول رفیق شاہ کی طرف تو نہیں؟"

"آپ کا اندازہ بالکل درست ہے۔" وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔ "مقتول جب بھی رقم کا تقاضا کرنے آتا تھا تو ملزم اسے ڈرا دھمکا کر واپس بھیج دیا کرتا تھا۔"

"ڈرا دھمکا کر... یا سمجھا بجھا کر؟" میں نے استفسار کیا۔

"جو لوگ سود کا کاروبار کرتے ہیں وہ لوگوں کے سمجھانے بجھانے میں نہیں آتے۔" وہ ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔ "یہ لوگ اپنے پیسا وصول کرنے کے ایک سو ایک گر جانتے ہیں۔ انہیں بس کسی خطرناک دھمکی سے روکا جا سکتا ہے۔"

"کیا یہ سچ ہے کہ ملزم نے مقتول کو خطرناک نتائج کی دھمکی دی تھی؟" میں نے پوچھا۔ "مقتول کے دوست اور استغاثہ کے گواہ فرید احمد کا دعویٰ ہے کہ ملزم نے مقتول کو قتل کی دھمکی بھی دی تھی۔"

"گواہ کا دعویٰ بالکل درست ہے۔" وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ "کئی بار میرے سامنے بھی ان دونوں میں شدید نوعیت کی تلخ کلامی ہوئی تھی اور ملزم نے مقتول کو دھمکی دی تھی کہ اگر وہ اپنے قرض کو بھولنے کی کوشش نہیں کرے گا تو اس کی جان کی ضمانت نہیں دی جا سکتی۔"

"ملزم یہ سب کچھ آپ ماں بیٹی کی خاطر ہی تو کر رہا تھا۔"

"وہ جو کچھ بھی کر رہا تھا، غلط تھا۔" وہ سفاکی سے بولی۔ "اور نتیجہ آپ کے سامنے ہے۔"

"تو آپ یہ کہنا چاہتی ہیں کہ ملزم نے بالآخر اپنی دھمکی کو عملی جامہ پہنا دیا تھا؟" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"میں کیا کہوں گی، حقیقت عدالت کے سامنے ہے۔" وہ اس کیس سے لاتعلقی کا اظہار کرتے ہوئے بولی۔ "میں نے کوئی تھوڑی ملزم سے کہا تھا کہ وہ مقتول کو ایسی خطرناک اور جان لیوا دھمکیاں دے...... جو کیا ہے، اب اسے بھگتنا تو پڑے گا ناں۔"

وہ سیدھا سیدھا میرے موکل اعجاز حسین کو رفیق شاہ کا قاتل ٹھہرا رہی تھی۔ اس کی اس حرکت سے میرے ذہن میں یہ خیال ابھرا کہ کہیں وہ کوئی بہت بڑی حقیقت چھپانے کے لیے تو اعجاز حسین کو قربانی کا بکرا نہیں بنا رہی۔ اس خیال کے آتے ہی میں نے اسے جرح کی چکی میں پیس ڈالا۔

"نگینہ بیگم! عدالت جاننا چاہتی ہے کہ آٹھ نومبر کی رات نو اور دس بجے کے درمیان آپ کے گھر میں کیا واقعہ پیش آیا تھا؟" میں نے قدرے جارحانہ انداز میں سوال کیا۔ "میں وقوعہ کی رات کا ذکر کر رہا ہوں۔"

"میں اچھی طرح سمجھ رہی ہوں۔" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی پھر مجھے تفصیلات سے آگاہ کرنے لگی۔ "میں اور ملزم گھر کے صحن میں بیٹھے تھے۔ فوزیہ اپنے کمرے میں تھی۔ اسی وقت مقتول آ گیا۔ میں نے رفیق شاہ کو ڈرائنگ روم میں بٹھایا اور خود صحن میں آ گئی۔ ملزم نے مجھ سے پوچھا، کون آیا ہے؟ میں نے جواب دیا۔ رفیق شاہ۔ ملزم نے کہا، اس کا روز روز کا آنا بند کرنا ہی پڑے گا۔ اس نے کیا تماشا لگا رکھا ہے۔ شاید، یہ سود خور مجھے جانتا نہیں۔ میں نے ملزم سے کہا، طیش میں آنے کی ضرورت نہیں، میں خود اس سے بات کرتی ہوں ...... یہ کہہ کر میں نے چائے کے خالی کپ اٹھائے اور کچن کی جانب بڑھ گئی۔ تھوڑی دیر پہلے میں نے اور ملزم نے ان کپ میں چائے پی تھی۔" وہ لمحے بھر کے لیے متوقف ہوئی۔ ایک گہری سانس خارج کی پھر سلسلۂ بیان کو آگے بڑھاتے ہوئے بولی۔

"میں نے یہی سوچا تھا کہ چائے کے جھوٹے برتن کچن میں رکھ کر میں رفیق شاہ کے پاس جاؤں گی اور اس سے منت کروں گی کہ اس وقت چلا جائے۔ میں نے تھوڑی دیر پہلے ملزم کے جو غضب ناک تیور دیکھے تھے ان کی روشنی میں مقتول کو فوراً وہاں سے چلے جانا چاہیے تھا لیکن میں اپنی سوچ پر عمل نہ کر سکی۔ میں کچن میں پہنچی ہی تھی کہ فضا فائرنگ کی آواز سے گونج اٹھی۔ فوری طور پر میرے ذہن میں یہی خیال آیا کہ ملزم نے رفیق شاہ کو قتل کر دیا ہے۔"

"آپ کے ذہن میں یہ خیال کس بنا پر آیا تھا؟" میں نے تیز لہجے میں پوچھا۔

جوان مرگ

"یار تمہیں پتا ہے کہ سگریٹ پینے والے کبھی بوڑھے نہیں ہوئے۔"

"اچھا وہ کیسے؟"

"وہ جوانی میں ہی گزر جاتے ہیں۔"

نمونے کے لیے

"برخوردار تم رو کیوں رہے ہو؟"

"میرے ابا جان نے ایک نئی قسم کا صابن تیار کیا ہے۔"

"تو اس میں رونے کی کیا بات ہے؟"

"رونے کی بات اس لیے ہے کہ جو بھی گاہک آتا ہے وہ نمونہ دکھانے کے لیے میرا منہ دھوتے ہیں۔"

پانچ روپیہ

ایک صاحب پان کی دکان پر پہنچے اور پانچ روپے دے کر بولے۔ "بھئی میرے لیے اعلیٰ قسم کا پان تیار کرنا۔ جس میں لونگ، الائچی، سونف، قوام بھی ڈالنا، خوشبو اور کھوپرا ڈالنا نہ بھولنا اور ہاں ...... ساتھ مراد آبادی زردی بھی۔"

پان والا جل کر بولا۔ "آپ نے جو پانچ روپے دیے ہیں، کہیے تو اسے بھی پان میں ڈال دوں؟"

دوسری طوطی

درخت کی شاخ پر بیٹھے ہوئے طوطے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بیگم نے اپنے بدمزاج اور چڑچڑے شوہر سے کہا۔

"ذرا ادھر دیکھنا، میں پرسوں سے ان دونوں کو یہاں اکھٹا دیکھ رہی ہوں۔ کتنا پیار ہے ان دونوں میں۔ کاش ہم دونوں میں بھی اتنا پیار ہوتا۔"

"پیار کی وجہ اور ہے بیگم۔" شوہر نے جھلائے ہوئے لہجے میں کہا۔ "ذرا غور سے دیکھو آج طوطی دوسری ہے۔"

مرسلہ: ریاض بٹ، حسن ابدال

''میں نے بتایا تو ہے......'' وہ تھوک نگلتے ہوئے بولی۔ ''تھوڑی دیر پہلے ملزم نے مقتول کے لیے بڑے خطرناک عزائم کا اظہار کیا تھا۔''

''فائرنگ کی آواز سن کر آپ کی کوئی چیخ وغیرہ بھی خارج ہوئی تھی؟''

''نن...... نہیں۔'' وہ متذبذب انداز میں مجھے دیکھنے لگی۔

میں نے پوچھا۔ ''کیوں؟''

''شاید میں بہت زیادہ گھبرا گئی تھی۔''

''اس گھبراہٹ میں آپ نے کیا کیا؟'' میں نے استفسار کیا۔

''میں کچن سے باہر نکلی تو ملزم صحن میں موجود نہیں تھا۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ''اس سے میرے شک کو تقویت پہنچی کہ یہ فائرنگ ملزم ہی نے کی ہوگی۔ میں بھاگتے ہوئے ڈرائنگ روم میں پہنچی اور اسی وقت میں نے ملزم کو ڈرائنگ روم کے دروازے سے باہر نکلتے ہوئے دیکھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں ریوالور بھی تھا......''

''ایک منٹ۔'' میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ ''ڈرائنگ روم کے تین دروازے ہیں۔ آپ نے کون سے دروازے سے ملزم کو نکلتے ہوئے دیکھا تھا؟''

''باہر والے دروازے سے۔'' وہ جلدی سے بولی۔

''یعنی وہ دروازہ جو داخلی دروازے کے بالکل سامنے پڑتا ہے؟'' میں نے تصدیق طلب نظر سے اس کی جانب دیکھا۔

''جی ہاں۔'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''ڈرائنگ روم میں مہمانوں کی آمدورفت اسی دروازے سے ہوتی ہے۔''

''جبکہ......'' میں نے چور کے پاؤں باندھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ''ڈرائنگ روم کا دوسرا دروازہ آپ کے بیڈروم میں کھلتا ہے اور تیسرا دروازہ عقبی جانب صحن میں؟''

''جی ہاں۔'' اس نے مختصر سا جواب دیا۔

میں نے پوچھا۔ ''تو جب آپ نے ملزم کو ڈرائنگ روم کے بیرونی دروازے سے نکلتے ہوئے دیکھا تو اس کے ہاتھ میں آپ کو ایک ریوالور بھی نظر آیا تھا؟''

''جی ہاں...... بالکل۔'' وہ بڑے وثوق سے بولی۔

''آپ نے ملزم سے فائرنگ کے بارے میں کوئی سوال نہیں کیا تھا؟''

''میں نے ملزم سے پوچھا تھا کہ یہ فائرنگ کی آواز کیسی تھی؟''

''پھر اس نے کیا جواب دیا؟''

''اس نے کوئی واضح جواب نہیں دیا تھا۔'' وہ [illegible] باکس میں کھڑے ملزم کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ ''بلکہ یہ الٹا مجھے جھڑک کر گھر سے باہر نکل گیا تھا۔''

''آپ نے ملزم کا تعاقب کرنے کی کوشش نہیں کی؟''

''نہیں۔'' وہ نفی میں گردن جھٹکتے ہوئے بولی۔ ''[illegible] وقت میں بے حد پریشان تھی۔ میں ملزم کا پیچھا کرنے کے بجائے ڈرائنگ روم میں داخل ہوگئی اور میں نے صوفے پر رفیق شاہ کو مردہ حالت میں دیکھا۔ اس کی کھوپڑی میں سے خون ابل رہا تھا اور وہ بیٹھے بیٹھے ایک جانب لڑھک سا گیا تھا۔''

نگینہ بیگم کا بیان ملزم کو پھانسی کے پھندے تک لے جانے کے لیے کافی تھا لیکن میں اتنی آسانی سے ہار ماننے والا نہیں تھا۔ میں نے پچھلے تین چار ماہ جو جان توڑ محنت کی تھی وہ رائگاں چلی جائے، یہ مجھے کسی بھی قیمت پر منظور نہیں تھا۔

''نگینہ بیگم!'' میں نے استغاثہ کی سب سے اہم گواہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''آپ مقتول کو دیکھنے کے لیے ڈرائنگ روم کے کون سے دروازے سے اندر داخل ہوئی تھیں؟''

''جس سے ملزم کو نکلتے ہوئے دیکھا تھا؟''

''یعنی وہ دروازہ جس کے عین سامنے صوفہ سیٹ رکھا ہوا ہے؟'' میں نے گہری سنجیدگی سے استفسار کیا۔ ''اور اسی صوفہ سیٹ پر مقتول کو آپ نے بٹھایا تھا؟''

''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔''

''کیا آپ کو مقتول رفیق شاہ کی لاش بھی اسی صوفے پر پڑی نظر آئی تھی جہاں تھوڑی دیر پہلے آپ اسے بٹھا کر گئی تھیں؟''

اس نے اثبات میں جواب دیا۔ میں نے گھیرا تنگ کرتے ہوئے پوچھا۔

''نگینہ بیگم! ڈرائنگ روم کا عقبی جانب صحن میں کھلنے والا دروازہ تو پہلے ہی سے بند تھا۔ آپ اپنے بیڈروم کی جانب کھلنے والے دروازے کے بارے میں کیا کہتی ہیں؟''

''وہ بند تھا۔'' وہ بڑے وثوق سے بولی۔ ''میں نے جب مقتول کو ڈرائنگ روم میں بٹھایا تھا تو اندرونی دروازہ بند کر آئی تھی۔''

''فائرنگ کی آواز سن کر جب آپ ڈرائنگ روم کی جانب لپکی تھیں، تب بھی وہ دروازہ بند ہی تھا؟''

''جی ہاں۔'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔

''دیٹس آل یور آنر۔'' میں نے جج کی جانب رخ کرتے ہوئے ایک گہری سانس خارج کی۔ ''مجھے گواہ سے اور کچھ نہیں پوچھنا۔ میں نے رفیق شاہ کے قاتل کو ڈھونڈ لیا ہے۔''

وکیل استغاثہ سمیت عدالت میں موجود ہر شخص کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ جج نے عینک کے اوپر سے مجھے گھور کر دیکھا اور گہری سنجیدگی سے استفسار کیا۔

''بیگ صاحب! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ آپ کی نظر میں رفیق شاہ کو کس نے قتل کیا ہے؟''

''یا تو نگینہ بیگم اصل قاتل کی جانب سے توجہ ہٹانے کے لیے مسلسل دروغ گوئی سے کام لے رہی ہیں اور یا پھر......'' میں نے لمحاتی توقف کے بعد ڈرامائی انداز میں اضافہ کیا۔ ''یا پھر نگینہ بیگم ہی رفیق شاہ کی قاتل ہیں۔''

''یہ آپ کیا بکواس کر رہے ہیں؟'' نگینہ بیگم نے غصیلے انداز میں پوچھا۔

وکیل استغاثہ نے نعرۂ احتجاج بلند کیا۔ ''آبجکشن یور آنر۔'' عدالت کے کمرے میں موجود لوگوں میں بھی چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے ہی سنجیدہ ماحول مچھلی مارکیٹ کا منظر پیش کرنے لگا۔

''آرڈر...... آرڈر۔'' جج نے بہ آواز بلند مخصوص لہجے میں پکارا۔ عدالت کے کمرے میں دوبارہ پہلے جیسی خاموشی اور سنجیدگی نظر آنے لگی۔ جج نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے پوچھا۔

''بیگ صاحب! کیا آپ اپنے اس دعوے کو ثابت کرسکتے ہیں؟''

''جناب عالی!'' میں نے مودبانہ لہجے میں کہا۔ ''اب تک کی عدالت کی کارروائی میں موقع بہ موقع میں نے جو پوائنٹس اٹھائے ہیں، وہ میرے موکل کی بے گناہی کو ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں۔ اگر معزز عدالت کی اجازت ہو تو میں ان پوائنٹس کو اجاگر کر کے نگینہ بیگم کے حوالے سے اپنے دعوے کو سچا ثابت کرسکتا ہوں۔''

''اجازت ہے۔'' جج نے کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔ میں نے تشکرانہ انداز میں جج کی جانب دیکھا پھر اپنے موقف کے حق میں دلائل دیتے ہوئے کہا۔

''جناب عالی! پوسٹ مارٹم کے مطابق، رفیق شاہ کا قتل آٹھ نومبر کی رات نو اور دس بجے کے درمیان ہوا تھا اور پولیس کا پیش کردہ چالان اس امر کا گواہ ہے کہ ملزم کو نصف شب کے قریب اس کے گھر واقع فیڈرل بی ایریا سے گرفتار کیا گیا تھا۔ پولیس نے ملزم کے پڑوسیوں کی موجودگی میں ملزم کی کار گاڑی کے ڈیش بورڈ میں سے آلۂ قتل یعنی اعشاریہ تین دو کیلی بر کا ریوالور برآمد کیا تھا۔ اگر میرے موکل نے رفیق شاہ کو قتل کیا ہوتا تو ایک قاتل کی نفسیات کے مطابق، سب سے پہلے اسے آلۂ قتل کو ٹھکانے لگا دینا چاہیے تھا کیونکہ نگینہ بیگم اور ظفر علی کے مطابق، وہ دونوں ملزم کے ہاتھ میں ریوالور دیکھ چکے تھے۔ اس صورت حال میں ملزم مذکورہ ریوالور کو کبھی بھی اپنی گاڑی کے ڈیش بورڈ میں نہ چھوڑتا۔ اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ملزم کی لاعلمی میں اس کے ریوالور کو استعمال کر کے رفیق شاہ کو قتل کیا گیا تھا۔ اب میں نگینہ بیگم کی چالاکی اور دروغ گوئی کی طرف آتا ہوں۔''

میں نے چند سیکنڈ کا وقفہ دے کر حاضرین عدالت پر ایک طائرانہ سی نگاہ ڈالی۔ ہر شخص کی نظر مجھ پر لگی ہوئی تھی۔ میں نے اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''نگینہ بیگم کے گھر میں قتل کی ایک واردات ہوگئی تھی لیکن نہ تو اس کے حلق سے کوئی چیخ برآمد ہوئی اور نہ ہی اس نے شور مچانے کی کوشش کی۔ ملزم کے بیان کے مطابق، فائرنگ کے بعد ان کی ملاقات نگینہ بیگم کے بیڈروم میں ہوئی تھی اور نگینہ بیگم نے ملزم کو بتایا تھا کہ کسی نے ڈرائنگ روم میں رفیق شاہ کو قتل کر دیا ہے لہٰذا وہ فوراً جائے وقوعہ سے غائب ہوجائے۔ ملزم نے نگینہ بیگم کا مشورہ مان لیا تھا جب کہ نگینہ بیگم نے ابھی تھوڑی دیر پہلے معزز عدالت کے روبرو بتایا ہے کہ فائرنگ کے بعد ان کی ملاقات ڈرائنگ روم کے بیرونی دروازے پر ہوئی تھی اور ملزم اسے ڈانٹ کر فرار ہوگیا تھا۔ اب میں ایک بار پھر پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کا ذکر کروں گا......'' میں نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔

''اس رپورٹ کے مطابق مقتول کے جسم پر دو فائر کیے گئے تھے۔ ایک گولی اس کی گردن میں دھنس گئی تھی اور دوسری نے اس کی کھوپڑی کو ہوادار بنا دیا تھا۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ اور انکوائری آفیسر اس امر کی تصدیق کرتے ہیں کہ مقتول کی گردن اور کھوپڑی کے بائیں یعنی لیفٹ حصے کو نشانہ بنایا گیا تھا جبکہ نگینہ بیگم نے ملزم کو ڈرائنگ روم کے سامنے والے دروازے سے نکلتے ہوئے دیکھا تھا۔''

''تو...... اس سے کیا ثابت ہوتا ہے؟'' وکیل استغاثہ نے جارحانہ انداز میں پوچھا۔

''میرے فاضل دوست!'' میں نے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ سجاتے ہوئے جواب دیا۔ ''اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ رفیق شاہ کو میرے موکل نے قتل نہیں کیا۔''

''وہ کیسے؟'' اس نے الجھن زدہ نظروں سے مجھے دیکھا۔ ''ذرا وضاحت کریں۔''

''میرے فاضل دوست۔'' میں نے وکیل استغاثہ کی

فرمائش پوری کرتے ہوئے کہا۔ ”نگینہ بیگم معزز عدالت کے روبہ رو اس حقیقت کا اقرار کرچکی ہے کہ جب اس نے ملزم کو ڈرائنگ روم کے سامنے والے دروازے سے فرار ہوتے دیکھا تو اس وقت ڈرائنگ روم کے باقی دونوں دروازے بند تھے اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر بالفرض یہ قتل میرے موکل ہی نے کیا ہے تو وہ مقتول پر فائرنگ کرنے کے لیے ڈرائنگ روم کے سامنے والے دروازے سے داخل ہوا ہوگا اور اس صورت میں دونوں گولیاں مقتول کے جسم کے سامنے والے حصے پر لگنا چاہیے تھیں کیونکہ وہ دروازے کے عین سامنے ایک صوفے پر براجمان تھا۔“ میں نے تھوڑی دیر رک کر بڑی معنی خیز نظر سے وٹنس باکس میں کھڑی نگینہ بیگم کی طرف دیکھا پھر اپنے دلائل کو موثر کرتے ہوئے کہا۔

”جناب عالی! جس صوفے پر رفیق شاہ کا قتل ہوا وہاں سے مقتول کی بائیں جانب ڈرائنگ روم کی ایک کھڑکی ہے جو دوسری طرف نگینہ بیگم کے بیڈروم میں کھلتی ہے۔ یقیناً مقتول پر فائرنگ اسی کھڑکی میں سے کی گئی تھی۔ اب یہ تو نگینہ بیگم ہی بتاسکتی ہیں کہ اس نے خود رفیق شاہ کو قتل کیا ہے یا......“

”مم...... میں نے کسی کو قتل نہیں کیا۔“ میری بات مکمل ہونے سے پہلے ہی نگینہ بیگم کی سراسیمہ، جھرجھراتی ہوئی آواز عدالت کے کمرے میں بلند ہوئی۔

میں نے پلٹ کر وٹنس باکس کی طرف دیکھا۔ نگینہ بیگم کا حوصلہ جواب دے چکا تھا۔ خوف کی شدت سے اس کا چہرہ پیلا پڑ گیا تھا۔ آنکھیں حیرت اور ڈر سے پھٹی جارہی تھیں۔ وہ کٹہرے کی ریلنگ کو تھام کر خود کو بچانے کی ناکام کوشش کررہی تھی۔

جج نے کڑک دار آواز میں پوچھا۔ ”نگینہ بیگم! رفیق شاہ کو اگر تم نے قتل نہیں کیا تو پھر اس کا قاتل کون ہے؟“

”مم...... میں بے گناہ ہوں، بے قصور ہوں۔“ وہ ریلنگ کو تھامے تھامے نیچے بیٹھنے لگی۔ ”وہ...... وہ دراصل...... مو...... را...... د......!“

☆☆☆

آئندہ پیشی پر عدالت نے میرے موکل کو باعزت بری کردیا۔

پچھلی پیشی کا وائنڈ اپ نگینہ بیگم کے اس کانپتے لرزتے جملے پر ہوا تھا۔ ”وہ...... وہ دراصل...... مو...... را...... د......!“

”مو...... را...... د......!“ سے درحقیقت نگینہ کی مراد، مراد نامی ایک شخص سے تھی۔ جج نے صورت حال کی نزاکت کے پیش نظر... پولیس کو حکم دیا تھا کہ وہ نگینہ بیگم کو شامل تفتیش کرکے جلد از جلد اس کیس کا نیا چالان پیش کرے۔ ... کا نئے چالان کے لیے احکامات صادر کرنے کا واضح ... یہی تھا کہ ملزم اعجاز حسین کو عدالت نے بے گناہ مان لیا ...

نگینہ بیگم کی ہمت اور حوصلے کو تو میری جرح ... نے پیس کر سفوف کی شکل دے دی تھی۔ پولیس کو ... زیادہ محنت نہیں کرنی پڑی۔ اس نے مراد کے ... کے شریک جرم ہونے کا قرار کرلیا۔ نگینہ بیگم کی نشان دہ... پولیس نے چھاپا مار کر مراد کو گلشن اقبال سے گرفتار کرلیا... کو رفیق شاہ کے قاتل کی حیثیت سے فٹ کرنے کے ... نگینہ بیگم کا اقبالی بیان ہی کافی تھا۔ بہرحال پولیس نے ... کی زبان کا قفل بھی کھول دیا تھا۔

مراد نامی وہ شخص دراصل ایک پراپرٹی ایجنٹ تھا ... کے علاوہ وہ سود پر پیسا دینے کا کاروبار بھی کرتا تھا۔ مراد کی ... حالت بہت مضبوط تھی اور اتفاق سے وہ نگینہ بیگم پر مرمٹا تھا ... اتفاق در اتفاق یہ کہ رفیق شاہ کسی زمانے میں مراد کا پارٹنر ... کرتا تھا اور اس کا ایک فراڈ پکڑنے کے بعد مراد نے اسے ... سے الگ کردیا تھا۔ نگینہ پر دل آجانے کے بعد جب اسے ... چلا کہ وہ رفیق شاہ کے چنگل میں پھنسی ہوئی ہے تو اس نے ایک ... تیر سے دو شکار کا منصوبہ نگینہ بیگم کے سامنے رکھا۔ نگینہ اعجاز حسین ... سے بھی جان چھڑوانا چاہتی تھی لہٰذا اس نے مراد کے منصوبے ... کے جواب میں ایک تیر تین شکار والا منصوبہ پیش کردیا اور ... پر ان دونوں میں اتفاق رائے ہوگیا۔

نگینہ بیگم نے ایسے وقت میں مراد کو اپنے گھر ... جب رفیق شاہ اور اعجاز حسین پہلے سے وہاں موجود ہوں۔ اعجاز حسین کا ریوالور بھی وہی نظر بچا کر اس کی گاڑی سے نکال لائی تھی۔ پروگرام کے مطابق، مراد نے کھڑکی میں سے فائر کرکے رفیق شاہ کو موت کے گھاٹ اتارا اور ریوالور اعجاز حسین کی گاڑی میں رکھ کر تو دو گیارہ ہوگیا۔

افسوس، جس مقصد کی خاطر نگینہ بیگم اور مراد نے اعجاز حسین کو قربانی کا بکرا بنانے کی کوشش کی تھی وہ پورا نہ ہوسکا ... رفیق شاہ عبرت ناک انجام کو پہنچا۔ مراد عمر قید کی سزا پا ... جیل کی دیواروں کے پیچھے چلا گیا۔ نگینہ بیگم کو بھی اعانت ... میں جیل ہوگئی تھی اور اعجاز حسین...... ”جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے“ کے مصداق مکھن میں سے بال کی طرح ... وسلامت نکل آیا تھا۔

سود کا لین دین کسی لعنت سے کم نہیں۔ یہ اس میٹھے ... کے مانند ہے جو انسان خوشی خوشی اپنے اندر اتار لیتا ہے۔

(تحریر: حسام ...)

نشانہ

طاہر جاوید مغل

ہاتھوں سے پھسلتی ریت کبھی کبھی ایک دلچسپ کھیل لگتی ہے مگر جب... ایسے ہی دھیرے دھیرے محبت دسترس سے دور ہو جائے تو زندگی کے کھیل میں جان کی بازی لگ جاتی ہے... وہ بھی کوئی سچ مچ کا بادشاہ نہیں تھا لیکن ”اپنی نور جہاں“ کے شوہر کی اتفاقی موت کے بعد اسے بھی ”جہانگیر“ جیسے صبر و تحمل اور لامتناہی انتظار کا سامنا کرنا پڑا۔

اندھے اعتماد، فریب نظر اور ادھوری محبتوں کا شاخسانہ

پانچ سال...... جی ہاں پانچ سال کا عرصہ کچھ کم نہیں ہوتا۔ یہ سارا عرصہ میں نے اسے سمجھانے بجھانے میں صرف کیا ہے۔ یہ بتانے میں صرف کیا کہ وہ جو کچھ تھا صرف، اور صرف ایک غلطی کی وجہ سے تھا۔ میں نے بڑے صبر کے ساتھ اس کے زخموں کے مندمل ہونے کا انتظار کیا ہے۔ بڑی محبت سے اس کی واپسی کی راہ دیکھی ہے اور آج میرا انتظار رنگ لایا ہے۔ میں نے پہلی بار اس کے ہونٹوں پر ایک پھیکی سی مسکراہٹ دیکھی ہے۔



اس کہانی کو مکمل طور پر جاننے کے لیے ہمیں قریباً آٹھ سال پہلے جانا ہوگا۔ میں سول سروس کے امتحان کی تیاری کر رہا تھا۔ ہمارے ساتھ والی کوٹھی میں ایک فیملی بطور کرایہ دار آئی۔ یہ لوگ اٹک کے رہنے والے تھے۔ فیملی کے سربراہ شیراز صاحب ایک پرائیویٹ فرم میں سینئر اکاؤنٹینٹ تھے۔ ان کا ایک بیٹا اپنی فیملی سمیت دبئی میں مقیم ہو چکا تھا۔ ایک بیٹی یاسم جو بی ایس سی کی طالبہ تھی ان کے ساتھ رہتی تھی۔ جلد ہی دونوں فیملیز کا ایک دوسرے کے گھر آنا جانا ہوگیا۔ مجھے بھی گاہے بگاہے یاسم کی جھلک نظر آجاتی تھی۔ وہ ایک خوش رنگ، خوش ادا اور دل کو بھا جانے والی لڑکی تھی۔ نہایت صاف رنگت، جاذب نظر نقوش اور ناک کی پھننگ پر ایک ننھا سا تل جو اس کی محبوبیت میں اضافہ کرتا تھا۔

جلد ہی ہم دونوں میں راہ و رسم ہوئی جو بڑھتے بڑھتے دوستی اور پھر منطقی طور پر محبت میں بدل گئی۔ میری بہن اور والدہ کو بھی یاسم بہت پسند تھی۔ دوسری طرف یاسم کی والدہ بھی مجھے بڑی شفقت کی نظروں سے دیکھتی تھیں۔ تاہم یاسم کے والد شیراز صاحب کو یہ صورت حال کچھ زیادہ پسند نہیں تھی۔ وہ مذہبی ذہن کے آدمی تھے۔ اس کے علاوہ ان لوگوں میں سے تھے جو مسلک وغیرہ کی پابندی بڑی سختی سے کرتے تھے۔

سی ایس ایس کا امتحان میں نے اچھے نمبروں سے پاس کیا۔ ان دنوں ایک نیا ٹرینڈ چلا تھا۔ اچھی فیملیز کے پڑھے لکھے لڑکے پولیس میں بھرتی ہو رہے تھے۔ حکومت بھی اس سلسلے میں حوصلہ افزائی کر رہی تھی۔ میں ذاتی طور پر پولیس میں جانا نہیں چاہتا تھا مگر پتا نہیں کیا حالات ہوئے کہ میں نے پولیس کا محکمہ جوائن کرلیا۔ ایک مجبوری کی وجہ سے میری ابتدائی تقرری بطور ڈی ایس پی ہوئی۔ جسم پر وردی سجا کر میں نے خود کو ایک اور ہی دنیا میں محسوس کیا۔ ایک ایسی دنیا میں جو میرے مزاج سے بہت مختلف تھی لیکن جہاں اختیار، وقار اور خود کو اہمیت دیے جانے کا ایک گونا گوں احساس موجود تھا۔

کہتے ہیں کہ کچھ پانے کے لیے کچھ کھونا بھی پڑتا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ میں نے یاسم کو اسی وقت کھونا شروع کر دیا تھا جب میری پولیس کی ملازمت شروع ہوئی۔ یاسم کو تو اس پر کوئی اعتراض نہیں تھا مگر شیراز صاحب اب مجھ سے اور زیادہ کھنچے کھنچے رہنے لگے تھے۔ کبھی ان سے ملاقات ہوتی تو وہ کسی علمی حوالے سے کوئی غیر ضروری بحث چھیڑ دیتے جس کا اختتام عموماً بدمزگی یا تلخ کلامی پر ہوتا۔ مجھے یہ بھی پتا چلا کہ وہ یاسم کا رشتہ اپنے ایک بھائی کی طرف کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

یاسم کی والدہ کچھ بیمار رہتی تھیں۔ یاسم اکثر ان کی تیمارداری میں مصروف نظر آتی تھی۔ دوسری طرف میں بھی اپنے کیریئر کے آغاز پر پوری توجہ دے رہا تھا۔ مختلف ڈیوٹی کے سلسلے میں مجھے لاہور سے باہر بھی رہنا پڑتا تھا۔ کچھ حالات تھے جن میں میرے اور یاسم کے تعلقات میں کچھ سرد مہری آتی چلی گئی۔ میں اس سرد مہری کو محسوس تو کر رہا تھا لیکن مجھے توقع تھی کہ جلد ہی ہم دونوں اس وقتی مصروفیت کے زنغے سے نکل آئیں گے اور اپنے تعلق کو پہلے جیسی آب و تاب کے ساتھ بحال کرلیں گے۔ مجھے ہرگز پتا نہیں تھا کہ جدائی سر پر کھڑی ہے اور یاسم اپنی فیملی کے ساتھ لاہور سے شفٹ ہو کر کوئٹہ جا رہی ہے۔

میں لاہور کے ہی ایک ٹریننگ سینٹر میں تھا جب یاسم نے مجھے فون کال کے ذریعے بتایا کہ وہ لوگ ایک ہفتے تک یہ گھر چھوڑ دیں گے۔

یہ خبر میرے لیے ایک شاک کی طرح تھی۔ اسی روز شام کو میں اور یاسم ایک ریسٹوران میں ملے۔ ہم نے دیر تک باتیں کیں۔ وہی باتیں جو عارضی طور پر جدا ہونے والے پریمی ایک دوسرے سے کیا کرتے ہیں۔ میں نے دل گرفتہ لہجے میں کہا۔ ''یاسم! مجھے لگتا ہے کہ ہم دن بدن ایک دوسرے سے دور ہو رہے ہیں۔ جیسے سوکھی ریت مٹھی سے پھسل رہی ہو۔''

وہ زخمی انداز میں مسکرائی۔ ''آپ میرا حوصلہ بڑھانے کے بجائے مجھے توڑنے والی باتیں کر رہے ہیں۔ اگر ہمارے دل پاس ہیں تو دوری کوئی معنی نہیں رکھتی۔ ہم روز ایک دوسرے کو فون کریں گے۔ اپنے اپنے طور پر حالات کو بہتر کرنے کی کوشش بھی کرتے رہیں گے۔''

اور پھر وہ چلی گئی۔ جو اتنا قریب رہ کر بھی میری نہیں ہو سکتی تھی سیکڑوں میل دور جا کر اپنی مجبوریوں اور حالات کی ستم ظریفیوں سے کیسے لڑتی۔ دھیرے دھیرے وہ دور ہوتی چلی گئی۔ اس کے فون آنا کم ہوئے اور پھر بالکل ختم ہو گئے۔ اسی طرح ایک سال سے زیادہ وقت بیت گیا اور پھر ایک دن جب میں اپنی ڈیوٹی پر تھا اور چھاپا مار ٹیم کے ساتھ ایک نامی گرامی دہشت گرد کی گرفتاری کے لیے شیخوپورہ جا رہا تھا میرے سیل فون پر میری بہن آبرو کی کال موصول ہوئی۔ آبرو نے افسردہ لہجے میں مجھے اطلاع دی کہ اس کی معلومات کے مطابق کوئٹہ میں یاسم کی شادی ہو چکی ہے۔

☆☆☆

وقت اپنی مخصوص رفتار سے گزرتا رہا۔ میں اپنے پروفیشن میں خصوصی دلچسپی لے رہا تھا۔ میں محکمے کے ان چند افسروں میں بھی شامل ہوا جو موسم بہار میں ایک مطالعاتی دورے کے لیے لندن اور اسکاٹ لینڈ یارڈ بھیجے گئے۔ ہم نئی بھرتی کے لوگ محکمے میں تازہ ہوا کے جھونکے کی طرح تھے۔ موٹی توندوں والے ست الوجود انسپکٹرز، ڈی ایس پیز اور ایس پیز وغیرہ کے جھرمٹ میں ہم خصوصی طور پر چاق و چوبند اور اسمارٹ نظر آتے تھے۔ اکثر لوگ دھوکا کھا جاتے تھے۔ خاص طور سے جب ہم سادہ کپڑوں میں ہوتے تو لوگ یقین ہی نہیں کر پاتے تھے کہ ہم پولیس آفیسر ہیں۔

میں نے گن شوٹنگ میں اسپیشل تربیت حاصل کی تھی۔ دو تین خطرناک چھاپوں میں، میں نے اپنی اس تربیت کا عملی مظاہرہ کیا تو لاہور کی سطح پر مجھے محکمے کے اندر جانا پہچانا جانے لگا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے وہ اگست کا ایک عام سا دن تھا۔ ہلکے بادل چھائے ہوئے تھے۔ شام کے وقت ہی اندھیرا محسوس ہونے لگتا تھا۔ میں ابھی ابھی تھانے پہنچا تھا اور ابھی وردی پہنی نہیں تھی۔ میرے سیل فون پر کال موصول ہوئی۔ میں نے کال اٹینڈ کی۔ دوسری طرف ابھرنے والی آواز کو میں نے چند سیکنڈ میں پہچان لیا۔ یہ یاسم تھی۔ وہ آواز دبا کر ہیجانی انداز میں بول رہی تھی۔

''سرفراز پلیز مدد کرو۔ میں خطرے میں ہوں، میرے شوہر بھی خطرے میں ہیں۔ وہ ہم دونوں کو مار دے گا۔ سب کچھ لوٹ لے گا۔ پلیز سرفراز......''

میں نے جلدی سے نمبر دیکھا پھر کہا۔ ''تم کہاں ہو یاسم؟''

''یہیں لاہور میں، ہوٹل بلیو اسکائی۔ سویٹ نمبر 318 ہے۔ اس نے شراب پی رکھی ہے۔ وہ کک...... کچھ بھی کر سکتا ہے۔ اس نے......''

فقرہ ادھورا رہ گیا۔ کسی نے زور سے دروازے پر دستک دی تھی۔ دستک کی آواز میں نے فون پر بالکل صاف سنی تھی۔ اسی کے ساتھ ہی کوئی نہایت کرخت اور بھاری آواز میں بولا بھی تھا۔ الفاظ بالکل سمجھ میں نہیں آئے۔

''پلیز سرفراز۔'' یاسم نے ایک بار پھر گھگیائی آواز میں کہا۔ اسی کے ساتھ ہی فون بند ہوگیا۔ یوں لگا جیسے وہ کسی باتھ روم وغیرہ میں گھس کر فون کر رہی تھی۔

ہوٹل بلیو اسکائی لبرٹی کے علاقے میں تھا اور اتفاقاً یہ یہاں سے زیادہ دور بھی نہیں تھا۔ میں نے اپنے سب انسپکٹر عادل کو ساتھ لیا اور بھاگتا ہوا اپنی جیپ تک پہنچا۔ کچھ ہی دیر بعد ہماری جیپ آندھی کی رفتار سے لبرٹی مارکیٹ کی طرف اڑی جا رہی تھی۔ سائرن مسلسل بج رہا تھا جس کی وجہ سے ہمیں نسبتاً آسانی سے راستہ مل رہا تھا۔ لبرٹی کے نزدیک پہنچ کر میں نے عادل کو سائرن بند کرنے کی ہدایت کی۔ جیپ پارک کر کے ہم دوڑتے ہوئے ہوٹل میں داخل ہوگئے۔ ہم سادہ لباس میں تھے۔ کسی نے ہماری طرف خصوصی توجہ نہیں دی۔ پتا چلا کہ سویٹ نمبر 318 تیسرے فلور پر ہے۔ ہم بذریعہ لفٹ تیسرے فلور پر پہنچے۔ کوریڈور میں مکمل سکوت تھا۔ سویٹ نمبر 318 کا دروازہ بند تھا۔ دروازے پر ڈسٹرب نہ کریں کا ننھا سا بورڈ آویزاں تھا۔ خاموش اور بند دروازے کو دیکھ کر یقین نہیں ہوا کہ اس کی دوسری جانب ایک نہایت سنگین واردات ہو رہی ہے۔ ایک ایسی واردات جس میں ایک لڑکی کی عزت اور جان شدید خطرے میں ہے۔

میں نے سرکاری پستول ہاتھ میں لیا اور دروازے پر دستک دی۔ تین چار دستکوں کے بعد کسی نے کرخت اور بھاری آواز میں پوچھا۔ ''کون ہے؟'' جواب میں عادل نے مودب انداز میں کہا کہ وہ ویٹر ہے۔

اندر سے نہایت غصیلے لہجے میں کہا گیا۔ ''تمہیں باہر سائن نظر نہیں آتا؟'' اس کے بعد خاموشی چھا گئی۔ اندازہ ہوتا تھا کہ اندر گھسا ہوا شخص دروازہ کھولنے پر آمادہ نہیں۔ یقیناً وہ خطرناک بھی تھا۔ میری نگاہوں میں دو ڈھائی ماہ پہلے کا ایک منظر گھوم گیا۔ ہم ایک چودہ سالہ مغوی لڑکے کو چھڑانے کے لیے شاہدرہ گئے تھے۔ زبردستی کمرے کا دروازہ کھلوانے کی کوشش کی گئی تو اغوا کار نے لڑکے کو گولی مار کر ختم کر دیا اور بعد ازاں بھاگنے کی کوشش میں خود بھی تیسری منزل سے گر کر ہلاک ہوگیا۔

اچانک میرے ذہن میں ایک اور بات آئی۔ اس چھ منزلہ ہوٹل کے عین سامنے سڑک کی دوسری طرف چھ سات منزلہ ایک شاپنگ پلازا بھی تھا۔ ہوٹل کے کمروں کی زیادہ تر کھڑکیاں اس پلازے کی طرف کھلتی تھیں۔ میں نے عادل کو اشارہ کیا ہم دونوں سیڑھیوں کے ذریعے تیزی سے نیچے اترے۔ سرکاری پستول پہلے ہی میرے لباس میں موجود تھا۔ جیپ میں ایک لانگ رینج ٹیلی اسکوپ بھی رکھی ہوئی تھی۔ میں نے ٹیلی اسکوپ کپڑے میں لپیٹ کر اٹھائی اور عادل کے ساتھ لپکتا ہوا شاپنگ پلازا میں پہنچ گیا۔ ہم

سیدھے منیجر کے آفس میں گئے۔ وہ مجھے پہچانتا تھا، ہمیں دیکھتے ہی کھڑا ہوگیا۔ میں نے اسے مختصر ترین الفاظ میں صورت حال بتائی۔ دو منٹ بعد ہم شاپنگ پلازا کے چوتھے فلور پر ایک خالی فلیٹ کے اندر موجود تھے۔

فلیٹ کی بیرونی کھڑکی میں سے وسیع سڑک کے پار ہوٹل بلیو اسکائی کی چھ منزلہ عمارت نظر آرہی تھی۔ تاریکی اب گہری ہوچکی تھی۔ ہوٹل کی بیشتر کھڑکیاں روشن نظر آرہی تھیں۔

''تھرڈ فلور سویٹ نمبر 318۔'' میں نے زیرلب کہا اور انگلی سے گن کر حساب لگایا۔

جگہ کا تعین کرنے کے بعد میں نے ٹیلی اسکوپ آنکھوں سے لگائی اور روشن کھڑکیوں کا جائزہ لینا شروع کیا۔ اچانک مجھے اپنے جسم کا سارا خون سر کو چڑھتا محسوس ہوا۔ میں مطلوبہ کھڑکی ڈھونڈنے میں کامیاب رہا تھا۔ کھڑکی کے صرف ایک تہائی حصے پر پردہ تھا۔ باقی میں سے اندر کا منظر نظر آرہا تھا۔ یاسم کا چہرہ مکمل نظر نہیں آیا تاہم میں نے اس کے جسم اور بیٹھنے کے انداز سے ہی پہچان لیا کہ وہ یاسم ہے۔ اس نے گہرے گلابی پھولوں والی سلکی شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔ کانوں میں بس ایک طلائی جھمکا تھا۔ ایک شاید گرگیا تھا یا اتار لیا گیا تھا۔ پچیس چھبیس سال کا ایک قبول صورت نوجوان بائیں طرف صوفے پر بیٹھا تھا۔ اس کے عین سامنے سانولی رنگت اور کسی قدر بھدے نقوش والا ایک لحیم شحیم شخص کھڑا تھا۔ اس نے سرخ ٹی شرٹ پہن رکھی تھی جس میں سے اس کے مضبوط بازوؤں کی مچھلیاں نمایاں نظر آتی تھیں۔ میں نے ٹیلی اسکوپ کو اس کے چہرے پر فوکس کیا۔ اس کا نصف چہرہ پردے کے پیچھے تھا تاہم جتنا نظر آرہا تھا اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ایک سخت گیر شخص ہے۔ اس کی عمر تیس بتیس کے لگ بھگ تھی۔ صوفے پر بیٹھا نوجوان اپنی ناک پر عینک درست کرتے ہوئے لحیم شحیم شخص سے کچھ کہہ رہا تھا جس کا جواب لحیم شحیم شخص سخت روئی سے دے رہا تھا۔

میں نے کھڑکی کے بالکل کونے میں جاتے ہوئے اپنی نظر کا زاویہ بہتر کرنے کی کوشش کی۔ مجھے اس میں کامیابی ہوئی۔ مجھے سرخ شرٹ والے لحیم شحیم کے ہاتھ میں ایک تیز دھار چھری نظر آئی۔ وہ بات کرتے ہوئے اس چھری کو بار بار حرکت دے رہا تھا۔ صوفے پر بیٹھا نوجوان انکار میں سر ہلا رہا تھا۔

میں نے ٹیلی اسکوپ اپنے سب انسپکٹر عادل کو تھمائی۔ اس نے بھی ہوٹل کی روشن کھڑکی کا جائزہ لیا۔

صورت حال واضح تھی۔ سرخ شرٹ والے شخص نے یاسم اور اس کے شوہر کو یرغمال بنا رکھا تھا۔ فی الحال ہمیں اس کے ہاتھ میں فقط تیز دھار چھری نظر آرہی تھی مگر یقینی بات تھی اس کے پاس آتشیں ہتھیار بھی ہوگا۔

یاسم نے ذرا سا رخ پھیرا تو اس کا چہرہ پورا میرے سامنے آگیا۔ پچھلے دو سال میں اس کے اندر ... تبدیلی پیدا ہوئی تھی۔ وہی دل میں کھب جانے والی آنکھیں، وہی لمبے گھنے بال، وہی تھوڑے سے ابھرے ہوئے رخسار جو یقیناً فی الوقت صورت حال کی سنگینی کے سبب زرد آرہے تھے۔ اس کے سر سے دوپٹا غائب تھا اور گریبان ... سا پھٹا ہوا تھا۔ اس کا دلکش جسم نمایاں ہو رہا تھا اور وہ اپنے گریبان کو سنبھالنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ ... شرٹ والا اس سے فقط چند انچ کے فاصلے پر موجود تھا اور ... کی نگاہ بار بار یاسم کے گریبان کی طرف اٹھ رہی تھی۔ میری طاقت ور ٹیلی اسکوپ نے مجھے یہ سب کچھ وضاحت سے دکھایا اور میرے جسم میں چنگاریاں سی بکھرنے لگیں۔ ... میری نہیں ہوسکی تھی لیکن میری محبت تو تھی۔ میں اسے مصیبت میں نہیں دیکھ سکتا تھا۔ خاص طور سے اس حالت میں کہ اس نے مجھے مدد کے لیے پکارا بھی تھا۔

مجھے اندازہ ہونے لگا کہ ہوٹل کے سویٹ نمبر 318 میں صورت حال کسی بھی لمحے کوئی سنگین ترین رخ اختیار کرسکتی ہے۔ میں نے ٹیلی اسکوپ سے نگاہ ہٹاتے ہوئے سب انسپکٹر عادل سے کہا۔ ''گاڑی سے گن لے آؤ۔''

''جی سر۔'' عادل نے کہا اور تیزی سے نیچے چلا گیا۔ گاڑی یعنی جیپ کی چابی اسی کے پاس تھی۔

دو منٹ بعد اس نے The Barrett Light اسنیپر گن میرے پاس لاکر رکھ دی۔ یہ اعشاریہ پچاس کیلیبر کی گن تھی۔ اس کے ساتھ ایک چھوٹا اسٹینڈ بھی ہوتا ہے ... یہ زبردست نشانہ لیتی ہے۔

میں نے گن کو چیک کیا اور ایک بار پھر اپنی آنکھیں ٹیلی اسکوپ کے عدسوں سے لگادیں۔ کمرے میں صورت حال بگڑ رہی تھی۔ سرخ شرٹ والا غصیلے انداز میں بول رہا ... ہوئے اپنے بھدے ہونٹوں کو تیزی سے حرکت دے رہا ... پھر اس نے ایک قدم آگے بڑھ کر نوجوان کو دھکا دیا۔ اس کا چشمہ گرگیا جسے اس نے جلدی سے دوبارہ آنکھوں پر لگایا۔ ایک لمحے کے لیے لگا کہ سرخ شرٹ والا چھری سے نوجوان پر حملہ کردے گا مگر پھر یاسم تیزی سے سامنے آگئی۔ اس نے اپنے شوہر کے سامنے آکر ہاتھ جوڑ دیے اور منت کے انداز میں

کچھ کہنے لگی۔ میں صاف دیکھ نہیں سکتا تھا لیکن یقینی بات تھی کہ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ ان لمحوں میں وہ اپنے پھٹے ہوئے گریبان کو بھی تقریباً بھول گئی تھی۔ اس کا ہیجان خیز جسم یقیناً سرخ شرٹ والے کے اشتعال میں اضافہ کرسکتا تھا۔

یاسم کی منت سماجت سننے کے بعد اس کا شوہر اٹھا اور الماری کی طرف بڑھا۔ ایک چابی گھما کر اس نے الماری کے پٹ کھولے اور مختلف چیزیں نکال کر قالین پر پھینکنے لگا۔ اس نے الماری کی ایک بڑی دراز بھی نکال کر سرخ شرٹ والے کے سامنے بیڈ پر رکھ دی۔ انداز سے عیاں تھا کہ وہ سرخ شرٹ والے کے مطالبے پر اسے الماری کی تلاشی دے رہا ہے غالباً سرخ شرٹ والا ان دونوں سے زیورات یا کیش وغیرہ کا مطالبہ کر رہا تھا۔

منیجر فلیٹ سے باہر کھڑا تھا۔ میں اور عادل فلیٹ میں بیرونی کھڑکی کے بالکل سامنے تھے۔ ہم نے فلیٹ کے اس حصے کو نیم تاریک ہی رہنے دیا تھا۔ میں نے گن ایک چار فٹ اونچے اسٹول پر رکھی اور اسے سویٹ نمبر 318 کی کھڑکی کی طرف پوائنٹ کرلیا۔ گن کے ساتھ اس کی اپنی ٹیلی اسکوپ اٹیچ ہوتی ہے۔ میں نے اسے کھڑکی کے منظر پر فوکس کرنا شروع کیا۔ اس دوران میں میری ہدایت کے مطابق عادل نے علاقے میں پیٹرول کرتی ہوئی دو پولیس موبائلز سے رابطہ کیا اور انہیں ہوٹل بلیو اسکائی کے سامنے پہنچنے کی ہدایت کردی۔

میں جب دوبارہ کھڑکی کے اندر کا منظر دیکھنے میں کامیاب ہوا تو سچویشن کچھ اور خراب ہوچکی تھی۔ میری نظروں سے یہ بات چھپی نہ رہ سکی کہ یاسم کے گلابی پھولوں والی قمیص کا گریبان کچھ اور پھٹ چکا ہے۔ اس کے شوہر سے اپنی بات منوانے کے لیے سرخ شرٹ والے نے یاسم سے دست درازی کی تھی یا اس سے ملتا جلتا کوئی اور واقعہ ہوا تھا۔

سرخ شرٹ والا کرخت انداز میں بول رہا تھا۔ یاسم کا شوہر انکار میں سر ہلا رہا تھا۔ یاسم ایک بار پھر منت کے انداز میں شوہر سے کچھ کہتی نظر آئی۔

میں نے آنکھ گن کے ٹیلی اسکوپ سے لگادی۔ مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ میرے پاس وقت کم ہے۔ میرے پاس دو آپشن تھے ایک یہ کہ سرخ شرٹ والے کو شدید زخمی کرنے کے لیے فائر کروں، دوسرے یہ کہ عین اس کی پیشانی پر گولی ماردوں اور ٹھنڈا اتھار کردوں۔

یہ میری مہارت کا امتحان تھا اور یہ امتحان آج میں اس لڑکی کے لیے دے رہا تھا جو مجھ سے جدا ہونے کے باوجود میرے دل کی گہرائیوں میں بسی تھی۔ جس کے لیے میں ہر حد تک جاسکتا تھا اور مشکل جھیل سکتا تھا۔

میں نے گن کا دستہ اپنے کندھے سے پیوست کیا۔ اپنی ٹریننگ کے مطابق ایک گھٹنا زمین پر ٹیکا اور اپنا دایاں رخسار گن کے ساتھ لگا کر ایک آنکھ بند کرلی۔ کمرے کے اندر سرخ شرٹ والا غصے کی انتہا کو چھو رہا تھا۔ اس کے منہ سے شعلے نکل رہے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ وہ کسی بھی وقت نوجوان کو جان لیوا طور پر زخمی کردے گا اور یاسم کو لے کر بیڈ روم میں گھس جائے گا یا اسی طرح کی کوئی اور غلیظ حرکت کر گزرے گا۔ دوسری طرف یاسم کا شوہر بھی خاطر خواہ مزاحمت کر رہا تھا۔ وہ سرخ شرٹ والے کو ترکی بہ ترکی جواب دے رہا تھا۔ اس کی باڈی لینگویج بتا رہی تھی کہ وہ بہت زیادہ خوفزدہ نہیں ہے۔

پھر اچانک سچویشن دھماکا خیز ہوگئی۔ دونوں ایک دوسرے پر جھپٹ پڑے۔ یاسم چلاتی ہوئی دروازے کی طرف گئی لیکن وہ باہر نہیں جاسکی۔ اندازہ ہوا کہ دروازہ اندر سے لاک کردیا گیا ہے۔ وہ پلٹی اور اپنے شوہر کو حملہ آور سے علیحدہ کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ وہ گتھم گتھا تھے۔ یکایک ان دونوں میں سے کسی ایک کی کہنی پورے زور سے یاسم کے منہ پر لگی۔ وہ بے چاری لڑکھڑا کر دیوار سے ٹکرائی اور بائیں طرف گر کر میری نظروں سے اوجھل ہوگئی۔ مجھے ایک سو ایک فیصد یقین تھا کہ وہ بے ہوش ہوگئی ہے۔

تیز دھار چھری سرخ شرٹ والے کے ہاتھ میں تھی۔ اب کسی بھی وقت کچھ بھی ہوسکتا تھا۔ میں اپنی پوری مہارت استعمال کرتے ہوئے اسنیپر گن سے نشانہ لے رہا تھا۔ میری انگلی ٹرائیگر پر تھی اور ساری حسیات سمٹ کر نگاہ میں آگئی تھیں۔ مجھے ایک یادگار نشانہ لے کر یاسم اور اس کے شوہر کو شدید ترین خطرے سے بچانا تھا لیکن اس کے ساتھ مجھے یہ احساس بھی تھا کہ اگر میری چلائی ہوئی گولی یاسم کے شوہر کو لگ گئی تو میں ساری زندگی خود کو معاف نہیں کرسکوں گا۔

اگلے چالیس پچاس سیکنڈ میری زندگی کے مشکل ترین لمحات تھے۔ کم از کم تین بار سرخ شرٹ والا میرے عین نشانے پر آیا لیکن اس سے پہلے کہ میں گولی چلاتا وہ یاسم کے شوہر کی اوٹ میں چلا گیا۔ یاسم کا شوہر الٹے پاؤں پیچھے ہٹ رہا تھا جب اسے ٹھوکر لگی اور وہ پشت کے بل صوفے پر گرا۔ اس کا گریبان بدستور سرخ شرٹ والے کے مضبوط ہاتھ میں تھا۔ سرخ شرٹ والے کے دوسرے ہاتھ میں چکن

کی تیز دھار چھری تھی۔

یہی لمحے تھے جب سرخ شرٹ والا ایک بار پھر بالکل صاف میرے نشانے پر آیا۔ یہ بڑے قیمتی لمحے تھے۔ میں نے سانس روکی اپنے ہاتھوں کو پتھر کی طرح ساکت کیا اور ٹریگر دبا دیا۔ شاندار طاقتور اسنیپر گن نے دھماکے سے شعلہ اگلا۔ قریباً سو میٹر دور ہوٹل کی کھڑکی میں سرخ شرٹ والے کے بالائی دھڑ کو شدید دھچکا لگا اور وہ بائیں طرف لڑھک کر میری نگاہ سے اوجھل ہو گیا۔ میرے اندازے کے مطابق گولی اس کی گردن کے بالائی حصے میں لگی تھی اور گوشت کو چیرتی ہوئی سر کے پچھلے حصے سے نکل گئی تھی۔

میں جانتا تھا کہ عادل کا ایک ساتھی ایس آئی شوکت اپنے تین مسلح کانسٹیبلو کے ساتھ سویٹ نمبر 318 کے کوریڈور میں پہنچ چکا ہے۔ میں نے عادل سے کہا۔ ''شوکت سے کہو دروازہ توڑ کر اندر گھس جائے۔ بندے کو گولی لگ گئی ہے۔'' عادل نے فوراً میری ہدایت پر عمل کیا۔

ہم بھاگتے ہوئے سیڑھیاں اترے اور سڑک پار کر کے ہوٹل بلیو اسکائی میں داخل ہو گئے۔ کچھ ہی دیر بعد ہم سویٹ نمبر 318 کے سامنے تھے۔ اس کا دروازہ چوپٹ کھلا تھا۔ کوریڈور میں ڈرے ہوئے چہرے تھے اور سویٹ کے اندر پولیس کی نفری نظر آ رہی تھی۔ میں نے سویٹ کے پہلے کمرے میں عینک والے نوجوان کو دیکھا۔ اس کا رنگ زرد ہو رہا تھا۔ شوکت نے اسے فرش پر اوندھا گرا کر الٹی ہتھکڑی لگوا دی تھی۔

''اس کو کیوں پکڑا ہے؟'' میں نے چلا کر شوکت سے پوچھا۔

''سر یہ بھاگ رہا تھا۔'' شوکت نے ہانپتی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

''تو پھر کیا ہوا؟'' میں نے کہا اور دوسرے کمرے میں پہنچا۔

مجھے سامنے والے کمرے سے رونے کی آواز آئی۔ یہ یاسم کی آواز تھی۔ وہ ہوش میں آ چکی تھی۔ میں نے اس کمرے میں جھانکا اور دنگ رہ گیا۔ یاسم سرخ شرٹ والے کی خون آلود لاش سے لپٹی ہوئی تھی اور بلک رہی تھی۔

''اٹھو...... خدا کے لیے اٹھو۔'' وہ دلدوز آواز میں بولی پھر اس کی نگاہ مجھ پر پڑی۔ وہ چند سیکنڈ ساکت رہی پھر مجھ پر جھپٹی۔

اس نے اپنے خون آلود ہاتھوں سے میرا گریبان پکڑا اور مجھے جھنجوڑتے ہوئے بولی۔ ''یہ تم لوگوں نے کیا کیا...... تم نے میرے ناصر کو مار دیا۔ تم نے میرا شوہر مجھ سے چھین لیا...... مجھے برباد کر دیا۔'' میں سکتہ زدہ کھڑا تھا۔

☆☆☆

مناظر انسان کو دھوکا دیتے ہیں۔ شاید اسی لیے کہتے ہیں کہ کانوں سنی اور آنکھوں دیکھی بھی غلط ہو سکتی ہے۔ میں اور عادل عینک والے نوجوان کو یاسم کا شوہر سمجھتے رہے لیکن وہ ایک ہسٹری شیٹر سجاد تھا۔ اس پر ڈکیتی اور آبرو ریزی وغیرہ کے کئی مقدمات درج تھے۔ ہم نے اس کی صورت سے دھوکا کھایا بلکہ دونوں کی صورتوں سے دھوکا کھایا۔ سرخ شرٹ والا یاسم کا شوہر تھا۔ اس نے خود کو اور یاسم کو بچانے کے لیے تیز دھار چھری کچن کی ٹیبل سے اٹھائی تھی مگر اس چھری کی سجاد کو کچھ پروا نہیں تھی۔ اس نے یاسم کی پنڈلی سے ایک چھوٹا سا طاقتور بم باندھ رکھا تھا۔ اس کا ننھا سا کنٹرول اس کے ہاتھ میں تھا۔ یاسم ہاتھ جوڑ جوڑ کر جو منتیں کر رہی تھی وہ اپنے شوہر سے نہیں حملہ آور سے کر رہی تھی۔

بے شک مناظر دھوکا دیتے ہیں۔ مجھ سے بہت بڑی غلطی ہوئی تھی لیکن میری نیت غلط نہیں تھی۔ اگلے سات آٹھ ماہ تک میری بہت کوششوں کے باوجود یاسم نے میری شکل تک دیکھنا گوارا نہیں کی لیکن پھر دھیرے دھیرے اس کا رویہ کچھ نرم پڑ گیا۔ میرے سینے میں اب بھی اس کی محبت کی جوت جگی تھی۔ میں اسے دل و جان سے چاہتا تھا۔ یاسم کے والد ایک سال پہلے وفات پا چکے تھے۔ والدہ ان سے بھی چند ماہ پہلے اس سے جدا ہو چکی تھیں۔ یاسم کا ابھی کوئی بچہ نہیں تھا۔ وہ اپنی بڑی بہن کے ہاں رہ رہی تھی۔ میں نے پورے خلوص اور محبت کے ساتھ گاہے بگاہے اس سے ملنا جاری رکھا۔ ہر طرح سے اس کے دکھ کو بانٹتا رہا۔

ہاں...... تو میں پانچ سال کی بات کر رہا تھا۔ جی ہاں پانچ سال کا عرصہ کچھ کم نہیں ہوتا۔ یہ سارا عرصہ میں نے یاسم کو سمجھانے بجھانے میں صرف کیا ہے۔ یہ بتانے میں صرف کیا ہے کہ وہ جو کچھ ہوا تھا صرف اور صرف ایک غلطی کی وجہ سے ہوا تھا۔ میں نے بڑے صبر کے ساتھ اس کے زخموں کے مندمل ہونے کا انتظار کیا ہے۔ بڑی محبت سے اس کی واپسی کی راہ دیکھی ہے اور آج میرا انتظار رنگ لایا ہے۔ میں نے پہلی بار اس کے ہونٹوں پر ایک پھیکی سی مسکراہٹ دیکھی ہے۔ مجھے پورا یقین ہے، بہت جلد یہ مسکراہٹ نمایاں ہو گی اور میری ویران زندگی کے صحرا میں ہریالی کے آثار نمودار ہو جائیں گے۔

+

چالباز

مختار آزاد

انداز دلبری ہو یا جرائم کی داستان... مغربی دنیا کی ہر ادا نرالی ہے۔ جھوٹ اور مکاری جس معاشرے کا فیشن ہو وہاں سادگی کا کیا کام... اور ایسے سنسنی خیز لمحات میں جب انا کی تلوار سے ''ابھی یا کبھی نہیں'' کی جنگ لڑی جا رہی ہو تو ایسے میں کچھ بھی ہو سکتا ہے مگر... جو کچھ وہاں ہوا، ایسا تو کسی کے گمان تک میں نہ تھا۔

دیدہ دلیری سے آنکھوں میں دھول جھونکنے کا شاندار منصوبہ



موسم بہار آ چکا تھا۔ گھنے جنگلوں کے درمیان واقع ڈارک ٹمبر قصبے والے بھی ریچھوں کی طرح جیسے غاروں سے نکل کر، خوشی کے مارے پائن کے درختوں پر چڑھ اتر رہے تھے۔ میں اکثر یہیں رہتا تھا۔ نیو ایئر نائٹ کا جشن بھی اپنے کیبن میں ہی منایا تھا جہاں میرے سوا نہ تو کسی اور کے بیٹھنے کی گنجائش تھی اور نہ ہوتی، تب بھی وہاں کوئی نہ تھا۔

پائن کے اونچے درختوں ڈارک ٹمبر کی سرد ترین تاریک راتیں ہی ہیبت ناک نہیں ہوتی تھیں بلکہ برف باری

اور ملکیجے دن بھی اس کی ہیبت برقرار رکھتے تھے مگر ہم یہیں کے رہنے والے تھے اور سردیوں کے شب و روز سے اچھی طرح واقف تھے۔ اسی لیے خزاں اور سردیوں کے طویل موسم کے بعد برف پگھلنے اور موسم بہار شروع ہونے کی خوشی ہم لوگ بہتر سمجھتے ہیں۔ برف لگ بھگ پگھل چکی تھی، راستے صاف تھے البتہ پہاڑیوں کی چوٹیاں اب بھی سفید لبادہ اوڑھے ہوئے تھیں۔

میں نے کیبن کے چاروں طرف نظر ڈالی اور موسم بہار کو خوش آمدید کہنے کے لیے پہلی بار گھر سے نکلا۔ میرا رخ پال کے گھر کی طرف تھا۔ اس نے اپنے گھر کی نچلی منزل پر بار، منی ریستوران اور کافی شاپ بنا رکھا تھا جہاں بے فکرے چھوٹے موٹے داؤ لگا کر جوا کھیلتے اور ٹائم پاس کرتے تھے۔ اس کے بار کی ایک خاصیت وائن تھی۔ وہ اپنے گھر پر پھلوں سے وائن کشید کرتا تھا اور مجھے اس کا ذائقہ بے انتہا پسند تھا۔ موسم بہار کو، پال کی کشید کردہ ذائقہ دار وائن کا گلاس چڑھا کر خوش آمدید کہنے سے اچھا کوئی اور طریقہ کم از کم مجھے تو سمجھ نہیں آ رہا تھا۔

میں دروازے کے قریب، کاؤنٹر کے ساتھ والی میز پر بیٹھا چسکیاں لے رہا تھا اور نظر کھڑکی سے باہر دلفریب نظاروں پر جمی تھی۔ سورج ڈھلنے لگا تھا مگر اب بھی کسی حد تک روشنی باقی تھی۔ ویسے بھی پہاڑوں اور جنگلوں میں گھرے اس قصبے میں رات بہت پہلے اتر آتی تھی۔

موسم سرما میرے لیے بیروزگاری کے ایام تھے۔ میں بھی گلہری کی طرح ذخیرہ کی گئی چیزوں پر یہ وقت گزارتا تھا۔ میری جیب خالی تھی اور سچ کہوں تو ایک ڈالر بھی فالتو جیب میں نہیں تھا کہ بے فکروں کی ٹولی کے ساتھ بیٹھ کر کم سے کم ایک داؤ ہی کھیل لیتا حالانکہ یہ لت مجھے بری طرح جکڑ چکی تھی اور اب پتے پھینکنے کو دل مچل رہا تھا۔

تقریباً دس منٹ بعد بے میرے پاس آیا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ اگر چاہوں تو یہاں بیٹھ کر صرف وائن پیوں، چاہوں تو بازی لگاؤں اور صرف وقت گزارہ کرنا ہے تو باہر چلا جاؤں۔ میں سمجھ گیا کہ اسے فارغ لوگوں کی موجودگی پسند نہیں۔ ویسے بھی اندر کافی لوگ تھے جو میری طرح سردیاں ختم ہوتے ہی اپنے اپنے بلوں سے اچھل کود کرنے کے لیے نکل پڑے تھے۔ اگرچہ یہ سب کچھ پال کا ہی تھا مگر اب کافی عرصے سے بے اس کو چلا رہا تھا جس کے عوض وہ پال کو اچھا خاصا کمیشن دیتا تھا۔ یہ اور بات کہ اس جگہ کی وجہ شہرت اب بھی صرف پال کا ہی نام تھا۔

''میں وائن بھی پیوں گا اور کھیلوں گا بھی۔'' میں نے سرد لہجے میں جواب دیا۔ یہ اور بات کہ جیب خالی تھی مگر مجھے یقین تھا کہ پھر بھی کچھ تو لگانے کو ہے۔ میں اتنا کنگلا ہوتا تو وائن پینے کیوں آتا۔ جیب میں بیس ڈالر تھے اور یہ میں نے مہینوں سے صرف اس لیے بچا رکھے تھے کہ موسم بہار میں اس سے کام شروع کرنے میں مدد مل سکے گی مگر بے کا طعنہ سننے کے بعد مجھے اپنی عزت نوٹ سے زیادہ قیمتی لگی تھی۔

''تو آؤ...'' اس نے مڑتے ہوئے دعوت دی اور انگلی سے سامنے کی طرف اشارہ کیا جہاں بازی پہ بازی چل رہی تھی۔

''گلاس ختم کر کے۔'' میں نے نظریں کھڑکی کی طرف موڑتے ہوئے کہا۔ مجھے درخت پر چڑھتی اترتی گلہریاں بہت خوبصورت لگ رہی تھیں۔

میں کھیلنے کے لیے میز پر پہنچا تو ڈوک بھی وہیں موجود تھا۔ اسے دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی۔ پورے ڈارک ٹمبر میں اس کی خوش قسمتی اور ایمان داری کے چرچے تھے۔ وہ ایک جنرل اسٹور بھی چلاتا تھا لیکن سچ پوچھو تو اس کی اصل آمدنی جوئے کی میز سے ہوتی تھی۔ دوسری میز پر پال تھا۔ چاہتا تو وہاں بھی بیٹھ سکتا تھا مگر میرا یقین تھا کہ جس میز پر ڈوک بیٹھا ہو، وہاں قسمت تم پر بھی ضرور مہربان ہو سکتی ہے۔ یہ میرا آزمودہ نسخہ تھا۔ ویسے میں پال کے ساتھ کھیلنے سے کتراتا ہی تھا۔ وہ بہت بے ایمانی کرتا تھا۔ اس وقت بھی پال کھیل رہا تھا۔ وائن کا آدھ بھرا گلاس اس کے برابر رکھا تھا اور ہاتھوں میں پتے تھے۔ وہ ہمیشہ کی طرح قہقہے لگا رہا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اب تک اس کی جیب میں اچھے خاصے نوٹ پہنچ چکے ہوں گے۔ وہاں ایک آدمی کی گنجائش تھی جسے میں نے اپنے لیے خوش قسمتی کا اشارہ سمجھا اور کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔

''کھیلو گے؟'' ڈوک نے ہنستے ہوئے پوچھا، میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

میں سرِ شام پہنچا تھا مگر موسم بہار کے باعث تھوڑی ہی دیر میں اندھیرا پھیلنے لگا۔ میں بھی کافی دیر تک کھیلتا رہا۔ کئی گھنٹوں کے بعد جب میں میز پر سے اٹھا تو ڈوک نشے میں چور تھا۔ اس وقت تک اس کی جیب خاصی بھاری اور بار تقریباً خالی ہو چکا تھا۔ اِکّا دُکّا لوگ بیٹھے تھے مگر وہ بھی اٹھنے کی تیاریوں میں تھے۔ اسی دوران پال اٹھا۔ اس نے اپنے سامنے رکھے نوٹ سمیٹے اور اوپری منزل کی طرف جانے والی سیڑھیوں کی طرف بڑھا۔ اسی لمحے بے میری طرف آیا اور مخصوص انداز میں صرف ایک لفظ کہا۔ ''بند۔'' میں بے

لفظی اعلان سے بہت اچھی طرح واقف تھا۔ یہ یہاں کی ایک ہدایت تھی کہ جب خالی تو کھیل ختم، اب جگہ خالی کرو دوسروں کے لیے۔ میں نے دیوار پر لگی گھڑی پر نظر ڈالی اور کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

اس سے پہلے کہ باہر نکلتا اچانک میری نظر سیڑھیوں کی طرف پڑی۔ مجھے حیرت ہوئی، کچھ دیر پہلے پال کو سیڑھیاں چڑھ کر اوپری منزل کی طرف جاتے دیکھا تھا مگر اس وقت وہ عین سیڑھیوں کے ساتھ والی میز پر بیٹھا تھا۔ میں اس کی طرف بڑھا۔

حالانکہ پورے ڈارک ٹمبر میں وہ جھوٹا اور بے ایمان مشہور تھا مگر سچ پوچھو تو کسی کو اس سے عداوت نہیں تھی۔ میں اکثر اس کے ساتھ بھی کھیلتا تھا۔ میں آج اس کے ساتھ نہ کھیلا تھا اور نہ ہی کوئی خاص بات چیت ہوئی تھی۔ بے کاؤنٹر صاف کر رہا تھا۔ ہال تقریباً خالی پڑا تھا۔ پال سامنے رکھے مرتبان کو دیکھے جا رہا تھا۔ ''ہائے پال... کیسے ہو؟'' میں نے قریب پہنچ کر خوش مزاجی سے کہا۔

''بہت عمدہ...'' اس نے بھی خوش دلی سے جواب دیا۔

''تم تو اوپری منزل پر جا رہے تھے پلٹ کیوں آئے؟''

''یہ بھول گیا تھا، لینے آیا تو سوچا چند لمحے اور بیٹھ جاؤں۔'' اس نے سامنے والی کرسی کی طرف انگلی سے اشارہ کر کے مجھے بیٹھنے کو کہا۔

پال کے سامنے رکھا مرتبان چھوٹا اور شیشے سے بنا تھا جس میں کوئی شفاف محلول بھرا تھا اور اس میں کسی چمکدار شے کے دو چھوٹے ٹکڑے تیر رہے تھے۔ ''یہ کیا ہے؟'' میں نے اشارہ کیا۔

''میری خوش نصیبی...'' اس نے مرتبان پر بڑے پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے جواب دیا۔ ''یہ سردیوں میں کہیں کھو گیا تھا مگر خدا کا شکر ہے کہ مجھے میری خوش نصیبی موسم بہار میں واپس مل گئی۔''

میں خوش نصیبی کا معاملہ سمجھ نہیں پایا حالانکہ کچھ دیر پہلے وہ اچھی خاصی رقم جیتا تھا مگر سچ کہوں تو مجھے دل سے یقین تھا کہ وہ خوش نصیبی سے نہیں بے ایمانی سے جیتا ہوگا۔ اگر پال اس مرتبان کو خوش نصیبی کہہ رہا تھا تو ہو سکتا تھا کہ اس میں واقعی کوئی خاص بات ہو مگر مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ کیا محسوس کر رہا ہے۔

اسی دوران چند لوگ اندر داخل ہوئے۔ ان میں سے ایک نے بے کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''کھلا ہے؟'' بے نے ہاں میں سر ہلا دیا۔ میں سمجھ گیا کہ طویل

سردیوں کے بعد اب اگر موسم بہار کے شروع میں گاہک کی شکل میں لکشمی آ رہی ہو تو اسے کون لوٹائے گا۔ اب اسے اتفاق کہیں کہ تھوڑی ہی دیر میں اچھے خاصے لوگ پہنچ گئے۔ پال کبھی مجھے، کبھی گاہکوں کو اور کبھی مرتبان کو دیکھے جا رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ ایک بار پھر اندر رونق عروج پر پہنچ گئی۔ ویسے مجھے بھی گھر جانے کی جلدی نہیں تھی، میں بھی جم گیا۔

اسی دوران میں نے مڑ کر دیکھا تو خوش گوار حیرت ہوئی۔ کونے کی ایک میز پر ویرا تنہا بیٹھی تھی۔ اس کے سامنے سینڈوچ رکھے تھے۔ ویرا کم گو تھی اور بہت لیے دیے رہتی تھی۔ اسے تاش کے اتنے کھیل آتے تھے کہ شاید ہی کسی ایک شخص کو اتنے زیادہ کھیل آتے ہوں مگر اکثر اسے ہارتا ہی دیکھا تھا۔

''ہائے ویرا...'' میں اٹھ کر اس کی طرف پہنچا۔

''بیٹھو۔'' اس نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ ''آج کھیل نہیں رہے، میں سمجھی تم پال کے ساتھ...''

''صرف گپیں مار رہا تھا۔'' میں نے قطع کلامی کی۔ ''مگر کھیل تو تم بھی نہیں رہی ہو۔'' میرا لہجہ استفساریہ تھا۔

''کھیلو گے؟''

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''تو ٹھیک ہے۔'' اس نے سینڈوچ کی پلیٹ ایک طرف کھسکائی اور سامنے رکھی تاش کی گڈی اٹھا کر پتے پھینکنے لگی۔

چار پانچ بازی کھیلنے کے بعد دل بھر گیا۔ ویسے بھی حسبِ عادت ویرا ہارتی رہی اور میں جو کچھ اب تک ڈوک سے ہار چکا تھا، وہ سب سود سمیت واپس مل گیا۔

ویسے تو ویرا خود اکثر ہار جاتی ہے لیکن اس کے حوالے سے ایک بات مشہور ہے۔ وہ یہ کہ اگر ویرا کسی کو کسی خاص میز پر بیٹھنے کا اشارہ بھی کر دے تو پھر جیت اس کا مقدر بنتی ہے اور میں یہ کئی بار تجربہ کر چکا تھا۔

کہاں گھنٹا بھر پہلے بے بار بند کرنے کی تیاریاں کر رہا تھا اور کہاں اب تن دہی سے کام میں جتا ہوا تھا۔ میں نے نظریں گھما کر چاروں طرف دیکھا۔ پال اسی میز پر بیٹھا تھا البتہ کافی سارے لوگ اس دوران میں آ چکے تھے۔ ڈھلتی رات میں بار کے خوشگوار گرم ماحول میں اچھی خاصی رونق ہو چکی تھی۔

''بس... اب ذرا آرام۔'' میں نے پتے میز پر پھینکے اور بے کی طرف دیکھ کر ہاتھ سے گلاس لانے کا اشارہ کیا۔ کافی بھیڑ تھی اور وہ بہت مصروف تھا مگر پھر بھی دو تین منٹ کے اندر اندر وہ گلاس میرے سامنے رکھ گیا۔ وہ ادھار دینے سے کتراتا تھا مگر مجھے یقین تھا کہ ویرا کے ساتھ کھیلتا دیکھ کر وہ سمجھ گیا ہوگا کہ

اب تو میں یقیناً خالی جیب بالکل نہیں رہوں گا۔
میں نے خالی گلاس میز پر رکھا تو کاؤنٹر پر کھڑا مکینی سب کے لیے ایک ایک گلاس پیش کرنے کا آرڈر دے رہا تھا۔ میری اس کی علیک سلیک بھی نہیں تھی اور ایسے لوگوں کو میں اجنبیوں میں شمار کرتا ہوں۔ رہی بات اس کے مفت گلاس کی تو مجھے اجنبیوں سے تحفے لینے کی عادت بھی نہیں تھی۔
میں اٹھنے ہی والا تھا کہ ایک اور اجنبی اندر داخل ہوا۔ مجھے اتنی بڑی تعداد میں اجنبیوں کی موجودگی پر کوئی حیرت نہیں تھی۔ موسم بہار میں یہاں دوسرے علاقوں سے اکثر لوگ تفریح یا پھر جنگل کی کٹائی کے ٹھیکے لے کر کمائی کے لیے آجاتے تھے۔
اچانک دروازہ کھلا اور جامنی رنگ کے سوٹ میں ملبوس وہ شخص اندر داخل ہوا اور ایک میز کے قریب ٹھہر کر چاروں طرف نظریں دوڑانے لگا۔ اس کا حلیہ کسی تو دولتیے کا سا تھا اور کسی حد تک مضحکہ خیز بھی۔ اس کے کوٹ کی اوپری جیب سے سونے کی بھاری زنجیر نکل کر اس کی واسکٹ تک جارہی تھی۔ وہ جیبی گھڑی ہوگی۔ جب زنجیر سونے کی تھی تو پھر گھڑی چاندی کی تو ہونے سے رہی۔ اس نے سر پر لمبوترا سا ہیٹ پہن رکھا تھا۔ اس کا حلیہ بتا رہا تھا کہ کسی اتفاق کے باعث ہی اسے دولت ملی ہوگی۔
وہ گہری نگاہوں سے چاروں طرف جائزہ لے رہا تھا۔ نہ جانے کیوں میں اسے دیکھ کر اٹھتے اٹھتے بیٹھ گیا۔ اس پر کتنوں نے توجہ دی، یہ تو نہیں جانتا، البتہ میری دلچسپی اجنبی میں تھی اور وہ بھی اس کے حلیے کے باعث۔
"لیڈیز اینڈ جنٹلمین..." اس نے بہ دستور نظریں گھماتے ہوئے نہایت بھاری آواز میں کہا۔ اس وقت ہال میں صرف ایک ہی عورت ویرا تھی اور باقی مرد۔ مفت گلاس کا جشن منانے والے اس کی طرف متوجہ ہو چکے تھے۔ ہال میں بڑی حد تک خاموشی تھی۔ اجنبی کی نظریں چاروں طرف گھوم رہی تھیں مگر لب خاموش تھے۔
"میرا نام ایزگے ہے۔" چند لمحوں کے توقف کے بعد اس نے حرف چبا چبا کر اپنا تعارف کرایا۔ اس کا لہجہ کسی اور ہی علاقے کا لگ رہا تھا۔ "فی الحال میں یہاں نیا ہوں اور رات ہو چکی ہے۔ مجھے شب بسری کے لیے جگہ چاہیے۔"
نہ جانے کب قصبے کی ایک کال گرل بھی اندر آچکی تھی۔ یہ سن کر وہ اس کی طرف بڑھ ہی رہی تھی کہ اس کے قریب بیٹھا ڈوک اٹھا اور اس نے ہاتھ سے اسے پیچھے دھکیل دیا۔ اس کے پاؤں لڑکھڑا رہے تھے۔ "ڈارک ٹمبر کے نوارد اجنبی..." اس نے لڑکھڑاتی آواز میں اسے مخاطب کیا۔ "میں تمہیں شب کے لیے اس قصبے کی سب سے عمدہ رہائش دے سکتا ہوں ... کے لیے تمہیں تھوڑا سا انتظار کرنا ہوگا۔" ڈوک نے ... ہاتھ سے میز کا سہارا لے رکھا تھا۔
"مجھے بھی کوئی جلدی نہیں..." ایزگے نے ... دیا اور دو قدم اس کی طرف بڑھائے۔ ہال میں ایک ... موج مستی کا سماں تھا۔ باتیں اور گلاس ٹکرانے کی آوا... پھر آنے لگیں۔
"تو مجھے یہ بازی ختم کر لینے دو۔" ڈوک اے ... انداز کر کے دوبارہ بیٹھ گیا۔
"او کے..." اس نے سر ہلا کر جواب دیا۔
خود کو ایزگے کے نام سے متعارف کرانے والے ... کا حلیہ ہی نہیں بلکہ اس کی جسمانی بناوٹ بھی عجیب سی ... میں نے غور سے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ ... بالکل چوہے جیسی تھی اور آنکھیں گول گول اور اندر کو ... ہوئی، بالکل الوؤں جیسی۔ میں نے گردن گھما کر دیکھا ... ڈوک کی میز کے قریب کھڑے اجنبی کو پال بھی گہری نگاہوں سے دیکھے جا رہا تھا۔ میں اٹھ کر پال کی طرف بڑھا۔
"تم یہاں کیا جھک مارنے آئے ہو؟" اسی ... میرے کانوں میں یہ جملہ پڑا۔ کوئی اس سے بات کر رہا ...
"مجھے سونے کی تلاش ہے۔" اس نے سادگی ... جواب دیا۔
اب میرا تجسس بڑھا اور مڑ کر دیکھا تو وہ مکینی تھا ... پھر اتنے اداس کیوں ہو... لو پیو، جیو اور خوش رہو۔" ... ہوئے اس نے ہاتھ میں پکڑی بوتل اس کے سر پر ... دی۔ اس کا چہرہ بھیگ گیا۔ "سونے کے نام جام دعا..." کہہ کر وہ ہنسا۔ "کل ہم سب جائیں گے اور ڈھیروں ... لے کر آئیں گے، جسے بیچ کر ایفل ٹاور خرید لیں گے۔" ہنستے ہوئے اونچی آواز میں کہے جا رہا تھا۔
یہ سنتے ہی ہال میں زور زور سے ہنسی کی آوازیں ... لگیں۔ اجنبی خاموش تھا مگر سب کی نگاہیں اس پر جمی تھیں۔ کچھ ہی دیر میں ماحول بدل گیا۔ تقریباً سارے ... اجنبی کو کن انکھیوں سے دیکھتے ہوئے سونے کی باتیں ... جا رہے تھے۔ وہ سب سے لاتعلق ڈوک کی میز کے ... کھڑا بازی ختم ہونے کا منتظر تھا۔ ڈوک نشے میں تھا لیکن ... بھی اس کی پوری توجہ پتوں پر تھی۔ محسوس ہو رہا تھا جیسے ... ہال میں ہونے والی سرگوشیوں اور اجنبی میں اس کی ... دلچسپی نہیں تھی مگر پھر بازی ایسی چلی کہ لگا ختم نہیں ہوگی۔

عام طور پر ڈوک جیتتا تھا مگر جب سے اجنبی آیا تب ... وہ بازی پہ بازی ہارتا گیا اور جیتنے کی آس میں وہ ایک ... نئی شروع کر دیتا مگر لگتا تھا کہ پتے بے وفائی پر اتر ... آئے تھے۔ حتیٰ کہ میں بھی اس سے اکیس ڈالر جیت چکا تھا ... میرے لیے خوش نصیبی کی بات تھی۔
اسی دوران پال بھی وہیں آگیا۔ "پیسے ختم ہو گئے تو ..." اس نے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر بٹوا نکالتے ... ہوئے ڈوک کو مخاطب کیا۔ "آخر کو تم میرے دوست بھی تو ..." ڈوک نے ہاتھ کے اشارے سے منع کر دیا۔
"ویسے یہ ڈارک ٹمبر ہے عجیب سا علاقہ۔" اسی دوران اجنبی نے کافی دیر بعد منہ کھولا اور پال سے مخاطب ہو کر کہا۔
یہ سنتے ہی وہاں موجود سب لوگ ہنس پڑے۔ میں بھی بہت زور سے ہنسا تھا۔ "یہ وہ راز ہے جو ہم سب جانتے ہیں۔" پال نے ہنستے ہنستے جواب دیا۔
اگرچہ میں اب کھیل تو نہیں رہا تھا مگر اٹھنے کو بھی دل نہیں چاہ رہا تھا۔ میرا تجسس اجنبی میں تھا۔ اسی دوران ... اٹھا اور باتھ روم کا کہہ کر کھڑکی کے قریب آیا۔ میں جانتا تھا کہ دراصل وہ اجنبی کی جاسوسی کے لیے اٹھا ہے۔ ... پہلے ہی یہ تاڑ چکا تھا کہ برآمدے کے سامنے اس کا گھوڑا کھڑا تھا جس پر تھیلا اور بستر بند لٹک رہا تھا۔
اگرچہ وہ قصبے میں نووارد تھا مگر جسمانی طور پر ایسا نہیں لگ رہا تھا کہ وہ کسی کو یہاں لڑائی بھڑائی میں کوئی نقصان پہنچا سکتا ہے۔ کہاں کئی گھنٹے پہلے بے یار بند کرنے کے چکر میں تھا اور اب آدھی رات ہونے والی تھی۔ ہم سب نشے میں دھت تھے، کسی کو وقت گزرنے کا احساس نہیں تھا۔ میں اس لیے بھی خوش تھا کہ گھر سے نکلتے وقت جیب میں پس ... کے بیس ڈالر تھے مگر اب اچھی خاصی رقم جیب کو بھاری بنا رہی تھی۔
میں نے محسوس کیا کہ ہم سب تو اپنی اوقات کے مطابق ... کھیل رہے تھے مگر پال بڑھ چڑھ کر شرط لگا رہا تھا۔ وہ داؤ پر ... رقم لگا رہا تھا کہ ممکن ہی نہیں کہ اسے محسوس نہ کیا جائے۔
"ایک بازی اور..." پال نے چاروں طرف دیکھا۔ سامنے ڈوک بیٹھا تھا۔
"کیوں نہیں..." اس نے لڑکھڑاتی آواز میں کہا۔
"تاش کی نئی گڈی لاؤ۔" پال نے چلا کر کہا۔ ایک ... منٹ بعد وہ پتے پھینٹ رہا تھا۔ اس بار اس نے آٹھ سو ڈالرز سے بازی شروع کی۔ یہ اتنی بڑی رقم تھی کہ اگر کاؤنٹی

پھیکی شیو

مہنگائی کے اس دور میں ایک شخص حجام کے پاس گیا اور پوچھا۔ "آج کل شیو بنانے کے کتنے پیسے لے رہے ہو؟"
"جناب پیسوں کا دور تو گزر چکا آج کل تیس روپے ہیں۔" حجام بولا۔
"تیس روپے؟" اس شخص نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔ "کچھ خدا کا خوف کرو۔"
"جناب، آپ ذرا چینی کا بھاؤ، فی کلو تو پوچھ کر آئیں۔"
"چینی کو رہنے دو، تم پھیکی ہی شیو بنا دو۔"



انتظامیہ کو پتا چل جاتا تو وہ غیر قانونی طور پر بھاری جوئے کے الزام میں یہ بار ہی بند کر سکتی تھی۔
اس بازی میں پال کے ساتھ کھیلنے والے ہم تینوں کی جیبوں میں خاصی رقم تھی۔ میں نے بھی داؤ لگا دیا اور پھر اس بازی میں ہماری صرف جیبیں ہی خالی نہیں ہوئیں بلکہ گھڑیاں، گلے کی زنجیر، انگوٹھیاں سب کچھ اتر کر پال کے کھاتے میں چلا گیا۔ تینوں کا حال ایک جیسا تھا، خوش تھا تو صرف پال۔
بازی جاری تھی پر داؤ لگانے کو کچھ نہیں بچا تھا۔ ہم تینوں ہاتھ کھڑے کر کے کرسی سے اٹھ گئے۔
"کھیل جاری ہے دوست..." اجنبی یہ کہتے ہوئے آگے بڑھا اور پال کے سامنے والی کرسی گھسیٹ کر اس پر بیٹھ گیا۔ "کھیل جاری رہے گا تینوں کی بازیاں میں اکیلا کھیلوں گا۔" یہ کہتے ہوئے اس نے دائیں بائیں کے پتے بھی اپنی طرف کھسکائے۔
یہ سنتے ہی ڈوک سمیت وہاں کھڑے سب نے تالیاں بجائیں۔ میں نے پال کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ سپاٹ تھا۔ اس نے سر ہلا کر چیلنج قبول کرنے کا اشارہ دیا اور پھر کھیل دوبارہ شروع ہو گیا۔
"یہ میرے پانچ سو ڈالرز..." اس نے کوٹ کے اندر کی جیب سے نوٹوں کی گڈی نکالی اور اس میں سے چند نوٹ نکال کر بے پروائی سے شرط کی رقم کی ڈھیری پر پھینکے۔
ویرا سب کچھ ہار چکی تھی۔ وہ تو ایک لفظ کہے بنا ہی وہاں سے نکل گئی۔ میں اور ڈوک بھی کنگال ہو چکے تھے لیکن پھر بھی

تماش بینوں میں کھڑے تھے۔ بازی ختم ہوئی، پال اس بار بھی جیت گیا۔ اس نے فاتحانہ نظروں سے اجنبی کی طرف دیکھا اور مسکراتے ہوئے نوٹوں کی ڈھیری اپنی طرف کھسکالی۔ ہم سب کو اپنی رقموں کے جانے کا افسوس تھا مگر اس سے بڑا افسوس پال کی جیت پر ہو رہا تھا اور وہ تھا کہ جیتتا ہی جا رہا تھا۔

ایک بار پھر بازی شروع ہوئی۔ کھیل اب صرف پال اور اجنبی کے درمیان تھا۔ یہ بازی بھی پال جیت گیا۔ اچانک ڈوک کو خیال آیا۔ اس نے جیبوں میں ہاتھ ڈالا اور پھر مسکرا کر میری طرف دیکھا۔ ”اگلی بازی میں ہم دونوں بھی ہوں گے۔“

”کیا...؟“ میں نے سرگوشی میں حیرت سے کہا۔

”نوٹوں کی ایک گڈی جیب میں ہے جو مجھے یاد نہیں رہی تھی۔“

”ٹھیک ہے۔“

اگلی بازی شروع ہوئی تو میز پر پال، اجنبی، ڈوک اور میں تھا۔ کھیل شروع ہوا۔ پہلا داؤ اکیس ڈالر کا تھا اور اتفاق سے ہم تینوں جیتے۔ پال پہلی بار ہارا۔ اس کے بعد تو بازی پہ بازی لگتی رہی اور پال ہارتا رہا۔ اس وقت پال کا چہرہ دیکھنے کے لائق تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ اسے سو پیاز اور سو جوتے ساتھ ساتھ کھانے پڑے ہوں۔

اگلی بازی شروع ہوئی تو سب نے بھاری داؤ لگایا اور نووارد ایز گے کے سوا سب ہی جیت گئے۔ مسلسل ہار سے پال کا چہرہ لٹک گیا تھا۔ میں قناعت پسند ہوں اس لیے جیب بھاری ہوئی تو خود ہی اٹھ گیا۔ ڈوک بیٹھا رہا اور پھر سب نے بھاری داؤ لگائے مگر اس بار اجنبی کے سوا سب ہار گئے۔

اس کے بعد تقریباً چھ بازیاں کھیلی گئیں مگر اجنبی جیتتا ہی رہا۔ پال کا چہرہ پیلا پڑ چکا تھا مگر پھر بھی وہ ڈٹا ہوا تھا... اور پھر جب اگلی بازی شروع ہوئی تو ڈوک نے سب کچھ بدل کر رکھ دیا۔

ڈوک نے نہ صرف خود داؤ لگایا بلکہ اجنبی کے سامنے رکھی رقم بھی اپنی طرف گھسیٹ لی۔ یہ دیکھ کر اس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات تھے۔ ”یہ رہی میری شرط کی رقم، اب رقم نکالو اور داؤ لگاؤ۔“ ڈوک نے پال کو چیلنج کیا۔

وہ تذبذب کا شکار تھا۔ سب خاموش کھڑے دیکھ رہے تھے کہ اب پال کیا کرتا ہے۔ شاید ہم سب کے لیے یہ پہلا موقع تھا جب پال کی آنکھوں میں خوف اور چہرے پر اتنی شدید مایوسی دیکھ رہے تھے۔ ”ٹھیک ہے۔“ اس نے گمبھیر لہجے میں کہا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ اس بازی کے لیے مجبوری میں تیار ہوا ہے، وہ بھی صرف اس لیے کہ کہیں انکار پر ناک نہ کٹ جائے۔

بازی شروع ہوئی... کچھ ہی دیر بعد، ایک [illegible] پال، ڈوک اور اجنبی سے ہار چکا تھا۔

ڈارک ٹمبر میں رہنے اور سب کو جاننے کے لیے [illegible] ہفتہ ہی بہت ہے، میں تو پھر بھی وہاں پچھلے تین سال سے رہا تھا۔ وہاں ایسے بھی کچھ لوگ تھے جو چار چھ سال سے وہیں رہ رہے تھے۔ بعض تو پچھلے آٹھ برس سے [illegible] ہوئے تھے۔ یہ وہ وقت تھا جب گھنے جنگلوں کے [illegible] ڈارک ٹمبر ٹاؤن آباد کیا جا رہا تھا۔ پال بھی قصبے میں پہلے آباد ہونے...... والوں میں سے ایک تھا۔ البتہ [illegible] تھے جو پال سے بھی پہلے آ کر آباد ہو چکے تھے۔

بتانا یہ چاہ رہا ہوں کہ ڈارک ٹمبر میں مجھ سمیت [illegible] یہ یاد نہیں تھا کہ جوئے میں پال کبھی اس بری طرح [illegible] ہو۔ چھوٹی موٹی ہار جیت تو ہوتی ہی رہتی ہیں مگر یہاں [illegible] وقت جتنی بڑی رقموں کے داؤ لگے، شاید ہی اس سے پہلے کسی شرط پر اتنی بھاری رقوم لگی ہوں۔ اس وقت پال [illegible] جذباتی صدمے سے دوچار نظر آ رہا تھا۔

کھیل لگ بھگ ختم ہو چکا تھا۔ اجنبی نے جیتی ہوئی [illegible] سے مجھے، ڈوک اور اسٹیفن کو کچھ نوٹ دیے۔ یہ وہ [illegible] اس کے شامل ہوتے ہوئے ہم داؤ پر لگا چکے تھے۔ اس نے سب کو اچھی خاصی رقم دی اور پھر سب کے لیے [illegible] کرنے کا آرڈر دیا۔ اجنبی اب بار میں کسی ہیرو [illegible] سب اسی کی طرف دیکھ رہے تھے۔ اس کے پاس [illegible] تھا، یہ کسی کو علم نہیں مگر وہ یہ بات ضرور جان چکے تھے کہ [illegible] کی جیب میں جیت کا بہت زیادہ مال ہے۔

”بازی چلے گی۔“ سب ڈرنکس میں مگن تھے کہ [illegible] نے کھڑے ہو کر بھاری آواز میں اعلان کیا۔ ”اب [illegible] میں اور یہ کھیلیں گے۔“ اس نے اجنبی کی طرف انگلی سے اشارہ کیا۔ یہ سنتے ہی سب چونک اٹھے۔

پورے ہال میں خاموشی طاری تھی۔ کم از کم میں یہ بات اچھی طرح جانتا تھا کہ پال نے جوئے میں جیت کر قصبے میں اپنا نام کمایا تھا، اب وہ کیسے گوارہ کر سکتا تھا کہ اجنبی کے ہاتھوں اس بری طرح ہار کر اٹھے۔ اس کے لیے شاید یہ شرم سے ڈوب مرنے کا مقام ہوتا۔

”مجھے چیلنج منظور ہے۔“ اجنبی اٹھا اور گلاس [illegible] ہوئے جواب دیا۔

”مگر داؤ بھاری رقم کا ہی ہوگا۔“ پال نے کہا۔

”منظور ہے۔“

بازی شروع ہوئی اور پھر رقموں کے ڈھیر لگتے گئے۔ رات تیزی سے ڈھل رہی تھی مگر بار کے آتشدانوں میں الاؤ روشن تھے اور کھیل بھی گرما گرم تھا۔ اجنبی مسلسل جیت رہا تھا اور پھر پہلی بار ایسا ہوا کہ پال نے اشارے سے بے کو بلا کر اس کے کان میں کچھ کہا۔ وہ خاموشی سے چلا گیا اور جب لوٹا تو اس کے ہاتھ میں لوہے سے بنا، سیاہ رنگ کا ایک چھوٹا باکس تھا۔ پال نے باکس کھولا تو اس میں نوٹوں کی گڈیاں تہ در تہ رکھی تھیں۔ کھیل جاری تھا اور پال کی شکست کا سلسلہ بھی۔

میں دو قدم آگے بڑھا اور کھڑکی سے باہر نظر ڈالی۔ رات کی سیاہی ہلکی پڑ رہی تھی مگر اب تو پال کے لیے یہ عزت کا معاملہ بن چکا تھا۔ وہ مسلسل ہارنے کے باوجود بھی کسی بھی قیمت پر کھیل ختم کرنے پر آمادہ نہیں تھا۔

اس دوران مزید دو مرتبہ پال نے بے کو اشارے سے قریب بلا کر اس کے کان میں کچھ کہا جسے سنتے ہی وہ باہر نکل جاتا۔ تیسری بار بھی وہ لوہے کا ایک سیاہ باکس لے آیا۔ اس میں بھی تہ در تہ نوٹ بھرے تھے۔ نوٹ، باکس سے نکل کر داؤ پر لگتے رہے اور ایز گے بڑے آرام سے انہیں جیتتا چلا گیا۔ اب تو سب کو صاف نظر آ رہا تھا کہ پال نے کھیل کو انا کا مسئلہ بنا لیا ہے۔ بار میں بڑا سنسنی خیز منظر تھا۔ سب دم سادھے اس انتظار میں تھے کہ دیکھیں اب کیا ہوتا ہے؟

میں نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ اندازہ ہو گیا کہ صبح ہونے میں تھوڑی ہی دیر رہ گئی تھی اور شب بسری کے لیے جگہ کی تلاش میں آنے والے ایز گے کی تقریباً پوری رات ہی بار میں گزرنے والی تھی۔ میز پر بھاری رقم پڑی تھی۔ پال اور ایز گے ایک دوسرے کے سامنے، اپنے اپنے پتوں پر نظریں گاڑھے بیٹھے تھے اور تماش بین تجسس کے باعث دم سادھے کھڑے تھے۔ بے تین بار باہر جا کر رقم لا چکا تھا اور سب کو ہی اندازہ تھا کہ پال سارا جمع پونجی لگا چکا ہے اب معاملہ آر یا پار کا تھا۔

پال کی پیشانی پر پسینے کے قطرے چمک رہے تھے۔ اس کے ایک ہاتھ میں پتے تھے تو دوسرے کی مٹھی بھنچی ہوئی تھی جس سے اس کے اندرونی اضطراب کا صاف اندازہ لگایا جا سکتا تھا۔ ”میں نے تم سے کیا کہا تھا......“ مجھے لگا جیسے پال مجھ سے کہہ رہا ہو لیکن سمجھ نہیں سکا کہ وہ کیا کہنا چاہ رہا تھا۔

”تم یہ بازی کھیلو گے۔“ اس نے ایک بار پھر کہا۔

”اگر تم میں سے کوئی آگے بڑھ کر یہ بازی جاری رکھنا چاہے تو مجھے منظور ہے۔“ ایز گے نے بھی چاروں طرف دیکھا۔ ”ویسے...“ اس نے لمحہ بھر کا توقف کیا۔ ”بہت بڑا داؤ لگ چکا مگر مجھے یقین ہے کہ بازی میں ہی ماروں گا۔“ اس کا لہجہ فاتحانہ تھا۔ ”ہے تم میں کوئی جوان ہمت والا جو یہ سب کچھ حاصل کرنا چاہے۔“ ایز گے نے انگلی سے رقم کی طرف اشارہ کیا اور جب کسی نے کوئی جواب نہیں دیا تو وہ پتے میز پر پھینک، ہاتھ جھاڑ کر کھڑا ہو گیا۔

کس میں ہمت تھی کہ اب داؤ لگاتا۔ لوگ رقم ہی نہیں اپنے پاس موجود ہر قسم کی قیمتی چیزیں تک ہار چکے تھے۔ گھڑی، انگوٹھی اور گلے کی چین تک تو میں ہار بیٹھا تھا۔

ایز گے نے کھڑے ہو کر چند لمحے تک سب کی طرف دیکھا۔ اس کے ہونٹوں پر دبی دبی مسکراہٹ تھی۔ میز پر بھاری رقم پڑی تھی جو اب اس کی جیب میں جانے والی تھی۔ میں نے پال کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر بدترین شکست کے آثار تھے۔ وہ میز پر رکھی رقم کو دیکھ رہا تھا۔ وہ اس کی برسوں کی کمائی تھی مگر چند گھنٹوں میں ہی اس کے ہاتھ سے چکنی مچھلی کی طرح پھسل کر پرائی ہو چکی تھی۔ باہر نووارد کا گھوڑا کھڑا تھا اور وہ خود اندر کھڑا میز پر سے جیتی گئی رقم سمیٹ رہا تھا۔

اسی دوران پال نے آنکھوں ہی آنکھوں میں کوئی اشارہ کیا۔ اس وقت میری نظریں پال پر تھیں مگر سمجھ نہیں سکا کہ وہ کس سے اور کیا کہنے کی کوشش کر رہا ہے۔

وہ قصبے کی بدنام ترین عورت اور پال کی بہت قریبی دوست مارتھا تھی۔ اکثر دونوں ساتھ ہی رہتے تھے۔ ان میں برسوں پرانی دوستی تھی۔ وہ بھی ٹکٹکی باندھے پال کی شکست کا منظر دیکھ رہی تھی۔ اچانک وہ جھکی، میکسی کو تھوڑا سا اوپر اٹھایا اور اگلے ہی لمحے پنڈلی سے بندھا چمکدار، نہایت تیز اور لمبا خنجر اُس کے ہاتھ میں تھا۔ مضبوط ہاتھ پاؤں والی مارتھا تیزی سے آگے بڑھی اور پیچھے سے ایز گے کو دبوچ لیا۔ وہ جھک کر میز پر سے رقم اکٹھی کرنے میں مصروف تھا۔ اسے صورت حال کے بدل جانے کا اندازہ بھی نہیں تھا۔ مارتھا کا خنجر اس کی گردن پر تھا۔ ”رقم یہیں چھوڑو اور باہر نکلو۔“ اس نے سفاکی سے کہا۔ اس کے پیچھے دو اجنبی اور بھی باہر نکلے۔

بار کے اندر خوف پھیل چکا تھا۔ کسی کو کچھ پتا نہیں تھا کہ یہ سب کچھ کیسے ہو گیا۔ ان کے نکلتے ہی پال نے بہ آواز بلند کہا۔ ”بار بند...“

ہم سب کچھ دیر پہلے بار میں پیش آنے والی ناخوش

گوار حقیقت کو تسلیم کر چکے تھے مگر اس سے پہلے کہ کوئی باہر نکلتا گولی چلنے کی آواز سنائی دی۔ آواز بار کے داخلی دروازے کے قریب سے آئی تھی۔ ہم سب باہر کی طرف دوڑے۔ اسی دوران ایک اور گولی چلی۔

جب تک ہم باہر نکلتے تب تک گھوڑے دوڑنے کی آوازیں آنا شروع ہو گئی تھیں۔ سامنے پال کے وفادار ملازم اور چھکے دار بے اور مارتھا خون میں لت پت پڑے زندگی کی آخری سانسیں لے رہے تھے۔ آسمان پر سورج کی سپیدی پھیلنے لگی تھی اور سامنے ایزگے گھوڑا دوڑاتا ہوا جا رہا تھا۔

باہر نکلنے والوں میں پال بھی تھا۔ اس نے ایک نظر آخری سانسیں لیتی مارتھا اور اپنے وفادار ملازم بے پر ڈالی لیکن جیسے ہی اسے ایزگے جاتا نظر آیا وہ حلق پھاڑ کر نہایت ہی بھیانک انداز میں چلانے لگا۔ سب سمجھ گئے کہ پال اب آخری بازی ہارا ہے۔ میں بھی اس وقت پال کے آنکھوں ہی آنکھوں میں کیے جانے والے اشارے کو سمجھ چکا تھا۔ سدا کا بے ایمان اتنی آسانی سے اپنا جمع جتھا کیسے کسی کو لے جانے دیتا مگر وہ تو وارد بھی اس کا باپ نکلا۔

جو کچھ ہوا، وہ ہم سب کے لیے بھیانک تھا۔ کچھ ہی دیر میں پولیس کو اطلاع کر دی گئی مگر ان کے پہنچنے سے پہلے ہی مجھ سمیت کئی لوگ نظر بچا کر جائے وقوعہ سے کھسک لیے۔

وہ رات ڈارک ٹمبر میں اس اجنبی کی تو پہلی اور شاید آخری رات تھی۔ اس کے بعد وہ پھر کبھی نظر نہیں آیا مگر حقیقت یہ ہے کہ اس کے بعد پال اور اس کا بار۔۔۔ دونوں ہی ختم ہو کر رہ گئے۔ سب کی نظر میں پال برباد ہو چکا تھا۔ وہ خود تو کچھ کرتا نہیں تھا، کئی سالوں سے بے ہی نے سب کچھ سنبھال رکھا تھا مگر اس رات کے خونی واقعے کے بعد۔۔۔ ڈارک ٹمبر کی سماجی زندگی میں پال صرف چند گھنٹوں میں تباہ ہو جانے کی انوکھی داستان بن کر رہ گیا تھا۔

وہ موسمِ بہار اور اس کے بعد، ساری گرمیاں قصبے میں صرف پال کا ہی چرچا رہا۔ قصبے میں جوئے کا اڈا بند ہو گیا تھا۔ ایک دو پب ہی رہ گئے تھے مگر وہاں بھی لوگ جانے سے گریز کرتے تھے۔ پولیس نے کچھ عرصہ تفتیش کی مگر پال کو بے گناہ قرار دے دیا جس کے کچھ عرصے بعد پال بھی خاموشی سے کہیں نکل گیا۔ قصبے والوں کا خیال تھا کہ پال لوگوں کی بدسلوکی، اپنی تباہی اور عزت گنوا بیٹھنے سے دل برداشتہ ہو کر قصبہ چھوڑ گیا ہے۔ پورا موسمِ گرما پال کا چرچا رہا اور پھر ایک بار موسم نے انگڑائی لی۔ سردیاں شروع ہونے والی تھیں کہ میں نے بھی سامان باندھا اور ڈارک ٹمبر کو خیرباد کہہ کر جنوب کی طرف نکل گیا۔ مجھ میں اب یہاں کے بھیانک موسمِ سرما اور اس دوران زندگی پر طاری جمود برداشت کرنے کی مزید ہمت نہیں تھی۔

☆☆☆

کیلی فورنیا سے سان ڈیاگو اور یوکان تک میں سونے کی مختلف کانوں میں کام کرتا رہا اور کافی پیسا کما کر [illegible] بعد آخر سان فرانسسکو پہنچ گیا۔ اس کی آب و ہوا اور معتدل موسم مجھے بہت پسند آیا۔ ارادہ تھا کہ اب باقی وقت یہیں گزاروں گا۔

میں مسلسل کام کرنے سے تھک چکا تھا۔ میں نے ایک ہفتے کی چھٹیاں لیں تاکہ خود کو تروتازہ کر سکوں۔ وہ میری چھٹیوں کا پہلا دن تھا۔ اس دن ارادہ گھوم پھر کر خود کو تروتازہ کرنے کا تھا۔ وہ ساحل کے کنارے، بندرگاہ کے قریب ایک خوبصورت مقام تھا جو کامریڈ پوائنٹ کے نام سے مشہور تھا۔ وہاں کئی چھوٹے موٹے کیسینوز اور بار تھے۔ اس دن موسم بھی بہت خوش گوار تھا۔ سردیوں کی دھند چھٹ چکی تھی اور موسمِ بہار کے آغاز پر رنگ برنگ پھول کھلنا شروع ہو چکے تھے۔ پت جھڑ کے ٹنڈ منڈ درختوں پر نئی کونپلیں کھل رہی تھیں۔

میں نے دن کا بڑا حصہ ساحل پر گھوم پھر کر گزارا اور سہ پہر کو ایک فاسٹ فوڈ ریسٹوران میں کھانا کھا کر باہر نکلا تو لکی کیسینو کے بورڈ پر نظر پڑی۔

یہ سچ ہے کہ پال والے واقعے کے بعد سے میں نے جوا تو کیا کھیلنا، تاش کو بھی ہاتھ نہیں لگایا تھا مگر اچانک جانے کیا سوجھی کہ کیسینو کی طرف بڑھنے لگا۔

وہ چھوٹا سہی مگر شاندار انداز میں سجایا گیا کیسینو تھا۔ میں اِدھر اُدھر گھومتا رہا۔ اچھے خاصے لوگ موجود تھے۔

”ٹامی... اُس میز پر۔“ اچانک پیچھے سے میرے کانوں میں ایک آواز آئی۔ لہجہ کچھ مانوس لگا پر فوری طور پر یاد نہیں آیا کہ وہ کس کی آواز ہو سکتی ہے۔ میں نے تجسس کے باعث مڑ کر دیکھا۔ وہاں کئی لوگ تھے۔ اسی دوران وہ آواز پھر سنائی دی۔ ”جمی... وہاں ٹوکن پہنچا دو۔“

میں چونک گیا۔ اس بار جس نے کہا تھا، اس کی پشت میری جانب تھی۔ وہ سیاہ رنگ کے قیمتی لباس اور چمکدار بوٹ میں ملبوس شخص تھا۔ اگرچہ میں اس کا چہرہ نہیں دیکھ پایا تھا مگر مجھے سو فیصد یقین تھا کہ یہ وہی ہے۔ میں آگے بڑھا اور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ ”ہیلو پال... میرے پرانے بچھڑے ہوئے دوست۔“

یہ سنتے ہی وہ تیزی سے پلٹا۔ ہم تین چار سال کے بعد ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ وہ چند لمحوں تک ساکت کھڑا حیرت سے مجھے دیکھتا رہا۔ ”تم... ارے ایڈی کیسے؟“ اس کے چہرے پر بھی خوش گوار حیرت پھیل گئی۔ ”میں تو تم کو بھول ہی چکا تھا۔“

”میں بھی... مگر اتفاق ہے۔“

”تو تم نے بھی ڈارک ٹمبر چھوڑ دیا۔“

”بہت عرصے ایک جگہ جمے رہنا ٹھیک نہیں ہوتا، شاید اسی لیے۔“ میں مسکرایا۔ ”مگر تم تو واقعی شان دار قسمت کے مالک ہو۔“

”قسمت...!“ وہ طنزیہ انداز میں ہنس دیا۔ ”قسمت کچھ نہیں ہوتی۔“ اس نے انگلی اپنی پیشانی پر رکھی۔ ”بس عقل ہونی چاہیے۔“

”شاید تم ٹھیک کہتے ہو۔“ میں نے سر ہلا کر اس سے اتفاق کیا۔ ”ورنہ قسمت نے تو اُس رات تمہیں برباد ہی کر ڈالا تھا۔“

”مجھے نہیں، مارتھا اور بے کو۔“ اس کے چہرے پر عیارانہ مسکراہٹ تھی۔ ”میں نے تو جو ہارا سو ہارا۔ مارتھا اور بے نے میرے پاس جتنی بھی رقم پس انداز کی تھی، وہ بھی چلی گئی تھی۔“

”تو کیا اُس رات جو بے تین لوہے کے باکس لے کر...“ اچانک مجھے یاد آیا۔

”وہ مارتھا اور بے کی بچت تھی۔“ پال مسکرایا۔ ”میرے پاس جو تھا وہ پہلے ہی ہار چکا تھا مگر پھر بھی...“

”حیرت ہے تم اس رات اپنے سامنے خوش قسمتی کا مرتبان رکھے بیٹھے تھے مگر پھر بھی ہارتے رہے۔“

”تمہاری یادداشت بہت اچھی ہے۔“ اس نے مسکرا کر کہا۔ ”مگر یہ تم مرتبان کو کیسے دوش دے سکتے ہو۔ سب کچھ اسی کی خوش قسمتی کے سبب تو ہوا۔“ وہ مسکرایا۔

”میں سمجھا نہیں۔“

”تمہیں یاد ہو گا، میں نے اس رات کہا تھا کہ مرتبان مجھ سے کھو گیا تھا، اب ملا ہے اور پھر...“ وہ خاموش ہوا اور چاروں طرف ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ سب کچھ اسی کے سبب ہوا، بس عقل نے میرا ساتھ دیا۔“

پال کی باتیں پیچیدہ تھیں مگر میرا ذہن تیزی سے اس کی گتھیاں سلجھانے میں مصروف تھا۔ مجھے اب سب کچھ سمجھ آنے لگا تھا۔ پال اور مارتھا نے اس کے پاس خطیر رقم جمع کروا رکھی تھی جس پر اس کی نیت خراب ہو گئی تھی۔

”تو کیا اس کا مطلب...“ میرے منہ سے بے دھیانی میں نکل گیا۔

”کیا مطلب...“ یہ سنتے ہی پال چونک گیا۔

”اے پال... کیسا چل رہا سب کچھ؟“ اسی دوران کسی نے پکارا۔

”سب ٹھیک ٹھاک...“ پال نے بھی اونچی آواز میں جواب دیا۔

میں نے گردن موڑ کر دیکھا۔ سامنے سے آتے شخص کو دیکھ کر مجھ پر حیرت کا ایک اور پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ وہ ایزگے تھا۔ اس رات کی طرح بینگنی رنگ کے لباس میں ملبوس، عجیب سا حلیہ بنائے وہ سامنے سے آ رہا تھا۔

میں سب کچھ سمجھ گیا تھا۔ اسی دوران وہ قریب آ گیا۔ ”یہ میرا بزنس پارٹنر ہے اور یہ ہیں ایڈی...“

”اوہ...“ میرے منہ سے نکلا۔ مجھ پر حیرت کا ایک اور پہاڑ ٹوٹا۔

”تو یہ ان دونوں کی ملی بھگت تھی کہ بھاری داؤ کا ناٹک رچا کر پہلے ڈارک ٹمبر والوں کی جیبیں خالی کرائیں اور پھر بے اور مارتھا کی رقم لے کر ان کا بھی پتا صاف کر کے نکل جائیں۔“ میرا دماغ بھک سے اڑ گیا۔

”تم ہمیشہ کے کمینے تھے...“ میں نے پال کا ہاتھ پکڑ کر دوستانہ لہجے میں کہا تو ایزگے ہنس دیا۔

”یہ بچپن سے ہی نہایت کمینہ، جھوٹا اور دغا باز ہے...“ ایزگے بولا۔

”اسی لیے شاید تمہارا پارٹنر ہے۔“ میں نے لقمہ دیا۔

”نہیں... میں اس سے بڑا کمینہ اور دغا باز ہوں، اس لیے ہماری پارٹنرشپ ہے اور وہ بھی بچپن سے۔“

”اوہ میرے خدا... کیسے کیسے لوگ ہیں۔“ میں نے دل میں کہا۔ ”ٹھیک ہے، پھر ملیں گے۔“ میں نے دونوں سے ہاتھ ملایا اور دل ہی دل میں ان پر لعنت بھیجتا ہوا باہر نکل آیا۔ ”ڈارک ٹمبر والے اسے ٹھیک بے ایمان کہتے تھے۔“ میں بڑبڑایا۔ باہر نکلتے ہی ساحل کی ٹھنڈی ہوا کا خوشگوار جھونکا چہرے سے ٹکرایا۔ دو بدترین بے ایمانوں اور چالبازوں سے ملاقات پر جو میرے دماغ پر بوجھ تھا، وہ تھوڑا سا ہلکا ہو گیا۔

میں تروتازہ ہونے کے لیے گھر سے نکلا تھا مگر یقین تھا کہ اس اتفاقی ملاقات کے بعد ہونے والی ذہنی تھکن دور ہونے میں اب کئی روز لگ جائیں گے۔

☆

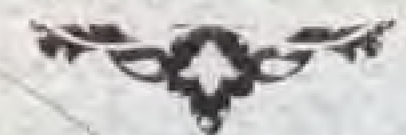
محفلِ شعر و سخن



❁ زین العابدین...... نور پور تھل
وہ تجھے بھولے ہیں تو تجھ پہ بھی لازم ہے میرؔ
خاک ڈال، آگ لگا، نام نہ لے، یاد نہ کر

❁ سارہ...... کراچی
ہم نے ہر دکھ کو محبت کا تسلسل سمجھا
ہم کوئی تم تھے، کہ دنیا سے شکایت کرتے
ہم نے سوکھی ہوئی شاخوں پر لہو چھڑکا تھا
پھول اگر اب بھی نہ کھلتے تو قیامت کرتے

❁ سعید عباسی...... بہاولپور
راستے پُرخار تھے لیکن سفر اچھا لگا
جستجو میں اُن کی پھرنا دربدر اچھا لگا



❁ مزمل اسلم...... لیہ
یاد ماضی عذاب ہے یارب
چھین لے مجھ سے حافظہ میرا

❁ حافظ شاہد عمران...... ڈسٹرکٹ جیل گوجرانوالہ
یوں تو غلط نہیں چہروں کا تاثر لیکن
لوگ ویسے بھی نہیں جیسے نظر آتے ہیں

❁ رمضان پاشا...... گلشن اقبال، کراچی
اس زندگی میں فراغت کسے نصیب
اتنا نہ یاد آ کہ تجھے بھول جائیں ہم

❁ محمد خواجہ...... کورنگی، کراچی
رنجشیں اتنی نہ تھیں ترکِ تعلق کرتے
بات کچھ اور تھی اس دل کو جلانے کے لیے
بات کوئی بھی کروں آنکھ چھلک جاتی ہے
کیا بہانہ کروں میں بات بنانے کے لیے

❁ محمد اقبال اداس...... گلیانہ روڈ، کھاریاں
رابطوں سے نفرتوں کے راستے کم ہوگئے
اک اک کر کے دلوں کے فاصلے کم ہوگئے
ترکِ رسم دوستی ہرگز میرا مسلک نہ تھا
اتفاقاً دوستوں سے رابطے کم ہوگئے

❁ این ایس آر مدثر...... بلدیہ ٹاؤن، کراچی
بتا کون سے موسم میں ہم امید وفا رکھیں
تجھ کو تو جنوری میں بھی ہم یاد نہیں آئے

❁ محمد رشید سیال...... روہڑی، ضلع سکھر
کچھ اور بڑھ گئے اندھیرے تو کیا ہوا
مایوس تو نہیں ہیں طلوعِ سحر سے ہم

❁ طالب حسین طلحہ...... بہاولپور
ہم چھوڑ چلے ہیں محفل کو یاد آئیں کبھی تو مت رونا
اس دل کو تسلی دے لینا گھبرائے کبھی تو مت رونا
اک خواب تھا دیکھا جو ہم نے جب آنکھ کھلی تو ٹوٹ گیا
یہ پیار تمہیں سپنا بن کر تڑپائے کبھی تو مت رونا

❁ محمد امجد ریاض...... ساہیوال
میرے شہر میں میری نسل کو لوٹنے والو
پتا ہے کس طرح بیٹا جوان ہوتا ہے

❁ دیم اقبال وٹو...... بہاولنگر
بہت پھول سے کرنا شمر سے بھی مگر دیکھو
ہیں کے خار سے بے رغبتی اچھی نہیں لگتی

❁ محمد اشفاق سیال...... شور کوٹ سٹی
غمِ ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک!

❁ ڈاکٹر ایچ اے لطیف...... فقیر والی
اگر درد کو محسوس کرنے کا سلیقہ ہو
تو کسی کی خامشی بھی اکثر بات کرتی ہے

❁ ادریس احمد خان...... ناظم آباد، کراچی
حوصلہ تجھ کو نہ تھا مجھ سے جدا ہونے کا
ورنہ کاجل تیری آنکھوں میں نہ پھیلا ہوتا

❁ سعدیہ بخاری...... اٹک سٹی
سو بار چمن مہکا، سو بار بہار آئی
دنیا کی وہی رونق، دل کی وہی تنہائی

❁ افتخار احمد تارڑ...... کوٹ قادر بخش
ملنا تھا اتفاق بچھڑنا نصیب تھا
وہ اتنا ہی دور ہوگیا جتنا قریب تھا
اس کو دیکھنے کو ترستی رہ گئیں مری آنکھیں
جس کے ہاتھوں کی لکیروں پہ مرا نصیب تھا

❁ محمد افضل خان...... پشاور
کبھی عرش پر کبھی فرش پر کبھی ان کا در کبھی دربدر
غمِ زندگی تیرا شکریہ، میں کہاں کہاں سے گزر گیا

❁ سلیم کامریڈ...... کھاٹاں
دیارِ پیرِ مغاں میں آکر یہ اک حقیقت کھلی ساغرؔ
خدا کی بستی کے رہنے والے تو لوٹ لیتے ہیں یار بن کر

❁ رانا حبیب الرحمٰن...... لاہور
تھی نہ اپنے گناہوں کی ہم کو خبر
دیکھتے رہے اوروں کے عیب و ہنر

❁ زید چودھری...... ساہیوال
کمبخت مانتا ہی نہیں دل اسے بھلانے کو
میں ہاتھ جوڑتا ہوں، وہ پاؤں پڑتا ہے

❁ مس مزمل حسین...... بھیرہ
وفا کریں گے، نبھائیں گے بات مانیں گے
تمہیں بھی یاد ہے کچھ یہ کلام کس کا تھا

❁ محمد ہمایوں تنولی...... مانسہرہ
اے صید زبوں قبر کے کیڑوں کو ذرا دیکھ
کیا زادِ سفر تو نے لیا، عقبیٰ کے سفر کو

❁ ملک قیصر اعوان...... سرگودھا
تمنا دید کی کرے موسیٰؑ اور طور جل جائے
عجب دستورِ الفت ہے کرے کوئی بھرے کوئی

❁ حافظ عرفان...... سرگودھا
یہ فیضانِ نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی
سکھائے کس نے اسماعیلؑ کو آدابِ فرزندی

❁ سادات احمد سعید کھارا...... نور پور تھل
نزاکت لے کے آنکھوں میں، وہ ان کا دیکھنا توبہ!
الٰہی ہم انہیں دیکھیں کہ ان کا دیکھنا دیکھیں

❁ محمد وسیم زاہد زرگر...... نئی منڈی، سکھیکی
بچھڑا کچھ اس ادا سے کہ رُت ہی بدل گئی
اک شخص سارے شہر کو ویران کر گیا

❁ طارق کلیر اینڈ وحید اختر...... نور پور تھل
کس نے کہا تجھے کہ انجان بن کے آیا کر
میرے دل کے آئینے میں مہمان بن کے آیا کر
پاگل اک تجھے ہی تو بخشی ہے دل کی حکومت
یہ تیری سلطنت ہے تو سلطان بن کے آیا کر

❁ محمد بابر شہزاد خان نیازی...... نور پور تھل
پوچھا جو ان سے چاند نکلتا ہے کس طرح
چہرے پہ زلف ڈال کر جھٹکا دیا کہ یوں

❁ غلام مصطفیٰ خاں...... وہاڑی
لٹیرے رہنما بن کر اگر لوٹیں رعایا کو
تو دنیا کو کبھی یہ رہبری اچھی نہیں لگتی

❁ محمد عقیل چٹھہ...... حافظ آباد
خوشبو بتا رہی ہے کہ وہ راستے میں ہے
موجِ ہوا کے ہاتھ میں اس کا سراغ ہے

❁ ایم ساجد علی قریشی...... میانوالی
اسے وہ سب سوال آتے ہیں
جو مجھے لاجواب کرتے ہیں

❁ طاہرہ یاسمین...... سرگودھا
چوم لیتی ہیں شانوں سے لٹک کر کبھی چہرہ کبھی لب
تم نے زلفوں کو بہت سر پہ چڑھا رکھا ہے

❄ جنید احمد ملک......گلستان جوہر، کراچی
کمرے میں اس نے چھپ کے، جلایا تھا میرا خط
پھر راکھ سارے شہر میں کیسے بکھر گئی

❄ ریاض بٹ......حسن ابدال
پہلے میرے خلوص کو دیتے رہے فریب
آخر میرے خلوص کو بدنام کر دیا

❄ محمد اقبال......کورنگی، کراچی
ہم نہ ہوں تو زمانے کی سانس رک جائے
قتیل وقت کے سینے میں ہم دھڑکتے ہیں

❄ امتیاز خٹک سی......اٹک سٹی
خدا کرے کہ مرے اک بھی ہم وطن کے لیے
حیات جرم نہ ہو زندگی وبال نہ ہو

❄ مولا بخش......میرپور ساکرو
جو عکس بن کے مری چشم تر میں رہتا ہے
عجیب شخص ہے پانی کے گھر میں رہتا ہے

❄ عبدالعزیز......جناح اسکوائر، ملیر
تیرے قریب آ کے بڑی الجھنوں میں ہوں
میں تیرے دوستوں میں ہوں کہ دشمنوں میں ہوں

❄ رضوان تنولی......اورنگی ٹاؤن، کراچی
ہم جس کیلئے اپنی بہاروں سے لڑے ہیں
وہ ہم سے بچھڑ کے بھی گلابوں کی طرح ہے

❄ ارسلا افضل......روہڑی
چاہت بھرے دو لفظ ہر اک لفظ میں دعا
مقروض کر دیا ہے تمہارے خلوص نے

❄ سید محی الدین اشفاق......فتح پور، لیہ
کس سوچ میں غرق ہو کہ آنچل ڈھلک گیا
کیا محویت ہے زلفِ پریشاں سنواریے

❄ شاہ زیب......بہاولپور
عشق میں جس کے یہ احوال بنا رکھا ہے
اب وہی کہتا ہے اس وضع میں کیا رکھا ہے

❄ صفدر عباسی......لاہور
اوڑھے ہوئے تاروں کی چمکتی ہوئی چادر
ندی کوئی بل کھائے تو لگتا ہے کہ تم ہو

❄ دلاور حسین......کراچی
گلشن پرست ہوں مجھے گل ہی نہیں عزیز
کانٹوں سے بھی نباہ کیے جا رہا ہوں میں

❄ جاوید لودھی......ملتان
مدت ہوئی ہے کوئے بتاں کی طرف گئے
آوارگی سے دل کو کہاں تک بچائیں ہم

❄ فرحان احمد......پاک کالونی، کراچی
کل رات ایک شخص تھا مجھ سا کسی کے ساتھ
جانے مری نگاہ کا دھوکا تھا یا تھا میں

❄ اظہر جمیل......ملیر، کراچی
ہوش میں آ چکے تھے ہم، جوش میں آ چکے تھے ہم
بزم کا رنگ دیکھ کر سر نہ مگر اٹھا سکے

❄ محمد کمال انور......اورنگی ٹاؤن، کراچی
میری بھی کچھ خطائیں تھیں، قاضیِ شہر نے مگر
اپنے بھی جتنے جرم تھے میرے ہی سر لگا دیے

❄ نور العین......اسلام آباد
مسکراتے ہوئے وہ مجمع اغیار کے ساتھ
آج یوں بزم میں آئے ہیں کہ جی جانتا ہے

❄ احمد مختار......میانوالی
کچھ تیری ہمتوں پہ ہی الزام آئے گا
مانا کہ راستہ ہے کٹھن چھوڑ کے نہ جا

❄ جبران احمد ملک......گلشن اقبال
دل کی بات زباں پر لا کر اب تک ہم دکھ سہتے ہیں
ہم نے سنا تھا اس بستی میں دل والے بھی رہتے ہیں

❄ زوہیب احمد ملک......گلستان جوہر، کراچی
ایک ہمیں آوارہ کہنا کوئی بڑا الزام نہیں
دنیا والے دل والوں کو اور بہت کچھ کہتے ہیں

کوپن برائے شمارہ اپریل 2013

مُحفلِ شعر و سُخن

نام : --

پتا : --

اجنبی شناسا

تنویر ریاض

کبھی کبھی اجنبی چہروں میں اپنائیت اور شناسائوں میں غیریت محسوس ہوتی ہے... اور یہ سارا گھن چکر جذبات کے تلاطم سے پیدا ہوتا ہے۔ اس کی زندگی بھی کچھ ایسے ہی مدوجذر سے دوچار تھی، جب ایک حسین سفر پر وہ اس کے ہم قدم تھی اور آج ان کے درمیان برسوں کی جدائی حائل تھی۔

ورق ورق چونکاتے، بل کھاتے حالات کی روداد



جارج ہینسی کی یادداشت بہت اچھی تھی اور برسوں پرانی باتیں بھی اس کے ذہن کے گوشے میں محفوظ رہتی تھیں۔ اسے آج بھی وہ کہانی یاد تھی جس میں ایک شخص نے چلتی ہوئی ٹرین کے سامنے آکر ڈرائیور کے سامنے اپنا ہیٹ لہرایا تھا۔ اس طویل عرصے میں یہ کہانی تین حصوں پر پھیل گئی تھی۔ پہلا حصہ اصل واقعہ سے متعلق تھا۔ دوسرا وہ جب اس نے یہ کہانی اپنے بیٹے چارلس کو سنائی اور تیسرا حصہ وہ جب اس نے اس عورت کو دوبارہ دیکھا۔ اگر وہ اس کے

سامنے نہ آتی تو شاید یہ کہانی بھی اس کے ذہن کے کسی کونے میں دبی رہتی لیکن اسے دیکھنے کے بعد وہ تمام واقعات اس کے ذہن کی اسکرین پر فلم کے مانند چلنے لگے۔

بڑھتی ہوئی عمر کے باوجود اس عورت کے وقار میں کوئی اضافہ نہیں ہوا تھا۔ لگتا تھا اس نے ذہنی طور پر اس حقیقت کو قبول نہیں کیا تھا کہ وہ بڑھاپے کی حدود میں قدم رکھ چکی ہے اور دوسری بہت سی عورتوں کی طرح وہ بھی جوان نظر آنے کی کوشش کر رہی تھی۔ دبلی پتلی ہونے کے باوجود اسے یہ زیب نہیں دیتا کہ پچاس سال سے زیادہ کی ہونے کے باوجود ٹی شرٹ، جینز پہنے اور اپنے سے کم عمر لوگوں میں گھلنے ملنے کی کوشش کرے۔

ہینسی پولیس اسٹیشن سے نکل کر لنچ کے لیے فش ریسٹورنٹ جا رہا تھا جب اس نے عورت کو اپنی طرف آتے دیکھا۔ وہ تیزی سے چلتی ہوئی آرہی تھی۔ یوں لگتا تھا اسے کہیں پہنچنے کی جلدی تھی لیکن ہینسی ایک پولیس آفیسر تھا اور اس کی ساری زندگی لوگوں کو پرکھنے میں گزری تھی۔ اس نے غور سے دیکھا، وہ کوئی خوفزدہ عورت لگ رہی تھی جو کسی اندرونی کیفیت کے سبب بھاگ رہی تھی۔ ممکن ہے اس خوف کا تعلق اس کے ماضی سے ہو جس سے چھٹکارا پانا اس کے لیے ممکن نہ ہو۔ جب اس عورت نے فٹ پاتھ پر چہل قدمی کرتے ہوئے سیاحوں کو دیکھ کر ہاتھ ہلایا تو اسے لگا کہ وہ اس عورت کو جانتا ہے لیکن وہ فوری طور پر اسے نہ پہچان سکا۔ سوائے اس کے کہ وہ جو کوئی بھی ہے، اس کا تعلق ہینسی کی ذاتی نہیں بلکہ پیشہ وارانہ زندگی سے ہے۔ وہ اس کے پاس پہنچی اور تیزی سے گزر گئی۔ ہینسی بس اس کی ایک جھلک ہی دیکھ پایا۔ پچکے ہوئے گال، بھاری میک اپ، لپ اسٹک سے تھڑے ہوئے ہونٹ اور سوکھے ہوئے بال۔ ہینسی نے ایک سرد آہ بھری اور تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا اس کے پیچھے ہولیا۔

وہ مائیکل گیٹ بار سے ہوتی ہوئی کروم ویل روڈ پر آئی اور ویگنرز میں داخل ہوگئی۔ یہ ایک سرائے تھی جس میں زیادہ تر مقامی افراد ہی پائے جاتے تھے۔ دوسرے شہروں سے تعلق رکھنے والے سیاح اس سرائے میں بہت کم آتے تھے کیونکہ اس جگہ پر مقامی نوجوانوں کا آنا جانا لگا رہتا تھا اس لیے ہینسی کو اس عورت کے وہاں داخل ہونے پر کوئی حیرت نہیں ہوئی۔ اس عورت نے اپنے لیے ایک بڑا ڈرنک لیا اور ہال کے ایک کونے میں بیٹھ گئی۔ ہینسی نے جوس پر ہی اکتفا کیا اور دوسرے کونے میں بیٹھ کر اس عورت کا جائزہ لینے لگا۔

''اولیویا اسٹرنگر'' اچانک اس کے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا۔ وہ عورت یقیناً اولیویا اسٹرنگر ہی تھی۔ وہ اس حال کو پہنچ گئی تھی۔ تنہا، اداس ایک کونے میں بیٹھی مشروب سے دل بہلا رہی تھی۔ حالانکہ یہ کھانے کا وقت تھا۔ اس کے حلیے اور وضع قطع سے لگ رہا تھا کہ وہ معاشی بدحالی کا شکار ہے لیکن ہینسی کو اس پر بالکل رحم نہیں آیا۔ بیس برس پہلے وہ جو کچھ کر چکی تھی۔ اس کے بعد اس پر ترس کھانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

اس عورت کو پہچان لینے کے بعد ہینسی کے ذہن میں وہ واقعہ تازہ ہوگیا تھا جب لندن ایکسپریس ٹرین کے ڈرائیور نے قریبی اسٹیشن کو مطلع کیا کہ اس کی ریل کے نیچے ایک آدمی آگیا ہے۔ اس نے جائے وقوعہ کی نشاندہی کر دی تھی۔ اس کے نتیجے میں تمام ٹرینیں روک دی گئیں اور امدادی ٹیمیں جائے حادثہ کے لیے روانہ ہوگئیں۔ جارج ہینسی ان دنوں نارتھ یارک شائر پولیس میں سراغ رساں سارجنٹ کے طور پر کام کر رہا تھا۔ اسے اس کیس کی تفتیش کی ذمے داری سونپی گئی۔ خودکشی کے کیس عام طور پر بڑے الجھے ہوئے ہوتے ہیں اور ان کے پس منظر میں کوئی نہ کوئی کہانی ضرور ہوتی ہے۔ ہینسی جب جائے حادثہ پر پہنچا تو لاش وہاں سے ہٹائی جا چکی تھی اور لائن پر ٹریفک بحال ہوگیا تھا۔

ٹرین ڈرائیور ابھی تک حواس باختہ تھا۔ اس نے ہینسی کے سامنے معذرت خواہانہ رویہ اختیار کرتے ہوئے کہا۔ ''میں ہمیشہ کہا کرتا تھا کہ اگر مجھے کوئی شخص پٹری پر نظر آیا تو اسے دیکھتے ہی ٹرین روک لوں گا لیکن ایسا نہ ہوسکا۔''

ڈرائیور ایک چھوٹے قد کا بندہ تھا اور اسے دیکھ کر ہینسی کو یقین آگیا کہ 125 کلومیٹر فی گھنٹا کی رفتار سے ٹرین چلانے کے لیے کسی جسمانی طاقت کی ضرورت نہیں۔ اس سے پہلے وہ سمجھا کرتا تھا کہ ٹرین ڈرائیور لمبے چوڑے اور بھاری بھرکم ہوتے ہیں۔

''اس مقام پر گاڑی کی رفتار ساٹھ کلومیٹر فی گھنٹا ہوتی ہے۔ عام رفتار کے مقابلے میں یہ بہت کم ہے لیکن اس رفتار پر بھی ٹرین کو فوری طور پر روکنا ممکن نہیں۔'' ڈرائیور نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''میں نے رفتار کم کرنے کی کوشش کی لیکن گاڑی رکنے سے پہلے ہی وہ آدمی اس سے ٹکرا گیا۔ اس وقت ٹرین کی رفتار چالیس میل فی گھنٹا تھی۔''

''یہ بھی بہت زیادہ ہے۔'' ہینسی نے کہا۔

''ہاں زیادہ تو ہے لیکن اس کے باوجود آخر وقت تک ہم ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ میرا مطلب ہے کہ وہ مجھے اور میں اسے دیکھتا رہا۔ وہ اپنی جگہ پر کھڑا ہوا تھا۔ اس نے

ٹرین کے آگے سے ہٹنے یا آخری منٹ میں چھلانگ لگانے کی کوشش نہیں کی۔'' ڈرائیور نے سگریٹ کا گہرا کش لیا اور زمین پر پھینکتے ہوئے بولا۔ ''کیا تم نے اس کی لاش دیکھی؟''

''نہیں۔''

''اس کے ظاہری حلیے سے بالکل ظاہر نہیں ہوتا کہ وہ خودکشی کے ارادے سے آیا تھا۔ میرے ایک ساتھی نے بتایا کہ اس کی ٹرین کے نیچے آنے والا ایک شخص بالکل برہنہ تھا اور کسی نفسیاتی اسپتال سے بھاگا ہوا تھا لیکن اس شخص نے بہترین تراش خراش کا سوٹ پہن رکھا تھا اور اس کے سر پر ہیٹ تھا۔ دیکھنے میں وہ کوئی بینک منیجر یا اکاؤنٹنٹ لگ رہا تھا۔ تم جانتے ہو کہ اس نے کیا، کیا؟''

''نہیں۔''

''ٹکر لگنے سے پہلے اس نے اپنا ہیٹ اتار کر میری طرف لہرایا اور ہونٹوں کو اس طرح جنبش دی جیسے کہہ رہا ہو۔ ''تمہارا شکریہ۔''

☆☆☆

ہینسی نے ذہن پر زور دیا تو اسے مرنے والے کا نام بھی یاد آگیا۔ وہ تھامسن ویبسٹر تھا اور یارک شائر اینڈ لنکا شائر بینک کی گلی گیٹ برانچ میں منیجر کے طور پر کام کرتا تھا۔ تعزیت کے لیے اس کے گھر گیا تو مسز ویبسٹر نے ایک اداس مسکراہٹ کے ساتھ اس کا استقبال کیا لیکن ہینسی کو اس کی اداسی مصنوعی لگی۔

''مسز ویبسٹر! معاف کرنا یہ ایک تکلیف دہ سوال ہے لیکن پوچھے بنا چارہ نہیں۔ کیا تم بتا سکتی ہو کہ مسٹر تھامسن کی خودکشی کی کیا وجہ ہوسکتی ہے؟''

''بہ ظاہر تو کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔'' مسز ویبسٹر نے ایک قیمتی رومال سے ناک پونچھتے ہوئے کہا۔ ''ہم ایک مطمئن زندگی گزار رہے تھے۔ اس کے پاس سب کچھ تھا۔ اچھی ملازمت، بیوی، بچے اور یہ خوب صورت گھر۔ ایک شخص کو اس کے علاوہ اور کیا چاہیے؟''

جارج ہینسی نے دیکھا کہ اولیویا اپنا گلاس ختم کر چکی تھی اور شاید اسے مزید طلب ہو رہی تھی۔ اس نے اپنی جینز کی جیب سے پلاسٹک کی تھیلی نکالی اور اس میں سے سکے نکال کر گننے لگی۔ ان پیسوں سے وہ ایک اور بڑا گلاس خرید سکتی تھی۔ اس نے کاؤنٹر پر جا کر ادائیگی کی اور بھرا ہوا گلاس لے کر دوبارہ اپنی جگہ پر آکر بیٹھ گئی۔ ہینسی کا دماغ دوبارہ ماضی کی طرف چلا گیا۔

آئن اسٹائن کا بیان

امریکی حکومت نے دنیا کے مشہور سائنسدان آئن اسٹائن سے سوال کیا۔ ''اگر ایٹم بم دوسری جنگ عظیم کا ہتھیار تھا تو تیسری جنگ عظیم میں کون سے ہتھیار استعمال ہوں گے۔''

آئن اسٹائن نے جواب دیا۔ ''مجھے تیسری جنگ عظیم کے بارے میں تو معلوم نہیں۔ البتہ میرا اندازہ ہے کہ چوتھی جنگ عظیم میں لوگ پتھر کے بنے ہوئے نوکدار ہتھیار استعمال کریں گے۔''

مرسلہ: ریاض بٹ، حسن ابدال

تفتیش کے دوسرے مرحلے میں وہ ویبسٹر کے بینک گیا۔ اس نے محسوس کیا کہ بینک کا عملہ اس واقعے پر ملول اور افسردہ ہے۔ مسٹر پینگ نے اس کا استقبال کیا اور تھامسن کے کمرے میں لے گیا۔

''میں یہاں کیئر ٹیکر منیجر ہوں اور تمام معاملات کی نگرانی کرتا ہوں۔'' اس نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ اس سے پہلے کہ ہینسی کچھ کہتا۔ پینگ بول پڑا۔ ''اچھا ہوا تم آگئے ورنہ ہم پولیس کو فون کرنے والے تھے۔'' اس نے ایک ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''ہم ایسا سوچ بھی نہیں سکتے تھے کیونکہ ہم نے ہمیشہ اپنے اسٹاف کی وفاداری پر بھروسا کیا ہے۔ اوہ میرے خدا، پانچ لاکھ پاؤنڈز۔''

''کیا یہ رقم غائب ہے؟''

''ہاں، یہ رقم اپنی جگہ پر نہیں ہے۔ ہم اتنی بڑی رقم والٹ میں نہیں رکھتے۔ تم اسے غبن کہہ سکتے ہو۔ یہ رقم ایسے اکاؤنٹس سے نکالی گئی ہے جو عرصہ دراز سے استعمال میں نہیں ہیں۔ ہمیں اس کا پتا اس وقت چلا جب ایک اکاؤنٹ کو دوبارہ قابل عمل کیا گیا۔ معلوم ہوا کہ یہ رقم تھامسن ویبسٹر کے ذاتی اکاؤنٹ میں منتقل ہوئی اور بعد میں وہاں سے بھی نقد کی صورت میں نکال لی گئی۔''

''تمہیں اس غبن کا پتا کب چلا؟''

''ایک ہفتہ پہلے جب مسز ویبسٹر نے فون کر کے مطلع

کیا کہ انہیں فلو ہوگیا ہے اور وہ دفتر نہیں آسکیں گے۔ ہم نے ان کی غیر موجودگی میں تحقیقات کی اور اس نتیجے پر پہنچے کہ مسٹر تھامسن ویبسٹر جو ہمیشہ سے ہی بینک کے قابل اعتماد ملازم رہے ہیں اور ان کے ریٹائر ہونے میں تھوڑا وقت ہی باقی رہ گیا تھا، انہوں نے کسٹمر کے اکاؤنٹ میں خیانت کر کے اپنی زندگی تباہ کرلی ہے۔ ہم پولیس کو فون کرنے ہی والے تھے کہ تمہاری بروقت آمد کے بعد اس کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ تمہارا کہنا ہے کہ اس نے خودکشی کی ہے۔"

"بہ ظاہر تو ایسا ہی لگتا ہے، آج صبح وہ ٹرین کے نیچے آگیا۔"

"بے چارہ تھامسن!" وہ تاسف سے ہاتھ ملتے ہوئے بولا۔ "میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں۔ میں نے اسے ہمیشہ ایک راست باز اور ایمان دار انسان پایا۔ نہ جانے اس نے کس کیفیت کے زیر اثر یہ حرکت کی اور اپنے آپ کو مارلیا۔ وہ کبھی چور نہیں ہوسکتا۔ وہ ایک باعمل عیسائی تھا اور باقاعدگی سے چرچ جاتا تھا۔ اس پر ضرور کوئی خبط سوار ہوگیا ہوگا۔ اگر وہ اپنی غلطی تسلیم کر کے بینک کو رقم واپس کر دیتا تو ہم اس کے لیے کچھ کر سکتے تھے۔ ممکن ہے کہ معاملہ قبل از وقت ریٹائرمنٹ پر ختم ہو جاتا۔"

پینگ آگے کو جھکا اور پھر جیسے اسے کچھ یاد آگیا۔ وہ ماتھے پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا۔ "اوہ ڈیئر! میں تو بھول ہی گیا تھا۔ آج صبح کی ڈاک سے ہمیں یہ کاغذ ملا ہے۔" اس نے ہینسی کی طرف ایک رسید بڑھاتے ہوئے کہا۔ اس کے ساتھ ایک کاغذ اور بھی تھا۔ وہ رسید یارک اسٹیشن میں رکھوائے گئے سامان کی تھی اور کاغذ پر تھامسن کی ہینڈ رائٹنگ میں لکھا ہوا تھا۔ "سب کچھ اس میں موجود ہے۔ تھامسن ویبسٹر۔"

"تم نے یہ سامان وصول نہیں کیا؟" ہینسی نے پوچھا۔

"ہمیں اس کے لیے پولیس کی ضرورت ہوگی۔ ممکن ہے کہ اس سامان میں وہی رقم ہو جو اس نے بینک سے چرائی تھی۔ ہم اتنی بڑی رقم ساتھ لانے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے۔ ہمیں چل کر دیکھنا چاہیے کہ اس سامان میں کیا ہے۔ میں احتیاطاً کچھ پولیس والوں کو بلا لیتا ہوں اگر واقعی اس سامان میں رقم ہوئی تو وہ پولیس والے تمہارے ساتھ ہی بینک تک آئیں گے۔"

"اس کے لیے میں تمہارا انتہائی شکریہ ادا کرنا چاہوں گا۔"

ہینسی اور پینگ، تین مسلح سپاہیوں کے ہمراہ یارک اسٹیشن پہنچے اور رسید دکھا کر سامان وصول کرلیا۔ یہ دو بڑے سوٹ کیس تھے جن میں تالا نہیں لگا ہوا تھا۔ جب انہیں کھولا گیا تو وہ پوری طرح نوٹوں سے بھرے ہوئے تھے۔ ہینسی نے فون کر کے پولیس کی گاڑی منگوائی اور سپاہیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "یہ تمہارے ساتھ بینک تک جائیں گے۔"

"بے چارہ ٹام!" پینگ افسردہ لہجے میں بولا۔ "جانتا ہوں کہ اس نے خودکشی کیوں کی۔ وہ اس حرکت کے بعد زندہ نہیں رہ سکتا تھا لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ اس نے ایسا کیوں کیا؟"

"یہی تو میں بھی جاننا چاہتا ہوں۔" ہینسی نے کہا۔

☆☆☆

ہینسی کو ذہن پر زور دینے کے باوجود یاد نہ آسکا کہ اسے اس شخص کا نام کس نے بتایا تھا۔ مسٹر پینگ، مسز ویبسٹر یا بینک کے عملے کے کسی فرد نے اور نہ ہی اسے وہ نام یاد آرہا تھا۔ اس شخص کے بارے میں لوگوں کا کہنا تھا کہ وہ اور ویبسٹر بھائیوں کی طرح تھے۔ ہینسی کا خیال تھا کہ اس شخص سے ویبسٹر کے بارے میں مزید معلومات حاصل ہوسکتی ہیں چنانچہ وہ دوسرے روز ہی اس شخص سے ملنے کے لیے پہنچ گیا۔ اس وقت تک اسے اپنے دوست کے مرنے کی اطلاع مل چکی تھی اور وہ سکتے کی سی کیفیت میں تھا۔ وہ دونوں اس کے گھر کے عقب میں بنے ہوئے باغیچے میں لکڑی کی بینچ پر بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ اس شخص نے ایک ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے کہا۔

"مجھے معلوم تھا کہ ایسا ہونے والا ہے۔"

"کھل کر بتاؤ۔" ہینسی نے دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔

"اس قصے کی ابتدا ان کے یہاں دوسرے بچے کی پیدائش سے ہوئی۔ اس کے بعد مسز ویبسٹر نے اپنا کمرا الگ کرلیا۔ وہ دو بچوں کی ماں بن چکی تھی اور تیسرے کی اسے کوئی خواہش نہیں تھی۔"

"کیا اس نے اپنی زبان سے ایسا کہا تھا؟"

"ہاں اور اس کے بعد ٹام کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیا کرے۔"

"ظاہر ہے کہ وہ بھی اپنی فطری خواہشات سے مجبور ہوگیا ہوگا۔"

"مرد اور عورت دونوں ہی اس معاملے میں بے بس ہیں لیکن مسز ویبسٹر اس حقیقت سے چشم پوشی کرتی رہی۔ اپنے رومانس کو زندہ رکھنے کے لیے رات دس بجے شوہر کی

بانہوں میں بانہیں ڈالے چہل قدمی کو ہی کافی سمجھ رہی تھی۔ ایک دن ٹام اس بے کیف زندگی سے اکتا گیا اور مجھے بتایا کہ اس نے ایک لڑکی سے تعلقات استوار کرلیے ہیں۔"

"لڑکی......؟" ہینسی نے تعجب سے پوچھا۔

"اس نے یہی کہا تھا۔ یہ بتاتے ہوئے وہ بہت خوش نظر آرہا تھا اور اس کی کیفیت بالکل اس نوجوان جیسی تھی جسے زندگی میں پہلی بار گرل فرینڈ ملی ہو، یہ کوئی تین ماہ پہلے کی بات ہے۔"

"کیا اس نے لڑکی کا نام بتایا تھا؟"

"اولیویا، لیکن مکمل نام نہیں بتایا۔ وہ تقریباً تیس سال کی ہے۔ گویا عمر میں اس سے بیس سال چھوٹی، مجھے یوں لگا جیسے وہ لڑکی محض وقت گزاری کے لیے اسے بے وقوف بنا رہی ہے جبکہ تھامسن اس ٹائپ کا بندہ نہیں تھا پھر اس ہفتے کے آغاز پر اس نے مجھے فون کر کے کہا۔ "میں نے اپنی زندگی تباہ کرلی۔" یہ کہہ کر اس نے فون بند کردیا۔ میں نے تفصیل جاننے کے لیے اس کے دفتر فون کیا۔ وہ وہاں نہیں تھا۔ گھر پر بھی نہیں ملا۔ میں نے ہر اس جگہ فون کیا جہاں اس کے ملنے کا امکان تھا لیکن بات نہ ہوسکی۔"

☆☆☆

اولیویا اسٹرنگر کا گلاس خالی ہوگیا تھا اور وہ مایوسی کے عالم میں اسے دیکھ رہی تھی شاید چاہ رہی ہو کسی جادو کے ذریعے وہ گلاس دوبارہ بھر جائے۔ ہینسی کو اس سے اپنی پہلی ملاقات یاد آگئی۔ وہ اپنے شاہانہ لائف اسٹائل کی تفصیل بتاتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ "یہ سب میرے بوائے فرینڈ کی مہربانی ہے۔ کپڑے، جیولری، میک اپ کا سامان، سب کچھ اسی کے ذمے ہے۔ اس فلیٹ کا کرایہ بھی وہی دیتا ہے۔ مانتی ہوں کہ وہ عمر میں مجھ سے بڑا ہے لیکن ایسے مرد بڑے فرماں بردار ہوتے ہیں۔ اسی لیے میری اس سے خوب نبھ رہی ہے۔"

"واقعی، مجھے یقین نہیں آرہا کہ اس دنیا میں ایسے لوگ بھی ہیں۔" ہینسی نے اس پر طنز کرتے ہوئے کہا۔

"مرد میرے اشاروں پر چلتے ہیں اور میں ان سے ہر طرح کا کام لے سکتی ہوں۔"

"مثلاً؟" ہینسی نے اسے کریدنے کی کوشش کی۔

"اب دیکھو نا۔ میں تیس کی ہوچکی ہوں اور چاہتی ہوں کہ کسی مرد سے شادی کر کے سکون سے بیٹھ جاؤں۔ اسی لیے میں نے اپنے بوائے فرینڈ سے کہہ دیا ہے کہ اگر وہ ایک معقول رقم کا انتظام کرسکتا ہے تو میں اس سے شادی کرنے کے لیے تیار ہوں۔ خیر یہ بتاؤ کہ تمہیں میرا پتا کس نے بتایا اور تم مجھ سے کیا چاہتے ہو۔"

ہینسی نے اسے بتا دیا کہ یہ پتا اس کے بوائے فرینڈ کی ڈائری سے ملا تھا اور یہ کہ گزشتہ روز اس نے ٹرین کے نیچے آکر خودکشی کرلی ہے۔ ہینسی نے اسے رقم کے بارے میں کچھ نہیں بتایا کیونکہ اولیویا کے لیے اس میں دلچسپی کا کوئی پہلو نہ تھا۔ ویسے بھی اس نے تھامسن کی موت کا سن کر کسی جذباتی ردعمل کا اظہار نہیں کیا۔ جانے والا تو جا ہی چکا تھا۔ اب اس کو رونے سے کیا فائدہ۔

ہینسی نے آخری گھونٹ لے کر اپنا گلاس خالی کیا اور سامنے بیٹھی ہوئی اولیویا پر نظریں جما دیں۔ کہانی کا پہلا حصہ ختم ہوچکا تھا۔

☆☆☆

کہانی کا دوسرا حصہ اس واقعے سے متعلق ہے جو دس سال بعد پیش آیا جب وہ اور اس کا بیٹا سخت سردی میں اپنے لونگ روم میں بیٹھے آتش دان کی حرارت سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ اس کی بیوی کچھ عرصہ قبل داغ مفارقت دے چکی تھی۔ اب فرصت کے اوقات میں ہینسی کا یہی مشغلہ تھا کہ وہ بیٹے کو اپنے کارناموں کے قصے سناتا رہے۔ البتہ وہ اس بات کا خیال رکھتا تھا کہ واقعات کے کرداروں کے نام ظاہر نہ کیے جائیں اور ان حصوں کو بھی حذف کردیا جائے جن میں سنسنی خیزی کا پہلو نمایاں ہو۔ تھامسن کی کہانی بھی انہی میں سے ایک تھی جو اس شام وہ اپنے بیٹے کو سنا رہا تھا۔

☆☆☆

کہانی کا تیسرا حصہ اس وقت شروع ہوا جب بالکل غیر متوقع طور پر اولیویا اسٹرنگر لڑکھڑاتی ہوئی اس کے پاس آئی۔ وہ بہت دیر سے اس پر نظریں جمائے بیٹھی ہوئی تھی کیونکہ اس وقت سرائے میں اس کے علاوہ کوئی اور گاہک موجود نہ تھا۔ اولیویا نے بڑی ادا سے اپنی آنکھیں گھمائیں اور بے چارگی سے بولی۔ "کیا تم مجھے ایک ڈرنک لے کر دے سکتے ہو۔ میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔"

ہینسی اپنی جگہ سے کھڑا ہوگیا اور بولا۔ "نہیں اولیویا، میں ایسا نہیں کرسکتا۔"

یہ کہہ کر وہ تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا سرائے سے باہر چلا گیا اور اولیویا حیران نظروں سے اسے جاتا دیکھتی رہی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ یہ اجنبی کون تھا اور اسے اس کا نام کیسے معلوم ہوا؟

★



ناصر ملک

مسافر

قسط نمبر : 13

یہ ایک حقیقت ہے کہ انسان مسافر... زندگی مسافت... اور اعمال زادِ سفر ہوتے ہیں... کسی کو انسانیت کے لبادے سے نکل کر پتھر کی صورت ڈھل جانے میں صدیاں نہیں لگتیں... اور کہیں آنکھوں میں اشک نہ ہونے کے باوجود ہر ادا، ہر چہرہ اشکبار ہونے کا احساس دلاتا ہے... وہ بھی ایک خانماں خراب، بے سپر اور آبلہ پائی کے عذاب میں مبتلا مسافر تھا... جو دنیا کے چلن سے آگاہ تھا، جسے ہتھیاروں کے اوچھے ہتھکنڈوں کا ادراک تھا مگر پھر بھی مائل بہ تغیر تھا کیونکہ وہ جانتا تھا... جب بند آنکھوں سے آنسو رواں ہوں اور ہونٹ ساکت ہوں تو ایسے میں ان ساکت ہونٹوں کے درمیان دل کی لرزش مچلا کرتی ہے... خاموش فضائوں میں طوفان چھپے ہوتے ہیں... دریا کی روانی کتنی کہانیوں کو بہا لے جاتی ہے... ایسے میں مسافت طویل... بہت طویل ہوجاتی ہے مگر مسافر ہر موڑ پر ایک نئی داستان رقم کرکے آگے بڑھتا جاتا ہے... کبھی کردار اس کے تعاقب میں ہوتے ہیں اور کبھی وہ خود اپنی تلاش میں کہیں گم ہوجاتا ہے... کبھی مل جانے کی خوشی، کبھی احساسِ زیاں... سوختہ جذبات میں تلاطم برپا کردینے والے واقعات اور معاشرتی سرد رویّوں پر مشتمل حیرت انگیز انکشافات کا طویل سلسلہ۔

گل و گلزار سے راہ پرخار تک ایک مسافر بے نوا کی روداد حیات

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

زندگی کے سفر پر ہم سب مسافر راہ کی کٹھنائیوں سے بے خبر رواں دواں رہتے ہیں۔ داستان سفر شروع کرنے سے پہلے اپنا تعارف ضروری ہے۔ میرا نام شہریار ہے پیار سے شہرا کہتے ہیں۔ میرا گھرانا عالی نسب غریب خاندان تھا جو چار افراد، میں، والد امام دین عرف سوہنا خان، والدہ رضیہ بی بی عرف رجو اور چھوٹی بہن پروین پر مشتمل تھا اور جنوبی پنجاب کے قصبے نور پور میں مقیم تھا جب میری عمر پانچ برس تھی ایک روز میرے والدین کو بے دردی سے قتل کر دیا گیا جس کے بعد میرے چچا چراغ دین اور چچی نے ہمیں اپنا لیا اور اپنے تین بچوں ہی کی طرح ہماری تربیت کی۔ گاؤں ہی میں پھوپی کبریٰ رہتی تھی جنہوں نے بچپن ہی میں اپنی بیٹی غزالہ سے میرا رشتہ طے کر دیا تھا۔ چچا نے مجھے تعلیم دلائی، میں نے ملتان سے گریجویشن کیا اور اسی دوران ایک

سیاسی پارٹی کے اسٹوڈنٹ ونگ میں ایک اہم عہدے پر فائز رہا اور ہتھیاروں کے استعمال ودیگر علوم میں مہارت حاصل کی۔ پھر اس کے بعد میں نور پور واپس آ گیا۔ گاؤں کے دوستوں میں امیر نواز بھی شامل تھا جو کہ گاؤں کے نمبردار حیات خان کا بیٹا تھا۔ میں ان کے حسابات کی منشی گیری اور دیگر چھوٹے موٹے کام بھی کر دیا کرتا تھا۔ میرا دوسرا دوست اللہ بخش لوہار کا بیٹا خالد عرف کھالا تھا جو تعلیم یافتہ تو نہ تھا لیکن حیات خان کی ویگن چلاتا تھا، اسی نے مجھے ڈرائیونگ سکھائی تھی جبکہ تیسرے دوست ڈاکٹر منصور علی شاہ عرف شاہ جی تھے جو گاؤں کے سرکاری اسپتال میں ڈاکٹر کی حیثیت سے تعینات تھے۔ وہ ایک سلجھے ہوئے مخلص، لیکن نڈر مگر کچھ جذباتی انسان تھے۔ میں ان سے عملی تربیت بھی حاصل کر رہا تھا۔ خالد عرف کھالا سردار حیدر خان جو کہ ایک سیاسی لیڈر تھا اور حیات خان کا سرپرست بھی تھا، کی بیٹی اسما کے یکطرفہ عشق میں مبتلا ہو گیا، میں نے اسے سمجھایا لیکن وہ اپنی روش پر قائم رہا۔ گاؤں کے بڑوں میں نمبردار حیات خان کے علاوہ اس کا کزن وریام خان اور اس کا بھائی سردار بخت خان بھی تھا جو سب سے الگ تھلگ رہتا تھا۔ وریام خان کی بیٹی کی شادی کے موقع پر سردار حیدر خان کی بیٹی اسما کی طبیعت خراب ہوئی تو ہرکارہ ڈاکٹر شاہ جی کو بلانے کے لیے دوڑایا گیا لیکن اس نے آنے سے انکار کر دیا جس پر وریام خان سخت چراغ پا ہوا اور اس کی حاکمانہ انا کو سخت ٹھیس پہنچی۔ چونکہ وہ ایک منتقم مزاج شخص تھا اس لیے اس نے انتقامی کارروائی کے ذریعے شاہ جی کو پھانسنے کی کوشش کی مگر میں نے اور کھالا نے اسے ناکام بنا دیا۔ ان تمام واقعات کے تناظر میں وریام خان نے شاہ جی سے میری حمایت پر مجھے سرزنش کی۔ ان کا مطالبہ تھا کہ میں شاہ جی کی صحبت چھوڑ دوں۔ گاؤں کے ماسٹر جی کی بیٹی جس کے پیر میں لنگ تھا اور وہ شاہ جی کے زیر علاج رہی تھی، ان کے عشق میں مبتلا ہو گئی۔ شاہ جی کے خلاف ہونے والی سازش سے آگاہ کرنے کے لیے حیدر خان کی بیٹی صدف نے ایک رقعہ کھالے کی بہن خالدہ کے ہاتھ بھیجا تھا۔ اسی باعث خالدہ نے جو کہ ابھی جوانی کی خطرناک عمر سے گزر رہی تھی، غلط تاثر لے لیا اور ایک دن بہانے سے اپنے گھر بلا کر مجھ سے اظہار الفت کرنا چاہا اور مجھ سے لپٹنا چاہتی تھی کہ میں پیچھے کی جانب گرا تو پیچھے رکھے صندوق کی نوک میری ریڑھ کی ہڈی میں چبھی اور میرا سارا جسم مفلوج ہو گیا۔ اسی دوران کھالا بھی وہاں پہنچ گیا۔ تو اس نے مجھے خنجر کے ذریعے مارنا چاہا اسے حقیقت کا احساس ہوا تو وہ مجھے ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔ گاؤں میں، سب کھالے پر لعن طعن کر رہے تھے میں نے اسے معاف کر دیا۔ اسی دوران میں گاؤں میں موجود سائیں جیت کے مزار پر مشکوک لوگوں کی آمد اور سرگرمیوں کے بارے میں سردار بخت خان نے ہم لوگوں کو مطلع کیا۔ سائیں کا بیٹا دل جیت شاہ اس آستانے پر بیٹھا کرتا تھا۔ بخت خان نے ہی مجھے معقول معاوضے پر اپنی بیٹی ملکہ کو پڑھانے پر مامور کر لیا۔ یہ معاملات جاری تھے کہ کھالے نے بتایا کہ اسما نے اسے شہر میں ایک مشہور پارک میں بلایا ہے۔ میں پریشان تو ہوا لیکن اس کے ساتھ جانے پر رضامند ہو گیا۔ اسما سے ملاقات کے دوران لمبے بالوں والا ہیرو ٹائپ نوجوان وہاں آ گیا اور ان دونوں کے درمیان کسی بات پر لڑائی شروع ہو گئی۔ معاملہ خون خرابے تک پہنچ گیا۔ اسی دوران کھالے کے ہاتھوں اس نوجوان سوبی کا قتل ہو گیا۔ کھالا تو بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گیا لیکن میں پولیس کے ہاتھ لگ گیا اور تھانے پہنچا دیا گیا جہاں میری ملاقات مخصوص لب ولہجہ رکھنے والے امیر شاہ عرف میرو شاہ سے ہوئی جس نے مجھے حوصلہ دیا کہ اس کی میڈم مجھے چھڑوا لے گی اور ہوا بھی یہی، میڈم شکیلہ نے مجھے چھڑوا لیا اور میں اس کے ٹھکانے پر پہنچ گیا میڈم شکیلہ توقع کے برعکس نہایت خوبصورت اور نوجوان لڑکی تھی لیکن اس کا اثر ورسوخ بہت تھا۔ میں نے اسے اپنی تمام روداد سے آگاہ کیا۔ اس نے مجھے بھرپور مدد کی یقین دہانی کرائی۔ اس نے مجھے اپنے ساتھ شامل ہونے کی پیشکش کی جسے میں نے قبول کر لیا۔ یہاں سے فارغ ہو کر نور پور پہنچا تو ایک سانحہ میرا منتظر تھا۔ چاچی نے روتے ہوئے بتایا کہ پروین غائب ہے۔ ایسے میں دیوانے نے مجھے دلاسا دیا اور امیر نواز پر شک کا اظہار کیا کیونکہ وہ بھی غائب تھا۔ میں میڈم شکیلہ کے پاس پہنچا اور اپنی پریشانی سے آگاہ کیا۔ میڈم نے مجھ سے کہا کہ اس سلسلے میں دل جیت بتا سکتا ہے اور یہ مجھ پر منحصر ہے کہ میں اس سے کس طرح اگلواتا ہوں۔ میرو شاہ نے مجھے ہتھیار فراہم کیے اور میں زمانہ طالب علمی کی ٹریننگ آزمانے کے لیے دل جیت کے ٹھکانے پر پہنچ گیا اور اسے دردناک موت سے ہمکنار کیا۔ دل جیت کے انکشاف کے مطابق پروین حیدر خان کے قبضے میں تھی۔ میری کارکردگی سے میڈم بہت خوش تھی اور مجھ پر غیر معمولی طور پر مہربان بھی۔ لیکن اس تمام عرصے میں، میں اپنے والدین کے قتل کو نہیں بھولا تھا۔ میڈم کے اڈے پر میں نے ایک کمرے میں اسما کو بے ہوش پڑے دیکھا جو سردار حیدر خان کی بیٹی تھی۔ پھر میڈم نے مجھے تفصیل سے آگاہ کیا اور مختلف محاذوں پر اپنے آدمیوں کو ہدایات دینے لگی کہ اسے اطلاع ملی کہ اڈے پر حملہ ہو گیا ہے۔ میں اس سے ملنے پہنچا تو وہ کمپیوٹر روم میں تھی اور مختلف اسکرینز پر مناظر کو دیکھ رہی تھی کہ ایک منظر میں حملہ آور پر ہماری نظر پڑی۔ میں اسے دیکھ کر شدت سے چونک اٹھا۔ اسکرین پر نظر آنے والا میرا جگری دوست کھالا تھا جو استاد ببلو کے گینگ کے ساتھ میڈم کے ٹھکانے میں داخل ہوا تھا لیکن میڈم نے خاص حکمت عملی کے تحت بازی پلٹ دی اور کھالا اس کی قید میں آ گیا۔ میڈم نے حیدر خان کی بیٹی اسما کو اغوا کر لیا تھا اور اس کے عوض پروین کا مطالبہ کیا۔ اسما نے مجھے پہچان لیا اور مجھے غیرت دلانے کی کوشش کی لیکن میں مجبور تھا۔ اسی دوران میرے ایما پر میڈم نے کھالے کی مجھ سے ملاقات کرا دی لیکن کھالا اسما کو قید میں دیکھ کر آپے سے باہر ہو گیا۔ ایک زبردست مقابلے کے بعد میں نے اسے دھول چاٹنے پر مجبور کر دیا۔ آخرکار طے یہ ہوا کہ ہم براہ راست حیدر خان کے ڈیرے پر پروین کے حصول کے لیے دھاوا بولیں گے۔ ہماری ٹیم کا سربراہ پیا نامی ایک تجربے کار شخص تھا۔ راستے میں ہمیں زخمی حالت میں وحید ملا۔ وحید کے ذریعے معلومات کے مطابق دلجیت کے آستانے پر ان دونوں بہن بھائیوں کو بے ہوشی کی حالت میں اغوا کر کے ڈیرے پر لایا گیا تھا لیکن قید کے دوران وحید کو تشدد کر کے مردہ جان کر پھینک دیا گیا جبکہ کسی نامعلوم فرد نے ہماری آمد سے قبل ڈیرے پر پہنچ کر وہاں موجود افراد کو ہلاک کر کے پروین، عاشی اور ایک مرد جو غالباً امیر نواز تھا، اپنے ساتھ لے گیا لہٰذا ہم یہاں سے خالی ہاتھ واپس آئے۔ میڈم نے مشورہ دیا کہ مجھے اپنے رشتے داروں کو نور پور سے نکال لانا چاہیے، ہم سے پہلے ہی ہمارے گھر پر نامعلوم افراد ہمارے گھر کو جلانے پہنچ چکے تھے۔ ایک خونی کارروائی کے دوران ہم نے ان پر غلبہ حاصل کیا۔ میں اپنی بہنوں کو لے کر اپنی گاڑی تک پہنچا اور پیا کا انتظار کرنے لگا مگر وہ چاچا اور چاچی کو لانے میں ناکام رہا۔ لیکن موجو کو لے آیا تھا۔ ہم اس جزوی کامیابی کے بعد واپس پہنچے جہاں ملتان کی حدود میں ہمارے لیے رہائش کا بندوبست کیا گیا تھا۔ کھالا بہروپ بدل کر نور پور سے یہ معلومات لے کر آیا کہ میرے گھر میں خون خرابے کی ذمے داری مجھ پر ڈال دی گئی تھی جائیداد کی خاطر، بخت خان بھی چاچا اور [illegible]

ساتھ لے گیا تھا۔ یہاں پیا نے میری تربیت کی اور ایک خونی مقابلے میں میڈم نے امتحان لیا۔ اسی دوران چند نامعلوم حملہ آوروں نے فارم ہاؤس پر حملہ کر دیا۔ ایک خونریز مقابلے کے بعد ہم انہیں ہلاک کرنے میں کامیاب ہوئے۔ واپسی کے سفر میں ہم جب گاڑی میں بیٹھے تو عقب سے ہم پر ہتھیار تان لیے گئے۔ میڈم نے نہایت ڈرامائی انداز میں ان دونوں کو قابو کر لیا۔ یہاں سے فارغ ہو کر ہم ٹھکانے پر پہنچے۔ کھالا میرا ساتھ چھوڑ گیا۔ میڈم شکیلہ نے مجھے اسما کو اس کے خریدار حیدر خان کے سرپرست میاں دلبر حسین کے سپرد کر کے رقم وصول کرنے کی ذمہ داری دی اور ایک شخص کو میرے ساتھ کر دیا۔ ہم اسما کو لے کر جب دلبر حسین کے گرگے رنگو قصائی کے اڈے پر پہنچے تو اسے دیکھ کر میں بھونچکا رہ گیا وہ میرے ماں باپ کا قاتل تھا لیکن میں نے انتقام کو دوسرے وقت کے لیے چھوڑ دیا اور کئی رکاوٹوں کو عبور کرتے ہوئے رقم لے کر میڈم کے پاس پہنچ گیا۔ میڈم بہت خوش تھی۔ اس نے رنگو قصائی کے سلسلے میں میری مدد کا وعدہ کیا وہاں سے بس میں گھر جا رہا تھا کہ اچانک مجھے اغوا کر لیا گیا۔ مجھے اغوا کرنے والا ہمارے ہاتھوں مارے جانے والے سوبی کا دست زور آور تھا۔ بعدازاں معلوم ہوا کہ وہ حیدر خان سے میرا سودا کر چکا تھا، کئی خونریز معرکوں اور آنکھ مچولی کے بعد میں اس کی قید سے رہا ہونے میں کامیاب ہو گیا اس دوران حیدر خان نے استاد ببلو کے ساتھ مجھے گرا دینے کی کوشش بھی کی۔ رہائی کے بعد ڈرامائی طور پر میری ملاقات عاشی کے عاشق شاہد سے ہو گئی اور میں اس کی مدد پر آمادہ ہو گیا۔ جب گھر پہنچا تو شاہد نے مجھے کاغذات کا ایک پلندہ دیا جو میں اپنے گھر سے اٹھا لایا تھا۔ جو درحقیقت چاچا کی جائیداد کی فروخت کے کاغذات تھے۔ خریدنے والے کا نام پڑھ کر میں چونک اٹھا۔ وہ نام میرے والد کی زمین ہتھیانے والے کے بیٹے کا تھا یعنی کہ میرے گھرانے کی تباہی کی کہانی دہرائی گئی تھی۔ بہرحال میں نے شکریہ ادا کر کے وہ کاغذات سنبھالے اور میرو سے رابطہ کیا۔ میڈم نے ایک میٹنگ رکھی تھی جہاں اس کے تمام قابل اعتماد لوگ شریک تھے۔ میرا تعارف کرایا گیا اور چند ذمے داریاں سونپی گئیں۔ میٹنگ کے بعد میڈم کے ساتھ کچھ رنگین وسنگین لمحات گزرے پھر اسے ایک گمنام کال موصول ہوئی جس کے بعد اس نے روانگی کی تیاری شروع کر دی میں نے ضد کر کے میڈم کے ساتھ جانے کا فیصلہ کیا۔ ہم ایک مکان میں پہنچے۔ جہاں ایک بوڑھا بندھا ہوا تھا۔ اس کا رویہ میڈم کے ساتھ نفرت انگیز تھا جو میرے لیے باعث حیرت تھا۔ میڈم نے اس سے ایک خاتون اور لڑکی کا پوچھا وہیں ایک خونریز معرکہ ہوا اور پیرو ماچھی غنڈے کا کردار سامنے آیا۔ اس کے بعد ہمارا ٹاکرا پولیس سے ہو گیا۔ اس سے گلوخلاصی کے بعد کچھ فرصت کے لمحات پر آئے تھے کہ میڈم کی چیخ سنائی دی۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

ہمارے پستول ہماری جیبوں میں تھے اور اتنے مختصر وقت میں انہیں نکال کر عقب میں کھڑے گن بردار پر فائر نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ناچار ہم دونوں نے ایک دوسرے کی جانب دیکھ کر ہاتھ سروں پر رکھ لیے۔ میں اس حیرت سے دوچار تھا کہ وہ کہاں سے نکل کر ہمارے پیچھے آن کھڑا ہوا تھا۔ اس سے پہلے ڈھنڈ پر مراد بخش ایسے وقت میں نکل کر سامنے آیا تھا جب کسی کی موجودگی کا واہمہ نہیں تھا۔ جس وقت میڈم اپنی گاڑی کو پتن سے اتار کر بیڑے میں سوار کر رہی تھی، اس وقت میں نے بڑی احتیاط سے بیڑے کا جائزہ لیا تھا۔ تب سوائے سیاہ فام سیلر کے کوئی بھی شخص بیڑے میں موجود نہیں تھا۔ ایک خیال کوندے کی طرح میرے ذہن میں لپکا۔ میں نے بیڑے میں سیلر کے خیمے میں نہیں جھانکا تھا۔ خیمہ مختصر تھا مگر اس میں اتنی گنجائش تھی کہ ایک کے بجائے دو آدمی اس میں لیٹ سکتے۔ مجھے ازخود یقین ہو گیا کہ وہ خیمے کے اندر ہی موجود تھا، جس وقت ہم بیڑے میں سوار ہوئے تھے۔

میڈم نے سرگوشی کی۔ ”یہی پیرو ماچھی ہے؟“

پیرو ماچھی نے ڈانٹا۔ ”کھسر پھسر نہ کرو، بتاؤ! تم کون ہو اور اس علاقے میں کیا کر رہے ہو؟“

میں نے اپنی آواز میں سختی پیدا کرتے ہوئے کہا۔ ”یہی سوال میں تم سے پوچھنا چاہتا ہوں۔ تم کون ہو اور بدمعاشوں کی طرح ہم پر گن تانے کیوں کھڑے ہو؟“

یہ کہنے کے ساتھ ہی میں نے تھوڑا پہلو بدلا اور کن انکھیوں سے اُسے دیکھا۔ وہ ہم سے پانچ سات فٹ کی دوری پر کنارے والے چوبی تختے پر کھڑا خشمگیں نظروں سے ہمیں گھور رہا تھا۔ اس کی نگاہیں میڈم پر مرتکز تھیں اور ندیدا پن صاف عیاں تھا۔ اس نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔ ایسے ہی وقت میں سیلر نے سہمے سہمے انداز میں کہا۔

”سائیں! یہ مسافر ہیں۔ انہیں کچھ نہ کہو..... مجھ سے غلطی ہو گئی کہ بھاڑے (کرایے) کے لالچ میں تمہیں بھول گیا۔“

اس نے ڈانٹا۔ ”بکواس نہ کر اور بیڑا واپس موڑ۔ بھاڑے کا فکر نہ کر۔ دوگنا مل جائے گا۔“

”سائیں! ان بے چاروں پر رحم کرو۔ میں ہاتھ جوڑتا ہوں۔“ سیاہ فام ملاح گھگھیایا۔ ساتھ ہی اس نے اپنے دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔

”اوئے مردود کا بچہ! مار مار کر بھرکس نکال دوں گا تیرا..... جو کہہ رہا ہوں، وہ کر ورنہ.....“

میں نے دیکھا کہ سیلر کو ڈانٹتے ہوئے بھی اس کی نظریں ایک لمحے کو بھی ہم پر سے نہیں ہٹی تھیں۔ میں حیرت کے حصار سے نکل آیا تو اس پر قابو پانے کی ترکیب سوچنے لگا، میں نے کہا۔ ”تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔ تم کون ہو اور یہ بدمعاشی کیوں کر رہے ہو؟“

اس نے غراتی ہوئی آواز میں مجھے گالی دی اور کہا۔

"لگتا ہے کہ بندوق دیکھ کر تمہارا دماغ چل گیا ہے۔ تمہارا نام کیا ہے؟"

"میرا نام اجمل ہے۔ تمہارا نام کیا ہے؟"

"میرا نام سنو گے تو پتا پانی ہو جائے گا جوان! میں پیر بخش ہوں۔ دنیا مجھے پیرو ماچھی کے نام سے جانتی ہے۔" اس نے روایتی بدمعاشوں کے انداز میں اسٹائل مارتے ہوئے کہا۔ "کیوں؟ بولتی بند ہو گئی ناں تمہاری...... یہ پینٹو شرٹو ناری تمہاری کیا لگتی ہے؟"

میڈم نے درست کہا تھا۔ وہ بدنام علاقہ اشتہاری ڈاکو پیرو ماچھی ہی تھا جس کی تلاش میں ہم بھٹک رہے تھے۔ وہ ہمیں بغیر کسی ردوکد کے مل گیا تھا مگر اس کی پوزیشن ہمارے لیے خاصی خطرناک تھی۔ اس نے اپنا سوال دُہرایا تو مجھ سے پہلے میڈم بول پڑی۔ "ہم دونوں میاں بیوی ہیں۔"

مجھے اس کے منہ سے نکلنے والا جملہ عجیب لگا۔ دیہاتوں کی عورتیں کئی ازدواجی سال گزارنے کے بعد بھی اتنی خود اعتمادی سے اپنا اور اپنے شوہر کا تعارف نہیں کرواتیں جتنے اعتماد سے میڈم نے جھوٹ بولا تھا۔

پیرو ماچھی نے معنی خیز انداز میں لمبا ہنکارا بھرا۔ "ہوں...... میاں بیوی...... ادھر ہنی مون منانے نکلے تھے کیا؟" نہ صرف اس کی آواز خاصی خوفناک تھی بلکہ اس کے منہ سے نکلنے والے الفاظ بھی خاصے تضحیک آمیز تھے۔ اس سطح کے بدمعاش اپنی مضحکہ خیز مگر ڈراؤنی آواز کے بل پر لوگوں کو ایسے ہی ڈرا کر اپنی مطلب برآری کرتے ہیں۔ "اوئے برائیلر ککڑ! بولو ناں...... یہاں کیا کرتے پھرتے ہو؟"

اس نے میرے عمدہ اور نفیس لباس، گوری رنگت اور شہری بودوباش کی بدولت مجھے برائیلر مرغ کی تشبیہ سے نوازا تھا۔ میں پنجہ آزمائی کے بعد اس کا خیال بدل سکتا تھا مگر ابھی اس کی ہرزہ سرائیوں کو سن کر برداشت کرنا مجبوری تھی۔ میں نے کن انکھیوں سے میڈم کو دیکھا اور کہا۔ "پیر بخش عرف پیرو ماچھی! اگر تم میں ہمت ہے تو گن عرشے پر رکھ دو اور میرے ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر دیکھو۔ پھر تمہیں پتا چلے گا کہ میں برائیلر ککڑ ہوں یا اصلی اصیل...... لمبی اور مضبوط خاروں والا ککڑ......"

وہ استہزائیہ انداز میں ہنسا، اکڑ کر بولا۔ "ذات دی کوڑھ کرلی تے شہتیراں نوں جپھے...... واہ جوان! فکر نہ کرو، تمہاری یہ حسرت ضرور پوری کروں گا۔ اے ناری! ذرا ادھر جلوہ دکھا اپنے حسن کا......"

مارے غصے کے میری مٹھیاں بھنچ گئیں۔ میڈم نے آنکھوں ہی آنکھوں سے مجھے برداشت کرنے کا حکم دیا اور نگاہیں اُٹھا کر اس کی سمت گھوم گئی، بولی۔ "لو! جی بھر کر جلوا دیکھ لو میرے حسن کا۔ جی بھر جائے تو بتا دینا، میں رُخ پھیر لوں گی۔"

میڈم کے لہجے میں بلا کی کاٹ تھی۔ پیرو ماچھی کو شاید اس رویے کی توقع نہیں تھی اس لیے چونک گیا۔ میڈم کو دیکھ کر ایک ذرا ٹھٹکا اور اپنی خفت چھپانے کو بولا۔ "بکواس نہ کرو...... تمہارا نام کیا ہے؟"

وہ ہنسی۔ "میرا نام بہن جی ہے۔ کیا تم اس نام سے مجھے پکارو گے؟"

میں سمجھ گیا کہ وہ اپنے آزمودہ حربے سے اُسے زچ کرنے چلی تھی۔ فارم ہاؤس کے باہر اس نے اپنے اغوا کار کو ذہنی دباؤ کا شکار کر کے زیردام کر لیا تھا، بولی۔ "ہاں پیرو ماچھی! تم نے کوئی جواب نہیں دیا۔ چلو شاباش! اپنی گن نیچے کر لو ورنہ بہت برا پیش آؤں گی۔"

اس کے ساتھ ہی میڈم نے اپنے دونوں ہاتھ نیچے کر لیے۔ میں نے اس کی تقلید کی تو وہ مجھے جھڑک کر بولی۔ "کیا تمہیں اس اوچھے بدمعاش نے ہاتھ نیچے کرنے کی اجازت دی ہے؟ نہیں ناں...... چلو! اپنے ہاتھ سر پر رکھو......"

میں نے جلدی سے ہاتھ سر پر رکھ لیے اور کن انکھیوں سے پیرو کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں حیرت کے ساتھ ساتھ تشویش کی لہر دوڑنے لگی تھی۔ اس نے میڈم کو گھورا اور غرایا۔ "میں تمہیں گولی مار دوں گا۔ ہاتھ سر پر رکھو......"

میڈم نے اپنے ہاتھ گود میں پھیلائے، ناخنوں کو دیکھتے ہوئے منہ بنایا اور بے نیازانہ بولی۔ "نہیں رکھتی...... کر لو جو کرنا ہے تمہیں...... بڑے آئے بدمعاش کہیں کے۔"

پیرو ماچھی کا حال برا ہو گیا۔ وہ گولی مارنا نہیں چاہتا تھا۔ محض ڈرانا چاہتا تھا مگر میڈم نے اس کی حکم عدولی کر کے للکار دیا تھا۔

اس نے دانت پیس کر گن کا رُخ میڈم کے سینے کی طرف کیا اور چہرے کے تاثرات یوں بدلے جیسے گولی چلانے لگا ہو۔ میڈم ہنسی۔ "چلو اَب ٹرائیگر دبا ہی دو۔ نہ رہے بانس، نہ بجے بانسری...... اس بندوق میں کتنی گولیاں ہوتی ہیں؟"

وہ بے خیالی میں بولا۔ "سات......"

"یہ برسٹ مارتی ہے ناں؟"

"نہیں۔" وہ دانت پیس کر بولا۔

"بولٹ تو چڑھا لو۔ کیا ایسے ہی گولی مارو گے؟" میڈم نے مسکرا کر کہا۔

اس نے جلدی سے گن کو دیکھا اور بے اختیارانہ بولٹ لیور پر ہاتھ رکھا۔ میڈم کا قہقہہ فضا میں گونج گیا۔ پیرو ماچھی کی ندامت آمیز غصے سے بگڑی ہوئی شکل دیکھ کر میرے لبوں پر مسکراہٹ تیر گئی۔ میڈم اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئی تھی اور اس نے پیرو ماچھی کو الجھا دیا تھا، بولی۔ "پیرو ماچھی تمہارا کیا لگتا ہے؟"

پیرو کے چہرے کے تاثرات ایک دم بدل گئے۔ متردد انداز میں کبھی میڈم کو اور کبھی مجھے دیکھنے لگا۔ "تم دِتے کو کیسے جانتی ہو؟ کون ہو تم؟"

"میں تو مراد بخش اور جمیل دتی کو بھی جانتی ہوں۔ اب یہ پوچھنا کہ میں انہیں کیسے جانتی ہوں۔" میڈم نے مزہ لیتے ہوئے کہا۔ "کہو تو تمہارا سارا کچا چٹھہ کھول کر رکھ دوں......"

ایسے ہی وقت میں بیڑا اس پتن پر جا لگا جس سے تھوڑی دیر پہلے روانہ ہوا تھا۔ میڈم اچھل کر کھڑی ہو گئی اور مجھے مخاطب کرتے ہوئے بولی۔ "پیرو ماچھی اپنا آدمی ہے۔ ہاتھ نیچے کر لو اور بیڑے سے اُترو۔ کسی پرسکون جگہ پر بیٹھ کر پیرو سے باتیں کرتے ہیں۔ کیوں پیر بخش؟"

پیرو ماچھی کے ذہن و قلب میں پیدا ہونے والی کشمکش چہرے پر رقم ہو گئی۔ دو قدم پیچھے ہٹ کر خیمے کے پاس جا کھڑا ہوا۔ چیخ کر بولا۔ "اوئے برائیلر! تم اِدھر ہی کھڑے رہو۔ ناری گاڑی میں بیٹھ کر اسے اسٹارٹ کرتی ہے۔ اوئے دِینے...... ماں کے دِینے...... چل گاڑی کے رسے کھول اور پتن کو لانبھہ کر...... چل فٹافٹ کر......"

میڈم نے مجھے اس کا حکم ماننے کا اشارہ کیا اور خود رسّا تھام کر جھولتی ہوئی گاڑی کی طرف بڑھ گئی۔ پیرو ماچھی کا دماغ واقعی فیوز ہو گیا تھا۔ اس نے میڈم کو ڈرائیونگ سیٹ تک پہنچنے کی مہلت دے کر اپنے تابوت میں کیل ٹھونک دی تھی۔ اُسے اندازہ نہیں تھا کہ گاڑی کے فرش پر موت اگلنے والی خطرناک گن پڑی تھی جو ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھتے ہی میڈم کے ہاتھ لگ جانی تھی۔ وہ بہ آسانی کھلے دروازے کی اوٹ لے کر یا سیٹ پر بیٹھ کر اپنا پستول کوٹ سے نکال سکتی تھی۔

میڈم شکیلہ نے بڑی چالاکی سے چھیڑ چھاڑ کر کے اس کا دم خم ٹھکانے لگا دیا تھا اور ڈنک نکال لیا تھا۔ وہ میرے مقابل میں چند فٹ اونچائی پر کھڑا مجھے گھور رہا تھا۔ مجھے بہ غور دیکھتے پا کر جبڑوں کے اعصاب بھینچے اور درشت لہجے میں کہا۔ "اپنی لونڈی کو سمجھا دو۔ اگر اس نے کوئی حرکت کی تو میں ایک لمحہ ضائع کیے بغیر تمہیں گولی مار دوں گا۔"

میں نے کہا۔ "وہ دیکھ رہی ہے۔ کوئی حماقت نہیں کرے گی۔"

ملاح کا نام دِینا تھا۔ ماں باپ نے دین محمد یا اللہ دین رکھا تھا مگر زمانے نے بگاڑ کر مختصر کر دیا تھا۔ دِینا ڈری ڈری نظروں سے پیرو ماچھی کی طرف دیکھتے ہوئے گاڑی بہ مضبوطی سے باندھے گئے رسے کھولنے لگا۔ اس کی شکل سے عیاں تھا کہ اُس پر نہ صرف خوف طاری تھا بلکہ اُسے ہماری پریشانی بھی لاحق تھی۔ بھاڑا ضائع ہونے کا دکھ الگ سے تھا۔

پیرو نے مجھے تختے پر بیٹھ جانے کا حکم دیا۔ میں بیٹھ گیا تو وہ اونچی آواز میں میڈم سے مخاطب ہو کر بولا۔ "گاڑی پتن پر اُتارو۔ جلدی کرو۔"

میڈم جواباً چلائی۔ "کیا جلدی ہے؟ کیا تم نے کالج میں لیکچر دینے کے لیے جانا ہے؟"

پیرو ماچھی کی آنکھیں سکڑیں، احساسِ خفگی پیشانی پر مچلا اور پھاڑ کھانے کے انداز میں گالی دے کر بولا۔ "بہتر ہے کہ میرے غصے سے بچ جاؤ ورنہ کسی کو منہ دکھانے کے لائق نہیں رہو گی۔"

میں نے کہا۔ "تمیز سے بات کرو ورنہ......"

"ورنہ کیا؟" وہ شعلے کی طرح بھڑکا۔ "ورنہ کیا کرو گے حرام زادے...... میں تمہارا خون پی جاؤں گا۔"

میڈم نے پستول نکالنے یا گن اُٹھانے کے بجائے سیٹ پر بیٹھ کر گاڑی اسٹارٹ کر دی۔ بیڑا تھرتھرانے لگا۔ پیرو ماچھی کا مارے اشتعال کے برا حال تھا۔ بعید نہ تھا کہ مجھے گولی مار دیتا۔ میں نے جلدی سے کہا۔ "ابھی بیڑے سے اُتر کر تمہیں بتائیں گے کہ ہم کون ہیں۔ پھر تمہیں ہم سے روا رکھے گئے اپنے رویے پر شرمندگی ہو گی، سمجھے تم؟"

میرے پراعتماد لہجے نے اُسے مزید الجھا دیا، بولا۔ "آخر تم ہو کون؟ بتاتے کیوں نہیں ہو؟"

میں نے سنجیدگی سے کہا۔ "ابھی بتاتے ہیں، ذرا صبر سے کام لو۔"

دِینے ملاح نے اپنا کام مکمل کر لیا اور میرے قریب آن کھڑا ہوا۔ اپنے مخصوص انداز میں میڈم کو گاڑی ریورس کرنے کے لیے کاشن جاری کرنے لگا۔ چند منٹ کی تگ و دو کے بعد گاڑی پتن پر چڑھنے میں کامیاب ہو گئی۔ میڈم گاڑی کو پتن سے چند گز دور لے گئی۔ روک کر بلند آواز میں بولی۔ "شہریار! ملاح کو پانچ سو روپے دے دو۔ پیرو ماچھی نے چھیننا سیکھا ہے، دینا نہیں۔"

"شہریار؟" پیرو ماچھی تعجب اور خفگی سے بولا۔ "مگر تم نے مجھے اپنا نام اجمل بتایا تھا۔ مجھ سے جھوٹ بولا تھا...... تمہاری تو......"

اس کے منہ سے غلیظ گالیوں کا فوارا ابل پڑا۔ آنکھوں کا تاثر ایک دم بدل گیا۔ یوں محسوس ہوا جیسے اُس نے مجھے گولی مارنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔

میڈم چلائی۔ ”پیر بخش! اسے لے کر پتن پر آجاؤ۔“

وہ اس کی توجہ مجھ پر سے ہٹانا چاہتی تھی مگر پیرو کی خون آشام نظریں مجھ پر گڑی رہیں۔ ٹریگر پر جمی انگلی لرزنے لگی۔ میں فوری طور پر حرکت میں آیا اور پیروں کے بل اُچھل کر بیڑے کے احاطی تختے پر کود گیا۔ بیڑے کو زور دار جھٹکا لگا جس کی وجہ سے میں اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور پشت کے بل بیڑے کے گیلے فرش پر جا گرا۔ شکر تھا کہ پھسل کر دریا کے یخ بستہ پانی میں نہیں گرا تھا۔ میں نے اُٹھنے میں غیر معمولی سرعت کا مظاہرہ کیا اور اچھل کر تختے پر چڑھ گیا۔ عرشے پر دیکھا۔ پیرو منہ کے بل چوڑے تختے پر پیٹر انجن کے قریب پڑا تھا۔ اس کی گن اس کے جسم کے نیچے دبی ہوئی تھی۔ وہ مجھے گالیاں دیتا ہوا اُٹھنے لگا۔ ابھی اُس نے گن اُٹھائی ہی تھی کہ فضا فائر کی خوفناک آواز سے گونج اُٹھی۔ پیرو تڑپ کر سیدھا ہوا پھر پہلو کے بل پیٹر انجن پر گر کر دوسری جانب الٹ گیا۔ اس کی گن میری جانب پھسل کر بیڑے کے فرش پر گر گئی۔ میں نے پلٹ کر میڈم کی طرف دیکھا۔ وہ پتن پر پستول ہاتھ میں تھامے کھڑی تھی۔

اس نے دوسرا فائر کیا۔ پیرو ماچھی کھڑے ہونے کی کوشش میں پھر عرشے پر گر کر لوٹ پوٹ ہونے لگا۔ میں نے دوسرے تختے پر چھلانگ لگائی۔ رُک کر پیرو کو بہ غور دیکھا۔ وہ عرشے پر اپنی دونوں پنڈلیوں کو سختی سے پکڑے بیٹھا کراہ رہا تھا۔ میڈم کی دونوں گولیاں اس کی پنڈلیوں میں پیوست ہوگئی تھیں اور وہ عملی طور پر ناکارہ ہوگیا تھا۔ میڈم کی سرد آواز میرے کانوں میں پڑی۔ ”شہریار! اسے سنبھال کر پتن پر لے آؤ۔ اسے مناسب الفاظ میں اپنا تعارف کراتے ہیں۔“

میں تختے پھلانگتا ہوا عرشے پر پہنچا۔ اُس کے پہلو میں بھرپور ٹھوکر رسید کی۔ اس نے سر اُٹھایا مجھے گھورا پھر برق رفتاری سے اپنی جیب کی طرف ہاتھ بڑھایا مگر میں نے اس کا ارادہ بھانپتے ہی کندھے پر بوٹ کی زوردار ٹھوکر ماری۔ وہ بلبلا کر کمر کے بل گرا۔ چیخ کر اُٹھنے لگا تو میرے ہاتھ میں پکڑے ہوئے پستول پر نظر پڑ گئی۔ ٹھٹک کر رُک گیا اور خوف زدہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے کہا۔ ”اُٹھو...... تمہارا کھیل ختم ہو چکا ہے اور ہمارا شروع۔ چلو شاباش! بیڑے سے اُترو۔“

اس نے ہتھیلیاں عرشے پر جمائیں اور اُٹھنے کی کوشش کی مگر اس کے حلق سے چیخ نکل گئی۔ اس کے دونوں پائنچے خون سے تر ہو چکے تھے اور عرشے پر بھی خون گر رہا تھا۔ میں نے اپنا حکم دہرایا تو وہ غصے اور بے بسی کے ملے جلے لہجے میں مجھے گالی سے نواز کر غرایا۔ ”اندھے ہو، دیکھ نہیں رہے ہو کہ مجھ سے کھڑا نہیں ہوا جاتا۔ بس! تم لوگ اب یہاں سے دفع ہو جاؤ، مجھے یہیں پڑا رہنے دو، جاؤ!“

”اوئے بھولے بادشاہو! چلو اُٹھو...... تم سے تو بہت حساب کتاب کرنے ہیں ہمیں۔“ میں نے دانت پیس کر کہا۔ ساتھ ہی مجھے احساس ہوگیا کہ وہ اپنے پیروں پر چلنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ میں نے اسے کالر سے پکڑا اور دو چار جھٹکے دیے۔ اس کی گردن میں پستول کی نال چبھوتے ہوئے آگے کی طرف دھکیلا۔ وہ بلبلا کر رہ گیا۔

میڈم نے دینے ملاح کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”اس بدمعاش کو سہارا دے کر میرے پاس لاؤ۔“

دینا سیلر سمجھ گیا تھا کہ ہم پیرو سے بھی کہیں بڑے بدمعاش ہیں، اس لیے آمادہ بہ تعاون نظر آیا۔ بیڑے میں اُترا اور بھاگ کر ہمارے پاس پہنچا۔ میں نے کہا۔ ”اس کی تلاشی لو۔ جو کچھ بھی ملے، نکال لو۔“

اس نے چند ہی لمحوں میں ایک چھوٹا ماؤزر، چھ گولیاں، ایک گراری دار چاقو اور بھاری بٹوا نکال کر عرشے پر رکھ دیا۔ میں نے کہا۔ ”ماؤزر اور گولیاں پانی میں پھینک دو۔ پرس اپنے پاس رکھ لو اور چاقو مجھے تھما دو۔“

دینے نے بلا چوں وچرا اں کانپتے ہاتھوں سے میرے حکم کی تعمیل کی پھر لرزتی ہوئی آواز میں بولا۔ ”سائیں! ایں کوں چھوڑ ڈیوو، اِہ بہوں ڈاڈھا ہے۔“

(سائیں! اسے چھوڑ دو۔ یہ بہت ظالم ہے)

میں نے اس کی گزارش نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ ”اسے گھسیٹ کر پتن پر لے جاؤ، جلدی کرو۔“

اس نے پیرو کی بغلوں میں ہاتھ ڈالے اور کھینچتا ہوا پتن پر لے گیا۔ بیڑے کے بڑے تختے پر خون کی دو لکیریں پتن تک کھنچتی چلی گئیں۔ پیرو ماچھی کے منہ سے نکلنے والی طوفانی چیخیں، گالیاں اور دھمکیاں بڑی دردناک تھیں۔

میڈم نخوت سے بولی۔ ”پیر بخش! بولو، کہاں جانا پسند کرو گے؟ کیا تمہیں تمہارے ڈیرے پر لے جا کر اپنا تعارف کراؤں؟“

”میں تم لوگوں سے نمٹ لوں گا۔ تمہاری تو ——“ اس نے پھر اپنی عادت سے مجبور ہو کر میڈم کو غلیظ گالی دی۔ میں نے

بھر کر اُسے لات مارنی چاہی تو میڈم نے روک دیا۔ مسکرائی، بولی۔ ”نہیں شہریار! گالی پر مسکرانا اور گولی سے بچنا جواں مردی کہلاتی ہے۔ اسے بکنے دو۔ اس غریب کو فارغ کرو جس کی روزی کا اڈا ہم نے اس بے غیرت کے گندے خون سے داغدار کر دیا ہے۔ زیادہ پیسے دو بے چارے کو۔“

میں نے جیب سے نوٹوں کی گڈی نکالی۔ تین نوٹ کھینچے۔ میڈم بولی۔ ”اوں ہوں! دو چار اور نکال لو۔ غریبوں کو دیے ہوئے نوٹ دو گنے چوگنے ہو کر واپس آتے ہیں۔“

میں نے گنے بغیر چند نوٹ کھینچ کر دینے کے ہاتھ پر رکھ دیے۔ اس نے ممنون نظروں سے میڈم کی طرف دیکھا، وہ بولی۔ ”ڈرو نہیں۔ یہ سب تمہارے ہیں۔ اس مردود کی طرف سے بھی فکر مند نہ ہونا۔ یہ آئندہ تمہیں دکھائی نہیں دے گا۔ کیا یہ تمہارے خیمے میں چھپا ہوا تھا؟“

میڈم نے پیرو ماچھی کی طرف اشارہ کیا۔

”جی بی بی سائیں!“ دینے ملاح نے سہمی ہوئی نظروں سے پیرو کی جانب دیکھا اور آنکھیں چرالیں۔ سرائیکی میں بولا۔ ”یہ جھوک سے نشے میں لڑھکتا ہوا آیا تھا اور مجھے اس پار پہنچانے کی ضد کرنے لگا۔ میں نے اِسے خیمے میں سلا دیا اور کہا کہ پھیرا بن جائے، تب ادھر آؤں گا۔ ایک آدھ سواری سے تو اس موئے پیٹر کا پیٹ نہیں بھرتا ناں۔“

”ہوں!“ میڈم نے تفہیمی انداز میں ہنکارا بھرا، بولی۔ ”ٹھیک ہے۔ تم اَب جاؤ اور اپنا بیڑا دھو پونچھ لو۔“

وہ الٹے قدموں چوبی کھونٹے کی طرف بڑھا اور میڈم پر آنکھیں ثبت کیے لانہہ کی گرہ ٹٹول کر کھولنے لگا۔ اسے شاید یہ واہمہ تھا کہ کہیں میڈم اسے گولی نہ مار دے۔ ایسے ہی انداز میں اُس نے دوسری لانہہ کھولی اور الٹے قدموں چلتا ہوا بیڑے پر سوار ہوگیا۔ اس نے پیٹر انجن اسٹارٹ کرنے کے بجائے پتن کو پوری قوت سے پاؤں کی مدد سے دھکیلا۔ بیڑا پانی میں تیزی سے بہاؤ کے رُخ پھسلا۔ دینا ملاح بیڑے کے وسط میں کھڑا میڈم کو دیکھے گیا۔ جب سو ڈیڑھ سو گز دور پہنچ کر اُسے اپنے زندہ سلامت بچ جانے کا یقین ہوا۔ اس نے دونوں ہاتھ فضا میں لہرائے اور حلق کے بل چلایا۔ ”بی بی سائیں! اللہ تیکوں بہوں ڈیوے، توں رج رج کے سوہنی جوانی مانڑیں!“

(بی بی مالکن! اللہ تجھے بہت دے۔ تو جی بھر کر اپنی خوب صورت جوانی سے لطف اندوز ہو)

میڈم نے جواباً ہاتھ لہرایا پھر میری طرف متوجہ ہوئی۔ ”اسے گاڑی میں ڈالو۔“

”کیا! اسے ڈیرے پر لے جانا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”ہاں!“ میڈم نے کہا اور گاڑی کی طرف پلٹی۔

”مگر اس فضول محنت کی کیا ضرورت ہے میڈم!“ میں نے جلدی سے کہا۔ ”جو پوچھنا ہے، یہیں پوچھ لیتے ہیں اور اپنی راہ پکڑتے ہیں۔“

میڈم پلٹی۔ چند لمحوں تک مجھے ایک ذرا خفگی سے دیکھتی رہی، پھر تحکمانہ انداز میں بولی۔ ”میں جو کہہ رہی ہوں، وہ کرو اور فضول مشورے نہ دو۔“

میں نے مسکرا کر کہا۔ ”میں آپ کا نوکر نہیں ہوں، باڈی گارڈ بھی نہیں ہوں بلکہ آپ کا دوست ہوں۔ دوستوں پر حکم نہیں چلایا جاتا۔“

مجھے توقع تھی کہ وہ بھڑک اُٹھے گی اور مجھے بے نقط سنائے گی مگر اس کے برعکس وہ تھم گئی۔ سپاٹ نظروں سے مجھے چند لمحوں تک گھورتی رہی پھر مسکرا کر بولی۔ ”اوہ میں یہ تو بھول ہی گئی تھی کہ تم میرے نوکر نہیں ہو۔ اچھا! کرو، جو کرنا چاہتے ہو۔“

مجھے اُس پر فخر ہوا۔ وہ گاڑی کے بونٹ پر اچھل کر بیٹھ گئی اور پستول سے کھیلتے ہوئے ہمیں دیکھنے لگی۔ میں نے اپنے پیروں میں پہلو کے بل لیٹے کراہتے ہوئے پیرو ماچھی کی پسلیوں میں زوردار ٹھوکر رسید کی اور غرا کر کہا۔ ”اوئے حرام زادے! سیدھا ہو کر بیٹھو۔ یہ کیا عورتوں کی طرح ’ہاں ہاں‘ کر رہے ہو۔ ٹانگوں میں گولیاں لگی ہیں، کوئی سینے میں تو لگی نہیں کہ چیخنے چلانے لگے ہو۔“

اس کا چہرہ تکلیف کی شدت سے بگڑ چکا تھا۔ میں نے پہلی مرتبہ اسے بہ غور دیکھا۔ وہ درمیانے قد کا گٹھے ہوئے بدن کا مالک تھا۔ اس نے بڑی، نوک دار اور غیر تراشیدہ مونچھیں رکھ چھوڑی تھیں جو اس کی دہشت میں اضافہ کرتی تھیں۔ گھنگھریالے لانبے سیاہ بال اور سرخ ڈوروں والی موٹی موٹی آنکھیں اس کی شکل کو خاصا خوفناک بناتی تھیں۔ میں نے اُسے دو چار ٹھڈے مارے۔ وہ بلبلا کر بولا۔ ”کیا مصیبت ہے تمہیں؟ بلاوجہ کھوتے کی طرح دولتیاں مار رہے ہو۔“

میڈم کھلکھلا کر ہنسی۔ یوں لگا جیسے مندر کی ڈھلتی ہوئی شام مترنم گھنٹیوں کی آواز میں دیوانہ وار نہانے لگی ہو، جھوم کر رقص کرنے لگی ہو۔ اس کی ہنسی ندامت انگیز تھی مگر مجھے اچھی لگی۔ ایسے ہی وقت میں دینے ملاح نے اپنا پیٹر انجن اسٹارٹ کر دیا۔ باوجود کہ وہ ہم سے بہت دور تھا، اس کے انجن کی پھٹ پھٹ کی آواز نے سارا طلسم توڑ دیا اور میں میڈم شکیلہ پر ایک نگاہِ شکایت ڈال کر پیرو ماچھی کی طرف متوجہ ہوا جو ایک ٹانگ پکڑے کراہ رہا تھا۔ میں نے اس کی

دوسری : ــ پر عین زخم والی جگہ پر بوٹ کی ٹھوکر ماری۔ وہ چیخ مارتے ہوئے دوسری جانب الٹ گیا، چلایا۔ ”میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“

اسے ایک ذرا نظر انداز کرتے ہوئے میں نے طائرانہ نگاہ چہار سو ڈالی۔ سوائے دوسرے کنارے کے قریب پہنچنے والے چوبی کشتے پر کھڑے دینے ملاح کے، کوئی ذی نفس نظر نہیں آیا۔ عجیب ویرانی سی ویرانی تھی۔ میڈم شوخی سے بولی۔ ”یہاں ہیرو، ہیروئن اور ایک عدد زخمی ولن کے علاوہ کوئی نہیں ہے۔ بے فکری سے اپنا کام کرو۔“

میں نے ولن کی طرف دیکھا۔ وہ سرخ آنکھوں سے مجھے کچا چبانا چاہتا تھا مگر مجبور پڑا تھا۔ دیکھنے میں وہ خاصے مضبوط اعصاب کا مالک دکھائی دیتا تھا مگر وہ نہایت بھونڈے طریقے سے اپنی غالب پوزیشن سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا اور اب اپنے زخموں کا لہو چاٹ رہا تھا۔ میں اس کے قریب پیروں کے بل بیٹھ گیا اور آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔ ”پیرو! مجھے تم سے کوئی دشمنی نہیں ہے اور نہ تمہیں قتل کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ مجھے چند سوالوں کے جواب درکار ہیں۔ اگر صحیح بتاؤ گے تو تمہیں زندہ چھوڑ کر چلا جاؤں گا ورنہ میرے ہاتھوں جہنم واصل ہونے والے تم پہلے شخص نہیں ہوگے۔“

اس نے بھنچی بھنچی آواز میں کہا۔ ”تم کون ہو اور مجھ سے کیا چاہتے ہو؟“

میں نے اپنے لہجے میں بے پناہ درشتی اتارتے ہوئے کہا۔ ”سوال نہیں، جواب...... تم اُس پار کس کے پاس گئے تھے؟“

اس نے مجھے گہری نظر سے دیکھا اور تکلیف دباتے ہوئے کہا۔ ”اپنے ایک دوست کے ہاں گیا تھا۔ کیا تمہیں کوئی اعتراض ہے؟“

اس کی آنکھوں نے چغلی کردی تھی کہ وہ مشکل پسند انسان تھا۔ میں نے پستول کوٹ کی جیب میں ڈالا اور گراری دار چاقو نکال لیا۔ وہ شاید کسی مناسب موقعے کی تلاش میں تھا، جونہی میں نے چاقو کھولنا چاہا، اُس نے پوری قوت سے اپنا آہنی مکا میرے جبڑے پر دے مارا۔ چونکہ مجھے اس ردِعمل کی توقع نہیں تھی، اس لیے میں سنبھل نہ پایا اور پہلو کے بل زمین پر گر گیا۔ یوں محسوس ہوا جیسے میرا جبڑا ٹوٹ گیا ہو۔ درد کی کٹیلی لہر میرے تن بدن میں بھر گئی۔ میں نے اُٹھنے میں دیر نہیں کی مگر تب تک وہ بھی گھٹنوں کے بل کھڑا ہو چکا تھا۔ میں نے اپنا ہاتھ جبڑے پر رکھا ہوا تھا۔

میڈم نے تالی بجائی اور چہکی۔ ”پیر بخش! ایک دم مزہ آ گیا۔ ونس مور......!“

میرا بدن سلگ اُٹھا۔ ایک نظر میڈم کو دیکھا جو بچوں کی طرح خوشی سے مچل رہی تھی۔ پیرو ماچھی مجھ پر سرخ ڈوروں والی آنکھیں جمائے زخمی سانپ کی طرح پھنکار رہا تھا۔ میں نے چاقو کھولا۔ ’کڑ کڑ‘ کی مخصوص آواز سنائی دی۔ تھوڑی مایوسی ہوئی کہ چاقو کا پھل تیز دھار نہیں تھا مگر کام چلتا تھا۔ مخصوص انداز میں لہرایا۔ پیرو اشتعال انگیز انداز میں بولا۔ ”مجھے دو گولیاں لگی ہیں جن کی وجہ سے میں پیروں پر کھڑا نہیں ہوسکتا۔ تم ٹھیک ٹھاک ہو پھر بھی ہتھیار کا سہارا لیتے ہو۔ ہمت ہے تو چاقو پرے پھینک کر میرے قریب آؤ۔ تمہاری بانسری نہ بجادوں تو میرا نام پیرو ماچھی نہیں ہے۔ ہاں......!“ اس نے اپنی عادت کے مطابق مجھے دو تین ناقابلِ اشاعت گالیوں سے بھی نوازدیا۔

میں نے ایک لمحے کے لیے سوچا پھر اس کا چیلنج قبول کرتے ہوئے چاقو بند کر کے جیب میں ڈال لیا اور قدم بڑھایا۔ قریب پا کر اُس نے پوری قوت سے میری ناف کے نیچے مکا مارا۔ میں آگے کی جانب جھک گیا جس سے میرے جسم کا درمیانی حصہ پیچھے ہوگیا اور اس کا وار خطا گیا۔ وہ اپنی ہی جھونک میں میری جانب گرنے لگا تو میں نے اُچھل کر اپنی داہنی کہنی اس کے سر میں رسید کردی۔ اس کے حلق سے دبی دبی چیخ نکلی اور دھڑام سے میرے ٹانگوں کے بیچ منہ کے بل زمین پر گر گیا۔ میں نے اچھل کر ہٹنا چاہا مگر اس نے اچانک الٹے ہاتھوں میرے پیر تھام لیے۔ میں اس کے پیروں کے قریب منہ کے بل جا گرا۔ شکر ہوا کہ میں نے اپنا منہ زمین پر لگنے سے بچالیا تھا ورنہ میں جس تیزی سے گرا تھا، میری ناک کی ہڈی ٹوٹ جاتی۔ میں نے تڑپ کر کروٹ بدلی۔ میرا بایاں پیر اس کی گرفت سے نکلا مگر دایاں پیر اس کی مضبوط گرفت کی وجہ سے مڑ گیا۔ میرے منہ سے سسکاری برآمد ہوئی۔ میں نے ٹانگ جھٹکی مگر کم بخت کی گرفت خاصی مضبوط تھی۔ میں نے الٹی کروٹ لی اور اس کے اوپر جا گرا۔ اس کی ٹانگ کے زخم پر کہنی ماری۔ وہ بلبلا اٹھا مگر اس نے میرا پیر نہ چھوڑا۔

میں نے اس کی دوسری ٹانگ پر مکا مارا اور اُٹھنا چاہا مگر اچانک میرے پورے جسم میں تکلیف وہ برقی لہر دوڑ گئی۔ میرے سنبھلنے سے پیشتر وہ پھر گھٹنوں کے بل کھڑا ہوگیا تھا اور اس نے میرا پیر پکڑ کر مروڑ دیا تھا۔ صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ میرے گھٹنے کے عقبی حصے میں کھڑی ہتھیلی کا وار کردیا۔ میرے منہ سے سسکی نکلی گویا ... اٹھنا چاہا مگر

زمین پر لوٹ پوٹ ہو کر رہ گیا۔ اس کی گرفت میں بلا کی سختی تھی۔ خود کو آزاد کرانے کے لیے میں تھوڑا اوپر اُٹھا مگر اس نے زوردار چیخ ماری اور میرے نیچے سے اپنی زخمی ٹانگ کھینچ کر آنِ واحد میں میرے گھٹنے کے عقبی حصے میں رکھ دی اور پھر اٹھا ہوا پیر پوری قوت سے نیچے کی طرف دبا دیا۔ یہ بہت خطرناک داؤ تھا۔ مجھے یکبارگی یوں محسوس ہوا جیسے میری ٹانگ اَب تب میں ٹوٹنے والی ہو۔ وہ لگاتار چیختا جاتا اور اپنا پورا وزن میرے پیر پر ڈالتا جاتا تھا۔

دباؤ کی ایک حد تک جا کر میری برداشت جواب دے گئی اور میرے حلق سے بلند چیخ نکل گئی۔ وہ بڑے ماہرانہ انداز میں بار بار جھٹکے دینے لگا جس کے نتیجے میں میرے حلق سے چیخیں برآمد ہوتی گئیں۔ اس نے حلق پھاڑ کر مجھے ماں کی گالی دی اور اشتعال انگیز انداز میں کہا۔ ”اوئے برائلر! اَب بول...... تیری تو...... تو اگر اپنے باپ کی اولاد ہے تو اُٹھ کر وار کر...... اپنے باپ، پیرو ماچھی پر...... اوئے لومڑی کی بچی! تو اب بھی تالیاں بجاتاں...... اپنے یار کی حالت دیکھ کر سیٹیاں مار......“

اس کی چنگھاڑتی ہوئی آواز میری سماعت میں انگارے اُتار رہی تھی اور میں بے بسی سے اوندھے منہ پڑا اس کے خونیں شکنجے سے نکلنے کی فوری ترکیب سوچنے میں ناکام ثابت ہو رہا تھا۔ میڈم ایک لمحے کو بھی پریشان نہیں ہوئی تھی بلکہ اس نے تالی بجا کر کہا۔ ”میں داد دینے میں کنجوسی نہیں کرتی پیر بخش! تم نے بہت عمدہ داؤ کھیلا ہے۔“

”اسلحہ تھام کر لڑنا تو ہر کسی کو آتا ہے کھوتے کی اولاد......“ پیرو ماچھی نے ایک زوردار جھٹکا دیا اور میرے شجرۂ نسب میں نامناسب تبدیلیاں کیں۔

میرے پاس چاقو نکالنے کے سوا چارہ نہیں رہا تو میں نے جبڑے بھینچے اور بجلی کی سی تیزی سے اپنی جیب سے چاقو نکالا۔ کھولنے کے لیے سر سے بلند کیا تو میڈم کی طنزیہ آواز میرے کانوں میں پڑی۔ ”نہیں شہریار! یہ مردانگی نہیں۔ تم نے اپنی مرضی سے چاقو فولڈ کر کے جیب میں ڈالا تھا۔ اِٹ اِز ناٹ فیئر گیم۔“

میڈم کی آواز سن کر پیرو ماچھی کو میرے ہاتھ میں چاقو کی موجودگی کا علم ہوگیا اور وہ خبردار ہوگیا تبھی عین اسی لمحے اس نے ایک جھٹکے سے اپنے بدن کا پورا وزن میرے پاؤں پر ڈال دیا۔ میرے حلق سے نکلنے والی چیخ میرے دماغ کے نہاں خانوں میں اس شدت سے گونجی کہ چند ثانیے تک میرے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت مفقود ہوگئی۔ یوں لگا جیسے میری ٹانگ گھٹنے سے علیحدہ ہوگئی ہو۔ چاقو میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔

پھر میں نے فیصلہ کن انداز میں نتائج کی پروانہ کرتے ہوئے اپنی دوسری ٹانگ کو ہوا میں اُٹھایا اور کوشش کی کہ اس کی کمر پر جما سکوں مگر کامیاب نہ ہوسکا اور ٹانگ ہوا میں لہرا کر دھڑام سے پیرو کی ٹانگ پر گری۔ اس نے حلق سے خرخراہٹ اُگلی اور میرے پاؤں کو زوردار جھٹکا دیا۔

مجھ پر مایوسی حملہ آور ہونے لگی تھی۔ اس کی گرفت سے نکلنے کے لیے کوئی مضبوط داؤ پیچ میری دانست میں نہیں تھا۔ غیر ارادی طور پر میں نے اپنا ہاتھ پیچھے کی سمت بڑھایا۔ اپنی چھاتی کو تھوڑا بلند کیا۔ میرا ہاتھ بہ دقت پیرو کے پاؤں تک پہنچا۔ اس کے پیر کو ٹٹولتے ہوئے میں نے زخم تلاش کیا۔ تب تک وہ چوکنا ہوگیا تھا۔ اس نے چاہا کہ اپنی ٹانگ میرے نیچے سے کھینچ لے مگر میں نے اسے کامیاب نہیں ہونے دیا۔ جونہی مجھے انگلیوں پر خون کی چپچپاہٹ محسوس ہوئی، میں نے کھڑی انگلی اندھا دھند اس کی پنڈلی پر مارنی شروع کردی۔ دوسرا یا تیسرا وار کارگر ثابت ہوا اور میری انگلی کی ضرب عین گولی کے زخم پر لگی۔ اس کے منہ سے غراہٹ نکلی اور اس نے میرا پاؤں چھوڑ دیا۔ بے ساختہ تڑپ کر مڑ گیا اور اس کی پنڈلی میری ٹانگ کے نیچے سے نکل گئی۔ یہ مرحلہ اس کے لیے بہت تکلیف دہ تھا مگر زندگی کی بازی کھیلتے ہوئے ایسی ٹیسوں کو خاطر میں نہیں لایا جاتا۔ وہ آزاد ہوگیا۔ میں بھی چند لمحوں کے لیے اس کی گرفت سے نکلا تھا مگر میں کوئی حرکت نہیں کر پایا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے میری ٹانگ ابھی تک اس کے شکنجے میں جکڑی ہوئی تھی۔

وہ اپنے تمام تر وزن کے ساتھ میری پیٹھ پر آن گرا۔ میرا سینہ یک لخت پچکا۔ سانس غیر معمولی رفتار سے نتھنوں سے خارج ہوئی۔ دوسری اُفتاد یہ پڑی کہ اُس نے میری گردن پر زوردار مکا رسید کردیا۔ دہری تکلیف ہوئی۔ ایک گردن کے پیچھے، دوسری ناک زمین پر لگنے کی۔ میری آنکھوں کے سامنے یک لخت اندھیرا چھا گیا۔ ابھی میری ٹانگ حرکت کے قابل نہیں ہوئی تھی کہ اس نے میرے بازو کی مچھلی پر کھڑی ہتھیلی کا وار کیا اور حلق کے بل چیخا۔ ”اُٹھ مائی کے لعل...... باپ پر ہاتھ ڈال، اپنی جوانی دکھا ذرا...... نہیں تو زمین پر ناک رگڑ اور پیرو ماچھی سے معافی مانگ......“

وہ میری توقع سے کہیں زیادہ خطرناک اور سخت جان واقع ہوا تھا ورنہ دونوں ٹانگوں میں گولیاں لگنے کے بعد اتنی پھرتیلی حرکت کی توقع کسی گوشت پوست کے انسان سے نہیں کی جاسکتی تھی۔ میں نے اپنے ہاتھ زمین پر ٹکائے، سانس روکی

اور دانت کچکچا کر اوپر اُٹھنے کی کوشش کی۔ گھٹنے کے عقب میں تیز ٹیس اُٹھی اور سر چکرا گیا۔ اس نے مجھے متحرک دیکھ کر میری گدی پر دوسرا مکا جڑ دیا۔ یہ پہلے سے کم جاندار تھا۔ شاید اس وجہ سے کہ میں اوپر اُٹھ کر اس کے زیادہ قریب ہو گیا تھا۔ میڈم کی حوصلہ افزائی میرے کانوں میں اُتری۔ ''گڈ ......ویل ڈن ......لیو دا لینڈ وِد نیو کرنٹ ڈارلنگ!''

اس کے مکوں کا دائرہ کار گردن سے بڑھ کر کھوپڑی کے عقبی حصے تک پہنچ گیا تو میرا ذہن جھنجھنا اُٹھا۔ میں دیوانہ وار اُٹھا اور پیٹھ پر لدے ہوئے اُس زخمی ریچھ کو جھٹک پھینکنے میں کامیاب ہو گیا مگر اپنے پیروں پر کھڑا نہ ہو سکا اور تیورا کر پھر منہ کے بل جا گرا۔ میری آنکھوں کے سامنے دبیز اندھیرا چھا گیا مگر لاشعور میں پیرو ماچھی کا ہولناک قرب خطرے کی گھنٹی بجا رہا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے گرتے ہی دائیں پہلو کے بل دو چار کروٹیں لیں اور پیرو سے دور گاڑی کے عقبی ٹائر کے قریب پہنچ گیا۔ میرے کانوں میں پیرو کی آواز گونجی۔ ''کتے کا بچہ! دور کیوں بھاگتا ہے؟ نر کا بچہ ہے تو میرے قریب آ، تیری......''

اس کے منہ سے نکلنے والی غلیظ گالی پگھلے ہوئے سیسے کی طرح میرے کانوں میں پڑی اور میں بھڑک کر اُٹھا۔ زور کا چکر آیا اور سر تھام کر ٹائر کی ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ پیرو ماچھی کا عکس میری آنکھوں کے سامنے رقصاں تھا۔ میں نے اُس پر نظریں جمانے کی کوشش کی مگر ناکامی ہوئی۔ وہ ہاتھوں کے تضحیک آمیز اشاروں سے مجھے اپنی جانب بلا رہا تھا۔

میں نے اپنے گھٹنے کو دونوں ہاتھوں میں سختی سے تھاما اور ہلا جلا کر دیکھا۔ شکر تھا کہ ٹوٹنے سے بچ گیا تھا مگر وقتی طور پر فعال نہیں رہا تھا۔ کئی مرتبہ سر جھٹکا، تب جا کر اس کی تھرتھراتی ہوئی تصویر ساکت ہوئی۔ وہ گھٹنوں کے بل جنگلی ریچھ کی طرح چھاتی پھیلا کر چند قدموں کے فاصلے پر کھڑا مجھے خشمگیں آنکھوں سے گھور رہا تھا۔ میں نے چند لمبی لمبی سانسیں لیں اور گاڑی کا سہارا لے کر کھڑا ہو گیا۔ مجھے فوری طور پر احساس ہو گیا کہ میری ٹانگ میرا بھرپور ساتھ دینے کے قابل نہیں رہی تھی۔ تبھی اپنے جسم کا زیادہ وزن دوسری ٹانگ پر ڈالا اور لنگڑاتا ہوا پیرو کی طرف بڑھا۔

دو قدم چلا تو پیرو کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے چاقو پر نظر پڑ گئی۔ وہ چاقو والا ہاتھ ہوا میں بلند کیے میرے قریب آنے کا انتظار کر رہا تھا، میں تھم گیا۔ میڈم کی آواز سنائی دی۔ ''پیر بخش کو زخمی ہونے کی وجہ سے چاقو رکھنے کی رعایت دی جاسکتی ہے شہریار!''

میں نے میڈم کی چھیڑ چھاڑ کو نظر انداز کیا اور اپنی نظریں چاقو پر جماتے ہوئے قدم بڑھایا۔ جونہی پیرو کے قریب پہنچا، اُس نے مجھ پر بجلی کی سی مستعدی سے وار کر دیا۔ میں ایک پاؤں پر اُچھلا اور اس کا وار خطا کرتے ہوئے پہلو میں پہنچ گیا۔ میرا زوردار گھونسا اس کے بائیں جبڑے پر پڑا۔ وہ لہرایا مگر سنبھل کر گرنے سے بچ گیا اور اس کا چاقو والا ہاتھ کوندے کی طرح میری جانب لپکا۔ میں جھپٹ کر پیچھے ہٹا اور ایڑی پر گھوم گیا۔ میری نیم مفلوج ٹانگ اس کی پسلیوں میں لگی۔ اس کے حلق سے 'اوغ' کی کریہہ آواز نکلی اور پہلو میں گرتے گرتے ہتھیلی کے بل زمین پر ٹک گیا۔ میں نے اپنی ٹانگ پھر گھمائی۔ وہ میرے وار سے بچنے کے لیے زمین سے چپک گیا۔ میں بروقت اس کی چالاکی کو بھانپ گیا تھا اس لیے اچھل کر اس پر جا گرا۔ میرے دونوں گھٹنے اس کے پیٹ میں دھنس گئے اور میں نے اسے مہلت نہ دیتے ہوئے چاقو والا ہاتھ کلائی سے تھام لیا۔ یہ سارا عمل پلک جھپکنے میں انجام پایا تھا اس لیے اسے چاقو سے فائدہ اُٹھانے کا موقع نہ مل سکا۔ میں نے کلائی مروڑی تو اس کی گرفت چاقو پر کمزور پڑ گئی۔ نتیجتاً چاقو اس کے پیٹ پر گر گیا۔

مجھے اس کی سخت جانی کا اندازہ ہو گیا تھا اس لیے اس سے رعایت برتنے کے حق میں نہیں تھا۔ میرے تابڑ توڑ مکوں نے اُسے چند ہی لمحوں میں نڈھال کر دیا۔ اس کے حلق سے نکلنے والی چیخیں ماند پڑنے لگیں تو میں چاقو اُٹھا کر کھڑا ہو گیا۔ اس دوران میری ٹانگ کافی حد تک ٹھیک ہو گئی تھی اور درد کا احساس بھی کم ہو گیا تھا۔ میں نے چاقو اس کی ران میں گھونپ دیا۔ اس کے حلق سے لمبی 'آہ' کے ساتھ گالیوں کا فوارا ابل پڑا۔ میں نے پے در پے اس کی دونوں رانوں پر کئی چیرے لگائے۔

میڈم بولی۔ ''شاہ مدار بننے کے بجائے مرنے والے سے کام کی بات پوچھ لو۔''

میں نے سخت لہجے میں کہا۔ ''ہاں پیر بخش! کیا ابھی اور مارا ماری کرنی ہے یا شوق پورا ہو گیا ہے؟''

وہ بہ دقت تمام بولا۔ ''کھوتے کے بچے! یاد رکھ، ایک ایک زخم کا بدلہ لوں گا تجھ سے۔ تو کتے کی طرح میرے تلوے چاٹے گا اور زندگی کی بھیک مانگے گا۔''

میں نے اس کا ایک پائنچہ اوپر چڑھا دیا۔ وہ جھٹکے سے اُٹھ بیٹھا۔ ہاتھ بڑھایا تو میں نے بجلی کی سی سرعت سے چاقو گھما دیا۔ کند چاقو کی نوک اس کی ہتھیلی میں لگی۔ وہ ہاتھ جھٹک کر چیخا۔ ''آخر تجھے مجھ سے دشمنی کیا ہے......

......ہو جا۔''

وہ ابھی تک یہی سمجھ رہا تھا کہ میں اسے یسی آٹو میٹک گرینڈز اَپ کرانے کے جرم کی سزا دے رہا تھا۔ ...علم نہیں تھا کہ ہم اسی کی تلاش میں بھٹک رہے تھے اور ...بدبختی اُسے کھینچ کر ہمارے پاس لے آئی تھی۔ میں ...چاقو اس کے چہرے کی طرف لہرایا۔ میری توقع کے مطابق وہ وار سے بچنے کے لیے پیچھے گر گیا۔ میں یہی چاہتا تھا۔ میں نے اس کی ننگی پنڈلی کی طرف دیکھا۔ گھٹنے سے بہ مشکل دو انچ نیچے گولی کا ننھا سا سوراخ دکھائی دے رہا تھا جس سے خون رس رہا تھا۔ اس نے جرابوں کے علاوہ بوٹ بھی پہن رکھے تھے جن میں کافی سارا خون جمع ہو گیا تھا۔ میں نے چاقو کی نوک گولی کے زخم پر رکھی اور سرد لہجے میں پوچھا۔ ''پیرو! تم دریا پار کیا کرنے گئے تھے؟''

وہ جواب دینے کے بجائے پھر اُٹھ بیٹھا۔ جونہی اسے میرے خطرناک ارادے کا اندازہ ہوا، اس کی آنکھیں مارے دہشت کے پھیل گئیں، بولا۔ ''کک...... کیا کرنے لگا ہے تو؟...... کک...... کیا تکلیف ہے تجھے، پاگل ہو گیا ہے؟''

میں نے چاقو کی نوک پنڈلی کی ہڈی میں بنے ہوئے گولی کے سوراخ میں ڈالی۔ اس کے حلق سے دردناک کراہ خارج ہوئی۔ میں بولا۔ ''اگر تم میرے ساتھ تعاون نہیں کرو گے تو میں ہڈی کے سوراخ میں چاقو کسی کلے کی طرح ٹھونک دوں گا۔ تمہیں اندازہ تو ہو گا ہی کہ زخمی ہڈی میں چاقو کا پھل کتنا شدید درد اُتار سکتا ہے...... ہیں؟''

اس نے ہاتھ بڑھایا۔ میں نے چاقو پر تھوڑا سا دباؤ بڑھا دیا۔ درد کا ابتدائی مرحلہ خاصا خوفناک تھا۔ اس کے حلق سے نکلنے والی چیخ دریا پار تک، ڈِینے ملاح کے کانوں تک ضرور پہنچی ہو گی۔ بری طرح سر جھٹکتے ہوئے بولا۔ ''خدا داناں من، ایں کوں کڈھ گھن......''

(خدا کا نام مان اور اِسے باہر نکال لے)

اس کا اشارہ سوراخ میں پھنسے ہوئے چاقو کی طرف تھا۔ میں نے چابی دبائی۔ اس کی رہی سہی قوتِ برداشت بھی دم توڑ گئی اور وہ زمین پر کمر کے بل گر گیا اور لمبی لمبی سانسیں لینے لگا۔ چند لمحوں بعد بولا۔ ''پپ...... پالی...... پر تجھے کیا، میں جس کے پاس بھی جاؤں، جو بھی کروں، تیرا اس سے کیا واسطہ؟''

میں نے چاقو دبایا، وہ کراہا۔ ''اوئے نامراد وا بچہ! میں اپنے سنگتی جمیل کے پاس گیا تھا۔ جمیل دستی کے پاس، ...بس...... اب تو تیری خدا پوری ہو گئی ہے، جا......

میری جان چھوڑ جا......''

اس کی حالت غیر ہو چکی تھی، میں نے پوچھا۔ ''شاباش! اب یہ بھی بتا دو کہ تم نے بابے گامن کی بیوی اور بچے کو کس کی ڈیمانڈ پر اغوا کیا ہے؟''

''کون گامن؟ میں کسی گامن کو نہیں جانتا۔'' اس نے چیخ کر کہا۔ ''اور نہ کسی کی ڈیمانڈ شیمانڈ پر کام کرتا ہوں۔ میں پیرو ماچھی ہوں، کرائے کا بدمعاش نہیں ہوں۔''

مجھے اس کی بات پر ہنسی آ گئی۔ میں نے چاقو کو تھوڑا اور دبایا اور چابی کی طرح تھوڑا دائیں جانب گھمایا۔ اس کے حلق سے دلدوز چیخ نکلی اور وہ جھٹکے لینے لگا۔ ایک مرتبہ اُٹھ کر بیٹھا، پھر ہاتھ لہراتا ہوا پشت کے بل گر گیا۔ میں نے کہا۔ ''جواب دو، کس کے کہنے پر ان ماں بیٹے کو تم نے اُٹھایا ہے؟''

''تو کون ہے؟''

''میں تمہاری موت ہوں...... موت...... جو پوچھتا ہوں، وہ بتاؤ ورنہ......'' میرا لہجہ بہت سنگلاخ تھا۔

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ آنکھیں زور سے میچ کر بولا۔ ''میں نے کسی کو اغوا نہیں کیا۔''

میں نے پینترا بدلا، کہا۔ ''کیا تمہیں علم ہے کہ تمہارے ڈیرے پر رات کو پولیس نے ریڈ کیا تھا اور تمہارے سبھی ساتھی پولیس مقابلے میں مارے گئے۔''

اس کا کانپتا ہوا سر تھم گیا۔ آنکھیں پھیل گئیں۔ پھٹی پھٹی آواز میں بولا۔ ''کک...... کیا کہہ رہا ہے تو؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟''

میں نے کہا۔ ''اس کا مطلب ہے کہ تمہیں کچھ بھی علم نہیں۔ میں بتائے دیتا ہوں۔ آدھی رات کو بہت سی نفری کے ساتھ ایس ایچ او نے تمہارے ڈیرے پر ریڈ کیا۔ چاروں طرف گھیرا ڈال لیا۔ تمہارا ایک آدمی، مراد بخش، ان کے ہاتھ لگ گیا۔ اس نے بتایا کہ تمہارے دوسرے ساتھی گامن کے ڈیرے پر کوئی کارروائی ڈالنے گئے ہیں۔ پولیس نے مراد بخش کو گولی ماری اور گامن کے ڈیرے کا رُخ کیا۔ وہاں تمہارے باقی ساتھی بھی پولیس کی فائرنگ میں کام آ گئے۔ سمجھے؟''

اسے اپنی تکلیف بھول گئی۔ دیدے پھیل گئے۔ زبان مفلوج ہو گئی۔ مجھے ایک ٹک دیکھتا رہا پھر خود کلامی کے سے انداز میں بولا۔ ''فائرنگ کی آواز تو سنی تھی مگر......!''

میں نے دیکھا کہ اس پر مایوسی کا شدید دورہ پڑ چکا تھا۔ وہ شاک سے نکلا تو شکست خوردہ انداز میں سر موڑ کر میڈم کو دیکھنے لگا پھر مجھے اور بولا۔ ''کیا تو سچ کہہ رہا ہے؟''

میں نے کندھے اُچکائے اور قدرے بے پروائی سے کہا۔ ''تمہاری مرضی، یقین کرو یا نہ کرو۔''

وہ چند ثانیوں تک آنکھیں موندے منہ ہی منہ میں بڑبڑاتا رہا پھر اُٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔ ''مجھے جانے دے...... دیکھوں، کچھ بچا ہے یا سب کچھ برباد ہو گیا ہے۔''

میں نے اس کی آنکھوں میں براہِ راست جھانکا۔ ''پیر بخش! تمہارا دل مانے، نہ مانے، پر سچ یہی ہے کہ تمہاری سلطنت اجڑ گئی ہے اور اب وہاں کچھ بھی باقی نہیں۔ تمہارے جاں نثار ساتھی مردہ کتوں کی طرح تھانے میں پڑے ہیں جبکہ خون کی ندیاں بہانے والا اسلحہ پولیس کے اسٹور میں رکھا جا چکا ہے۔ کیا کرو گے وہاں جا کر؟''

اس نے ایک طرف گردن ڈال دی۔ مجھے فوراً احساس ہو گیا کہ وہ ہوش و خرد سے بیگانہ ہو گیا تھا۔ میں نے اسے ہلا جلا کر دیکھا پھر گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔ پانی کی بوتل نکال کر پلٹا اور چھینٹے مار کر ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگا۔ اس نے دو چار منٹ بعد کراہ کر آنکھیں کھول دیں۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی اُٹھ بیٹھا۔ چاقو کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ زخم دکھ گیا۔ ہڈی میں پھنسے ہوئے چاقو نے درد کی خنک ٹیس پورے بدن میں اُتار دی تو بے بسی سے میری طرف دیکھنے لگا۔ ''پپ...... پانی دے مجھے...... ہائے!''

وہ آسانی سے شکست تسلیم کرنے والا نہیں تھا مگر اپنے گروہ کے ختم ہونے کی اطلاع سنتے ہی اس نے ذہنی طور پر ہتھیار ڈال دیے تھے۔ میں نے بوتل منہ سے لگائی۔ چند گھونٹ پینے کے بعد ہچکیاں لینے لگا۔ ہر ہچکی کے بعد اس کے حلق سے دردناک آہ خارج ہو جاتی تھی۔ میں نے کہا۔ ''پیر بخش! میں نے تم سے پوچھا تھا کہ تم نے گامن کی بیوی اور بچے کو کس کے کہنے پر اغوا کیا اور انہیں کہاں پہنچایا۔ یہ بتا دو گے تو زندہ بچ جاؤ گے ورنہ اپنے ساتھیوں کے پاس اگلے جہان پہنچا دیے جاؤ گے۔ جلد فیصلہ کر لو۔ میرے پاس وقت کم ہے۔''

اس کے ہونٹوں کے گوشوں سے لعاب آلود پانی رسنے لگا۔ عجیب بے بسی بھری نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''تو اس لنگڑے منحوس کا کیا لگتا ہے؟''

میں پھنکارا۔ ''یہ بتانا ضروری نہیں ہے۔''

میرے عقب میں میڈم کی آواز گونجی۔ ''میں بتاتی ہوں پیر بخش! اس کا بابے گامن سے کوئی تعلق نہیں ہے مگر میرا ہے۔ میں اس کی بیٹی ہوں۔ چندو ماہی...... کیا تمہیں میرا نام یاد ہے؟''

وہ زیر لب بڑبڑایا۔ ''چندو ماہی...... لنگڑے کی دِھی...... اوہ! تو یہ تو ہے...... مگر یہ سب کیا ہے؟''

وفورِ حیرت سے وہ اپنا مدعا پوری طرح ظاہر نہیں کر پایا اور گردن موڑ کر پھٹی پھٹی نگاہوں سے میڈم کو دیکھنے لگا۔ میں نے اپنی پرانی پوزیشن سنبھال لی اور چاقو کے دستے پر ہاتھ رکھ دیا۔ اس کے حلق سے سسکاری نکلی اور بولا۔ ''اسے ہاتھ نہ لگا، میری جان نکلتی ہے۔ اے چندو! اسے بول کہ یہ چاقو نکال لے ورنہ میں درد سے مر جاؤں گا۔ دیکھ چندو...... تو واقعی چندو ہے...... ہائے! تو کتنی بدل گئی ہے۔ میں نے تو پہچانا ہی نہیں۔''

میں نے مستفسر نگاہوں سے اُسے گھورا۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں اپنا سوال دُہرایا۔ وہ گردن جھکا کر بولا۔ ''میں جانتا ہوں کہ تو مجھے زندہ نہیں چھوڑے گا۔ مگر ٹھیک ہے۔ میرے بعد کیا ہوتا ہے، کیا نہیں ہوتا، مجھے کیا؟ ان دونوں کو میں نے دس لاکھ روپے اور دو ولایتی گنوں کی قیمت پر بیچ دیا ہے۔ وہ اِس وقت بہت دور پہنچ چکے ہوں گے۔ تم ان لوگوں تک نہیں پہنچ سکتے۔ پہنچ بھی گئے تو تمہارے ہاتھ کچھ نہیں لگے گا۔ اب موت ہی انہیں اس شکنجے سے نکالے تو نکالے، بندے کے بس کی بات نہیں۔''

مجھے اس کے رویے پر غصہ آیا مگر میں نے ٹوکا نہیں بلکہ آنکھوں سے اُسے اپنا بیان جاری رکھنے کا اشارہ کیا، وہ بولا۔ ''تو انہیں خریدنے والے پر ہاتھ نہیں ڈال سکتا۔ وہ بہت بڑا آدمی ہے۔ ہائے! یہ چاقو نکال لے۔ میں سب کچھ بتاتا ہوں۔ آہ! بہت شدید درد ہو رہا ہے۔''

میں نے انکار میں سر ہلایا، کہا۔ ''پیر بخش! وہ بڑا آدمی کون ہے؟''

''وہ...... وہ...... تم اُسے نہیں جانتے۔ وہ اس ناری کا عاشق ہے۔ یہ اسے اپنی شکل دکھا دے تو وہ دونوں کو آزاد کر دے گا ورنہ کبھی نہیں...... ہائے! وہ ادھر...... مظفر گڑھ ضلع میں رہتا ہے۔''

وہ پوری طرح اپنے حواس میں نہیں تھا اس لیے نہایت بے ربط انداز میں بول رہا تھا۔ میں نے کہا۔ ''میں نے اُس کا نام پوچھا ہے۔''

''اس کا نام یارن خان ہے، سردار یارن خان۔ ادھر تور پور میں رہتا ہے۔ تو اسے نہیں جانتا۔''

یارن خان کا نام سنتے ہی میرا ذہن ایک لمحے میں بھک سے اُڑ گیا۔ میں نے بے یقینی سے کہا۔ ''کیا کہا تم نے، یارن خان...... سردار یارن خان بلوچ...... تور پور والا؟''

''ہاں...... ہاں...... کیا تو اسے جانتا ہے؟ اسے ہر کوئی جانتا ہے۔ تو اس کا خیال چھوڑ دے ورنہ مارا جائے گا۔ یارن خان بہت ظالم ہے۔'' اس نے ہاتھ لہرایا۔ اس دوران اس کی آنکھوں سے وفورِ تکلیف سے آنسو نکلنے لگے تھے۔ وہ بڑی جوان مردی سے کافی دیر سے غیر معمولی تکلیف برداشت کرتا چلا آ رہا تھا۔

اس کی بات ماننے کی نہیں تھی۔ میری دانست میں یارن خان ایسا شخص نہیں تھا۔ باوجود کہ میں اس کے کبھی قریب نہیں رہا تھا، اس کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں رکھتا تھا مگر وہ اتنا پہنچا ہوا شخص ہو گا، یہ ماننا میرے لیے دشوار تھا۔

میں نے پیر بخش کی آنکھوں میں غور سے دیکھا۔ زبان بھلے جھوٹ کی بکل مار کر وِک جائے، آنکھیں سچ بولتی ہیں اور دل کی دنیا کو دیکھنے والے پر لحظہ بھر میں آشکار کر دیتی ہیں۔ اس کی آنکھیں اس کے کہے کی لاج رکھتی محسوس ہوئیں تو میرے حلق سے طویل سانس خارج ہو گئی اور میں نے زہر خند لہجے میں کہا۔ ''کیا تم نے اس بڑھیا اور بچے کو تور پور پہنچایا ہے؟''

''نن...... نہیں...... اس کے بندوں نے پتن پر مال وصول کیا تھا...... اب نہیں معلوم یارن خان نے انہیں کہاں رکھا ہوا ہے۔ خدا کی قسم! میں نہیں جانتا۔'' وہ گھگھیایا اور ہاتھ جوڑ کر بولا۔ ''یار! میں نے سب کچھ تجھے بتا دیا۔ اب تو میری جان چھوڑ دے، یہ چاقو نکال لے۔''

میں نے پوچھا۔ ''یارن خان نے کتنے بندے بھیجے تھے؟ کیا تم انہیں جانتے ہو؟''

''وہ تعداد میں تین تھے۔ میں ان میں سے کسی کو نہیں جانتا۔''

''پھر تم نے مال ان کے حوالے کیوں کر دیا؟ وہ کسی اور کے بھیجے ہوئے بھی تو ہو سکتے تھے؟'' میں نے سخت لہجے میں پوچھا۔

''نہیں...... وہ یارن خان کے آدمی ہی تھے کیونکہ انہوں نے بقایا رقم میرے حوالے کی تھی۔''

''کتنی؟''

''آدھی...... آدھی رقم بیعانے میں دی تھی۔''

''وہ رقم کہاں ہے؟''

''وہ جمیل دستی کے پاس پڑی ہے۔''

''اس کا تمہارے دھندے سے کیا تعلق ہے؟''

''وہ تھرڈ مین ہے۔ دلالی کرتا ہے۔'' اس نے ہاتھ اُٹھا کر بہ وقت کہا۔ ''اب میں کچھ نہیں بولوں گا۔''

میں نے ہاتھ کا دباؤ بڑھایا، وہ چیخ اُٹھا، بولا۔ ''اسے باہر نکال...... ہائے! اسے باہر نکال ورنہ میں مر جاؤں گا۔ اوئے چندو! اس سے بول دے نا!''

''ایک بات اور...... تم نے اس سے پوچھا تھا کہ وہ ان دونوں غریبوں کو کیوں اتنی بھاری قیمت میں خرید رہا ہے؟''

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ معلوم ہوا کہ اس نے سچ بولا تھا۔ میں اس سے کچھ اور دریافت نہیں کرنا چاہتا تھا۔ چاقو کھینچ کر کھڑا ہو گیا۔ میڈم کی طرف مستفسر نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ اس نے یارن خان کے بارے میں سن لیا تھا۔ اس کے ہونٹ بھنچ گئے تھے اور چند لمحے پیشتر دکھائی دینے والا کھلنڈرا پن مفقود ہو چکا تھا۔ سنجیدگی سے بولی۔ ''میں نے سب سن لیا ہے۔ ہمیں اس کمینے کی ضرورت باقی نہیں رہی۔''

اس نے ہاتھ کے مخصوص اشارے سے مجھے سمجھا دیا کہ اس کی چھٹی کرا دوں۔ پیرو ماچھی بھی سمجھ گیا تھا تبھی بھرائی ہوئی آواز میں کراہا۔ ''ہائے! مجھے مار کر تجھے کیا ملے گا چندو...... دیکھ...... میں کسی نہ کسی دن تیرے کام آ جاؤں گا۔ کتا بھی کام آ جاتا ہے۔ بلاوجہ مجھے مت مار۔''

میڈم اُچھل کر بونٹ سے اُتری اور آہستگی سے چلتی ہوئی ہمارے قریب آ گئی۔ اس پر نگاہِ تنفر ڈال کر سرد لہجے میں بولی۔ ''یہ نہ سوچنا کہ میں تمہیں اُس جرم کی سزا دے رہی ہوں جو تم نے آج سے کئی سال قبل کیا تھا۔ تب تم اتنے بڑے بدمعاش نہیں تھے، بس معمولی سے چور اُچکے ہوا کرتے تھے۔ یاد ہے ناں؟ ہاں...... وہ جرم میں نے معاف کر دیا تھا مگر تمہاری اس ظالمانہ حرکت کو معاف نہیں کر سکتی۔ تم نے ایک بوڑھی عورت اور لاغر بچے پر ظلم کا پہاڑ توڑا ہے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ میرے سگے ہیں۔ نہیں پیر بخش...... مجھ میں اتنی برداشت نہیں ہے۔'' میڈم کا لہجہ اتنا سرد تھا کہ مجھے بے اختیار جھرجھری آ گئی۔ وہ میری طرف مڑی اور تحکمانہ انداز میں بولی۔ ''شہریار! ڈوواٹ ناٹ...... ناٹ مین زیرو......''

پیرو ماچھی نے ایک زوردار جھٹکا لیا اور میڈم کے پیروں کی طرف لپکا۔ میڈم مستعدی سے پیچھے ہٹ گئی اور پلٹ کر گاڑی کی طرف بڑھ گئی۔ پیرو بلند آواز میں زندگی کی بھیک مانگنے لگا۔ زندگی روٹھ کر جانے لگے تو انسان سبھی کروفر بھول جاتا ہے۔ سب جاہ و حشم مٹی میں مل جاتا ہے۔ پاؤں میں گری ہوئی پگڑی اور پھٹے ہوئے دوپٹے میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔ پیرو ماچھی اس سمے نامی گرامی بدمعاش نہیں رہا تھا بلکہ زندگی کی دہلیز پر تھوڑی سی مہلت مانگنے والا بھکاری تھا۔ مجھے اس پر ترس آیا مگر میڈم کے حکم سے سرتابی کی گنجائش نہیں تھی۔ میں نے چاقو کے لہو سے تر پھل کو دیکھا اور اُسے پانی میں اُچھال دیا۔ پیرو ماچھی کی طرح اب

اس کی بھی ضرورت نہیں رہی تھی۔ جیب سے پستول نکالا، بولٹ چڑھایا اور پیرو ماچھی کی پیشانی کا نشانہ لیا۔ اس کی گھگی بندھ گئی، ہاتھ جڑ گئے اور زبان لکنت زدہ ہو گئی۔

"میکوں ناں مار سائیاں! میکوں ناں مار...... عمراں تیڈی جوتیاں پھبیساں۔"

(مجھے مت مار سائیں! مجھے مت مار۔ میں تمام عمر تمہاری جوتیاں صاف کروں گا)

اس دوران میڈم نے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر گاڑی اسٹارٹ کر دی تھی۔ میں نے کن انکھیوں سے ادھر دیکھا۔ وہ گاڑی کو ریورس کر رہی تھی تاکہ ٹرن لے کر واپسی کی راہ پر ڈال سکے۔ میں نے زیر لب کہا۔ "گڈ بائے پیرو!" اور پستول کی لبلبی دبا دی۔ 'ٹھائیں' کی خوف ناک آواز کے ساتھ ہی پیرو ماچھی کی دونوں آنکھوں کے بیچ سوراخ ہو گیا۔ آنکھیں موت کی دہشت سے گولی لگنے سے پہلے ہی پھیل گئی تھیں۔ وہ ایک فٹ کے لگ بھگ ہوا میں اچھلا اور گر کر مرغ بسمل کی طرح تڑپنے لگا۔ اس کی زندگی کے ساتھ ہی اس کے گینگ کی رقم کردہ بربریت بھری کتاب بھی تمام ہو گئی تھی۔

میرے ہاتھوں پر اُس کا خون لگا ہوا تھا، لباس پر بھی۔ پینٹ کے ایک پائنچے پر بڑا سا سرخ دھبا نظر آیا۔ میں دریا کی طرف بڑھا تاکہ ہاتھ اور پائنچہ دھو سکوں۔ عقب میں میڈم کی آواز ابھری۔ "شہریار! اس کتے کا کفن دفن کسی نے نہیں کرنا۔ بہتر ہے کہ اِسے غسل دے دو۔ دریا میں پھینک دو۔ زندگی میں کسی کے کام نہیں آیا، مرنے کے بعد تو مخلوقِ خدا کی دو چار وقت کی بھوک مٹا دے۔"

میں رُک کر پلٹا۔ پیرو ماچھی کے جھٹکے لیتے ہوئے وجود کو بانہوں سے پکڑ کر دریا کی طرف کھینچا۔ اس کی روح قفسِ عنصری سے مائل بہ پرواز تھی جب میں نے اُسے پتن سے لڑھکا کر پانی کی نذر کر دیا۔ وہ تہ کی طرف گیا۔ پانی میں سرخ ڈورے مچلے جنہوں نے چند لمحوں میں ہی پیرو کے مردہ وجود کے اطراف کا پانی گدلا کر دیا۔ وہ چند لمحے زیرِ آب رہا پھر اس کا کھوکھلا وجود مجھ سے خاصے فاصلے پر پانی پر نمودار ہوا اور بہتا ہوا لمحہ بہ لمحہ دور ہوتا گیا۔ میں نے پائنچہ دھویا، گیلے ہاتھ سے لباس پر لگنے والے خون کے دھبے صاف کیے اور ہاتھ دھو کر پلٹا۔ سو ڈیڑھ سو فٹ کی دوری پر میڈم گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھی بڑی محویت سے میری کارگزاری کا مشاہدہ کر رہی تھی۔

میں گھوم کر اگلی سیٹ پر آیا۔ وہ متفکر انداز میں گویا ہوئی۔ "شہریار! معاملہ خاصا بگڑ چکا ہے۔ مجھے رائی بھر توقع نہ تھی کہ یمو اور اماں کے اغوا کے پیچھے سردار یارن خان کا ہاتھ ہوگا۔"

میں نے حیرت سے کہا۔ "مجھے یقین نہیں آتا میڈم! یارن خان میرا دور پار کا رشتہ دار ہے۔ میرے گاؤں میں اس کی شاندار دو منزلہ حویلی ہے جہاں وہ سال میں بہ مشکل دو تین ماہ کے لیے آتا ہے۔ کسی بھی خان کے ساتھ اس کا یارانہ نہیں ہے اور نہ ہی وہ یہاں کوئی ایسی ویسی حرکت کرتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اُسے سردار حیدر خان نے بھڑکایا ہو اور مدد مانگی ہو۔"

میڈم نے آنکھیں موند کر نفی میں سر ہلایا اور سوچ میں کچھ لمحے گزار کر بولی۔ "نہیں...... وہ حیدر خان کی ایک نہیں سنتا۔ اس کی مدد کیوں کرے گا۔ وہ مجھے نیچا دکھانا چاہتا ہے تبھی میرے بالوں کو پیروں تلے دبا کر بیٹھ گیا ہے۔"

"آپ سے اُس کا کیا تعلق واسطہ؟" میں نے استعجاب سے پوچھا۔

اس نے آنکھیں کھولیں، مجھے بہ غور دیکھا اور بولی۔ "کیا تمہارے پاس سگریٹ ہے؟...... ایک تو یہ بھی بڑی مصیبت ہے کہ تم سگریٹ نہیں پیتے ہو۔" پھر گیئر لیور کو دباتے ہوئے سر جھٹک کر بولی۔ "خیر! اَب کیا کرنا چاہیے؟...... نور پور جانے کے لیے لمبا چکر کاٹنا پڑے گا۔ یہ ممکن نہیں رہا کہ بیڑے کے ذریعے دریا پار کریں کیونکہ دینا ملاح خوف کے مارے اَب ادھر کا رُخ نہیں کرے گا۔"

میں نے غیر اضطراری طور پر دریا کے پار پتن کی طرف دیکھا۔ دینے ملاح کا بیڑا نظر آ رہا تھا مگر وہ خود دکھائی نہیں دیتا تھا۔ یقین کی حد تک اندازہ تھا کہ وہ بیڑے کو لانچ کر کے وہاں سے رفو چکر ہو گیا تھا۔ جو منظر اُس نے دیکھا تھا، وہ اُسے مرتے دم تک بھولنے والا نہیں تھا۔ اگر وہ بیڑے کے خیمے میں گھسا ہو گا تب بھی میرے بلانے پر ادھر کا رُخ نہیں کرے گا۔ میں نے دل ہی دل میں میڈم کی بات سے اتفاق کیا اور کہا۔ "کیا یارن خان بھی حیدر خان کی طرح لمبے ہاتھوں والا ہے؟"

شاید میرا دل ابھی اس نئی صورتِ حال کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہو رہا تھا، وہ بولی۔ "ہاں! بلکہ وہ اس سے کہیں بڑا خبیث ہے۔"

ایک مرتبہ دیوانے شاعر کے 'گھروندے' پر ماسٹر ولی جی نے مجھے کہا تھا۔ "شہرے! سوہنے کریم کا کرم ہے کہ یارن خان کا دل نور پور سے اُچاٹ ہو گیا اور وہ لاہور چلا گیا ورنہ اَب تک نور پور کی گلیاں ویران اور گھر کھنڈر ہو چکے ہوتے۔" اور تب میں نے اس کی بات پر توجہ نہیں دی تھی

سمجھا تھا کہ وہ اپنا غصہ فرو کر رہا ہے کیونکہ میں یارن خان کو اپنی دنیا میں مگن رہنے والا انسان سمجھتا تھا۔ جن دنوں میں ڈاکٹر شاہ جی کے ایما پر اپنے والدین کے قاتلوں کی کھوج میں مصروف تھا، ان دونوں افسر علی نے بھی کم و بیش انہی الفاظ میں یارن خان کی شخصیت کا احاطہ کیا تھا جبکہ شریف بھی والا اور دیوانہ اس کی تعریفیں کرتے نہیں تھکتے تھے۔

میڈم شکیلہ نے ایک مرتبہ مجھ سے یارن خان کے بارے میں دریافت کیا تھا اور میرے استعجاب پر اس نے یارن خان کو دوسرے خانزادوں سے بڑا شیطان قرار دیا تھا۔ آج بھی وہ انہی الفاظ میں اپنی نفرت کا اظہار کر رہی تھی۔ دونوں کے درمیان کہیں سنگین تنازعہ، خونیں ربط یا کاروباری پرخاش کارفرما تھی۔ میڈم نے دانستہ طور پر اپنے اور سردار یارن خان کے مابین تعلق والا معاملہ گول کر دیا اور میں خواہش کے باوجود دوبارہ نہ پوچھ سکا۔ مستفسر ہوا۔ "کیا ہم واپس جا رہے ہیں؟"

وہ کچھ دیر تک ہونٹ سکیڑ کر سیٹی بجاتی رہی پھر بولی۔ "ہاں! میں ڈبل مائنڈڈ ہو رہی ہوں۔ میں تمہیں نور پور بھیجنے کے بارے سوچ رہی ہوں۔"

میں ٹھٹکا۔ "مجھے؟ کیا میرا نور پور جانا مناسب ہوگا؟"

"کیوں؟ کیا ہوا؟" وہ بولی۔ "تم نے راستے، خان کی حویلی اور گاؤں اچھی طرح دیکھ بھال رکھا ہے۔ کون شخص تم سے زیادہ مناسب ہوگا، ان حالات میں...... ہیں؟"

اس نے درست کہا تھا مگر نور پور جانے کے بارے میں سوچ کر میری سانسیں غیر معتدل ہونے لگی تھیں۔ میں نے سہارا لیا۔ "میڈم! وہاں سبھی مجھے پہچانتے ہیں۔ کوئی گڑبڑ نہ ہو جائے۔"

"کوشش کرنا کہ تم کسی کی نظروں میں نہ آؤ۔ اگر ایسا ہو بھی گیا تو کوئی قیامت نہیں آئے گی۔ ڈونٹ وری ڈارلنگ...... تمہیں مزید کچھ سیکھنے کا موقع مل جائے گا۔" وہ سنجیدگی سے بولی۔ "رہی تمہارے پہچان لیے جانے کی بات تو فکر مت کرو۔ کوئی تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ یقیناً نور پور میں تمہارا اب کوئی نہیں رہا۔"

اس نے درست کہا تھا مگر وہ نہیں جانتی تھی کہ میرا دل اس کی مدح سرائی کے ساتھ ساتھ غزالہ کے لیے بھی بے چین رہتا تھا۔ وہ نور پور میں رہتی تھی۔ ہمیشہ دھڑکن کی تال پر رقص کرتی تھی، سانسوں کے نشیب و فراز میں نغمہ سرا ہوتی تھی اور روح تک بکھرتی جاتی تھی۔ میں نے ایک طویل سانس لی اور دل ہی دل میں سوچتے اپنے آپ کو نور پور جانے کے لیے آمادہ کرنے لگا۔ میں نے یہ بھی سوچ لیا تھا کہ پیا جی سے کہہ کر اپنا میک اَپ کروا لوں گا تاکہ مجھے فوری طور پر کوئی پہچان نہ پائے۔

میڈم نے گاڑی کی رفتار خاصی تیز رکھی تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں ہم پکی سڑک پر تھے۔ میں نے کہا۔ "میڈم! کیا آپ کو پیرو ماچھی کی بات پر یقین آ گیا ہے؟ میرا مطلب ہے ہوسکتا ہے اُس نے جھوٹ بولا ہو، سردار یارن خان کا نام ہمیں الجھانے کے لیے لیا ہو اور ہم آنکھیں بند کیے بھاگتے ہوئے نئی مصیبت کو گلے لگا بیٹھیں۔"

میڈم بولی۔ "میرا نہیں خیال کہ اس نے جھوٹ بولا ہو۔"

"اس خیال کی کوئی وجہ؟"

"وجہ تو کوئی خاص نہیں...... مگر وہ جھوٹ کیوں بولے گا؟"

"وہ ہمارا دشمن تھا میڈم! دوست نہیں تھا۔" میں نے جلدی سے کہا۔ "اس کیٹگری کے لوگوں سے کچھ بھی بعید نہیں ہوتا۔"

"جھوٹ ہی بولنا تھا تو پھر کسی اور شخص کا نام لے دیتا۔ اس نے ایسے شخص کا نام کیوں لیا جس تک ہم پہنچ سکتے ہیں۔"

"اس کی دانست میں ہم یارن خان تک نہیں پہنچ سکتے۔ اس کی باتیں آپ نے سنی تو تھیں، بھول گئیں کیا؟"

"ہوں...... تم اپنی جگہ درست کہتے ہو۔ میں اپنی جگہ۔ کیونکہ مجھے علم ہے کہ یارن خان ایسی گری ہوئی حرکت کر سکتا ہے۔"

"یعنی آپ کی خاطر......" میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

وہ بولی۔ "ہاں! وہ ایسا ہی ہے۔"

"کیوں؟" میرے دل کی آواز سوال بن کر لبوں پر آ ہی گئی۔

"تو یوں کہو کہ تمہیں تجسس نے گھیر رکھا ہے۔ تم گھما پھرا کر مجھ سے میرا اور یارن خان کا باہمی تعلق پوچھ رہے ہو...... ہوں؟" میڈم نے کہا۔ "ایک مرتبہ اس نے مجھے لاہور ایئرپورٹ پر دیکھا تھا۔ میں دبئی سے لوٹی تھی۔ وہ دوبئی جا رہا تھا۔ لاؤنج میں چند منٹوں کے لیے آمنا سامنا ہوا تھا۔ تب سے وہ میرے پیچھے پڑا ہوا ہے۔"

"کیا آپ دونوں متعارف ہوئے تھے؟"

"ہاں! اس نے عجیب سے انداز میں کہا تھا کہ ہم دوبارہ ملیں گے۔ میں نے اس کی دھمکی کو ہنسی میں اڑا دیا تھا۔ جب میں نے اُس کے بارے میں معلومات حاصل کیں تو پتا چلا کہ وہ نہایت خطرناک انسان ہے۔ اس نے تھرڈ مین کے ذریعے مجھے بلوایا۔ میں نہ گئی تو دھمکایا۔ میں

نے پروانہ کی تو عرصے بعد اس نے یہ قدم اُٹھالیا۔"
میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "نہیں میڈم! یہ کہانی دل کو نہیں لگتی۔ کوئی اتنی سی بات پر اتنا بڑا قدم نہیں اُٹھاتا۔"
"تم نے درست تجزیہ کیا ہے مگر میری جان! ہماری دنیا میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ معمولی تنازعے کو اَنا کا مسئلہ بنا کر تمام تر داؤ پیچ کھیل لیے جاتے ہیں۔ اگر ہم لوگ آپس میں جھگڑ کر توانائیاں ضائع نہ کریں تو قانون ہم تک کبھی نہ پہنچ پائے۔"
"دنیا خواہ کوئی بھی ہو، انسانوں پر مشتمل ہوتی ہے اور انسان ہمیشہ فطری احساسات کے زور پر تھرکتے ہیں۔ وہ امیر آدمی ہے۔ جس طلب کی طرف آپ نے اشارہ کیا ہے، وہ نوٹوں کے عوض کہیں بھی پوری کی جاسکتی ہے۔ پھر آپ ہی کیوں؟" میں نے دبے دبے لفظوں میں اُسے باور کرایا کہ دنیا میں اس کے علاوہ بھی خوب صورت عورتیں رہتی ہیں۔
وہ طنزیہ مسکراہٹ لبوں پر سجا کر، کن انکھیوں سے مجھے دیکھ کر بولی۔ "شہر یار! کیا تمہاری بہن نور پور کی سب سے خوب صورت لڑکی تھی؟ کیا تمہاری منگیتر غزالہ کے بعد دنیا میں نسوانی حسن ختم ہوگیا ہے؟...... نہیں۔ ان دونوں سے، مجھ سے زیادہ خوب صورت لڑکیاں یہاں سانسیں لیتی ہیں۔ پھر کیا دماغی خلل ہے کہ حیدر خان نے تمہاری بہن کو اغوا کرایا، تم نے اپنی زندگی کے فری وِیل کو غزالہ کی دہلیز پر جوانی بھر روک دیا۔ ہر چہرہ کسی نہ کسی کے دماغ میں نقش ہو جاتا ہے۔ ہر صورت کسی کے دل میں کھب جاتی ہے۔ بھلے اُس نے شفاف آنکھ سے دیکھا ہو، ہوس بھری گدلی آنکھ سے یا اُس نے آنکھوں کے بجائے دل سے دیکھا ہو اور خام تصور میں سجایا ہو۔"
اس نے درست کہا تھا۔ مجھے اتفاق ہوا، کہا۔ "میڈم! مجھے اعتراف ہے کہ آپ کو ایک نظر دیکھنے والا کوئی اور منظر دیکھنے کا روادار نہیں رہتا مگر یارن خان...... اس نے تو بہت کچھ دیکھ رکھا ہے۔ بوڑھا بھی ہو چکا ہے۔ اس کی آنکھیں تو اَب تب میں بجھنے والی ہیں۔"
"مرد کی آنکھ کبھی نہیں بجھتی شہر یار! بھلے ہاتھ کی گرفت کپکپانے لگے۔" اس نے قدرے شوخی سے کہا۔ "یارن خان کا بڑھاپا بھی تو کہتا ہے کہ گو ہاتھ کو جنبش نہیں، آنکھوں میں تو دم ہے، تبھی ساغر و مینا اپنے سامنے میز پر سجانا چاہتا ہے تاکہ مرتے دم تک دیکھتا رہے، آنکھوں کے رستے دل کو جوانی کی دید سے سیراب کرتا رہے۔"
میں نے دبے لفظوں میں کہا۔ "مجھے آپ کی تمام باتوں سے اتفاق ہے مگر دل کہتا ہے کہ کہانی کوئی اور ہے۔

آپ فی الحال بتانا نہیں چاہتیں تو آپ کی مرضی۔"
وہ اپنی انگلی کی اگلی پور کو نچلے ہونٹ تک لائی۔ انگلی پھسلتی ہوئی ہونٹوں کے گوشے تک گئی، پھر پلٹ کر ہونٹ کی وسطی ڈھلان پر آ کر رک گئی۔ ایک ادا سے آنکھیں چندھیا کر مسکرائی اور بولی۔ "تم نے ٹھیک اندازہ لگایا، یا غلط...... اس کا فیصلہ وقت کرے گا۔ ابھی اپنا ذہن اس فضول سوچ میں مت الجھاؤ اور سوچو کہ آئندہ تمہیں کیا کرنا ہوگا۔"
"اوکے میڈم! میں سوچتا ہوں کہ مجھے نور پور جا کر کیا کرنا ہوگا؟" میں نے ہتھیار ڈالے۔ "آپ رہنمائی کریں، کیا میں نے یارن خان کی حویلی میں داخل ہونا ہے اور خان کے نوکروں سے پوچھ گچھ کرنی ہے کہ سردار نے سیمو اور اماں کو کہاں چھپا رکھا ہے؟ یا خان کو حویلی سے نکال کر آپ کی کوٹھی پر لانا ہے؟"
میڈم نے اسپیڈ بریکر پر گاڑی کی اسپیڈ کم کرتے ہوئے کہا۔ "یہ ہوئی نا بات! ہم نے اپنے مغویوں کو اس شیطان کی کچھار سے نکالنا ہے۔ کیسے؟ یہی سوچنے کی بات ہے۔ میرا نہیں خیال کہ خان کی نور پور والی حویلی پر مامور کوئی شخص اس کے خفیہ اڈوں کے بارے میں جانتا ہو۔ تم نے ہی بتایا تھا کہ وہاں بے ضرر اور مزدور قسم کے لوگ رہتے ہیں۔"
"جی! وہاں کام کرنے والے مزدوروں کے بارے میں میری یہی رائے ہے۔" میں نے چشمِ تصور میں یارن خان کی حویلی کے باغیچے سنوارنے والے دونوں مزدوروں کو دیکھا اور کہا۔ "مجھے یہ بھی یقین ہے کہ خان نے پیرو ماچھی سے دونوں مغویوں کو وصول کرنے کے بعد اس حویلی میں نہیں رکھا ہوگا۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اس حویلی میں کسی غیر متعلق شخص کو آتے جاتے نہیں دیکھا گیا تبھی تو میں اسے تارکِ دنیا یا درویش قسم کا انسان سمجھتا آیا ہوں۔"
"پھر؟" میڈم مستفسر ہوئی۔
"مجھے وہاں سے کچھ حاصل ہوتا دکھائی نہیں دیتا میڈم!" میں نے نتیجہ اخذ کرتے ہوئے کہا۔ "ہاں! اس پر ہاتھ ڈالنا ہے، اسے مارنا ہے یا اغوا کرنا ہے تو نور پور کا قصد کیا جاسکتا ہے، وگرنہ نہیں۔ اگر میں اس سے وہیں پوچھ گچھ کروں گا اور اسے زندہ چھوڑ کر نور پور سے نکل آؤں گا تو وہ فوری طور پر ان دونوں کا ٹھکانا بدل دے گا یا ٹھکانے لگا دے گا۔ اگر اس کے کسی آدمی کو چھیڑوں گا، یرغمال بناؤں گا اور تشدد کر کے معلومات حاصل کروں گا یا ماردوں گا تو وہ چونک جائے گا، ہوشیار ہو جائے گا۔ یوں نہ صرف میری محنت اکارت چلی جائے گی بلکہ میرا نور پور سے نکلنا بھی محال

...گا۔"
"تمہیں اس کے کسی خفیہ اڈے کا علم نہیں ہے؟" ...نے پوچھا۔ "یا تمہارے کسی دوست کو؟"
میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "میرے دوستوں میں اس کے یار دو تریب رہنے والا امراد بخش دیوانہ ہے۔ وہ اس کے ...میں کچھ نہیں جانتا۔"
"چونکہ پیرو ماچھی اور اس کا گینگ ختم ہوگیا ہے اور اس کی خبر جلد یا بدیر سردار یارن خان کو مل جائے گی، اس ...ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔"
"تو ٹھیک ہے میڈم! میں ڈائریکٹ ایکشن کرتے ...خان کی بانسری بجانے کے بعد اس کی طاقت کے بانس کو بھی جلادوں گا۔" میں نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔
میری بات میڈم کے دل کو نہیں لگی۔ کچھ دیر تک سوچتی رہی پھر ہنکارا ابھر کر بولی۔ "نہیں شہر یار! میں اسے مارنا نہیں چاہتی۔"
"مگر کیوں میڈم؟" مجھے اچنبھا ہوا۔
"وہ تر نوالہ نہیں ہے۔ اسے قتل کیا تو میرے لیے بہت سی مشکلات پیدا ہو جائیں گی۔" میڈم نے بے حد سنجیدگی سے کہا۔ "کوئی ایسی ترکیب سوچو کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔"
میں سوچ میں پڑ گیا۔ ایسی کوئی ترکیب سجھائی نہیں دیتی تھی۔ جونہی ہم مین روڈ پر چڑھے، میڈم نے پوچھا۔ "کچھ سوچا؟"
میں نے جواب دیا۔ "جی! مگر مجھے ایسی کوئی ترکیب نہیں سوجھی کہ خان کو چھیڑے بغیر ہم ٹارگٹ تک پہنچ جائیں۔"
وہ ہونٹ سکیڑ کر سیٹی بجانے لگی۔ میں نے اس کی پیشانی پر فکر و تردد کی غماز لکیروں کا جال تنتے دیکھا تو خاموش رہ کر اسے سوچنے کا موقع دیا۔ میں سمجھ رہا تھا کہ وہ یارن خان سے دل ہی دل میں ڈر رہی تھی۔ اس سے گریزاں رہنا چاہتی تھی اور اپنی اماں اور بھائی کو اس کی قید سے چھڑانا بھی چاہتی تھی۔ اسی وجہ سے وہ بیٹ خیر پور سے لوٹ آئی تھی۔ ...یارن خان کے بجائے کسی اور نے یہ کارروائی کی ہوتی تو وہ جوالا مکھی بن کر اس کا پیچھا کرتی، پلٹتی نہ...... کافی دیر گزر گئی۔ اچانک اُس کا موبائل فون بج اُٹھا۔ وہ چونک گئی۔ فون نکال کر دیکھا، بڑبڑائی۔ "وہی کمینہ اپنی ڈیمانڈ بتانے کے لیے کال کر رہا ہے۔"
میں سمجھ گیا، بولا۔ "کال اٹینڈ کر کے لاؤڈر آن کر دیجیے گا۔"

اس نے اثبات میں سر ہلایا اور گاڑی روڈ سائڈ پر کھڑی کردی۔ کال ریسیو کی، لاؤڈر آن کیا اور بولی۔ "ہیلو......"
اسپیکر سے بھنچی بھنچی آواز پھوٹی۔ "یہ تمہارا فون 'ناٹ رسپانڈنگ' کیوں ہو جاتا ہے؟"
"میں اس سوال کا جواب نہیں دینا چاہتی۔" میڈم نے خشک لہجے میں کہا۔ "کام کی بات کرو، میں بہت بزی ہوں۔"
"میں تمہاری مصروفیات کو اچھی طرح جانتا ہوں۔" اسپیکر سے پھوٹنے والی آواز صوتی اتار چڑھاؤ سے مبرا تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے انسان کے بجائے کوئی مشین بول رہی ہو۔ "کیا میں یہ سمجھ لوں کہ تمہیں اپنی ماں اور بھائی کی کوئی ضرورت نہیں رہی؟"
میڈم نے ایک نظر مجھے دیکھا اور بلا تردد جواب دیا۔ "میں نے تمہیں بتایا تو تھا کہ جن لوگوں کو تم نے اغوا کیا ہے، میرا اُن سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس کے باوجود اگر تم بضد ہو کہ وہ میری ماں اور بھائی ہیں تو بولو، میں کیا کروں؟ کیا تمہیں پانچ دس لاکھ روپے بھیجوں یا منت سماجت سے کام چل جائے گا؟"
مجھے میڈم کے لہجے سے عیاں بے خوفی اور بے پروائی بڑی عجیب اور غیر فطری لگی۔
اسپیکر سے طنزیہ قہقہہ پھوٹا۔ "تم بڑی چالاک بنتی ہو مگر یہاں تمہاری کوئی چالاکی کام نہ دے گی۔ تم بزی ہو۔ میں تم سے زیادہ مصروف ہوں۔ آخری بار کال کر رہا ہوں۔ یہ بتانے کے لیے کہ اگر تم نے کل شام پانچ بجے مجھے کال کر کے مجھ سے ان دونوں کی جان کی قیمت نہ پوچھی تو میں ان کی چھٹی کرادوں گا۔ اوکے؟"
میڈم کے لبوں پر استہزائیہ مسکراہٹ تیر گئی، بولی۔ "کیا تم پوچھے بنا اپنی ڈیمانڈ نہیں بتاؤ گے؟"
"ہرگز نہیں...... میں مال کو بے وقعت نہیں کرنا چاہتا۔"
"اوکے! مجھے یاد رہا تو ضرور رابطہ کروں گی۔"
"مجھے یقین ہے کہ تم بھولو گی نہیں۔" دوسری طرف سے کہا گیا اور رابطہ منقطع کر دیا گیا۔ میڈم چند لمحوں تک اسکرین کو گھورتی رہی پھر طویل سانس لے کر بڑبڑائی۔ "مجھے یقین ہے کہ یہ یارن خان کی آواز نہیں ہے۔ پھر یہ کون ہوسکتا ہے؟"
چند لمحوں تک اسٹیئرنگ وہیل پر پیشانی ٹکائے بیٹھی رہی، کچھ سوچتی رہی یا دل ہی دل میں کوئی فیصلہ کرتی رہی، پھر سر اُٹھا کر گاڑی روڈ پر ڈالتے ہوئے بولی۔ "شہر یار! میں نے فیصلہ کرلیا ہے۔ تم نور پور جا کر یارن خان کی حویلی کی

تلاشی لو گے۔ اس کے خفیہ ٹھکانوں کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرو گے مگر یارن خان پر بالکل ہاتھ نہیں ڈالو گے۔ میں میرو شاہ اور پیا جی کو الگ الگ روانہ کروں گی۔ وہ اپنے اپنے طور پر کام کریں گے۔ مجھے یقین ہے کہ ہم ان دونوں کا سراغ نکالنے میں کامیاب ہوجائیں گے۔"

میں نے سرِتسلیم خم کیا۔ "جی بہتر! مجھے آپ کے اعتماد پر پورا اُتر کے دلی خوشی ہوگی۔"

میڈم کی کوٹھی میں پہنچنے تک ہم دونوں خاموشی سے اپنی سوچوں میں غرقاں رہے۔ اس نے ڈرائیور کو بلا کر مجھے گھر پہنچانے کا حکم صادر کیا اور مجھ سے مخاطب ہو کر بولی۔ "تم آج کی رات نور پور میں گزارو تو بہتر ہوگا۔ اِز اِٹ اوکے؟"

"یس میڈم!"

وہ گاڑی سے اُتری اور میری طرف دیکھے بغیر تیز قدموں سے چلتی ہوئی گیسٹ ہاؤس کے بڑے چوبی دروازے کو عبور کرکے میری نظروں سے اوجھل ہوگئی۔

☆☆☆

گھر میں سوائے شانو کے کوئی نہیں تھا۔ فوجی اختر، فرزانہ اور موجو بازار کی طرف نکلے تھے۔ میں نہا کر تازہ دم ہوا تو شانو میرے لیے چائے بنا لائی۔ رسمی باتوں کے بعد گویا ہوئی۔ "پھوپو کبریٰ اور غزالہ کی کوئی خبر ملی؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "نہیں! کھالا پلٹتا تو کسی بات کا علم ہوتا۔ اس کے علاوہ نور پور کی خبر کون لا سکتا ہے۔"

"کیا ایسا ممکن نہیں کہ تم چلے جاؤ اور انہیں ایک نظر دیکھ آؤ۔ چوری چھپے ہی سہی۔" وہ امید بھری نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ "بھائی! جب نور پور کی یاد آتی ہے تو دل بیٹھنے لگتا ہے۔ پتا نہیں ہمارے مال ڈنگر کا کیا بنا ہوگا، ہماری زمین کسی نے بیجی ہوگی یا نہیں؟...... پھوپی کیا سوچتی ہوگی کہ ہم نے پلٹ کر اس کی خبر تک نہیں لی۔"

میں نے اس کا ہاتھ تھام کر پیار سے سہلایا۔ "شانو! تم زیادہ سوچا نہ کرو۔ خود کو، اپنی باجی اور بھائی کو سنبھالا کرو۔ رب سوہنے نے ہماری ہمت سے کہیں بڑا امتحان لیا ہے۔ مصیبت ابھی ٹلی نہیں مگر یقین ہے کہ جلد ہی ہم سرخرو ہو جائیں گے اور سر اُٹھا کر نور پور جائیں گے۔"

"بھائی اپنو کا کیا بنا؟"

میرا دل بیٹھنے لگا۔ مجھے اسی سوال کا خوف تھا۔ نظریں جھکا کر بولا۔ "اللہ نے چاہا تو وہ جلد مل جائے گی۔"

اس نے آہ بھری اور خاموش ہوگئی۔ میں نے اس کے چہرے پر حزن و ملال کی پرچھائیں رقصاں دیکھ کر دلاسا دیا۔ "نہیں شانو! جہاں اتنا کچھ برداشت کر لیا ہے وہاں چند دن اور انتظار کر لو۔ میں پروین کی طرف سے ایک لمحے کے لیے بھی غافل نہیں ہوتا۔"

میں چائے پی چکا تھا۔ اس نے پیالہ اُٹھایا، میز پر رکھا اور میرے دونوں ہاتھ تھام کر اپنی آنکھوں سے لگالیے۔ میرے ہاتھوں پر اس کے آنسوؤں کا گرم لمس جاگا تو بے چین ہوگیا۔ اسے روتے دیکھنا تکلیف دہ تھا۔ کچھ کہنا چاہتا تھا کہ وہ سر اُٹھا کر بول پڑی۔ "بھائی! میں جانتی ہوں کہ تم بھی ہزاروں لاکھوں انسانوں جیسے انسان ہو۔ کوئی فرشتہ نہیں، جن بھوت نہیں یا بہت بڑے آدمی نہیں ہو۔ سمجھتی ہوں کہ ہمارے دشمن فرعون ہیں۔ تم ان سے نہیں لڑ سکتے۔ ان سے پروین بہن کو چھین کر نہیں لا سکتے مگر کیا کروں؟ بہنوں کے لیے بھائی سے بڑھ کر دنیا میں کوئی طاقتور اور بہادر نہیں ہوتا، خواہ وہ کتنا ہی کمزور اور ناتواں کیوں نہ ہو۔ میں کہتی ہوں کہ تم بہت کمزور ہو۔ میرے اندر بیٹھی ہوئی تمہاری بہن کہتی ہے کہ نہیں، تم سے زیادہ طاقتور دنیا میں کوئی نہیں۔ تم مجھے جھلی کہتے ہو۔ ٹھیک کہتے ہو۔ مانتی ہوں کہ جھلی ہوں، کملی ہوں اس لیے تم میری باتوں کا برا مت مانا کرو بھائی!"

اس کی آواز بھرّا گئی اور وہ میرے دونوں ہاتھ سختی سے اپنے چہرے پر رکھ کر سسکنے لگی۔ میں اس کی قلبی کیفیت کو بخوبی سمجھتا تھا۔

ایک مرتبہ نور پور میں شریف چکی والے کی بہن کے مرگ پر جب سبھی عورتیں بین کر رہی تھیں، زار و قطار رو رہی تھیں تو مجھے کھالے نے کہا تھا۔ "شہرے! یہ لوگ ماسی جمال بی کو نہیں رو رہے، یہ سب اپنے اپنے دکھوں کو رو رہے ہیں۔ ہر کسی کو اس گھڑی اپنا اپنا بچھڑا ہوا، اپنا مرا ہوا یاد آرہا ہے اور یہ ماسی جمال بی کے نام پر اُسے رو کر دل کا غبار نکال رہے ہیں۔"

اس نے درست کہا تھا۔ ہر کوئی اپنے دکھ پر روتا ہے۔ وہ پروین کے نام پر رو رہی تھی مگر میں جانتا تھا کہ وہ پروین کے نام پر اپنے ماں باپ کا ماتم کر رہی تھی۔ اپنے جلے ہوئے گھر کو یاد کرکے اندوہ سے ٹوٹ پھوٹ رہی تھی اور نور پور کی گلیوں کا نوحہ آنسوؤں کی زبانی تحریر کر رہی تھی۔ میں نے آہستگی سے ہاتھ چھڑائے، اسے اپنی جانب کھینچا اور گود میں سر رکھ کر پیار کرنے لگا۔ اسے سمجھانے لگا کہ مصیبت کا وقت رونے دھونے سے نہیں کٹتا بلکہ اس کا بہادرانہ انداز میں مقابلہ کرکے مات دی جاتی ہے۔

وہ بولی۔ "بھائی! اماں اور ابا تو کبھی واپس نہیں آئیں گے۔ پروین کو ڈھونڈ لانا مشکل ہے مگر غزالہ اور پھوپو کو تو اپنے پاس لایا جا سکتا ہے۔ نور پور میں اب ان کا کون ہے جس کے سہارے پر وہ باقی زندگی گزاریں گی۔"

میں نے کہا۔ "ٹھیک ہے۔ میں ان سے رابطہ کرنے کی کوشش کروں گا۔ تم دعا کرنا کہ وہ میرے ساتھ آنے پر راضی ہوجائیں۔"

وہ ابھی بہت سی باتیں کرنا چاہتی تھی مگر میرا فون بجنے لگا۔ پیا جی کا نمبر بلنک کر رہا تھا۔ میں نے کال اٹینڈ کی۔ پیا بولا۔ "شہر یار! مین روڈ پر آجاؤ۔ میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔"

میں نے ہامی بھری اور کال منقطع کرتے ہوئے بیڈ سے اُٹھ آیا۔ شانو مایوسی سے بولی۔ "بس؟"

"میں ڈیوٹی پر جا رہا ہوں۔ رات کو نہیں آؤں گا۔"

اس کی آنکھیں بجھ سی گئیں اور چہرے پر مایوسی کی پرچھائیں لہرا گئی، بولی۔ "بھائی! یہ کیسی نوکری ہے؟ نہ دن کو چین، نہ رات کی خبر...... کوئی آسان سا کام تلاش کر لو ناں۔"

میں نے مسکرا کر اس کے گال پر چپت لگائی اور گھر سے نکل آیا۔ مجھے اندازہ تھا کہ پیا جی میڈم شکیلہ کے کہنے پر مجھے لینے کے لیے آیا تھا تاکہ مجھے تیار کرکے نور پور روانہ کر سکے۔ وہ کالج کی دیوار کے ساتھ گاڑی پارک کیے میرا انتظار کر رہا تھا۔ میں گاڑی میں بیٹھ گیا تو اس نے بتایا۔ "میڈم جی نے حکم دیا ہے کہ تمہارا معقول میک اَپ کرکے تمہیں لاری اڈے پر پہنچا دوں جہاں سے تم نور پور سدھار جاؤ گے۔"

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

پیا جی مجھے اپنے ساتھ اپنے مکان پر لے گیا۔ وہ یہاں اکیلا رہتا تھا۔ میرے استفسار پر اس نے بتایا کہ اس نے چند دن قبل ہی رشید آباد میں رہائش اختیار کی تھی۔ میڈم نے سب کو ہدایت دے رکھی تھی کہ وہ زیادہ دنوں تک ایک جگہ پر مقیم نہ رہیں بلکہ وقتاً فوقتاً اپنی اقامت گاہ بدلتے رہیں۔ یہ تین مرلہ زمین پر مشتمل چھوٹا سا مکان تھا۔ دو کمرے، باتھ روم، صحن اور کچن نہیں تھا۔ پیا نے برآمدے کے ایک گوشے کو کچن بنا رکھا تھا۔ چولھے کے قریب پڑے ہوئے برتنوں سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ یہاں محض چائے بناتا تھا۔ کھانا کسی قریبی ریستوران سے کھاتا تھا۔

ایک کمرا بیڈ روم تھا جبکہ دوسرا سٹنگ روم۔ اس نے مجھے سٹنگ روم میں بٹھایا اور کہا۔ "یہاں سامان کم ہے۔ سامان صرف وہ کہ آپ لے جا سکتے ہیں۔ ایک وہی جو خالد کو دیا تھا، یعنی گھریلو سامان بیچنے والے پٹھان کا۔ دوسرا جوگی یا ملنگ ٹائپ گداگر کا...... ویسے تم چاہو تو پٹھان والے گیٹ اَپ میں لکڑیوں اور کھڑے درختوں کے سودے بھی کر سکتے ہو، سامان بھی بیچ سکتے ہو اور مردان یا پشاور کے کسی فرضی مدرسے کا چندہ بھی مانگ سکتے ہو۔"

میں نے خالد کے چہرے پر اس کے مشاق ہاتھوں کا جو ہنر دیکھ رکھا تھا، وہی پسند کیا۔ اس نے مجھے جستی ٹرنک سے ایک سفید رنگ کا چست...... اور وہی سرحدی لباس پہننے کو دیا جو خالد نے پہنا تھا۔ میں نے چست لباس کے اوپر بھاری شلوار اور چنوں والی کھلی قمیص پہنی۔ کھیڑی چپل پاؤں میں ڈالی۔ اس نے ایک عجیب الوضع کوٹ مجھے پہنایا اور اپنے سامنے چوبی اسٹول پر بٹھا کر چھوٹا سا بریف کیس کھول لیا۔ اس میں نہ سمجھ میں آنے والا سامان بڑے قرینے سے رکھا ہوا تھا۔ پیا نے مختصر الوجود سیفٹی ریزر میں بلیڈ ڈالا، میری شیو کی۔ مونچھیں مونڈنا چاہتا تھا مگر میں نے انکار کر دیا۔ وہ بولا۔ "پتا نہیں تم دیہاتی لوگوں کو اپنی مونچھوں سے اتنا پیار کیوں ہوتا ہے؟"

میں زیرِ لب مسکرایا۔ "پیا جی! ہمارے ہاں ایک مقولہ زبان زدِ عام رہتا ہے کہ مچھ نہیں تے کچھ نہیں۔ تم نے کلین شیو کر رکھی ہے۔ میرے گاؤں والے تمہیں دیکھ کر دبی دبی ہنسی میں ایک دوسرے کو اشاروں سے بتائیں گے کہ یہ ہیجڑا ہے۔"

اس نے کھل کر قہقہہ لگایا اور بولا۔ "دیہاتی لوگ واقعی بہت بھولے ہوتے ہیں۔"

اس کے ہاتھ ماہرانہ انداز میں حرکت کرنے لگے۔ اس کی زبان بھی چل رہی تھی۔ مجھے سمجھاتا جا رہا تھا کہ وہ کیا کرتا جا رہا ہے۔ اس نے میرے سر کے بالوں پر تیز بو والا اسپرے کیا۔ آئینہ دکھایا تو میں دیکھ کر دنگ رہ گیا کہ میرے بال سرخی مائل بھورے ہوگئے تھے۔ اس نے پلاسٹک کے دو ننھے ننھے اسپرنگ میرے نتھنوں میں فٹ کیے۔ لمبی اور گھنی ڈاڑھی میرے چہرے پر چسپاں کی، ٹرانسپیرنٹ گم کی مدد سے میری مونچھوں میں اضافی لمبے بال چپکائے، سر پر ٹوپی رکھی اور اوپر بڑی سی پلو دار پگڑی باندھ دی۔ اس نے نہ صرف میری آنکھوں میں سبز لینز فٹ کیے بلکہ مجھے ان کے اُتارنے اور دوبارہ لگانے کا طریقہ بھی سمجھایا۔ جب وہ اپنے کام سے فارغ ہوگیا، ناقدانہ نگاہوں سے جائزہ لے کر مطمئن ہوگیا تو مسکرا کر بولا۔ "گلاب خان! ذرا اس آئینے میں اپنا معائنہ کرو۔ دیکھو، کوئی کمی تو نہیں رہ گئی۔"

اس نے مجھے دیوار گیر آئینے کے طرف دھکیلا۔ میں آئینہ دیکھ کر حیران رہ گیا۔ نہ صرف میری ہیئت، بلکہ میری شکل بھی بدل گئی تھی۔ اسپرنگ لگانے سے میری ناک خاصی بھدی اور بدوضع ہو گئی تھی اور میری غیر معمولی سیاہ آنکھیں سبزی مائل ہو گئی تھیں۔ میں حیرت سے اپنا بدلا ہوا روپ دیکھ رہا تھا جبکہ وہ میری انگلیوں میں مختلف پتھروں کی انگوٹھیاں پہنا رہا تھا۔

اس نے مجھے واقعتاً ایسا بنا دیا تھا کہ میں اپنی عمر سے کم وبیش بیس سال بڑا نظر آنے لگا تھا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ نور پور والے کوشش کے باوجود مجھے پہچان نہیں سکتے تھے۔

اس نے مجھے ہدایات سے نوازا۔ ”شہر یار! تم جب تک اس روپ میں رہو گے، منہ ہاتھ نہیں دھوؤ گے۔ ٹھیک؟ اور ہاں...... ایسے بولو۔“ اس نے اپنا منہ کھولا، نچلے جبڑے اور گردن کے اعصاب کو تھوڑا پیچھے کی طرف کھینچ کر آواز نکالی۔ اس کی آواز یک دم بدل گئی۔ میں نے اس کی تقلید کی۔ دو تین مرتبہ کوشش کے بعد میں آواز بدلنے میں کافی حد تک کامیاب ہو گیا۔ وہ سر ہلا کر بولا۔ ”تم نے ٹوٹی پھوٹی اُردو بولنی ہے۔ مذکر کو مؤنث اور مؤنث کو مذکر قرار دینا ہے۔ لہجہ اکھڑ اور جاہلانہ، ہنسی مذاق نہیں کرنا اور کسی پر اپنا آپ ظاہر نہیں کرنا۔ تم اپنے آبائی گاؤں جا رہے ہو۔ وہاں تمہاری معمولی سی کوتاہی بنا بنایا کھیل بگاڑ سکتی ہے۔“

میں نے اس کے مشوروں کو پلّے باندھ لیا۔ جب ہم اپنا کام مکمل کر کے مکان سے نکلے تو شام کے چار بجنے والے تھے۔ حسین آگاہی مارکیٹ کی ایک ہول سیل دکان سے اس نے سامان خریدا۔ میں نے اس کی مدد سے مختلف انواع کے برتن سامان کو مخصوص انداز میں باندھا۔ ایک گٹھڑی کمر پر ڈالی جبکہ دوسرا بنڈل ہاتھ میں تھام لیا۔ اس نے مجھے ہنسی مذاق میں گاہک سے مول تول کے سنہرے اصول بتائے اور ڈیرا اڈا کی طرف لے چلا۔ ڈیرا غازی خان جانے والی ایک ویگن پر مجھے سیٹ مل گئی۔ میں نے چوک قریشی کا کرایہ ادا کیا۔ ٹکٹ کا رواج ان ویگنوں میں نہیں تھا۔ کنڈیکٹر نے چالاکی اور روایتی بے ایمانی کا سہارا لیتے ہوئے مجھ سے سامان کے لیے دوسری سیٹ کا فل کرایہ اینٹھ لیا۔

ویگن روانہ ہونے لگی تو پیاجی نے کھڑکی میں جھانک کر مجھ سے ہاتھ ملایا اور سنجیدگی سے کہا۔ ”گلاب خان! ذرا دھیان سے سودے بازی کرنا۔ یہ نہ ہو کہ اپنی تھوڑی گل کر بیٹھو۔“

میں نے ہاتھ لہرایا۔ ”اوئے خوجا! کیا تو میرے کو بے وقوف سمجھتی ہے۔ اللہ نگہبان۔“

اس نے مسکرا کر اپنا داہناں انگوٹھا بلند کیا اور ... کے پار کھڑی گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔ کنڈیکٹر نے ... گیٹ بند کیا اور چیختی ہوئی آواز میں بولا۔ ”ڈبل ... ڈبل...... سیٹیں فل ہیں۔ پہلی بریک تلیری موڑ ... گی۔ اُٹھ سو تیرہ ابھی نکلی ہے۔ اسے بائی پاس کراس ... کرنے دینا...... چل اُستاد جھولے لال، کر مزدوری ... مال! سوہنے رب دیاں رکھاں......“

ڈرائیور نے ایکسی لریٹر پر پاؤں کا دباؤ یک لخت بڑھا دیا۔ اپنے گاؤں کی طرف سفر کا آغاز ایک جاندار جھٹکے سے ہوا۔ میں نے پیاجی کی دی ہوئی لکڑی کے موٹے منکوں والی تسبیح نکالی اور پڑھنے لگا۔ کچھ دیر تک بڑے خشوع سے ثنائے یزداں کرتا رہا، پھر انگلیاں تو میکانیکی انداز میں متحرک رہیں مگر ذہن میں مختلف سوچوں کی یلغار ہونے لگی۔ میں سوچ رہا تھا کہ مجھے نور پور جانے کے لیے میک اَپ کی کیا ضرورت تھی؟ کیا میں نور پور میں محفوظ نہیں تھا؟

میں نے اپنی طے کردہ مسافت کا باریک بینی سے احاطہ کیا۔ مجھے یقین تھا کہ میں نے کہیں فاش غلطی نہیں کی تھی۔ سائیں دل جیت شاہ میرے ہاتھوں نہ صرف قتل ہوا تھا بلکہ میں نے اسے جلا کر خاکستر کر دیا تھا اور اپنے جرم کا نام و نشان تک مٹا دیا تھا۔ اس کے بعد میرے گھر پر دھاوا بولا گیا، تب اتفاق سے میں عین موقع پر پہنچ گیا اور پیاجی اور کھالے کی مدد سے میں نے حملہ آوروں کو ٹھکانے لگا دیا۔ اپنی بہنوں اور چھوٹے بھائی کو نہ صرف زندہ نکال لیا بلکہ اپنے ساتھ لے جانے میں کامیاب بھی ہو گیا۔ مگر چاچے اور چاچی کو آگ کے شعلوں سے نہیں نکال سکا۔ تب نور پور والوں نے مجھے بھاگتے دیکھ کر پہچان لیا تھا اور نکلنے کا موقع دیتے ہوئے اپنی ہمدردیوں کا خاموش اظہار کر دیا تھا۔

بعد میں مجھے معلوم ہوا تھا کہ بخت خان نے خانزادوں کی خواہش کے برعکس مجھے قانون کی نظروں میں مجرم بننے سے بچا لیا تھا۔ ان واقعات سے قبل میری بہن اغوا کر لی گئی تھی جس کے ساتھ ساتھ سردار حیات خان کا ... امیر نواز بھی غائب تھا۔ حیات خان اپنے بیٹے کے غیاب ... ملبا میرے سر پر ڈالنے لگا تھا۔ مجھے اس کی طرف سے خطرہ تھا۔ حیدر خان کا چہیتا اور خاص کارندہ وریام خان مجھے دیکھتے ہی دھر لیتا اور باندھ کر سردار حیدر خان کے ڈیرے پر پہنچا دیتا۔ مجھے اس سے بھی بچنا تھا۔ یارن خان نے میری ... پر ہاتھ ڈالا تھا اور میں اس کو نقصان پہنچانے کی نیت سے ... ہاتھ ... بعید نہ تھا کہ اسے بھنک مل چکی ہو کہ میں ...

کے گینگ سے وابستہ ہوں اور وہ مجھے دیکھتے ہی پولیس کو بلوا لیتا۔ میں قانون کو مطلوب نہیں تھا مگر میرے لیے یقینی طور پر نور پور میں قدم قدم پر خطرات منہ کھولے کھڑے تھے۔ مجھے ہر شخص سے بچتے ہوئے گام گام محتاط رہنا تھا۔ ذہن میں درپیش آنے والی ہر ممکنہ صورت حال کا سماں باندھ رہا تھا اور نبرد آزمائی کے لیے لائحہ عمل تیار کر رہا تھا۔

شام کا اندھیرا چار سو پھیل چکا تھا جب ویگن نے مجھے چوک قریشی اُتارا۔ میں نے سامان اُٹھایا اور سڑک پار کر کے نور پور جانے والی حیات خان کی ویگن کے اسٹاپ کی طرف قدم بڑھائے۔ ہوٹل کے قریب پہنچا تو بنچ پر بیٹھے ہوئے ایک دبلے پتلے سپاہی نے ہانک لگائی۔ ”اوئے دو نمبر پٹھان! ادھر آ، کوئی حال حویلہ دے۔“

جب میں، کھالا اور پیا جی نور پور اپنی شاندار ٹرو پر میں نور پور جا رہے تھے تو اسی سپاہی نے بیریئر پر ہمیں روکا تھا۔ کھالے نے بتایا تھا کہ وہ اس کے پکی فروش ہومیو پیتھک ڈاکٹر کا سالا تھا۔ میں نے قریب پہنچ کر اکھڑ انداز میں کہا۔ ”اوئے صاب لوک! اگر اَم دو نمبر پٹھان ہے تو بول کہ ایک نمبر کدھر ہے۔ اَم اس سے ابھی ملتی ہے۔“

میرے بے ساختہ جملے پر بنچ پر بیٹھے ہوئے دوسرے لوگ ہنس پڑے۔ سپاہی کھسیا کر بولا۔ ”یہ اسمگلنگ کا مال ہے؟“

میں نے احمقوں کی طرح دیدے نچائے اور کہا۔ ”اَم ادھر حسین آگاہی سے خرید کر لایا ہے بیچنے کے واسطے۔ تم نے کچھ خریدنا ہے؟ ایک نمبر مال ہے۔ یہ دیکھو۔ اصلی جاپانی استری ہے۔ دو نمبر ہو تو اَم لاک روپیہ جرمانہ دے گا۔ بات کرو...... کتنے میں لیتا ہے؟“

اس نے جان چھڑانے کے سے انداز میں کہا۔ ”رہنے دو پٹھان، رہنے دو۔ مجھے کچھ نہیں چاہیے۔ جاؤ، اپنا کام کرو۔“

وہ محض اپنا رعب داب جمانا چاہتا تھا وگرنہ میں اس کی نظر میں مشکوک نہیں تھا۔ میں نے تمسخرانہ لہجے میں کہا۔ ”صاب لوگ کا جیب خالی ہے، بس...... اَمارے مال کو دو نمبر بولتا ہے۔ واہ بھئی واہ......“

میں بڑبڑاتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ یکبارگی میرا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ میری نگاہ ہوٹل کے بڑے ہماچے پر آلتی پالتی مار کر بیٹھے ہوئے استاد کھالے پر پڑ گئی تھی۔ اس کے اطراف یار لوگوں کا جمگھٹا لگا ہوا تھا اور وہ اپنی عادت کے مطابق چھاتی پھلائے ڈینگیں مارنے میں مگن تھا۔ سانولا سلونا شیدو ہماچے کی بانہہ پر پیر ٹکائے کھڑا تھا۔ جی چاہا کہ دوڑ کر کھالے کو اپنی بانہوں میں بھر لوں مگر میری نظر پاس کھڑی ویگن اور ویگن میں بیٹھ کر روانگی کا انتظار کرنے والے لوگوں پر پڑ گئی جو تقریباً سبھی نور پور کے رہنے والے تھے۔ میں ویگن کے قریب گیا۔ جھانک کر دیکھا۔ ویگن فل تھی۔ شیدو کی نٹ کھٹ آواز میرے عقب میں گونجی۔

”اوئے خان! پَرے ہٹ وَنج، ڈیدھا تاں پیا ہیں جو ویگن ٹن پر بونجا تھئی لاتھی ہے۔“

(اوئے خان! پرے ہٹ جا۔ دیکھ تو رہا ہے کہ ویگن بالکل فل ہو چکی ہے)

’تن پر بونجا‘ شیدو کا مخصوص کلمہ تھا جس کا آسان الفاظ میں مطلب نکلتا تھا کہ ویگن فل ہے اور کسی سواری کی گنجائش نہیں ہے۔ میں نے پلٹ کر اُسے دیکھا اور ڈانٹا۔ ”اوئے کیا بولتا ہے پدی کا بچہ! ہمارا سیٹ بناؤ۔ اَم نے دور جانا ہے۔“

وہ ہاتھ نچا کر بولا۔ ”اس ویگن پر لاہور جاتا ہے کیا؟“

سواریاں ہنس پڑیں۔ میں نے مونچھیں پھڑکائیں اور اسے گردن سے پکڑ لیا۔ ”اوئے خوچے کا بچہ! اَم سے مذاق کرتی ہے۔ اَم گلاب خان ہے۔ گردن مروڑ کر نسوار کی ڈبی میں ڈالے گی اور اپنے وطن لے جائے گی۔“

وہ ہنسا اور سواریوں کی طرف منہ کر کے بولا۔ ”چاچا...... ڈیکھ! اِہ اوہ گلاب ہوی جیکوں بھیڈ سنگھ کے بے ہوش تھی ویندی اے۔“

(چاچا! دیکھ! یہ وہ گلاب ہے جسے سونگھتے ہی بھیڑ بے ہوش ہو جاتی ہے)

میں نے دل ہی دل میں اس کے نقد اور خوب صورت جواب پر داد دی اور پوچھا۔ ”تمہارا اُستاد کدھر ہے؟ اس ائر کنڈیشنڈ ویگن کا پائلٹ۔“

اس نے ہماچے کی طرف اشارہ کیا اور اپنی گردن میرے ہاتھ سے چھڑاتے ہوئے کہا۔ ”جا خان! استاد کھالے سے بات کر۔ ہو سکتا ہے وہ تمہیں چھت یا بمپر پر وی آئی پی سیٹ الاٹ کر دے۔“

وہ بالکل ویسا ہی تھا، جیسا میں نے آخری مرتبہ دیکھا تھا۔ نٹ کھٹ، تیز طرار...... میں کھالے کے پاس پہنچا۔ وہ مجھے دیکھ کر ایک ذرا چونکا۔ میں نے کہا۔ ”اوئے کالے استاد! اَم ادھر جائے گا۔“

یوں لگا جیسے اس کی آنکھوں نے میرا ایکسرے کر لیا ہو، مسکرا کر بولا۔ ”کدھر جائے گا خان بابا؟“

اس کے انداز سے لگ رہا تھا کہ اس نے مجھے پہچان لیا تھا۔ [illegible] مسکرا کر کہا۔ ”ادھر...... جدھر تمہارا ائر کنڈیشنڈ گاڑی [illegible]“

ایک ڈرائیور مزہ لے کر بولا۔ ”یہ تو جہنم میں جائے گا۔“ [illegible] ہماچہ نشینوں نے زوردار قہقہہ لگایا۔ کھالے نے [illegible] آواز میں کہا۔ ”اوئے چپ کرو بے غیرتو! یہ کوئی ہنسنے کی بات ہے۔ اوئے چل خان باوا! ادھر گاڑی کی چھت پر سامان رکھ دے۔ کسی سیٹ پر مت بیٹھنا۔ جب گاڑی چلنے لگے تو پیچھے بمپر پر کھڑے ہو جانا۔“

میں نے منت آمیز لہجے میں کہا۔ ”استاد رحم کر اَم پر...... سردی بوہت اے۔“

اس نے ایک مرتبہ پھر مجھے کریدتی ہوئی نظروں سے گھورا اور اونچی آواز میں بولا۔ ”اوئے شیدے! اس بیچارے پٹھان کو فرنٹ سیٹ پر بٹھا دے، کیا یاد کرے گا۔ اوئے چل خان! ادھر سے بستر کھول کر۔“

میں نے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر اس کا شکریہ ادا کیا اور فاتحانہ انداز میں چھاتی پھیلا کر ویگن کے قریب آیا۔ شیدے نے کندھے اُچکائے، آنکھیں نچائیں اور شوخی سے کہا۔ ”بڑی بات ہے چاچا گلاب خان! استاد کو تم پر رحم آ گیا۔ چل ادھر لا، سامان پکڑا۔ کوئی ٹوٹنے والی شے تو نہیں ہے اس میں؟“

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ وہ بندر کی طرح پلک جھپکتے میں ویگن کی چھت پر چڑھ گیا۔ میں نے اپنی دونوں گٹھریاں اسے تھمائیں۔ اس نے ایک بدوضع رسی کی مدد سے انہیں ریلنگ سے باندھ دیا۔ میں نے ہوٹل کے کاؤنٹر کے پاس کھڑے ہو کر چائے کا ایک بڑا پیالہ حلق میں اتارا۔ تب تک فلائٹ کے ’ٹیک آف‘ کا ٹائم ہو گیا اور کھالا اپنی مخصوص، شانِ بے نیازانہ چال چلتا ہوا ڈرائیونگ سیٹ پر براجمان ہو گیا اور مونچھوں کو بل دیتے ہوئے بولا۔ ”اوئے شیدے! دیکھ لے، کوئی سواری نیچے نہ ہو۔ آخری ٹائم ہے۔ جو رہ گیا، وہ سردی میں ٹھٹھر گیا۔“

ویگن کے ڈرائیونگ کیبن میں کھالے سمیت ہم چار آدمی سمٹ کر بیٹھے ہوئے تھے۔ گیٹ کے شیشے کا ربڑ پھٹا ہوا تھا۔ کئی درزوں سے ٹھنڈی ہوا آ رہی تھی۔ کھالے نے رسی سے بندھے ہوئے عقب نما کا رُخ میری جانب کر دیا۔ میں نے اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں خود پر مرتکز دیکھیں۔ چونکہ میرے اور اس کے بیچ دو اور مسافر بیٹھے تھے اس لیے وہ جو سوال پوچھنا چاہتا تھا، پوچھ نہیں سکتا تھا۔ دونوں مسافر مجھے بخوبی جانتے تھے۔ سیاہ پگڑی والا فیضو تھا۔ کالے بزدار کا سالا جبکہ دوسرا العل دین عرف لالو تھا جو امان اللہ قریشی کے دارے پر مہمانوں کی آؤ بھگت کیا کرتا تھا۔ مجھے بڑی طمانیت ہوئی جب میں نے دیکھا کہ انہوں نے مجھے بہ غور دیکھنے کے باوجود پہچانا نہیں تھا۔ فیضو نے پوچھا۔ ”خان صاب! کدھر سے آیا ہے؟“

میں نے احمقانہ انداز میں کہا۔ ”اوپر سے...... جدھر سے سارا لوگ آتا ہے۔ اَم کوئی اور مخلوق ہے جو کسی اور راستے سے آئے گا۔“

تینوں کے چہروں پر مسکراہٹ تیر گئی۔ کھالا بولا۔ ”خان باوا! تمہیں کہاں جانا ہے؟“

”بولا تو تھا اَم نے، تم جدھر جائے، اَم ادھر جائے گا۔“ میں نے جلدی سے کہا۔

وہ بولا۔ ”میں تو نور پور جا رہا ہوں۔ تم اس وقت وہاں جا کر کیا کرو گے؟“

”اَم اپنا سودا بیچے گا اور کیا کرے گا۔“ میں نے کہا۔

تب مجھے سمجھ آئی کہ اس کا پوچھنے کا مطلب یہ تھا کہ رات کو مجھ سے گاؤں میں کون سودا خریدے گا۔ میں نے پریشان ہونے کی اداکاری کی، پوچھا۔ ”ادھر کوئی اوٹل ووٹل نہیں ہے؟“

وہ قہقہہ لگا کر مزاحیہ انداز میں بولا۔ ”فکر نہ کرو خان! ادھر نور پور کے مال روڈ پر بڑے بڑے ہوٹل کھلے ہوئے ہیں۔ ایک دم مفت سروس، کھلی فضا!“

میں نے بے بسی سے کہا۔ ”تو پھر اَم کو ایدھر اُتار دے استاد!“

ساتھ ہی میں نے سر نکال کر کھالے کا چہرہ دیکھا۔ وہ کن انکھیوں سے مجھے ہی دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ہلکورے لیتی معنی خیز چمک نے چغلی کر دی کہ وہ مجھے پہچان کر چھیڑ خانی کر رہا تھا۔ چونکہ وہ اسی گیٹ اَپ میں نور پور آیا تھا اس لیے وہ پیا جی کی مہارت کو تاڑ گیا تھا۔ آنکھوں سے بولا۔ ”میں نے تجھے پہچان لیا ہے شہرے خان! زیادہ اداکار بننے کی کوشش نہ کرو۔“

میرے لبوں پر مسکراہٹ تیر گئی اور میں نے فیضو اور لالو کے درمیان چھڑے ہوئے تبصرے سے صرفِ نظر کرتے ہوئے ویگن کے گدلے شیشے کے پار پیچھے کی طرف سرکتے ہوئے مانوس مناظر پر آنکھیں ثبت کر دیں۔ دل کو کچھ کچھ ہونے لگا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے میں صدیوں بعد اس راستے کو، راستے کے اطراف کچے مکانات اور لہلہاتی فصلوں کو دیکھ رہا تھا۔ وطن کی مٹی سوندھی ہوتی ہے۔ وطن کی فضا پیار سے تھپکیاں دیتی ہے اور خوش آمدید کہتی ہے۔ یہ

احساس بڑا جاں فزا تھا کہ میں نور پور کی فضاؤں میں سانسیں لینے والا تھا۔

کھالے نے پھر مجھے مخاطب نہیں کیا بلکہ بلند آواز میں کوئی گیت گانے لگا تھا، میں نے کہا۔ ”اوئے استاد! تو اپنی بانسری بند کر اور گاڑی کا ٹیپ چلا۔ کوئی پختو گانوں کا کیسٹ رکھا ہے تو نے؟“

اس نے اپنی صدا کا گلا گھونٹا اور قدرے غصے سے بولا۔ ”پختو گانا تیرا باپ سنے گا اس علاقے میں؟ چپ کر کے بیٹھا رہ ورنہ ایدھر اُتار دوں گا۔“

میں دبک بیٹھا۔ فیضو نے کندھا دبایا، کہا۔ ”خان صاب! دھیان سے بات کرو۔ استاد بڑا غصے والا ہے۔“

میں نے دل ہی دل میں کھالے کے شجرۂ نسب میں نامناسب تبدیلیاں کیں اور کہا، میں اس کالے ٹیٹ ڈرائیور کے غصے کو بڑی اچھی طرح جانتا ہوں پر اپنی پوزیشن کے پیشِ نظر دل کی آواز لبوں تک نہ لا سکا اور ہنکارا بھر کر خاموش ہو گیا۔

شام کے گہرے دھندلکے میں نور پور کی زمین پر قدم رکھا۔ چھت سے اپنا سامان اُتار کر کھالے کی دیوار کی جڑ میں رکھا۔ دل کو دھکا سا لگا کہ میں اپنے ہی گاؤں میں چوروں کی طرح روپ بدل کر آیا تھا۔ چند لمحوں میں تمام سواریاں تتر بتر ہو گئیں جبکہ میں، کھالا اور شیدو بخشو لوہار کے چھپر تلے کھڑے رہے۔

بخشو لوہار نے مجھے مخاطب کیا۔ ”اوئے کملے پٹھان! تیکوں پتا کائے ناہی جو منہ چاتے اِتھ آن کھڑیں۔ رات ویلے اِتھاں کون سامان گھنسی؟“

(اوئے بے وقوف پٹھان! تجھے علم نہیں تھا جو منہ اُٹھائے چلے آئے ہو۔ رات کو تم سے کون یہاں سامان خریدے گا)

میں نے انگلی آسمان کی طرف اُٹھائی اور جبڑا کھینچ کر کہا۔ ”خدا مالک ہے چاچا! وہ روزی دے گا۔“

کھالے نے مجھے جھلنگا چارپائی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور اندر چلا گیا۔ شیدو دکان بڑھانے میں چاچے بخشو کی مدد کرنے لگا۔ میں چارپائی پر بیٹھ گیا۔ میری نظروں کے سامنے شیرے قسائی کا کچا مکان واقع تھا جو اُترتی رات کے اداس اندھیرے کا حصہ معلوم ہو رہا تھا۔ چشمِ تصور میں کھالے پر جان وارنے والی الہڑ دوشیزہ شموں کا لہراتا بدن سمایا۔ دل سے ہوک نکلی۔ ”ہائے! کیا وقت تھا۔“

سڑک کے ساتھ ساتھ بجی نائی کے حمام تک دکانوں کا مختصر سا سلسلہ تھا۔ تمام دکانیں بند ہو چکی تھیں جبکہ شریف [illegible] والے کا انجن اپنی مخصوص 'پھک پھک' کی آواز خارج کر [illegible] تھا۔ وہ لکڑی کی چرائی کر رہا تھا۔ گردن موڑ کر سردار حیدر خان کے دارے کے اندر تک نظر دوڑائی۔ ڈیرا آباد تھا۔ ہمیشہ کی طرح لوگوں کی ٹولیاں آمنے سامنے چارپائیوں پر براجمان تھیں۔

میں اپنے سامان کو بلا وجہ چھیڑ رہا تھا اور کھالے کا انتظار کر رہا تھا۔ جب چاچا بخشو اور شیدو نے دروازہ اندر سے بند کر لیا، تب کھالا ویگن کی طرف سے آتا دکھائی دیا۔ میرے قریب چارپائی پر بیٹھ گیا اور اردگرد دیکھ کر رازدارانہ انداز میں بولا۔ ”شہرے! تم ادھر کیوں آئے ہو؟“

میں نے اس کی نظروں کو دل ہی دل میں سراہا اور کہا۔ ”لمبی بات ہے۔ میرا کوئی بندوبست کرو۔ کچھ کھلاؤ پلاؤ، پھر تفصیل سے بتاؤں گا۔“

اس نے وفورِ محبت سے میرا ہاتھ تھام لیا۔ آواز بھرا گئی، بولا۔ ”یار! تم نے اچھا کیا جو سوانگ رچا کر ادھر آئے ہو ورنہ تمہیں لینے کے دینے پڑ جاتے۔ خان زادے سخت سیخ پا ہیں اور اپنے اپنے طور پر تمہیں تلاش کرتے پھرتے ہیں۔ خیر! یہ باتیں تو ہوتی ہی رہیں گی، پہلے میں تمہاری شب بسری کا بندوبست کر کے آتا ہوں۔“

اس نے میرا ہاتھ دبایا اور عجیب تشنہ نگاہیں لیے رخصت ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد لوٹا اور مجھے گھر کے اندر لے گیا۔ اس نے اپنے اور میرے لیے ایک کمرا خالی کروا لیا تھا۔ میں نے اپنا سامان ایک جانب رکھا اور پھیل کر چارپائی پر بیٹھ گیا۔ دوسرے کمرے سے خالدہ عرف بلو کی تیز آواز سنائی دے رہی تھی۔ وہ کسی بات پر ماں سے جھگڑ رہی تھی۔ ساتھ ساتھ کھالے کو بھی کوس رہی تھی جس کے مہمان کی ناوقت آمد کے سبب اسے کمرے سے نکل کر ادھر جانا پڑا تھا۔ میرے لبوں پر آسودہ سی مسکراہٹ تیر گئی۔ میں بھلے جس رنگ میں یہاں آیا تھا، میرے لیے خوش کن اور طمانیت بخش تھا کہ میں اپنے آبائی گاؤں میں بیٹھا تھا۔ تھوڑی دیر بعد کھالا چنگیر میں روٹیاں اور سالن کی دو پلیٹیں رکھے نمودار ہوا۔ اس نے شیدو کو آواز دے کر پانی کا جگ منگوایا۔

میں نے سیر ہو کر روایتی انداز میں پکے ہوئے آلو مٹر کھائے اور ہاتھ کھینچ لیے۔ کھالا بڑا سا لقمہ چباتے ہوئے مجھے بڑے انہماک سے دیکھ رہا تھا، بولا۔ ”یار شہرے! ماں کی انگلیوں کو خدا نے سونے کا بنا رکھا ہے۔ ایک دم بند... [illegible]

میں کوئی مائی کا لعل پہچان نہیں پائے گا۔“

”تم نے تو پہچان لیا۔“ میں مسکرایا۔

”میری بات اور ہے۔ میں نے تمہیں اس لباس کی بدولت پہچانا تھا۔ میں نے بھی یہی پہنا تھا۔“ اس نے بتایا۔

چائے پینے کے بعد میں نے اپنی نور پور آمد کی غرض و غایت سے تفصیلاً آگاہ کیا۔ وہ توجہ سے سنتا رہا۔ پھر متفکر انداز میں بولا۔ ”یارن خان کو چھیڑنا تو سوئے ہوئے شیش ناگ کی دم پر پاؤں رکھنے کے برابر ہے۔ میری مان تو رات گزار کر واپس چلا جا۔ کہہ دینا کہ کچھ ہاتھ نہیں لگا۔“

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ”نہیں کھالے! میں میڈم کو دھوکا نہیں دے سکتا۔“

”کیوں؟“ اس نے قدرے برہمی سے کہا۔ ”کیا اس سالی پر عاشق ہو گئے ہو؟“

میں نے کہا۔ ”ہاں کھالے! ایسا ہی سمجھ لو۔ وہ مجھ پر بہت مہربان ہے۔ مجھ پر بھروسا کرتی ہے۔ تم جانتے ہو کہ شہریار جس چنگیر میں کھاتا ہے، اس میں چھید نہیں کرتا۔“

ہم دونوں رضائیوں میں گھس گئے اور کھسر پھسر کرنے لگے۔ پہلے اس نے مجھے اپنے بارے میں بتایا کہ اس نے بڑی مشکل سے خانزادوں کو مطمئن کیا تھا اور قسمیں کھا کر یقین دلایا تھا کہ اس کا شہرے سے تعلق نہیں رہا تھا۔ پھر اس نے مجھے نور پور کے ایک ایک گھر کی بابت مطلع کیا۔ میں حیرانی سے، کبھی پریشانی سے اور کبھی خوشی سے اس کی باتیں سنتا...... پل پل متغیر ہوتی کتھائیں...... پل پل بکھرتی ہوئی داستانیں...... جن کا نتیجہ محض یہی نکلتا تھا کہ میرے بعد گاؤں میں کوئی خاص واقعہ رونما نہیں ہوا تھا۔ غزالہ اور پھوپو ہنوز بخت خان کی حویلی میں مقیم تھیں۔ ان کی خواہش پر میرے ڈیرے کا انتظام اور مال ڈنگران کے حوالے کر دیا گیا تھا۔ غزالہ پوری شدومد سے میرا انتظار کر رہی تھی۔ سردار حیات خان کا بیٹا امیر نواز نہیں لوٹا تھا۔ اس کے باپ کو یقین ہو گیا تھا کہ میں نے اُسے اور اپنی بہن کو کہیں ٹھکانے لگا دیا تھا جبکہ سردار وریام خان کا زیادہ تر وقت روتے گزرتا۔ میں سردار حیدر خان کی حویلی میں گزرنے لگا تھا۔ خانزادی اسما کا اغوا منظرِ عام پر آ چکا تھا۔ ہزار کوشش کے باوجود ابھی تک بازیاب نہیں ہوئی تھی جس کی وجہ سے لوگ دبے دبے لفظوں میں کہنے لگے تھے کی خانزادی اپنی مرضی سے کسی کے ساتھ اُدھل گئی تھی۔ تینوں سردار مجھے اپنا جانی دشمن قرار دیتے تھے اور کھلے عام اظہار کرتے تھے کہ جونہی [illegible] دکھائی دیا، اسے قتل کر دیا جائے گا اور علاقے بھر کے لیے عبرت بنا دیں گے تاکہ آئندہ کوئی شخص کسی خانزادی کی طرف میلی آنکھ سے دیکھنے کی جرأت نہ کرے۔

سائیں جگ جیت شاہ کے مزار پر معتقدین کی آمد و رفت کا سلسلہ پوری آب و تاب کے ساتھ جاری تھا۔ شیخوپورے سے امپورٹ کیے گئے نئے خلیفے، سائیں نورن آغا نے دربار کا چارج سنبھالتے ہی لوگوں کے دلوں میں گھر کر لیا تھا۔ سائیں دل جیت شاہ ابھی تک لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہو کر چلہ کشی میں محو تھا۔ اس کے بارے میں بہت سی اوٹ پٹانگ باتیں نور پور میں گردش کرتی تھیں۔ بے جا عقیدت میں لپٹی ہوئی ان بے سروپا باتوں کا تمام تر ثمر خلیفہ نورن آغا کی ہتھیلی پر جمع ہو رہا تھا۔ کھالے کے بقول، نورن آغا پینتالیس سینتالیس کے سن میں تھا۔ وجیہہ انسان تھا۔ عمدہ پوشاک زیبِ تن کرتا اور شیریں باتیں کر کے مریدوں کے دل موہ لیتا۔ اس کام میں چرب زبانی سے بڑا کوئی ہتھیار کارگر نہیں ہوتا۔

کھالے نے یہ بتا کر مجھے حیران کر دیا کہ سردار حیدر خان کو معلوم ہو گیا تھا کہ اس کی بیٹی میڈم شکیلہ کی تحویل سے نکل کر میاں دلبر حسین کے ہاتھ لگ گئی تھی۔ وہ کئی بار میاں صاحب کے دربار میں حاضری دے چکا تھا مگر ہر بار مایوس لوٹا تھا۔ کھل کر میاں صاحب پر الزام عائد نہیں کر سکتا تھا کیونکہ اس کے پاس کوئی ثبوت نہیں تھا اور اس میں اپنے سے بڑے جاگیردار پر اپنے مخصوص جابرانہ انداز میں چڑھ دوڑنے کی جرأت نہیں تھی۔ البتہ اس نے اپنے ہرکاروں کو میاں صاحب کے اطراف چوکس کر رکھا تھا جو اسے پل پل کی خبر دے رہے تھے۔ کھالے کو یہ باتیں کیسے معلوم ہوئیں؟ اس نے میرے استفسار کے باوجود نہیں بتایا۔ مجھے بھی آم کھانے سے غرض تھی، پیڑ گننے سے نہیں۔

اسپتال میں ایک نیا ڈاکٹر تعینات ہو گیا تھا جو فیروزی رنگ کی کار پر ہر صبح دس بجے کے قریب پہنچتا تھا اور ایک ڈیڑھ بجے واپسی کی راہ پکڑتا تھا۔ وہ خاصا کم عمر تھا۔ کھالے نے اس کی صورت کا نقشہ بھی کھینچا جس سے مجھے پتا چل گیا کہ وہ بہ مشکل پانچ فٹ قد والا مختصر الوجود شخص تھا جس نے غالباً ہاؤس جاب کے بعد ادھر کا رُخ کیا تھا۔ یارن خان کے بارے میں بتایا کہ وہ کچھ عرصہ قبل لاہور سے آیا تھا۔ اس کے ساتھ معمول کے نوکر چاکر تھے۔ حسبِ سابق اس نے کسی کو منہ نہیں لگایا تھا بلکہ حویلی میں ایک طرح سے مقید ہو کر رہ گیا۔ مراد بخش دیوانہ اپنا زیادہ تر وقت وہیں گزارتا تھا۔ اسے اچھا سامع میسر آ گیا تھا۔

اس نے کہا۔ ”دیکھ شہرے! میں مانتا ہوں کہ تو بہت اونچی پروازیں کرنے لگا ہے۔ مجھ سے زیادہ پڑھا لکھا بھی ہے اور تیری مالکن کو ہتھیلی پر سرسوں جمانے کا ہنر بھی آتا ہے پر ایک بات کان کھول کر سن لے۔ تم نے اور تمہاری مالکن نے احمقانہ قدم اُٹھایا ہے۔“

میں نے تعجب سے پوچھا۔ ”کیا مطلب؟“

”مطلب ظاہر ہے۔ یہ تو تمہیں اندازہ ہوگا ہی کہ یارن خان نے اپنی حویلی میں مال چھپا کر نہیں رکھا ہوگا۔ اس نے یقینی طور پر یہاں سے دور کسی اڈے پر ان ماں بیٹے کو رکھا ہوگا۔ خان کے کسی بھی اڈے کا کسی کو علم نہیں۔ اول تو وہ اس علاقے میں کوئی غلط کام کرتا نہیں، اگر کرتا ہے تو کسی کو رازدار نہیں بناتا۔“ کھالے نے سنجیدگی سے حالات کا تجزیہ کیا۔ ”یعنی تم اس کے کسی نوکر سے کوئی معلومات حاصل نہیں کر سکتے۔ اس کا پیچھا کرنے کے لیے تمہارے پاس کوئی گاڑی نہیں ہے جبکہ اس کے پاس فور ویل گاڑی ہے۔ فرض کیا، تمہیں مطلوبہ معلومات حاصل ہو بھی جائیں تو بتاؤ، کیا کرو گے؟ کیا خان پر ہاتھ ڈالو گے یا ملتان جا کر اپنی مالکن کو رپورٹ دو گے؟“

میں نے کندھے اُچکائے۔ ”لامحالہ بات ہے کہ مجھے میڈم کو رپورٹ دینا ہوگی۔“

”تب تک وہ تمہارے مطلوبہ افراد کو کسی دوسرے ٹھکانے پر منتقل کر دے گا۔“ اس نے کڑی نظروں سے مجھے گھورا۔

”تو پھر؟“ میں نے ہتھیار ڈالے۔ ”مجھے کیا کرنا چاہیے؟“

”تمہیں نور پور کی سیر کر کے لوٹ جانا چاہیے۔“ اس نے اپنے تجزیے کا نتیجہ اخذ کیا۔ ”وہاں سے تیار ہو کر آؤ اور یارن خان پر ڈائریکٹ ایکشن کرتے ہوئے اپنے مدعا تک پہنچو۔“

”مگر میڈم ایسا نہیں چاہتی۔“ میں نے بتایا۔

”کیوں؟ کیا وہ خان سے ڈرتی ہے؟“ اس کے لہجے میں ہلکا سا تمسخر نہاں تھا۔ ”یا تمہیں آگ میں جھونکنا چاہتی ہے؟“

میں نے بات ٹالی۔ ”ہاں شاید۔ اس نے میرے ذمے لگایا ہے کہ میں خان کے ٹھکانوں کی ٹوہ لگاؤں۔“

وہ سوچ میں مستغرق ہو گیا۔ میں وقت ضائع کیے بغیر رات کو ہی یارن خان کی حویلی میں جانا چاہتا تھا مگر کھالا اس حق میں نہیں تھا۔ اس کا موقف تھا کہ مجھے رات کو وہاں جا کر کوئی خاطر خواہ کامیابی نہیں مل سکتی۔ مجھے اگلے دن نور پور میں سامان بیچنے کے دوران حویلی کی سن گن لینی چاہیے اور دیکھ بھال کر کوئی قدم اُٹھانا چاہیے۔

مجھے ہتھیار ڈالنا پڑے اور نصف شب کے بعد سونا پڑا۔ البتہ یہ طے پا گیا کہ اگلے دن وہ اپنے معمول کے مطابق ویگن کو نور پور لے جائے گا۔ ڈرائیور کا بندوبست کرے گا بقیہ آدھا دن میری معاونت کرے گا۔ ہم دونوں مراد بخش دیوانے کے یہاں جائیں گے۔ وہ اسے کریدے گا، میں سنوں گا۔ امید تھی کہ اس سے کوئی کارآمد بات ہم کو مل جائے گی۔

نیند آنے لگی۔ تاہم میں تن آسان نہیں تھا کیونکہ مجھے پٹھانوں کے روایتی لباس میں بڑی اُلجھن ہو رہی تھی۔ تار کے اسپرنگ اور گالوں سے چپکی ہوئی ڈاڑھی الگ سے پریشان کر رہی تھی مگر میں ان بہروپی معاونین سے گلوخلاصی کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔

علی الصباح ناشتا کرنے کے بعد جب کھالا اور رشید اپنی ویگن کی خاطر مدارت میں جُٹ گئے، میں سامان اُٹھا کر گلی میں آ گیا۔ خالدہ، پھوری اور ماسی عفو سے چند لمحوں کے لیے آمنا سامنا ہوا اور مجھے یہ دیکھ کر مزید اعتماد حاصل ہوا کہ انہوں نے مجھے دیکھ کر یکسر نظر انداز کر دیا تھا۔ میں نے سردار حیات خان کے دارے کے سامنے کھڑے ہو کر بلند آواز میں ہوکا لگایا۔ ”استری، ولایتی جوسر، ٹیپ ریکارڈر لے لو، چار بینڈ والا ریڈیو لے لو، ٹی سیٹ، واٹر سیٹ لے لو...... ایک نمبر گارنٹی والا مال......“

اگر میں نے اپنا حلیہ بدل نہ رکھا ہوتا تو مارے جھجک کے میرے حلق سے ایک آئٹم کا نام بھی نہ نکل پاتا۔ اب یوں لگ رہا تھا جیسے میں ہر کسی کو دیکھ رہا تھا مگر کوئی مجھے نہیں دیکھ رہا تھا۔ تبھی ہر دروازے پر رکا۔ ہر در پر صدا دی۔ کسی نے گلی میں جھانک کر دیکھنے کی زحمت کی، کسی نے نہیں کی۔ پھر خانزادوں کی حویلیوں کے سامنے سے گزرتا ہوا گلی میں اپنے کھنڈر نما آبائی مکان کی دیوار کی جڑ میں جا کر بیٹھ گیا۔ سامان کو بلاوجہ کھول کر اوپر تلے کرنے لگا۔

مجھے یہاں قلبی سکون مل رہا تھا۔ چکنی مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو نتھنوں سے گزر کر دماغ تک پہنچ رہی تھی اور عجیب آسودگی کا توانا احساس بخش رہی تھی۔ میرا دل بھر آیا۔ چاہا کہ دھاڑیں مار مار کر روؤں اور دل میں جمع ہونے والا غبارِ خاطر نکال دوں مگر آنکھوں میں کلر لینز لگے ہوئے تھے۔ میں نے بہ مشکل خود پر قابو پایا اور اپنے سودا سلف کی دکان کی فہرست بلند آواز میں نادیدہ گاہکوں کے گوش گزار کرنے لگا۔

نور پور کی اکلوتی مسجد تھی۔ مسجد کے ...ے کی جانے والی آرائش آج ...وں پر کبوتر اٹھکیلیاں کر رہے تھے۔ ...نے سر اُٹھایا۔ میرا بخت عروج ...ے غزالہ نکلی۔ وہ اکیلی تھی۔ اس ...لباس زیب تن کیا ہوا تھا۔ میں نے ...نہیں دیکھا تھا۔ نیا سلوایا ہوگا۔ اپنا ...کرتے ہوئے، گلی عبور کرتے ہوئے ...طرف بڑھی۔ کالے کی سالی جو غزالہ ...لیے جا رہی تھی۔

...آواز دی۔ ”اے لڑکی! اَم کو پانی پلاؤ۔“ ...رُک گئی۔ گردن موڑ کر میری طرف ...رہن سہن میں وہ اتنی بااختیار اور بااعتماد ...اجنبی پٹھان کو پانی پلاتی۔ حیرانی آمیز خفگی ...اس کا آدھا چہرہ مجھے دکھائی دے رہا ...میں چھپا ہوا تھا۔ میں نے جلدی سے آواز ...اس استری ہے، ٹی سیٹ، واٹر سیٹ، سیکو ...کوئی چیز لینی ہے تو آ جاؤ، دیکھ لو...... سستا اور ...ہے۔“

...تیزی سے دھڑک رہا تھا، اُسے پکار رہا تھا مگر ...میرے پاس نہیں آئے گی۔ دل نے اس ...کی دعا مانگی۔ قبولیت کی گھڑی تھی۔ کالے ...ے میں نمودار ہوئی۔ اس کی بڑی بہن ...پر سامان دیکھنے کے لیے میری طرف چل ...نے بھی ہمت کی اور ان کے پیچھے پیچھے چل ...مارے مسرت سے رقص کرنے لگا۔ کالے ...ل۔ ”بھائی! استری کتنے کی ہے؟“

...بابا! پہلے دیکھو تو سہی، پھر مول تول کرنا۔“ ...سے دو تین استریوں کے ڈبے نکال دیے۔ ...کی اوٹ میں کھڑی تھی۔ کندھے پر سے ...رنگ برنگ ڈبوں کو شوق سے دیکھ رہی ...بار بار اس پر اُٹھتی تھی اور جام دیدنوش ...میری طرف پلٹ آتی تھی۔ کالے کی سالی ...میری نظروں کی تپش تاڑ گئی۔ اُسے کہنی ...سے دیکھنے لگی۔ غزالہ نہ سمجھتے ہوئے ...کوئی سیٹ دکھائے۔“

...اس کی آواز سننے کو ترسے ہوئے تھے۔ ...اپنے سوانگ کو دفع کروں اور لپک کر

اُسے باہنوں میں دبوچ لوں۔ فوراً ہی اپنی خواہش کا گلا گھونٹتے ہوئے ٹی سیٹ نکالنے لگا۔ ساتھ ساتھ اپنے مال کی تعریفیں کرنے لگا۔ غزالہ اور اس کی سہیلی میدو ٹی سیٹ کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگیں جبکہ کالے بزدار کی بیوی نے استری والا ڈبا اُٹھا لیا، بولی۔ ”میں اپنے سائیں کو دکھانے کے لیے گھر لے جا رہی ہوں۔ وہ بجلی کے سامان کو سمجھتا ہے۔ تم اس کی قیمت بتاؤ۔“

عمومی طور پر پٹھان چیز کا کئی گنا زیادہ ریٹ مانگتے ہیں۔ خریداروں کو بھی ان کی اس پختہ عادت کا علم ہوتا ہے۔ وہ کئی گنا کم قیمت بتاتے ہیں۔ پھر مول تول کا مرحلہ آتا ہے۔ کئی بار سودا منسوخ ہوتا ہے۔ کئی بار نئے سرے سے نرخ بازی ہوتی ہے۔ میں نے منہ پھاڑ کر کہا۔ ”ایک نمبر جاپانی استری ہے...... اصل نیشنل...... دو ہزار سے کم نہیں ہوگا۔ اپنے گھر والے کو دکھا دو۔“

اس نے ڈبا زمین پر رکھ دیا۔ منہ بنا کر بولی۔ ”اتنی مہنگی...... نہیں بابا، ہمارا سودا نہیں بن سکتا۔“

میں نے ڈبا اُٹھا کر اس کے ہاتھ پر رکھا اور اکھڑ انداز میں کہا۔ ”اے بی بی! جاؤ، اپنے سائیں کو دکھاؤ۔ سودا نہیں ہوگا تو کوئی بات نہیں۔ دیکھنا تو مفت کا ہے ناں!“

میدو نے آنکھوں سے اشارہ کیا۔ وہ ڈبا اُٹھا کر گھر میں گھس گئی۔ میں نے موقع غنیمت جانتے ہوئے میدو کو مخاطب کیا۔ ”اے لڑکی! ایک گلاس پانی تو لاؤ۔ پیاس لگی ہے۔“

میں نے ایک ستائی سیٹ غزالہ کے ہاتھ میں تھما دیا۔ وہ میرے چکر میں آ گئی اور میدو کے پیچھے جاتے جاتے رُک گئی۔ میں نے کہا۔ ”اے لڑکی! تمہارا شادی ہو گیا ہے؟“

اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ اجنبی لہجے کا سوال ناگوار لگا۔ چہرہ متغیر ہوا۔ میں نے جلدی سے کہا۔ ”میرا مطبل (مطلب) ہے کہ......“

وہ ناک چڑھا کر بولی۔ ”تمہارا جو کوئی بھی مطلب ہے، اپنے پاس رکھ۔ یہ بتا کہ اس کا ریٹ کیا ہے؟“

مجھے اپنے آپ پر قابو رکھنا مشکل ہو رہا تھا۔ اس کا خوب صورت چہرہ غصے سے تمتما گیا تھا۔ مجھے یہ دیکھ کر افسوس ہوا کہ اس کے چہرے کی تاب و تمکنت پہلی سی نہیں رہی تھی۔ وہ نہ صرف ایک ہی شب میں اپنے کئی پیارے گنوا چکی تھی بلکہ اپنا گھر بار ہونے کے باوجود دست نگر ہو کر بخت خان کی حویلی میں رہائش پذیر ہو گئی تھی۔ میں نے پیار سے کہا۔ ”لڑکی! تم نے ایسے ہی غصہ کیا۔ اَم کو مافی (معافی) دو اور یہ

سیٹ دیکھو۔ یہ چار سو کا ہے۔ یہ ساڑھے سات سو کا ہے۔"

وہ دونوں ڈبے ہاتھ میں پکڑ کر کسی سوچ میں غرق ہو گئی۔ میں اس کی حالت سمجھتا تھا۔ اس کے پاس پیسے نہیں تھے۔ میں نے کہا۔ "کیا تیرے پاس پیسا نہیں ہے؟"

اس نے بڑی معصومیت سے نفی میں سر ہلایا۔ میرا دل دُکھا۔ میں نے کہا۔ "تمہارا باپ کیا کرتا ہے؟"

اس نے بتایا۔ "وہ اللہ کو پیارا ہو گیا ہے۔"

"ادھر، اسپتال کے سامنے کس کا بڑا سا حویلی ہے؟"

"وہ...... اچھا! وہ تو سردار یارن خان کی حویلی ہے۔"

"کیا وہ ایدھر رہتا ہے؟" میں نے پوچھا۔ "میرا مطبل ہے کہ وہ ایدھر زمیندارہ کرتا ہے؟"

"نہیں۔ وہ لاہور میں رہتا ہے مگر ان دنوں یہاں آیا ہوا ہے۔ کیا تم نے اس سے ملنا ہے؟"

"اَم اس سے کیا ملے گا، اَم تو غریب پھیری والا بندہ ہے۔ وہ امیر آدمی ہے۔" میں نے عاجزی دکھائی۔ "اَم تو ویسے ہی پوچھتا ہے۔"

جب تک میدو پانی بھرا گلاس لے کر نہیں آئی، میں نے اُسے بے سروپا باتوں میں اُلجھائے رکھا۔ پانی پینے کے بعد وہ دونوں زمین پر بیٹھ گئیں اور میرے سامان سے چھیڑ خانی کرنے لگیں۔ ان کی حرکات سے عیاں تھا کہ انہیں کچھ بھی خریدنا نہیں تھا۔ مجھے جو کچھ بیچنا تھا، میں ان کی لاعلمی میں بیچ رہا تھا اور مدت کے بعد جی بھر کر اپنی محبوبہ کو دیکھ رہا تھا۔ میدو کی بہن استری اُٹھائے لوٹی۔ بولی۔ "بھائی! یہ چار سو کی دو گے؟"

میں نے منہ بناتے ہوئے ڈبا اس کے ہاتھ سے لیا اور غصے سے کہا۔ "یہ چار سو کا استری ہے، تمہارا دماغ کام نہیں کرتا بی بی...... یہ جاپانی استری ہے۔"

مول تول کا روایتی مرحلہ درپیش ہو گیا۔ وہ سو پچاس کی سیڑھی پر اوپر چڑھ رہی تھی جبکہ میرا نرخ کم ہوتا جا رہا تھا۔ میں نے ڈبے پر ہاتھ مارتے ہوئے قدرے بلند آواز میں کہا۔ "تم نے پٹھان کا ریٹ سنا ہے، رعایت نہیں دیکھا۔ چلو، نکالو ایک ہزار روپیہ اور استری پکڑو۔"

غزالہ بولی۔ "خان! بس چھ سو......"

"اَم نے تو سو کا خریدا ہے، کیسے چھ سو کا دے دے؟"

"کوئی بات نہیں...... دے دو ناں!" وہ دوپٹا دانتوں میں دبا کر ہنستی ہوئی میدو سے چپک گئی۔ میرا دل گنگنایا، جب دباتے ہیں وہ دانتوں میں گلابی آنچل، کتنے پرکیف نظاروں کو سزا ملتی ہے۔ میں نے غزالہ کی شریر ادا پر

قربان جاتے ہوئے ہتھیار ڈال دیے۔ میدو... گھر گئی۔ نوٹ تھامے لوٹی۔ سو کے چھ نوٹ اپنی... جیب میں ڈالتے ہوئے میں نے جی بھر کر غزالہ... اپنا بکھرا ہوا سامان باندھنے لگا۔

وہ تینوں خوشی خوشی گھر میں گھس گئیں... آنکھوں کے سامنے غزالہ کی مسکراتی ہوئی صورت... ٹھہر گئی۔ یہ استری ہم نے حسین آغا ہی سے... خریدی تھی۔ پہلے سودے میں مجھے تین سو کا... ملنے والے نفع کا شمار ہندسوں میں نہیں کیا جا... نے جھوم کر ہوکا لگایا۔ "استری لے لو...... جاپانی..."

سوچا تھا کہ اسے دیکھنے سے دل کو قرار... اب سوچ رہا تھا کہ ایسے دیکھنے سے دل کا... رخصت ہو گیا تھا۔ میں نے سامان اُٹھایا، ا... ایک حسرت کناں نگاہ ڈالی اور آگے بڑھ گیا۔ ... سے کچھ فاصلے پر ایک پگڈنڈی سائیں جگ... مزار کی طرف جاتی تھی۔ راستے میں بائیں ہاتھ... جوہڑ اور گھنا جنگل واقع تھا جن کے درمیان ایک... چاچے چراغ کے مکان کی عقبی کھڑکی تک جاتی... پگڈنڈی پر چلتا ہوا، آوازیں لگاتا ہوا جوہڑ کے... آن رکا۔ چاچے چراغ کے سیاہ دیواروں والے... کھڑکی نظر آ رہی تھی جو بند تھی۔ وہ جلنے سے... چاچے اور چاچی کی شکلیں نظروں میں گھومنے لگیں... کیا بے بسی ان کی آنکھوں میں رچی ہو گی جب... کے شعلوں کو اپنی جانب بڑھتا دیکھ رہے ہوں گے... بچاؤ کے لیے ہاتھ پیر تک نہ ہلا سکے ہوں گے۔ میرے... میں الاؤ بھڑک اُٹھا۔ آنکھیں سلگ اُٹھیں۔ جی چاہا... بلوچ نگر جاؤں اور حیدر خان کے محل کو آگ لگا دوں... بھی شخص کو محل سے نکلنے نہ دوں۔ پاؤں من من... لگے تو میں گھسٹتا ہوا مزار کی عقبی چار دیواری کے... آیا۔ صحن میں چند لوگ موجود تھے جو قبر کی زیارت... آئے تھے۔ میں نے چکر کاٹا اور مزار کے احاطے... آ گیا۔ سب کچھ ویسا ہی تھا۔ اگر بدلا تھا تو اس... اقتدار کا سورج بدل گیا تھا۔ سائیں دل جیت... آغا نے لے لی تھی۔ وہ خانزادوں کا تعینات... تھا اس لیے انہی کے مفادات کے تحفظ میں... کی طرح ظلم اور جرم کی بھٹی تپائے رکھتا ہو گا... بسی کا احساس ہوا۔ میں نے سائیں دل جیت... دیا تھا مگر اس نظام کو...

غریبوں کا خون چوسنے کے لیے رائج کیا گیا تھا۔ میری ساری محنت اکارت گئی تھی اور محض چہرہ بدلنے کی حد تک جزوی کامیابی حاصل کر پائی تھی۔ ایک جواں سال لڑکی کو اپنی ماں کے ساتھ مزار کے دائیں کونے میں ایستادہ درخت پر سرخ اور سبز کپڑے کی ٹاکیاں باندھتے دیکھ کر دل سے ہوک نکلی۔ ابھی اس سلطنت میں لڑکیوں کو 'پروین' اور 'عاشی' بنانے کی روایت پورے دم خم سے موجود تھی۔

میرا بار بار رونے کو جی چاہتا تھا مگر رہ رہ کر اپنے کلر لینز کا خیال آ جاتا تھا۔ مزار سے نکلا تو صحن میں نورن آغا سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ شاید اُسے نہ پہچان پاتا مگر احاطے میں موجود معتقدین کی حرکات نے باور کرایا کہ وہی نورن آغا تھا۔ سادہ لوح اور لاعلم لوگ بڑی عقیدت سے اس سے سلام لیتے، اس کے ہاتھ چوم کر آنکھوں پر لگاتے اور الٹے قدموں پیچھے ہٹ کر راستہ دیتے۔ کھالے نے درست کہا تھا۔ وہ طویل قامت اور گوری رنگت والا خاصا وجیہہ شخص تھا۔ اس نے بے داغ لٹھے کا کرتا اور پاجامہ زیب تن کر رکھا تھا۔ شانوں پر لمبی اور بل دار زلفیں پھیلی ہوئی تھیں جبکہ ڈاڑھی اور مونچھوں کو کلف لگا ہوا تھا۔ آنکھوں میں سرمے کی فراوانی تھی۔ ہاتھ میں لمبی مگر خوب صورت تسبیح جھول رہی تھی۔ میں نے اس سے سلام کیا۔ وہ مربیانہ انداز میں مخاطب ہوا۔ "خان! کیا حال ہے؟ لگتا ہے، دور سے آئے ہو۔"

میں نے اثبات میں سر ہلایا، کہا۔ "اَم پشاور سے آیا ہے۔ مزدوری کرتا ہے۔"

میں نے اپنے سامان کی طرف اشارہ کیا۔ اس نے ایک نظر دیکھا، پھر بولا۔ "کیا تمہارے پاس گھڑیاں بھی ہیں؟"

"اَمارے پاس اصل سیکو فائیو گھڑی ہے...... میڈ اِن جاپان۔ دکھاؤں شاہ صاحب؟" میں نے پیشہ ورانہ مستعدی کا مظاہرہ کیا اور اس کے جواب دینے سے پیشتر اپنی گٹھڑی کھول لی۔ دو مختلف ڈیزائنوں کی گھڑیاں نکال کر اس کی ہتھیلی پر رکھ دیں۔ اس نے ایک گھڑی پسند کی۔ نرخ پوچھا۔ میں نے کہا۔ "اَم لوگوں کو تو دو ہزار بتاتا ہے۔ تم بڑا نیک آدمی ہے، اس لیے اَم تیرے کو پانچ سو کی دے گا۔"

وہ ٹھٹک گیا۔ شاید اسے یہ توقع تھی کہ میں اسے مفت گھڑی دے دوں گا۔ ارد گرد دیکھا۔ دو مریدین لپک کر قریب آ گئے۔ خوشامدی لہجے میں بولے۔ "آغا جی! بڑی خوب صورت گھڑی ہے۔ لینے کا ارادہ ہے؟"

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ایک مرید نے جلدی سے جیب میں ہاتھ ڈالا اور پانچ سو کے نوٹ گن کر میری طرف بڑھا دیے۔ یوں میرا دوسرا سودا بھی بک گیا۔ ادھیڑ عمر مرید نے گھڑی اپنے ہاتھ سے نورن آغا کی کلائی پر باندھی۔ میں نے اپنا سامان سمیٹا۔ نورن آغا مزار کے اندر جاتے جاتے رُک گیا، بولا۔ "سامان ادھر پڑا رہنے دو۔ اے بھائی! تھوڑی دیر کے لیے پٹھان کے سامان کا خیال رکھو۔"

اس نے میرا ہاتھ تھاما اور ہال کی طرف بڑھا۔ ہال میں چند افراد موجود تھے۔ سائیں دل جیت کے دور کا منظر سجا ہوا دیکھ کر میرے ہونٹ بھنچ گئے۔ نورن آغا میرے دل کی زیروزبر ہوتی دنیا سے بے خبر مجھے لیے حجرے میں گھس گیا۔ بیٹھنے کے بعد بولا۔ "پٹھان! تمہارے پاس کون کون سا سودا ہوتا ہے بیچنے کے لیے؟"

میں اس کے انداز پر گڑبڑا گیا۔ اس کی آنکھوں میں عجیب اور معانی خیز چمک دیکھ کر ہوشیار ہو گیا، پوچھا۔ "شاہ صاب! حکم کرو، کیا چاہیے؟"

وہ بولا۔ "جوان کرنے والا کوئی سودا ہے تمہارے پاس؟ یعنی ایک نمبر......" اس نے ایک بدنام زمانہ دوائی کا نام لیا اور میری طرف جھکتے ہوئے رازدارانہ انداز اختیار کر لیا۔ "میرا مطلب ہے کہ وہ دوائی جو تھکاوٹ اور ضعف پر جوانی کی چادر ڈال دیتی ہے۔"

وہ بلاشبہ کمینہ صفت انسان تھا۔ میں نے چھاتی تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ "شاہ صاب! اَم کو کھل کر بتاؤ، تیرے کو کیا پریشانی ہے۔ ہر مرض کا علاج یہ دوا نہیں ہوتا۔ اَمارے پاس ایک نمبر مال ہوتا ہے، ہر قسم کا۔"

اخلاق کے دائرے میں رہ کر جتنا کھل کر بتایا جا سکتا ہے، وہ بتا چکا تھا۔ میرے اکسانے پر اس کی سرمہ بھری آنکھوں میں چمک کے ساتھ ساتھ بے شرمی کھل گئی اور زبان کا تمام تر فساد لفظوں میں تحلیل ہونے لگا۔ وہ جوانی کی دہلیز عبور کر چکا تھا۔ ڈھلتی ہوئی پچی کلائیوں پر اس کے نچڑے ہوئے اعصاب کانپنے لگتے تھے۔ وہ عمر کے لحاظ سے بوڑھا نہیں ہوا تھا مگر دشتِ گناہ میں دوڑتے دوڑتے ہانپنے لگا تھا۔ وہ عمرِ رفتہ کو آواز دیتا تھا اور چاہتا تھا کہ کوئی ایسا دائرۂ طلسم میں اُتر جائے جو آناً فاناً برف میں آگ لگا دے اور اس کی ہوس کے گھوڑے پر طاقت کی زین رکھ دے۔ میں جانتا تھا کہ رکابوں سے نکلا ہوا پیر کبھی منہ زور گھوڑے کو ایڑ نہیں لگا سکتا مگر اسے تسلی آمیز دعووں سے پرت در پرت کھولتا گیا۔

مجھے اس کے بہروپ میں چھپے ہوئے اصل روپ کو دیکھ کر گھن آ رہی تھی۔ معصوم لوگوں کے عقائد سے کھیلنے کے

ساتھ ساتھ ان کی عصمت سے بھی کھل کھیلنا چاہتا تھا۔ قدرت نے اس سانپ کا زہر ختم کردیا تھا اور وہ میری دہلیز پر گر کر نیا زہر مانگ رہا تھا۔ میں نے اُسے کہا۔ ''تم فکر نہ کرو شاہ صاب! اَمارے پاس بہت تیز دارو ہے۔ ایک دم فسٹ کلاس...... مگر وہ اس وقت اَمارے پاس نہیں ہے۔ اگلے ہفتے آئے گا تو ساتھ میں لائے گا۔ خُو تھوڑا مہنگا ہوگا۔''

اس کا چہرہ کھل اُٹھا، بولا۔ ''پیسوں کا فکر نہ کرنا۔ زیادہ لانا مگر ہو ایک نمبر ورنہ کوئی فائدہ نہیں۔''

میں نے ہامی بھری، دل ہی دل میں نورن آغا پر چار حروف بھیجے اور حجرے سے نکل آیا۔ یکبارگی جی چاہا کہ مزار کے احاطے میں موجود تمام مرد و زن کو مجتمع کروں اور انہیں بتاؤں کہ جس شخص کے پاس وہ اپنی جوان بہو بیٹیاں بغیر کسی جھجک کے بھیج دیتے ہیں، اس کی طلب کیا ہے؟ گلا پھاڑ پھاڑ کر بتاؤں کہ وہ جس شخص کو اللہ کا نیک اور برگزیدہ بندہ سمجھتے ہیں، وہ انسانیت کی ہر سطح سے گرا ہوا شخص ہے اور ان کی عصمتوں کو روندنے کے لیے دواؤں کا سہارا ڈھونڈتا پھرتا ہے۔ میں اسے بیچ چوراہے برہنہ کرنا چاہتا تھا مگر یہ میرے بس کی بات نہیں تھی۔ علم تھا کہ ایسی ہر کوشش رائیگاں جائے گی اور لوگوں کی آنکھوں پر بندھی ہوئی عقیدت کی دبیز پٹی انہیں کوئی حقیقی منظر نہیں دیکھنے دے گی۔

میں نے بارہ بجے کے قریب یارن خان کی حویلی سے سرمئی رنگ کی لینڈ کروزر نکلتے دیکھی۔ کالے شیشوں کی وجہ سے اندر بیٹھے ہوؤں کو نہ دیکھ پایا۔ گاڑی پرانے ماڈل کی تھی مگر کنڈیشن وائز بہت بہتر تھی۔ میں مسجد کے سامنے کھڑا تھا جب وہ موڑ مڑ کر نوری چوک کی طرف تیزی سے بڑھ گئی۔ مجھے اپنی سواری کے نہ ہونے کا قلق ہوا۔ اگر میرے پاس گاڑی ہوتی تو میں اس کے پیچھے لگا دیتا اور دیکھتا کہ وہ کہاں جا رہا تھا۔ کھالے نے درست کہا تھا۔ میں بے دست و پا نورپور میں اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوسکتا تھا۔ امان اللہ قریشی کی حویلی کے سامنے پہنچا تو کھالا نظر آ گیا۔ وہ اپنے کھوکھے کی دکان کے چھپر تلے کولہوں پر ہاتھ رکھے کھڑا تھا۔

طے شدہ پروگرام کے تحت میں اُسے اشارہ کرتے ہوئے پلٹ کر مراد بخش دیوانے کے گھروندے پر پہنچ گیا۔ وہ غیر متوقع طور پر اپنی دکان پر تھا۔ اس کے پاس افسر علی اور کالا بزدار بیٹھے ہوئے تھے۔ دیوانہ بلند آواز میں کہہ رہا تھا۔ ''پھر کیا ہوا؟ بس...... سرگی ویلا، جنگل بیلا، جائے نماز پہ بیٹھا ہی تھا کہ میرا دل بھر آیا۔ میں نے ہاتھ پھیلائے، چہرہ سوئے فلک بلند کیا اور ملتجیانہ انداز میں اپنے رب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ اے مالک! مجھ پر اپنا خاص کرم فرما۔ میں تیرے آگے جھولی پھیلائے بیٹھا ہوں جبکہ ساری دنیا سو رہی ہے...... ایسے ہی وقت میں میرے عقب میں کم بخت بڈھے مردار شریف چکی والے کی غصیلی آواز گونجی۔

''اوئے کیں اوتری ماء دا پترا! اپنی دعا منگ، ساڈیاں چغلیاں تے نہ کرا!''

(لاوارث ماں کے بچے! اپنی دعا مانگو، ہماری چغلیاں تو نہ کرو)

دیوانے کا مخصوص اندازِ بیاں سن کر میرے لیے اپنا قہقہہ دبانا مشکل ہوگیا۔ میری آواز سن کر تینوں چونک گئے۔ مجھے دیکھ کر کالے بزدار نے کہا۔ ''اوئے پٹھان! تم اس بھکے تت شاعر کے پاس کیا لینے آئے ہو؟ جاؤ، اپنی روٹی روزی کرو۔ ان تلوں میں تیل نہیں ہے۔''

میں اس کا مطلب سمجھ گیا تھا مگر جان بوجھ کر ہونقوں کی طرح اسے دیکھنے لگا گویا میں اس کے جملے کو سمجھ نہیں پایا تھا۔ دیوانے نے ہاتھ لہرا کر اپنے انداز میں کالے بزدار کی بات کا متن سلیس زبان میں سمجھایا۔ میں نے بے پروائی سے سر جھٹکا اور کہا۔ ''اَم تھوڑا دیر آرام کرنے کو ادھر آیا ہے۔ تھوڑا دیر بیٹھنے دو اَم کو، اَم تھک گیا ہے۔''

دیوانے نے مجھے چوبی چوکی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور اپنی بات، جہاں پر چھوڑی تھی، وہیں سے چھیڑ دی۔ ''سردار یارن خان اور اس کے پروہنے شکاریوں نے رضائی میں دبکے شریف چکی والے کی بات سن لی۔ پھر تو وہ قہقہہ پڑا کہ میرا خون جل گیا۔ جی چاہا کہ پوپلے منہ والے بڈھے شریف کو ایسا ہاتھ دوں، ایسا کہ وہ مہینا بھر پرہیزی دلیا کھاتا رہے۔''

کھالا کھانستا ہوا گھروندے میں داخل ہوا۔ سلام دعا کے بعد دیوانے کی روزی کے اڈے پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ اس کا انداز متردد تھا۔ ادھر اُدھر کی باتوں کے بعد اس نے دیوانے کو پٹڑی پر چڑھا لیا اور یارن خان کا تذکرہ چھیڑ دیا۔ وہ غیر محسوس انداز میں اس کی سرگرمیوں کو کرید رہا تھا اور دیوانہ احساسِ تفاخر سے یارن خان کے بارے میں بڑھ چڑھ کر بتا رہا تھا۔ افسر علی اور کالا بزدار یارن خان کے ناوقت تذکرے پر بور ہو کر اُٹھ گئے۔ مجھے بھی مایوسی ہوئی۔ کھالا اس سے کوئی کارآمد بات، ماسوائے اس کے کہ یارن خان گزشتہ تین چار دنوں سے باہر نہیں نکلا تھا، کچھ اگلوانے میں کامیاب نہیں ہوسکا تھا۔ رات کو ہم دونوں نے اندازہ کیا تھا کہ دیوانہ بھی اپنا عاجزانہ کلام سنا کے خوشامد کرنے چار

[illegible] اور گلہری کی طرح آنیاں جانیاں دکھانے تک محدود رہتا تھا۔ اس نے یارن خان کا حقیقی رُخ کبھی نہیں دیکھا تھا اور نہ ہی دلچسپی رکھتا تھا۔ کھالے نے تذکرہ بدل دیا، بولا۔ ''اپنے شہرے خان کی کوئی خیر خبر؟''

دیوانے نے ٹھٹک کر اُسے دیکھا پھر ٹھنڈی آہ بھر کر بولا۔ ''نہیں یار! اس بے چارے کا تو نورپور میں ٹڑی ڈنہ (گا چھا) ہی ختم ہوگیا۔ نہ جانے کس حال میں ہوگا۔''

کھالا سانس لے کر بولا۔ ''تم نے مجھے اس کا پیغام دیا تھا کہ جمعہ کے روز قلعہ کہنہ قاسم باغ میں وہ میرا انتظار کرے گا۔ مجھ سے جایا نہ جاسکا۔ بعد میں رابطے کی کوئی سبیل ہی نہیں نکلی۔ سنا ہے کہ اس نے سردار حیدر خان پر قاتلانہ حملہ کیا تھا جس کا پرچہ چوک قریشی والے تھانے میں بڑے خان نے کٹوا رکھا ہے۔ کہتا ہے کہ جہاں بھی نظر آیا، پکڑ کر ہڈیوں پسلیوں کا سرمہ بنوا دوں گا۔''

میرے جبڑوں کے اعصاب کھنچے، دانت کڑکڑائے مگر میں نے اُٹھ کر پانی پینے کے بہانے اپنے چہرے کے بدلتے ہوئے تاثرات کو ان دونوں سے چھپایا، کھالا بولا۔ ''کبھی یارن خان نے شہرے کے بارے میں تم سے کچھ پوچھا؟''

''کوئی ایک بار...... اس نے کئی بار مجھ سے شہرے کے بارے پوچھا۔ بولتا تھا کہ وہ بڑا اپیا منڈا (لڑکا) تھا۔ پتا نہیں کس کی نظر لگ گئی۔ اس نے میرے ذمے لگایا تھا کہ جہاں بھی شہرا ملے، اس کے پاس پہنچا دوں۔ وہ اسے اپنی حویلی میں رکھے گا اور دیکھے گا کہ حیدر خان اس پر ہاتھ ڈالنے کی جرأت کیسے کرتا ہے۔'' دیوانے نے کہا۔ ''مگر افسوس! اس کا کوئی اَتا پتا نہیں ہے۔ میں اسے تلاش کرنے کے لیے ہر روز ملتان بھی تو نہیں جاسکتا۔''

''اگر میں تمہیں اس کا نواں پتا دوں تو اس سے ملنے جاؤ گے؟'' کھالے نے ٹٹولا۔

''ہاں! مگر شاید نہیں۔ یار! میں اس قضیے میں نہیں پڑنا چاہتا۔ پتا نہیں یارن خان اس کے ساتھ کیا سلوک کرے۔ یہ نہ ہو کہ شہرا خان کی وجہ سے مجھ سے بدگمان ہو جائے اور دونوں کی یاری پر حرف آئے۔'' دیوانے نے اپنی گردن کو مخصوص انداز میں اکڑایا تو میرے لبوں پر بڑی جاندار مسکراہٹ ابھر آئی۔ وہ بولا۔ ''کھالے اُستاد! ایک بات ہے، شہرا وہ نہیں رہا، جو نورپور میں ہوا کرتا تھا۔ یارن خان کہہ رہا تھا کہ اس نے حیدر خان کو نتھ ڈال دی ہے۔ تم جانتے ہو کہ حیدر خان کوئی معمولی بندہ نہیں ہے۔ جو اُسے نتھ ڈال سکے، وہ کتنا طاقتور ہوگا۔ خانزادی کے اغوا میں بھی اس کا ہاتھ تھا۔ یارن خان کی طرح مجھے یقین ہوگیا ہے کہ شہرے کی بہن کو حیدر خان نے امیر نواز کی مدد سے اُٹھایا تھا۔''

''کیا خبر، ایسا ہی ہو؟'' کھالے نے گول مول جواب دیا اور پھر میری طرف متوجہ ہوا، بولا۔ ''اوئے پٹھان! تمہارا نام کیا ہے؟''

''گلاب خان!'' میں نے اکھڑ لہجے میں جواب دیا۔

دیوانہ میری طرف جھکا، مضحکہ خیز انداز میں مجھے سونگھنے کے بعد بولا۔ ''گلاب؟ تیرے پاس سے خوشبو تو آتی نہیں۔''

میں نے جھٹ سے کہا۔ ''خو! تم نے کبھی گلاب جامن کھایا ہے؟''

''ہاں...... کھایا ہے۔ کیا ہوا اُسے؟'' دیوانہ متجسس ہوا۔

''اس میں نہ گلاب ہوتا ہے، نہ گلابی رنگ...... اَم نے سونگھ کر دیکھا تھا۔ گلاب کا خوشبو بھی نہیں ہوتا۔ اس میں جامن بھی نہیں ہوتا۔ تم پنجاب کا رہنے والا اُسے گلاب جامن کیوں بولتا ہے؟'' میں نے دانش ورانہ انداز میں کہا تو دونوں ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔

کھالا بولا۔ ''دیوانے! یہ پٹھان نہیں، پٹھانوں کا سائنس دان ہے۔ کیا سمجھے؟ اب کیسٹ کی دوسری سائڈ لگاؤ اور نیا پشتو گیت سنو۔''

دیوانے نے ستائش آمیز نظروں سے مجھے گھورا، کھالا بولا۔ ''اوئے دیوانے! یہ تمہارے پاس بیٹھا کیا کر رہا ہے...... میری مانو تو اسے دو چار قاتلانہ قسم کے دوہڑے مارو اور اسے بگٹٹ بھاگتا دیکھو۔''

دیوانے نے ایک ذرا غصے سے کھالے کو دیکھا۔ ''کوئی دوہڑا سنا کر تمہارے کلیجے میں چھید کیوں نہ کر دوں؟''

کھالا تمسخرانہ انداز میں ہنسا تو دیوانے کو غصہ آ گیا۔ گردن اکڑ گئی۔ مونچھیں پھڑ پھڑانے لگیں اور شعلہ بار نظروں سے کھالے کو دیکھ کر اپنی سلائی مشین پر جھک گیا۔ کھالے نے مجھے گھروندے سے نکلنے کا اشارہ کیا۔ میں نے سامان اُٹھایا اور دیوانے کو مخاطب کیا۔ ''اوئے درزی! تم نے کچھ خریدنا ہے۔ ٹی سیٹ، واٹر......''

میں نے سانس لیے بغیر اپنی چلتی پھرتی دکان کا بھلا سامان گنوا دیا۔ دیوانہ آنکھیں پھاڑے سنتا رہا پھر نتھنے پھلا کر بولا۔ ''غضب خدا کا، تو پھیری والا ہے یا آٹو ریورس ٹیپ پلیئر...... کچھ نہیں لینا میں نے۔ جا، اپنا کام کرو۔ میرا دماغ چاٹنے کے لیے یہ منحوس ڈرائیور ہی کافی ہے۔''

گھروندے سے نکل کر میں اور کھالا آگے پیچھے چلتے

ہوئے بخشو لوہار کی دکان پر پہنچے۔ کھالے کو دیکھتے ہی اس کے باپ نے اڈا چھوڑ دیا اور تہبند سنبھالتے ہوئے بولا۔ ''پتر! میں ذرا حیات خان کے دارے پر جا رہا ہوں۔ تب تک تم ادھر بیٹھ جاؤ۔''

بخشو نے دکان سے نکلتے ہوئے اچٹتی ہوئی نگاہ مجھ پر ڈالی اور نظر انداز کرتا ہوا باہر نکل گیا۔ وہ اپنی عادت کے مطابق برہنہ پا تھا۔ گاؤں کے اکثر بوڑھے، جو گاؤں تک محدود رہتے تھے، ننگے پاؤں پھرا کرتے تھے۔ کھالا اور میں چھپر تلے چارپائی پر بیٹھ گئے اور میں نے آتے جاتے لوگوں کی توجہ سے بچنے کے لیے اپنا سامان کھول کر پھیلا دیا۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ دیکھنے والے یہی سمجھتے کہ کھالا کچھ خریدنے کے لیے مجھے گھیرے بیٹھا تھا۔ میں نے آہستگی سے کہا۔ ''کھالے! میں نے غزالہ کو دیکھ لیا ہے۔''

ساتھ ہی میں نے اس سے ہونے والی ادھوری ملاقات کا احوال حسرت بھرے لہجے میں کہہ سنایا، وہ بولا۔ ''بہتر یہی کہ اپنی پھوپو اور غزالہ کو یہاں سے نکال لے جاؤ۔ ان کے حصے کی روٹی رب کی ذات دیتی رہے گی۔''

مجھے روٹی کی فکر نہیں تھی۔ یہ وہم لاحق تھا کہ وہ میرا ساتھ نہیں دیں گی اور نور پور کو خیرباد نہیں کہیں گی۔ تبھی میں نے انہیں لے جانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ میں نے کہا۔ ''تم نے دیوانے کی بات سنی تھی؟ کہہ رہا تھا کہ بڑا خان کئی دنوں سے حویلی سے نہیں نکلا۔ کیا اس کا یہ مطلب نہیں کہ میرا مدعا حویلی میں موجود ہے۔''

کھالے نے نفی میں سر ہلایا۔ ''نہیں یار! خان ایسی حماقت نہیں کر سکتا۔ بڑا سیانا کاں (کوا) ہے۔ جانتا ہے کہ اس نے کسی معمولی شخص پر ہاتھ نہیں ڈالا۔ اسے یقیناً اندازہ ہوگا کہ میڈم شکیلہ زخمی ناگن کی طرح پھنکارتی پھر رہی ہوگی۔ تبھی بچاؤ کی نیت سے حویلی تک محدود ہو گیا ہے۔''

''بس کھالے! میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ آج رات کو یارن خان کے نرخرے پر ہاتھ رکھوں گا۔'' میں نے اس کی تاویل کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ ''میڈم کچی گولیاں نہیں کھیلتی۔ اسے علم تھا کہ مجھے نور پور سے کچھ ہاتھ لگنے والا نہیں ہے۔ تب بھی اس نے رسی کا سانپ بنا کر ڈرایا اور روانہ کر دیا۔ لامحالہ اس نے میرے سامنے چیلنج رکھا ہے۔ وہ دیکھنا چاہتی ہے کہ میں اسلحہ اور اس کے زیرک ساتھیوں کے بغیر بھی کچھ کر سکتا ہوں یا نہیں۔ اپنے آپ کو ثابت کرنے کے لیے مجھے ہاتھ پیر ہلانا ہوں گے۔''

وہ سپاٹ لہجے میں بولا۔ ''تم بضد ہو تو میں تمہاری راہ میں رکاوٹ نہیں بنوں گا۔''

مجھے اس کی بے نیازی بری لگی، کہا۔ ''کھالے! اس کے علاوہ کوئی چارہ بھی تو نہیں ہے ناں!''

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ کافی دیر تک سر جھکائے ایک ٹی سیٹ سے کھیلتا رہا۔ توقف کے بعد سر اٹھا کر مستفسر ہوا۔ ''خانزادی کا کیا بنا؟''

میں سمجھ گیا کہ اس کا اشارہ حیدر خان کی بیٹی اسما کی طرف تھا۔ میں نے بتایا۔ ''اسے میڈم نے لمبے سفر پر روانہ کر دیا تھا۔ وہ میاں دلبر حسین کی تحویل میں ہے۔''

میں نے دیکھا کہ میری بات سن کر کھالے کا رنگ پل بھر کو متغیر ہوا، مگر فوراً سنبھل گیا، بولا۔ ''شہرے! تمہاری مالکن نے اچھا نہیں کیا۔ خانزادی کا چہرہ جب بھی میری آنکھوں کے سامنے آتا ہے تو دل کٹنے لگتا ہے۔ تمہیں معلوم تو ہوگا کہ وہ کہاں ہوگی اس وقت؟''

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''مجھے نہیں پتا، میرا خیال ہے کہ میڈم کو بھی علم نہیں ہوگا کہ میاں دلبر حسین نے اسے کہاں رکھا ہوگا۔''

''وہ بے غیرت میاں دلبر کوئی گیم کھیل رہا ہے یا بس وہی منہ کالا کرنے والا چکر ہے؟'' وہ اپنے اندیشوں کو زبان نہ دے سکا۔

میں نے پھر کندھے اچکائے۔ ''میں اس بارے میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ چھوڑو اسے! یہ بتاؤ، تمہارے پاس کوئی پستول ہے؟''

اس نے انکار کیا، کہا۔ ''شہرے! میں پھر کہتا ہوں کہ باز آ جاؤ اور ملتان لوٹ جاؤ۔''

''ڈاکٹر شاہ جی کا کچھ پتا چلا؟'' میں نے اس کا مشورہ ایک کان سے سنا اور دوسرے سے نکال دیا۔ وہ ابھی تک مجھے نور پور کا بھولا بھالا شہر یار سمجھ رہا تھا، نہیں جانتا تھا کہ پیا جی اور میڈم کی سنگت نے میری جون بدل ڈالی تھی۔ اس نے مجھے بتایا کہ نہ اس نے ڈاکٹر منور علی شاہ کو تلاش کرنے کی کوشش کی اور نہ اس کا کچھ پتا چلا، بولا۔ ''سمجھو، اس کی کہانی ختم ہو گئی۔ وہ جب تک یہاں تھا، ہمارا دوست تھا۔ جی پلٹ کر آئے گا، یہ خام خیالی ہے۔ سرکاری افسر اور کنجری...... دونوں پلٹ کر دیکھنے کے عادی نہیں ہوتے۔''

میں نے اپنا سامان باندھنا شروع کر دیا۔ اس نے اپنی پنڈلی کے ساتھ بندھا ہوا تیز دھار خنجر کھولا اور مجھے تھما دیا، بولا۔ ''شہرے! استاد عاشق ویگن کا پھیرا لے کر آ گیا ہی ہوگا۔ میں اس کے ساتھ [illegible] چلا جاؤں گا [illegible] کا آخری پھیرا مجھے ہی لانا ہوگا۔ اگر تم حویلی پر دھاوا بولنا چاہتے ہو تو تمہاری مرضی۔ تم اپنا بندوبست کر لینا کیونکہ میں تمہیں رات کو اپنے گھر سلا نہیں سکوں گا۔ مجبوری ہے۔ اگر معاملہ بگڑ گیا تو یارن خان میرے گھر والوں کو دیواروں میں چنوا دے گا۔ سمجھ رہے ہو ناں میری بات؟''

میں نے چونک کر اسے دیکھا، پھر خنجر کو۔ کھالے کے چہرے پر ندامت کا عکس لہرا رہا تھا جبکہ خنجر کے چمکدار پھل پر خون کی پیاس چمک رہی تھی۔ یہ وہ خنجر نہیں تھا جس سے کھالے نے مجھے اپنے کمرے میں بلو کے ساتھ دیکھ لینے پر زخمی کیا تھا۔ ان حالات میں یہ خاموش اسلحہ میرے لیے بڑا فائدہ مند تھا۔

کھالے کی ندامت تحلیل کرنے کے لیے میں نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔ ''فکر نہ کرو یار! میں اپنا بندوبست کر لوں گا۔''

ایسے میں ویگن کے ہارن کی آواز کانوں میں پڑی۔ وہ اب تب میں پہنچنے والی تھی۔ میں نے کھالے سے ہاتھ ملایا، غزالہ کا خیال رکھنے کی تاکید کی اور آزردہ لہجے میں الوداع کہا۔ مجھے گھر میں ٹھہرانے سے معذرت کے سبب وہ شرمسار دکھائی دے رہا تھا حالانکہ میں نور پور میں بہ آسانی نصف شب تک کا وقت گزار سکتا تھا۔

مجھے بھوک لگی تھی۔ چونکہ مجھے معلوم تھا کہ سردار وریام خان کے دارے پر مسافروں کو کھانا دیا جاتا تھا اس لیے وہاں پہنچ گیا۔ سرخ و سپید اور دراز قامت وریام خان دارے میں اپنے روایتی کروفر سمیت جلوہ افروز تھا۔ اس نے ایک نظر مجھے دیکھا اور کڑک دار آواز میں پوچھا۔ ''ہاں بھئی پٹھان! کیسے آئے ہو؟''

میں نے پیشانی پر ہاتھ رکھ کر احمقانہ انداز میں سلام کیا اور کہا۔ ''صاب! ام کو بھوک لگا ہے۔ کھانا مانگتا ہے۔''

اس نے اپنے نوکر ملنگی کو ہاتھ کے اشارے سے مجھے کھانا کھلانے کا حکم دیا اور مہمانوں سے محو کلام ہو گیا۔ میں ایک طرف بیٹھ کر اسے دیکھنے لگا۔ اس نے حسب معمول بوسکی کا بے داغ سوٹ اور پیروں میں تلے دار کھسہ پہن رکھا تھا۔ باتیں کرنے کے دوران وقفے وقفے سے عادتاً مونچھوں کو تاؤ بھی دے رہا تھا۔ مجھے وہ وقت یاد آ گیا جب اس نے اپنی پوری فرعونیت سمیت اسی جگہ پر مجھے بے عزت کرتے ہوئے ڈاکٹر شاہ جی کی بے جا معاونت کے جرم میں سخت سست کہا تھا۔

ملنگی کھانا لے آیا۔ اسٹیل کی ٹرے میرے سامنے رکھ کر چارپائی پر بیٹھ گیا اور مجھ سے میرا نام پتا پوچھنے لگا۔ کھانے کا معیار اتنا اچھا نہیں تھا مگر سائیں جگ جیت کے مزار پر بٹنے والے لنگر سے بدرجہا بہتر تھا۔ میں نے سیر ہو کر کھایا اور پانی پی کر چارپائی پر لیٹ گیا۔ وریام خان نے اپنے ڈیرے کو آباد رکھنے اور اپنے جاگیردارانہ جاہ و جلال کو دوآتشہ کرنے کے لیے یہی اچھا کام کر رکھا تھا۔

سہ پہر کو میں دارے سے نکلا اور نور پور کی گلیوں میں گھومنے پھرنے لگا۔ نجانے میرے اندر کتنی تشنگی بھری ہوئی تھی کہ ایک گلی سے کئی کئی مرتبہ گزرنے کے بعد بھی دل بھرنے کو نہیں آتا تھا۔ میں نے یارن خان کی حویلی کے کئی چکر لگائے۔ کئی مرتبہ اس کی لینڈ کروزر کو حویلی سے نکلتے اور داخل ہوتے دیکھا۔ حویلی کا گوشہ گوشہ میرا دیکھا بھالا تھا۔ اس کا کمرا کمرا میں نے دیکھ رکھا تھا۔ مگر آج تک اس نظر سے نہیں دیکھا تھا، جس نظر سے آج دیکھ رہا تھا۔ یارن خان کی آمد نے حویلی کے جاہ و جلال میں اضافہ کر دیا تھا ورنہ کچھ بھی بدلا ہوا نہیں تھا۔ دل بدقسمت رہا کہ اس کی تشنہ کامی کو غزالہ کا دوسرا دیدار نصیب نہیں ہوا تھا۔

شام تک میں نے کئی اشیا اونے پونے بیچ کر اپنا وزن کم کر لیا۔ سائیں جگ جیت شاہ کے مزار کے لنگر خانے میں بھوک کا درماں کیا اور اپنے ڈیرے کی طرف نکل گیا۔ میرا ڈیرا بے آباد نہیں تھا۔ مال ڈنگر موجود تھے۔ جس جگہ پر میں نے سائیں دل جیت کی چتا جلائی تھی، وہ جگہ اب بھی سائیں کے کرتوتوں کی طرح سیاہ پڑی تھی۔ میں ڈیرے میں موجود جھلنگا سی چارپائی ٹوکے والے چھپر میں ڈال کر لیٹ گیا۔

چونکہ میں اپنا میک اپ محفوظ رکھنے کے لیے علی الصباح نہایا نہیں تھا اس لیے چاق و چوبند نہیں تھا۔ سردی کافی تھی۔ تن پر اوڑھنے کے لیے رضائی یا کمبل نہیں تھا۔ میں نے چارے والی چادر کھینچ کر اپنے اوپر ڈال لی۔ اپنی پگڑی بھی کھول کر اوڑھ لی۔ کچھ سکون ہوا۔ پھر رات کے گہرے ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ چونکہ میرے ذہن میں کوئی لائحہ عمل تیار نہیں تھا اس لیے میں نے انجام کے خوف سے جان چھڑا کر براہ راست سردار یارن خان پر ہاتھ ڈالنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ شاید میڈم بھی یہی چاہتی تھی۔

نور پور میں اجنبیوں کی طرح طویل وقت گزارنے کے بعد مجھے احساس ہوا تھا کہ جدائی بہت بڑا خلا پیدا کر دیتی ہے۔ اتنا بڑا...... کہ شاید زندگی بھر نہیں بھرتا۔

☆☆☆

میں نے اپنا ڈھیلا ڈھالا لباس اور بچ جانے والا سامان سائیں جگ جیت شاہ کے مزار کے پچھواڑے والے گھنے جنگل میں چھپایا تاکہ واپسی پر اگر مجھے اس سامان کو اُٹھانے کی مہلت نہ بھی ملی تو یہ فوری طور پر کسی کی نگاہ میں نہیں آئے گا۔ کوئی ایک بجے کا عمل تھا جب میں بجی نائی اور اسلم مغل کے گھروں کا چکر کاٹ کر یارن خان کی وسیع و عریض دو منزلہ حویلی کے عقب میں پہنچ گیا تھا۔ میں نے کھالے کا دیا ہوا خنجر نکال کر ہاتھ میں پکڑا اور پانچ چھ فٹ اونچی دیوار عبور کر کے حویلی کے عقبی لان میں کود گیا۔ اس جانب چنبیلی، مور پنکھ، سرو اور گلاب کے ان گنت پودے اور گھنے درخت موجود تھے جن سے بچ کر چلتا ہوا میں حویلی کی جانب بڑھتا چلا گیا۔

مطلع صاف ہونے کی بدولت سرد رات کے دامن میں چاند کا شوخ اُجالا پھیلا ہوا تھا۔ ہر چیز صاف دکھائی دے رہی تھی۔ میں جھکے جھکے انداز میں قوس کی شکل کی وسطی کیاری میں سے گزر رہا تھا کہ میرے کانوں میں بل ٹیرر کتے کی غراہٹ پڑی۔ یک لخت میرے اعصاب تن گئے۔ دیوانے نے بتایا تھا کہ حویلی میں چار خونخوار کتے شب بھر دندناتے رہتے تھے۔ ان کتوں کو وہ لاہور سے اپنے ہمراہ یہاں لایا تھا۔

مجھے ان کتوں کا خاطر خواہ انتظام کرنا یاد نہیں رہا تھا۔ اب پچھتا رہا تھا۔ غراہٹ سے اندازہ ہوا تھا کہ ایک یا زیادہ کتے میرے کہیں قریب موجود تھے۔ میں سنتھے کی باڑھ میں دبک گیا اور کھوجتی نظروں سے چہار سو دیکھنے لگا۔ اچانک مجھ پر افتاد آن پڑی۔ وہ خاصا قد آور اور صحت مند کتا تھا جو نجانے کہاں سے نکل کر مجھ پر کود گیا تھا۔ اس کے پنجے تو چست لباس کی وجہ سے مجھے زخمی نہ کر سکے مگر اس کے خونخوار دانت میرے بازو کی مچھلی میں پیوست ہو گئے۔ میں بہ مشکل دانت بھینچ کر چیخ کو دبانے میں کامیاب ہو سکا تھا۔ درد کی تیز اور کٹیلی لہر میرے تن بدن میں سرایت کر گئی۔

اس کے حلق سے نکلنے والی ڈراؤنی خرخراہٹ اس کی دہشت میں اضافہ کر رہی تھی۔ میں نے اُسے ایک دو مرتبہ جھٹک کر اپنے اوپر سے اُتار پھینکنا چاہا مگر کامیابی نہیں ہوئی۔ وہ اپنے جبڑے کو جھٹکے دے رہا تھا اور اس کے نوکیلے دانت لحظہ بہ لحظہ میرے گوشت میں گھستے جاتے تھے۔ یہ صورت حال بہت خطرناک تھی۔ میں نے اچانک پینترا بدلا اور اسے نیچے کی جانب جھکاتے ہوئے خنجر کی مدد سے اُس کا نرخرہ کاٹ دیا۔ خون کا فوارا نکلا جو میری احتیاط کی بدولت سیدھا زمین پر گرا۔ اگر میں نے اسے ایک طرف جھکا نہ دیا ہوتا تو میرا لباس خون سے تر ہو چکا ہوتا۔

اس کے دانت میرے بازو میں گڑے ہوئے تھے۔ جونہی نرخرہ کٹا، وہ بری طرح تڑپا اور میرا ماس بھنبھوڑتا ہوا زمین پر گر گیا اور زور زور کے جھٹکے لینے لگا۔ میں نے بے ساختہ کندھے سے نیچے بازو کو زور سے تھاما۔ میرا ہاتھ چپچپا گیا۔ خون بہہ رہا تھا۔ جلن اور تکلیف ناقابلِ بیان تھی۔ میں نے ہاتھ کی انگلیاں پھیلائیں، مٹھی بند کی اور اطمینان کی سانس لی کہ اعصاب کٹنے سے بچ گئے تھے۔

ابھی میں اپنے بازو پر پٹی باندھنے کے لیے کپڑے کی دستیابی کے بارے سوچ ہی رہا تھا کہ حویلی والی جانب کی باڑھ پھلانگ کر تین سفید، جسیم کتے کیاری میں آن کودے۔ میں نے چشم زدن میں سنبل کے بڑے درخت کی طرف چھلانگ لگائی اور خاردار تنے کے ساتھ پشت لگا دی۔ چونکہ کتے تعداد میں تین تھے، اس لیے کھلی جگہ پر ان سے مقابلہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ خود کو عقب سے محفوظ کرتے ہی میں نے ان کے استقبال کے لیے خود کو تیار کر لیا۔ لڑاکے نے خون کی بو سونگھ لی تھی کیونکہ ان کا انداز نہایت جارحانہ تھا۔ وہ غرائے بغیر مجھ پر حملہ آور ہوئے۔ ایک اچھل کر میرے منہ تک آیا۔ دوسرا گولی کی طرح ٹانگوں کی طرف لپکا اور اس نے میری داہنی پنڈلی دانتوں میں جکڑ لی اور دیوانہ وار بھنبھوڑنے لگا۔ تیسرا دکھائی نہیں دیا۔ میں نے چہرے پر لپکنے والے کی گردن پکڑی اور گھما کر دوسرے کی کمر پر دے مارا۔ پھر گردن چھوڑے بغیر میں نے اس کا نرخرا بھی کاٹ دیا۔ اس کے حلق سے دردناک خرخراہٹ نکلی، ٹینس بال کی طرح اچھل کر زمین پر گرا اور لوٹ پوٹ ہونے لگا۔ اس کے خون کا گرم لمس مجھے اپنے پیر پر محسوس ہوا۔

پنڈلی پر کاٹنے والا کتا پورا زور لگا کر ٹانگ کو اپنی جانب کھینچ رہا تھا جس سے میرا ماس پھٹ رہا تھا اور ناقابلِ برداشت تکلیف ہو رہی تھی جبکہ چوتھا کتا درخت کے تنے کی دوسری سمت میں اچھل کود کر رہا تھا۔ وہ اپنی حرکات سے بوکھلایا ہوا لگتا تھا۔ پھر پہلو کی طرف سے آیا اور ہوا میں اُچھلا۔ اگر میں اس کی طرف سے ہوشیار نہ ہوتا تو وہ چند سیکنڈوں میں ہی میری گردن ادھیڑ کر رکھ دیتا۔ میں نے اُسے جھکائی دی اور ایک لمحہ ضائع کیے بغیر اس کی پچھلی ٹانگ پکڑ لی۔ وہ مچلا اور میری گرفت سے نکل کر چند قدم دور جا گرا۔ اس کے آنے تک میں نے پنڈلی چبانے والے کا تیا پانچا کر دیا۔ میرا ان تینوں کتوں کو [illegible]

[illegible] چند لمحوں تک اپنے حواس میں نہیں رہا تھا [illegible] سمت میں چند قدم دوڑا پھر پلٹ کر میری [illegible] کے قریب آ کر جھکائی دے کر دوسرے [illegible]

[illegible] نظریں جمائے کھڑا تھا۔ شاید وہ اپنے [illegible] دیکھ کر باؤلا ہو گیا تھا یا ڈر گیا تھا۔ کھل کر حملہ [illegible] چند لمحے اس کے قریب آنے کا انتظار کیا۔ [illegible] سنبل کے تنے کی جڑ میں پیروں کے بل بیٹھ [illegible] تیز چبھن ہوئی جس نے مجھے آنِ واحد میں [illegible] مگر میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا تھا۔ کتے [illegible] انداز میں مجھ پر چھلانگ لگا دی تھی۔ جواباً میں [illegible] خنجر والا ہاتھ سامنے کر دیا۔ تیز پھل اس کے کھلے [illegible] سے گزر کر تالو میں کھب گیا۔ وہ دردناک آواز [illegible] پیچھے ہٹنے لگا تو میں نے اس کی اگلی ٹانگ پکڑ کر کھینچ [illegible] کی طرف گھسٹا اور میں نے اس کی گردن پر کھڑی [illegible] وار کیا جس سے وہ ڈھے گیا۔ تب تک میں [illegible] کے حلق سے خنجر کھینچ لیا تھا اور گردن کو مخصوص انداز [illegible] تھا۔ وہ تڑپنے لگا۔ اپنی گردن چھڑانے کی کوشش [illegible] مگر میری گرفت سے نجات حاصل کرنا اس کے [illegible] نہیں تھی۔ میں نے اٹھ کر ایک پاؤں گردن پر [illegible] ٹانگ پر اور پوری قوت سے گردن مروڑ دی۔ [illegible] کی آواز کے ساتھ ہی اس کی ہڈی ٹوٹ گئی اور وہ [illegible] مرغِ بسمل کی طرح تڑپنے لگا۔

[illegible] نے اس کی چھوٹے بالوں والی سخت جلد پر رگڑ کر [illegible] کیا، رسماً کپڑے جھاڑے اور تیزی سے اگلی [illegible] شاخوں میں گھس گیا۔ میری سانسیں بری طرح [illegible] تھیں۔ دل بھی بڑی تیز رفتاری سے دھڑک رہا [illegible] نے بہت قلیل وقت میں نہ صرف مجھے تھکا دیا تھا [illegible] بھی کر دیا تھا۔ چونکہ کتوں کے غرانے کی خوف [illegible] خاصی دور تک سنی گئی ہوں گی، اس لیے مجھے [illegible] اس طرف آمد کی توقع تھی مگر پانچ سات منٹ [illegible] بعد بھی کسی نے ادھر کا رُخ نہیں کیا۔ شاید حویلی [illegible] گمان لوگوں نے یہ سمجھا ہوگا کہ کتے آپس میں [illegible] کیونکہ وہ ذہنی طور پر مطمئن ہوں گے کہ یارن [illegible] میں کون جان کی امان پائے بغیر قدم رکھنے کی [illegible] تھا۔ یارن خان سرد رات کے اس پہر میں حویلی [illegible] کمرے میں نیند کے مزے لوٹ رہا ہوگا۔

[illegible] احساس تھا کہ میری پنڈلی اور بازو سے خون بہہ رہا تھا جو مجھے مسلسل کمزور کر رہا تھا مگر لہو کے بہاؤ کو روکنے کے لیے کوئی طریقہ نہیں سوجھ رہا تھا۔ میں نے سر جھٹکا اور باڑھ سے نکل آیا۔ چہار سو محتاط نظروں سے دیکھتا ہوا کیاری سے نکلا اور اینٹوں کی روش پر دبے پاؤں چلنے لگا۔ میرا بے اختیارانہ ہاتھ بازو پر جما ہوا تھا۔ بہ ظاہر میدان صاف تھا کیونکہ حویلی کی رکھوالی پر مامور چاروں کتے مر چکے تھے۔ پہرے دار کوئی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ دن کے اجالے میں نظر آنے والے مزدور اپنے گھروں کو چلے گئے تھے یا حویلی میں سو رہے تھے۔ ہو کا عالم تھا۔ نقاہت کی وجہ سے سردی بدن چیرنے لگی تھی۔ حویلی کا عقبی دروازہ اندر سے بند تھا۔ اسے توڑا نہیں جا سکتا تھا۔ چکر کاٹ کر اگلے دروازے کی طرف جانا فضول تھا کیونکہ اس وقت اُسے بھی مقفل ہونا چاہیے تھا۔ مجھے اپنا پرانا ہنر آزمانا تھا۔ میری تیز نظروں نے اس سفیدے کے اونچے درخت کو آنِ واحد میں تاڑ لیا جو مجھے بغیر کسی مشکل یا تاخیر کے اس دو منزلہ حویلی کی بالکونی پر پہنچا سکتا تھا۔ تیز قدموں سے سفیدے کی طرف بڑھا جس پر عام آدمی کے لیے چڑھنا ناممکن تھا۔

میں نے پشاوری چپل اُتار کر پائجامے میں اُڑسی، خنجر دانتوں میں دبایا اور بندر کی سی پھرتی سے سفیدے پر چڑھنے لگا۔ چونکہ سفیدے کا تنا ملائم ہوتا ہے اور اس پر شاخیں بھی نہ ہونے کے برابر ہوتی ہیں اس لیے اس پر چڑھنا عام درختوں کی نسبت زیادہ مشکل ہوتا ہے۔ میرا بازو بار بار دُکھ رہا تھا مگر تابِ ضبط آزماتا ہوا بالکونی کے سامنے پہنچ گیا۔ ایک موٹی شاخ بالکونی کی طرف چلی گئی تھی جسے آری کی مدد سے کاٹ کر ٹنڈ بنا دیا گیا تھا۔ میں شاخ کے کٹے ہوئے حصے پر کھڑا ہوا اور مشاقانہ انداز میں اچھل کر بالکونی کے فرش پر کود گیا۔ اگر میں کودنے میں خفیف سی غلطی بھی کرتا تو میری کمر چوبی ریلنگ پر لگتی اور میں قلابازیاں کھاتا ہوا زمین پر آن گرتا۔ بعید نہ ہوتا کہ میرا ریڑھ کی ہڈی کا کوئی مہرہ ٹوٹ جاتا۔

بالکونی کا بلب بجھا ہوا تھا مگر متصل بڑے سے ہال میں قمقمے روشن تھے جن کی روشنی بڑے دروازے کے شیشوں سے چھن کر بالکونی میں پڑ رہی تھی۔ میں نے دروازے کے دھندلے شیشے سے جھانک کر دیکھا۔ منظر دھندلا تھا مگر اتنا پتا چل گیا کہ ہال میں کوئی شخص موجود نہیں تھا۔ دروازہ حسبِ معمول غیر مقفل تھا۔ مجھے یاد تھا کہ وہ کھلتے وقت زور کی آواز نکالتا تھا۔ تبھی میں نے نہایت آہستگی سے اُسے اتنا دھکیلا کہ میرے داخل ہونے کا راستہ بن گیا۔

رات کے سناٹے میں اس کی نہایت کم بلند آواز بھی دور تک گئی تھی جو میرے لیے نقصان دہ ثابت ہو سکتی تھی۔

اس کشادہ ہال کی تینوں دیواروں کے ساتھ قطار کی صورت میں صوفے پڑے تھے جن کے آگے شیشے کی نفیس میزیں دکھائی دے رہی تھیں۔ عین درمیان میں ایک لمبی ڈائننگ ٹیبل موجود تھی جس کے چاروں اطراف کھڑی پشت والی کرسیاں پڑی تھیں۔ جب تک میں نے میڈم شکیلہ کی کوٹھی کا کچھ حصہ نہیں دیکھا تھا، تب تک مجھے یہ حویلی طلسم خانہ معلوم ہوا کرتی تھی۔

جدید وضع کے بڑے فانوس کے نیچے کھڑے ہو کر میں نے اپنا جائزہ لیا۔ میرا سفید لباس خون کے بڑے چھوٹے دھبوں سے بھر گیا تھا۔ بازو اور پنڈلی سے چپکے ہوئے کپڑے میں کتوں کے دانتوں کے سوراخ بن گئے تھے جن سے خون ابھی تک رس رہا تھا۔ میں نے ایک جالی دار میز پوش کھینچا۔ لمبائی کے رُخ اس کو دو برابر حصوں میں پھاڑا۔ ایک پنڈلی پر، دوسرا بازو پر کس کے باندھ دیا جس سے خون بہنا بند ہو گیا اور درد میں بھی افاقہ ہو گیا۔

بل ٹیرر کتوں کے دانت بہت نوکیلے اور جبڑے طاقت ور ہوتے ہیں۔ چونکہ میرا اور کھالے کا اس نسل کے کتوں سے پرانا واسطہ تھا اس لیے میں نہ صرف ان کو مارنے میں کامیاب ہو گیا تھا بلکہ متوقع زخموں سے بھی بچ گیا تھا مگر ویکسین لگوانے کا عذاب بھگتنا ناگزیر ہو گیا تھا۔ اگر سانپ اور کتے کے سامنے اپنے حواس بحال رکھ لیے جائیں تو ان کے حملے سے بہ آسانی بچا جا سکتا ہے۔ ان دونوں خطرناک جانوروں کا تعلق دیہات سے ہے، اس لیے شہریوں کی نسبت دیہاتی لوگ ان کا شایانِ شان طریقے سے سواگت کر سکتے ہیں۔

ازحد خنکی کے باوجود، حویلی پر چھایا ہوا غیر معمولی سکوت مجھے پریشان کر رہا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہونے لگا کہ مجھ سے اندازے کی غلطی ہو گئی تھی اور میں رائگاں مسافتوں پر چل نکلا تھا۔ لگتا تھا کہ یارن خان سمیت یہاں کوئی ذی نفس موجود نہیں تھا۔ میں کھالے کے ساتھ جب بھی اس حویلی میں داخل ہوا، اسی مخصوص سکوت اور سیلن سے میرا واسطہ پڑا تھا۔ ایک طرح سے آسیبی محل معلوم ہوتا تھا۔

میں نے ہال سے نکل کر یوشکل کے برآمدے کا کڑی نظروں سے جائزہ لیا۔ برآمدہ خالی تھا اور سبھی کمروں کے دروازے بند تھے۔ کمروں کی بتیاں بھی گل تھیں۔ میں دوسرے کونے تک چلا گیا۔ پھر سیڑھیاں اُتر کر گراؤنڈ فلور پر آیا اور ایک ایک دروازہ کھول کر دیکھنے لگا۔ تھا۔ یہ سولہ ضرب پچیس کا جہازی سائز کا کمرا تھا۔ چارپائیوں پر دیہاتی طرز کے بستروں میں خوابِ غفلت کے مزے لوٹ رہے تھے۔ چارپائیوں کے نیچے پڑے جوتوں، دیواروں پر کپڑوں اور دکھائی دینے والے سامان سے ان کے میں اندازہ لگایا تھا کہ وہ نوکر تھے۔ چونکہ وہ تعداد میں تھے اس لیے میں ان میں سے کسی ایک کو جگانے سے معلومات حاصل کرنے کا رسک نہیں لے سکتا تھا۔

چند منٹوں میں ہی میں نے پوری حویلی کھنگال یارن خان سمیت کوئی بھی نہ ملا۔ سخت حیرت اور عالم میں بڑے دروازے سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ دروازے کے شیشوں کے پار، گیٹ وے اور پارکنگ کے سنگم کی کالے شیشوں والی فوروہیل جیپ کے قریب کالباس پہنے ایک گن مین کرسی پر بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ اپنی گن گھٹنے سے ٹکا رکھی تھی اور گولیوں کا پٹا مخصوص انداز میں کمر اور کاندھے پر ڈال رکھا تھا۔ اس کے اطمینان پر حیرت ہوئی۔ اُسے حویلی میں کسی گڑبڑ کا ہوا تھا اور نہ ہی کتوں کی ہلاکت اس کے نوٹس میں آئی میں گومگو کی حالت میں پلٹ کر ایک بڑے کے سامنے آن کھڑا ہوا۔ اس کی آرائش دیکھ کر لگایا جا سکتا تھا کہ یہ کمرا یارن خان کے زیرِ استعمال تمام کمروں کی حالت میں کوئی تغیر دیکھنے کو نہیں ملا تھا۔

اس غیر معمولی بڑے اور قالین یافتہ کمرے کے وسط میں نہایت آرام دہ بیڈ پڑا تھا۔ دوسرے فرنیچر کی صورتی پر بھی کوئی کلام نہیں تھا۔ دل ہی دل میں یارن کے ذوق کی داد دیتا ہوا دراز یں کھول کر دیکھنے لگا۔ چند ذاتی استعمال کی اشیا اور وارڈ روب میں ہینگروں میں لٹکتے ہوئے ملبوسات کے، کچھ ہاتھ نہ لگا۔ الماری میں کاغذات کے پلندے اور فائلیں ترتیب سے گئی تھیں۔ بیڈ کی سائیڈ ٹیبل کی دراز میں ایک ولایتی پستول بھی پڑا تھا۔ اسے دیکھ کر میری آنکھیں۔ جونہی میں نے اس کی میگزین دیکھی گیا۔ میگزین خالی تھی۔ میں نے پستول دراز میں

مایوسانہ انداز میں صوفے پر بیٹھ گیا اور گھوڑے دوڑانے لگا۔ میں نے یارن خان کی چار مرتبہ آتی جاتی دیکھی تھی۔ میری دانست میں اندر تھا۔ تلاشی کا ناکام عمل کہہ چکا تھا کہ وہ یہاں

کہیں اور شب بسری کر رہا تھا۔ فوری طور پر ذہن میں خیال اُبھرا کہ وہ اپنے اُسی نامعلوم ٹھکانے پر گیا ہوگا جہاں اس نے سیمو اور اماں کو رکھا ہوگا۔ از خود، سرنفی میں ہلا کر میں نے اس خیال کو رد کر دیا۔ اسے بوڑھی عورت اور بچے کی رات سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی......؟ کچھ بھی تو نہیں، پھر......؟ وہ کہاں گیا ہوگا......؟ ذہن بری طرح الجھ گیا۔ وہ لاہور سے اپنے ہمراہ چار پانچ نوکر لایا کرتا تھا۔ یہاں کے مقامی ملازم بہ دستور حویلی کی دیکھ بھال پر فائز رہتے تھے۔ یعنی خان سمیت کم و بیش سات آٹھ افراد کو اس وقت یہاں موجود ہونا چاہیے تھا جن میں سے چار دکھائی دیے تھے۔ باقی کہاں تھے؟ تین خوابیدہ، ایک کاہل پہرے دار......

میری چھٹی حس ذہن میں کچوکے لگانے لگی۔ کوئی بہت بڑی گڑبڑ اپنا غیر عنوان احساس جگانے لگی تھی۔ بے اختیار کمرے سے باہر نکلا۔ اچانک ذہن میں تہ خانے کا خیال ابھرا۔ بعید نہ تھا کہ حویلی میں تہ خانہ یا خفیہ کمرے واقع ہوں جن تک میری رسائی نہ ہوئی ہو۔ اس امکان کو مدنظر رکھ کر میں نے ایک مرتبہ پھر حویلی کا جائزہ لیا مگر کوئی کلیو نہ ملا۔ مایوس ہو کر فرسٹ فلور پر جانے کے ارادے سے سیڑھیوں کی طرف بڑھا۔ ایسے ہی وقت میں مجھے قدموں کی موہوم سی چاپ سنائی دی۔ کوئی تھا مگر کس طرف؟ یہ اندازہ نہ ہو سکا۔ میں لپک کر سیڑھیوں کے قریبی ستون کے ساتھ چپک گیا۔ کان لگا کر آہٹ کی سمت کا تعین کرنے کے بعد بائیں ہاتھ گیلری پر نظریں مرتکز کر دیں۔ تعجب کی بات تھی کہ میں اس طرف والے سبھی کمروں کو خالی دیکھ چکا تھا۔

اچانک درمیان والے اسٹور ٹائپ کمرے کا دروازہ کھلا اور ایک لمبا تڑنگا شخص برآمد ہوا۔ وہ سیاہ رنگ کی پینٹ شرٹ پہنے ہوئے تھا اور سیدھا میری جانب آ رہا تھا۔ میں جس ستون کے پیچھے چھپا تھا، وہ اتنا موٹا نہیں تھا کہ مجھے پوری طرح چھپا لیتا اس لیے میرا دیکھ لیا جانا حتمی تھا۔ تبھی وہ سیڑھیوں کی طرف مڑتے ہوئے رُک گیا اور میری جانب پلٹا۔ اسی وقت مجھے اس کے ہاتھ میں دبا لمبی نال والا خوفناک پستول نظر آیا اور میری سانسیں رکنے لگیں۔

وہ ایک قدم بڑھ کر رُکا، پھر بجلی کی سی تیزی سے اچھل کر دیوار کی اوٹ میں چلا گیا۔ چونکہ میں اس کے نشانے کی زد میں نہیں تھا، اس لیے غراتی ہوئی آواز میں بولا۔ ”کون ہو تم؟“

میں نے اپنے وجود کو مزید سمیٹنے کی کوشش کی۔

جواب نہ پا کر اس کا لہجہ مزید درشت ہو گیا۔ ”ہاتھ اُٹھا کر سامنے آ جاؤ ورنہ گولی مار دوں گا۔“

وہ دکھائی نہیں دے رہا تھا مگر مجھے اس کی جائے پنا علم تھا۔ مجبوری یہ تھی کہ میں اس پر حملہ نہیں کر سکتا تھا۔ یہ خو بھی لاحق تھا کہ وہ کسی کو آواز دے کر بلا نہ لے۔ میں فوری طور پر فیصلہ کرتے ہوئے دائیں ہاتھ جست بھری بجلی کی سی تیزی سے اگلے ستون کے پیچھے پہنچ گیا۔ اسے کی مہلت نہ ملی۔ چیخ کر ٹھیٹھ پنجابی میں بولا۔ ”رُک جاؤ و مارے جاؤ گے۔“

ہم دونوں کی پوزیشن ایک سی تھی۔ اس کے پا پستول تھا مگر میں نشانے کی زد میں نہیں تھا۔ وہ اس خوف بدولت سامنے نہیں آتا تھا کہ میں اس پر فائر نہ کر دوا چوروں کی طرح حویلی میں آنے والے کا خالی ہاتھ ہونا از قیاس تھا۔ اس نے بڑی احتیاط سے گیلری میں جھا سیڑھیوں کے پرے چھت میں نصب بلب نے اس کے سایہ دیوار پر بنایا۔ میں نے دبی آواز میں کہا۔ ”ہمت سامنے آؤ، وار کرو۔ یوں چھپ کر دھمکیاں دینے وا بزدل ہوتے ہیں۔“

وہ نادان نہیں تھا کہ میرے جوش دلانے پر کمیر سے نکل آتا، بولا۔ ”تم یہاں کیا کر رہے ہو؟“

میں نے کہا۔ ”یہی سوال میں تم سے کرتا ہوں۔“

اس نے جواباً گالی دی۔ وہ دیوار سے پشت لگا کھڑا تھا۔ دیوار پر وقفے وقفے سے نظر آنے والا سایہ کی بے چینی کی خبر دے رہا تھا۔ جونہی سایہ اوجھل ہوا، نے اگلے ستون کی طرف چھلانگ لگا دی۔ اس نے بھی اپنی پوزیشن بدلنے کی ٹھانی تھی کیونکہ اس نے پھر نہیں جو تھا۔ مجھے اندیشہ ہوا کہ وہ سیڑھیاں چڑھ کر فرسٹ فلور چلا جائے۔ وہاں سے وہ مجھے بہ آسانی نشانہ بنا سکتا تھا شکل کی بالائی منزل کے برعکس فرشی منزل زیرو شکل میر کی گئی تھی۔ ایک دروازہ عقب میں کھلتا تھا جبکہ اگلی جا مین گیٹ تھا جس کے باہر گن مین بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے میرا اور لمبے تڑنگے نو وارد کا باہمی مکالمہ سن لیا ہوگا اور چا چوبند ہو کر بیٹھا ہوگا۔ میں ادھر کا رُخ کر کے اس کی گو نشانہ بن سکتا تھا جبکہ عقبی دروازے یا بالائی منزل پر جا کے لیے اسی گیلری سے گزرنا پڑتا تھا جس میں پستول بر دشمن چھپا ہوا تھا۔

ایک خیال برق کوندے کی طرح ذہن میں لپکا کہ حویلی کے نیچے کوئی تہ خانہ ضرور واقع تھا جس میں سے نکل وہ گیلری میں آیا تھا۔ وہ کسی ضرورت کے تحت نکلا تھا یا سن گن پر آیا تھا، سرِدست یہ تخصیص نہیں کی جا سکتی تھی۔

میں چند لمحوں میں تین چار ستون عبور کر کے
ے کے آخری سرے پر پہنچ گیا۔ میری حالت اس
ے کی سی تھی جو اپنی حماقت کی وجہ سے پنجرے میں
ں جاتا ہے۔ میں نے ایک ذرا ٹھہر کر اپنے تنے ہوئے
ب کو ڈھیلا چھوڑا، لمبی لمبی سانسیں لیں اور خود پر قابو
، کی کامیاب کوشش کی۔ اس نامساعد کیفیت میں پاؤں
اور سر ٹھنڈا رکھنے میں زندگی کا راز مضمر تھا۔

پستول بردار کی تیز چیختی آواز بالائی منزل سے حویلی
ناٹے کا قلب چیر گئی۔ ''اوئے گن مین! دروازہ کھول
ندر آ ...... کوئی چور اُچکا نیچے چھپا ہوا ہے۔''

میں نے اوپر دیکھا۔ وہ دکھائی نہیں دیا۔ بائیں ہاتھ
ی سے گن مین نمودار ہونے والا تھا جو اندر داخل
نے ہی مجھے دیکھ لیتا اور فائر کر دیتا۔ ستون سے ہٹ کر
کے استقبال کے لیے نئی پوزیشن لیتا تو پستول بردار کی
کا شکار ہو جاتا۔ ایسے ہی وقت میں بیرونی دروازہ کھلنے
پیدا ہونے والی تیز چرچراہٹ کانوں میں پڑی۔
ے اعصاب یکبارگی تن گئے۔ میں نے گیٹ اور
ے کے فاصلے، قدموں کی چاپ اور گیٹ کھلنے کی
لو ذہن میں سجا کر اس کے نمودار ہونے کے لمحے کا تعین
سانس روکی اور لمبی جست بھرنے کے لیے خود کو تیار کر
یرا اندازہ قابل فخر تھا کہ جونہی اس نے برآمدے میں
کھا، میں اس پر پل پڑا۔ اسے گن سیدھی کرنے اور
رنے کی مہلت نہ ملی اور میرے بازو کا شکنجہ اس کی
ن کے گرد حائل ہو گیا۔ خنجر کی نوک اس کے پہلو سے
ں۔ غرایا۔ ''خبردار! کوئی حرکت کی تو گردن کی ہڈی توڑ
ا۔''

ساتھ ہی میں نے خنجر پر ہاتھ کا دباؤ بڑھایا۔ اس کی
ں پھیل گئیں اور بھنچی آواز میں بولا۔ ''تم کون ہو؟''
وہ مجھے پہچان نہیں سکتا تھا مگر میں نے اُسے پہچان لیا
ہ مولا داد عرف دادو مہانہ تھا جس کا پورا خاندان سردار
خان کی حویلی اور اسپتال کے درمیان کچے گھروں
ہائش پذیر تھا۔ وہ لڑائی بھڑائی والا بندہ نہیں تھا۔ پھر نہ
کیوں بڑے خان نے اُسے گن مین بنا کر حویلی کے
نات کر رکھا تھا۔

میں نے سرد لہجے میں کہا۔ ''گن پھینک دو۔''
اس کی گرفت گن پر ڈھیلی پڑ گئی۔ میں نے فرش پر
ے والی گن کو پاؤں کی مدد سے اپنی جانب کھینچا۔ ایسے
ت میں حویلی کے درو دیوار فائر کی خوفناک آواز سے

لرز اُٹھے۔ مجھے فی الفور سمجھ نہ آئی کہ فائر کس پر کیا گیا تھا مگر دوسری گولی میرے بازو کو چھوتی ہوئی پہلو سے نکل گئی۔ تیز جلن ہوئی۔ دل دھک سے رہ گیا۔ فائر کی آواز سے عیاں تھا کہ گولی پستول سے نہیں، کسی گن سے چلائی گئی تھی۔ گولی چلانے والے کے نزدیک شاید دادو مہانے کی کوئی اہمیت نہیں تھی تبھی اس نے فائر کرتے ہوئے اس کی پروا نہیں کی تھی۔ میں نے گن اُٹھانے میں وقت ضائع نہ کیا اور دادو کو دھکیلتا ہوا ایک مرتبہ پھر ستون کی اوٹ لینے میں کامیاب ہو گیا۔ سرگوشی کے سے انداز میں اسے دھمکی دی کہ اگر وہ ایسی ویسی حرکت کرے گا تو دونوں طرف سے آنے والی موت اسے گلے لگا لے گی۔ بالائی منزل سے ستون پر دو تین فائر مزید ہوئے۔ خوش بختی سے ہم دونوں محفوظ رہے وگرنہ ستون کی چوڑائی ناکافی ہونے کے سبب ہمارے جسموں کے کچھ حصے باہر جھلک رہے تھے۔

دادو میرے شکنجے میں بری طرح پھنسا ہوا تھا مگر جونہی میری توجہ فائرنگ پر مبذول ہوئی، اس نے نہ صرف ناقابل بیان پھرتی سے پینترا بدلا بلکہ میرا خنجر والا ہاتھ بھی کلائی سے تھام لیا۔ میرے سنبھلنے سے پیشتر اس نے کہنی پوری قوت سے میرے پہلو میں ماری۔ ضرب شدید تھی۔ میں 'اوہ' کی آواز نکال کر بے اختیار جھکا۔

دادو مہانہ حلق کے بل چیخا۔ ''گولی نہ چلاؤ صاحب! میں نے چور کو قابو کر لیا ہے۔''

میں نے جھکتے ہی بجلی کی سی سرعت سے مکا اس کی ٹانگوں کے بیچ مارا، ساتھ ہی خنجر والے ہاتھ کو جھٹکا دیا۔ اس کے حلق سے گھٹی گھٹی چیخ نکلی اور وہ کمر کے بل ستون سے ٹکرا کر فرش پر گر گیا۔ اس نے میری کلائی مکا لگتے ہی چھوڑ دی تھی۔ میں ستون کی اوٹ میں رہتا ہوا اچھل کر اُس پر کودا۔ میرے دونوں گھٹنے اس کے کندھوں پر لگے۔ جونہی میرے قدم زمین کو چھوئے، میں اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ میں اپنا وار دہرانا چاہتا تھا مگر وہ بے آب ماہی کی طرح تڑپتا ہوا ستون سے کئی فٹ دور فرش پر پھسل گیا۔ میں نے خود کو بہ دقت اس کے پیچھے جانے سے روکا ورنہ گولی کا نشانہ بن جاتا۔ وہ تا دیر نہیں اُٹھا، نہ ہلا جلا، یوں جیسے بے ہوش ہو گیا ہو۔ یہ بھی غنیمت تھا ورنہ اس کی گن اس سے کچھ ہی فاصلے پر پڑی تھی جسے اُٹھا کر مجھ پر فائر کر سکتا تھا۔

حویلی کا سکوت جیسے پھر لوٹ آیا تھا۔ فائرنگ کی آواز نور پور کے گھر گھر تک پہنچی تھی مگر حسبِ روایت کسی میں حویلی کی طرف آنے کی جرأت نہیں تھی۔ میرا دل دھڑکنے

سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ لمبا تڑنگا پستول والا اور نادیدہ گن بردار فائرنگ روک کر مجھ پر قابو پانے کی کس ترکیب پر عمل پیرا ہو گئے تھے۔ پیا جی نے مجھے سمجھایا تھا کہ یک لحاتی فیصلہ اور اس پر جان وتن سے فوری عمل زندگی کی طرف لوٹاتا ہے، کشمکش موت کی طرف دھکیلتی ہے۔ میں نے پیا کی نصیحت پر عمل کیا اور دیوانہ وار دوڑ پڑا۔ دادو مہانے کے بے حس وحرکت جسم کو پھلانگتا ہوا گیلری میں گھس گیا۔ مجھ پر خلاف توقع فائر نہیں ہوا۔ بھاگتے ہوئے جھک کر دادو مہانے کی ڈبل بیرل گن کو اُٹھانے کی کوشش کی۔ ایک پل کو ہاتھ جما مگر فوراً پھسل گیا۔ میں نے رکنے کا خطرہ مول نہیں لیا اور لمبی زقند بھر کر کھلا ہوا مین گیٹ عبور کر گیا۔

میں اس آہنی جھنگلے سے نکل آیا تھا جس میں اپنی حماقت کے سبب جا پھنسا تھا۔ سیڑھیاں اُترتے ہی میں دائیں ہاتھ مڑا اور عمارت کے ساتھ ساتھ دوڑتا چلا گیا۔ نکڑ پر ایک لمحے کو رُک کر پلٹا، دیکھا، میدان صاف تھا مگر زیادہ دیر صاف رہنے والا نہیں تھا۔ عمارت کی جڑ میں بنے ہوئے کنکریٹ کے دو اڑھائی فٹ چوڑے راستے پر دوڑتا ہوا حویلی کے عقب میں آ گیا۔ اب میرے سامنے وہی کیاریاں تھیں جن میں سے ایک کیاری میں مجھ پر کتوں نے خوفناک حملہ کیا تھا۔ درخت کے نیچے دو جھاڑی دار مور پنکھ دیکھے تو ان کے بیچ دُبک گیا۔ اب میں فوری طور پر کسی کو نظر نہیں آ سکتا تھا۔

ایسے ہی وقت میں نور پور کی مسجد کے اسپیکرز ’شوں، شوں‘ کی آواز نکالتے ہوئے بیدار ہو گئے۔ پھر بہ زبان مُلا ہنگامی اعلان نشر ہونے لگا کہ سردار یارن خان کی حویلی کی جانب سے فائرنگ کی آواز سنی گئی ہے۔ لوگ اپنے ہتھیار سنبھال کر گھروں سے باہر نکل آئیں تاکہ ڈاکوؤں کو گھیرا جا سکے۔ میرے لیے ایک اور مصیبت کھڑی ہونے والی تھی۔ میں شہریار نظر آتا تو بپھرے ہوئے نور پوریوں سے بچ سکتا تھا مگر گلاب خان دکھائی دیتا تھا۔ اگر ہتھیاروں سے لیس لوگوں کے ہتھے چڑھ جاتا تو وہ آناً فاناً میرا بھرکس نکال دیتے۔ چند منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ فضا پرجوش نعروں اور ہوائی فائرنگ سے گونجنے لگی۔ میں حویلی کے اندر غیر محفوظ تھا تو باہر موت میری منتظر تھی۔

ایسے ہی وقت میں کنکریٹ کے پٹی نما راستے پر بھاری بوٹوں کی آواز اُبھری۔ میرے پیچھے آنے والا اکیلا تھا۔ وہ حویلی کی نکڑ سے برآمد ہوا تو پتا چلا کہ میرے تعاقب میں وہی لمبا تڑنگا پستول بردار تھا جو گیلری سے نکل کر میرے پیچھے لگا تھا۔ میرے اعصاب میں بجلی سی بھر گئی۔ جونہی وہ بوتل برش کے درخت تلے پہنچا، میں نے اس پر چھلانگ لگانے میں لمحہ بھر کی تاخیر نہیں کی۔ وہ چوکس تو تھا مگر مار کھا گیا اور میرا قوی دھکا کھا کر بری طرح دیوار سے ٹکرایا۔

اس کے سنبھلنے سے قبل ہی میں نے خنجر والا ہاتھ ہوا میں لہرایا۔ چاہا کہ اس کے پیٹ میں خنجر گھونپ دوں مگر وہ بجلی کی سی تیزی سے دیوار کے ساتھ کروٹ بدل کر پرے ہٹ گیا۔ خنجر ٹیپ دار دیوار سے ٹکرایا۔ ہاتھ کو چوٹ لگی۔ عین اسی لمحے مقابل نے منہ سے ’ہے‘ کی لمبی آواز نکالی، ایک ٹانگ پر اُچھلا اور اس کے ہوا میں اُڑتے ہوئے پیر کی زوردار ضرب میرے ہاتھ پر پڑی۔ یوں لگا جیسے میرے ہاتھ کی ہڈیاں ٹوٹ گئی ہوں۔ خنجر ہاتھ سے چھوٹ کر اُڑتا ہوا مور پنکھوں میں جا گرا۔ میں بے ساختہ ہاتھ تھام کر دُہرا ہوا۔ اس کا زوردار مکا میری کمر پر لگا۔ اس کا بدن فولادی تھا، ضربیں کاری۔ وہ پستول میری کنپٹی پر مارنا چاہتا تھا جب میں اچانک اس کی جانب جھکا، اپنا کندھا اس کی دونوں ٹانگوں کے بیچ ڈالا اور بدن کی تمام تر طاقت بروئے کار لاتے ہوئے کھڑا ہو گیا۔ میرے کندھے کی ضرب اور ہوا میں اُٹھ کر زمین پر گرنے کے غیر متوقع عمل نے اسے بوکھلاہٹ کا شکار کر دیا۔ اس کی انگلی کا دباؤ ازخود ٹرائیگر پر بڑھ گیا اور گولی چل گئی۔ گولی دیوار پر لگی۔ اینٹ کے چند ننھے ننھے ٹکڑے اُڑ کر میرے چہرے پر لگے۔

وہ بہت طاقتور اور پھرتیلا تھا، دلیر بھی تھا۔ اسے مہلت دینا موت کو دعوت دینا تھی اس لیے میں نے لمحہ بھر میں چھلانگ لگائی اور دونوں پیر جوڑ کر اس کے سینے پر مارے۔ ’آہ‘ کی بے ساختہ آواز اس کے حلق سے نکلی۔ میں نے اس کے سینے پر رہتے ہوئے پستول کی نال پر ہاتھ ڈال دیا۔ نال خاصی لمبی اور گرم تھی۔ اس نے دوسرا ہاتھ میری کمر کے نیچے رکھا اور زوردار دھکا دیا۔ میں توازن برقرار نہ رکھتے ہوئے فرش پر گرا۔ اتفاق سے میرا گھٹنا پستول پر لگا۔ چوٹ آئی، زخمی پنڈلی دکھ گئی۔ اس کا ہاتھ بھی پستول اور فرش میں پس گیا تبھی سسکی لے کر مچلا اور اس نے اپنا ایک گھٹنا میری کمر میں رسید کیا۔ میرا سر دیوار سے ٹکرایا۔ چودہ طبق روشن ہوئے مگر میں نے فوراً پہلو بدلا۔ پیروں کے بل دو تین فٹ اوپر اچھلا اور ’دھپ‘ سے پستول پر کود گیا۔ وہ پستول کھینچنا ہی چاہ رہا تھا کہ افتاد پڑ گئی۔ اس کے حلق سے نکلنے والی تیز سسکی نے باور کرا دیا کہ اس کے ہاتھ کی دو چار ہڈیاں ضرور ٹوٹ گئی ہوں گی۔ وہ تڑپ کر اُٹھا اور دیوانہ وار مجھ سے لپٹ گیا۔ مجھے فوراً

احساس ہو گیا کہ پستول اس کی گرفت سے نکل گیا تھا۔

اس نے مجھے بانہوں میں جکڑ کر زور سے بھینچا۔ فولادی گرفت کی بدولت میری سانس گھٹنے لگی۔ میں نے اپنے دونوں مکے اس کے دونوں جبڑوں پر مارے مگر اس کی گرفت مزید سخت ہو گئی۔ یوں لگا جیسے وہ بانہوں میں بھینچ کر میرا دل پھاڑنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ میں نے اس کے چہرے پر ہاتھ جمائے۔ جب تک وہ سنبھلتا، میرا وار چل چکا تھا اور میری انگلیاں اس کی دونوں آنکھوں میں چبھ گئی تھیں۔ وہ درد سے بلبلا اُٹھا، مجھے چھوڑ کر ایک جھٹکے سے پیچھے ہٹا اور آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر بیٹھتا چلا گیا۔ میں نے گھوم کر اس کی گردن پر لات جمائی۔ وہ پہلو کے بل گر گیا۔ اس کے ہاتھ بہ دستور سختی سے آنکھوں پر چپکے ہوئے تھے۔ میں نے فی الفور پستول کی تلاش میں نظر دوڑائی۔ وہ دیوار کی جڑ کے ساتھ پڑا تھا۔ میں نے لپک کر پستول اُٹھا لیا۔ تیزی سے اس کے عقب میں آیا اور گردن میں نال چبھوتے ہوئے سرد لہجے میں کہا۔ ”تمہارا کھیل ختم ہو گیا ہے پیارے! اب کوئی حرکت نہ کرنا ورنہ جان سے ہاتھ دھو بیٹھو گے۔“

اس نے کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا بلکہ آنکھوں پر ہاتھ رکھے کراہتا رہا۔ شاید میرے ہاتھ کچھ زیادہ زور سے پڑ گئے تھے۔ میں نے اُسے سنبھلنے کا موقع دیا۔ وہ سنبھل گیا، اپنی پوزیشن سمجھ گیا تو شکست خوردہ انداز میں بولا۔ ”تم کون ہو اور کیا چاہتے ہو؟“

میں نے کائیاں انداز میں اردگرد دیکھا۔ حویلی کے اندر خاموشی تھی۔ سامنے، سڑک کی طرف سے لوگوں کے اونچا اونچا بولنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ میں نے اپنے لہجے کو مزید سنگین بناتے ہوئے کہا۔ ”یارن خان کہاں چھپا ہے؟“

وہ بھنچے بھنچے انداز میں بولا۔ ”وہ تو یہاں نہیں ہے۔ کہیں گیا ہوا ہے۔“

”کہاں؟“ میں نے پستول پر دباؤ بڑھایا۔

”پتا نہیں...... شام کو گیا تھا۔“ اس کی آواز سے ظاہر تھا کہ اس نے شکست تسلیم کر لی تھی مگر میں پوری طرح ہوشیار تھا۔ وہ مجھے جُل دینے کے لیے یہ انداز اختیار کر سکتا تھا۔

میں غرایا۔ ”بکو مت، سچ بولو۔ کہاں ہے وہ؟“

”مجھے نہیں معلوم۔“ اس نے سخت لہجے میں کہا۔

میں نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ ”تین تک گنوں گا پھر گھوڑا دبا دوں گا۔ ایک...... دو......!“

اس نے جلدی سے کہا۔ ”وہ نیچے ہے۔ بیسمنٹ میں...... مگر تم کون ہو؟“

”تہ خانے کا راستہ کدھر ہے؟“ میری آواز میں موت کی آمیزش گھل گئی۔

”اسٹور روم میں...... مگر تم راستہ کھول نہیں سکتے۔ کھول بھی لو تو بیسمنٹ سے زندہ باہر نہیں آ سکتے۔“ اس نے ایک ہی سانس میں کہا۔

ایسے میں حویلی سے کسی نے سڑک پر اکٹھے ہونے والے لوگوں کو پکارا اور تحکمانہ انداز میں یارن خان کا حکم سنایا۔ ”بڑا خان کہتا ہے کہ تم لوگ اپنے گھروں کو لوٹ جاؤ۔ یہاں خیر سلا ہے۔ جاؤ، شاباش!“ بولنے والے نے اس اعلان کو دو مرتبہ دہرایا جس کے نتیجے میں ایسی آوازیں سنائی دیں جن سے عیاں تھا کہ ہتھیار سنبھال کر حویلی کی طرف آنے والے تبصرے کرتے ہوئے واپس ہونے لگے تھے۔

میں نے اپنے شکار کو کالر سے پکڑ کر اُٹھایا، اس کی کمر میں بازو حمائل کیا، پستول کی نال ریڑھ کی ہڈی پر ٹکائی اور سخت لہجے میں کہا۔ ”چلو! مجھے حویلی کے اندر لے چلو۔ دیکھوں تو سہی، بیسمنٹ میں ایسا کیا ہے جس سے ڈرا رہے ہو۔ ہری اَپ...... کوئی مستی کرو گے تو گولی سیدھی ریڑھ کی ہڈی میں گھس جائے گی۔“

اگر اس کے ذہن میں مزاحمت کا کوئی خیال تھا بھی تو ہوا ہو گیا۔ پژمردگی سے بولا۔ ”میں سچ کہتا ہوں کہ ادھر مت جاؤ بلکہ اپنی جان بچاؤ اور حویلی سے نکل جاؤ۔ میں تمہارا پیچھا نہیں کروں گا۔“

میں نے دانت پیسے۔ ”جیسا کہہ رہا ہوں، ویسا کرو۔ مشورے نہ دو۔“

ساتھ ہی اُسے دھکیلا۔ وہ طوعاً و کرہاً سست روی سے چل پڑا۔ میں نے ارادتاً متضاد راستہ چنا۔ چند قدم چلے ہوں گے کہ ایک بھاری مگر بھنچی بھنچی آواز کانوں میں پڑی۔ ”پرویز! فکر نہ کر، میں آ گیا ہوں۔ اوئے بے غیرت! یہیں رُک جاؤ ورنہ تمہیں گولیوں سے چھلنی کر دوں گا۔“

آواز اوپر سے آئی تھی۔ میری نظریں اُٹھیں۔ میں سفیدے کے درخت پر چڑھ کر جس بالکونی میں کودا تھا، اس کی چوبی ریلنگ پر سفیدے کے سائے میں ایک ہیولا دکھائی دیا۔ اسے دیکھتے ہی میں نے برق مستعدی سے پستول اوپر کیا، اپنے یرغمالی جسے اس کے ساتھی نے پرویز کہہ کر اپنی آمد کی خوش خبری سنائی تھی، کے کندھے پر سے تھوڑا اوپر نکالا اور فی الفور فائر کر دیا۔ میرا نشانہ خطا گیا تاہم دوسرا فائر نشانے پر لگا۔ ایک تیز چیخ سناٹا چیرتی ہوئی نور پور کی فضا میں

چکرا کر تحلیل ہوگئی اور ہیولا غائب ہوگیا۔ میرے اندازے کے مطابق گولی اس کے پیٹ یا چھاتی میں لگی تھی۔

موقعے سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے پرویز نے میری گرفت سے نکلنا چاہا مگر میں اس کی طرف سے غافل نہیں تھا۔ میں نے پستول کی نال اس کی گدی پر رکھ دی۔ وہ جہاں کا تہاں رہ گیا۔ اپنے ساتھی کے انجام نے اس کا رہا سہا حوصلہ بھی توڑ دیا تھا۔ اپنا بدن ڈھیلا چھوڑ کر چلنے لگا۔ میں بہ طور احتیاط دیوار کے ساتھ لگ کر چل رہا تھا اور وقفے وقفے سے گردن موڑ کر اپنے پیچھے بھی دیکھ رہا تھا۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں عقب سے کوئی نہ آجائے۔

میں نے پوچھا۔ ''حویلی میں کتنے آدمی ہیں؟''

وہ نیم مردنی اور بیزاری سے بولا۔ ''نو...... دسواں بڑا خان ہے۔''

میں نے دل میں حساب لگایا۔ ''تین ملازم، ایک گن مین دادو مہانہ جو بے ہوشی کا مکر کر کے فرش پر پڑا تھا، ایک بالکونی میں مر گیا تھا یا زخمی ہو چکا تھا جبکہ پرویز نامی غنڈا میری دسترس میں تھا...... باقی بچے تین۔ دسواں یارن خان......''

ہم نکڑ عبور کرنے کے بعد، بہ مشکل نصف مسافت طے کر پائے تھے کہ اچانک پرویز رُک گیا۔ اس نے بغل دبائی۔ میرے حلق سے سسکی نکلی۔ میں نے اپنا زخمی بازو اس کی بغل کے نیچے سے نکال کر اپنا ہاتھ اس کی چھاتی پر رکھا ہوا تھا، وہ دکھ گیا تھا۔ غصے سے پستول کو جھٹکا دیا، کہا۔ ''کیوں رک گئے ہو؟ چلتے رہو ورنہ......''

وہ چلنے کے بجائے میرا بازو جکڑ کر اچانک نیچے بیٹھ گیا جس سے مجھے زور کا جھٹکا لگا۔ میری ٹھوڑی اس کے سر سے ٹکرائی۔ میں اپنا توازن برقرار نہ رکھتے ہوئے اس کے اوپر سے سرک کر آگے کی جانب لڑھک گیا۔ اس نے کھڑے ہونے میں دیر نہیں کی اور مجھے اُٹھا کر نیچے پٹخ دیا۔ اس کم بخت کے بازوؤں میں بلا کی جان تھی۔ میں نے سود و زیاں کی پروا نہ کرتے ہوئے آنِ واحد میں اس کا نشانہ لیا اور ٹرائیگر دبا دیا۔ 'ٹرچ' کی مخصوص آواز کے سنتے ہی میرا دل دھک سے رہ گیا۔ پستول میں گولیاں ختم ہو چکی تھیں اور میں اچانک خالی ہاتھ ہوگیا تھا۔ تبھی اس کی بے خوفی کا عقدہ کھلا۔ اس نے سنبھلتے ہی دل ہی دل میں اپنے پستول کی فائر ہونے والی گولیوں کا شمار کیا تھا اور بھانپ چکا تھا کہ میگزین میں کوئی گولی باقی نہیں بچی تھی۔

میں کنکریٹ کی دو اڑھائی فٹ چوڑی یخ بستہ پٹی پر چت پڑا تھا جبکہ وہ میرے قریب پہلوؤں پر ہاتھ رکھے فاتحانہ انداز میں کھڑا تھا، بولا۔ ''بڑے سورمے بنتے تھے۔ اب تمہارا کیا حشر ہوگا، یہ تم دیکھو گے، دنیا دیکھے گی۔''

اس نے زوردار ٹھوکر میری پنڈلی پر ماری۔ اتفاق سے اس کا بھاری بوٹ اس جگہ پڑا جہاں کتے کے کاٹے کا زخم تھا۔ میں بلبلایا۔ اس نے پے در پے کئی ٹھوکریں رسید کیں۔ ہر ضرب پر میرے حلق سے کراہ نکلی۔ میں نے خود کو سنبھالا اور ہاتھ میں پکڑا ہوا بھاری پستول پوری قوت سے اسے دے مارا۔ اس نے جھکائی دے کر خود کو بچا لیا اور وحشیانہ انداز میں چیختا ہوا مجھ پر پل پڑا۔ چند ہی لمحوں میں اس نے مجھے مار مار کر ادھ موا کر دیا۔ اس کی ٹھوکروں سے میرے جسم کا شاید ہی کوئی حصہ محفوظ رہا تھا۔ تب، جب وہ تھک گیا اور ہانپنے لگا، دو قدم پیچھے ہٹا، جھکا، پائنچہ اُٹھایا اور پنڈلی سے بندھے چرمی پٹے سے پتلے پھل والا لمبا خنجر کھینچ لیا۔ میں نے پہلو کے بل کروٹ بدلی اور اس سے تھوڑا دور ہو گیا۔ وہ خنجر سونت کر چھوٹے چھوٹے قدم اُٹھاتا میری طرف بڑھا۔ میرے اُٹھنے سے پیشتر میرے سر پر پہنچ گیا اور پہلو میں پیروں کے بل بیٹھ گیا۔ خنجر والا ہاتھ ہوا میں اُٹھایا۔ اس کی آنکھوں کا ارتکاز میرے سینے پر دل کا مقام تھا۔

چاند کی مدھم روشنی میں وہ کسی ریچھ کی طرح دکھائی دیا۔ کسی بھی لمحے وہ میرے دل میں تیز خنجر اُتار سکتا تھا۔ میری اوپر کی سانس اوپر، نیچے کی نیچے اَٹکی ہوئی تھی اور خوف سے دل کی دھڑکن کئی گنا بڑھ گئی تھی۔ ایسے ہی وقت میں ایک کم بلند مگر دردناک نسوانی چیخ میرے کانوں میں پڑی۔ ابھی پہلی چیخ کی بازگشت کانوں میں چکرا رہی تھی کہ دوسری چیخ سنائی دی۔ ہم دونوں چونکے۔ یوں لگا جیسے آواز کسی کنویں سے نکلی تھی۔

''مار ڈالو مجھے! ہائے!'' چیخنے والی نے چیخوں کے درمیان حلق پھاڑ کر کہا تھا۔ یوں لگا جیسے یہ آواز میری شناسا تھی۔ پھر میرا دل یکبارگی پوری قوت سے دھڑک کر گویا رُک گیا اور میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے ہوا میں معلق تیز دھار خنجر کو دیکھنے لگا۔ میں بھول گیا کہ اس خنجر کے چمکدار پھل پر میرے دل کا خون لگنے والا تھا بلکہ میرے ذہن کی غلام گردشوں میں چیخ کی آواز گونجنے لگی تھی۔ میں اس آواز کو جنم جنم میں پہچاننے کی قدرت رکھتا تھا۔

معاشرتی ناہمواریوں پر مبنی دلوں کی دھڑکن، لہو کی گردش تیز کر دینے والے سطر بہ سطر جاری اس سفر کے اگلے پڑاؤ کا احوال آئندہ ماہ



ٹرنک کی چوری

بابر نعیم

نک ویلوٹ کا کارنامہ ہو اور... لہو کی گردش تیز کرتا سسپنس نہ ہو، ایسا بھلا کب ممکن ہے۔ حالات کی تیز رفتاری نے اس کے نزدیک اس معمولی سے ٹرنک کو ''مرے ہوئے ہاتھی'' کی طرح قیمتی بنا دیا تھا جسے وہ کسی صورت گنوانا نہیں چاہتا تھا اور جو بے گناہوں کی رہائی کا بہت بڑا سبب بھی تھا لہٰذا... سر دھڑ کی بازی لگا کر بھی وہ اسے حاصل کرنا چاہتا تھا۔

رشتوں کی ڈوری سے لالچ کی گرہیں کھولتی ایک پراثر تحریر

نک ویلوٹ نے پرتاسف انداز میں سر ہلایا۔ وہ نصف گھنٹے سے پبلک لائبریری کے جرائم سیکشن میں جھک مار رہا تھا لیکن فن چوری پر ایک بھی کتاب نہیں تھی۔ حالانکہ قتل کے موضوع پر کئی کتابیں موجود تھیں۔ وہ ایک خالی میز پر بیٹھ گیا...... اور کھڑکی سے باہر نظر آنے والے با دیکھنے لگا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ چوری کے موضوع پر ا ہی کتاب لکھنی پڑے گی جس کا عنوان کچھ ہوگا۔ ''چوری، ایک قدیم فن'' یا ''چوری برائے زندگ

چند لمحوں بعد ایک فربہ اندام شخص اس کے بائیں ب والی کرسی پر آکر بیٹھ گیا۔ اس کے چہرے پر نظر تے ہی نک کے ذہن میں بلڈاگ کا تصور ابھر آیا۔ اس ر چالیس برس کے لگ بھگ معلوم ہوتی تھی۔ اس کے سرخ رنگ کے تھے، آنکھوں پر سنہری کمانی والا چشمہ ور ناک نقشہ روسیوں جیسا تھا۔ وہ بہ ظاہر بے مقصد رسالے کی ورق گردانی کرنے لگا۔ اس کے چہرے پروائی اور بے نیازی پائی جاتی تھی۔ وہ ان لوگوں سے معلوم ہوتا تھا جو دنیا کو بازیچۂ اطفال سے زیادہ ت نہیں دیتے۔

"کتابیں!" اس نے خود کلامی کے سے انداز میں "کتابیں ہی کتابیں...... اونہہ" نک نے سرسری انداز س کی طرف دیکھا اور دوبارہ کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔

"اسے کتب خانہ کہنے کے بجائے قبرستان کہنا ہے۔" اجنبی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "قوموں کا ان! انسانوں کا قبرستان! کتنی عجیب بات ہے، قومیں صفحۂ سے اٹھ جاتی ہیں۔ کالعدم ہو جاتی ہیں، خاک میں مل ک بن جاتی ہیں لیکن کتابوں کے اندر ان کی ایک نئی باد ہو جاتی ہے۔" پھر وہ نک کی طرف دیکھتے ہوئے "تمہارا کیا خیال ہے مسٹر نک ویلوٹ؟"

اپنا نام سن کر نک چونکا اور بھنویں سکیڑ کر اجنبی کی دیکھنے لگا۔ "مجھے کتابوں اور قبرستانوں سے کبھی دلچسپی رہی۔" بالآخر اس نے کہا۔ "کتابوں اور قبرستانوں ٹھہراؤ ہوتا ہے جبکہ میں حرکت اور ہنگامہ پسند کرتا ۔" قدرے توقف کے بعد اس نے پوچھا۔ "کیا میں جانتا ہوں؟"

"تم مجھے نہیں جانتے، میں تمہیں جانتا ہوں۔ ایک اونچی سفارش کی بنیاد پر تمہارے پاس آیا ہوں، م الیانوف ہے وکٹر الیانوف۔"

نک نے ہولے سے سر ہلایا اور اس کے بولنے کا ر کرنے لگا۔

"مسٹر ویلوٹ۔" الیانوف بات جاری رکھتے ہوئے "میں تمہارے شہر میں اجنبی ہوں اور صرف تم سے ملنے آیا ہوں۔ میں ایک ٹرنک چوری کروانا چاہتا ہوں۔"

"میں صرف بے قیمت اور ردی چیزیں چوری کرتا ۔" نک نے کہا۔

"مجھے معلوم ہے، جس ٹرنک کی میں بات کر رہا ہوں، سی سال پرانا ہے۔"

"تو پھر وہ یقیناً نوادر میں شمار ہوتا ہوگا۔"

"میرا خیال ہے کہ کوئی کباڑی بھی اسے خریدنا پسند نہیں کرے گا۔ وہ ایک شکستہ اور زنگ آلود ٹرنک ہے۔ ڈیڑھ فٹ اونچا، دو فٹ چوڑا اور چار فٹ لمبا۔ آج کل اس قسم کے ٹرنک کوئی بھی استعمال نہیں کرتا۔ نہ ہی مارکیٹ میں فروخت کیے جاتے ہیں۔"

ٹرنک کے سائز سے نک کو خیال آیا کہ اس میں لاش بند کی جا سکتی ہے۔

"تم اس ٹرنک کو کیوں چوری کروانا چاہتے ہو؟"

"مجھے بتایا گیا تھا کہ تم زیادہ سوالات نہیں کرتے۔" الیانوف نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔" نک نے تسلیم کیا۔ "لیکن تم نے یہ بھی سنا ہوگا کہ میں بہت بھاری فیس لیتا ہوں۔"

"کتنی فیس؟"

"پچیس ہزار ڈالرز۔"

الیانوف نے جواب دینے کے بجائے اپنے کوٹ کی اندرونی جیب سے ایک پھولا ہوا لفافہ نکال کر نک کے سامنے رکھ دیا، بولا۔ "اس میں دس ہزار ڈالرز ہیں۔ پندرہ ہزار کام مکمل ہونے کے بعد۔"

نک لفافے کی طرف دیکھے بغیر بولا۔ "یہ ٹرنک کس مقام پر ہے؟"

الیانوف نے جیب سے ایک پرزہ نکال کر نک کے سامنے رکھ دیا۔ اس پر ایک پتا لکھا ہوا تھا۔ "مذکورہ ٹرنک اس پتے پر ملے گا۔" الیانوف نے کہا۔ "غالباً عمارت کے تہ خانے میں ہوگا۔"

"نیوپالٹ۔" نک نے قصبے کا نام پڑھا۔ "یہ قصبہ یہاں سے غالباً سوا سو میل کے فاصلے پر ہے۔"

"نوے میل۔" الیانوف نے تصحیح کی۔ "اسے لیک مہانک بھی کہتے ہیں، خاصی پرفضا جگہ ہے۔"

"مجھے معلوم ہے۔ میں ایک دفعہ وہاں جا چکا ہوں۔"

"تمہیں یہ ٹرنک چوری کرنے میں زیادہ دقت پیش نہیں آئے گی۔ عمارت کے مکین آج کل نیویارک آئے ہوئے ہیں۔ صرف ایک بوڑھا چوکیدار وہاں ہوتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تمہیں اس شخص کو چکر دینے میں کوئی دقت پیش نہیں آئے گی۔"

"مجھے اپنے کام میں کبھی دقت پیش نہیں آتی۔" نک نے کہا۔ "تم یہ ٹرنک کہاں وصول کرنا چاہتے ہو؟"

"میں یہ ٹرنک خود وصول نہیں کروں گا۔" الیانوف

ایک اور پرزہ نکال کر نک کے سامنے رکھ تمہیں اس پتے پر پہنچانا ہوگا۔ یہ جگہ نیویارک

کیا یہ تمہاری رہائش گاہ ہے؟"

ہاں...... یہ ہم...... میری عارضی رہائش گاہ ہے۔ س وقت مقررہ پر وہاں نہ ملوں۔" اس نے جیب چابی نکال کر نک کے سامنے رکھ دی۔ "یہ اس کی چابی ہے تم کل رات ٹھیک دس بجے ٹرنک اسی کے اندر رکھ کر چلے جانا، کل رات ٹھیک دس بجے۔"

تم نے یہ کیسے فرض کر لیا کہ میں کل تک ٹرنک ں کامیاب ہو جاؤں گا؟"

ٹرنک تمہیں آج رات کسی وقت چوری کرنا ہے۔ یہ ری ہے کیونکہ کل تک اہل خانہ واپس آجائیں گے۔ ر کار تقریباً ڈیڑھ گھنٹے میں نیوپالٹ پہنچ جاؤ گے۔ اتنا واپسی میں لگے گا۔ مجھے یقین ہے کہ تم پندرہ بیس ں اپنا کام مکمل کر لو گے۔ اگر تم رات کے آٹھ بجے گیارہ ساڑھے گیارہ بجے تک واپس پہنچ سکتے ہو۔"

اس کے بعد کم از کم گیارہ گھنٹے مجھے اس ٹرنک کو ں رکھنا ہوگا۔" نک نے کہا۔ "کیا یہ مناسب نہ ہوگا وری طور پر ٹرنک تمہارے اپارٹمنٹ پہنچا دوں؟"

نہیں، یہ مناسب نہیں ہوگا۔"

ک نے لفافہ اٹھا کر اندر نوٹوں پر سرسری نظر ڈالی اور جیب میں رکھتے ہوئے بولا۔ "تمہارا کام ہو جائے گا وف! اب دوسری ملاقات کہاں ہوگی؟"

دوسری ملاقات کام مکمل ہونے کے فوراً بعد ہوگی۔ ی تم سے ملوں گا تاہم اگر میں کسی وجہ سے ملاقات نہ تم مجھے فون کر لینا۔"

ک نے اس کا فون نمبر نوٹ کر لیا اور اٹھ کر کاؤنٹر کی و گیا۔ اس وقت صبح کے ساڑھے دس بجے تھے اور ا خوشگوار تھا۔ نک نے کاؤنٹر کلرک سے اجازت یا کو فون کیا اور رابطہ ملنے کے بعد کہا۔ "ہیلو گلوریا! شکار کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

مچھلی کا شکار؟" گلوریا کے لہجے میں حیرت تھی۔ ب، مچھلی کے شکار کے علاوہ تم اسکیٹنگ، پیراکی بھی کر سکتی ہو۔"

میں ابھی تک تمہارا مطلب نہیں سمجھی۔"

ہم فوری طور پر نیوپالٹ جا رہے ہیں۔ میں بیس پہنچ رہا ہوں۔ میرے آنے تک تیار رہنا۔"

"نیوپالٹ! کیا تمہیں کوئی کام مل گیا ہے؟"

"باقی باتیں راستے میں ہوں گی۔" نک نے کہا اور فون بند کر دیا۔ اس نے لائبریری میں نظر ڈالی لیکن وکٹر الیانوف نامی شخص کہیں نظر نہیں آیا۔

نصف گھنٹے بعد ان کی کار اٹھارویں شاہراہ پر دوڑ رہی تھی اور نک گلوریا کو اس اچانک پروگرام کی تفصیل بتا رہا تھا۔ گلوریا کو زیادہ خوشی اس بات کی تھی کہ وہ نیویارک کے آلودہ اور پرہنگم ماحول سے نکل کر ایک کوہستانی اور پرفضا مقام کی طرف جا رہے تھے۔

بارہ بج کر چالیس منٹ پر ان کی کار نیوپالٹ کے مشہور ہوٹل ماؤنٹین ہاؤس کے پارکنگ لاٹ میں داخل ہوئی۔ مہانک جھیل کے کنارے پر واقع وہ پرانی وضع کا آرام دہ اور پرسکون ہوٹل تھا۔ نک نے اپنے لیے ایک ڈبل روم بک کرایا۔ ڈائننگ ہال میں دوپہر کا کھانا کھایا اور گلوریا کو ساتھ لے کر تفریح کے لیے نکل گیا، تاہم وہ اس مکان کو دیکھنا چاہتا تھا جہاں سے اسے ٹرنک چوری کرنا تھا۔

چاروں طرف سے پہاڑوں میں گھرا ہوا وہ ایک چھوٹا سا پرفضا قصبہ تھا۔ وہاں نہ تو ٹریفک کا شور تھا اور نہ ہی ہر طرف بلند و بالا عمارتیں، ہر طرف خاموشی اور سکون تھا۔ مطلوبہ مکان ہوٹل سے زیادہ دور نہیں تھا۔ دونوں صرف دس منٹ میں وہاں پہنچ گئے۔ وہ سرخ پتھروں کی بنی ہوئی ایک مضبوط عمارت تھی۔ اس کے اردگرد درختوں کی بہتات تھی۔ صدر دروازہ لوہے کی سلاخوں کا بنا ہوا تھا۔ قوس نما ڈرائیو وے کے اختتام پر عمارت کی سیڑھیاں نظر آرہی تھیں جن پر ایک معمر چوکیدار بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔ شکل وصورت سے وہ روسی معلوم ہوتا تھا۔ اس کے کندھے پر اسٹین گن نظر آرہی تھی۔ عمارت کا صرف ایک دروازہ کھلا تھا۔ باقی تمام دروازے اور کھڑکیاں بند تھیں جس سے یہ اندازہ ہوتا تھا کہ عمارت کے مکین اندر موجود نہیں تھے۔ بیرونی چار دیواری زیادہ اونچی نہیں تھی۔ پچھلا حصہ ایک پہاڑی کی ڈھلان کے ساتھ ملا ہوا تھا۔ نک نے عمارت کے نقشے کو ذہن نشین کر لیا اور واپس ہو لیا۔

دن کا باقی حصہ دونوں نے تفریح میں گزارا۔ رات کے دس بجے نک نے گلوریا کو ہوٹل میں چھوڑا اور کار میں بیٹھ کر مذکورہ عمارت کے سامنے پہنچ گیا۔ رات تاریک اور سنسان تھی۔ نک نے اپنی کار عمارت کے شمالی کونے کے ساتھ ایک گھنے درخت کے نیچے روک دی اور بڑی آسانی کے ساتھ دیوار پھاند کر اندر پہنچ گیا۔ ابھی وہ آگے بڑھنے کا

ارادہ کر ہی رہا تھا کہ رات کے سناٹے میں کسی کار کی آواز گونجی۔ نک پودوں کی آڑ میں دبک گیا۔ کار آہنی پھاٹک کے سامنے پہنچ کر رک گئی اور تین دفعہ اس کا ہارن بجایا گیا۔ ہیڈ لائٹس کی روشنی سے ڈرائیووے اور عمارت کا ایک حصہ روشن ہو گیا تھا۔ نک کے چہرے پر پریشانی نمودار ہو گئی۔ اس نے سوچا شاید اہل خانہ واپس آگئے ہیں۔ لمحہ بھر کے بعد بوڑھا روسی محافظ کندھے پر اسٹین گن ڈالے نمودار ہوا۔ پھاٹک کے سامنے پہنچ کر رک گیا۔ کار میں سے ایک لڑکی باہر آئی اور محافظ سے کچھ کہا۔ چونکہ وہ ہیڈ لائٹس کی روشنی میں کھڑی تھی اس لیے نک بہ آسانی اسے دیکھ سکتا تھا۔ اس کا جسم قدرے فربہ تھا اور اس نے خاصی چست پتلون پہن رکھی تھی۔ وہ چند لمحوں تک ہاتھ ہلا ہلا کر محافظ سے باتیں کرتی رہی۔ پھر کار میں بیٹھ کر واپس روانہ ہو گئی۔ محافظ ہنوز پھاٹک کے پاس کھڑا تھا، نک نے اس موقعے کو غنیمت جانا اور گھاس پر بے آواز چلتا ہوا عمارت کے کھلے ہوئے دروازے میں داخل ہو گیا۔ اندر گہری تاریکی تھی۔ نک نے جیب سے پین ٹارچ نکال لی تاہم اسے جلایا نہیں۔ داہنی طرف کے ایک کمرے میں بتی جل رہی تھی۔ غالباً وہ محافظ اسی کمرے سے نکل کر گیا تھا۔ نک بالاخانے کی طرف جانے والی سیڑھیوں کی اوٹ میں کھڑا ہو کر انتظار کرنے لگا۔ وہ یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ محافظ کس طرف جاتا ہے۔ کار کی آواز رات کے سناٹے میں معدوم ہو چکی تھی۔

چند ساعتوں کے بعد نک کو محسوس ہوا کہ بالاخانے پر کوئی چل رہا ہے، وہ چونکنا ہو کر آواز سننے کی کوشش کرنے لگا۔ آواز بہت مدھم تھی۔ یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ واقعی کوئی شخص بالاخانے پر چل رہا تھا یا محض فریب سماعت تھا۔ دو تین منٹ یوں ہی گزر گئے پھر محافظ ہال کمرے میں داخل ہوا۔ دروازے کا بولٹ چڑھایا اور ہال میں سے ہوتا ہوا داہنی طرف والے روشن کمرے میں داخل ہو گیا۔ اس کے فوراً بعد کمرے کی بتی بجھ گئی۔

نک اپنی پناہ گاہ سے باہر نکلا اور احتیاط سے تہ خانے کی سیڑھیاں اترنے لگا۔ یہ دیکھ کر اسے تھوڑی سی حیرت ہوئی کہ تہ خانے کا دروازہ کھلا تھا۔ وہ اندر چلا گیا اور ٹارچ جلا کر آس پاس کا جائزہ لیا۔ وہاں پرانا فرنیچر، ٹوٹا پھوٹا سامان، ردی اخبار اور رسائل بکھرے پڑے تھے۔ ان چیزوں پر جمی ہوئی گرد اور مکڑی کے جالوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہاں عرصے سے کسی نے قدم نہیں رکھا تھا۔ نک ذرا آگے بڑھا تو اسے دیوار کے ساتھ ایک زنگ آلود ٹرنک رکھا ہوا دکھائی دیا۔ اس پر نظر پڑتے ہی نک سمجھ گیا الیانوف نے جس ٹرنک کا ذکر کیا تھا وہ یہی تھا۔ ٹرنک کا ڈھکنا کھول کر اندر روشنی ڈالی، وہ خالی تھا۔ بات عجیب تھی کہ اس کے اوپر گرد نہیں تھی۔ نک نے ڈھکنا بند کیا اور اسے اٹھا کر سر پر رکھ لیا۔ خالی ہونے کے باوجود وہ خاصا بھاری تھا۔

سیڑھیوں کے وسط میں پہنچ کر وہ ذرا سا رکا، غیر متوقع آواز پر کان لگائے۔ اوپر ہال میں مکمل سناٹا تھا۔ وہ سیڑھیاں طے کر کے اوپر پہنچا اور داخلی دروازہ کھول کر باہر نکل گیا جیسا کہ الیانوف نے کہا تھا، اسے ٹرنک چوری کرنے میں واقعی کوئی دقت پیش نہیں آئی تھی۔ وہ اطمینان سے دیوار پھاند کر باہر پہنچا اور کار کی ڈکی کھول کر ٹرنک کو اندر رکھنے لگا جب اس نے ٹرنک کو سر سے اتارا تو اس کا ایک حصہ قدرے نیچا ہو گیا اور اندر کوئی چھوٹی سی چیز ہلکی سی کھڑکھڑاہٹ پیدا کرتی ہوئی ایک طرف سے دوسری طرف چلی گئی۔ نک کے دل میں تجسس پیدا ہوا۔ اس نے نیچے والے حصے کو اونچا کیا تو مذکورہ شے لڑھکتی ہوئی دوسری طرف چلی گئی۔ اس نے ٹرنک کھول کر اندر دیکھنے کا ارادہ کیا لیکن اسی وقت عمارت کے اندر سے کچھ ملی جلی آوازیں سنائی دیں، پہلی آواز دروازے کی تھی جیسے دروازہ کسی نے زور سے بند کیا ہو، پھر کسی کے دوڑنے اور شور مچانے کی آواز گونجی، اس کے بعد معاً کسی بھاری چیز کے گرنے کی آواز آئی پھر یکے بعد دیگرے دو فائر کیے گئے۔

نک نے جلدی سے ٹرنک کو ڈکی میں بند کیا اور کار آگے بڑھا دی۔ اس کی نظر عقب نما آئینے میں لگی ہوئی تھی لیکن کوئی گاڑی پیچھے آتی دکھائی نہیں دی۔ وہ ان آوازوں کا مطلب نہیں سمجھ پایا تھا۔ یہ بھی اندازہ نہیں تھا کہ فائر کس پر کیا گیا تھا۔ وہ رات اس نے ماؤنٹ... میں گزاری اور اگلے روز علی الصباح واپس روانہ ہوا۔ نیویارک پہنچ کر اس نے سب سے پہلے ڈکی کے اندر رکھے ہوئے ٹرنک کا ڈھکنا کھول کر اندر دیکھا۔ جس چیز کی آواز اس نے سنی تھی وہ ایک پرانی وضع کی طلائی جڑاؤ انگوٹھی تھی۔ اس کے وسط میں ایک بڑے سائز کا ہیرا جڑا ہوا تھا اور اس کے چاروں طرف چھوٹے چھوٹے ہیرے ... تھا۔ بلاشبہ وہ ایک نادر اور قیمتی انگوٹھی تھی۔ نک نے ... جیب میں رکھ لی اور ٹرنک بند کر کے ڈکی بند کر دی۔

''نک تم کیا چیز دیکھ رہے تھے؟'' گلوریا ...

نک نے گہرا سانس لیا، بولا۔ ''تمہیں ... آئے گا، مجھے ٹرنک کے اندر سے سونے کی ایک جڑاؤ انگوٹھی ملی ہے...... دیکھو۔'' اس نے جیب سے انگوٹھی نکال کر گلوریا کو دکھائی۔ ''اس میں اصلی ہیرے جڑے ہوئے ہیں۔''

گلوریا نے انگوٹھی لی اور حیرت و اشتیاق سے اسے دیکھنے لگی۔ ''میرا خیال ہے کہ تمہارے موکل نے، کیا نام ہے اس کا...... غالباً اسی انگوٹھی کے لیے ٹرنک چوری کروایا ہے۔''

نک نے نفی میں سر ہلایا، بولا۔ ''یہ بات قرین قیاس نہیں ہے۔ اول تو کوئی احمق ہی اتنی چھوٹی سی انگوٹھی اتنے بڑے ٹرنک میں رکھ سکتا ہے، دوسری بات یہ کہ یہ انگوٹھی پچیس ہزار ڈالرز کی ہرگز نہیں ہے، اس انگوٹھی کی صندوق میں موجودگی محض اتفاقیہ معلوم ہوتی ہے پھر بھی بات کچھ سمجھ میں نہیں آئی۔''

گلوریا نے مختلف انگلیوں میں انگوٹھی پہننے کی کوشش کی لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔ انگوٹھی خاصی بڑی تھی۔ ''اسے چھوٹا کروانا پڑے گا۔'' اس نے کہا۔ ''بہت کھلی ہے کسی بھی انگلی میں پوری نہیں آتی۔''

نک نے انگوٹھی اس کے ہاتھ سے لے کر جیب میں رکھی، بولا۔ ''تمہاری خوش فہمی قابل رشک ہے لیکن تمہیں یہ سن کر افسوس ہوگا کہ میں بغیر معاوضے کے کوئی چیز چوری نہیں کرتا اور دوسری بات یہ ہے کہ......''

''معاوضہ تو تم وصول کر چکے ہو۔'' گلوریا نے اس کی بات کاٹی۔

''وہ ٹرنک کا معاوضہ تھا۔ خالی ٹرنک کا اور دوسری بات......''

''کیا اب تم مجھ سے بھی معاوضہ لو گے؟''

''اور دوسری بات یہ ہے کہ میں قیمتی چیزیں چوری نہیں کرتا۔ لہٰذا میں یہ انگوٹھی اپنے پاس نہیں رکھ سکتا، اسے کسی نہ کسی طرح اس کے مالک تک پہنچانا پڑے گا۔''

گلوریا کا منہ لٹک گیا لیکن نک نے اس کی طرف توجہ نہیں دی۔ وہ کچھ اور ہی سوچ رہا تھا۔

رات کے ساڑھے نو بجے وہ مقررہ جگہ پر ٹرنک پہنچانے کے لیے روانہ ہو گیا۔ جس اپارٹمنٹ کی چابی وکٹر الیانوف نے اسے دی تھی وہ چار منزلہ عمارت کے گراؤنڈ فلور پر تھا۔ نک نے کار عمارت کے سامنے کھڑی کر دی۔ باہر نکل کر پہلے اپارٹمنٹ کے دروازے پر دستک دی پھر جواب نہ ملنے پر چابی سے دروازہ کھولا اور ڈکی سے ٹرنک نکال کر کمرے میں رکھ دیا۔ وہ ایک آراستہ اور کشادہ اپارٹمنٹ تھا اور نشست گاہ کو بڑی نفاست سے سجایا گیا تھا۔ وہ ٹرنک اس کمرے میں عجوبہ ہی لگ رہا تھا۔ لیکن نک کو اس بات سے کوئی سروکار نہیں رہا تھا۔ وہ اس قسم کے عجائبات کا عادی ہو چکا تھا۔

جب وہ باہر نکل کر کار کے قریب پہنچا تو اس نے الیانوف کو اپنا منتظر پایا۔ وہ کار کے ساتھ ٹیک لگائے سگریٹ کے کش لگا رہا تھا۔

''آج موسم کتنا خوشگوار ہے۔'' اس نے نک کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

''ہاں اتنا برا بھی نہیں ہے۔'' نک نے کہا، پھر بولا۔ ''میں نے خالی ٹرنک تمہارے اپارٹمنٹ کے اندر رکھ دیا ہے۔'' اس نے لفظ خالی، پر زیادہ زور دیا تھا۔

''مجھے تم پر رشک آرہا ہے۔'' الیانوف نے کہا۔ ''جی چاہتا ہے کہ تمہاری شاگردی اختیار کر لوں۔'' اس نے خالی ٹرنک والی بات پر کوئی توجہ نہیں دی تھی۔ نک نے اندازہ لگایا کہ اسے انگوٹھی کے بارے میں کوئی علم نہیں تھا۔ اس نے جیب سے ایک پھولا ہوا لفافہ نکال کر نک کے ہاتھ پر رکھ دیا اور بولا۔ ''حسب وعدہ بقیہ پندرہ ہزار ڈالرز۔''

نک نے لفافہ لے کر نوٹ گنے اور پھر لفافے کو جیب میں رکھتے ہوئے بولا۔ ''مجھے ٹرنک کے اندر سے ایک قیمتی چیز ملی ہے۔''

الیانوف نے پہلی بار چونک کر نک کی طرف دیکھا۔

''قیمتی چیز! کیسی قیمتی چیز؟''

''ایک جڑاؤ طلائی انگوٹھی۔''

''میرا خیال ہے کہ یہ انگوٹھی غلطی سے ٹرنک میں رہ گئی ہوگی۔'' الیانوف نے کہا۔ ''میری معلومات کے مطابق ٹرنک بالکل خالی تھا۔ وہ انگوٹھی کہاں ہے؟''

''میرے پاس ہے اور میں اسے اس کے مالک تک پہنچانے کا ارادہ رکھتا ہوں۔''

''اگر میں تمہاری جگہ پر ہوتا تو اس انگوٹھی کو بونس کے طور پر اپنے پاس رکھ لیتا۔''

''مجھے یہ بات بار بار بتانا پڑتی ہے کہ میں صرف معمولی چیزیں چوری کرتا ہوں ورنہ مجھ میں اور ایک دو ٹکے کے بازاری اچکے میں کوئی فرق نہیں رہے گا۔''

''اگر تمہارا ضمیر تمہیں اتنا ہی پریشان کر رہا ہے تو لاؤ وہ انگوٹھی میرے سپرد کر دو۔ میں اسے اس کے مالک تک پہنچا دوں گا۔''

نک نے نفی میں سر ہلایا، بولا۔ ''میں یہ کام خود بھی کر سکتا ہوں۔''

الیانوف انگوٹھی کے لیے اصرار کرتا رہا لیکن نک کار میں جا بیٹھا اور اسے آگے بڑھا دیا۔

اگلی صبح ناشتے کی میز پر نک ایک خبر پڑھ کر چونک گیا۔

نیو پالٹ میں ڈکیتی کی سنسنی خیز واردات، لاکھوں روپے کے جواہرات اور نوادر چوری ہو گئے۔ مزاحمت کرنے پر ڈاکوؤں نے مسلح محافظ کو قتل کر دیا۔ پولیس نے تین افراد کو جن میں ایک لڑکی بھی شامل ہے، گرفتار کر لیا ہے۔ تفصیلات کے مطابق دو روز قبل تین مسلح افراد نیو پالٹ کے ایک مکان میں چوری کی نیت سے داخل ہوئے۔ مکان کا مالک اس وقت گھر میں موجود نہیں تھا۔ صرف ایک مسلح محافظ تھا جسے ڈاکوؤں نے قتل کر دیا اور لاکھوں ڈالرز مالیت کے جواہرات اور نوادر چوری کر کے لے گئے۔ گزشتہ رات پولیس نے نامعلوم مخبر کی رپورٹ پر نیویارک کے ایک اپارٹمنٹ پر چھاپہ مار کر ایک ٹرنک اور لوٹے ہوئے جواہرات کا کچھ حصہ برآمد کر لیا ہے اور تین افراد کو گرفتار کر لیا۔ ان کے نام یہ ہیں۔ پینتیس سالہ ایلن کننگھم بتیس سالہ تھامس روڈی اور تیس سالہ اینا الیانوف۔"

خبر پڑھنے کے بعد نک کے پیٹ میں بل پڑنے لگا۔ واضح طور پر الیانوف نے اسے اپنا آلۂ کار بنایا تھا۔ اس نے تین بے گناہ افراد کو پھانسنے کے لیے سارا چکر چلایا تھا۔ نیز یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ اینا الیانوف اس کی قریبی رشتہ دار تھی۔ نک نے جیب سے وہ پرزہ نکالا جس پر الیانوف کا نمبر درج تھا اور ٹیلی فون کے پاس جا کر نمبر ڈائل کرنے لگا۔

"صبح بخیر۔" رابطہ ملنے کے بعد ایک خوشگوار نسوانی آواز سنائی دی۔ "برک شائر ہوٹل، میں آپ کی کیا خدمت کر سکتی ہوں؟"

"میں وکٹر الیانوف سے بات کرنا چاہتا ہوں۔"

"ذرا توقف کیجیے۔" لڑکی نے کہا۔ پھر لمحہ بھر کے بعد الیانوف کی آواز سنائی دی۔

"مسٹر الیانوف۔" نک نے کہا۔ "میں نک ویلوٹ بول رہا ہوں۔"

"اوہ ہیلو مسٹر ویلوٹ۔" الیانوف نے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ تمہارا کام ختم ہو چکا ہے۔"

"مسٹر الیانوف! میں تم سے فوری طور پر ملنا چاہتا ہوں میرا خیال ہے کہ مجھے آلۂ کار بنایا گیا ہے۔"

"اوکے مسٹر ویلوٹ۔ میں یہاں برک شائر ہوٹل میں مقیم ہوں، کمرا نمبر سات سو ستائیس۔ تم کسی وقت بھی مجھ سے مل سکتے ہو۔ یہ ہوٹل میڈیسن ایونیو پر واقع ہے۔"

"مجھے معلوم ہے۔ میں پندرہ منٹ تک وہاں پہنچ رہا ہوں۔"

نک نے ناشتا ادھورا چھوڑا اور تیار ہو کر برک شائر ہوٹل پہنچ گیا۔ وکٹر الیانوف رنگین ٹی وی کے سامنے بیٹھا سگار پی رہا تھا۔ اس نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ نک کا استقبال کیا اور اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"میں تفصیل جاننا چاہتا ہوں۔" نک نے مطالبہ کیا۔

"کس بات کی تفصیل مسٹر ویلوٹ؟"

"جن تین افراد کو پولیس نے گرفتار کیا ہے، وہ کون ہیں؟" نک نے کہا۔ "اینا الیانوف سے تمہارا کیا رشتہ ہے؟ روسی محافظ کو کس نے قتل کیا ہے؟ اور وہ نامعلوم مخبر کون ہے جس نے پولیس کو رپورٹ کی؟"

الیانوف نے چیک بک جیب سے نکالی۔ ایک چیک لکھ کر اس پر دستخط کیے اور اسے نک کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ "مزید پانچ ہزار ڈالرز، یہ رقم چند روز کسی تفریحی مقام پر گزارنے کے لیے کافی ہوگی۔ اس کے بعد تم بھول جاؤ گے کہ تم نے کوئی ٹرنک چوری کیا تھا یا الیانوف نامی کسی شخص سے ملاقات ہوئی تھی اور ہاں...... وہ انگوٹھی بھی رکھ لو۔"

آخری بات سن کر نک چونک گیا۔ "اچھا تو یہ بات ہے۔" اس نے کہا۔ "وہ مکان تمہارا اپنا ہے، مجھے پہلے ہی شبہ تھا۔"

الیانوف نے اثبات میں سر ہلایا، بولا۔ "ان سب باتوں کو بھولنے کے لیے یہ پانچ ہزار ڈالرز کافی ہوں گے۔"

نک نے اس کے ہاتھ سے چیک لیا اور اس کے چار ٹکڑے کر کے واپس دے دیا۔ "مسئلہ تین بے گناہ افراد کا ہے جنہیں تم نے قتل اور ڈکیتی کے الزام میں گرفتار کرایا ہے۔"

الیانوف نے کچھ اس طرح نک کی طرف دیکھا جیسے اس کی حرکت سے اسے سخت صدمہ پہنچا ہو، بولا۔ "مجھے معلوم نہیں تھا کہ تم اس حد تک احمق ہو سکتے ہو۔ جن تین افراد کو تم بے گناہ قرار دے رہے ہو اگر وہ چھوٹ گئے تو پھندا تمہاری گردن میں آ جائے گا۔ میڈیکل رپورٹ میں محافظ کی موت کا جو وقت بتایا گیا ہے اس وقت تم جائے وقوعہ پر موجود تھے قتل اور ڈکیتی کا الزام تم پر بھی آ سکتا ہے۔"

اس کی بات خاصی وزنی تھی، نک سوچنے پر مجبور ہو گیا۔

"میں تمہارا تجسس دور کرنے کے لیے تھوڑی سی تفصیل بتا دیتا ہوں۔" الیانوف نے کہا۔ "مکان کے بارے میں تمہارا اندازہ درست ہے۔ وہ ہمارا آبائی مکان ہے۔ اینا الیانوف میری سوتیلی بہن ہے، میرے آباؤ اجداد روسی تھے۔ تم نے میرے دادا جنرل بورس الیکسی الیانوف کا نام ضرور سنا ہوگا۔ 1921ء میں انہیں لینن کے ساتھ ... اختلافات کی بنا پر مجبوراً روس چھوڑنا پڑا۔ روس سے فرار ہونے کے بعد انہوں نے استنبول میں جو اس وقت قسطنطنیہ کہلاتا تھا، پناہ لی۔ فوج میں جنرل ہونے کے علاوہ وہ خاندانی رئیس تھے اور اپنے ساتھ جواہرات، زیورات اور نوادرات کی شکل میں بے پناہ دولت لے کر گئے تھے۔"

نک نے معنی خیز انداز میں سر ہلایا۔ "جواہرات اور نوادرات! میں تھوڑی دیر پہلے اخبار میں بھی ان کے بارے میں پڑھ چکا ہوں۔"

"میں اپنے دادا کے زمانے کی بات کر رہا ہوں۔ استنبول میں قیام کے دوران جواہرات کو چوری کرنے کی چند کوششیں کی گئی تھیں لیکن کوئی کوشش کامیاب نہیں ہوئی۔ 1932ء میں میرے دادا اس ملک میں آ گئے اور یہاں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ شروع میں کچھ عرصہ وہ کیلی فورنیا میں رہے پھر نیویارک آ گئے اور نیو پالٹ میں مکان بنا کر آباد ہو گئے۔ وہ اپنا خزانہ ایک مضبوط ٹرنک میں مقفل رکھتے تھے اور ان کے سوا کوئی اس خزانے کے بارے میں نہیں جانتا تھا۔ مرنے سے چند ہفتے قبل انہوں نے خزانے کا راز اپنے اکلوتے بیٹے یعنی میرے باپ کو بتا دیا۔ ہماری خاندانی روایات کے مطابق عورتوں کو اس خزانے کے بارے میں کچھ نہیں بتایا جاتا۔ نہ ماں کو، نہ بہن کو، نہ بیٹی کو۔"

"تمہارا خاندان خاصا قدامت پسند معلوم ہوتا ہے۔"

"مسٹر ویلوٹ! ہم روسی خاندانی قدروں کا بہت خیال رکھتے ہیں۔ تمہارے ملک میں آزادیٔ نسواں کا جو شور مچا ہوا ہے، وہ درحقیقت بربادیٔ نسواں ہے۔ یہ ایک سازش ہے نفس پرستوں کی، اس آزادی کے نام پر عورت کو عریاں کیا گیا ہے، اس کے کپڑے اتارے گئے ہیں۔"

"تم اپنے دادا الیکسی الیانوف کا ذکر کر رہے تھے۔" نک نے اسے یاد دلایا۔

"ہاں، میرے دادا نے اپنی موت سے قبل خزانے کا راز میرے باپ کو بتا دیا۔ میرے باپ نے ایک امریکن عورت سے شادی کی بلکہ دو شادیاں کیں۔ ان کی پہلی بیوی جو میری ماں تھی ایک حادثے میں فوت ہو گئی تو میرے باپ نے دوسری شادی کر لی۔ اینا اس دوسری بیوی کی اولاد ہے۔"

"اینا کی ماں کہاں ہے؟"

"میرے باپ نے اسے طلاق دے دی تھی۔ دونوں کا نباہ نہیں ہو سکا۔ یہ آج سے بیس سال پہلے کی بات ہے۔ وہ اینا کو لے کر نیویارک چلی گئی تھی۔ بعد میں اس نے کسی اور شخص کے ساتھ شادی کر لی تھی۔ اینا وقتاً فوقتاً ملنے آتی رہتی تھی۔ والد اسے باقاعدگی سے خرچ دیتے تھے۔"

"یہ جواہرات کی چوری کا کیا معاملہ ہے؟"

"میرے والد کا ایک ہفتہ قبل انتقال ہوا ہے۔ انہوں نے مرنے سے قبل مجھے خاندانی خزانے کے بارے میں بتا دیا تھا۔ مجھ سے یہ حماقت ہوئی کہ میں نے ان تمام باتوں کو ڈائری میں نوٹ کر دیا۔ یہ خزانہ اس ٹرنک میں تھا جو تم نے چوری کیا ہے۔ یہ ٹرنک ہمیشہ مقفل رہتا تھا۔ میں اکثر حیران ہوتا تھا کہ تہ خانے میں رکھے ہوئے اس بھاری ٹرنک میں کیا چیز بند ہے؟ میرے والد کہا کرتے تھے کہ مجھے اس ٹرنک کے بارے میں وہ ایک دن ضرور بتائیں گے اور بالآخر انہوں نے اپنا وعدہ پورا کیا۔

والد کی وفات والے روز میری سوتیلی بہن اینا بھی یہاں آ گئی جس وقت میں تجہیز و تکفین کے انتظامات میں مصروف تھا اس وقت وہ سارے گھر کی الماریاں اور درازیں دیکھتی پھر رہی تھی...... شاید اسے اہم خاندانی دستاویزات کی تلاش تھی۔ اسی دوران میں میری ڈائری اس کے ہاتھ لگ گئی اور اسے صندوق میں مقفل خزانے کے بارے میں سب کچھ پتا چل گیا۔ اس کے دو روز بعد وہ اپنے دو ساتھیوں کے ہمراہ یہاں آئی اور ٹرنک کا تالا توڑ کر سارے زیورات نکال کر لے گئی۔"

"کیا تمہارے پاس اس کا کوئی ثبوت ہے؟"

"یہی تو ساری مصیبت تھی۔ میرے پاس کوئی ثبوت موجود نہیں ہے لیکن یہ بات یقینی ہے کہ چوری کے پیچھے اسی کا ہاتھ تھا۔ میں نے اسے ڈائری پڑھتے دیکھ لیا تھا۔"

"لہٰذا تم نے میرے ذریعے ٹرنک چوری کروا کے اس کے اپارٹمنٹ میں رکھوا دیا اور پھر گمنام مخبر کی حیثیت سے پولیس کو رپورٹ کر دی، لیکن میرا خیال ہے کہ تم اس کے اپارٹمنٹ میں ٹرنک رکھوائے بغیر بھی رپورٹ درج کروا سکتے تھے۔"

"ہاں میں ایسا کر سکتا تھا لیکن میرا قیاس یہ تھا کہ اینا نے مسروقہ مال اپنے اپارٹمنٹ میں نہیں رکھا ہوگا۔"

"لیکن ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔" نک نے کہا۔ "تمہارے محافظ کو کس نے قتل کیا ہے؟"

"ظاہر ہے یہ کام اینا اور اس کے ساتھیوں کے سوا

اور کون کر سکتا ہے؟"

"یہ بات کچھ بے ربطی معلوم ہوتی ہے اگر بقول تمہارے اینا اور اس کے ساتھی پانچ روز قبل جواہرات چوری کر کے لے گئے تھے تو انہیں دوبارہ آنے کی کیا ضرورت تھی؟"

"غالباً انہیں شبہ ہو گیا تھا کہ محافظ نے انہیں چوری کرتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ کچھ ایسی ہی بات ہو سکتی ہے، یا ہو سکتا ہے کہ وہ کچھ اور سامان چوری کرنے آئے ہوں۔"

نک ہولے ہولے سر ہلانے لگا۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ معاملہ اس کی سمجھ میں آچکا ہے۔

"تو پھر کیا خیال ہے مسٹر ویلوٹ؟" الیانوف نے کہا۔ "کیا میں دوسرا چیک لکھ دوں؟"

نک نے گہرا سانس لیا، جیب سے جڑاؤ انگوٹھی نکال کر الیانوف کے ہاتھ پر رکھی اور کچھ کہے بغیر کمرے سے نکل گیا۔ ایک گھنٹے بعد وہ پولیس ہیڈ کوارٹر میں ملاقاتیوں کے کمرے میں بیٹھا تھا۔ کاؤنٹر کی دوسری جانب اینا الیانوف، ایلن کننگھم اور تھامس روڈی بیٹھے تھے۔ تینوں کے چہروں پر گھبراہٹ پائی جاتی تھی۔ نک نے اینا کو پہلی ہی نظر میں پہچان لیا تھا۔ وہ اسے دوسری بار دیکھ رہا تھا۔ پہلی بار اس نے اسے وکٹر الیانوف کے آہنی پھاٹک کے سامنے اس وقت دیکھا تھا جب وہ ٹرنک چرانے گیا تھا۔

"میرا نام نکولس ویلوٹ ہے۔" نک نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا۔

"ہمیں کسی وکیل کی ضرورت نہیں ہے۔" اینا نے کہا۔ "ہم اپنے وکیل کا انتظام کر چکے ہیں اور اگر تم اخباری نمائندے ہو تو ہم کوئی بیان نہیں دینا چاہتے۔"

"ہم نے کوئی جواہرات چوری نہیں کیے۔" تھامس روڈی نے کہا۔ "ہمیں دھوکے سے پھانسا گیا ہے۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے۔" نک نے کہا۔

"تم کون ہو؟" اینا نے پوچھا۔ "اور تمہارا اس معاملے سے کیا تعلق ہے؟"

"فی الحال میں کوئی تفصیل نہیں بتا سکتا۔ یوں سمجھ لو کہ مجھے بھی دھوکے سے اس معاملے میں پھانسا گیا ہے۔"

"یہ مجھے وکٹر کا ساتھی معلوم ہوتا ہے۔" کننگھم نے کہا۔

"تم کیا چاہتے ہو؟" اینا نے پوچھا۔

"میں تمہاری مدد کرنا چاہتا ہوں۔" نک نے کہا۔

"وکٹر کا کہنا ہے کہ تم نے اس کے ٹرنک سے بھاری مالیت کے جواہرات اور نوادر چوری کر لیے ہیں۔ پولیس نے تمہارے اپارٹمنٹ سے کچھ سامان بھی برآمد کیا ہے۔ اگر اس کا الزام صحیح ہے تو پھر تم تینوں پر صرف چوری کا نہیں قتل کا الزام بھی آئے گا۔"

"قتل! کس کا قتل؟"

"وکٹر کے بوڑھے محافظ کا قتل۔"

"اوہ نہیں۔ وکٹر کا دماغ خراب ہو گیا ہے، وہ مجھے پاپا کی جائداد سے محروم کرنا چاہتا ہے یقیناً اس نے خود ہی میخائل کو قتل کیا ہے۔"

"مس اینا، تم پرسوں رات نیو پالٹ میں دیکھی گئی تھیں، اپنے آبائی مکان کے سامنے اور میخائل بھی پرسوں رات ہی قتل کیا گیا ہے، اس اعتبار سے تمہاری پوزیشن بہت نازک ہے۔"

"پرسوں میں وکٹر کی دعوت پر نیو پالٹ گئی تھی، اس نے کہا تھا کہ وہ جائداد کے بارے میں کچھ بات چیت کرنا چاہتا ہے لیکن جب ہم وہاں پہنچے تو میخائل نے بتایا کہ وکٹر نیویارک گیا ہوا ہے لہٰذا ہم پھاٹک ہی سے واپس چلے گئے۔"

نک سوچ میں پڑ گیا۔ اگر اینا سچ بول رہی تھی تو وکٹر الیانوف نے نہایت ہوشیاری کے ساتھ منصوبہ ترتیب دیا تھا۔ جس وقت اس کا ملازم میخائل قتل ہوا اس وقت اینا مکان کے آس پاس موجود تھی لہٰذا اس کا قتل کے الزام سے بچنا محال تھا۔ خصوصاً اس وجہ سے بھی کہ مسروقہ سامان اس کے اپارٹمنٹ سے برآمد ہوا تھا۔

"تمہارے وکٹر کے ساتھ کیسے تعلقات تھے؟" نک نے پوچھا۔

"بس واجبی سے تھے۔ ہمارا آپس میں کوئی اختلاف نہیں تھا۔ کم از کم پاپا کی موت سے پہلے تک کوئی اختلاف نہیں تھا۔ شاید وکٹر کا خیال تھا کہ پاپا اپنی جائداد میں سے مجھے کوئی حصہ نہیں دیں گے۔ لیکن ان کی وصیت کے مطابق میں کل جائداد کے تیسرے حصے کی ملک ہوں۔"

نک نے حیرت سے آنکھیں پھیلائیں۔ وکٹر کی سازش کا محرک واضح ہوتا جا رہا تھا۔

"مس اینا، کیا تم نے وکٹر کو اپنے اپارٹمنٹ کی چابی دے رکھی ہے؟"

"میں نے اسے اپنے اپارٹمنٹ کی چابی تو نہیں دی لیکن چند روز پہلے میری ایک چابی گم ہو گئی تھی۔"

"کیا تمہیں ان جواہرات اور نوادر کے بارے میں علم تھا جو تمہارے پاپا نے ٹرنک میں بند کر رکھے تھے؟"

"یہ بات مجھے پاپا نے اپنی موت سے دو ہفتے قبل

نائی تھی۔"

"اور اب بقول وکٹر تم لوگوں نے ٹرنک کا تالا توڑ کر
ہ تمام خزانہ چوری کرلیا ہے اور واردات کے دوران
ڑھے محافظ میخائل کو قتل کردیا ہے بہ ظاہر تمام شواہد تمہارے
لاف جاتے ہیں۔ اگر تمہیں قتل اور چوری کے الزام میں
زا ہوجاتی ہے تو تم جائداد سے محروم ہوجاؤ گی یا دوسرے
فظوں میں وکٹر بڑے اطمینان سے ساری جائداد پر قابض
وجائے گا لیکن میرا خیال ہے کہ میں اس کی سازش کو بے
قاب کرسکتا ہوں بشرطیکہ تم تعاون کرو۔"

"کس قسم کا تعاون؟"

"مسئلہ یہ ہے کہ افراط زر کے اس دور میں کوئی شخص بغیر
عاوضے کے کام نہیں کرتا اور میں بھی اس کمزوری سے مستثنیٰ
ہیں ہوں۔ میرا مطلب ہے تمہیں فیس ادا کرنا پڑے گی۔"

"کتنی فیس؟"

"میری عام فیس پچیس ہزار ڈالرز ہے لیکن تم سے میں
صوصی رعایت کروں گا اور صرف پندرہ ہزار ڈالرز لوں گا۔"

"پندرہ ہزار ڈالرز!" تھامس روڈی نے کہا۔ "یہ تو
ہت زیادہ ہے۔"

"عمر قید اور جائداد سے محرومی کے مقابلے میں کچھ بھی
ہیں ہے اور یہ فیس اس وقت واجب الادا ہوگی جب تم لوگ
عزت بری ہوجاؤ گے، بلکہ اس معاملے کا ایک اور روشن پہلو
ہے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ بات قبل از وقت ہوگی۔"

"مجھے منظور ہے۔" اینا نے کہا۔ "اگر تم ہمیں بری کرانے
یں کامیاب ہوگئے تو میں تمہاری فیس ادا کردوں گی۔"

"خوب! اب میں کچھ باتیں علیحدگی میں تم سے کرنا
چاہتا ہوں۔"

اینا نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ وہ ذرا ایک طرف
ہوجائیں۔ دونوں نے برا سامنہ بنایا تاہم ایک طرف
ہوگئے پھر نک دبے لہجے میں اینا سے بات کرنے لگا۔ تھوڑی
دیر بعد ڈیوٹی پر متعین محافظ نے وقت ختم ہونے کا اعلان کیا
اور نک اپنی نشست سے اٹھ گیا۔

اپارٹمنٹ پہنچ کر اس نے گلوریا سے کافی بنانے کے
لیے کہا، پھر ریسیور اٹھا کر برک شائر ہوٹل کا نمبر ملایا اور وکٹر
الیانوف سے بات کرنے کی خواہش ظاہر کی لیکن آپریٹر نے
بتایا کہ وکٹر الیانوف ہوٹل چھوڑ چکا ہے۔ نک نے انکوائری
سے الیانوف کے نیو پالٹ والے مکان کا نمبر معلوم کیا اور
ایک گھنٹا انتظار کرنے کے بعد رنگ کیا۔ تیسری گھنٹی کے بعد
ریسیور اٹھانے کی آواز سنائی دی۔

"وکٹر الیانوف......" دوسری طرف سے آواز آئی۔

"مسٹر الیانوف میں نک ویلوٹ بول رہا ہوں۔ میں نے
تمہاری تجویز پر غور کیا ہے اور اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ وہ اتنی بری
بھی نہیں ہے لیکن کیا تم پانچ ہزار ڈالرز کو دگنا نہیں کرسکتے؟"

"ہاں! نک ویلوٹ! مجھے معلوم تھا کہ تم دوبارہ رنگ
کرو گے۔ کیا کہا، پانچ ہزار کو دگنا کردوں! اگر یہ بات تم
اس وقت کرتے تو شاید میں غور کرتا لیکن اب نہیں۔ اب
تمہیں پانچ ہزار پر ہی قناعت کرنا پڑے گی۔"

"ٹھیک ہے۔" نک نے بہ ظاہر بجھی ہوئی آواز میں
کہا۔ "تمہارے ساتھ ملاقات کہاں ہوسکتی ہے؟"

"یہاں آجاؤ، تم نے میرا گھر تو دیکھا ہی ہوا ہے۔"

"کیا تم نیویارک نہیں آسکتے؟"

الیانوف نے جواب دینے میں کچھ توقف کیا پھر بولا......

"اوکے، میں آج شام آٹھ بجے برک شائر میں ملوں گا۔"

اس کے ساتھ ہی اس نے سلسلہ منقطع کردیا۔

رات کے ٹھیک آٹھ بجے نک کی کار وکٹر الیانوف کے
وسیع مکان کے قریب پہنچ کر رک گئی۔ اس نے انجن بند کیا
اور باہر آگیا۔ اس نے ایک فرلانگ دور ہی اپنی کار کی بتیاں
بجھا دیں۔ اس نے بغیر آواز پیدا کیے احتیاط سے کار کا
دروازہ بند کیا اور اردگرد نظر دوڑائی۔ گلی دونوں طرف دور
دور تک سنسان پڑی تھی۔ اس وقت وہ گہرے سبز رنگ کی
ٹی شرٹ اور اسی رنگ کی پتلون پہنے ہوئے تھا۔ رات کی
تاریکی میں درختوں اور پودوں کے پس منظر میں وہ دور سے
بالکل نظر نہیں آتا تھا۔

عمارت کے اندر سناٹا اور تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ نک
دیوار پھاند کر اندر پہنچا اور لان پر بے آواز چلتا ہوا داخلی
دروازے پر پہنچ گیا۔ دروازہ مقفل تھا۔ نک نے جیب سے
چابیوں کا بڑا سا گچھا نکالا اور بضمی قفل پر طبع آزمائی کرنے
لگا۔ دو منٹ سے بھی کم عرصے میں تالا کھل گیا اور وہ اندر چلا
گیا۔ اندر گہری تاریکی تھی اور کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ نک نے
جیب سے پین ٹارچ نکالی اور چوبی زینے طے کرکے اوپر
پہنچ گیا۔ اگرچہ اتنے بڑے محل نما مکان کے ایک ایک
کمرے کو چیک کرنا آسان کام نہیں تھا تاہم نک کو یقین تھا
کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوجائے گا۔ اس نے سوچا
وکٹر الیانوف اس وقت برک شائر ہوٹل میں اس کا انتظار کر
رہا ہوگا۔ اگر اسے شبہ ہوگیا اور فوری طور پر واپس روانہ ہوگیا
تو تقریباً ڈیڑھ گھنٹے میں واپس پہنچے گا۔ اس دوران میں وہ
اپنے کام سے فارغ ہوچکا ہوگا۔

پہلا کمرا کھولا اور تلاش شروع کردی۔ زیادہ
تھے اور کھولنے میں نک کو سخت محنت کرنا
گزر گیا لیکن کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔ اس
خانے سے ملحقہ اسٹور میں کھڑا تھا۔ وہاں
راشن، کچھ خالی اور کچھ بھرے ہوئے
برتن پڑے ہوئے تھے۔ ایک طرف ایک
خراب ریفریجریٹر رکھا تھا جس کے دائیں
چند ڈبے اوپر تلے رکھے ہوئے تھے۔ نک
تمام ڈبوں کو کھول کر دیکھا۔ ان میں مختلف
بھری ہوئی تھیں پھر اس نے ریفریجریٹر کا
اندر نظر ڈالی تو اس کی آنکھیں حیرت سے
اندر زیور اور نوادرات بھرے ہوئے تھے اور
انہ تھا جو ٹرنک سے نکالا گیا تھا اور جس کی چوری
اینا اور اس کے دو ساتھی جیل میں بند تھے۔
نے باورچی خانے میں رکھے ہوئے اضافی فون
یس کا نمبر ملایا۔ دوسری طرف سے جس شخص
اس نے اپنا نام سارجنٹ بروکس بتایا۔
ایک واردات کی اطلاع دینا چاہتا ہوں۔"

را نام؟"
نے قدرے تامل کرتے ہوئے کہا۔ "رچرڈ نکسن۔"
..... کیا؟" سارجنٹ بروکس گھبرا گیا۔ "کیا
مریکی صدر ہیں؟"
ات سن کر میں ہمیشہ شرمندہ ہوجاتا ہوں۔ خوش
ں نہ تو سابق صدر ہوں اور نہ ہی سابق صدر سے
ہے۔"
ں واردات کی بات کررہے تھے۔" سارجنٹ
ول پر آگیا۔
ات کی چوری کی۔"
چند روز پیشتر وکٹر الیانوف نامی شخص نے
چوری کی رپورٹ درج کرائی تھی اور اس
دوران اس کا محافظ ہلاک ہوگیا تھا۔" سارجنٹ

بالکل درست سمجھا ہے۔ میں نے ان
ت کا سراغ لگالیا ہے۔ یہ ایک پرانے
ور رکھے ہیں۔"
سے بات کررہے ہو؟"
میں نے پہلے دانستہ نہیں بتائی کیونکہ یہ

بات بتانے کے فوراً بعد میں یہاں سے رخصت ہوجاؤں
گا۔ یہ مبینہ مسروقہ مال مسٹر وکٹر الیانوف کے گھر میں ہی
موجود ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس کے بعد تمہیں یہ اندازہ
لگانے میں دیر نہیں لگے گی کہ چوری اور قتل کی ساری ذمے
داری الیانوف پر عائد ہوتی ہے اور جو تین افراد اس ضمن
میں نیویارک پولیس نے گرفتار کیے ہیں، وہ بے گناہ ہیں۔"

"مسٹر نکسن تم وہیں رکو میں چند منٹ کے اندر وہاں
پہنچ رہا ہوں۔"

لیکن نک نے فون بند کردیا اور جانے کے لیے مڑا۔
تب اچانک باورچی خانے کی بتی روشن ہوگئی۔ نک نے نظر
اٹھا کر دیکھا تو وکٹر الیانوف ریوالور ہاتھ میں پکڑے
دروازے میں کھڑا تھا۔

"تم نے دانش مندی کا ثبوت نہیں دیا مسٹر نک۔"
اس نے غصے سے کہا۔ "میں نے تمہیں مشورہ دیا تھا کہ پانچ
ہزار ڈالرز لے کر سب کچھ بھول جاؤ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ تم
اپنے آپ کو مصیبت میں ڈالنا پسند کرتے ہو۔"

"پہلی بات تو یہ ہے کہ میں نے قاتلوں سے کبھی
سمجھوتا نہیں کیا۔" نک اپنی گھبراہٹ پر قابو پاتے ہوئے
بولا۔ "دوسری بات یہ ہے تم نے مجھے اپنا آلۂ کار بنا کر تین
بے گناہ افراد کو قتل اور ڈکیتی کے الزام میں گرفتار کرادیا ہے
اور یہ بات مجھے قطعاً پسند نہیں ہے۔"

"دنیا میں ہزاروں چیزیں ایسی ہیں جو انسان پسند
نہیں کرتا۔ لیکن پھر بھی انہیں برداشت کرنے پر مجبور ہوتا
ہے، ویسے تم فون پر کس سے باتیں کررہے تھے؟"

یہ سوال سن کر نک کو اطمینان ہوا۔ الیانوف کو یہ معلوم
نہیں تھا کہ وہ پولیس سے بات کررہا تھا۔ وہ اسے پولیس
کے آنے تک باتوں میں الجھائے رکھ سکتا تھا۔

"میں نیویارک میں گلوریا سے بات کررہا تھا۔" نک
نے کہا۔ پھر فوراً ہی موضوع بدلتے ہوئے بولا۔ "یہ سن کر
تمہیں یقیناً کوئی خوشی نہیں ہوگی کہ میں آج صبح تمہاری سوتیلی
بہن سے ملا تھا۔ اس نے مجھے ایک مختلف کہانی سنائی ہے۔"

"بولتے جاؤ۔"

"اس کا کہنا ہے کہ اس نے تمہاری ڈائری نہیں دیکھی
تھی بلکہ تمہارے والد نے اسے جواہرات کے بارے میں
بتایا اور نیز یہ کہ وصیت کی رو سے وہ جائداد کے تیسرے حصے
کی وارث ہے۔ اس کے علاوہ میں نیو پالٹ کی پولیس کے
چیف سے بھی ملا ہوں۔" یہ بات اس نے اپنی طرف سے
بنائی تھی اور ان معلومات کی بنا پر بنائی تھی جو اسے

اینا الیانوف سے حاصل ہوئی تھیں۔ ”مجھے معلوم ہوا ہے کہ ایلون نامی ایک بدمعاش سے تمہارا خاصا میل ملاپ ہے۔ جس روز میں یہاں ٹرنک چوری کرنے آیا تھا اس روز تم نے اینا اور اس کے ساتھیوں کو بات چیت کے لیے یہاں بلایا تھا لیکن خود نیویارک چلے گئے۔ یہ تمہاری سازش کا ایک حصہ ہی تھا۔ اس روز میں نے بالاخانے پر کسی کے قدموں کی چاپ سنی تھی۔ میں اسے وہم سمجھا تھا لیکن حقائق جاننے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ وہ وہم نہیں تھا، وہاں ایلون چھپا ہوا تھا جب میں ٹرنک لے کر باہر چلا گیا تو اس نے دروازے پر کھٹکا کر کے محافظ کو باہر آنے پر مجبور کیا اور پھر تمہاری ہدایت کے مطابق اسے قتل کر دیا۔ اس سے چند لمحے قبل اینا اور اس کے ساتھی محافظ سے بات کر کے گئے تھے لہٰذا وہ جائے وقوعہ سے اپنی عدم موجودگی ثابت نہیں کر سکتے تھے۔“

”تم ان باتوں میں سے ایک بھی ثابت نہیں کر سکتے مسٹر ویلوٹ!“

”شاید تم ٹھیک کہتے ہو۔“ نک نے چالاکی سے کہا۔ اس کے کان پولیس کے سائرن کی طرف لگے ہوئے تھے۔ ”کسی بات کا جاننا اور بات ہے اور ثابت کرنا اور بات۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ کسی طرح تمہاری سوتیلی بہن اور اس کے ساتھی بری ہو جائیں۔“

”اور میں یہ چاہتا ہوں کہ تمہارا منہ ہمیشہ کے لیے بند کر دوں تم اس وقت مداخلت بے جا کے مرتکب ہوئے ہو بلکہ چوری کی نیت سے میرے گھر میں گھسے ہو۔ میں پولیس کو یہ کہہ کر مطمئن کر سکتا ہوں کہ میں نے اپنی حفاظت میں گولی چلائی تھی۔ اب تم ایسا کرو کہ دونوں ہاتھ سر پر رکھ لو اور میرے آگے آگے چلو۔ میں تمہیں کسی مناسب جگہ پر گولی مارنا چاہتا ہوں۔“

نک نے اس کے حکم کی تعمیل کی اور سر پر ہاتھ رکھ کر اس کے آگے چل پڑا۔ اسی لمحے پولیس کے سائرن کی آواز سنائی دی۔ الیانوف چونک گیا۔ لمحہ بھر کے بعد عمارت کے باہر گاڑی رکنے کی آواز سنائی دی۔ اس کے بعد دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز اور پھر بھاری قدموں کی گونج۔ الیانوف آنکھیں جھپکاتا ہوا نک کی طرف دیکھنے لگا۔ دو پولیس آفیسر مارچ کرتے ہوئے سیدھے باورچی خانے کی طرف آئے۔

”یہ شخص چوری کی نیت سے میرے گھر میں داخل ہوا ہے۔“ الیانوف نے بدحواسی کے ساتھ کہا۔ ”اسے گرفتار کر لیں۔“

”رچرڈ ڈکسن کس کا نام ہے؟“ ایک پولیس افسر نے پوچھا۔

”و...... دراصل یہ میرا قلمی نام ہے۔“

”مم...... میرا مطلب ہے کہ فون میں نے ہی کیا

”فون کیا تھا۔“ الیانوف کے چہرے

بدحواسی نمودار ہو گئی۔

”ریوالور نیچے کر لو۔“ آفیسر نے الیا

پھر نک سے مخاطب ہو کر بولا۔ ”تم نے فون

مال کا ذکر کیا تھا وہ کہاں ہے؟“

نک اسٹور کی طرف اشارہ کرتے ہو

اسٹور ہے جس کا میں نے فون پر ذکر کیا تھا

ایک پرانا ریفریجریٹر......“

”خبردار!“ الیانوف نے ایک دم

اسے اپنا منصوبہ فیل ہوتا دکھائی دیا۔ ”کوئی

قدم رکھنے کی کوشش نہ کرے۔“

”ریوالور نیچے پھینک دو۔“ ایک آفیسر

کو حکم دیا۔

”میں کہتا ہوں کہ میرے گھر سے نکل

نے چیخ کر کہا۔ ”تم لوگ بغیر سرچ وارنٹ کے

کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگا سکتے۔“ وہ دو قدم پیچھے ہٹا

دونوں پولیس افسروں کو ریوالور کی زد پر لے لیا

”ریوالور پھینک دو۔“ پہلا آفیسر دہا

کے ساتھ ہی اس کا ریوالور باہر آیا۔ اس کے

شعلہ لپکا اور الیانوف چیخ مار کر دہرا ہو گیا۔ اس

ریوالور چھوٹ کر دور جا پڑا۔ آفیسر کے ریوالور

گولی اس کے ہاتھ کو چاٹتی گزر گئی تھی۔ دوسر

پستول اٹھا لیا اور جیب سے رومال نکال کر الیانو

پر باندھ دیا، پہلا پولیس آفیسر نک کے ہمراہ

اور ریفریجریٹر کا دروازہ کھول کر بیش قیمت

نوادر کو حیرت سے دیکھنے لگا۔

اس کے بعد جو کارروائی ہوئی وہ مختصر

تھی۔ وکٹر الیانوف کو قتل اور قانون کو دھوکا

میں گرفتار کر لیا گیا۔ نک نے مختصر بیان

نیویارک پہنچ گیا۔

جب اینا الیانوف اور اس کے ساتھیوں

وہ گلوریا کے ہمراہ ان کے استقبال کے لیے

نے اس کا شکریہ ادا کیا اور وعدہ کیا کہ وہ جا

ہاتھ میں آتے ہی سب سے پہلے اس کی فیس

ایک ایسے ولیِ کامل کی داستان جسے ایسا کاسۂ گدائی ملا جو بزرگانِ دین سے فیض پانے کے باوجود مسلسل تشنگی کا شکار تھا... جسے عیش و نشاط کی کوئی حاجت نہ تھی، جس نے جنگل کو مسکن بنایا۔ جس کا شیدائی اور ملاقات کا تمنائی اس وقت کا بادشاہ نورالدین جہانگیر تھا مگر ”افسوس کہ بادشاہ سے ملاقات درویشی مسلک کے خلاف ہے“ کہہ کر بادشاہ کو ملنے سے انکار کر دیا۔ آپ کا ایک ایسا کارنامہ جو آج تک تاریخ میں رقم ہے۔ قرآن کا ایسا فارسی ترجمہ تیار کیا جس میں ترجمہ اور اصل کے حروف برابر ہیں۔ جو ترجمۂ جہانگیری کے نام سے موسوم ہے۔ ولیوں کی بھی کیا شان ہوتی ہے۔ ہر ادا کسی نہ کسی راز سے پردہ اٹھاتی ہے۔

ولیِ کامل

ضیا تسنیم بلگرامی



حضرت بہاء الدین ذکریا ملتانی کے دو بیٹے تھے، شیخ صدرالدین عارف اور بدرالدین۔ بدرالدین نے ہندوستان
... دور غزنی میں سکونت اختیار کی اور وہاں بندگی میاں کے نام سے شہرت حاصل کی۔
جن دنوں بندگی میاں مشہورِ خاص و عام تھے، شہاب الدین غوری رائے پتھورا سے نبرد آزما تھا۔ دو بار کی ناکامی نے
...ری کو درویشوں کی طرف متوجہ کیا اور وہ بندگی میاں کی خدمت میں دعائے کامرانی کے لیے حاضر ہوا۔ آپؒ نے فرمایا کہ

تیری فوج میں ظلم وزیادتی اور فسق وفجور کی کثرت ہے۔ لوگ عدل وانصاف سے کام نہیں لیتے۔ پھر تو کامرانی کس طرح حاصل کرے گا؟

غوری نے کہا۔ ”اگر یہ بات ہے تو میں آپ کو اپنے لشکر میں ایک ایسا منصب دینے کو تیار ہوں جو لوگوں کے فسق وفجور، ظلم وزیادتی اور ناانصافی کا سدِباب کردے۔“

بندگی میاں نے یہ منصب قبول کرلیا اور غوری کی فوج میں شامل ہوگئے۔ ان کے ساتھ ایک دوسرے بزرگ میر عطاء اللہ بھی فوج میں ملازم ہوگئے اور بندگی میاں اور سلطان غوری کے ساتھ یہ بھی ہندوستان چلے آئے۔

پرتھوی راج چوہان ورآئے پتھورا کو شکست ہوئی اور برصغیر پر مسلمانوں کا قبضہ ہوگیا۔ میر عطاء اللہ نے ہانس میں سکونت اختیار کرلی۔ یہاں ایک ترکمان راجو خان بھی رہتا تھا۔ میر عطاء اللہ نے راجو خان ترکمان کی بیوی کو بہن بنالیا۔ وہ بھی انہیں بھائی کہنے لگی۔

یہیں میر عطاء اللہ کے گھر میں ایک لڑکا پیدا ہوا۔ ان دنوں نظام الدین نارنولی کو درویشی میں بلند پایہ مقام حاصل تھا۔ میر عطاء اللہ نے ولادت فرزند کی خوشی میں مٹھائی خریدی اور نظام الدین نارنولی کی خدمت میں پہنچ گئے۔

نظام الدین نارنولی نے میر عطاء اللہ سے معذرت کی، کہا۔ ”میر صاحب آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ میں شادی اور غمی کی چیزیں قطعاً نہیں کھاتا!“

میر عطاء اللہ نے کہا۔ ”لیکن حضرت یہ مٹھائی تو آپ کو کھانا ہی پڑے گی۔“

نظام الدین نے ایک ڈلی اٹھا کر منہ میں رکھ لی اور کہا۔ ”بے شک یہ تو مجھے کھانا ہی پڑے گی۔ کیونکہ خدا کے نزدیک اس فرزند کا مرتبہ نہایت بلند ہے۔“

میر عطاء اللہ بذاتِ خود ایک نیک نفس اور روشن ضمیر بزرگ تھے۔ بیوی کا انتقال ہوگیا تو ایک دن راجو خان ترکمان کی بیوی سے کہا۔ ”بہن! مجھے ایسا لگتا ہے کہ میرا بیٹا تجھ کو پالنا پڑے گا کیونکہ میں عالمِ کشف میں اپنی زندگی کے چراغ کو جھلملاتا ہوا دیکھ چکا ہوں۔“

منہ بولی بہن نے جواب دیا۔ ”بھائی میر عطاء اللہ! خدا آپ کے بیٹے کے سر پر آپ کا سایہ برقرار رکھے۔ ویسے میں آپ کی موجودگی میں بھی اس کی دیکھ بھال اور نگہداشت پر آمادہ ہوں۔“

بچے کا نام نعمت اللہ رکھا گیا۔ اس بچے کی ذہانت خداداد اور حافظے کی تیزی کا یہ عالم تھا کہ چار برس چار ماہ کی عمر میں قرآن پاک پڑھ ڈالا۔ اس کے بعد درس کی ابتدا گلستان سے کی گئی۔

ایک دن میر عطاء اللہ سو کر اٹھے تو انہیں غیر معمولی تھکان محسوس ہوئی۔ نمازِ فجر کے بعد دنیا کے کاموں میں مشغول ہوگئے۔ لیکن سرگرانی اور تھکان کم ہونے کے بجائے بڑھتی ہی رہی۔ یہاں تک کہ دوپہر کے بعد ان کی حالت تشویشناک ہوگئی۔ ان کا کمسن بیٹا نعمت اللہ ان کے بستر پر دائیں جانب بیٹھا باپ کو بڑی توجہ سے دیکھ رہا تھا۔ میر عطاء اللہ نے بیٹے کو حکم دیا۔ ”نعمت اللہ! ذرا میری بہن راجو خان کی بیوی کو تو بلا لا۔“

خاموش طبع نعمت اللہ چپ چاپ راجو خان کی بیوی کے پاس پہنچے اور اس کو اپنے ساتھ لے کر دوبارہ حاضر ہوگئے۔ راجو خان کی بیوی ان کے سامنے ادب سے کھڑی ہوگئی اور پوچھا۔ ”بھائی صاحب! آپ نے مجھے یاد فرمایا؟“

میر عطاء اللہ نے جواب دیا۔ ”ہاں بہن، میں نے تمہیں زحمت دی ہے۔“

نعمت اللہ ان دونوں کی باتیں بڑی توجہ اور معصومیت سے سنتے رہے۔ منہ بولی بہن پوچھ رہی تھی۔ ”ہاں بھائی! بتایئے میں آپ کے کس کام آسکتی ہوں؟“

میر عطاء اللہ نے کہا۔ ”بہن! یہ میرا آخری وقت ہے، اب میں اپنے سفرِ آخرت پر جانے والا ہوں، نعمت اللہ تمہارے حوالے ہے، تمہیں اس پر وہی توجہ دینا ہوگی جو اپنے بچوں پر دے سکتی ہو۔“

منہ بولی بہن کا دل بھر آیا۔ آنکھیں ابلنے لگیں کہ نظریں جھکا کر رندھی ہوئی آواز میں پوچھا۔ ”اور کچھ بھائی اور کچھ؟“

میر عطاء اللہ نے جواب دیا۔ ”اور یہ کہ میں ایک گناہگار انسان ہوں۔ جب میں مرجاؤں تو مجھے زیادہ دیر نہ رکھنا جلد از جلد میرا کفن دفن کرکے رخصت کردینا۔ مجھے چوراہے پر دفن کرنا۔“

منہ بولی بہن زور زور سے رونے لگی، بولی۔ ”بھائی! یہ آپ کیا فرما رہے ہیں؟“

جواب میں میر عطاء اللہ نے کلمہ طیبہ پڑھا اور ان کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔ نعمت اللہ کو بھی یہ احساس ہوچکا تھا کہ ان کا باپ ان سے ہمیشہ کے لیے چھن چکا ہے۔ وہ باپ کے پاس جا کھڑے ہوئے۔ کچھ دیر کھڑے باپ کی صورت دیکھتے رہے۔ اس کے بعد باپ کی پیشانی چوم لی اور باپ کی منہ بولی بہن کی گود میں دبک گئے اور آنسوؤں سے رونا شروع کردیا۔ شریف خاتون نے انہیں اپنی اولاد کی طرح سینے سے لگالیا اور بھینچ بھینچ کر تسلیاں دینے لگی۔

جب میر عطاء اللہ کی آخری رسوم کی ادائیگی کا وقت آیا تو منہ بولی بہن کو بڑی پریشانی ہوئی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ بھائی کی وصیت پر کس طرح عمل کیا جائے۔ جیسے تیسے کرکے ..... جو بھی اپنی اس بہن کو انہوں نے حکم دیا تھا اس نے اس پر عمل کرنے کی پوری کوشش کی۔

چنانچہ اس پر نہایت احتیاط اور احترام سے عمل کیا گیا اور انہیں چوراہے پر دفن کردیا گیا۔

اب مرحوم کی منہ بولی بہن کے سامنے ایک بہت بڑی ذمے داری موجود تھی۔ اس کے اپنے کئی بیٹے تھے۔ انہی میں نعمت اللہ کو بھی شامل کرلیا گیا۔ وہ راجو خان ترکمان کی بیوی تھی۔ اس گھرانے میں شمشیر زنی، تیراندازی اور شہسواری طرۂ امتیاز تھی۔ نعمت اللہ کو بھی یہی سب سیکھنا پڑا اور ان مراحل سے گزر کر وہ اپنی عمر کے تیرھویں سال میں داخل ہوگئے اور اس نو عمری میں ان کا یہ حال تھا کہ فنِ سپاہ گری میں وہ اپنا جواب آپ تھے۔

حکومت کا نمائندہ دوست محمد خان زمینداروں سے مال گزاریاں وصول کرنے پر تعینات تھا۔ آپ اس کے پاس اکثر جایا کرتے تھے اور دلچسپ گفتگو رہتی تھی۔ ایک دن آپ دوست محمد خان سے باتیں کررہے تھے کہ ایک زمیندار آیا۔ اس کے ذمے مال گزاری کی رقم نکلتی تھی۔ دوست محمد خان نے تقاضا کیا۔ زمیندار نے ادائیگی کا وعدہ کیا۔ دوست محمد خان نے کہا۔ ”میں وعدہ نہیں رقم چاہتا ہوں اگر رقم نہ ملی تو میں سختی کروں گا۔“

زمیندار نے کہا۔ ”جناب! رقم یہاں تو میرے پاس ہے نہیں، اگر آپ کسی آدمی کو میرے ساتھ کردیں تو میں دے دوں گا۔“

دوست محمد خان نے جواب دیا۔ ”اور آدمی میرے پاس نہیں ہے جس کو تیرے ساتھ بھیجا جائے۔“

نوعمر نعمت اللہ نے خود کو پیش کردیا۔ ”جناب میں اس کے ساتھ جانے کو تیار ہوں۔“

دوست محمد خان کوئی جواب دیے بغیر اندر چلے گئے اور ملازم کے ذریعے نعمت اللہ کو اندر بلوالیا۔

اندر پہنچ کر نعمت اللہ نے دیکھا کہ دوست محمد خان کی تیوریوں پر بل پڑے ہوئے ہیں۔ آپ نے پوچھا۔ ”آپ نے مجھے یاد فرمایا ہے؟“

دوست محمد خان نے چیں بہ جبیں ہوکر دریافت کیا۔ ”کیا تم اس زمیندار سے واقف ہو؟“

نعمت اللہ نے جواب دیا۔ ”نہیں تو، کیوں کیا کوئی خاص بات ہوگئی؟“

دوست محمد خان نے کہا۔ ”جانتے ہو۔ اگر یہ تمہیں اپنے ساتھ لے گیا تو کیا سلوک کرے گا؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”نہیں، میں نہیں جانتا۔“

دوست محمد خان نے اور زیادہ گرمی دکھائی۔ ”صاحبزادے! میں تمہاری عزت بھی کرتا ہوں اور لحاظ بھی۔ یہ زمیندار لوگ جب کسی شخص کو ادائیگی کے بہانے اپنی زمینوں میں لے جاتے ہیں تو اپنے غم وغصہ کا اظہار اس آدمی پر کردیتے ہیں۔ اگر تم اس کے ساتھ چلے گئے تو پتا نہیں کہ تمہیں واپسی بھی نصیب ہوگی یا نہیں۔ تمہیں ساتھ جانے پر آمادہ نہیں ہونا تھا۔“

آپ نے نہایت اطمینان سے فرمایا۔ ”اگر ساتھ جانے پر آمادگی ظاہر کرکے میں نے غلطی کی ہے تو میں معافی کا طلبگار ہوں، ویسے میں اس تخلیے میں بھی عرض کروں گا کہ میں اس زمیندار کے ساتھ جانے کے لیے اب بھی تیار ہوں۔ آپ مجھے جانے دیجیے پھر دیکھیے گا کہ میں آپ کی رقم وصول کرلایا یا نہیں۔“

دوست محمد خان نے نعمت کو سر سے پاؤں تک حیرت سے دیکھا اور کہا۔ ”پھر وہی ضد؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”ضد وہ کسے کہتے ہیں۔ آپ مجھے اس زمیندار کے ساتھ چلے جانے دیں۔“

دوست محمد خان نے سختی سے کہا۔ ''اچھا اب باہر چلو، وہاں زمیندار کے ساتھ جانے کی بات نہ کرنا۔''
لیکن باہر نکلتے ہوئے اس نے زمیندار سے کہا۔ ''دیکھو اس نوجوان کو اپنے ساتھ لیے تو جا رہے ہو لیکن خبردار جو اسے کسی قسم کا نقصان پہنچا۔''

نعمت اللہ کے لیے گھوڑے کا انتظام کر دیا گیا۔ اس کے بعد زمیندار ان کو ساتھ لے کر اپنی زمینوں پر روانہ ہو گیا۔ زمیندار، نعمت اللہ سے بہت متاثر تھا۔ گھر پہنچ کر اس نے معزز مہمان کو ٹھہرایا اور ان کی دعوت کا انتظام کرنے لگا۔ جب وہ جانے لگا تو نعمت اللہ نے پوچھا۔ ''کہاں جا رہے ہو؟''

زمیندار نے جواب دیا۔ ''آپ کی دعوت کا انتظام کرنے۔''

آپ نے سختی سے کہا۔ ''لیکن میں یہاں دعوت کھانے نہیں آیا۔ مال گزاری کی رقم لینے آیا ہوں۔''

زمیندار نے جواب دیا۔ ''رقم تو تیار ہے چلتے وقت دے دوں گا۔''

آپ نے سختی سے کہا۔ ''اگر تیار ہے تو لے آ انتظار کس بات کا؟''

زمیندار مسکراتا ہوا چلا گیا۔ آپ سمجھے زمیندار رقم لینے گیا ہے مگر جب کافی دیر بعد واپس آیا تو دو ملازم کھانے کا سامان لیے ہوئے زمیندار کے پیچھے پیچھے آ رہے تھے۔ آپ کو بڑا غصہ آیا۔ سختی سے پوچھا۔ ''یہ کیا ہے؟''

زمیندار نے جواب دیا۔ ''کھانا۔''

آپ نے پوچھا۔ ''اور رقم؟ وہ کہاں ہے؟''

زمیندار نے ہنس کر جواب دیا۔ ''میاں صاحبزادے! آپ رقم کے لیے پریشان کیوں ہو رہے ہیں، کہہ جو دیا کہ وہ بھی مل جائے گی۔ گرمی میں اتنا سفر کر کے آئے ہیں، پہلے کھا پی کر آرام کر لیں پھر رقم لے کر واپس چلے جائیے گا۔''

ملازم کھانا رکھ کر واپس چلے گئے۔ آپ کو شبہ گزرا کہ زمیندار نے رقم کا انتظام تو کیا نہیں، ٹالنے کی باتیں کر رہا ہے۔ آپ نے اپنا تازیانہ سنبھالا اور سختی سے کہا۔ ''زمیندار! میں تیری چالاکیاں سمجھ رہا ہوں۔ میں اس وقت تک کھانا نہیں کھاؤں گا جب تک تو مال گزاری کی رقم میرے حوالے نہیں کر دے گا۔''

زمیندار آفتابہ سنبھالے آگے بڑھا اور عاجزی سے کہا۔ ''غصہ تھوک دیجیے۔ لیجیے ہاتھ دھویئے اور کھانا کھا کر طبیعت کو سکون پہنچایئے۔''

آپ نے غصے میں تازیانوں کی بارش کر دی۔ سارے تازیانے اس کی پشت پر لگے اور وہ سسکیاں بھرنے لگا۔ زخمی ہونے کے باوجود وہ ہاتھ دھلانے اور کھانا کھلانے پر مصر رہا۔ آخر آپ شرمندہ ہو گئے اور ہاتھ دھو کر کھانے پر بیٹھ گئے۔ گرمی سخت تھی، یہ کھانا کھانے لگے۔ زمیندار پنکھا جھلنے لگا۔ آپ کھانا کھاتے رہے اور سوچتے رہے۔ زمیندار کے تحمل، حلم اور صبر و ضبط نے نعمت اللہ کے دل میں انقلاب برپا کر دیا تھا۔

کھانے کے بعد زمیندار نے مال گزاری کی رقم دی اور کہنے لگا۔ ''صاحبزادے! یہ میرا فرض ہے کہ میں آپ کو تنہا نہ جانے دوں۔ میں آپ کے ساتھ چلوں گا۔''

دونوں ایک ساتھ واپس روانہ ہوئے لیکن نعمت اللہ کی حالت غیر ہو رہی تھی، وہ مسلسل سوچ رہے تھے کہ جب یہ زمیندار مال گزاری کی رقم فوراً ادا کر سکتا تھا تو اس نے ضرورت سے زیادہ خوش اخلاقی اور تواضع سے کام لیا۔ وہ اگر دعوت نہ بھی کرتا تب بھی کوئی بات نہ تھی اور پھر جب اس کی پشت پر تازیانوں کی بارش کر دی گئی۔ اگر وہ چاہتا تو اپنے ملازمین کے ذریعے ان کی پٹائی کرا دیتا اور کچھ کھلائے پلائے اور رقم دیے بغیر ہی واپس بھیج دیتا لیکن اس نے مار کھانے کے باوجود ان کی خاطر تواضع کی اور جب وہ کھانا کھانے لگے تو وہ پنکھا جھلتا رہا۔ انہوں نے سوچا صبر و رضا کی اس سے بہتر مثال نہیں مل سکتی۔ انہیں دنیا سے نفرت ہو گئی۔ انہیں اپنا اور رب کا رشتہ یاد آیا۔ انہوں نے سوچا اگر انسان اپنے رب کا یونہی خیال رکھے اور دکھ سکھ سے بے نیاز ہو کر اطاعتِ الٰہی میں مشغول رہے تو اس کو کتنا بلند مقام عطا ہو گا۔ زمیندار نے تصوف کا ایک نسخہ انہیں دے دیا تھا۔

دونوں دوست محمد خان کی خدمت میں ایک ساتھ پہنچے، مال گزاری کی رقم دوست محمد خان کے حوالے کر دی گئی۔ اس نے تخلیے میں نعمت اللہ سے پوچھا۔ ''صاحبزادے! کوئی ناخوشگوار واقعہ تو نہیں پیش آیا؟''

نعمت اللہ بہت اداس تھے، بولے۔ ''ہاں ایک نہایت ناخوشگوار واقعہ پیش آ گیا۔ اس نے میری زندگی بدل کر رکھ دی

اور اب میں دنیا کے کام کا نہیں رہ گیا۔''

دوست محمد خان گھبرا گیا، پوچھا۔ ''کیا بات ہے؟ مجھے بتاؤ۔ میں اس زمیندار کی وہ خبر لوں گا کہ یہ زندگی بھر یاد رکھے گا۔ آخر بات کیا ہوئی؟''

نعمت اللہ نے پورا واقعہ سنا دیا اور کہا۔ ''میں حیران ہوں اور اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ خدا نے اس زمیندار کو میری ہدایت اور نصیحت کے لیے بھیجا تھا۔ اس نے مجھ کو بدل کر رکھ دیا۔''

دوست محمد خان نے باہر نکل کر زمیندار کا بہت بہت شکریہ ادا کیا۔ زمیندار نے کہا۔ ''آپ لوگ مجھ کو شرمندہ نہ کیجیے میں نے وہی کیا جس کا میرے رب نے مجھے حکم دیا تھا۔''

بات ختم ہو گئی۔ نعمت اللہ نے ہر کہیں کا آنا جانا بند کر دیا۔ اب وہ اپنی ذات میں محوِ سفر رہے۔ ہتھیار ان کے پاس اب بھی تھے لیکن ان سے نفرت ہو گئی تھی۔ ایک رات انہوں نے یہ فیصلہ کر لیا کہ اب دنیا ترک کر دینا چاہیے اور ویرانے میں بسرام کرنا چاہیے۔ چنانچہ کمان، تیروں سے بھرا ترکش، ایک اشرفی اور پانچ روپے لے کر گھر سے نکل پڑے۔ گھر میں کسی کو بھی یہ پتا نہ تھا کہ وہ کہاں اور کب تک کے لیے جا رہے ہیں۔

رات ہی کے سفر میں وہ دریا کے کنارے تک پہنچ گئے۔ چونکہ کشتی کا کوئی انتظام نہ تھا اس لیے دریا کنارے مصلیٰ بچھا کر یادِ الٰہی میں مشغول ہو گئے۔ رات بھر عبادت کرتے رہے۔ صبح فجر کی نماز ادا کی اور آگے جانے کا ارادہ کیا۔ اتفاق کی بات کہ اسی وقت راجو خان کا خدمت گار کسی طرف سے آتا دکھائی دیا۔ اس نے آگے بڑھ کر آپ کا راستہ روک لیا اور خوشامد سے پوچھا۔ ''حضرت! آپ رات بھر کہاں غائب رہے۔ ہم سب تلاش کرتے کرتے عاجز آ گئے۔''

آپ نے پوچھا۔ ''اس وقت تو کہاں جا رہا تھا؟''

ملازم نے جواب دیا۔ ''میں آپ ہی کو تلاش کر رہا تھا۔''

آپ نے فرمایا۔ ''میری تلاش فضول ہے کیونکہ اب میں گھر نہیں جاؤں گا۔''

ملازم نے اصرار کیا۔ ''آپ کو گھر واپس چلنا ہوگا؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''میں گھر نہیں جاؤں گا کیونکہ میں نے اپنے رب سے ناتا قائم کرلیا ہے۔''

ملازم بہت گھبرایا، بولا۔ ''حضرت! اگر آپ مجھ کو مایوس کرتے ہیں تو پھر مجھے اپنے ساتھ لے لیجیے۔''

آپ نے پوچھا۔ ''میری منزل آسان نہیں ہے، تو پریشان ہوجائے گا۔''

ملازم نے عرض کیا۔ ''میری آپ سے دو درخواستیں ہیں۔ پہلی تو یہ ہے کہ آپ میرے ساتھ گھر واپس چلیں دوسری یہ کہ آپ واپس نہیں چلتے تو پھر مجھے بھی اپنے ساتھ لے لیجیے۔''

آپ نے خاموشی اختیار کی آخر کچھ تامل کے بعد فرمایا۔ ''کیا تیرے پاس دو روپے ہوں گے؟ اگر ہوں تو مجھے دے دے۔''

ملازم نے جواب دیا۔ ''حضرت! روپے یہاں کہاں اگر گھر تشریف لے چلیں تو دو کیا چار مل جائیں گے۔ آپ گھر تشریف تو لے چلیں۔''

آپ نے فرمایا۔ ''اچھا تو گھر چلا جا اور پہلے دو روپے لے آ۔''

ملازم ہنسی خوشی گھر چلا گیا۔ آپ نے فوراً جنگل کی راہ لی۔ اب آپ کے سامنے پھر دریا تھا۔ دریا کے گھاٹ پر مسافروں کا ہجوم تھا اور سودا بیچنے والے آوازیں لگا لگا کر اپنی چیزیں بیچ رہے تھے۔ ایک خربوزے والا بڑے میٹھے اور دل نشیں پیرائے میں خربوزے فروخت کررہا تھا۔ اس سے چند قدم کے فاصلے پر دس بارہ مسافر للچائی ہوئی نظروں سے خربوزے دیکھ رہے تھے۔ ان کی خستہ حالی ان کے چہرے اور لباس سے عیاں تھی۔ آپ ان کے پاس گئے اور پوچھا۔

''ہاں بھائی! اپنا دل خربوزوں پر مائل ہے لیکن میں تنہا کھانے کا عادی نہیں ہوں۔ اگر اس میں تم سب میرے شریک بن جاؤ تو بڑی مہربانی ہوگی۔''

وہ سب آدمی آپس میں کھسر پھسر کرنے لگے۔ آپ نے کہا۔ ''اور ہاں، خربوزوں کی میری طرف سے دعوت ہے۔ میرا خیال ہے آپ لوگ مجھے شرمندہ نہیں کریں گے۔''

مسافروں کو اب کیا تامل ہوسکتا تھا، راضی ہوگئے۔ آپ کے پاس جو کچھ تھا مسافروں پر خرچ کردیا۔ ہتھیاروں کو بھی تقسیم کردیا۔ جب پاس کچھ نہ رہا تو بہ اطمینان ویرانے کی راہ لی اور حیدرآباد کے مضافات میں نکل گئے۔ وہاں شیخ محمد کا بڑا چرچا تھا۔ نعمت اللہ ان کی طرف کھنچنے لگے۔ جب دونوں کا آمنا سامنا ہوا تو شیخ محمد نے انہیں اپنے پاس بٹھالیا اور بڑی محبت سے پوچھا۔

''تمہیں کس چیز نے میرے پاس آنے پر مجبور کیا ہے؟''

نعمت اللہ نے جواب دیا۔ ''حضرت! علوم باطنی اور علوم الٰہی کی تحصیل کے لیے حاضر ہوا ہوں۔''

شیخ محمد نے پوچھا۔ ''کیا علوم ظاہری سے فارغ ہوگئے؟''

انہوں نے جواب دیا۔ ''علم ظاہری حاصل تو کیا ہے مگر تکمیل نہیں ہوئی۔''

شیخ محمد نے فرمایا۔ ''سبحان اللہ۔ خدا کے ایسے بندے بھی ہیں کہ علم ظاہری حاصل کیا نہیں اور خدا کی طلب کرنے لگے۔''

نعمت اللہ نے درخواست کی۔ ''حضرت! میں آپ کا مرید ہونا چاہتا ہوں۔ آپ مرید کرلیجیے، اس کے بعد میں علم ظاہری کی تکمیل کرلوں گا۔''

شیخ محمد نے آپ کو مرید کرلیا اور ادھر سے مطمئن ہونے کے بعد آپ دولت آباد روانہ ہوگئے کیونکہ ان دنوں دولت آباد کے حکیم جبرئیل کا علم و حکمت میں کوئی جواب نہ تھا۔ اس نے آپ کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور نہایت شفقت سے درس دینے لگا۔ ابتدا شرح ملا جامی سے ہوئی اور بہت جلد فلسفہ و منطق تک پہنچ گئے۔ آپ کی ذہانت اور استعداد سے خوش ہوکر ایک دن حکیم جبرئیل نے نعمت اللہ سے کہا۔ ''بھائی! میں تمہاری صلاحیتوں اور استعداد سے اتنا خوش ہوں کہ بار بار یہی جی چاہتا ہے کہ میں اپنا سارا علم ایک لقمہ بنا کر تمہیں کھلا دوں۔''

آپ نے استاد کے جذبات کا شکریہ ادا کیا اور واقعی کچھ عرصہ بعد ہی آپ نے سب کچھ حاصل کرکے فراغت پالی اور استاد کی جگہ خود مطب کرنے لگے۔

شیخ ابو یعقوب بصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں ایک مرتبہ حرم شریف میں دس روز تک بھوکا رہا۔ یہاں تک کہ میں ضعیف ہوگیا۔ میرے دل نے چاہا کہ میں جنگل کو نکل جاؤں۔ شاید کوئی ایسی چیز پالوں جس سے بھوک سے نجات مل جائے۔ راستے میں ایک شلجم سڑا ہوا زمین پر پڑا ملا۔ میں نے اس کو اٹھالیا مگر میرے دل میں اس حرکت سے ایک وحشت و اضطراب پیدا ہوگیا۔ گویا کوئی شخص مجھ سے کہہ رہا ہے تو دس دن تک بھوکا رہا بالآخر تیرا حصہ گرا ہوا ایک بدرنگ شلجم تھا۔ میں نے وہ شلجم پھینک دیا اور مسجد حرام میں چلا گیا اور بیٹھا رہا۔ اچانک ایک آدمی آیا اور آکر میرے روبرو بیٹھ گیا، اس نے ایک تھیلی میرے سامنے رکھ کر کہا۔ ''یہ پانچ سو اشرفیوں کی تھیلی تیرے واسطے ہے۔''

میں نے اس سے کہا۔ ''یہ خاص میرے واسطے کیوں ہے؟''

اس نے جواب دیا۔ ''میں دس روز سے دریا میں تھا اور میری کشتی ڈوبنے کو تھی۔ اہل کشتی نے جدا جدا نذر مانی کہ اگر خدا نے ڈوبنے سے نجات دے دی تو کچھ خیرات کریں گے اور میں نے نذر مانی تھی کہ اگر خدا مجھے ڈوبنے سے بچالے تو یہ پانچ سو اشرفیوں کی تھیلی خیرات کروں گا اور خانہ کعبہ کے مجاورین میں سے جس پر سب سے پہلے میری نگاہ پڑے گی اسی کو دوں گا اور تم مجھے سب سے پہلے ملے ہو لہٰذا یہ تھیلی میں تمہیں دیتا ہوں۔''

میں نے کہا۔ ''اسے کھولو۔'' اس نے وہ تھیلی کھولی تو بجائے اشرفیوں کے میدے کی روٹی، مصری، چھلے ہوئے بادام اور شکر پارے اس میں تھے۔ میں نے ایک مٹھی سب میں سے لے لی اور اس سے کہا۔ ''باقی تم اپنے بچوں میں تقسیم کردینا۔ میری جانب سے یہ ہدیہ ہے اور تمہارا ہدیہ میں نے قبول کرلیا۔'' پھر میں نے اپنے جی سے کہا۔ ''اے نفس تیرا رزق دس روز سے تیری طرف چلا آرہا تھا اور تو اسے جنگل میں ڈھونڈنے کے لیے گیا تھا۔''

آپ کے استاد حکیم جبرئیل کی ایک نوجوان لڑکی تھی جو اپنی ماں کے ساتھ دولت آباد سے دور رہتی تھی۔ استاد نے پوچھا اور دوستوں سے مشورہ کیا کہ اگر نعمت اللہ کو داماد بنالیا جائے تو کیسا رہے گا۔ دوستوں نے یہی مشورہ دیا کہ اس سے بہتر رشتہ نہیں مل سکتا۔ چنانچہ استاد نے اس سلسلے میں ایک جامع منصوبہ بنالیا۔

ایک دن استاد نے اپنے شاگرد سے پوچھا۔ ''نعمت اللہ! ایک بات بتاؤ، میرا تم پر کوئی حق نکلتا ہے یا نہیں؟''

لائق شاگرد نے جواب دیا۔ ''استاد محترم! میں آپ کا اتنا شکر گزار ہوں کہ لفظوں میں اسے ظاہر نہیں کیا جاسکتا۔''

استاد نے کہا۔ ''تب پھر تم میرا ایک کام کردو۔ بقیہ بعد میں ظاہر کروں گا۔''

نعمت اللہ نے عرض کیا۔ ''جو کچھ فرمانا ہے اسی وقت فرما دیجیے بلکہ حکم دیجیے۔''

استاد نے کہا۔ ''میری اہلیہ کابل میں ہیں۔ میں تمہیں راہ خرچ دیتا ہوں، تم جاؤ اور انہیں لے آؤ۔''

سعادت مند شاگرد نے جواب دیا۔ ''بسر و چشم۔ یہ کوئی ایسا کام تو نہیں جو انجام نہ دیا جاسکے۔ آپ جب فرمائیں میں چلا جاؤں گا اور استانی صاحبہ کو لے آؤں گا۔''

چنانچہ دو دن بعد استاد نے انہیں ایک ہنڈی دی اور انہیں کابل روانہ کردیا۔

جب وہ کابل سے اپنے استاد کے گھر والوں کو لے کر واپس ہوئے تو انہیں یہ معلوم ہوا کہ استانی کے ساتھ ان کی جوان بیٹی بھی ہے۔ استانی بھی اپنے شوہر کا ارادہ بھانپ چکی تھیں۔ انہوں نے دورانِ سفر ہی میں یہی کوشش کی کہ ان کے شوہر کا لائق ہونہار اور سعادت مند شاگرد ان کی بیٹی کی طرف راغب ہوجائے لیکن نعمت اللہ کے دل میں اپنی استانی اور استاد زادی دونوں ہی کے لیے جذبۂ احترام و عقیدت پایا جاتا تھا۔ وہ ہر قدم پر اپنی عقیدت اور ارادت کا اظہار تو کرتے رہے لیکن ایک مرتبہ بھی محبت کا اظہار نہ کیا۔

سفر ختم ہوا، دولت آباد آگیا۔ حکیم جبرئیل کے بیوی بچے ان سے مل گئے۔ استانی نے شاگرد کی دیانت داری، ایمان اور حیا کا بطورِ خاص ذکر کیا۔ شوہر نے بیوی کو ایک گوشے میں لے جاکر دریافت کیا۔ ''کیا تم نے میرا مفہوم پالیا، میں نے اس نوجوان کو کسی اور ہی مقصد سے کابل روانہ کیا تھا؟''

بیوی نے جواب دیا۔ ''جہاں تک آپ کے شاگرد کی امانت، دیانت اور حیا و شرم کا تعلق ہے، میں سوتے جاگتے، اٹھتے

بیٹھتے اس کی تعریف کروں گی لیکن رہی یہ بات کہ کیا آپ کا شاگرد میری بچی کو پسند کرنے لگا ہے یا اس طرف ذرا بھی راغب ہے تو میں ادھر سے بالکل ہی مایوس نظر آؤں گی، نعمت اللہ کے دل میں ہم سب کے لیے عقیدت واحترام تو بیشک ہے لیکن صاحب زادی کی محبت ہرگز نہیں۔“

استاد کو اس انکشاف نے دکھ پہنچایا لیکن وہ مایوس نہیں ہوا۔ بولا۔”بیوی! وہ ایک شریف نوجوان ہے اگر اس کے دل میں کوئی ایسا ویسا جذبہ ہوگا بھی تو وہ اس کو ظاہر نہیں ہونے دے گا۔ ہمیں مایوس نہیں ہونا چاہیے۔“

دولت آباد کے صوبے دار کا وزیر انتقال کر گیا۔ اس کے حکیم جبرئیل سے گہرے مراسم تھے۔ صوبے دار کو نئے وزیر کی فکر تھی۔ لیکن نظر انتخاب میں کوئی چڑھتا ہی نہ تھا۔

ایک دن حکیم جبرئیل صوبے دار سے ملنے جو گئے تو ان کا نہایت سرد مہری سے استقبال ہوا۔ صوبے دار نے حکیم صاحب کو ایک طرف بیٹھ جانے کا اشارہ کیا۔ یہ بیٹھ گئے۔ مگر بیٹھتے بیٹھتے دریافت کیا۔”صوبے دار صاحب! خیریت تو ہے، نصیب دشمناں کیا کچھ طبیعت ناساز ہے؟“

صوبے دار نے جواب دیا۔”حکیم صاحب! میری طبیعت ذرا بھی خراب نہیں۔ آپ یہ تو جانتے ہی ہیں کہ کئی دن پہلے میرے وزیر کا انتقال ہوگیا۔ اب مجھے کسی ایسے شخص کی تلاش ہے جو صالح بھی ہو، دیانت دار اور عقلمند بھی۔ بس اسی فکر نے مجھے پریشان کر رکھا ہے۔“

حکیم جبرئیل نے کہا۔”اگر میں آپ کے اس مسئلے کو حل کر دوں تو؟“

صوبے دار نے جواب دیا۔”تو کیا، میں آپ کا یہ احسان زندگی بھر یاد رکھوں گا لیکن شرط یہی ہے کہ وہ شخص ایماندار، عقلمند اور صالح ہو، علوم ظاہری اور باطنی بھی رکھتا ہو۔“

حکیم صاحب نے کہا۔”جناب صوبے دار صاحب! ایک میرا شاگرد نعمت اللہ ہے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اس میں وہ سارے اوصاف موجود ہیں جو آپ کو اپنے وزیر میں مطلوب ہیں بلکہ میں تو یہ دعویٰ کروں گا کہ وہ اس سے بھی کہیں زیادہ لائق وفائق ہے، جتنی لیاقت آپ کو درکار ہے!“

صوبے دار کا اشتیاق بڑھا، بے چینی سے بولا۔”پھر اس کو میرے پاس کب لایئے گا؟“

حکیم نے جواب دیا۔”کل یہاں ہی لے آؤں گا۔ آپ بے فکر ہو جائیں۔“ اس دن صوبے دار نے حکیم صاحب کی کچھ زیادہ ہی خاطر مدارات کی۔

☆☆☆

حکیم صاحب کا خوشی سے برا حال ہو رہا تھا۔ ان کا ہونے والا داماد اور لائق شاگرد وزارت کے منصب پر فائز ہونے والا تھا۔ سب سے پہلے یہ خوش خبری انہوں نے اپنی بیوی کو سنائی۔ مگر بیوی شاید زیادہ حقیقت پسند تھی۔ اس کو ابھی تک یہ یقین نہیں تھا کہ نعمت اللہ اس کی بیٹی سے واقعی شادی کرلے گا۔ شوہر کی زبان سے خوش خبری سن کر بھی جب بیوی نے کسی خاص خوشی کا اظہار نہیں کیا تو حکیم صاحب کو غصہ آگیا۔ بیوی نے ان کی خوشیوں کا مزہ کرکرا کر دیا تھا۔ گرم ہو کر بیوی سے پوچھا۔”میں تجھ کو یہ خوشخبری سنا رہا ہوں کہ تیرا ہونے والا داماد دولت آباد کی وزارت کا منصب سنبھالنے والا ہے لیکن تو نے اس خبر سے مسرت نہیں حاصل کی؟“

بیوی نے جواب دیا۔”میں زیادہ خوش فہم نہیں ہوں، مجھ کو ابھی تک یہ یقین نہیں آیا کہ نعمت اللہ واقعی میرا داماد بن جائے گا۔“

حکیم صاحب نے کہا۔”اچھا اب بقیہ باتیں اس وقت ہوں گی جب نعمت اللہ تیرا داماد بن چکا ہوگا۔ ابھی میں خاموش ہوا جاتا ہوں۔“

بیوی پھر خاموش ہوگئی۔

حکیم صاحب کو کسی پہلو چین ہی نہیں مل رہا تھا۔ بیوی کے پاس سے اٹھ کر اپنے شاگرد کے پاس پہنچ گئے اور اس سے ترنگ میں باتیں کرنے لگے۔ آج انہوں نے یہ طے کر لیا تھا کہ وہ اپنا حرف مدعا زبان پر لا کر ہی رہیں گے۔ وہ کچھ دیر تک تو ادھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے پھر ایک دم گریز اختیار کیا اور شاگرد سے پوچھا۔”میاں صاحبزادے؟ میں کیسا آدمی ہوں؟“

شاگرد نے جواب دیا۔”آپ کی خوبیاں احاطۂ تقریر میں نہیں آسکتیں، میں کس طرح اور کس زبان سے بیان کروں۔“

حکیم صاحب نے کہا۔”میاں صاحبزادے! جب کسی کی قسمت کو عروج حاصل ہوتا ہے تو کچھ ایسی ہی صورتیں نکلنے لگتی ہیں۔ اگر میں تم سے یہ کہوں کہ میں تمہیں دولت آباد کا وزیر بنا رہا ہوں تو تم کیا سوچو گے اور اس کا تمہارے دل و دماغ پر کیسا اثر پڑے گا؟“

شاگرد نے جواب دیا۔”استاد محترم! افسوس کہ آپ مجھ سے ایک ایسا سوال کر رہے ہیں جس کا میرے پاس ایک ایسا جواب ہے کہ آپ اس سے خوش نہیں ہوں گے لیکن میں جواب وہی دوں گا۔“

حکیم صاحب کو خیال گزرا کہ ان کا سیدھا سادا اور بھولا بھالا شاگرد واقف نہیں ہے کہ اس کو کیسا گراں مایہ تحفہ ملنے والا ہے۔ انہوں نے زور سے کہا۔”میں نے جو کچھ بھی کہا اس کا تیرے پاس کیا جواب ہے؟“

شاگرد نے پوچھا۔”آپ پہلے پوری خبر تو سنائیں۔ اس کے بعد مجھ سے میرا جواب لے لیں۔“

حکیم صاحب نے مختصر لفظوں میں بتا دیا۔”میاں صاحبزادے! جیسا کہ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ دولت آباد کی وزارت تیری منتظر ہے، میرے ساتھ چل میں تجھے اتنی اونچی اڑان پر لے جاؤں گا کہ تو زندگی بھر یہ یاد رکھے گا کہ کوئی کچھ کہتا تھا۔“

نعمت اللہ نے کہا۔”استاد محترم! میں آپ کا مطلب اب بھی نہیں سمجھا!“

استاد نے جواب دیا۔”میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ تجھے اپنی فرزندی میں لے لوں اور دولت آباد کے صوبے دار سے وزارت کا منصب تجھ کو دلوا دوں۔“

انہوں نے کہا۔”استاد محترم! میرا دل دنیا پر مائل نہیں ہے، میں وزارت حاصل کر کے کیا کروں گا؟“

استاد نے ذرا سختی سے کہا۔”بھائی تو کیسی بات کر رہا ہے۔ میں نے سارا معاملہ طے کر دیا ہے۔ اب این و آں اور قیل و قال کی کوئی ضرورت نہیں، اپنی زبان اپنے قابو میں رکھو پھر دیکھو کہ خدا کیا کرتا ہے۔“

نعمت اللہ خاموش ہوگئے۔ رات کو جب سب سو گئے تو انہوں نے اپنا مختصر سامان سمیٹا اور اس گھر کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیا۔ سیدھے پیر و مرشد شیخ محمد کے پاس پہنچے اور انہیں مطلع کیا۔ مرشد نے انہیں سینے سے لگا لیا اور کہا۔”اب بات ہوئی، میں تم سے بہت خوش ہوں کہ تم نے علم ظاہر تو حاصل کر لیا اور اپنے دل سے دنیا کی محبت نکال دی۔“

نعمت اللہ اپنے پیر و مرشد کے قدموں میں آنسو بہاتے رہے۔ آخر انہیں حکم ملا کہ فیروز پور جاؤ اور وہیں سکونت اختیار کرو۔ یہی اللہ کا حکم ہے۔

نعمت اللہ فوراً کھڑے ہوگئے، پوچھا۔”پیر و مرشد میرے لیے اور کوئی حکم؟“

مرشد نے جواب دیا۔”ہاں، چند نصیحتیں بھی گرہ میں باندھ لو۔ خدا کے بندوں کو نصیحتیں اور ہدایتیں کرتے رہنا اور جو نعمت تمہیں ملی ہے اس پر غنی نہ ہو جانا۔ تمہیں اور بزرگ بھی ملیں گے ان کو کچھ دینے کے بجائے ان سے حاصل کرنے کی کوشش کرنا، یہ سمجھ لینا کہ تمہیں کاسۂ گدائی ملا ہوا ہے۔ اس کو بزرگوں کے سامنے کر دینا۔ نفس کو کشتہ کرنا۔ بس یہی باتیں تمہارے کام آئیں گی۔“

نعمت اللہ نے اپنے مرشد کو الوداع کہا اور فیروز پور روانہ ہوگئے۔ فیروز پور کا ایک جنگل ان کا مسکن بن گیا۔ دنیا والوں سے دوری نے انہیں کپڑوں سے بھی محروم کر دیا۔ تن پر جو لباس تھا وہ بھی تار تار ہو کر رخصت ہوا۔ جنگلی پتوں اور چھالوں نے لباس کی جگہ لے لی۔ سردی، گرمی، برسات سارے ہی موسم آتے اور جاتے رہے۔ دل میں یاد الٰہی کی گرمی ایسی تھی کہ سردی اور برسات ان کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکے۔ سولہ سال اسی حال میں گزار دیے اور جب وہاں سے نکلے اور انسانوں کی بستی میں آئے تو بستی والے خوفزدہ ہوگئے۔ آپ کے جسم پر پتے بندھے ہوئے تھے۔ ایک دیہاتی نے یہ بند دیا اور اپنے گھر لے گیا۔ وہاں کسی طرح ستر پوشی کرائی۔ اس کے بعد آپ پھر مرشد کی خدمت میں پہنچے۔

کچھ دن بعد آپ ایک بار پھر اپنے پیر سے جدا ہوگئے اور اکبر آباد پہنچے۔ یہاں بھی دل نہ لگا تو خاندیس کا رخ کیا۔ اب آپ کا یہ طریقہ ہوگیا تھا کہ پیدل ہی گھومتے پھرتے رہتے۔ خاندیس کے ایک دیہات سے آپ گزر رہے تھے کہ ایک طرف سے گیت گانے کی آواز سنائی دی۔ کئی نوجوان لڑکیوں کی سریلی آوازوں میں چکی کی گھر گھر بھی شامل تھی گویا چکی ساز کا کام

کر رہی تھی۔ ان آوازوں نے انہیں کھینچ لیا اور نعمت اللہ بے اختیار ان لڑکیوں کی طرف کھنچ گئے۔

لڑکیوں نے دیکھا، ایک فقیر ان سے کچھ دور کھڑا ان کے گیت میں کھو گیا ہے۔ انہوں نے اور لہک لہک کر گانا شروع کر دیا۔ آپ نے کچھ دیر تو آواز کا لطف اٹھایا اور اس کے بعد چل کھڑے ہوئے۔ ایک لڑکی انہیں جاتے دیکھ کر پریشان ہوگئی۔ دور ہی سے آواز دی۔ ”شاہ جی! ذرا بات تو سنیے۔“

یہ رک گئے۔ مڑ کر دیکھا تو ایک حسین اور نوجوان پنہاری ان کی طرف بھاگی چلی آرہی تھی۔ وہ بھاگتے بھاگتے ہانپ گئی تھی۔ آپ نے پوچھا۔ ”بی بی! کیا بات ہے؟ خیریت تو ہے؟“

لڑکی نے کہا۔ ”شاہ جی! آپ وہاں کھڑے تھے تو اچھے لگتے تھے، پھر چلے کیوں آئے؟“

انہوں نے جواب دیا۔ ”بی بی! میں ایک تارک الدنیا مست الست درویش۔ تم سب کی آوازوں نے مجھے اپنی طرف کھینچ لیا تھا لیکن پھر جیسے ہی یہ خیال آگیا کہ بابا یہ دنیا ہے، تو لڑکیوں کے پاس جا کھڑا ہوا۔ گاؤں کے مرد دیکھیں گے تو کیا کہیں گے، معلوم نہیں کیا خیال کریں۔ اس لیے میں چل کھڑا ہوا۔“

لڑکی آپ کے آگے ہاتھ جوڑنے لگی، بولی۔ ”لیکن میں آپ کو یوں نہیں جانے دوں گی۔“

آپ نے کہا۔ ”اگر تیری یہی مرضی ہے تو لے، میں بیٹھا جاتا ہوں، میرے لیے ٹھنڈا پانی منگوا۔“

لڑکی نے فوراً ہی پانی پیش کیا۔ آپ نے پیا اور دعا دی۔ ”لڑکی! خدا تجھے صاحبِ اولاد کرے، اچھا سا بیٹا دے۔“

لڑکی نے شرما کر عرض کیا۔ ”شاہ جی! میری تو ابھی شادی بھی نہیں ہوئی۔“

آپ نے فرمایا۔ ”شادی ہوگی، شادی...... جانتی ہے یہ شادی کیا ہوتی ہے؟“

لڑکی نے معصومیت سے جواب دیا۔ ”شادی شادی ہوتی ہے اس کے علاوہ اور کیا ہوتی ہے؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”ہر شادی شادی نہیں ہوتی، بی بی بس کوئی کوئی شادی شادی ہوتی ہے۔ شادی یعنی خوشی...... تیری تو شادی ہی ہوگی۔ ایک اچھا سا بیٹا، شادی میں شادی، خوشی ہی خوشی۔“

لڑکی مارے خوشی کے رونے لگی، بولی۔ ”شاہ جی! میں ایک غریب پنہاری ہوں۔ میرے خاندان میں ایک بھی دولت مند نہیں اور جس شادی کی بات آپ کر رہے ہیں۔ وہ دولت کے بغیر ناممکن ہے۔“

آپ نے لڑکی کو تسلی دی۔ ”بی بی! میں نے کہہ جو دیا کہ تیری شادی ہوگی، تیرے خاندان میں دوسروں کی شادیاں نہیں ہوئیں۔ بس تیری شادی ہوگی۔ شادی...... شادی کو لکھ لے۔“

غریب پنہاری آپ کو دیکھتی رہ گئی اور آپ اسے حیران اور مشتاق چھوڑ کر اپنی راہ ہو لیے۔

ایک عرصہ بعد انہیں پھر اپنے مرشد کا خیال آیا اور یہ ان کی خدمت میں واپس گئے۔ پیر بہت خوش ہوئے اور انہیں اپنے ساتھ کھانے میں شریک کیا۔ آپ نے فرمایا۔ ”شریکِ طعام ہونے میں کوئی امر مانع نہیں ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں نے ایک عرصے سے یہ کھانا نہیں کھایا جو دسترخوانوں پر لگایا جاتا ہے۔“

پیر نے جواب دیا۔ ”میں تمہارے جذبے کی قدر کرتا ہوں لیکن تمہیں میرے ساتھ کھانا کھانا پڑے گا۔“

جب پیر نے زیادہ اصرار کیا تو آپ نے بہ مشکل پانچ نوالے کھا لیے اور اس کے بعد تو یہ پانچ نوالے مستقل طور پر آپ کی غذا قرار پائے۔

کچھ دن اپنے پیر کی صحبت میں گزار کر آپ نے گجرات کا سفر کیا۔ گجرات کے شیخ شاہ عالم درویش نے ان کی شاندار پذیرائی کی بعد میں شاہ عالم درویش کے فرزند سید جلال سے ان کی دوستی ہوگئی۔ شاہ عالم نے نعمت اللہ سے کہا۔

”برادرِ عزیز! میں چاہتا ہوں کہ میرے فرزند سید جلال کی تربیت تم کرو۔“

آپ نے جواب دیا۔ ”حضرت! مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے، میں ہر وقت آمادہ رہتا ہوں۔“

باپ نے اپنے بیٹے کا ہاتھ نعمت کے ہاتھ میں دے دیا اور فرمایا۔ ”بس بابا، یہی ایک فکر تھی جس نے مجھے پریشان کر رکھا تھا۔ بابا نعمت اللہ تم نے میری یہ پریشانی دور کر دی۔“

نعمت اللہ نے سید جلال کو سلوک کی تربیت دینا شروع کر دی۔ یہ صحبت اور استادی شاگردی بعد میں گہری دوستی میں بدل گئی۔ کچھ دنوں بعد شاہ عالم کا وصال ہوگیا اور آپ نے سید جلال کے پاس مستقل رہائش اختیار کر لی۔

یہ نور الدین جہانگیر کا دورِ فرماں روائی تھا۔ جہانگیر نے گجرات کا سفر کیا تو آس پاس کے علاقوں میں ایک دھوم مچ گئی۔

سید جلال بھی بادشاہ کی آمد سے بے حد خوش ہوئے۔ بادشاہ گجرات میں داخل ہوئے تو استقبال کرنے والوں میں سید جلال بھی شامل تھے لیکن نعمت اللہ اپنے حجرے سے باہر تک نہیں نکلے۔ بادشاہ نے سید جلال کو ملازمت شاہی عطا کی اور انہوں نے اسے قبول کر لیا۔

چونکہ نعمت اللہ کا شہرہ دور دور تک پھیل چکا تھا اس لیے یہ خبریں بادشاہ کے کانوں تک بھی پہنچ گئیں۔ خان جہاں بادشاہ کے آگے پیچھے تھا، جہانگیر نے تخلیہ میں خان جہاں کو طلب کیا اور پوچھا۔ ”خان بابا! آپ خود ایک دیندار انسان ہیں۔ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ اس سرزمین پر بھی کوئی ایسا شخص موجود ہے جس کا دور دور کوئی ثانی نہ ہو اور اسے قربِ الٰہی بھی حاصل ہو اور ظاہری اور باطنی علوم سے بھی مالا مال ہو۔“

خان جہاں نے جواباً عرض کیا۔ ”حضور والا! اس وقت بس ایک ہی ذات ایسی ہے جس کا دور دور کوئی ثانی نہیں اور جس کے ظاہری اور باطنی علوم کا کوئی کنارہ نہیں۔“

بادشاہ نے پُرشوق نظروں سے خان بابا کو دیکھا اور پوچھا۔ ”یہ بزرگ کہاں ملیں گے؟“

خان جہاں نے جواب دیا۔ ”جہاں پناہ! نعمت اللہ اپنے سید جلال کے روحانی استاد بھی ہیں اور انہی کی خانقاہ میں رہتے ہیں۔“

جہانگیر نے کسی قدر تذبذب سے کہا۔ ”خان بابا! کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ انہیں دربار میں بلا لیا جائے؟“

خان جہاں نے فکر مند لہجے میں جواب دیا۔ ”حضور کا فرمان اپنی جگہ لیکن جہاں تک نعمت اللہ کا تعلق ہے، یہ دربار سرکار سے بھاگتے ہیں، مجھے یقین نہیں کہ وہ حاضری پر آمادہ ہو جائیں۔“

بادشاہ نے کہا۔ ”خان بابا! آپ کا تو خاصا دبدبہ ہے اور لوگ آپ کا خیال بھی بہت کرتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اگر نعمت اللہ کو آپ مجبور کریں گے تو وہ ضرور آجائیں گے۔ یہ کام کسی اور کے بس کا ہرگز نہیں۔“

خان جہاں اداس اور فکر مند بادشاہ سے جدا ہوئے اور نعمت اللہ کی خدمت میں پہنچ گئے۔ خان جہاں نے اپنے لیے پائنتی پسند کی۔ نعمت اللہ نے اپنے پاؤں سمیٹ لیے اور کہا۔ ”بابا! یہ تم کہاں بیٹھ گئے ہو؟“

خان جہاں نے جواب دیا۔ ”حضرت! آپ کی یہی مہربانی کیا کم ہے کہ آپ ہم دنیا داروں کو اپنی صحبت سے بھگاتے نہیں حالانکہ دوسروں میں یہ ضبط و تحمل نہیں ہے۔“

نعمت اللہ نے کہا۔ ”بابا! اپنے اپنے ظرف کی بات ہے، خدا ان پر رحم کرے (آمین)“

خان جہاں خاموش بیٹھ گیا اور اپنی طرف سے ایک بات بھی نہیں کی۔ کچھ دیر بعد کہنے لگا۔ ”حضرت! اگر آپ اجازت دیں تو میں کچھ عرض کروں؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”خان جہاں! یہ سلطانی دربار نہیں، فقیر کی کٹیا ہے، جو کہنا ہے صاف صاف کہہ دو۔ اس میں شرم کیسی؟ ندامت کیسی؟ ندامت کیوں؟ خجالت کس لیے؟“

خان جہاں نے عرض کیا۔ ”حضرت! بادشاہ کی خواہش ہے کہ وہ آپ سے شرفِ ملاقات حاصل کرے۔ عاجز نے وعدہ کر لیا ہے کہ زیارت کراؤں گا۔ آپ کے اخلاق کریمانہ سے امید کرتا ہوں کہ شرمندہ نہیں ہونے دیں گے۔“

آپ نے جواب دیا۔ ”خان بابا! افسوس کہ میں بادشاہ سے نہیں مل سکوں گا کیونکہ یہ درویشی کے مسلک کے خلاف ہے۔ مجھے اپنی درویشی عزیز ہے۔“

خان جہاں نے بڑی کوشش کی کہ نعمت اللہ راضی ہو جائیں لیکن وہ نہیں راضی ہوئے۔ آخر تھک کر خاموشی اختیار کی۔ جہانگیر کو خان جہاں کا انتظار تھا۔ بادشاہ کو یقین تھا کہ درویش کو ملاقات پر ضرور آمادہ کر لیں گے۔ لیکن جب یہ جواب ملا کہ نعمت اللہ بادشاہ سے نہیں ملیں گے تو جہانگیر کو بڑا غصہ آیا۔ اس نے قدرے ترشی سے کہا۔ ”خان بابا! میں آپ کو اتنا معمولی آدمی نہیں سمجھتا تھا۔ آپ اس درویش کو میرے پاس تک آنے پر راضی نہ کر سکے، خوب!“

خان جہاں نے جواب دیا۔ ”جہاں پناہ! میں خود حیران ہوں کہ نعمت اللہ پر میری کسی بات کا اثر ہی نہیں ہوتا۔“

جہانگیر نے کہا۔ ”اور میں نے بھی یہ طے کر لیا ہے کہ ان سے ملوں گا ضرور۔“

خان جہاں لرز کر رہ گیا کہ دیکھیے بادشاہ کی ضد کیا رنگ لاتی ہے۔ اس نے سوچا اگر بادشاہ نے نعمت اللہ کے ساتھ سختی یا زیادتی کی تو یہ بات بہت بری ہوگی اور درویش کو بادشاہ پر غصہ آگیا اور ان کے منہ سے کوئی ایسی ویسی بات نکل گئی تو بہت برا

ہوگا۔ بادشاہ سے درخواست کی۔ ''حضوروالا! میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ بات کو زیادہ نہ بڑھایئے۔ درویش کو اس کے حال میں مست رہنے دیجیے۔ کیونکہ فقیر کی برہمی، برہمیٔ سلطنت کا سبب بن سکتی ہے۔''

جہانگیر نے جواب دیا۔ ''خان بابا! میری بات سمجھنے کی کوشش کرو، میں شاہ عالم کے مزار پر حاضری دوں گا، وہیں نعمت اللہ سے ملاقات ہوجائے گی۔''

خان جہاں کو بات بنتی نظر آئی، کہا۔ ''حضور کی یہ تدبیر مناسب معلوم ہوتی ہے۔ شاید اس طرح ملاقات ہوجائے گی۔''

اس کے بعد اعلان کردیا گیا کہ بادشاہ شاہ عالم کے مزار پر فاتحہ خوانی کی غرض سے جانے والے ہیں ۔ سید جلال نے نعمت اللہ سے کہا ''چلیے یہ بڑی اچھی صورت نکل آئی۔ بادشاہ آپ سے ملنا چاہتا ہے اور آپ اس کے پاس جانا نہیں چاہتے، اب بادشاہ آپ کے پاس چل کر خود ہی آرہا ہے۔''

نعمت اللہ نے جواب دیا۔ ''لیکن وہ مجھ سے ملنے تو نہیں آرہا ہے، فاتحہ پڑھنے آرہا ہے۔ پڑھ کر واپس چلے جانا چاہیے' ہم درویشوں کو کیوں تنگ کرے گا۔''

سید جلال نے بادشاہ کی طرف داری کی۔ ''حضرت! آخر ملاقات میں ہرج کیا ہے؟''

نعمت اللہ نے جواب دیا۔ ''ہرج ہے۔ بہت بڑا ہرج ہے، میں اس ہرج سے واقف ہوں اسی لیے بادشاہ سے ملنا نہیں چاہتا۔''

اعلان کے بعد بادشاہ اپنے آدمیوں کے ساتھ خانقاہ میں پہنچ گیا۔ شیخ شاہ عالم کے مزار پر فاتحہ پڑھی اور اس کے بعد خانقاہ کے معائنے کے بہانے ایک ایک حجرے میں جانے لگا۔ سید جلال بادشاہ کے ساتھ ساتھ تھے۔ خان جہاں بھی سید جلال کا ساتھ دے رہا تھا۔ بادشاہ نے ایک حجرے کے سامنے رک کر پوچھا۔ ''سید جلال! میں نے نعمت اللہ کا ذکر سنا تھا اور یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ اسی خانقاہ کے کسی حجرے میں تشریف فرما ہیں۔ آخر وہ کون سا حجرہ ہے مجھے بھی تو اس درویش سے ملواؤ۔''

سید جلال انہیں نعمت اللہ کے حجرے میں لے گئے۔ وہ خالی پڑا تھا۔ بادشاہ نے کہا۔ ''یہاں تو کوئی بھی نہیں، یہ خالی پڑا ہے۔ شاہ صاحب کہاں چلے گئے؟''

سید جلال نے سر جھکالیا۔ آہستہ سے بولے۔ ''معلوم نہیں کیوں شاہ نعمت اللہ بادشاہوں سے بھاگتے ہیں اور اس خاکسار کو شرمندہ کرتے ہیں۔''

نعمت اللہ کے ٹل جانے سے ہر ایک کو شرمندگی ہورہی تھی۔ بادشاہ کو ملاقات نہ ہونے کا بہت ملال تھا لیکن اس کا اظہار نہیں کیا۔ خان جہاں نظریں چراتا رہا۔

اسی شام کو خان جہاں، نعمت اللہ کے پاس پہنچا اور ادھر ادھر کی باتیں شروع کردیں۔ بتدریج موضوع بدلتا گیا اور آخر بادشاہ کے ذکر میں بدل گیا۔ خان جہاں نے کہا۔ ''جہانگیر کا دم بھی غنیمت ہے۔ مغلوں میں ایسا شریف اور فقراء سے عقیدت اور محبت رکھنے والا کوئی حکمران نہیں گزرا۔ کہنے کو تو جہانگیر پورے ملک کا بادشاہ ہے مگر طبیعت میں عاجزی اور انکسار ایسا کہ ایک کامل درویش کے در کی جبہ سائی کو اپنے لیے فخر اور شان کی بات سمجھتا ہے۔ حیثیت شاہی مزاج فقیری۔ میں تو بادشاہ کی ارادت مندی کو اپنی خوش نصیبی سمجھتا ہوں۔''

آپ خاموش رہے کوئی جواب نہ دیا۔ خان جہاں بہت پریشان تھا۔ زچ ہو کر بولا۔ ''حضرت! آپ تو کچھ بولتے ہی نہیں۔ خود آپ کا بادشاہ کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''میں اس شخص کے بارے میں کیا رائے دوں جس سے میں واقف نہیں، تم اچھا کہتے ہو تو اچھا ہی ہوگا کیونکہ تم بادشاہ کو مجھ سے زیادہ بہتر سمجھتے ہو۔''

خان جہاں نے عرض کیا۔ ''بادشاہ اچھا آدمی ہے آپ اس کا اقرار فرمارہے ہیں، پھر اس اچھے آدمی سے ملاقات کرنے میں کیا چیز مانع آرہی ہے؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''خان بابا! میں نے بادشاہ کو اچھا نہیں کہا۔ اسے تم اچھا کہہ رہے ہو۔''

خان جہاں نے عرض کیا۔ ''حضرت! بادشاہ کی خواہش ہے کہ آپ سے شرف ملاقات حاصل کرے۔ اگر آپ اس پر توجہ فرمائیں تو میں بطور خاص شکر گزار ہوں گا۔''

آپ نے جواب دیا۔ ''لیکن میں بادشاہ سے نہیں ملنا چاہتا۔''

خان جہاں نے عرض کیا۔ ''چلیے آپ نہیں ملنا چاہتے تو کوئی بات نہیں، میں بادشاہ کو یہیں بلالوں گا۔ آپ اس کی اجازت دے دیجیے۔''

آپ سنبھل کر بیٹھ گئے، بولے۔ ''خان جہاں! ایک بات تو بتاؤ!''

خان جہاں نے عرض کیا۔ ''پوچھیے۔''

آپ نے پوچھا۔ ''صحبت کا اثر ہوتا ہے یا نہیں؟''

خان جہاں نے جواب دیا۔ ''بالکل ہوتا ہے۔''

آپ نے فرمایا۔ ''اگر اثر ہوتا ہے تو بادشاہ کو فقیر کی صحبت سے اور فقیر کو بادشاہ کی صحبت سے بچنا چاہیے۔ میں ٹھہرا فقیر اگر بادشاہ کی صحبت کا اثر مجھ پر ہوگیا تو میری گدڑی چھن جائے گی اور اگر میری صحبت بادشاہ پر اثر کر گئی تو اس کا اثر امور سلطنت پر پڑے گا اور ملک تباہ ہوجائے گا۔''

خان جہاں نے ایک دم سکوت اختیار کیا۔ خان جہاں لاجواب ہوچکا تھا۔

خان جہاں نے بادشاہ کو مطلع کیا کہ شاہ صاحب بادشاہ سے نہیں ملیں گے۔ جہانگیر ناراض ہو کر واپس چلا گیا۔ کچھ عرصہ بعد بادشاہ نے درباری علما سے کہا کہ قرآن پاک کا ایک ایسا فارسی ترجمہ تیار کیا جائے جس میں ترجمہ اور اصل کے حروف برابر برابر ہوں۔ بادشاہ کا حکم تھا، کسی میں دم مارنے کی ہمت نہ تھی۔ علمائے وقت اور فضلائے عصر سر جوڑ کر بیٹھے اور اس کام میں مہینوں ضائع کردیے اور دو پاروں کا ترجمہ تیار کرلیا۔

بادشاہ نے دیکھا اور عربی اور فارسی کے حروف کی گنتی کرائی۔ مگر کام سے مطمئن نہ ہوا، پوچھا۔ ''بقیہ کام کب تک ہوجائے گا؟''

ایک عالم وفاضل شخص نے اپنے ساتھیوں کی طرف سے جواب دیا۔ ''بندہ پرور! یہ کام ہماری استطاعت اور لیاقت سے بالا ہے اگر حضور اتنے ہی پر اکتفا فرمائیں تو عین بندہ پروری ہوگی۔''

بادشاہ برہم ہوگیا۔ ''میں کچھ نہیں جانتا، گویا پورے ملک میں ایک عالم بھی ایسا نہیں جو اس کام کو انجام دے سکے۔ گویا پورا ملک نالائقوں سے بھرا ہوا ہے۔''

اس عالم نے عرض کیا۔ ''حضوروالا۔ ہماری نظر میں بس ایک ہی ایسا شخص ہے جو اس کام کو انجام دے سکتا ہے۔''

بادشاہ نے پوچھا۔ ''وہ کون؟''

عالم نے جواب دیا۔ ''وہ ہیں شاہ نعمت اللہ صاحب۔ جو سید جلال کے گہرے دوست ہیں، وہ اگر چاہیں تو یہ کام ہوسکتا ہے۔''

بادشاہ نے منہ بنا کر کہا۔ ''یہ انہی شاہ صاحب کا ذکر ہورہا ہے نا جنہوں نے مجھ سے ملاقات تک نہیں کی اور جب میں ان کے حجرے میں خود پہنچ گیا تو وہ حضرت وہاں سے غائب ہوگئے۔''

عالم نے عرض کیا۔ ''حضوروالا نے بجا ارشاد فرمایا۔ میں انہی شاہ صاحب کا ذکر کررہا ہوں، اگر وہ اس کام پر آمادہ ہوجائیں تو یہ مشکل کام بہ آسانی ہوجائے گا۔''

بادشاہ نے کہا۔ ''لیکن یہ کام ان سے کرائے گا کون؟''

عالم نے جواب دیا۔ ''سید جلال، جو ملازمت شاہی میں ہیں، شاہ نعمت اللہ ... کے مرید بھی ہیں۔ ان کا شاہ صاحب پر بڑا اثر ہے۔ جب سید جلال ان سے اس کام کے لیے کہیں گے تو وہ ضرور کردیں گے۔''

بادشاہ نے اسی وقت ایک فرمان سید جلال کے نام جاری کردیا اور اس میں انہیں حکم دیا کہ ''سید جلال کو حکم دیا جاتا ہے کہ وہ شاہ نعمت اللہ سے قرآن کا فارسی ترجمہ اس التزام سے تیار کرائیں کہ جتنے حروف عربی اصل کے ہوں اتنے ہی فارسی ترجمے میں ہوں اور یہ ترجمہ ہمیں جلد از جلد روانہ کردیا جائے۔''

سید جلال نے یہ فرمان وصول کیا تو ان کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ وہ بہت پریشان ہوگئے۔ چہرہ زرد پڑ گیا۔ اپنے کسی مرید سے کہا۔ ''یہ ضرور کسی مخالف کی شرارت ہے۔ ورنہ میں تو اتنا عاجز اور مجبور انسان ہوں کہ شاہ نعمت اللہ سے ان کی مرضی کے خلاف کوئی کام کبھی نہیں لے سکتا۔''

لیکن اس فرمان سے چشم پوشی بھی نہیں کرسکتے تھے۔ فرمان لیے ہوئے شاہ نعمت اللہ کی خدمت میں پہنچے اور سر جھکا

کر بیٹھ گئے۔ شاہ صاحب نے پوچھا۔ ''سید جلال! کیا بات ہے؟''

سید جلال نے شاہی فرمان آپ کی طرف بڑھا دیا۔ آپ نے فرمان پڑھ کر دریافت کیا۔ ''تو اس میں پریشانی کی کیا بات ہے؟''

سید جلال نے کہا۔ ''اس میں پریشانی کی بات یہ ہے کہ میں بادشاہ کی ملازمت میں ہوں، میں خود یہ کام نہیں کر سکتا اور آپ سے کہہ نہیں سکتا، بادشاہ کو اس کا کیا جواب دوں؟''

آپ نے اپنا سر جھکا لیا۔ کچھ دیر سوچتے رہے، پھر فرمایا۔ ''سید جلال! تمہارا بادشاہ سے ملازمت کا تعلق ہے۔ میں ترجمہ کروں گا، لفظی بھی یا محاورہ بھی۔ حرف بہ حرف آسان عبارت میں، تم بادشاہ سے دریافت کرو کہ قرآن میں جہاں جہاں قصے بیان ہوئے ہیں ان کی تشریح کروں یا نہ کروں؟''

سید جلال نے بادشاہ کو لکھ دیا کہ ترجمہ کا کام ہو جائے گا لیکن اس کی وضاحت کی جائے کہ قرآنی قصص کی تشریح کی جائے یا نہیں؟

بادشاہ نے جواب میں لکھ دیا۔ ''اس کی ضرورت نہیں ہے، بس اس کا خیال رہے کہ ترجمہ کے حروف قرآن کے حروف سے زیادہ نہ ہوں۔''

آپ نے ترجمہ کا کام شروع کر دیا اور... دو ماہ کی قلیل مدت میں پورے قرآن کا ترجمہ کر ڈالا۔ سید جلال نے قرآن کے حرفوں کی تعداد کو ترجمہ کے حرفوں سے ملایا تو دونوں برابر نکلے۔ سید جلال اتنے خوش ہوئے کہ مارے خوشی کے ان کی زبان سے لفظ نہیں نکلتے تھے۔ انہوں نے ترجمہ روانہ کرنے سے پہلے شاہ صاحب سے پوچھا۔ ''اس کا نام کیا رکھا جائے؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''سید جلال! تمہاری ملازمت شاہی اور بادشاہ کی خوشنودی کے خیال سے میں نے اس کا نام ''ترجمۂ جہانگیری'' تجویز کیا ہے۔''

چنانچہ یہ ترجمۂ جہانگیری بادشاہ کو روانہ کر دیا گیا۔ جہانگیر نے اس ترجمے کو جگہ جگہ سے جانچا پرکھا۔ ترجمہ کا اصل عربی کے مفہوم سے موازنہ کیا۔ دونوں زبانوں کے حرفوں کو گنا، ہر چیز شاندار، خواہش اور توقع سے کہیں زیادہ معیاری تھی۔ بادشاہ نے اس ترجمے کی نمائش کی اور ان علما اور فضلا کو دکھایا جو اس کوشش میں ناکام رہے تھے۔ سبھی نے شرم وندامت سے گردنیں جھکا لیں۔

بادشاہ کے دل میں ملاقات کی آرزو پھر سے بیدار ہو گئی۔ وہ شاہ صاحب کی ایک جھلک دیکھنے کا خواہش مند تھا۔ اس نے جب یہ دیکھا کہ شاہ نعمت اللہ، سید جلال کی اتنی بات مانتے ہیں کہ ان کی وجہ سے اتنا مشکل اور اہم کام دو ماہ میں کر دیا تو اس نے سید جلال پر دباؤ ڈالنا شروع کر دیا۔ اس نے سید صاحب کو لکھا۔

''سید جلال کو معلوم ہو کہ مابدولت نے ترجمۂ جہانگیری کو اپنی توقع سے بڑھ کر پایا۔ اس سے یہ اندازہ بھی ہوا کہ حضرت شاہ نعمت اللہ آپ کا کس قدر خیال کرتے ہیں۔ ان سے کہیے کہ بادشاہ آپ سے ملنا چاہتا ہے۔ اگر وہ خود نہ آسکیں تو مجھے اجازت دیں کہ میں حاضر ہو جاؤں۔ ملاقات ازبس ضروری ہے۔''

سید جلال نے بادشاہ کا خط شاہ صاحب کو دکھا دیا۔ آپ نے فرمایا۔ ''بادشاہ کی یہ زیادتی ہے کہ وہ ملاقات پر اصرار کر رہا ہے جبکہ میں بہت پہلے ہی اس سے انکار کر چکا ہوں۔''

سید جلال نے عرض کیا۔ ''حضرت! ترجمۂ جہانگیری سے بادشاہ نے یہ اندازہ لگا لیا ہے کہ آپ میرا خیال فرماتے ہیں اس کے بعد بادشاہ میں اتنی ہمت پیدا ہوئی کہ یہ خط لکھ دیا۔''

آپ نے فرمایا۔ ''سید جلال! تم فکر نہ کرو، بادشاہ کو جواب میں لکھ دو کہ نعمت اللہ ملاقات کے لیے تیار نہیں۔''

سید جلال نے بادشاہ کو لکھ دیا۔ بادشاہ نے سید جلال کی جاگیر ضبط کر لی اور لکھ دیا کہ جب تک شاہ صاحب کو ملاقات پر آمادہ نہیں کر لو گے مدد معاش کا فرمان تنسیخ اور جاگیر کی ضبطی کا حکم برقرار رہے گا۔ شاہ صاحب سے ملاقات کرا دو اور سابقہ مراعات حاصل کر لو۔

سید جلال بدحواس ہو گئے، وہ چلچلاتی دھوپ میں گھر میں داخل ہوئے اور عتاب نامہ شاہ صاحب کے ہاتھ میں تھما دیا۔

آپ نے سب کچھ پڑھ کر فرمایا۔ ''سید جلال! اس میں پریشانی کی کیا بات ہے! دھوپ سے چل کر آئے ہو۔ ذرا دم تو لو' آرام کرو۔''

سید جلال نے عرض کیا۔ ''حضرت! میں کس طرح اطمینان کروں، بادشاہ مجھ سے ناراض ہے اور میں گجرات میں بیٹھ کر اس کو اس وقت تک راضی نہیں کر سکتا جب تک کہ اس کی آپ سے ملاقات نہ کرا دوں۔''

آپ نے فرمایا۔ ''اگر تمہاری کارسازی میری ذات پر منحصر ہے تو میں بادشاہ کے پاس چلا چلوں گا، تم کیوں پریشان ہوتے ہو۔ دھوپ نے تمہیں کچھ زیادہ ہی پریشان کر دیا ہے، کچھ دیر آرام کر لو۔''

سید جلال نے یہ مژدہ جو سنا تو جان میں جان آئی۔ دھوپ نے انہیں واقعی پریشان کر دیا تھا۔ وہ سونے کے لیے بستر پر جو گئے تو فوراً ہی نیند آگئی۔ شاہ صاحب نے ایک خدمت گار کو حکم دیا کہ کھڑے ہو کر پنکھا جھلتا رہے۔

سید جلال کو سوتا چھوڑ کر آپ نے کاغذ اور قلم سنبھالا اور خط لکھنے لگے۔

''سید جلال! میں تمہاری ہر مشکل اور مہم کا غوث الثقلین کی طرف سے ذمے دار ہوں۔ تمہارے کام تمہاری خواہش کے مطابق بن جائیں گے۔ فکر نہ کرو اور مجھ کو اپنا معین سمجھو۔ وسوسوں کو دل سے نکال دو۔ اب ہم رخصت ہوتے ہیں، جرنہ میں ملاقات ہوگی۔ فقیر نعمت اللہ۔''

آپ نے رقعہ قلمدان میں چھوڑا اور صحرا کی طرف نکل گئے۔

سید جلال بیدار ہوئے اور شاہ صاحب کو اپنے پاس نہ دیکھ کر پریشان ہو گئے۔ ادھر اُدھر تلاش کیا اور قلمدان میں رکھے ہوئے خط کو پڑھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ آپ کی تلاش میں آدمی چھوڑ دیے گئے لیکن کہیں پتا نہ چلا۔

چند دنوں بعد بادشاہ کی طرف سے مدد معاش کا پروانہ اور جاگیر کی بحالی کا فرمان دوبارہ وصول ہوا۔ بادشاہ نے سید جلال کو لکھا تھا کہ اس سے پہلے جو کارروائی کی گئی تھی وہ غصے کا اظہار تھا۔ جب مابدولت کا غصہ سرد پڑا تو پشیمانی ہوئی اور فوراً ہی مدد معاش کا پروانہ اور جاگیر کی بحالی کا فرمان جاری کر دیا۔ شاہ صاحب سے کہہ دو کہ اگر وہ مجھ گناہگار سے نہیں ملنا چاہتے تو نہ ملیں مگر مجھے دعاؤں میں ضرور یاد رکھیں۔

اب سید جلال کا عجب حال تھا۔ وہ شاہ صاحب کا رقعہ بار بار پڑھتے اور روتے رہتے۔ بعد میں مدتوں یہ حال رہا کہ شاہ صاحب کا رقعہ دن میں ایک بار ضرور پڑھتے اور آنسو بہانے لگتے۔

☆☆☆

آپ چلتے چلتے تھک گئے۔ گرمی بلا کی تھی۔ سر پر بھی کچھ نہ تھا اور پاؤں بھی جوتوں سے خالی تھے۔ ایک گھنیرا سایہ دار درخت دیکھا تو اس کے نیچے تنے سے پشت لگا کر بیٹھ گئے۔ آنکھیں بند کیں تو مراقبے میں چلے گئے۔ کچھ دیر بعد کسی طرف سے ایک کالا سانپ رینگتا ہوا آپ کے پاؤں کے پاس آیا۔ پھن اٹھا کر آپ کی طرف دیکھا اور پھر ایک پاؤں پر سر رکھ کر پڑا رہا۔ کچھ دیر بعد آپ نے آنکھیں کھول کر سانپ کی طرف دیکھا اور دوبارہ آنکھیں بند کر لیں۔

سانپ نے ذرا دیر بعد پھر پھن اٹھایا اور آپ کی طرف دیکھا اس کے بعد جدھر سے آیا تھا اسی طرف واپس چلا گیا۔

آپ مراقبے سے نکل کر پھر چل پڑے۔ چلتے چلتے اس گاؤں میں داخل ہو گئے جہاں چند نوجوان پنہاریوں کا چکّی پر گیت سنا تھا اور ایک پنہاری کو دعائیں دی تھیں۔ جس جگہ چکّی پیسنے کا منظر دیکھا تھا اب وہاں ایک محل کھڑا تھا، شاندار محل، یہ اس جگہ کھڑے ہو کر اس لڑکی کو یاد کرنے لگے جس نے آپ کو روک کر ٹھنڈا پانی پلایا تھا اور آپ کی دعائیں لی تھیں۔

کچھ دیر بعد ایک بوڑھی عورت آئی اور کہا۔ ''شاہ جی! آپ کو محل میں یاد کیا جا رہا ہے۔''

آپ نے پوچھا۔ ''محل میں کون یاد کر رہا ہے مجھے؟''

عورت نے جواب دیا۔ ''محل کی مالکن۔ آپ چلیں تو سہی۔''

آپ عورت کے ساتھ محل میں گئے تو اسی پنہارن کو اپنے سامنے کھڑا دیکھا۔ لیکن اب وہ بیگم صاحبہ کے روپ میں کھڑی تھی۔ وہ کچھ دیر آپ کو دیکھتی رہی۔ اس کے بعد قدموں میں گر گئی، بولی۔ ''شاہ جی! آپ کہاں چلے گئے تھے۔ میں نے تو آپ کو معلوم نہیں کہاں کہاں تلاش کرایا۔''

آپ نے جواب دیا۔ ''بی بی! ہم فقیر لوگ کہاں ملتے ہیں۔ آج یہاں کل وہاں۔ مسافروں کی طرح مارے مارے پھرتے رہتے ہیں۔''

لڑکی نے کہا۔ ''بابا میری شادی ہو چکی ہے۔ میرا ایک بچہ بھی ہے، میرا شوہر شکار کھیلنے گیا ہوا ہے۔ آپ اس محل میں قیام کریں۔ میرا شوہر آپ سے ملنے کا خواہش مند ہے۔''

آپ نے جواب دیا۔ ”بی بی تجھے دیکھ لیا، خوش ہو گیا۔ محل تجھی کو مبارک، ہم فقیروں کو محل کہاں راس آیا ہے۔“
لڑکی نے کہا۔ ”شاہ جی! یہ جو کچھ بھی ہے، آپ ہی کے طفیل ہے، میں آپ کو نہیں جانے دوں گی۔“
آپ نے فرمایا۔ ”لڑکی! ضد نہ کر۔ تجھ کو دیکھ کر جی خوش کر لیا۔ اب فقیر نہیں ٹھہرے گا۔“
جب لڑکی نے یہ محسوس کر لیا کہ شاہ جی کسی قیمت پر بھی نہیں رکیں گے تو وہ اندر جاتے ہوئے بولی۔ ”بابا جی! میں ابھی آئی چند لمحوں میں۔“
اس کے بعد اس طرح واپس آئی کہ اس کی گود میں ایک بچہ تھا اور ہاتھ میں روپوں کی تھیلی تھی۔ لڑکے کو آپ کے قدموں میں ڈال دیا اور بولی۔ ”بابا جی! یہ آپ کا خادم ہے، اس کی آپ ہی نے بشارت دی تھی۔“ اس کے بعد روپوں کی تھیلی آپ کی گود میں ڈال دی، بولی۔ ”یہ بھی آپ ہی کی دعاؤں کے طفیل ہے، میرے پاس جو کچھ بھی ہے آپ ہی کا ہے۔ اگر آپ قیام نہیں فرماتے تو نہ سہی یہ حقیر سا نذرانہ ہی قبول فرما لیں۔“
آپ نے جواب دیا۔ ”بی بی! تو کیوں مجھے شرمندہ کرتی ہے۔ خدا نے جو کچھ تجھے دیا ہے اس کا شکر ادا کر۔ میں نے تیرے روپے بھی قبول کر لیے لیکن اب انہیں تو میری طرف سے اپنے بچے کو دیدے۔“
لڑکی آزردہ ہو گئی، بولی۔ ”شاہ جی! آپ میرا دل توڑ رہے ہیں۔ آپ میری طرف سے کچھ قبول ہی نہیں کر رہے۔“
آپ نے مسکرا کر کہا۔ ”اچھا اگر یہ بات ہے تو میں اس میں سے ایک روپیہ لے لیتا ہوں۔“ اس کے بعد تھیلی میں سے ایک روپیہ نکال کر جیب میں رکھ لیا۔ ”اب تو، تو خوش ہے!“
لڑکی کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں، بولی۔ ”ہاں اب خوش ہوں۔“
جب آپ لڑکی سے رخصت ہوئے تو وہ بلک بلک کر رونے لگی۔ آپ نے دو چار قدم چل کر گھوم گھوم کر محل کی طرف دیکھا۔ وہ لڑکی بھی اس وقت تک آپ کو برابر دیکھتی رہی جب تک آپ اسے نظر آتے رہے۔
آپ نے وہ روپیہ وہاں کے تکیہ دار کو دے دیا اور اپنی راہ لی۔

☆☆☆

آپ فیروز پور واپس آ گئے اور کچھ دن قیام کر کے پھر سیاحت کی غرض سے نکل کھڑے ہوئے۔ بہار گئے اور بہار سے ٹانڈے پہنچے۔ ٹانڈے میں چند دن قیام کیا اور بنگال چلے گئے۔ جہانگیر (ڈھاکا) کا صوبے دار اسلام خان چشتی آپ کا بڑا معتقد تھا، اس نے بیس گاؤں کا وقف آپ کے نام کرنا چاہا مگر آپ نے انکار کر دیا۔
بنگالے کے ہفت ہزاری نواب خان خاناں اور پنج ہزاری مہابت خان ...... آپ کی قدم بوسی میں فخر محسوس کرتے تھے۔ مہابت خان کو بادشاہ نے اپنے پاس بلا لیا۔ ان کی جگہ ان کے بیٹے خانہ زاد خان کو بنگالے کا صوبے دار مقرر کر دیا۔ مہابت خان جاتے وقت بہت اداس تھا۔ آپ نے پوچھا۔ ”مہابت خان ...... تجھے بادشاہ نے بلایا ہے تو جا۔ اس میں پریشانی کی کیا بات ہے؟“
مہابت خان نے عرض کیا۔ ”حضرت! میں تو جا رہا ہوں، اب یہاں میرا لڑکا اور آپ کا غلام خانہ زاد خان آئے گا۔ میں اس کی طرف سے فکر مند ہوں کہ کہیں پریشانی نہ اٹھانی پڑے۔“
آپ نے جواب دیا۔ ”تو بے فکر ہو کر جا۔“
مہابت خان نے عرض کیا۔ ”حضرت! میں یہ چاہتا ہوں کہ اس پر آپ کی توجہ رہے اور وہ ہاتھ پاؤں بچا کر راست روی اختیار کرے۔“
آپ نے جواب دیا۔ ”مہابت خان! اس کے لیے میں جو کام کر سکتا ہوں وہ یہ ہے کہ کسی بھی خطرے کی آمد سے ایک ماہ پیشتر اس کو مطلع کر دوں، ماننا نہ ماننا اس کا کام ہے۔“
مہابت خان نے خوش ہو کر کہا۔ ”بس میرے لیے اتنی ہی بات کافی ہے۔ خانہ زاد خان آپ کا غلام ہے۔ اسے آپ کی یہ بات ماننی ہو گی۔ میں اس کو اچھی طرح سمجھا دوں گا۔“
مہابت خان چلا گیا۔ اس نے اپنے بیٹے خانہ زاد خان کو اچھی طرح سمجھا بجھا کر بنگالے بھیجا۔ وہ آتے ہی شاہ صاحب کے قدموں میں بیٹھ گیا اور عرض کیا۔ ”حضرت شاہ صاحب! میں آپ کے غلاموں کا غلام رہا۔ میرے جس کام میں بھی آپ خرابی یا نقص محسوس فرمائیں۔ فوراً تنبیہ فرما دیں، میں اس کے مطابق عمل کروں گا۔“

آپ نے فرمایا۔ ”میں اس سے زیادہ اور کیا کہوں کہ خدا نے تمہیں جو مقام اور مرتبہ دیا ہے اس سے مخلوق کو فائدے پہنچاؤ، لوگوں کے دل نہ دکھاؤ کیونکہ دل آزاری گناہ ہے۔“
خانہ زاد خان پر ان نصیحتوں نے یہ اثر کیا کہ اس کی طبیعت ہی بدل گئی اور وہ اچھا خاصا صوفی مشرب ہو گیا۔
جب بھی تخلیہ ملتا اور خانہ زاد خان فرصت میں ہوتا آپ اسے نفس کشی کی ہدایت فرماتے۔ اسی طرح ایک دن آپ اسے تعلیم و تلقین فرما رہے تھے۔ اسی وقت ڈیوڑھی پر ایک پردیسی فقیر آیا اور دربان سے کہا۔ ”بابا! خانہ زاد خان سے کہہ دے ایک فقیر تجھ سے ملنا چاہتا ہے۔“
دربان نے یہ خبر اندر خان صاحب کو پہنچا دی۔ انہوں نے دربان سے کہا۔ ”فقیر سے پوچھا، کہاں سے اور کیوں آیا ہے؟“
دربان واپس چلا گیا اور خانہ زاد خان کا سوال دہرایا۔ فقیر نے دربان کو اوپر سے نیچے تک دیکھا اور پوچھا۔ ”بھائی دربان! ایک بات تو بتاؤ، پھر میں تمہاری بات کا بھی جواب دے دوں گا۔“
دربان نے کہا۔ ”پوچھو بابا کیا پوچھنا چاہتے ہو؟“
فقیر نے پوچھا۔ ”یہ خانہ زاد خان مہابت خان کا لڑکا ہے نا؟“
دربان نے جواب دیا۔ ”ہاں، ہمارے صوبے دار مہابت خان ہی کے صاحبزادے ہیں۔“
فقیر نے دوسرا سوال کیا۔ ”اور یہ کہ یہ وہی خانہ زاد خان ہیں نا جو شاہ نعمت اللہ فیروز پور والے سے انتہائی محبت اور عقیدت رکھتے ہیں؟“
دربان نے جواب دیا۔ ”ہاں ہاں یہ بالکل وہی ہیں۔ تو انہیں کس طرح جانتا ہے؟“
فقیر زور زور سے ہنسنے لگا، بولا۔ ”مجھے تیری سادہ لوحی پر ہنسی آ رہی ہے۔ سچ بتا۔ کیا تو نے مجھے نہیں پہچانا؟“
دربان نے سہم کر جواب دیا۔ ”بابا بخدا میں نے آپ کو نہیں پہچانا۔ آپ اپنا تعارف کرا دیں۔“
فقیر نے اکڑ کر کہا۔ ”جا، اپنے آقا سے کہہ دے کہ سید نعمت اللہ آئے ہیں۔ سائیں کا فیروز پور میں قیام رہتا ہے۔“
دربان نے فقیر کو سر سے پاؤں تک دیکھا۔ وہ حیران تھا کہ فیروز پور کے اصل سائیں سید نعمت اللہ تو اندر تشریف فرما ہیں پھر یہ دوسرا کہاں سے آ گیا ہے۔
دربان کو مذبذب دیکھ کر فقیر کا پارہ چڑھ گیا۔ کڑک کر پوچھا۔ ”کیا سوچنے لگا بدبخت انسان! جا اپنے آقا سے کہہ دے کہ اگر وہ مجھ گناہگار سے ملنا چاہتے ہیں تو فوراً ہی اجازت فرمائیں لیکن اگر کسی وجہ سے وہ ملاقات سے گریز کریں تو ان سے میری طرف سے کہہ دینا کہ دنیا میں اتنا زیادہ پھنس جانا اچھی بات نہیں۔ کچھ خدا کے لیے بھی کرنا چاہیے۔“
دربان یہ پیغام لے کر اندر پہنچا اور خانہ زاد خان کو درویش کا پیغام پہنچا دیا۔
خانہ زاد خان نے یہ پیغام سنا تو غصے میں کھڑا ہو گیا، کہا۔ ”یہ مکار کون ہے اور کہاں سے آ گیا۔ میں اس کے جوتے نہ لگواؤں تو میرا نام خانہ زاد خان نہیں۔“
آپ نے ٹوکا۔ ”خانہ زاد خان ہوش میں آؤ۔ مشتعل ہونے کی ضرورت نہیں۔“
خانہ زاد خان نے بے بسی سے عرض کیا۔ ”حضرت! وہ آپ کے نام پر دھوکا کر رہا ہے۔ یہ درویش نہیں عیار، دھوکے باز ہے۔ اس کو سزا ضرور ملنا چاہیے۔“
آپ نے جواب دیا۔ ”نہیں، اس کو سزا نہیں ملے گی۔ معلوم نہیں کس ضرورت نے اس کو دھوکے بازی اور مکاری پر مجبور کر دیا ہے اور پھر یہ کہ اس کو تمہارے بارے میں جو حسن ظن ہے اس کو دھکا لگ جائے گا۔ تم اس کے ساتھ سلوک کرو۔ یہ غریب اپنے پیٹ کی خاطر جھوٹ بول رہا ہے اس لیے قابل معافی ہے۔ اس کو اندر بلوا لو اور اس سے سلوک کرو۔“
خانہ زاد خان فوراً نرم پڑ گیا اور دربان کو حکم دیا۔ ”فقیر کو عزت و احترام سے اندر لے آؤ۔“
دربان باہر گیا اور فقیر کو اندر لے آیا۔ آپ اس کو دیکھتے ہی تعظیم سے کھڑے ہو گئے اور اپنے پاس بٹھا لیا۔ وہ نہایت شان سے بیٹھ گیا۔
نعمت اللہ شاہ نے پوچھا۔ ”حضرت! آپ کا اسم شریف؟“
فقیر نے رعونت سے آپ کو گھورا، کہا۔ ”فقیر کو نعمت اللہ شاہ کہتے ہیں۔“

آپ نے پوچھا۔ ”کہاں سے آنا ہوا؟“

اس نے ایک بار پھر قہر کی نظریں ڈالیں اور کہا۔ ”بابا! تم کیسی جاہلانہ باتیں کررہے ہو۔ کیا تم یہ بھی نہیں جانتے کہ نعمت اللہ شاہ کا تعلق کہاں سے ہے؟ اب میں تمہیں کیا بتاؤں۔“

خانہ زاد خان کا غصے سے چہرہ سرخ ہو رہا تھا لیکن شاہ صاحب کی وجہ سے مجبور تھا۔

آپ نے عاجزی سے سوال کیا۔ ”بابا! میں نہیں جانتا اسی لیے تو آپ سے سوال کررہا ہوں۔“

فقیر نے کہا۔ ”اگر تم نہیں جانتے تو لو مجھ سے سنو، میرا نام سید نعمت اللہ شاہ ہے۔ فیروز پور میں ایک خانقاہ بنوائی ہے، وہیں اس فقیر کا قیام رہتا ہے۔“

آپ نے خانہ زاد خان کو اشارہ کیا۔ بنگالے کا صوبے دار اٹھا اور اندر سے دو سو روپے لے آیا۔ آپ نے روپوں کی تھیلی فقیر کی طرف بڑھا دی اور کہا۔ ”بابا یہ نذر ہیں قبول فرمائیں۔“

فقیر نے دو سو روپے قبضے میں کیے اور دعائیں دیتا ہوا رخصت ہو گیا۔

ایک عرصہ بعد آپ نے خانہ زاد خان کی مدح میں ایک قصیدہ لکھا۔ اور انہیں خود ہی پڑھ کر سنایا بھی۔ ایک شعر پر خاص زور دیتے ہوئے فرمایا۔ ”خانہ زاد خان! اس شعر کو غور سے سنو، خاص تمہارے لیے ہے۔“

خانہ زاد خان نے کہا۔ ”ارشاد، ارشاد، میں متوجہ ہوں۔“

آپ نے شعر سنایا۔

من درہوایت اے گل خنداں چو عندلیب
اے تو بنوبہار، تماشائے دیگراں

خانہ زاد خان سناٹے میں آگیا۔ کچھ توقف کے بعد کہا۔ ”حضرت اس شعر کو دوبارہ تو سنائیے۔“

آپ نے دوبارہ پڑھ دیا۔ خانہ زاد خان اپنی جگہ سے اٹھا اور اپنے معتقدوں کو حکم دیا۔ ”اس شعر کو لکھو تو۔“ اور اپنا سامانِ سفر باندھنا شروع کر دیا۔

ایک معتقد نے پوچھا۔ ”جناب آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟“

خانہ زاد خان نے جواب دیا۔ ”میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ مجھے اس شعر سے مطلع کر دیا گیا ہے کہ عنقریب بادشاہ مجھ کو طلب کرے گا اور میری جگہ کسی اور کو بھیج دیا جائے گا۔“

لیکن خانہ زاد خان کی یہ بات کسی اور کی سمجھ میں نہیں آئی۔

ٹھیک ایک ماہ بعد بادشاہ کی طرف سے فرمانِ طلبی آگیا اور خانہ زاد خان کی جگہ ایک دوسرے شخص کو بنگالے کا صوبے دار مقرر کر دیا گیا۔

سید نعمت اللہ شاہ، جنہیں سید نعمت اللہ شاہ ولی کہا جاتا ہے۔ اپنی شہرت اور ناموری میں جواب نہیں رکھتے اور ان کے بارے میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے لیکن سب سے زیادہ حیرت کی بات یہ ہے کہ تلاش بسیار کے باوجود یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ ان کا وصال کہاں ہوا اور ان کا مزار کہاں ہے؟ بس اتنا پتا ضرور چلتا ہے کہ آپ کی وفات 834ھ میں ہوئی۔ کہاں ہوئی یہ نہ معلوم ہو سکا لیکن اس پر سب کا اتفاق ہے کہ ایسی نادر اور یگانہ روزگار شخصیات کبھی کبھی عالمِ وجود میں آتی ہیں۔ ولیِ کامل بھی اور عالم و فاضل بھی۔ ایسے عالم و فاضل کہ اگر باکمال کہا جائے تو بات نہ بنے اور اکمل سے کچھ احاطہ ہو جائے۔

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردوں سے انسان نکلتا ہے

ماخذات: تذکرۃ الاولیأ، شیخ فرید الدین عطار۔ سفینۃ الاولیا، شہزادہ دارا شکوہ۔ طبقات الکبریٰ، علامہ شعرانی۔ انوار الاولیاٗ، رئیس احمد جعفری۔ خزینۃ الاصفیا، مفتی غلام سرور لاہوری

چک تھامس اخبار میں گھڑ دوڑ کے نتائج تلاش کررہا تھا۔ اس کی نظریں ایک خبر کی سرخیوں میں اٹک گئیں۔ اس نے آہستہ آہستہ پوری خبر پڑھی اور پھر سر اٹھا کر چھت کو گھورتے ہوئے اس پر غور و فکر کرنے لگا پھر اس نے دوبارہ خبر پڑھی۔ ایک ایک لفظ پر توجہ دی اور خبر ختم کر کے دوبارہ کسی سوچ میں ڈوب گیا۔

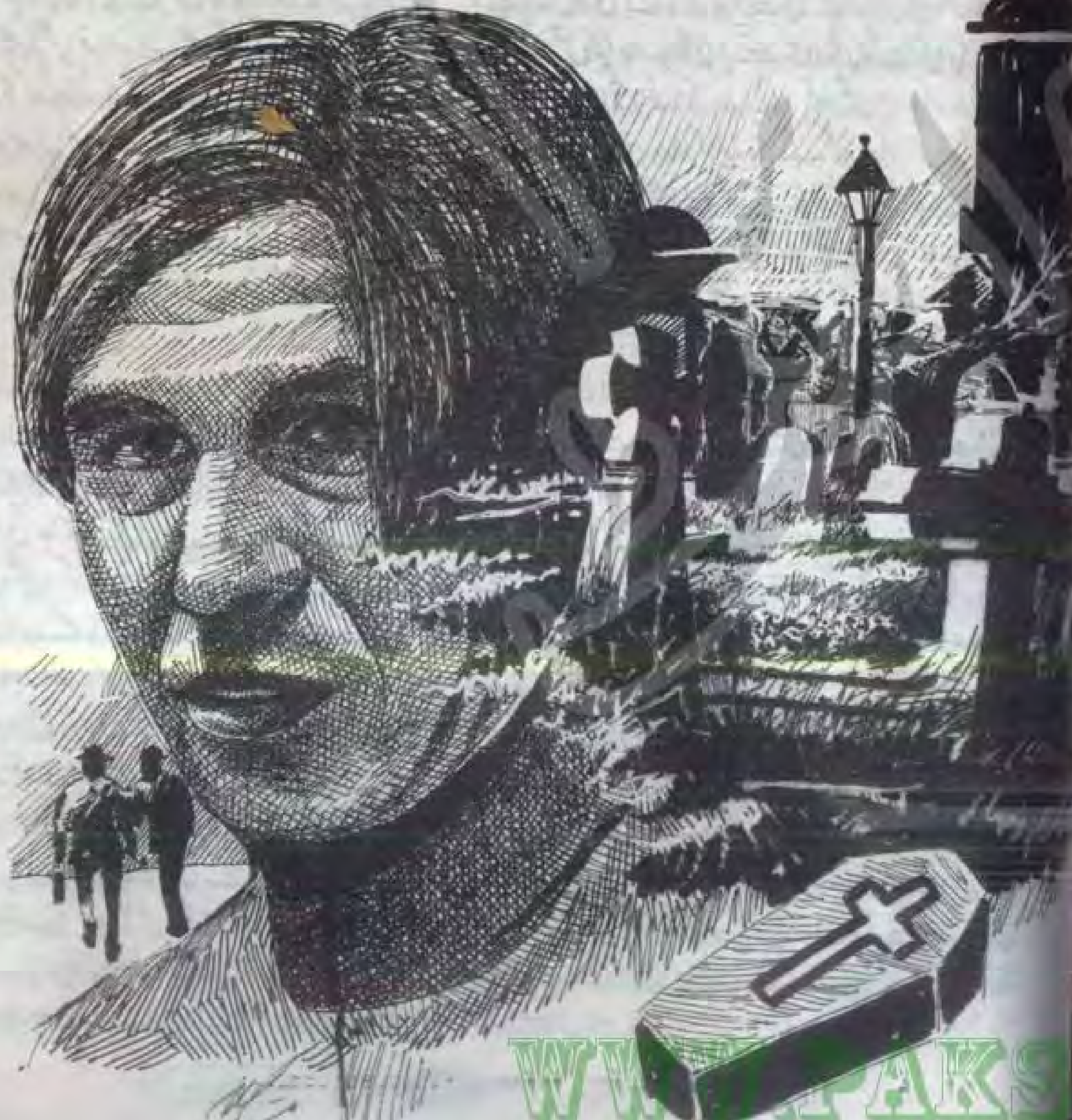
”سنو نیبر اسکی! ایک اہم خبر شائع ہوئی ہے۔“ تھامس نے اپنے ساتھی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

مدفن

ڈاکٹر مقبول حسین

جستجو اور ہوس میں بس ایک قدم کا فاصلہ ہے... جسے اپنے مطمحِ نظر اور رویوں سے ہی قائم رکھا جا سکتا ہے مگر... بدقسمتی سے یہاں معاملہ ایسے لوگوں کا تھا جو جستجو اور ہوس کو یکجا کر دینے کے قائل تھے، اگرچہ ان کے پاس کوئی معقول جواز نہیں تھا پھر کیسے ممکن ہو جاتا کہ ببول کے پودے میں گلاب کھل جائیں۔

حرص کے ہاتھوں اندھیروں میں گم ہو جانے والوں کا ماجرا



نبیر اسکی ایک جاسوسی ناول کا آخری سنسنی خیز باب پڑھنے میں مشغول تھا۔ ''کیا ہے، کیا صدر مملکت کا انتقال ہوگیا؟''

''اس سے زیادہ اہم خبر ہے۔ مس گیرائی کا انتقال ہوگیا ہے اور......''

''افسوس! ابھی اس کی عمر ہی کیا تھی۔ ابھی تو اس کے کھیلنے کودنے کے دن تھے۔'' نبیر اسکی اظہار تعزیت کر کے دوبارہ سنسنی خیز باب کے مطالعے میں مصروف ہوگیا۔

''مس گیرائی کی عمر اسی سال تھی۔'' تھامس نے سرد لہجے میں اطلاع دی اور نبیر اسکی یہ محسوس کرتے ہوئے کہ وہ ناراض ہوگیا ہے ناول ایک طرف پھینک کر اس کی طرف متوجہ ہوگیا۔

''تو مس گیرائی کا انتقال ہوگیا ہے اس کی عمر اسی سال تھی تو پھر کیا قیامت آگئی؟''

''اس نے زندگی بھر شادی نہیں کی۔ اس کا کوئی عزیز واقارب نہیں، کوئی رشتے دار نہیں، وہ اپنے والدین کی اکلوتی تھی۔ اس کا باپ ایک ریلوے کمپنی کا صدر تھا جو اپنے پیچھے خاصا بڑا ترکہ چھوڑ گیا تھا اور اب مس گیرائی کے انتقال کے بعد اس دولت کا کوئی وارث نہیں ہے۔''

''گو کہ میری مرحومہ سے کوئی رشتے داری نہیں تھی لیکن اس کے دردناک حالات نے مجھے اس قدر متاثر کیا ہے کہ میں بلامعاوضہ اس کا وارث بننے کے لیے اپنی خدمات پیش کرتا ہوں۔ کیا اخبار میں ورثے کی مالیت دی گئی ہے؟''

تھامس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''بس کئی لاکھ ڈالرز کی مالیت کے ہیرے جواہرات لکھا ہوا ہے۔''

''ہیرے جواہرات؟''

''ہاں کوئی جائداد نہیں ہے۔ وہ خود بھی کرائے کے فلیٹ میں رہتی تھی۔ کرنسی نوٹ رکھنے کی قائل نہیں تھی۔ پچاس سال قبل اس کے باپ نے ترکے میں ایک لاکھ ڈالرز اور ایک مکان چھوڑا تھا۔ مس گیرائی نے مکان فروخت کردیا اور ساری دولت کے ہیرے جواہرات خرید لیے جن کی اب پچاس سال بعد قیمت کم از کم دس لاکھ ڈالرز ہونی چاہیے اور وہ تمام ہیرے جواہرات ایک صندوق میں بند کر کے اس کے تابوت کے پاس رکھ دیے جائیں گے۔''

''کیا مطلب؟'' نبیر اسکی نے چونک کر سوال کیا۔

''مطلب یہ ہے کہ چونکہ اس کی دولت کا کوئی وارث نہیں ہے اس لیے وہ مرنے کے بعد اپنی دولت اپنے ساتھ لے جائے گی۔ وصیت کے مطابق اس کی لاش دفن نہیں کی جائے گی اس کی لاش حنوط کرنے کے بعد تابوت میں رکھ دی جائے گی اور ہاں حنوط کرنے کے بعد پہلے اسے شب عروسی کا لباس پہنایا جائے گا......''

''لیکن تم تو کہہ رہے تھے کہ اس نے کبھی شادی نہیں کی۔''

''درست ہے لیکن مرنے کے بعد وہ دلہن بننا چاہتی ہے اور یہ خبر اخباری نمائندوں کو دلچسپ محسوس ہوئی تھی۔ جب انہوں نے اس معاملے کو کریدا تو پتا چلا کہ بڑھیا کچھ سنکی تھی وہ تنہا رہتی تھی، ایک ملازمہ دن میں کام کرنے آتی تھی۔ اس نے اپنی وصیت مرنے سے تین روز قبل لکھوائی تھی۔ تمہیں پتا ہے ان اخبار والوں سے شیطان بھی پناہ مانگتا ہے تو اس وکیل کے دفتر میں ملازم کسی کلرک نے اخباری نمائندوں کے کان میں یہ بات بھی پھونک دی کہ بڑی بی کی دولت ہیرے جواہرات پر مشتمل ہے۔ جو تابوت کے ساتھ اس کے آبائی مقبرے میں رکھ دی جائے گی اور بڑی بی نے اپنے وکیل کو سختی کے ساتھ ہدایت کی ہے کہ اس کی وصیت پر لفظ بہ لفظ عمل کیا جائے یعنی اسے زمین میں دفن نہ کیا جائے۔ نمبر دو اس کی لاش حنوط کی جائے۔ نمبر تین حنوط کرنے کے بعد اس کا آخری دیدار کرلیا جائے۔ نمبر چار اس کے بعد اسے شب عروسی کا لباس پہنایا جائے اور اس کی لاش تابوت میں رکھ کر تابوت بند کردیا جائے۔ نمبر پانچ دلہن بننے کے بعد کوئی اس کا چہرہ نہ دیکھے۔ نمبر چھ اس کا تابوت آبائی مقبرے میں اس کے باپ کے تابوت کے قریب رکھا جائے اور نمبر سات اس کی تمام دولت جو ہیرے جواہرات پر مشتمل ہے اسے ایک صندوقچی میں بند کر کے تابوت کے قدموں میں رکھ دیا جائے۔''

''یعنی کیڑے مکوڑوں کی غذا بننے کے لیے۔ مجھے تو یہ سب نری بکواس نظر آتی ہے تھامس۔ تم کس چکر میں پڑ گئے۔'' نبیر اسکی نے ناول کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

''خبردار! دھندے کے وقت میں یہ سب خرافات پسند نہیں کرتا۔'' تھامس نے تنبیہ کرتے ہوئے وضاحت کی۔ ''اور یہ بکواس نہیں ہے جب اخباری نمائندوں نے وکیل صاحب سے رابطہ کیا تو انہوں نے وصیت کی کسی شق کی تردید یا تصدیق کرنے سے انکار کردیا اور تمہیں معلوم ہے اس کا کیا مطلب ہوتا ہے؟'' نبیر اسکی نے انکار میں سر ہلا دیا۔

''اسی لیے کہتا ہوں کہ اخبار پڑھا کرو۔ ناولوں میں گھسے رہتے ہو۔ جب کوئی شخص کسی خبر کی تردید کرنے سے انکار کردے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ بالواسطہ طریقے پر اس کی تصدیق کررہا ہے۔ اگر یہ اطلاعات غلط ہوتیں تو وکیل صاحب کو تردید کرنے میں کیا تکلیف تھی۔ وہ سب زبان ہلا دیتے اور معاملہ ختم ہوجاتا۔''

''تو تم مس گیرائی کے زبردستی وارث بننا چاہتے ہو؟ ٹھیک ہے مجھے کوئی اعتراض نہیں لیکن ابھی بھی کیا جلدی، بڑی بی کی لاش ٹھنڈی ہوجائے۔ لوگ اس خبر کو بھول جائیں پھر چلیں گے کدال پھاوڑا لے کر۔'' تھامس نے دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ لیا۔

''کوئی تعجب نہیں کہ تاریخ کا عظیم ترین جرائم پیشہ آج یوں اس گھٹیا سے کمرے میں بیٹھا ہوا مونگ پھلی کھا رہا ہے کیونکہ بدقسمتی سے اس کا ساتھی تھرڈ کلاس ذہنیت کا مالک ہے۔ فرماتے ہیں ابھی بھی کیا جلدی ہے۔'' تھامس نے جلے بھنے انداز میں نبیر اسکی کی نقل اتارتے ہوئے کہا۔

''کیا تمہاری عقل گھاس چرنے گئی ہوئی ہے نبیر اسکی؟ ابھی بھی کیا جلدی ہے ایک ہفتے بعد چلیں گے جیسے ہمارے علاوہ پوری دنیا میں کسی کے ذہن میں یہ خیال آ ہی نہیں سکتا۔ تمہیں پتا ہے یہ خبر پڑھتے ہی اس مقبرے پر ہیرے جواہرات حاصل کرنے کے خواہش مندوں کی قطار لگ جائے گی۔ کیا پتا نظم ونسق برقرار رکھنے کے لیے گورکن کو پولیس کی مدد طلب کرنی پڑے کیونکہ قطار میں لگا ہوا ہر شخص پہلا موقع حاصل کرنے کی کوشش کرے گا۔''

نبیر اسکی اچھل کر اپنی نشست سے کھڑا ہوگیا۔ اس نے الماری کھول کر ٹائی لگائی اور گرہ باندھنے لگا۔ ''بتاؤ کہاں چلنا ہے؟ کیا ارادے ہیں؟''

☆☆☆

تھامس اور نبیر اسکی قبرستان میں داخل ہوئے۔ دروازے کے قریب ہی چوکیدار کی کوٹھری بنی ہوئی تھی۔ تھامس نے دروازے پر دستک دی نبیر اسکی حیرت بھری نظروں سے قبرستان کا جائزہ لینے لگا۔ اس کا خیال تھا کہ عام قبرستانوں کی طرح وہاں اسے ٹوٹی ہوئی اور شکستہ قبریں نظر آئیں گی لیکن وہاں کا منظر ہی کچھ اور تھا۔ وہ دولت مندوں کا قبرستان نظر آتا تھا۔ وہاں کوئی قبر نہیں تھی۔ صرف مقبرے تھے۔ کچھ پرانے کچھ نئے جو ہرے بھرے درختوں اور پھولوں کی جھاڑیوں کے پیچھے چھپے ہوئے تھے۔ پختہ راستے تھے جن پر بنچیں پڑی ہوئی تھیں۔ مجموعی طور پر وہ کسی باغ کا منظر پیش کرتا تھا۔ چوکیدار دروازہ کھول کر باہر نکلا اور انہیں سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

''بات یہ ہے دوست کہ ہمارا تعلق شام کے اخبار ایوننگ اسٹار سے ہے۔'' تھامس نے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔

''ہمیں بڑی بی پر کہانی لکھنے کا حکم ملا ہے جنہیں کل صبح یہاں لایا جائے گا اور کچھ ہیرے وغیرہ بھی مقبرے میں رکھے جائیں گے۔ ہمیں بتایا گیا ہے کہ ہم چٹ پٹا مسالا لکھ کر نہیں لائے تو ہماری چھٹی کردی جائے گی۔''

چوکیدار نے تاسف بھرے انداز میں سر ہلایا۔ ''بڑا ہی ذلیل پیشہ ہے، بالکل میری طرح۔ تم ایسا کرو اس راستے پر سیدھے چلے جاؤ اور الٹے ہاتھ پر سب سے آخری گلی میں مڑ جانا۔ تقریباً پچاس گز چلنے کے بعد تمہیں گیرائی خاندان کا مقبرہ نظر آجائے گا، اس کی نشانی یہ......''

تھامس نے دوستانہ انداز میں چوکیدار کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ ''دوست ہم مقبرہ اندر سے دیکھنا چاہتے ہیں کل تو ہمیں کوئی بھی اندر نہیں جانے دے گا۔ ہم وعدہ کرتے ہیں کہ ہم کسی سے اس کا ذکر نہیں کریں گے۔ نہ اندر کی کوئی تصویر لیں گے۔ تم ہماری تلاشی لے سکتے ہو۔ ہمارے پاس کیمرا وغیرہ نہیں ہے۔'' تھامس نے تلاشی دینے والے انداز میں دونوں ہاتھ بلند کیے اور پھر نیچے گرا دیے۔ نبیر اسکی نے اس کی تقلید کی۔

''لیکن جناب یہ میرے لیے ناممکن ہے۔'' چوکیدار نے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔ ''اگر قبرستان کے ٹرسٹ والوں کو پتا چل گیا تو وہ کھڑے کھڑے مجھے نوکری سے نکال دیں گے۔'' اس نے کن انکھیوں سے دس ڈالرز کے نوٹ کی طرف دیکھا جو اسی وقت تھامس کی جیب سے برآمد ہو کر چٹکی میں لہرا رہا تھا۔

''کوئی امید نہیں کی جاسکتی؟'' تھامس نے سازشی لہجے میں دریافت کیا۔

''امید کا دامن تو انسان کو کبھی نہیں چھوڑنا چاہیے۔'' بوڑھے چوکیدار نے دس ڈالرز کے نوٹ کو حریصانہ نظروں سے دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ ''یہ دراصل قبرستان نہیں ہے۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ یہاں کوئی قبر نہیں بنی ہوئی۔ صرف مقبرے ہیں۔ یہ ایک ٹرسٹ کی ملکیت ہے اور دولت مند افراد اس ٹرسٹ سے یہاں زمین خرید کر خاندانی مقبرے تعمیر کرتے ہیں۔ خود مجھے کسی مقبرے میں داخل ہونے کی اجازت نہیں ہے۔'' تھامس نے دس ڈالرز کا ایک

اور نوٹ نکال کر پہلے نوٹ کے ساتھ شامل کر دیا۔
''اگر ہم دو منٹ کے لیے اندر داخل ہو کر اسے دیکھ لیں تو کسی کو اس کا علم نہیں ہو سکے گا۔ تم دوبارہ اسی طرح مقبرے کا دروازہ مقفل کر دینا۔'' چوکیدار کو ہچکچاتا ہوا دیکھ کر تھامس نے دس ڈالرز کا ایک اور نوٹ ان میں شامل کر دیا۔

''مجھے شام چھ بجے تک یہاں سے ہلنے کی اجازت نہیں ہے لیکن خیر......'' وہ پلٹ کر واپس اپنی کوٹھری میں چلا گیا۔ جب واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں چابیوں کا ایک بہت بڑا گچھا لٹک رہا تھا۔ اس نے احتیاط سے چاروں طرف دیکھا۔

''چلو جلدی کرو۔ ہمیں فوراً واپس آنا ہے۔'' بوڑھے چوکیدار نے کہا اور ان کے آگے چلنے لگا۔

تھامس نے نیبر اسکی کو مخاطب کرتے ہوئے تحکمانہ لہجے میں کہا۔ ''قبرستان کے ماحول کا غور سے جائزہ لو۔ نوٹس بناؤ اس کا ہماری کہانی میں ضرور ذکر آنا چاہیے۔''

نیبر اسکی نے کان میں لگی ہوئی پنسل نکالی اور جیب سے استعمال شدہ لفافہ برآمد کیا اور چلتے چلتے لفافے کی پشت پر آڑھی ترچھی لکیریں بنانے لگا جیسے شارٹ ہینڈ میں نوٹس لکھ رہا ہو۔

''میرا ساتھی اہم باتیں نوٹ کرتا ہے اور پھر میں ان کی مدد سے کہانی لکھتا ہوں۔'' تھامس نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

''یہ اخبار والے معلوم ہوتا ہے اپنے آدمیوں کو بہت اچھی تنخواہ دیتے ہیں؟'' چوکیدار نے کہا۔

''ایسی تو کوئی بات نہیں ہاں اوپر جو خرچ ہوتا ہے وہ دفتر والے ہی ادا کر دیتے ہیں۔ جیسے ابھی میں نے جو رقم خرچ کی ہے۔'' تھامس نے جواب دیا۔

کچھ دیر بعد وہ ایک پرانے مقبرے کے سامنے رک گئے۔ ''یہ ہے گیرائی خاندان کا مقبرہ۔'' چوکیدار نے کہا اور چابیوں کا گچھا ٹٹولنے لگا۔ تھامس نے غور سے مقبرے کو دیکھا اور اس کا نقشہ ذہن نشین کر لیا پھر اس نے قبرستان کی چہار دیواری سے مقبرے کا فاصلہ ناپا جو کچھ زیادہ نہیں تھا۔ چہار دیواری کافی بلند تھی اور اس کے اوپر خاردار تاروں کی باڑھ لگی ہوئی تھی۔ وہ دیوار کے دوسری طرف کوئی ایسی نشانی تلاش کرنے لگا جس کی مدد سے جب وہ دیوار عبور کر کے قبرستان میں داخل ہو تو مقبرے کے بالکل قریب ہی اترے۔ اسے دور پُل پر گاڑیاں گزرتی ہوئی نظر آئیں جس پر اشتہاروں کے بڑے بڑے بورڈ لگے ہوئے تھے اور ایک مشہور برانڈ کے سگریٹ کا بورڈ ٹھیک اس مقبرے کے سامنے تھا۔ اس سے فارغ ہو کر اس نے اپنی توجہ بوڑھے چوکیدار پر مبذول کر دی جو قفل میں چابی داخل کر رہا تھا۔ مقبرہ کافی پرانا بنا ہوا تھا اور اس پر مس گیرائی نے اپنی زندگی میں کوئی توجہ نہیں دی تھی۔ دروازے کے باہر خودرو گھاس اگی ہوئی تھی۔ چوکیدار جس چابی سے تالا کھول رہا تھا وہ گچھے میں ایک طرف سے پانچویں اور دوسری طرف سے گیارہویں چابی تھی۔ اس نے آہستہ سے پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈال کر موم کی ٹکیہ نکالی۔ یہ اس کے پیشے کا اہم اوزار تھا اور اس قسم کی کئی ٹکیاں وہ ہر وقت تیار رکھتا کہ جانے کب اس کی ضرورت پڑ جائے۔ موم کی ٹکیہ چند انچ لمبی اور ایک انچ چوڑی تھی۔ اس نے وہ ٹکیہ ہتھیلی میں چھپالی اور دوسری جیب سے ویسی ہی دوسری ٹکیہ نکال کر دوسرے ہاتھ کی ہتھیلی میں رکھ لی۔ اس عمل کے دوران اس کی نظریں ایک لمحے کے لیے بھی چابی سے نہیں ہٹیں۔ قفل کھل گیا تو چابی گچھے میں لوٹ آئی لیکن اس عمل کے دوران اس کے اوپر کی پانچ چابیاں پھسلتی ہوئی دوسری طرف چلی گئیں۔ اسی طرح وہ چابی گول حلقے میں اپنی طرف سے سب سے اوپر آ گئی۔ بوڑھا چوکیدار دونوں ہاتھوں سے زور لگا کر دروازہ کھولنے لگا۔

نیبر اسکی سر موڑے متوقع نظروں سے تھامس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ نظریں ملتے ہی تھامس نے پہلے سے طے شدہ اشارہ دیا جسے سمجھتے ہوئے نیبر اسکی چوکیدار کی طرف بڑھا۔

''ٹھہریے، میں آپ کی مدد کرتا ہوں۔ دروازے کے قبضے زنگ آلود ہونے کی وجہ سے جام ہو گئے ہیں۔'' اس نے آگے بڑھ کر مضبوطی سے دروازے کو پکڑا اور زور سے جھٹکا دیا۔ دروازہ کھل گیا جس کی وجہ سے نیبر اسکی کا جسمانی توازن برقرار نہیں رہ سکا۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا اپنے عقب میں کھڑے ہوئے چوکیدار سے ٹکرایا اور اس قوت سے ٹکرایا کہ بوڑھا چوکیدار زمین پر گر گیا۔ یہ بہت پرانی اور آزمودہ ترکیب تھی جس میں کبھی ناکامی نہیں ہوتی۔ چابیوں کا گچھا چوکیدار کے ہاتھ سے چھوٹ کر ایک طرف گر گیا۔

تھامس کی نظریں اس چابی کے ساتھ چپکی ہوئی تھیں۔ اس نے لپک کر چابی سیدھی کی اور اسے مومی ٹکیہ پر رکھ کر دبایا اور فوراً ہی اوپر دوسری ٹکیہ رکھ کر دونوں کی سطح کو دبا کر یکجا کر دیا۔ نیبر اسکی اس اثنا میں معافی مانگتے ہوئے بوڑھے چوکیدار کو زمین سے اٹھنے میں مدد دے رہا تھا۔ ایسا کرتے ہوئے اس نے تھامس کو بوڑھے کی نظروں سے اوجھل کر دیا۔

تھامس نے مومی ٹکیوں کے دونوں ٹکڑے علیحدہ کیے اور انہیں احتیاط سے رومال میں لپیٹ کر جیب میں رکھ لیا۔ چابی حلقے میں اپنی جگہ پر لوٹ آئی۔

وہ مقبرے کے اندر زیادہ دیر نہیں رکے اور اس کی کوئی خاص ضرورت بھی نہیں تھی۔ ان کا بنیادی مقصد پورا ہو گیا تھا۔ مقبرے کا فرش قبرستان کی زمین سے تین فٹ نیچے تھا اور چھت دس فٹ بلند۔ اس کی چوٹی پر بڑا سا گول روشندان تھا جسے سبز رنگ کے اندھے شیشے سے بند کر دیا گیا تھا تاکہ اندر صرف روشنی داخل ہو سکے۔ اس وقت بھی مقبرے کے اندر ٹھنڈی سبز روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ فرش پر گرد کی تہ جمی ہوئی تھی۔ دروازے کی مخالف سمت میں واقع دیوار کے ساتھ ماربل کے پانچ چبوترے بنے ہوئے تھے جن کے درمیان ایک ایک فٹ کا فاصلہ تھا۔ دو چبوتروں پر دو تابوت کھڑے ہوئے تھے اور باقی جگہ خالی تھی تھامس کو یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ وہاں تابوت کھڑے کرنے کا انتظام کیا گیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مس گیرائی کی طرح اس کا باپ بھی سنکی تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ تابوت مس گیرائی کے باپ اور ماں کے تھے اور گیرائی کے باپ نے یہ سوچ کر زیادہ چبوترے تعمیر کرائے تھے کہ اس کی بیٹی، داماد اور ان کے بچے بھی اس مقبرے میں آرام کریں گے۔ ایک بار دروازہ بند ہونے کے بعد بہ ظاہر اس میں ہوا کا گزر ممکن نظر نہیں آتا تھا۔ تھامس سوچنے لگا کہ اگر کوئی شخص غلطی سے یہاں بند ہو جائے تو وہ مقبرے میں موجود ہوا پر کتنے عرصے تک زندہ رہ سکے گا۔ ایک ہفتہ یا کم از کم چوبیس گھنٹے تو ضرور زندہ رہے گا۔

نیبر اسکی بڑی سنجیدگی سے لفافے کی پشت پر پنسل سے لکیریں بنا رہا تھا۔ جیسے بڑی محنت کے ساتھ نوٹس لکھ رہا ہو۔ وہ مقبرے سے باہر نکل آئے۔ بوڑھے چوکیدار نے دروازہ مقفل کر دیا۔ تھامس نے نیبر اسکی کو دروازے کے دوسری طرف چابی کا سوراخ دکھایا جس کا مطلب یہ تھا کہ اگر چابی اندر کی طرف سے لگائی جائے تو دروازہ کھل جائے گا۔ نیبر اسکی نے اس کا مطلب سمجھتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔

قبرستان کے دروازے پر پہنچ کر بوڑھے چوکیدار نے ان سے ہاتھ ملایا۔ ''مجھے امید ہے کہ تم لوگ جس مقصد سے یہاں آئے تھے وہ پورا ہو گیا ہوگا؟'' چوکیدار نے کہا۔

تھامس نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے محبت سے تھپتھپایا۔ ''تمہاری مہربانی ہے بڑے میاں جس کے لیے ہم بے حد شکر گزار ہیں۔''

قبرستان سے باہر نکلتے ہی تھامس نے رفتار تیز کر دی۔ ''جلدی کرو نیبر اسکی اس سے پہلے کہ بڑے میاں جیب ٹٹولیں جہاں ان کے خیال میں دس ڈالرز والے تین نوٹ رکھے ہوئے ہیں ہمیں درمیانی فاصلہ زیادہ سے زیادہ طویل کرنا ہے۔'' اس نے دس ڈالرز والے تین نوٹ واپس اپنی جیب میں ڈالتے ہوئے کہا۔ نیبر اسکی ہاتھ کی اس صفائی پر حیران رہ گیا۔ اس نے تعریفی نظروں سے تھامس کی طرف دیکھا۔

''اس عمر میں بڑے میاں تیس ڈالر کا کیا کریں گے؟ ان کے لیے یہ رقم بے کار تھی۔'' تھامس نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔

جب وہ شہر واپس پہنچے تو سورج غروب ہو رہا تھا۔ نیبر اسکی

....کا منہ لٹکا ہوا تھا۔ اس کے چہرے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ برے برے خوفناک خیالوں میں ڈوبا ہوا ہے۔ تھامس سمجھ گیا کہ اسے منصوبے میں اپنا حصہ پسند نہیں آ رہا اور وہ کسی طرح جان چھڑانے کے چکر میں ہے۔ مقبرے کی اندرونی فضا نے اسے خوف زدہ کر دیا ہے، اور اس لیے ضروری تھا کہ اس کا ذہن کسی دوسرے کام میں الجھا دیا جائے۔

''تمہارے پاس پیسے ہیں؟'' تھامس نے فٹ پاتھ سے سڑک پر اترتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں لیکن تھامس......''

''یہ لو۔'' تھامس نے دس ڈالرز کے دو نوٹ اس کی طرف بڑھائے۔ ''تمہیں بازار سے چند چیزیں خریدنی ہیں۔ لوہے کی ایک سلاخ جس کا ایک سرا نوکیلا ہو اور لمبائی فٹ ڈیڑھ فٹ سے زیادہ نہ ہو اور ایک ناشتادان' بالکل ویسا جو مزدور اپنے ساتھ کام پر لے جاتے ہیں۔''

''کیوں، کس لیے؟''

''ٹھہرو، میں تفصیل بتاتا ہوں۔'' تھامس نے جواب دیا۔ ''بڑی بی کی لاش حنوط کی جائے گی اور آج رات آخری دیدار کے لیے رکھی جائے گی جس کے بعد اسے دلہن والا لباس پہنا کر تابوت میں بند کر دیا جائے گا اور کل صبح تابوت قبرستان لے جایا جائے گا۔ ہمیں اخبار سے تدفین کے اس ادارے کا پتا چل چکا ہے۔ جہاں آخری دیدار کرایا جائے گا رات ہم وہاں جائیں گے اور تابوت کھول کر بڑی بی کی لاش نکال لیں گے۔ اس کی جگہ تم لیٹ جاؤ گے۔ سرہانے کی طرف تابوت میں چند چھوٹے چھوٹے سوراخ کر دیے جائیں گے اس کے لیے میرے پاس ہاتھ سے چلنے والا برما موجود ہے تاکہ تمہیں اندر ہوا ملتی رہے پھر تمہیں ایک دوا سنگھا کر بے ہوش کر دوں گا جس کا اثر آٹھ سے بارہ گھنٹے رہتا ہے۔ اس طرح تم تابوت میں بند ہو کر کوئی حرکت نہیں کر سکو گے اور بے ہوش پڑے رہو گے۔ میں تمہاری ٹانگ کے ساتھ آہنی سلاخ باندھ دوں گا۔ اس کے بعد اسکرو لگا کر تابوت دوبارہ بند کر دوں گا۔ جب تمہیں ہوش آئے گا تو تمہارا تابوت مقبرے کے اندر چبوترے پر کھڑا ہوگا۔ تمہاری جیبوں میں کھانے پینے کا سامان ہوگا۔ تم پہلے ناشتا کرنا اور پھر آہنی سلاخ سے تابوت توڑ کر باہر نکل آنا۔ اسی سلاخ سے تم ہیرے جواہرات کا وہ صندوق توڑ کر سارا سامان نکال لینا جو تابوت کے قریب زمین پر رکھا گیا ہوگا۔ اس کے بعد تم میرا انتظار کرو گے۔ رات گئے میں مقبرے میں آؤں گا۔ میرے ساتھ ناشتے دان ہوگا جس میں ابلی ہوئی سبزیاں رکھی ہوں گی۔ ہم تمام ہیرے جواہرات اس کے اندر چھپا دیں گے اور مقبرے سے باہر نکل آئیں گے۔ ہمارا حلیہ مزدوروں جیسا ہوگا اور میرے ہاتھ میں ناشتے دان بھی ہوگا۔ اس لیے رات گئے سڑکوں پر آوارہ گردی کے الزام میں نہیں پکڑے جائیں گے۔'' تھامس خاموش ہو گیا۔

''تم نے بڑی بی کی لاش کے بارے میں کیا سوچا؟''

''اسے کسی خالی تابوت میں بند کر دیں گے۔''

''اگر کسی نے تابوت کھول کر دیکھ لیا تو انہیں فوراً ہماری کارستانی کا علم ہو جائے گا۔'' نیبر اسکی نے اندیشہ ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

''ہو جائے ہمیں چوبیس گھنٹوں کی مہلت درکار ہے۔ وہ تجہیز و تکفین کا بڑا ادارہ ہے۔ وہاں بہت سے خالی تابوت تیار پڑے ہوں گے۔ ہم کسی میں بھی بڑی بی کی لاش کو چھپا دیں گے۔ اگر وہاں بڑی بی کی لاش کے علاوہ کوئی دوسرا مردہ نظر آ جائے تو اچھا ہے۔ ہم بڑی بی کو دوسرے مردے کے ساتھ بند کر دیں گے۔ اس طرح صبح ہونے پر وہ اس لاش کے ساتھ دفن کر دی جائے گی۔ ہاں یہ بتانا بھول ہی گیا کہ مقبرے کی دو چابیاں بنواؤں گا۔ ایک چابی تمہارے پاس رہے گی تاکہ ہنگامی صورت حال میں تم چابی سے دروازہ کھول کر فرار ہو سکو۔''

نیبر اسکی کے چہرے پر مسلط تردد آمیز شکنیں یہ مژدہ سن کر صاف ہو گئیں اور وہ آٹھ گھنٹے بعد پہلی مرتبہ مسکرایا۔ ''تو ٹھیک ہے۔'' اس نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''اب مجھے کوئی فکر نہیں۔''

''لیکن میرے آنے تک تم مقبرے سے باہر مت نکلنا ورنہ کسی مصیبت میں پھنس جاؤ گے اور قبرستان سے فرار ہونے کے لیے ویسے بھی تمہیں میری مدد درکار ہوگی۔ اب تم سامان خرید کر گھر پہنچو میں چابیاں بنوا کر لاتا ہوں۔'' وہ ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔ تھامس کی چال سے ولولے کا اظہار ہوتا تھا اور نیبر اسکی اس طرح ڈھیلے ڈھالے انداز میں چل رہا تھا جیسے وہ دانت نکلوانے کے لیے کسی دندان ساز کے پاس جا رہا ہو یا اسے فوج میں جبری بھرتی کا حکم ملا ہو۔

☆☆☆

تھامس ضروری سامان سے لیس ہو کر رات بارہ بجے گھر سے نکلا۔ اس نے شہر سے باہر جانے والی بس پکڑی۔ آدھ گھنٹے بعد وہ اسٹاپ پر کھڑا تھا۔ قبرستان وہاں سے دو میل کے فاصلے پر تھا اور اسے یہ تمام راستہ پیدل طے کرنا تھا۔ وہ اتنی رات گئے ٹیکسی کے ذریعے قبرستان آنے کی حماقت نہیں کر سکتا تھا۔ اسے کوئی عجلت نہیں تھی۔ ان کے پاس پوری رات پڑی تھی۔ اب تک منصوبے پر بڑی خوب صورتی سے عمل ہوتا آیا تھا۔ خوش بختی ان کا ساتھ دے رہی تھی اور ایک گھنٹے بعد وہ دس لاکھ ڈالرز کے مالک بننے والے تھے۔ اس نے فیصلہ کر لیا تھا وہ اپنے حصے کی رقم لے کر نیبر اسکی سے علیحدہ ہو جائے گا۔ اسے یقین تھا کہ نیبر اسکی کسی روز اپنی بے وقوفی سے خود پھنسے گا اور اسے بھی پھنسوا دے گا۔ بے وقوف دوست سے دانا دشمن بہتر ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ اب وہ چوری کا دھندا چھوڑنا چاہتا تھا۔ لاکھوں ڈالرز کی رقم سے بہت اچھا کاروبار کیا جا سکتا تھا۔

گزشتہ شب تین بجے اس نے اپنے منصوبے پر عمل کرتے ہوئے نیبر اسکی کو بڑی بی کے تابوت میں بند کر دیا تھا۔ خوش قسمتی سے وہاں ایک تابوت اور رکھا تھا جس میں کسی موٹے آدمی کی لاش تدفین کی منتظر تھی۔ اس نے بڑی بی کی لاش موٹے آدمی کے تابوت میں گھسیڑ دی تھی۔ اب اسے اطمینان تھا کہ ان کا راز جلد ہی منکشف نہیں ہوگا۔ اسے یہ بھی اطمینان تھا کہ نیبر اسکی مقبرے کے اندر نہ صرف موجود ہوگا بلکہ بے چینی سے اس کا انتظار بھی کر رہا ہوگا۔ اس نے نیبر اسکی کو جو چابی دی تھی اس سے وہ مقبرے کا تالا نہیں کھول سکتا تھا۔ چابی بنانے والے نے اس کی ہدایت پر دوسری چابی کو اصل سے مختلف کر دیا تھا۔ وہ اتنا بے وقوف نہیں تھا کہ نیبر اسکی کو صحیح چابی دے کر اسے دس لاکھ ڈالرز کی مالیت کے ہیرے جواہرات لے کر مقبرے سے فرار ہونے کا موقع فراہم کرتا۔ اتنی بڑی رقم کے لیے وہ اپنے سگے بھائی پر بھی اعتبار نہیں کر سکتا تھا۔ نیبر اسکی کو بے ہوش کرنے کے بعد اسے اپنے منصوبے کی کامیابی کا پورا یقین ہو گیا تھا۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں تابوت میں بند ہونے کے بعد نیبر اسکی دہشت زدہ ہو کر تابوت توڑ دے اور وہاں سے فرار ہو جائے۔ دس لاکھ ڈالرز حاصل کرنے کا وہ پہلا اور آخری موقع تھا۔ اس کے بعد دوسرے امیدواروں کی قطار لگ جاتی تھی۔ صورت حال کے پیش نظر ضروری تھا کہ فوری طور پر عمل کیا جائے اور اس سے پہلے کہ دوسرے ہاتھ مارنے کی کوشش کریں وہ پہلے ہی مال اڑا لیں۔ ایک رات کی تاخیر فیصلہ کن ثابت ہو سکتی تھی قسمتوں کو بدل سکتی تھی۔

ہر طرف سکوت طاری تھا۔ رات کی سیاہی پھیلی ہوئی تھی۔ دور پل پر لگے ہوئے اشتہاری نیون سائن روشن تھے اور کبھی کبھار کوئی گاڑی گزرتی تو روشنی کی دو لکیریں تاریکی سے نبرد آزما نظر آ جایا کرتیں۔ تھامس پل پر نظریں جمائے چلتا رہا۔ جب وہ ملبوبہ سگریٹ کے اشتہار کے سامنے پہنچ گیا تو وہ قبرستان کی دیوار کے پاس کھڑا ہو گیا۔ اس نے کوٹ کی جیب سے ایک چھوٹی سی ڈوری نکالی اور پہلے ناشتے دان پتلون کی بیلٹ سے باندھا پھر اس نے دوسری جیب سے موٹی سی ڈوری نکالی اور پھندا بنایا۔ آٹھ فٹ بلند دیوار پر آہنی خاردار تاروں کی باڑھ لگی ہوئی تھی جو دس دس فٹ کے فاصلے پر لوہے کی چپٹی سلاخ کے گرد لپٹی ہوئی تھی اور وہ چپٹی سلاخ دیوار کے اندر نصب تھی۔ تھامس نے ڈوری کا پھندا چپٹی سلاخ کے اوپری حصے میں ڈال دیا۔ وہ اس کام میں خاصا تجربہ کار تھا۔ پہلی ہی کوشش پر پھندا سلاخ کے گرد لپٹ گیا۔ تھامس ڈوری کی مدد سے دیوار پر چڑھ گیا۔ وہ احتیاط سے خاردار تاروں کے دوسری طرف اترا پھر اس نے ڈوری قبرستان کے اندر پھینکی اور اس کا سہارا لے کر زمین پر اتر گیا۔ اس نے ڈوری وہیں لٹکی رہنے دی اور ایک منٹ تک سانس روکے ہوئے قرب و جوار کا جائزہ لیتا رہا۔ قبرستان پر بلا کا سکوت طاری تھا۔ وہ گیرائی خاندان کے مقبرے کے قریب ہی اترا تھا۔ مقبرے کے دروازے پر پہنچ کر اس نے دروازے سے کان لگائے لیکن کوئی آواز سنائی نہ دی۔ جس کی وجہ یہ تھی کہ دروازہ موٹی لکڑی کا بنا ہوا تھا اور دیواریں بھی پرانے طرز پر بڑے بڑے پتھروں سے بنائی گئی تھیں۔ اس نے پنسل ٹارچ روشن کر کے دروازے میں بنا ہوا تالے کا سوراخ تلاش کیا اور چابی قفل

لطیفہ

ایک انگریز اور سکھ ٹیکسی میں سفر کر رہے تھے۔ انگریز بولا۔ ''سردار جی! ہندوستان میں آپ لوگوں کا ہے ہی کیا؟ تم اپنے جھنڈے کو ہی دیکھ لو۔ سبز رنگ کسی اور قوم کا ہے سرخ کسی اور قوم کا جبکہ سفید رنگ بھی دوسری قوموں کے ہیں، بتاؤ تمہارا کیا ہے؟''

سردار جی کو یہ سن کر غصہ آ گیا، بولے ''یہ جھنڈے میں جو ڈنڈا ہے یہ تمہارے باپ کا ہے۔''

مرسلہ: بابر عباس، گلیانہ روڈ، کھاریاں

میں ڈال کر تالا کھولنے لگا۔ چابی نے گھومنے سے انکار کر دیا شاید وہ اچھی طرح اندر نہیں بیٹھی تھی۔ اس نے چابی باہر نکالی اور اسے اچھی طرح اندر گھسایا پوری چابی اندر چلی گئی صرف اس کا گول سرا باہر رہ گیا تھا۔ اس نے چابی گھمائی اس مرتبہ بھی وہ اپنی جگہ سے حرکت نہ کر سکی۔ غالباً تالا بہت زنگ آلود تھا یہی وجہ تھی کہ بوڑھے چوکیدار کو تالا کھولنے میں اتنا وقت لگا تھا۔ اس نے تالا کھولنے کے لیے زیادہ قوت لگائی اور اس کے ذہن میں جو خیال پیدا ہوا اس نے تھامس کا بدن ٹھنڈا کر دیا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ اس نے صحیح چابی نیبر اسکی کو دے دی ہو اور اس کے پاس غلط چابی رہ گئی ہو؟ شاید اسی لیے تالا نہیں کھل رہا۔ کہیں وہ اپنی چالاکی کا خود ہی شکار تو نہیں بن گیا۔ مقبرے کے اندر چھائے ہوئے سکوت کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ نیبر اسکی دس لاکھ ڈالرز کے ہیرے جواہرات لے کر غائب ہو چکا ہے۔ اسے دوپہر گیارہ بارہ بجے ہوش آ گیا ہوگا اور اس وقت رات کا ایک بجا تھا۔ اس وقت تک نیبر اسکی ہزاروں میل کی مسافت طے کر سکتا تھا۔ دولت اگر جیب میں ہو تو معجزے بھی رونما ہو سکتے ہیں۔ اس کی پیشانی عرق آلود ہو گئی پھر اسے ایک اور خیال آیا ممکن ہے بڑی بی کے وکیل نے مقبرے کا تالا تبدیل کر دیا ہو۔ اسے اپنے ساتھ تھوڑا سا تیل لانا چاہیے تھا تاکہ صحیح صورت حال کا پتا چل جاتا۔ اگر تالا زنگ آلود ہوتو تیل ڈالنے سے کھل جاتا اور اس نے پوری قوت استعمال کرتے ہوئے چابی گھمائی اور اس مرتبہ کلک کی ایک بلند آواز سنائی دی۔ وہ تالا کھلنے کی آواز نہیں تھی وہ چابی ٹوٹنے کی آواز تھی۔ چابی کا گول سرا ٹوٹ کر اس کے ہاتھ میں آ گیا اور ٹوٹا ہوا حصہ تالے کے اندر رہ گیا۔

تاریخ میں شاید کبھی کسی نے قفل ساز کو اس قدر نہیں کوسا ہوگا جتنا کہ اس وقت تھامس نے کوسا تھا۔ وہ تقریباً رو پڑا تھا۔ اس نے بے انتہا کوشش کی کہ کسی طرح چابی کا ٹوٹا ہوا حصہ باہر نکال لے لیکن بری طرح ناکام رہا۔ ٹوٹی ہوئی چابی کی ڈنڈی تالے کے اندر تھی اور وہ زور آزمائی کی وجہ سے بری طرح پھنس گئی تھی۔ صورت حال کی نزاکت نے اسے دہشت زدہ کر دیا۔ نیبر اسکی اندر موجود ہے اور اس کے پاس جو چابی ہے اس سے قفل نہیں کھل سکتا اور اگر چابی صحیح بھی ہے تب بھی وہ اب اسے تالے کے اندر داخل نہیں کر سکے گا۔ وہ اس کا انتظار کر رہا ہوگا۔ اگر وہ سورج طلوع ہونے سے قبل تالا نہیں کھول سکا تو پھر اسے واپس لوٹنا پڑے گا۔ سوال یہ تھا کہ آخر نیبر اسکی کا کیا ہوگا؟ مقبرے کے اندر موجود ہوا کب تک چلے گی؟ کہیں ایسا نہ ہو کہ صبح تک انتظار کرنے کے بعد نیبر اسکی دہشت سے پاگل ہو جائے اور اس کا ذہنی توازن بگڑ جائے۔ مقبرے کے اندر دو حنوط شدہ لاشیں موجود تھیں گو کہ وہ تابوت میں بند تھیں لیکن خوف ناک حالات میں ان کا تصور ہی اچھے خاصے آدمی کو پاگل کر سکتا ہے۔ اس کے ذہن میں نہ جانے کیسے کیسے خیالات آئیں گے۔ صبح وہ کہیں اندر سے دروازہ پیٹ پیٹ کر چوکیدار کو متوجہ کرنے کی کوشش نہ کرنے لگے؟

پھر اچانک اسے گنبد کی چوٹی پر موجود روشن دان کا خیال آیا جس میں سبز رنگ کا اندھا شیشہ لگا ہوا تھا۔ اندر داخل ہونے کے اس راستے کو وہ بالکل فراموش کیے ہوئے تھا۔ وہ قبرستان کی چہار دیواری کے پاس گیا جہاں لوہے کی چپٹی سلاخ میں ڈوری اٹکی ہوئی تھی۔ اس نے پھندا نکالا اور واپس مقبرے کے پاس آیا۔ دروازے کے بالکل قریب اوپر چھت پر اڑتے ہوئے فرشتے کا مجسمہ لگا ہوا تھا۔ اس نے ڈوری میں پھندا لگایا اور آسانی سے اسے فرشتے کے مجسمے میں پھنسا دیا پھر اس نے ڈوری کھینچ کر مجسمے کی مضبوطی کا اندازہ لگایا اور ایک منٹ بعد وہ مقبرے کی چھت پر موجود تھا، اب مسئلہ گنبد پر چڑھنے کا تھا جس کی چوٹی پر روشن دان موجود تھا۔ گنبد نہ صرف گول تھا بلکہ خاصا بلند بھی تھا۔ اس نے ڈوری کے آزاد سرے پر ایک پتھر باندھا اور اسے چوٹی کے دوسری طرف اچھال دیا۔ دوسری کوشش میں وہ کامیاب ہو گیا۔ ڈوری چوٹی پر سے گزرتی ہوئی گنبد کے دوسری طرف لٹک گئی۔ وہ دوسری طرف سے ڈوری پکڑ کر گنبد کے اوپر چڑھ گیا۔ روشن دان میں لگا ہوا سبز رنگ کا شیشہ توڑنا مشکل کام نہیں تھا۔ ڈوری کے آزاد سرے پر بندھا ہوا پتھر کام آیا اور شیشہ ٹوٹ کر مقبرے کے اندر گر گیا۔ گول روشن دان اتنا بڑا تھا کہ وہ آسانی سے اس کے اندر داخل ہو سکتا تھا۔ اس نے پہلے اندر جھانک کر دیکھا۔ وہاں گھپ اندھیرا طاری تھا۔ اس نے کان لگا کر سن گن لینے کی کوشش کی، اندر مکمل سکوت طاری تھا۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ یا تو نیبر اسکی ہیرے جواہرات لے کر فرار ہو گیا ہے یا پھر وہ کسی قسم کی آواز نکالنے کی حالت میں نہیں ہے۔ ورنہ اب تک تو وہ چیخ کر خوش آمدید کہہ چکا ہوتا۔ اس نے ڈوری روشن دان کے اندر لٹکا دی اور پھر ڈوری پکڑ کے اندر اترنے لگا۔ اس طرح ڈوری پکڑ کے جھولتے ہوئے نیچے اترنے کا اتفاق اسے بہت کم ہوا تھا۔

اچانک ڈوری کا تناؤ ختم ہو گیا اور اس نے خود کو تیزی سے تاریکی میں گرتا ہوا محسوس کیا۔ اس طرح بلا ارادہ گرنے پر اس کی کوئی ہڈی بھی ٹوٹ سکتی تھی لیکن خوش قسمتی سے ایسا نہیں ہوا۔ شدید جھٹکے کی وجہ سے اس کے بدن کی تمام ہڈیاں جوڑوں سے ہل گئیں اور چند لمحے اس کے ہوش و حواس گم رہے لیکن فوراً ہی اس نے خود پر قابو پا لیا۔ ایک لمحے بعد اسے فرشتے کا مجسمہ اپنے قریب ہی دستی بم کی طرح پھٹتا ہوا سنائی دیا۔ مجسمہ دیوار سے اکھڑ کر روشن دان سے گزرتا ہوا اس سے ایک فٹ کے فاصلے پر گرا تھا۔ اگر اس کی ٹانگیں بھی تھامس کے بدن کو چھو لیتیں تو جسم کا وہ حصہ مفلوج ہو جاتا۔ کوئی ہڈی ٹوٹ جاتی اور سر پر گرنے کی صورت وہ آنجہانی ہو جاتا۔

یکے بعد دیگرے ناگہانی افتاد نے اس کی خود اعتمادی متزلزل کر دی۔ ”نیبر اسکی!“ اس نے خوف زدہ لہجے میں آواز دی۔

”تم کہاں ہو نیبر اسکی، تمہیں چوٹ تو نہیں آئی؟“ اس کے خاموش ہوتے ہی دوبارہ مقبرے پر گہرا سکوت مسلط ہو گیا۔ تب اسے جیب میں پڑی پنسل ٹارچ یاد آئی۔ اس نے ٹارچ نکال کر بٹن دبا دیا اور خدا کا شکر ادا کیا کہ نیچے گرنے کی وجہ سے اس میں کوئی نقص پیدا نہیں ہوا تھا۔ وہ معمول کے مطابق کام کر رہی تھی۔ اس نے جلدی سے ٹارچ کی پتلی سی روشنی اس طرف پھینکی جہاں دیوار کے ساتھ چبوتروں پر تابوت کھڑے تھے۔ دیوار کے دونوں کناروں پر مس گیرائی کے باپ اور ماں کے تابوت موجود تھے اور درمیانی تین چبوترے جو ایک روز قبل خالی تھے اب ان میں سے ایک چبوترے پر تیسرا تابوت کھڑا ہوا نظر آ رہا تھا۔ اس نے ٹارچ کی روشنی میں تابوت کا اچھی طرح جائزہ لیا۔ وہ بالکل درست حالت میں تھا۔ اس نے قریب جا کر ایک بار پھر تابوت کا معائنہ کیا اور کہیں بھی کوئی رخنہ تک نظر نہیں آیا پھر اسے خیال آیا کہ ممکن ہے وکیل نے تابوت ادھر ادھر کر دیے ہوں اور یہ وہ تابوت نہ ہو جس میں نیبر اسکی لیٹا تھا۔ منصوبے کے مطابق ہوش میں آتے ہی نیبر اسکی کو آہنی سلاخ کی مدد سے تابوت توڑ کر باہر نکلنا تھا اس لیے وہ تابوت ٹوٹا ہوا ہونا چاہیے تھا۔ اس نے جلدی جلدی بقیہ دونوں تابوت دیکھے وہ بھی بالکل درست حالت میں تھے۔

کیا نیبر اسکی کو اب تک ہوش نہیں آیا؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ اس نے بے ہوش کرنے والی دوا زیادہ دیر تک نیبر اسکی کی ناک سے لگائے رکھی ہو؟ اتنی زیادہ مقدار جان لیوا بھی ثابت ہو سکتی ہے۔ یہ خیال آتے ہی تھامس پر دیوانگی طاری ہو گئی۔ اس نے روشن ٹارچ کو زمین پر رکھا اور کسی محنت کش مزدور کی طرح درمیانی تابوت کو پشت پر لاد کر اسے زمین پر کھڑا کر دیا۔ اس تابوت کے نیچے فرش پر ایک صندوقچی بھی رکھی تھی جس کی وجہ سے اسے یقین تھا کہ درمیانی تابوت ہی میں نیبر اسکی موجود ہے۔ تابوت کو زمین پر لٹا کر اس نے ٹوٹے ہوئے مجسمے کا دھڑ اٹھایا اور پاگلوں کی طرح تابوت کے ڈھکن پر پوری قوت سے مارنے لگا۔ تابوت کی لکڑی زیادہ موٹی نہیں ہوتی۔ چند ضربات نے اس کے پرخچے

اڑا دیے اور ڈھکن میں بڑا سوراخ ہوگیا۔ تھامس نے مجسمہ زمین پر رکھا اور سوراخ میں ہاتھ ڈال کر تختے اکھاڑنے لگا۔ اس کے دونوں ہاتھ لہولہان ہوگئے لیکن اس نے ہمت نہیں ہاری۔ چند منٹ بعد کئی تختے ٹوٹ کر علیحدہ ہوگئے۔ اس نے زمین پر رکھی ہوئی ٹارچ اٹھائی اور تابوت کے اندر روشنی ڈالی، اندر نظر پڑتے ہی بے ساختہ ایک چیخ اس کے حلق سے بلند ہوئی اور ٹارچ ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر گر پڑی۔

چند لمحے وہ بے یقینی کے عالم میں آنکھیں ملتا رہا۔ اس نے دوبارہ ٹارچ اٹھائی اور سرہانے کی طرف روشنی پھینکی لیکن جو منظر اس نے پہلی بار دیکھا تھا اس میں ذرا بھی تبدیلی رونما نہیں ہوئی۔ اس کے سامنے مس گیرائی کا ہیبت ناک چہرہ موجود تھا جس کے پتلے پتلے سوکھے ہونٹوں پر خوفناک تبسم منجمد تھا۔ وہ ان کی ناکامی پر خندہ زن تھی، وہ نامعلوم طریقے سے کام لیتے ہوئے ان کا منصوبہ ناکام بنا کر اپنے مقبرے میں آگئی تھی۔ بڑی بی کی لاش کے نیچے اسے ایک موٹے آدمی کی لاش بھی نظر آرہی تھی۔

یہ سب کچھ تجہیز و تکفین کے ادارے سے غلطی سے ہوا تھا یا شاید یہ اس کی اپنی غلطی تھی گزشتہ شب تین بجے جب وہ اس کمرے میں داخل ہوئے تھے جہاں مس گیرائی کا تابوت رکھا ہوا تھا تو انہوں نے اس کے قریب ایک اور تابوت دیکھا تھا۔ دونوں تابوت اسکرو لگا کر بند کردیے گئے تھے اور ان پر سیاہ رنگ کی چادریں پڑی ہوئی تھیں۔ ادارے نے شناخت کے لیے چادروں پر دو گتے رکھے ہوئے تھے۔ جن پر ہاتھ سے بڑے بڑے حروف میں مرنے والوں کے نام لکھ دیے گئے تھے۔ انہوں نے دونوں اسکرو کھول کر دونوں تابوتوں کے ڈھکن کھول دیے تھے۔ مس گیرائی کی لاش موٹے آدمی کی لاش کے اوپر رکھ دی اور پھر منصوبے کے مطابق نیبر اسکی مس گیرائی کے تابوت میں لیٹ گیا تھا۔ اس نے دونوں تابوت اسکرو لگا کر بند کردیے تھے ان پر دوبارہ سیاہ چادریں ڈالی تھیں اور پھر چادروں پر ناموں کی تختیاں رکھ کر واپس چلا گیا تھا۔ شاید اس نے تختیاں غلط رکھ دی تھیں۔ اس وقت اسے تختیوں کی اہمیت کا قطعی احساس نہیں ہوا تھا۔ اس نے ان پر کوئی توجہ نہیں دی تھی۔ اس کا کام ختم ہوگیا تھا اور وہ جلد از جلد وہاں سے جانا چاہتا تھا۔ ممکن ہے اس نے موٹے آدمی کے نام کی تختی مس گیرائی والے تابوت پر رکھ دی ہو جس کی وجہ سے صحیح ادارے کے آدمیوں کو غلط فہمی ہوگئی ہو اور انہوں نے وکیل کو موٹے آدمی والا تابوت تھما دیا ہو اور جس تابوت میں نیبر اسکی بے ہوش پڑا تھا آخر اس کا کیا انجام ہوا ہوگا؟ جواب بہت سیدھا سادا اور آسان تھا۔

موٹے آدمی کی لاش حنوط نہیں کی گئی تھی جس کا مطلب یہ تھا اسے زمین میں دفن کیا جانا تھا۔ صبح موٹے آدمی کے وارث آئے ہوں گے اور دفن کرنے کے لیے تابوت اپنے ساتھ لے گئے ہوں گے۔ تھامس کسی بھی طرح اس بارے میں صحیح قیاس نہیں لگا سکتا تھا کہ آیا موٹے آدمی کا دیدار کرلیا گیا تھا یا نہیں۔ اگر آخری دیدار والی رسم ادا کرلی گئی تھی تو وارثوں نے تابوت قبرستان لے جاکر کھولے بغیر دفن کردیا ہوگا جس کے اندر نیبر اسکی زندہ موجود تھا لیکن بے ہوش تھا اسے گیارہ بارہ بجے کے قریب ہوش آنا تھا۔ بے ہوشی کے عالم میں اگر اسے دفن کیا گیا ہوگا تو وہ اندر سے چیخ چلا کر وارثوں کو صحیح صورت حال سے آگاہ بھی نہیں کرسکا ہوگا اور بے ہوشی کی حالت میں زندہ دفن کردیا گیا ہوگا۔ اگر آخری دیدار کی رسم ادا کی گئی تھی تو اس کا مطلب یہ تھا کہ تابوت کا ڈھکن کھولتے ہی ورثا کو ادارے کی غلطی کا احساس ہوگیا ہوگا۔ وہ تابوت واپس تجہیز و تکفین کرنے والے ادارے کے پاس لے گئے ہوں گے تاکہ غلط تابوت واپس کرکے صحیح تابوت حاصل کرلیں۔ ممکن ہے عین اس وقت نیبر اسکی کو ہوش آگیا ہو، ممکن ہے ورثا اسے زندہ محسوس کرکے فوراً نیبر اسکی کو اسپتال لے گئے ہوں، پولیس کو طلب کرلیا ہو ان کے علاوہ اور بھی بہت سے امکانات ہیں۔

اب اس سے کیا فرق پڑ سکتا تھا کہ تابوت کس کی غلطی سے وہاں پہنچا۔ اس حقیقت کو وہ کسی بھی طرح نہیں جھٹلا سکتا کہ مس گیرائی کسی نہ کسی طرح اپنے مقبرے میں پہنچ گئی تھی اور اپنے ساتھ ایک موٹے کو بھی لے آئی تھی اور وہاں اس کی مدد کے لیے پہلے ہی سے اس کے والدین موجود تھے جبکہ وہ خود تنہا تھا۔ اس کے پاس ایک رسی تھی جسے وہ کہیں بھی نہیں اٹکا سکتا تھا۔ مقبرے کی چھت تیرہ فٹ بلند تھی اور گنبد کی چوٹی اس سے بھی چار پانچ فٹ زیادہ اونچی تھی۔ وہ نیچے سے روشن دان کو دیکھ سکتا تھا لیکن اس تک پہنچنے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ مقبرے کا ایک دروازہ تھا جو بے حد مضبوط تھا۔ اس کے تالے میں ٹوٹی ہوئی چابی پھنسی ہوئی تھی اور وہاں چار لاشیں تھیں جن کی اس نے بے حرمتی کی تھی۔ کیا روحیں انتقام لیتی ہیں؟ اس نے روحوں کے انتقام کے کئی واقعات پڑھے تھے اور ایک تو بہت ہی دہشت ناک ...... یہ کیا؟ اس نے بڑی آہستگی سے سر ترچھا کرکے دائیں جانب دیکھا اس طرف کوئی حرکت سی محسوس کی ...... نہیں تو وہ عقب میں

تھی۔ اس نے مڑ کر پیچھے دیکھنے کی کوشش کی اور فوراً واپس پلٹا۔ اس مرتبہ اس کی آنکھوں کے کونوں نے واضح طور پر کوئی شے حرکت کرتی ہوئی محسوس کی تھی۔ وہ آنکھیں پھاڑ کر چاروں طرف دیکھنے لگا۔ کوئی سرد شے اس کی گردن کو چھوتی ہوئی گزر گئی۔ تھامس کے حلق سے ایک بھیانک چیخ بلند ہوئی اور پھر مقبرہ دہشت ناک چیخوں سے گونجتا رہا یہاں تک کہ اس کا حلق بیٹھ گیا۔ اوپر روشن دان سے صبح صادق کی سفید روشنی اندر داخل ہونے لگی تھی، وہ زمین تک پہنچنے میں کامیاب نہیں ہوسکی۔ اس نے ٹوٹا ہوا مجسمہ اٹھایا اور پوری قوت سے دروازے پر مارنے لگا یہاں تک کہ اس کے بازو شل ہوگئے۔ مجسمہ ٹوٹ کر چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بٹ گیا اور وہ نڈھال ہوکر دروازے کے پاس نیم بے ہوشی کے عالم میں گر گیا۔

☆☆☆

پولیس والے جب مقبرے کا دروازہ توڑ کر اندر داخل ہوئے تو ان کی صورتیں دیکھ کر تھامس کا دل باغ باغ ہوگیا۔ اس سے پہلے وہ پولیس والوں کو حقارت بھری نظروں سے دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتا تھا۔ اسے جیل جانا منظور تھا۔ وہ ہنسی خوشی بیس سال، تیس سال، پچاس سال سزا قبول کرنے کو تیار تھا۔ بشرطیکہ وہ اسے اس منحوس مقبرے سے باہر نکال لیں۔

پولیس والے اندر داخل ہوئے تو اس انسانی تماشے کو دیکھ کر حیران رہ گئے' وحشت زدہ چہرہ، سفید بال۔ ہاتھ خون میں لہولہان، کئی ناخن ٹوٹے ہوئے' لباس پھٹا ہوا اور آنکھوں سے آنسو رواں تھے، وہ تھامس کو پہچانتے تھے لیکن اس سے پہلے کسی نے بھی اس کے بال سفید نہیں دیکھے تھے۔ مسز گیرائی کا وکیل بھی ان کے ساتھ تھا۔

"انتہائی شرمناک، قابل نفرت۔" اس نے غصے سے کھولتے ہوئے کہا۔ "مجھے معلوم تھا کہ ضرور اس قسم کی کوشش کی جائے گی۔ لعنت ہو ان اخبار والوں پر' لعنت ہو ان مجرموں پر......"

تھامس جلدی جلدی کچھ بول رہا تھا لیکن اس کے حلق سے آواز برآمد نہیں ہورہی تھی۔ قبرستان کے چوکیدار نے جیب سے وہسکی کا ادھا نکالا اور تھامس کے منہ سے لگا دیا۔ دو گھونٹ وہسکی پیتے ہی اس کے حلق سے باریک سی آواز نکلنے لگی۔ "دوسرا تابوت، دوسرا تابوت۔"

"کون سا تابوت؟" ایک پولیس آفیسر نے اسے جھنجوڑتے ہوئے پوچھا۔

تھامس نے مختصراً اسے نیبر اسکی اور دوسرے تابوت کے بارے میں بتایا۔ "اس میں میرا ساتھی موجود ہے، وہ زندہ ہے۔ خدا کے لیے اسے بچاؤ۔ کوئی وہاں فون کرکے انہیں بتادے کہ اس تابوت میں ایک زندہ انسان موجود ہے انہیں روکو ورنہ وہ اسے......"

پولیس آفیسر دوڑتا ہوا مقبرے سے باہر نکل چکا تھا۔

تھامس دو پولیس والوں کے درمیان بیٹھا تھا۔ بڑی بی کا وکیل اگلی نشست پر تھا۔ ان کی گاڑی تیز رفتاری سے شہر کی طرف جارہی تھی۔ اچانک وائرلیس پر ٹوں ٹوں کی آواز بلند ہوئی۔ گاڑی چلانے والے پولیس افسر نے وائرلیس کا بٹن آن کردیا۔

"آپ کے لیے ایک پیغام ہے لیفٹیننٹ۔" وائرلیس سے آپریٹر کی آواز ابھری۔ "فیئرویل مورچری والوں نے اطلاع دی ہے کہ دوسرا تابوت کل صبح دس بجے لاش کے ورثا قبرستان سے لے گئے تھے اور اسے ساڑھے گیارہ بجے دفن کردیا گیا تھا۔ تابوت لانگ آئی لینڈ کے قبرستان میں دفن کیا گیا ہے۔"

"اوہ میرے خدا!" تھامس پر سکتہ طاری ہوگیا۔

"کیا زمین کے اندر؟" کسی نے پھنسی پھنسی آواز میں پوچھا۔

"چھ فٹ نیچے۔"

"افسوس لالچ انسان کو اندھا کردیتا ہے۔" وکیل نے تاسف بھرے لہجے میں کہا۔ "یہ المیہ محض شیشے کے چند رنگین ٹکڑے حاصل کرنے کی وجہ سے پیش آیا۔ انہیں یہ سوچنا چاہیے تھا کہ بڑھیا تو پاگل تھی جس نے ایسی احمقانہ وصیت کی تھی لیکن میرا ذہنی توازن تو درست تھا۔ میں کس طرح اصلی ہیرے جواہرات یوں ایک سنسان قبرستان کے مقبرے میں رکھ سکتا تھا۔ وہ تو بڑھیا کے مرتے ہی بینک کے لاکر میں پہنچا دیے گئے۔" وکیل نے فقرہ نامکمل چھوڑ دیا۔

"ذرا دیکھنا تو، مجرم شاید بے ہوش ہوگیا ہے۔"

اقوال زریں

☆ اللہ تعالیٰ کو گناہ گار توبہ کرنے والے کی آواز سے زیادہ محبوب اور کوئی آواز نہیں۔ (رسول پاک ﷺ)

☆ غصے میں ایسی کوئی بات نہ کرو جس سے بعد میں ندامت ہو۔ (حضرت علیؓ)

مرسلہ: بابر عباس، بگلیانہ روڈ، کھاریاں

زندگی نام ہے

احمد اقبال

موجودہ عہد کی بھیانک حقیقت یہ ہے کہ ہم اپنی کوتاہیوں پر یہ کہہ کر "زندگی نام ہے مرمرکے جیے جانے کا" خود کو ایک پُرفریب تسلّی دیتے ہیں پھر اسی کو زندگی کی حقیقت، تفسیر یا فلسفہ ثابت کرنے کی کوشش میں مبتلا رہتے ہیں۔ دولت چاہے وقت کی ہو یا زر کی، زیادتی ایک خود پسند انسان کو احساسِ برتری کی بیماری میں مبتلا کرکے تنہائی کی اذیت میں دُھکیل دیتی ہے۔ جہاں سلگتے جذبات اور بکھیرتے خوابوں کا تماشا دیکھنے والا کوئی نہیں ہوتا۔ جب زندگی نئی منزلوں کی جستجو میں مسلسل پڑائو کا شکار ہوجائے اور جب چھائوں کا فریب تپتی دھوپ کا سفر بن جائے... جب نہ آنکھوں میں کوئی چہرہ ٹھہرے اور نہ کوئی سرگوشی دلوں کو گدگداتی ہو... ایسے میں بے حسی انسان کو فرعون بنا دیتی ہے لیکن آخر کب تک... پھر ایک لمحہ اپنی گردش میں کچھ یوں قید کرتا ہے کہ ہر موسم کی برف دھیرے دھیرے پگھلنے لگتی ہے اور دن رات کا تسلسل "احساسِ رائگاں" بن کر دل پر بوجھ بنتا ہے تو خود کو یہی کہہ کر سہارا دیا جاتا ہے "زندگی نام ہے مرمرکے جیے جانے کا" اور کسی کو خبر تک نہیں ہوتی کہ کب ان کا گھمنڈ ریت کے مانند بکھرتا چلا گیا۔

زندگی کی رعنائیوں سے لمحہ لمحہ کشید کرنے والے لگر بے مقصد محو پرواز طائروں کی روداد حیات

اک معما ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا
زندگی نام ہے مر مر کے جیے جانے کا

ٹیلی فون کی گھنٹی نے ایک بار پھر بڑی مستقل مزاجی سے گا کے اسے متوجہ کرنے کی ناکام کوشش کی۔ عامر نے صرف ایک لمحے کے لیے نظر پتوں پر سے ہٹائی۔

اس کے سامنے بیٹھے ہوئے تاج نے سگریٹ کے باقی رہ جانے والے ٹکڑے کو ایش ٹرے میں مسل دیا۔ "ابے کون ہے؟ دیکھ کیوں نہیں لیتا...... بار بار ڈسٹرب کر رہا ہے ماں کا خصم......"

پرنس صاحبِ عالم اپنی سنہری زلفوں کو جھٹک کر ہنسا۔ "تو مارا جائے گا عامر کے ہاتھوں...... ابے یہ اسی ماں کا فون تھا جس کا کوئی خصم نہیں...... بس ایک ناخلف بیٹا ہے...... جو تیرے سامنے بیٹھا ہے۔"

چوتھے شریک مولاداد نے اپنی مونچھوں کو بل دیا۔ گھنٹی نے تیسری بار دہائی دینی شروع کی، تاج بھنا گیا۔ "ابے تیری ماں کا فون ہے تو سن لے...... پتا نہیں ایسی کیا بات ہے۔"

پرنس نے اس کی تائید کی۔ "اور جنت ماں کے قدموں کے نیچے ہے۔"

عامر نے پتا نیچے ڈال دیا۔ "جنت!" اس نے طنز اور تمسخر سے کہا۔ "مجھے معلوم ہے وہ کیوں بار بار فون کر رہی ہے...... اس نے پھر کوئی جنت بی بی تلاش کرلی ہوگی، میری زندگی کو جہنم بنانے کے لیے...... چلو پوائنٹ گنو اور نکالو مال......"

باقی تینوں نے عامر کے کھلے پتوں پر ایک رشک و حسد کی نظر ڈالی۔ "پھر بنالی رمی تو نے اتنی جلدی......" تاج نے ناراضی سے کہا۔

پرنس نے اپنے پتے نیچے ڈال دیے۔ "کوئی چکر ہے اس میں...... بے ایمانی ہے۔"

مولاداد نے صرف ٹھنڈی سانس لی۔ "نہیں یار......

اس سالے کی قسمت اچھی ہے۔"

عامر نے حساب شروع کیا۔ "بے ایمانی تم نہیں کرتے؟"

"یعنی تو اعترافِ جرم کر رہا ہے۔" تاج نے جیب سے نوٹ نکالے۔

"دیکھو بچے...... زبان سے بکواس کرنے کی کیا ضرورت ہے...... بے ایمان وہ جو پکڑا جائے، تم لوگ ہارتے ہو تو روتے ہو...... ابے مردانہ وار ہارو...... اور ہار کا حوصلہ نہیں تو کھیلنے کیوں بیٹھتے ہو...... میرے جیسے استاد کے ساتھ......"

"تیری استادی تو ہم نکالیں گے کسی روز......" پرتس کے ساتھ وہ تینوں بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔

عامر نے تقریباً بارہ سو روپے سمیٹ کر آج کی جیت کا ٹوٹل کیا...... آج اس کی جیب میں تقریباً چھ ہزار آ گئے تھے۔ ہارنے والوں کو قسمت سے گلہ بھی بے جا نہ تھا۔ اصل قصور ان کی عقل و نظر کا تھا جو عامر کے ہاتھ کی صفائی کو نہ دیکھ سکتی تھی اور نہ سمجھ سکتی تھی۔ عامر دل ہی دل میں استادِ محترم شاہ جی کا بہت شکر گزار تھا جنہوں نے اسے تاش کے باون پتوں سے قسمت سنوارنے کا یہ ہنر سکھایا تھا۔

☆☆☆

شاہ جی کی عقل و ذہانت نے ہوشیاری سے چالاکی، پھر عیاری و مکاری سے فریب کاری، دھوکا دہی اور جعلسازی تک کے سارے مراحل ترتیب وار کئی برسوں میں طے کیے تھے اور انہی کے طفیل اب ماشاءاللہ کئی برسوں سے ولایت میں دادِ عیش دے رہے تھے۔ اسکول اور کالج میں شاہ جی اور عامر کلاس فیلو تھے...... اس وقت عامر کی پروازِ فکر روایتی انداز میں دوسرے بہت سے کلاس فیلوز کی طرح بہت بلند تھی جو سب کے سب فرسٹ ڈویژن پاس کر کے ڈاکٹر یا انجینئر بننا چاہتے تھے۔ شاہ جی کی نظر اس وقت بھی مستقبل کو ایسے دیکھتی تھی جیسے عقاب کی نظر بلندیٔ افلاک سے زمین پر شکار کو دیکھتی ہے۔ اس نے عامر کو دوست سمجھتے ہوئے لگی لپٹی رکھے بغیر صاف بتا دیا تھا۔ "تو...... کتنا ہی زور لگا لے پتر...... تیری بس سیکنڈ ڈویژن ہی آئے گی...... بے شک یہ خوش خبری میری طرف سے اپنے ابا صاحب کو بھی سنا دینا جو تجھے لوکل فیکٹری سے ڈاکٹر بنوانے کے بعد تجھے ایکسپورٹ کرنے کا خواب دیکھے رہے ہیں تاکہ تو ولایتی ڈگری، میم اور شہریت لے کر انہیں بھی امریکا منگوا لے...... اسی لیے وہ گو امریکا گو ریلی میں بڑے اسلامی جوش و خروش کے ساتھ گلا پھاڑتا ہے...... ابے ہم...... تو بیٹا ہم ہیں دوسری دنیا کے آدمی...... کتابوں سے ہمیں کیا لینا دینا...... فیل ہو کے ہم کریں گے کوئی ایسا دھندا جس میں چار پیسے ملیں...... پھر چار روپے یا چار لاکھ اور چار کروڑ...... جائز ناجائز۔ ولدیت کا پتا نہیں چلتا یہاں تو مال کا کیا ہے...... سب حلال ہے...... رام نام جپنا پرایا مال اپنا...... یہی ہے اپنا فلسفۂ حیات......"

اور اس نے غلط نہیں کہا تھا۔ ہر امتحان میں وہ شاہ جی کی مدد کرتا رہا جس میں پڑھانے سے نقل کرانے تک کے تمام مراحل آسان نہ تھے۔ میٹرک کے سالانہ امتحان میں شاہ جی کمرائے امتحان میں بے خوف و خطر نقل کرتا رہا...... نگراں نے اس کی طرف آنکھ اٹھا کے بھی نہیں دیکھا...... شاہ جی نے بعد میں اسے بتایا کہ نقل کرنے والوں نے اتفاقِ رائے سے اس کو معاملات طے کرنے کا اختیار دیا تھا اور اس نے سب سے چندے کی صورت میں وہ رقم جمع کر لی تھی جو نگراں نے صرف نظر کرنے کے لیے مانگی تھی۔ تب عامر کو احساس ہوا کہ ہال میں اس جیسے کم تھے جنہوں نے پڑھنے میں راتیں کالی کر کے اور آنکھیں پھوڑ کے امتحان دیا تھا۔ اکثریت نے نمبر حاصل کرنے کا آسان راستہ اختیار کیا تھا۔ نتیجہ یہ کہ شاہ جی نے سیکنڈ ڈویژن میں اچھے نمبر لیے اور عامر کی تھرڈ ڈویژن آئی۔

مجبوراً اسے بی ایس سی میں ڈالا گیا جہاں بقول ابا صاحب اس نے ترقیٔ معکوس کی اور ایک بار فیل ہوا۔ شاہ جی نے مزید آسانی کے لیے آرٹس کے مضامین لیے اور عامر سے پہلے گریجویٹ بن کے کالج سے نکل گیا۔ تاہم عامر کی دوستی میں وہ ہمیشہ اس کا احسان مند رہا۔ وجۂ رحلت یہ نہ سہی مگر ابا اپنے ہونہار سپوت کو ڈاکٹر بنانے کی حسرت لیے دنیا سے رخصت ہو گئے۔ اس وقت عامر مجبوراً ان کی پسند کے مضمون میں ایم ایس سی کر رہا تھا۔

درمیان میں عامر کی شاہ جی سے ایک ملاقات ہوئی۔ ایک کار اسے بار بار ہارن دیتی رہی اور وہ کنارے کی طرف ہوتا گیا۔ اس کے باوجود کار نے اسے سائڈ سے ٹکر ماری تو عامر نے غصے میں پلٹ کے گالی دی۔ کار سے اترنے والے شاہ جی نے قہقہہ مار کے اسے کھینچ لیا۔ "مٹر گشت کر رہا ہے پتر یا جوتیاں چٹخا رہا ہے؟ چل بیٹھ میرے ساتھ......"

عامر نے جھینپ کے کہا۔ "گاڑی کس کی ہے شاہ جی......؟"

"ٹویوٹا کی...... پرائی ہے مگر کار ہے......" اس نے

بڑی قرأت کے ساتھ اور غیر موجود ڈاڑھی پر ہاتھ پھیر کے کہا۔

"میرا مطلب تھا۔ اپنی ہے...... تیری اپنی ہے؟"

شاہ جی پھر ہنسا۔ "اوئے کھوتے...... پرائی بیوی اور پرائی کار کون رکھ سکتا ہے۔"

"بڑی عیش ہے یار...... کر کیا رہا ہے تو......؟" عامر نے اس سے پوچھا تھا۔

"وہی جو تو نہیں کر سکتا اس لیے پوچھ کے کیا کرے گا۔ ہم تو پیدا ہوئے ہیں لائف کو کیش کرا کے عیش کرنے کے لیے...... اور اللہ بھی شکر دیتا ہے شکر خور کو...... کسی شوگر کے مریض کو ملے تو...... تیرا کام ہے کتابیں رٹنا...... میں نے تو پہلے ہی بتا دیا تھا کہ تو نے کوئی تیر نہیں مارنے...... یہ بتا ابا صاحب نے جوتے کتنے مارے تھے...... جب تو ڈاکٹر نہیں بنا تھا۔"

"وہ تو فوت ہو گئے یا رب حالات دیکھ کے دل تو اپنا...... نہیں کرتا پڑھنے کو...... مگر ویلا پھرنے سے بھی کیا ملے گا...... تو بتا کوئی کام ہے تو......"

شاہ جی نے برہمی سے کہا۔ "کیوں؟ تو اندھا ہے کیا...... تجھے نظر نہیں آتا کہ دنیا میں کتنے کام کر رہے ہیں لوگ...... فٹ پاتھ پر کتنے نجومی، دندان ساز، فال نکالنے والے بیٹھے ہیں۔ لنڈے کے کپڑوں سے پکوڑوں تک...... کیا یہ کام نہیں کر رہے ہیں۔"

"میرا مطلب تھا...... میں کیا کر سکتا ہوں؟"

شاہ جی اپنی رو میں بولتا گیا۔ "جب کوئی تیرے جیسا عقل کا اندھا نکما افلاطون مجھ سے یہ سوال کرتا ہے نا تو میرا دل کرتا ہے ایک جھانپڑ ماروں ایسا...... کہ آنکھیں کھل جائیں...... مگر تو یار ہے اپنا اور ہمیں امتحان میں نقل کراتا تھا۔ اس لیے کہتا ہوں کہ لگا رہے اسی کام میں...... جس دن عالم فاضل ہو کے نکلے گا دنیا میں تو آٹے دال کا بھاؤ بھی معلوم ہو جائے گا۔ چل اب اتر...... مجھے دوسری طرف جانا ہے...... تیرا گھر یہاں سے قریب ہے، ٹائم نہیں ہے میرے پاس ورنہ کہیں بیٹھ کے چائے پیتے......" اس نے یک دم گاڑی روک لی۔ "یہ لفافہ رکھ لے، اس میں ایک تحفہ ہے۔"

عامر خفیف سا ہو کے اترا۔ "پھر ملنا ہو تجھ سے تو......؟"

اس نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ "مل جائیں گے اسی طرح کہیں پتر...... دنیا کون سی بڑی جگہ ہے۔"

لفافے میں دس ہزار روپے تھے، ایک سال بعد جب

پیغام رسانی

انتخابات میں کون آتا ہے اور کون جاتا ہے۔ کس کی ضمانت ضبط ہوتی ہے اور کون ضمانت ضبط کرواتا ہے؟ یہ تمام باتیں تو چند روز بعد ہی سامنے آئیں گی، فی الحال جو ہو رہا ہے وہ یہ ہے کہ جلسوں میں لیڈر حضرات گالیاں دے رہے ہیں، پھر یہی گالیاں سوزوکیوں پر لگے ہوئے لاؤڈ اسپیکروں کے ذریعہ محلوں میں پہنچ رہی ہیں اور گلی گلی چھوٹے چھوٹے بچے انہیں یوں دہراتے پھر رہے ہیں جیسے آموختہ تازہ کر رہے ہوں۔ آج کی مروجہ سیاسی زبان میں تو انہیں نعرے ہی کہا جاتا ہے مگر شائستگی کا یہ عالم ہے کہ خواتین تو رہیں ایک طرف خود باپ بیٹے کے سامنے دہرائے تو پتہ پانی ہو جائے۔ تعجب تو اس وقت ہوتا ہے جب نہایت معقول چہرے مہرے والے مقطع حضرات تلفظ کی نوک پلک کو ملحوظ رکھتے ہوئے ترنم کے ساتھ ان مغلظات کا ورد کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ سچ کہتے ہیں لیڈر حضرات کہ وہ اپنا پیغام گھر گھر پہنچائیں گے۔ ہاں صاحب، پہنچ رہا ہے، اور ڈنکے کی چوٹ پر پہنچ رہا ہے۔ مگر ڈر یہ ہے کہ کہیں یہی پیغام اسی شائستگی کے ساتھ ان لیڈر حضرات کے اپنے گھروں تک نہ پہنچ جائے۔

شفیع عقیل کی کتاب سرخ، سفید، سیاہ سے اقتباس

وہ ایک اور ڈگری کے لیے ایم ایس سی کر رہا تھا اچانک وہ شاہ جی سے ٹکرا گیا۔ اس بار شاہ جی نے اسے دیکھا اور گاڑی سے اتر کے آواز دی۔ عامر نے دیکھا تو وہ سڑک کے دوسرے کنارے پر ایک بالکل نئی چمکتی دمکتی کار کا پچھلا دروازہ کھول کے اترا تھا۔ ظاہر ہے گاڑی کو شوفر چلا رہا تھا۔ وہ اتنا حیران، خوش اور نروس ہوا کہ دیکھے بغیر سڑک کراس کرنے لگا۔ اچانک کسی ٹیکسی کی ٹکر نے اسے اوپر اچھال دیا۔ وہ سڑک پر گرنے تک ہوش میں تھا مگر جب اس کی آنکھ بے ہوش ہونے کے بعد کھلی تو اس نے خود کو کسی اسپتال کے بیڈ پر پایا...... یہ بہت اچھا پرائیویٹ اسپتال تھا جہاں اسے شاہ جی نے پہنچایا تھا۔ اسے اپنے تکیے پر ایک چٹ رکھی ہوئی

ملی۔ ”جاتے وقت اسپتال والوں سے حساب کتاب کر لینا...... اور آیندہ سڑک پر آنکھیں کھلی رکھنا۔“

عامر کی مرہم پٹی کی جا چکی تھی۔ اسے معمولی زخم آئے تھے مگر جسم کا جوڑ جوڑ درد کر رہا تھا۔ ٹیکسی والا ابھی وہاں موجود تھا اور عامر کی ماں بھی مگر شاہ جی غائب تھا۔ صرف دو دن بعد اسے گھر جانے کی اجازت دے دی گئی۔ اس کا بل گیارہ ہزار سے کچھ اوپر تھا۔ اسپتال والوں نے یہ رقم کاٹ کے ایڈوانس کے طور پر جمع کرائے گئے ایک لاکھ اسے لوٹا دیے اور ظاہر ہے یہ رقم شاہ جی دے گیا تھا مگر وہ اپنا کوئی پتا یا فون نمبر چھوڑ کے نہیں گیا تھا۔

شاہ جی کو اس نے ایم ایس سی کرنے کے بعد پھر دیکھا لیکن یہ کوئی ملاقات نہ تھی، اس نے شاہ جی کو اخبار کے پہلے صفحے پر دیکھا تھا۔ وہ پولیس کی حراست میں تھا اور اس کے ہاتھوں کو ہتھکڑی نے جکڑ رکھا تھا۔ شاہ جی کو پولیس جسمانی ریمانڈ کے لیے پیش کرنے لائی تھی۔ شاہ جی کی صحت پہلے سے بہتر نظر آتی تھی، اس نے ہلکی سی نفاست سے تراشی ہوئی ڈاڑھی بھی رکھ لی تھی اور وہ پریشان نظر آنے کے بجائے مسکرا کے کیمرے کی طرف دیکھ رہا تھا۔

تصویر سے منسلک خبر میں اسے ایک خطرناک مجرم، دھوکے باز، جعلساز، فراڈ کی متعدد وارداتوں کے علاوہ بینک ڈکیتی میں بھی ملوث بتایا گیا تھا۔ عامر کو بہت دکھ ہوا، ظاہر ہے جس راستے پر شاہ جی سفر کر رہا تھا اس کا انجام ذلت و رسوائی اور قید و بند پر ہی ہونا تھا۔ شاید وہ اور کچھ عرصہ گرفتار نہ ہوتا تو اس کے نامۂ اعمال میں قتل بھی شامل ہو جاتا ...... لیکن وہ عامر کا دوست اور محسن تھا مگر عامر میں اتنی بھی ہمت نہ تھی کہ شاہ جی کو برے اعمال کے برے انجام پر لیکچر دے سکے۔ اسے معلوم تھا کہ شاہ جی اس کی بات کو ہنس کر کیسے چٹکیوں میں اڑائے گا اور اسے بزدل، ڈرپوک اور نامرد سے بھی بڑھ کر ایک خطاب سے نواز دے گا۔ لاشعوری طور پر عامر کے لیے وہ سپرمین تھا۔

رات بھر عامر کو پریشانی اور خوف سے نیند نہ آئی۔ وہ سوچتا رہا کہ ریمانڈ لینے کے بعد رات بھر اعتراف جرم حاصل کرنے کے لیے اس پر تھانے میں تشدد کے کیسے حرب آزمائے جائیں گے۔ چشم تصور سے عامر نے شاہ جی کو ننگا اور الٹا لٹکا ہوا دیکھا، پولیس اسے مرچوں کی دھونی دے رہی تھی، وہ ننگے فرش پر لیٹا ہوا تھا، ایک پولیس مین نے اس کے ہاتھ پکڑ رکھے تھے۔ دوسرے نے سر دبا رکھا تھا اور تیسرا سیدھا کھڑا ہوا پوری قوت سے چھترول کر رہا تھا...... شاہ جی کے حلق میں کپڑا ٹھونس دیا گیا تھا، چنانچہ وہ تکلیف کی شدت سے صرف تڑپ سکتا تھا، حلق سے آواز نہیں نکال سکتا تھا۔ اس پر رات بھر اپنے دوست کی حالت کے خیال سے لرزہ طاری رہا۔

اگر اگلے روز شاہ جی کا پیغام نہ ملتا تو عامر انتہائی متفکر اور دکھی ہونے کے باوجود تھانے جا کے شاہ جی سے ملاقات کی ہمت کبھی نہ کرتا۔ ایک تو اسے ڈر تھا کہ وہ تھانے گیا تو پولیس اسے بھی مجرم کا دوست اور ساتھی سمجھ کے دھر لے گی۔ مجرم کا ساتھی بنانے میں فائدہ تو پولیس کا ہی ہوتا ہے۔ فرد جرم میں نام ڈالنے کی دھمکی بھی کافی ہوتی ہے۔ خود بے گناہ مجرم پر جو گزرتی ہے سو گزرتی ہے۔ اس کے ماں باپ یا بہن بھائی یا بیوی بچوں کو تفتیش دکھا کے یا صرف سنا کے رہائی کی منہ مانگی قیمت وصول کرنا آسان ہو جاتا ہے۔ عامر کی ماں کے پاس مرحوم شوہر کی پنشن کے سوا کیا تھا جو وہ ہر تین ماہ بعد وصول کرنے جاتی تھی۔

تاہم شاہ جی نے طلب کیا تو اس کے لیے انکار کی گنجائش ہی نہ رہی۔ اب جو ہو سو ہو...... اس نے سوچا، دستیاب نذرانہ جیب میں ڈال کے وہ آیت الکرسی پڑھتا ہوا تھانے کی سمت روانہ ہو گیا۔ ماں کو کچھ بتانے کی اس میں ہمت نہ تھی مگر گلی محلے کے دو رازداں دوستوں کو بتانا ضروری تھا۔ عامر اپنے ساتھ چائے کا تھرماس اور کھانے پینے کا بہت سا سامان بھی لے گیا تھا۔

ڈرتے ڈرتے عامر نے تھانے کے دروازے پر کھڑے سنتری سے شاہ جی کے بارے میں پوچھا۔ سنتری نے غرا کے اسے غور سے دیکھا۔ ”کون شاہ جی...... انچارج صاحب......!“

”نہیں جی......“ عامر منمنایا اور وہ اخبار سنتری کے سامنے کر دیا جس میں شاہ جی کی تصویر شائع ہوئی تھی۔ ”یہ جو وکیل صاحب کے پیچھے ہیں...... یہ میرے بڑے بھائی ہیں۔“

عامر کے اس حفاظتی جھوٹ پر توجہ دیے بغیر سنتری نے اندر جانے کا اشارہ کر دیا۔ ”ادھر اپنے محرر صاحب سے معلوم کرو۔“

عامر نے شاہ جی کو انچارج صاحب کے کمرے میں دیکھا۔ وہ کرسی میں پھنسے ہوئے ایس ایچ او کے ساتھ میز کے دوسرے کنارے پر ایک کرسی پر موجود تھے۔ میز پر چائے کے خالی برتن اور بہت کچھ موجود تھا جس سے ثابت ہوتا تھا کہ قانون کے محافظوں نے اپنے معزز مہمان کی خاطر مدارت میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ عامر ایک شاپنگ بیگ، تھرماس اور دوسری سبھی اشیائے خورونوش لٹکائے بے وقوف بنا کھڑا رہا۔ پھر شاہ جی اٹھا اور اس سے گلے ملا۔ ”اوئے مجھے پتا تھا تو آئے گا میرے یار...... لو اپنے شاہ جی، اس بندے کی بات کر رہا تھا میں آپ سے کچھ دیر پہلے۔“

دوسرے شاہ جی یعنی تھانہ انچارج نے فقط سر ہلانے پر اکتفا کیا۔ کرسی میں سے نکلنا اور کھڑا ہو کے عامر سے ہاتھ ملانا اس کے لیے مشکل کام بھی تھا اور اس کی شان کے خلاف بھی۔

عامر دوسری خالی کرسی پر بیٹھ گیا تو شاہ جی نے کہا۔ ”یہ کیا لے آیا ہے تو......“

عامر نے خفت سے جواب دیا۔ ”میں نے سوچا تمہارے لیے کچھ لے جاؤں۔“

شاہ جی زور سے ہنسا۔ ”اسی لیے بلا لیا تھا میں نے تجھے۔ مجھے پتا تھا کہ تصویر دیکھ کر تیری تو نیند بھوک سب اڑ گئی ہوگی، اوئے پاگل، اللہ کے فضل سے یہاں مجھے گھر جیسا آرام ہے۔“

عامر نے ہمت کر کے پوچھ لیا۔ ”کیا اس کا مطلب ہے کہ تم نے بھی گھر بسا لیا؟“

”اوئے اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے۔ گھر بساتے ہیں تیرے جیسے گھریلو جانور......“ اس نے بے تکلفی سے عامر کے کندھے پر ہاتھ مارا۔ ”چل چھوڑ...... کیا کر رہا ہے تو؟“

عامر کا چہرہ پہلے ہی سرخ ہو چکا تھا۔ ”ابھی تو کچھ نہیں......“

”اور تیرے ابا صاحب جو تجھے ڈاکٹر بنانا چاہتے تھے......؟ اب کیا بنانا چاہتے ہیں؟“

”بتایا تو تھا ان کا تو انتقال ہو چکا ...... بہت پہلے......“

”پھر گزارہ کیسے چل رہا ہے......؟“ شاہ جی سنجیدہ ہو گیا۔

”ان کی پنشن ہے۔ اماں کو مل رہی ہے ابھی......“

شاہ جی نے سر ہلایا۔ ”اچھا کوئی مسئلہ ہو تو بتانا......“

”کہاں بتاؤں...... تم جب ملتے ہو، نہ اپنا پتا ٹھکانا بتاتے ہو...... نہ فون نمبر دیتے ہو۔“

شاہ جی نے مسکرا کے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ ”ابھی کچھ دن تو ہم ہوں گے بڑے گھر میں سرکار کے مہمان...... تو ادھر آ کے جب چاہے مل سکتا ہے۔“

عامر نے مطلب سمجھ لیا۔ ”جیل تو ہر شہر میں ہے۔“

”ہاں...... کراچی کی ٹھیک لگتی ہے مجھے، شہر کے بیچ میں ہے، آسانی رہتی ہے سب کو...... لیکن ادھر نہ ہوا تو معلوم ہو جائے گا تجھے...... یہ شاہ جی ہیں ورنہ کہیں سے بھی پوچھ لینا، نام جانتا ہے تو اور یہ اخبار رکھ لینا سنبھال کے۔“ عامر چائے کا سامان اٹھائے واپس گھر پہنچا تو شاپنگ بیگ میں سے ایک لاکھ روپے نکلے جو شاہ جی نے اس کی نظر بچا کے ڈالے تھے۔ وہ عامر کی شاہ جی سے آخری ملاقات تھی۔ آج بغیر کسی وجہ کے اسے پھر یاد آئی تو اس نے سوچا کہ پتا کر لینے میں حرج ہی کیا ہے۔ شاہ جی جہاں بھی ہوگا عیش ہی کر رہا ہوگا۔ لائٹ بجھاتے وقت اس نے آہ بھر کے سوچا۔ آخر یہ مقدر ہوتا کیا ہے......؟ اسے بے اختیار ہنسی آ گئی۔

■ ■ ■

اس کو تکیے کے نیچے رکھے ہوئے موبائل فون کی گھنٹی نے بیدار کیا۔ حسب عادت اس نے پہلے کلائی پر بندھی روشن ہندسوں والی گھڑی کو دیکھا تو اسے کچھ اطمینان ہوا کہ وہ اپنی نیند پوری کر چکا ہے۔ اس نے نمبر دیکھا اور کال ریسیو کر لی۔ ”السلام علیکم اماں......“

”جیتے رہو بیٹا...... کل رات بھی میں نے تین مرتبہ فون کیا تھا۔“

عامر آنکھیں ملتا اٹھ بیٹھا۔ ”ہاں...... فون ایک دوست کے گھر رہ گیا تھا۔ وہ ابھی صبح دے کر گیا ہے اماں...... خیر تم بتاؤ کیسی ہو؟ کیا کر رہی ہو......؟ دوا کھاتی ہو یا بھول جاتی ہو، ناشتا کیا؟......“

”سب پوچھے گا، یہ نہیں پوچھے گا کہ بار بار فون کیا تھا تو کیوں......“

عامر ہنس پڑا۔ ”یہ بھی کوئی بات ہے پوچھنے کی...... تم سو بار فون کرو۔“

”بکواس مت کر...... یہ بتا کیا ہوا تیرے کام کا، آخر کب تک بیٹھا رہے گا کراچی میں...... اتنے خراب حالات ہیں، میں تو دن رات دیکھ رہی ہوں۔“

”وہ سب ڈراما ہے ٹی وی والوں کا، ایک آدمی مرے تو دس دکھاتے ہیں ...... دہشت گردی، ٹارگٹ کلنگ، اسٹریٹ کرائم...... ان کے بغیر تو خبرنامہ نہیں بنتا ان کا۔“

”کیا مطلب ہے تیرا، سب جھوٹ بولتے ہیں؟“

”سب سچ بھی نہیں ہوتا اماں...... تو خود آ جا اور دیکھ لے، سارا دن میں لوگوں سے ملتا ہوں، ہر جگہ جاتا ہوں۔ مجھے تو کچھ نظر آتا نہیں، کسی نے ابھی تک موبائل فون بھی نہیں مانگا مجھ سے۔ وہی فون ہے جس سے بات کر رہا ہوں۔“

”اس کام کی بات کر جس کے لیے کراچی گیا تھا...... کچھ ہوا کہ نہیں؟“

"ابھی ہوا تو نہیں مگر امید ہے اماں......"

ماں نے اس کی بات کاٹ دی۔ "چھوڑ اس روز کی امید کو...... آخر کب تک تو وہاں بیٹھا رہے گا اور میں یہاں اکیلی دعائیں مانگ مانگ کے ہلکتی رہوں گی۔ بس تو آجا واپس۔"

"اماں......" اس نے شکایتی لہجے میں کہا۔ "جب امید پیدا ہوئی ہے کام کی تو میں آجاؤں...... مجھے تو لگتا ہے تم نے پھر کسی بدبخت کو تاڑ لیا ہے۔ یہ بھی ہوگی لاکھوں میں ایک حور پری، خاندانی، سلیقہ شعار...... کیوں یہ گناہ اپنے سر لیتی ہو اماں، جو بیٹھی ہے آرام سے ماں باپ کے گھر میں خوش و خرم، اسے میرے ساتھ باندھ کے مصیبت میں ڈالنے کا فائدہ؟"

خلاف توقع ماں نے وہ ڈائیلاگ شروع نہیں کیے جن کا آغاز ہی دردناک ہوتا تھا اور انجام آنسوؤں پر...... کچھ اپنے مرجانے کی بات، کچھ غصہ...... کچھ دھمکی ماں نے کہا۔ "لڑکی تو خیر ہے اپنی جگہ اور تو خود آکے دیکھ لیتا کہ ماں کی نظر کمزور ہوئی ہے، ماں اندھی نہیں ہے، کاروباری لوگ ہیں۔"

"گویا کروڑ پتی لوگ ہیں۔ لاکھوں کا جہیز دیں گے۔ کوٹھی کار سمیت...... اور گھر داماد رکھیں گے، کیا سودا کیا ہے تم نے اماں......"

"فون پر فضول بکواس مت کر میرے ساتھ...... میں جانتی ہوں اپنے بیٹے کو...... اور میرا بیٹا بکاؤ ہے بھی نہیں، کون ماں اپنے اکلوتے بیٹے کا سودا کرتی ہے۔"

"ماں...... اب تم رونا شروع مت کر دینا۔ میں فون بند کر دوں گا، تم نے بتایا ہے انہیں کہ لڑکا ایم ایس سی پاس بے روزگار ہے...... کوئی اسے کلرکی بھی نہیں دیتا۔"

"سب بتا دیا تھا میں نے، جو باقی رہ گیا ہو تو خود آکے بتا دینا۔ مرضی ہو تو ہاں کرنا ورنہ انکار کر دینا۔ میں کچھ نہیں بولوں گی، لیکن میں نے پرسوں بلایا ہے انہیں شام کو...... اور جیسے بھی ہو تجھے پہنچنا ہے۔" ماں نے اس کا جواب سنے بغیر فون بند کر دیا۔

اسے سخت طیش آیا لیکن اس کے بار بار ملانے پر بھی اسے ماں کا فون بند ہی ملا، وقت بہت کم تھا۔ عامر نے باہر جاکے ناشتا کیا اور بہت دیر تک اپنے حالات پر غور کرتا رہا۔ اب کراچی آئے تین مہینے ہونے کو تھے۔ وہ ایک پسماندہ بستی کے چھوٹے سے مکان میں گلی کی طرف کھلنے والا ایک کمرا کرایے پر لے کر رہ رہا تھا۔ اب تک اس کی ہر کوشش کا انجام ناکامی پر ہوا تھا۔ اس نے جیل جاکے شاہ جی سے بھی ملنے کی کوشش کی مگر اس کی ملاقات نہیں ہو سکی تھی۔ جیل کے ایک عمر رسیدہ سنتری نے اخبار میں شاہ جی کی تصویر دیکھ کر یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ یہ بندہ تو شاید کہیں باہر نکل گیا ہے۔

عامر نے بے وقوفوں کی طرح پوچھا۔ "تمہارا مطلب ہے، اس کی سزا پوری ہو گئی؟"

"سزا تو اسے سات سال کی ہوئی تھی۔"

"پھر...... اتنی جلدی باہر کیسے نکل گیا؟"

"اوئے میرا مطلب تھا کہ ملک سے باہر چلا گیا۔" سنتری نے اسے غور سے دیکھا۔

عامر کی تسلی نہیں ہوئی۔ "سنتری صاحب...... سزا کی میعاد پوری کیے بغیر وہ بیرون ملک کیسے گیا؟"

"یار بندہ تو سیانا لگتا ہے تو...... پڑھا لکھا بھی ہے لیکن دنیا کی کچھ خبر نہیں تجھے...... اوئے بھولے بادشاہ...... یہ جو اونچی اونچی دیواریں ہیں نا، یہ میرے تیرے جیسے غریب، لاوارث لوگوں کا راستہ روکتی ہیں، کیا سمجھا...... جس کا ہو کوئی آگے پیچھے یا جس کی جیب میں ہو مال، اس کے سامنے یہ خود جھک جاتی ہیں ادب سے...... کہ جاؤ بادشاہو، موج کرو...... تو کیا لگتا ہے شاہ جی کا......؟"

عامر چونکا۔ "میں...... کچھ نہیں...... اسکول میں ساتھ پڑھتے تھے۔ پھر ایک دن یہ تصویر دیکھی تو اس سے ملا تھا، ادھر سے گزرتے ہوئے خیال آیا کہ پوچھوں وہ یہاں کیسا ہے۔"

سنتری اسے یوں دیکھتا رہا جیسے اس کی بات کے جھوٹ سچ کا فیصلہ کر رہا ہو۔ "چل جا یار، کام کر اپنا......" اس نے بیزاری سے کہا۔ "ہم ویلے نہیں ہیں تیری طرح......"

اس بات کو بھی مہینا بھر سے زیادہ ہو چکا تھا۔ اب تک وہ ویلا یعنی فارغ ہی پھر رہا تھا اپنی لیاقت اور ضرورت کے مطابق کام کی جستجو میں وہ بڑی مستقل مزاجی سے کراچی کے طول و عرض کو ناپتا رہا...... کام ہر جگہ تھا لیکن اس کے لیے نہیں تھا کیونکہ بدقسمتی سے وہ ایم ایس سی کی ڈگری رکھتا تھا۔

ایک جگہ اس سے کہا گیا۔ "کام تمہارے لائق نہیں ہے۔"

یہی بات دوسری جگہ یوں کہی گئی۔ "تم اس کام کے لائق نہیں ہو۔"

اس نے جنرل منیجر ٹائپ شخص کے سامنے سے درخواست برائے ملازمت اٹھالی۔ "کیا آپ مجھے یہ بات سمجھا سکتے ہیں سر...... کام کرائے بغیر آپ نے کیسے جان لیا کہ میں اس کام کے لائق نہیں ہوں۔"

جی ایم نے کہا۔ "اگر ابھی تک کسی نے تمہیں یہ بات نہیں سمجھائی اور خود تم یہ سمجھنے سے قاصر ہو، تو میں کلیئر کر دیتا ہوں۔ یہاں صرف کارخانے ہیں، ہر قسم کے کارخانے اور ان میں دو ہی طرح کے لوگ ملتے ہیں، مالکوں کو شمار کر لو تو تین...... ورنہ افسر اور مزدور، عموماً افسر بھی وہی ہوتے ہیں، مالک یا ان کے بیٹے اور بھانجے بھتیجے...... باقی سب دہاڑی کے ملازم...... اپنی ڈگری کے ساتھ تم مزدوری نہیں کر سکتے، ایم ایس سی کی ڈگری ہمارے کسی کام کی نہیں اور شاید تمہارے بھی کسی کام کی نہیں۔"

پھر ایک جگہ عامر نے تجربے کے لیے ڈگری کا ذکر ہی نہیں کیا۔ اسے کام پر لگا دیا گیا۔ صرف ایک دن میں اس پر چودہ طبق روشن ہو گئے۔ وہ ٹیکسٹائل مل تھی، دن بھر میں اس نے جتنی مشقت کی اس سے زیادہ گالیاں کھا کے ذلت اٹھائی اور جب شام کو اسے دن بھر کی اجرت ملی تو اسے اندازہ ہوا کہ...... ہیں تلخ بہت بندہ مزدور کے اوقات۔ اس نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی اجرت کی رقم کو دینے والے کے منہ پر مارنے سے گریز کیا اور باہر نکل آیا۔ پھر وہ نائٹ کالجوں اور ٹیوشن سینٹروں میں پھرتا رہا۔ ہر جگہ اس سے تجربہ پوچھا گیا۔ یہ کہا گیا کہ لڑکے لاؤ پڑھنے والے...... فیس میں ففٹی پرسنٹ لے لو۔ ویسے بھی وہ سمجھتا تھا کہ تعلیم و تدریس کے شعبے میں اپنی ڈگری کے باوجود وہ ناکام رہے گا۔ وہ کم گو اور جھینپو تھا، اس کا انداز تخاطب جارحانہ اور مرعوب کرنے والا نہیں ہوتا تھا۔ کامیاب وہ تھے جو فضول بول کے بھی سب کو چپ کرا سکتے ہوں۔

وہ ایک اچھا منتظم تھا لیکن یہ بھی اس کا اپنا خیال تھا، ابھی تک اسے اپنی یہ صلاحیت آزمانے یا ثابت کرنے کا کوئی موقع نہیں ملا تھا اسے افسوس ہوتا تھا کہ کسی وجہ اور ضرورت کے بغیر وہ ایک مضمون پڑھتا رہا۔ بھلا پاکستان میں جنیٹک انجینئرنگ، فزیکل کیمسٹری یا مائیکروبائیولوجی جیسے مضامین میں قابلیت کی کس کو ضرورت ہے۔

اس جیسے ہزاروں لاکھوں اپنے علم کا بوجھ اٹھائے نوکری ڈھونڈ رہے تھے مگر نوکری نہ حکومت کے پاس تھی نہ پرائیویٹ سیکٹر میں...... جس کا استعمال کہیں نہیں وہ تعلیم دینے یا لینے میں صرف وقت کا زیاں ہے اور کچھ نہیں۔

جیل سے واپسی پر راہ چلتے عامر کو اپنا ایک پرانا کلاس فیلو مل گیا جو اس سے ایک سال آگے تھا مگر اس کے ماں باپ کے پاس پیسا تھا چنانچہ اس کے مستقبل کا واضح پلان بھی تھا۔ اس نے عامر کو بتایا کہ میں ایبرڈین یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کر رہا ہوں، الیکٹرانک انجینئرنگ میں۔

عامر کی عقل خبط ہو گئی۔ "وہ کیا چیز ہے اور یہ یونیورسٹی دنیا کے کس خطے میں ہے؟"

اس نے حیرانی سے کہا۔ "تمہیں نہیں معلوم، یہ اسکاٹ لینڈ میں ہے اور اس کا شمار کیمبرج یا آکسفورڈ جیسی اعلیٰ اور قدیم ترین یونیورسٹی میں ہوتا ہے، یہ ٹی وی، موبائل فون، ایکسرے سے ایم آر آئی اور سی ٹی اسکین تک سب الیکٹرانک انجینئرنگ ہی تو ہے۔ مجھے تو سونی کارپوریشن آف امریکا نے آفر بھی بھیج دی ہے۔"

اس روز وہ جیل سے مایوس لوٹا تھا۔ سنتری نے یہ کہہ کر اس کی ساری امیدوں پر پانی پھیر دیا تھا کہ شاہ جی کہیں باہر ہے۔ لندن، نیویارک یا پیرس میں عیش کے دن گزار رہا ہے۔ کہیں جگمگاتے جوئے خانوں میں شراب کا بلوریں جام تھامے ہار جیت کی سنسنی خیزی سے لطف اندوز ہو رہا ہوگا...... دروازے پر ہونے والی دستک نے اس کے تصور کی پرواز کو روک دیا، عامر کی آنکھیں وہی دیکھ رہی تھیں جو اس نے فلموں کے مناظر سے اخذ کیا تھا۔

اس نے بے دلی سے اٹھ کے دروازہ کھولا تو اس کا مالک مکان اندر آگیا۔ پچھلے حصے میں وہ اپنی فیملی کے ساتھ رہتا تھا۔ باہر کی طرف اس نے موٹر سائیکلوں کے پنکچر لگانے کی دکان کھول رکھی تھی۔ وہ چالیس پینتالیس سال کا معمولی پڑھا لکھا مگر بھلا مانس تھا۔ تین مہینے پہلے وہ رہنے کی جگہ تلاش کر رہا تھا تو کسی نے اسے یہاں بھیج دیا تھا۔ عامر نے اسے صاف بتا دیا تھا کہ وہ نوکری کی تلاش میں آیا ہے اور کراچی میں کسی کو نہیں جانتا۔ عامر نے اس کے ہر سوال کا جواب سادگی سے دیا تھا اور سچ بولا تھا۔ والد نہیں ہیں، ماں کو پنشن ملتی ہے اور وہ بچوں کو قرآن بھی پڑھاتی ہیں۔ تین مہینے کا کرایہ میرے پاس ہے۔ آپ اسے ایڈوانس سمجھ لیں۔ مزید کرایہ نہ دے سکا تو سامان اٹھا لوں گا۔ اس سے پہلے بھی آپ کو شکایت ہوئی تو چلا جاؤں گا۔ شاید عامر کی یہی سادگی اور صاف گوئی کام آگئی تھی۔ اسے یہ کمرا رہنے کے لیے مل گیا تھا جس میں ایک چارپائی کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ مٹی کے تیل کا ایک چولہا اور چند ضروری برتن ایک کونے میں رکھے ہوئے تھے۔ صبح مالک مکان اندر سے ایک دروازہ آدھے گھنٹے کے لیے کھولتا تھا تو عامر پچھلے حصے کے باتھ روم سے ہاتھ منہ دھو کے اور حوائج ضروری سے فارغ ہو کے باہر نکل جاتا تھا اور پھر سارا دن باہر ہی گزارتا تھا۔

مالک مکان چارپائی کی پٹی پر ٹک گیا۔ "کہو بھئی...... کچھ کام بنا؟"

عامر نے مایوسی سے سر ہلایا۔ "اب تو جی چاہتا ہے کہ

ڈگری کو پھاڑ کے پھینک دوں، اس کی وجہ سے مزدوری بھی کوئی نہیں دیتا۔“

وہ ہنسنے لگا۔ ”اتنا مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔ اس کے ہاں دیر ہے اندھیر نہیں۔“

عامر نے کچھ دیر بعد کہا۔ ”میرا صرف دس دن کا کرایہ رہ گیا ہے، آپ یہی بتانے آئے ہیں نا...... فکر نہ کریں، میں یہی سوچ رہا ہوں کہ واپس چلا جاؤں۔ اب تو کھانے کے پیسے بھی ختم ہو رہے ہیں، ماں سے اور مانگتے ہوئے شرم آتی ہے۔“

”کاروبار میرا ابھی مندا ہے۔ بجلی کے بغیر کچھ بھی نہیں ہوسکتا۔ سب کا حال خراب ہے کیا درزی اور کیا ویلڈر...... سوچتا ہوں کوئی اور کام کرلوں مگر کیا کروں، گھر والی کہتی ہے بریانی لگا لو۔ میں نے کہا کہ نیک بخت، گھر کے چار لوگوں کے لیے پکانا اور بات ہے۔ پانچ کلو کا پتیلا کیسے سنبھالے گی۔ وہ کہتی ہے کہ یہ مجھ پر چھوڑو، تم باہر سے یہ سب ہٹا کے کرسیاں ڈالو یا بینچ، جگہ بناؤ بیٹھنے کی......“

عامر سنتا رہا۔ خود اس کے پاس کہنے کے لیے کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ کسی نوٹس کی بات سننے سے پہلے ہی بتا چکا تھا کہ دس دن پورے ہوتے ہی وہ جگہ خالی کر دے گا۔ خلاف توقع مالک مکان نے جاتے جاتے کہا۔ ”عامر بیٹا، میں تمہیں اپنا دکھڑا سنانے نہیں آیا تھا۔ یہ کہنے آیا تھا کہ کرائے کی وجہ سے خود کو مشکل میں نہ ڈالنا۔ ہمارا گزارا تو ہو ہی رہا ہے۔ تم رہو جب تک تمہارا مسئلہ حل نہ ہو جائے۔ اللہ بڑا کارساز ہے۔“

عامر نے کہا۔ ”آپ کی بڑی مہربانی ہے۔ بڑا احسان ہے۔“

وہ جاتے جاتے دروازے میں رکا۔ ”دن میں تو تم ہوتے نہیں، میں نے گھر میں کہہ دیا ہے صبح چائے پی کے نکلا کرو...... اور رات کا کھانا جو ہم کھاتے ہیں تم بھی کھا لینا۔“

”میں...... یہ نہیں کرسکتا۔“ عامر نے بہ مشکل تمام کہا۔ ”آپ کیوں میرا بوجھ اٹھائیں۔“

”کھانے والے چار سے پانچ ہو جائیں تو برکت اللہ دیتا ہے، بوجھ کوئی نہیں پڑتا۔“

دوپہر سے پہلے وہ پارک پہنچا تو وہاں تاج پہلے سے موجود تھا۔ نوکری کے چکر میں عامر کو وہی سب سے پہلے ملا تھا۔ اسی نے پرنس سے ملوایا تھا اور مولا داد ایک دن خود ان کے پاس آ بیٹھا تھا جب وہ ایک فٹ پاتھ پر بیٹھے چائے کے ساتھ پاپے کھا رہے تھے۔ وہ سب متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والے لوگ تھے جو، اب غریب شمار ہونے لگے تھے۔ ان میں قدر مشترک بے روزگاری تھی، کیونکہ عامر کی طرح وہ پہلے ماں باپ کے مجبور کرنے پر دل لگا کے پڑھتے رہے۔ اب وہ کہتے تھے کہ کما کے لاؤ تو ان کا یہ مطالبہ پورا کرنے سے قاصر تھے۔

تاج اس کی بات سن کر سوچ میں پڑ گیا۔ ”اس پنکچر لگانے والے لینڈ لارڈ کی کوئی جوان بیٹی ضرور ہوگی، غیر شادی شدہ......“

”ہوگی...... مجھے نہیں معلوم......“

”اس کے لیے رشتہ بھی اچھا نہیں آیا ہوگا۔ کیونکہ وہ شکل و صورت میں بھی معمولی ہوگی اور تعلیم میں بھی۔ خاندان کے قابل لڑکے اسے پہلے ہی مسترد کر چکے ہوں گے۔“ تاج بینچ پر لیٹ گیا۔

عامر سمجھ گیا۔ ”اب اچانک اس کی نظر نے مجھے کرایہ دار کے بجائے داماد کے روپ میں دیکھنا شروع کر دیا ہے۔ یہی مطلب ہے تیرا؟“

”اس مہربانی کا اور کیا مطلب نکالا جاسکتا ہے پتر...... اس کی نظر ذرا دور کے مستقبل کو دیکھ رہی ہوگی۔ آخر تو ایم ایس سی ہے، کبھی نہ کبھی برسر روزگار ہوگا اور تب تک اس کی دختر نیک اختر نے تجھے دام الفت میں گرفتار کرلیا تو تیرے جیسے داماد پر اس کا سر فخر سے کتنا بلند ہوگا۔“

”میں اس جال میں پھنسنے والی مچھلی نہیں ہوں۔ فکر مت کر۔“

تاج ہنسا۔ ”اب مت کر ایسے دعوے...... جال نہیں بلاتے مچھلی کو، شامت اعمال بلاتی ہے۔“

تاج کی بات میں عامر کو خاصا وزن محسوس ہوا۔ ”دس دن پورے ہونے سے پہلے ہی میں واپس چلا جاؤں گا، ماں بلا رہی ہے، اس نے کوئی نیا چکر چلایا ہے۔“

تاج اٹھ بیٹھا۔ ”یار ایک گر کی بات بتاؤں۔ اپنی ماں سے کہہ کہ تیرا سودا کرلے، پرنس کی طرح...... اس نے تو ان ون والی ڈیل کی، لڑکی والوں نے نوکری بھی دلا دی۔“

”تو خود یہ کام کیوں نہیں کرتا؟“

”میری ماں نہیں مانتی یار...... اس نے مجھے ہوش سنبھالنے سے پہلے ہی ٹھکانے لگا دیا تھا۔ اپنی بہن کی بیٹی کے سر منڈھ دیا تھا مجھے، خیر...... لڑکی وہ بری نہیں بلکہ اس کے مقابلے میں برا خود میں ہوں۔ آج کل تو لڑکے صاف کہتے ہیں کہ باہر سیٹل کرادو، بزنس کرادو۔“

”حیرت ہے...... میں نہیں کرسکتا یہ سب...... ایک بڑی امید تھی، اب وہ بھی نہیں رہی۔“ عامر نے شاہ جی سے ملاقات نہ ہونے پر اپنی مایوسی کا ذکر کیا۔

تاج نے کہا۔ ”بڑی اونچی چیز ہے یہ تیرا شاہ جی...... ان کا پتا چلانا مشکل نہیں ہونا چاہیے۔“

تاج کے ساتھ عامر دوبارہ سینٹرل جیل گیا۔ سنتری نے اسے پہچان لیا۔ ”تم پھر آ گئے؟“

تاج نے ڈراما کیا۔ اس نے سنتری کے گھٹنے پکڑ لیے۔ ”آپ کسی طرح معلوم کر کے بتادو ہمیں...... جیل کے اندر کوئی ضرور جانتا ہوگا شاہ جی کے بارے میں، تم بے شک اخبار رکھ لو۔ اور یہ بھی۔“ اس نے ہزار کا نوٹ سنتری کی بند مٹھی میں دبا دیا۔ ”پتا کردو گے تو ہم اور خدمت کریں گے۔“

سنتری نے سر ہلا کے رضامندی کا اقرار کیا۔ ”دو چار دن بعد آنا۔“

چار دن بعد وہ پھر اس کے سامنے تھے۔ ”جناب عالی، کچھ ہوا......؟“

سنتری نے سر ہلایا۔ ”ایک بندہ ہے، کہتا ہے اپنا نام اور فون نمبر دے دو، وہ شاہ جی کو بتا دے گا۔ آگے شاہ جی کی مرضی، بات کرے نہ کرے۔“

اس کی بات کا یقین نہ کرنے کے باوجود عامر نے ایک کاغذ کے پرزے پر اپنا نام اور موبائل فون نمبر لکھ کر سنتری کو تھما دیا۔ واپسی پر وہ اتنا ہی مایوس تھا۔ تاج بھی اس سے متفق نظر آتا تھا کہ ہزار گئے...... خیر...... کوشش کرنا ان کا کام تھا۔

تیسرے دن ماں کا فون پھر آ گیا۔ ”کب آ رہا ہے تو؟ چھوڑ نوکری کا چکر...... میں کب تک ٹالوں لڑکی والوں کو......“

”آخر مسئلہ کیا ہے ان کا؟ لڑکی بدشکل یا معذور ہے...... یا بدنام ہے اتنی......“

”بکواس مت کر۔ کسی کی بیٹی کے بارے میں ایسا کہتے شرم نہیں آتی۔ تیری اپنی کوئی بہن نہیں ہے نا......“ ماں اور رونے پر آ گئی۔ ”اپنی ماں کو ایسا سمجھتا ہے تو...... ایسی بولائے گی وہ......“

”اچھا ماں، معاف کر دے مجھے، پرسوں شام لڑکی والے مجھے دیکھ لیں۔ انہیں منظور ہوگا تو میری طرف سے ہاں سمجھو۔ لڑکی تو نے پسند کرلی ہے تو مجھے دیکھنی بھی نہیں۔“ اس نے فون بند کر دیا۔

اسی دن شام کو اس نے مایوس مالک مکان کو الوداع کہا اور ٹرین میں بیٹھ گیا۔ اپنی ہر کوشش میں ناکام ہو جانے کے بعد اس نے خود کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دیا تھا۔ لیکن اب وہ اپنی کیمسٹری میں ماسٹرز کی ڈگری کو اپنے عزائم کی راہ میں رکاوٹ سمجھنے لگا تھا۔ اگر مقصد کمانا ہی ہو تو جائز طریقے سے ہی وہ اپنی عقل اور صلاحیت کو استعمال کر کے کامیاب ہوسکتا ہے۔ سیلز یا مارکیٹنگ کے علاوہ اور بہت سے بزنس کرنے کے لیے کسی سرمائے کی ضرورت نہیں مثلاً وہ پراپرٹی ڈیلر یا کار ڈیلر بن کے دوسروں کے گھر اور گاڑیاں بیچ کے یا کرائے پر اٹھا کے اپنا کمیشن لے سکتا ہے جو یقیناً حق محنت ہوتا ہے۔

ماں کی باتوں نے اسے مزید حوصلہ دیا۔ ”بس اب نوکری کے لیے بھٹکنا چھوڑ۔ عمر نکلی چلی جا رہی ہے، کام کرنے کے بہت ہیں۔“

”تو نے بالکل ٹھیک کہا ماں۔ ابا صاحب مجھے ڈاکٹر نہ بنا سکے، ایم ایس سی فزیکل کیمسٹری میرے کسی کام نہ آئی، اب میں بریانی بیچوں گا۔ جیسی بریانی تو پکاتی ہے۔“

ماں ہنس پڑی۔ ”باؤلا ہوا ہے لڑکے، کوئی ضرورت نہیں تجھے ایسے گھٹیا کام کرنے کی۔“

”کام کوئی گھٹیا نہیں ہوتا ماں۔ محنت میں عظمت ہے۔ کتابوں میں لکھا ہے۔“

”تیرے لیے اللہ نے اچھا بندوبست کر دیا ہے۔ یہ جو لڑکی والے ہیں، مگر پہلے تو تصویر دیکھ لے لڑکی تجھے پسند نہ آئے تو یہ بات یہیں ختم......“ وہ اٹھی ہی تھی کہ بجلی چلی گئی۔

”چھوڑ تصویر کو...... تو نے پسند کرلی، کافی ہے۔“

ماں پھر بیٹھ گئی۔ ”میں نے بتایا تھا کہ ان کا بزنس ہے۔ بڑے سمجھدار شریف لوگ ہیں۔ تجھے اپنے ساتھ کاروبار میں شریک کرنا چاہتے ہیں۔ ملازم کی حیثیت سے نہیں، تو مالک ہوگا۔“

”بر خرید رہے ہیں نا، اور کوئی کاٹھ کا الو نہیں ملا ہوگا۔“

”پھر وہی بکواس، ارے کیا کمی ہے تجھ میں...... ان کی لڑکی بی اے پاس ہے تو تیرے پاس ایم ایس سی کی ڈگری ہے، صورت شکل، صحت، خاندانی شرافت، سب کچھ مل رہا ہے انہیں...... کہیں بھی فخر سے پیش کرسکتے ہیں اپنے داماد کو، ویسے تو بہت ہوں گے رشتے مانگنے والے...... ان پڑھ یا کم حیثیت، پھر ہم بھی اہل سادات ہیں اور رہنے والے تو ادھر کے ہیں مگر دلی سے آئے تھے۔“

عامر کی ملاقات پہلے لڑکی کے بڑے بھائی سے ہوئی۔ اس نے کہلوایا تھا کہ عامر برا محسوس نہ کرے تو اس

سے دکان پر مل لے۔ موبائل فون کی مارکیٹ دوپہر سے پہلے نہیں کھلتی تھی مگر شام تک وہ فارغ ہی ہوتا تھا۔ کام کارش شام سے آدھی رات تک رہتا تھا۔ عامر اس کے پاس بارہ بجے پہنچ گیا۔

دکان ایک موبائل پلازا میں فرنٹ پر تھی اور دوسری کیبن جیسی دکانوں کے مقابلے میں کشادہ بھی...... وہ ایک خوش اخلاق اور اسمارٹ لڑکا تھا۔ کاروبار کی نوعیت نے اسے تیز طرار اور تجربہ کار بنا دیا تھا۔ اس نے چھوٹی سی میز کے سامنے دوسری کرسی پر عامر کو بٹھا دیا اور دکان کی صفائی میں مصروف لڑکے کو چائے لینے بھیج دیا۔ عامر ہر طرف الماریوں میں سجے رنگ برنگے موبائل فونز کو دیکھتا رہا۔

''کھانے میں ابھی دیر ہے، چائے پی لیتے ہیں پہلے......'' وہ بولا۔ ''میرا نام شاہد ہے۔''

عامر نے رسمی تکلف کا مظاہرہ کیا۔ ''شاہد صاحب...... کسی تکلف میں مت پڑیں۔''

''تکلف میں تو تم پڑ گئے ہو، شاہد صاحب کہہ کے...... شاہد کافی ہے۔''

''دکان تو تمہاری موقعے کی جگہ پر ہے، اچھی چلتی ہوگی؟'' عامر نے گفتگو کا آغاز کیا۔

''سیدھی صاف بات ہے عامر...... خود مجھ میں تو کوئی ایسی صلاحیت تھی نہیں...... بی اے کرلیا روپیٹ کر کے ان پڑھ نہ کہلائیں، پھر والد صاحب نے یہاں بٹھا دیا تو ہم بیٹھ گئے۔''

''وہ شروع سے بزنس مین ہیں؟......''

''ہاں...... مگر بزنس شروع سے یہ نہیں تھا۔ انہوں نے بہت پاپڑ بیلے ہیں، ایک زمانے میں بیچ بیچ...... وہ بتاتے ہیں کہ اماں گھر میں بناتی تھیں اور تل کے دیتی تھیں، وہ پارکوں اور باغوں میں گھوم پھر کر بیچتے تھے، یہ بہت بڑی بات ہے۔ اس کے بعد بہت سے کام کیے۔ انہی کی محنت کے طفیل آج ہم یہاں بیٹھے ہیں۔'' شاہد نے کہا۔

''یہ تو ہے...... ہم اپنے والد کی جگہ نہیں لے سکے۔ وہ سرکاری ملازم تھے۔''

''اب آتی ہے سمجھ کہ نوکری شاید ہم کر بھی نہیں سکتے تھے۔ لو چائے پیو...... کام اپنا ہی اچھا، محنت کرو زیادہ تو کمالو زیادہ...... ورنہ وہی لگی بندھی تنخواہ......''

عامر نے کہا۔ ''سوائے چند ایک کے وہاں سب خدا من فضل ربی ہے......''

شاہد ہنسا۔ ''وہ میرے تمہارے جیسے لوگوں کے نصیب میں کہاں...... ہم دل کو خوش کرتے ہیں کہ حق حلال کی کما کے کھا رہے ہیں، تم کراچی گئے تھے ٹیچر بننے......''

''میں اور کچھ بن جو نہیں سکتا تھا۔''

''اتنا مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔ ہر کام کے لیے ایک وقت مقرر ہے۔ آدمی کوشش کرتا رہے۔''

ظاہر ہے یہ سب رسمی باتیں تھیں۔ دکان پر بلانے کا اصل مقصد یہ دیکھنا تھا کہ بندہ گھر میں بلانے کے قابل ہے یا نہیں جیسے میڈیکل کالجوں میں داخلے سے پہلے ایک ٹیسٹ ہوتا ہے خواہ آپ کے نمبر کچھ بھی ہوں...... ڈگری کا سب کو علم تھا۔ وہ عامر کی شکل دیکھنا چاہتے تھے اور کچھ طور طریقے...... عامر نے کھانے سے انکار کیا تو اسے رات کو گھر پر کھانے کی دعوت دے دی گئی۔ عرف عام میں اس کو بردکھوا کہا جاتا تھا...... رات کو ہونے والے ساس سسر اور دیگر ممبران فیملی...... سالی یا بہنوئی وغیرہ پر مشتمل پورے بورڈ کو اس کا معائنہ کرنا تھا۔

ماں بہت خوش تھی اور عامر نے بھی تہیہ کرلیا تھا کہ اب صرف ماں کی خوشی مقدم ہوگی۔ لڑکی جیسی بھی ہو چلے گی۔ دو چار سال میں ایشور یا رائے بھی بن جاتی ہے، دو من کی دھوبن...... اور زندگی کٹنے کو سب کی اچھی گزر جاتی ہے...... ماں کے تو ہاتھ پاؤں پھول گئے تھے۔ اسے شاید امید نہیں تھی کہ انہیں اتنے شارٹ نوٹس پر بلا لیا جائے گا۔

ان کے اپنے گھر کے مقابلے میں یقیناً وہ عالی شان کوٹھی تھی لیکن کوئی محل نہیں تھا جہاں دربان اور خدام دست بستہ ہوں۔ کوٹھی کے انداز آرائش سے بھی خوشحالی عیاں تھی۔ شاہد سے عامر کی ملاقات پہلے ہی ہو چکی تھی۔ والدین کے علاوہ کھانے کی میز پر اس کے بہن بہنوئی بھی تھے۔ اور بس...... کھانے کے دوران کوئی خاص کام کی بات نہیں ہوئی...... کھانے کے بعد مردوں کا ڈرائنگ روم میں کافی سیشن ہوا تو لڑکی کے باپ نے چیف سیکریٹری کا رول سنبھال لیا۔

''سید عامر علی شاہ...... کتنا عرصہ ہوگیا آپ کو ایم ایس سی کیے......؟''

عامر نے سوچ کے کہا۔ ''تقریباً ایک سال دس مہینے پہلے رزلٹ آیا تھا۔''

''اور تب سے آپ لیکچرر بننے کی کوشش کر رہے ہو......؟''

''جی...... صرف کوشش...... کم سے کم دو درجن انٹرویو دیے ہیں مختلف پرائیویٹ کالجوں میں، لیکن کبھی انہوں نے مجھے مسترد کر دیا یا کبھی میں نے انہیں...... میں کی لینٹی کہنے کا قائل نہیں، ابا کی خواہش تھی کہ میں ڈاکٹر بنوں، لیکن تھرڈ ڈویژن کے بعد مجھے بی ایس سی میں بھی داخلہ مشکل سے ملا...... کیمسٹری سے مجھے کوئی دلچسپی نہ تھی، نہ ہے...... یہ بھی ابا کی خواہش پر میں نے پڑھ لی، لیکن اب اندازہ ہو رہا ہے کہ فزیکل کیمسٹری اتنا ہی بے مصرف مضمون ہے جتنا اب اردو یا تاریخ کو سمجھا جاتا ہے۔''

سسر محترم مسکرائے۔ ''اگر کچھ اور بننا چاہتے تم تو کیا کرتے؟''

عامر نے وہی جواب دیا جو سچ تھا۔ ''میں انتظامی نوعیت کا کوئی کام کرتا، میرا خیال ہے کہ میں اچھی پلاننگ کرسکتا ہوں، پی آر اچھی ہے میری...... جھوٹ سے نفرت ہے اور بے ایمانی فطرت میں نہیں۔''

اس کے متوقع سسر مسکرانے لگے۔ ''یہ تو خیر اچھی بات ہے، لیکن انتظامی صلاحیت کا اندازہ کیسے کیا تم نے......؟''

عامر شپٹا گیا۔ ''کالج میں کچھ فنکشن کیے تھے، خاندان میں کوئی تقریب ہو تو انتظام میرے سپرد کر دیا جاتا ہے، مثلاً پکنک، کسی کی شادی کے انتظامات......''

شاہد اور اس کے ابا نے ایک دوسرے کی طرف جن نظروں سے دیکھا ان میں حیرانی سے زیادہ سوال تھا کہ یہ لطیفہ تمہاری سمجھ میں آیا؟ مگر انہوں نے مروت اور لحاظ سے کام لیا۔ ''بہت خوب...... اب فرض کرو ہم اپنے کاروبار کا کچھ حصہ تمہیں سونپ دیں، تو تم اسے چلا لوگے؟ دیکھو نا اب یہ ضروری ہے کہ تم اپنے پیروں پر کھڑے ہو جاؤ۔''

''ایسا تو میں بھی چاہتا ہوں لیکن......''

سسر نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''یہ تمہیں اچھا نہیں لگے گا کہ ہم تمہاری ذمے داری قبول کرلیں اور نبھاتے رہیں۔ آخر اپنا گھر خود تمہیں ہی چلانا چاہیے، آزادانہ طور پر......''

عامر سمجھ گیا کہ وہ کیا نہیں کہنا چاہتے۔ ان کا مطلب تھا کہ گھر داماد تو تم بنو گے نہیں۔ اس نے بڑی ہوشیاری سے پوچھا۔ ''اس سلسلے میں آپ میرے لیے کیا کرنا چاہتے ہیں۔ کھل کر بات کریں، میں برا نہیں مانوں گا۔''

سسر صاحب کے چہرے پر اطمینان جھلکنے لگا۔ ''بھئی عامر...... اس رشتے پر تو ہمیں کوئی اعتراض ہے نہیں ورنہ ہم تمہیں بلاتے ہی کیوں، نہ ہم تمہیں ملازمت دے سکتے ہیں اور نہ گھر داماد رکھ سکتے ہیں۔ تمہارے ساتھ اس میں ہمارے لیے بھی سبکی ہے، لوگ سو باتیں بنائیں گے کہ بیٹی کے لیے کوئی نہیں ملا تو...... خیر ہم اپنی بیٹی کو خالی ہاتھ تو رخصت کریں گے نہیں، دس بیس لاکھ لگ ہی جاتے ہیں بیٹی کے جہیز میں......''

''مجھے کسی جہیز کی ضرورت نہیں۔''

''ہم نے بھی سوچا ہے کہ جہیز کی رقم سے تمہیں ایک موقع فراہم کریں کاروبار کے لیے...... پہلے ہماری بات سن لو، ہم ویسے بھی کاروبار کو بڑھانے کا سوچ رہے تھے، میرا خیال تھا کہ شاہد چلا جائے کراچی، یہاں اس کا بڑا بہنوئی میری مدد کرے۔ اب اس نے معذرت کرلی ہے کیونکہ اس کا ارادہ ہے امریکا یا کینیڈا جانے کا، کیا یہ ہوسکتا ہے کہ شاہد کی جگہ تم کراچی چلے جاؤ، اپنی انتظامی صلاحیت کو عملی طور پر آزما کے دیکھو۔''

عامر نے سنبھل کر کہا۔ ''کراچی...... لیکن میری امی یہاں اکیلی ہیں...... اور پھر مجھے کوئی تجربہ نہیں۔''

''اس کام میں تجربے کی کوئی خاص ضرورت نہیں۔'' اب شاہد نے بات بڑھائی۔ ''دس دن میرے ساتھ دکان پر صرف دیکھو...... سب سمجھ میں آجائے گا کہ موبائل فون کیسے بیچے، خریدے اور ایکس چینج کیے جاتے ہیں، کراچی میں رسک کچھ زیادہ ہے، وہاں موبائل چھینے بہت جاتے ہیں اور خریدتے وقت ذرا......''

سسر نے بیٹے کی بات اچک لی۔ ''چلو شاہد کو ابھی

شہر بے مثال

از: بانو قدسیہ

ایک پستہ قامت خاتون اپنے قد سے احساس کمتری میں مبتلا ہوگئی۔ وہ اکثر تقریبوں میں شرکت سے کتراتی تھی لیکن ایک بار ایک تقریب میں شامل ہونا ہی پڑ گیا۔ تقریب میں شرکت سے پہلے اپنے قد کو بڑھانے کی یہ ترکیب سوجھی کہ اول تو بال اس طرح بنوائے کہ سر پر ایک کوہان بن گئی دوسرے سینڈل ایسی پہنیں جن کی ایڑی بہت اونچی تھی، جب وہ شان سے اکڑتی ہوئی مجلس میں داخل ہوئی تو ایک شریر لڑکی نے ان پر زوردار پھبتی کسی۔ ''واہ محترمہ! آج آپ نے اپنی کوتاہ قامتی دور کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا ہے۔''

جانے دو کراچی۔ تم یہاں کا بزنس سنبھالو۔ میں تو ڈیل کرتا ہوں الیکٹرانکس میں، یہاں کے معاملات شاہد سے سمجھ لو۔"
عامر چکرا گیا۔ "میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ اس کاروبار میں میری حیثیت کیا ہوگی؟"
"ایک پارٹنر کی۔ یہ آپس کی بات ہے، ہم طے کرلیں گے...... کراچی میں یہ ہوتا کہ تم خودمختار رہتے اور کسی کو شک بھی نہ ہوتا، بزنس تمہارا ہی کہلائے گا...... اور ہوگا۔"
شاہد نے کہا۔ "سب کام سیٹ ہے، تم کو نقصان سے ڈرنے کی بھی ضرورت نہیں اور کہو تو میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں کراچی...... ابھی تو ویزا لگنے تک یہ ہیں یہاں۔" اس نے بہنوئی کی طرف اشارہ کیا جو ابھی تک خاموشی سے سب سن رہا تھا۔ "ان کے جانے سے پہلے میں سب کچھ تمہیں سونپ کے واپس آجاؤں گا۔"
"یہ خود کیا کرتے ہیں یہاں......؟" عامر نے پوچھا۔
"یہ اسی بزنس میں ہیں، امریکا میں بھی یہی کام کریں گے...... ہمارے لیے بھی اور اپنے لیے بھی......"
خاموشی کا ایک مختصر وقفہ آیا۔ عامر نے سمجھ لیا تھا کہ اپنے پہلے داماد کو بھی خود انہوں نے اپنے پیروں پر کھڑا کیا تھا، بالکل اسی طریقے سے...... اور آج وہ اس قابل ہوچکا تھا کہ امریکا جاکے اپنا کاروبار سیٹ کرسکے۔ یہ پریکٹیکل اور باعزت طریقہ تھا مگر عامر نے فوراً اقرار کرلینا مناسب نہ سمجھا۔
"آپ مجھے سوچنے کے لیے کچھ وقت دیں گے؟" عامر نے کہا۔
"کیوں نہیں، آخر یہ تمہاری زندگی کا فیصلہ ہے۔" سسر محترم نے خوش دلی سے کہا۔
واپس گھر آکے اس نے ماں سے پوچھا۔ "تمہیں معلوم تھا یہ سب؟"
"انہوں نے پوچھا تھا اگر ہم جہیز نہ دیں، لڑکے کو کاروبار کرادیں۔ شادی بعد میں ہوجائے گی۔ تو میں نے کہا کہ مجھے تو اس میں کوئی خرابی نظر نہیں آتی مگر عامر خود بتائے گا۔"
"اور میں انکار کردوں تو پھر......؟"
"تو کیا...... بات یہیں ختم ہوجائے گی، ابھی تک کسی کو کچھ نہیں بتایا میں نے اور نہ انہوں نے۔"
"بات میری سمجھ میں نہیں آرہی ہے ماں...... مجھے ہضم نہیں ہورہی۔"
"کیوں اپنے ساتھ میرا بھی دماغ خراب کررہا ہے۔ ایسی بھلا کون سی بات ہے۔"

"لیکن بیس لاکھ کے بزنس کا وہ مجھے مالک بنارہے ہیں شادی سے پہلے...... دوسرے شہر میں...... یہ کوئی معمولی رقم نہیں ہے، جب تک کوئی ضامن نہ بنے۔ یہ لون بھی نہیں ہے۔"
"انہیں اعتبار ہے ہم پر......"
"کیوں ہے...... ہماری اور ان کی نہ رشتے داری ہے نہ جان پہچان...... اور وہ مجھے بیس لاکھ کے بزنس کا مالک بنارہے ہیں۔"
ماں نے کچھ لاجواب ہوکے کہا۔ "وہ کسی امید پر کررہے ہیں یہ سب۔"
"یعنی وہ جوا کھیل رہے ہیں، ہر جواری اسی امید پر جوا کھیلتا ہے کہ وہی جیتے گا۔ اگر ایسا نہ ہوا تو یہ لوگ کیا کریں گے؟ میں انکار کردوں شادی سے...... وہاں کسی اور کے چکر میں پڑجاؤں...... پر......؟"
ماں چلائی۔ "کیوں سوچ رہا ہے ابھی سے تو ایسی باتیں...... کیا تیرے دل میں بے ایمانی ہے، ان کے بھروسے کو بے وقوفی سمجھتا ہے تو، جوا کہتا ہے، شرم نہیں آتی تجھے......"
عامر چپ چاپ اسے دیکھتا رہا۔ "میں جانتا ہوں کہ کسی کو دھوکا دینا آسان نہیں۔ انہیں مجھ سے زیادہ خود پر اعتماد ہوگا کہ ہونے والے داماد صاحب کی نیت میں فتور آیا خدانخواستہ...... تو اس کا دماغ کیسے درست کیا جائے گا۔ اتنی آسانی سے کوئی دھوکا نہیں کھاتا۔ وہ آپس میں ڈسکس کرچکے ہوں گے کہ اپنی بیس لاکھ کی انوسٹمنٹ کو محفوظ کیسے کیا جائے...... لیکن ان کی جگہ میں ہوتا تو یہ سب کرنے کے بجائے آسان راستہ اختیار کرتا، میں کہتا کہ برخوردار پہلے عقد پھر نقد......"
"تو سوچتا رہ...... مجھے تو اب نیند آرہی ہے، میرا دماغ مت خراب کر، پاگل وہ نہیں تو ہے، یہ سب وہاں کیوں نہیں بولا۔" وہ بڑبڑاتی ہوئی چادر میں منہ لپیٹ کر پڑگئی۔
آدھی رات کے بعد عامر کی آنکھ فون کی گھنٹی سے کھلی۔ حسب عادت اس نے پہلے اپنی کلائی کی گھڑی دیکھی اور پھر سوچا کہ اتنی رات گئے اسے فون کرنے والا کون ہوسکتا ہے۔ اندھیرے میں موبائل فون کی ٹیلکوں روشن اسکرین پر دکھائی دینے والا نمبر اس کے لیے اجنبی تھا اور یہ شاید کراچی سے کی جانے والی کال تھی۔
اس نے رانگ نمبر کے امکانات کو ذہن میں رکھنے کے باوجود ہیلو کہہ دیا۔

دوسری طرف سے کسی نے کہا۔ "معاف کرنا یار، میں نے تجھے سوتے سے جگادیا۔"
عامر کو جیسے چار سو چالیس وولٹ کا کرنٹ لگ گیا۔ وہ ایک دم اٹھ بیٹھا۔ "شاہ جی......"
"پہچان لیا تو نے......؟"
"میرا نمبر پہنچ گیا تم تک، قسم خدا کی مجھے امید نہیں تھی۔ میں نے تو صبر کرلیا تھا کہ میرے ہزار گئے۔"
"ہزار...... کیسے ہزار......؟"
"یار میں نے بہت تلاش کیا تجھے...... میں سینٹرل جیل بھی گیا تھا۔" عامر نے کمرے کا دروازہ بند کرکے لائٹ جلالی۔
"مجھے پتا چلا تھا کہ تو کراچی میں ہے، مگر میں ملنے کے لیے آ نہیں سکتا تھا۔"
"وہاں میں تین مہینے رہا، نوکری تلاش کرنے گیا تھا لیکن کام نہیں بنا کہیں بھی تو لوٹ آیا۔ تم بتاؤ کہاں ہو آج کل......"
"یار فقیروں کا کوئی ایک ٹھکانا کہاں، تقدیر جہاں لے جائے......" شاہ جی کی آواز میں عامر کو عجیب سی مایوسی اور شکستگی محسوس ہوئی۔
"شاہ جی...... میں ملنا چاہتا ہوں تم سے...... مجھے تو پتا چلا تھا کہ تم باہر نکل گئے ہو۔"
وہ ہنسا۔ "ابے یار اندر باہر کا سلسلہ تو چلتا رہتا ہے۔ یہ بتا تیرا کام تو ہوگیا نا۔"
"کہاں شاہ جی۔ جھک مار کے واپس آگیا لاہور، اب تو دل چاہتا ہے یہ ڈگری پھاڑ کے پھینک دوں، اتنا وقت اور پیسا برباد کیا بلاوجہ......"
"چھوڑ عامر...... کیا کرتا تو دس بیس ہزار کی نوکری کرکے۔ وہ وقت گئے جب استاد کی کم سے کم عزت تو تھی، اب عزت کا معیار کچھ اور ہے پتر...... تو بزنس میں محنت کرے گا تو کامیاب رہے گا۔ محنت کی عادت ہے تجھے اور تو ایماندار ہے، یہ کام بھی مشکل نہیں، تو ہر کام کرسکتا ہے ویسے تو......"
"شاہ جی...... یہ تمہیں کیسے معلوم......؟"
"ابے ہمیں معلوم نہیں ہوگا تو اب کسے معلوم ہوگا۔ تو محنت سے نمبر لیتا تھا۔ بے ایمانی سے ہم لیتے تھے، تو پڑھنے میں دن رات ایک کردیتا تھا اور پھر اپنے علم کے خزانے میں سے ہمیں بھی دیتا تھا۔ کسی غرض کے بغیر ہمارے لیے بھی سوچتا تھا کہ کامیاب ہوجائیں۔ ہمارے نمبر تجھ سے زیادہ ہوجاتے تو حسد نہیں کرتا تھا، اگلی مرتبہ پھر ہمیں نقل کرانے کا خطرہ بھی مول لیتا تھا۔ دنیا میں ایک تو ہی اپنا خیر خواہ اور دوست تھا۔"
"احسان ہمیشہ تم نے کیے مجھ پر......"
"پیسے کی بات مت کرنا۔ وہ ہاتھ کا میل ہوتا ہے جانی......" وہ پھر ہنسا اور ایک بار پھر عامر کو یہ ہنسی بہت کھوکھلی اور دکھ دینے والی محسوس ہوئی۔ "اپنے کام تو آیا نہیں، وقت گزر گیا ایسے ہی۔"
"شاہ جی...... تم نے بتایا نہیں کہ کہاں ہو، یہ نمبر تو کراچی کا ہے۔"
"کراچی سے نمبر لے کر کوئی جہاں چاہے چلا جائے۔ یہ دنیا بہت چھوٹی جگہ ہے پتر...... ہم ضرور ملیں گے کبھی، اگر اس زندگی نے مہلت دی۔" فون کی لائن ایک دم کٹ گئی۔ وہ چلاتا رہ گیا۔ "شاہ جی...... شاہ جی......" پھر اس نے خود اسکرین پر آنے والا نمبر ملایا۔ دوسری طرف سے بار بار ایک ہی ٹیپ چلتا رہا آپ کے مطلوبہ نمبر سے جواب موصول نہیں ہورہا ہے۔ عامر صبح تک وہیں بیٹھا رہا۔ شاہ جی کی کال نے اسے سخت ڈسٹرب کیا تھا۔ خصوصاً اس کی بزنس والی بات نے، اسے کیسے اندازہ ہوا کہ اب وہ نوکری سے مایوس ہوکے بزنس کی سوچ رہا ہے۔
اب اس کے ذہن میں ایک نئی الجھن پیدا ہورہی تھی۔ شاہ جی کی آواز میں ایک دکھ تھا اور مایوسی تھی۔ ایک پر آسیب اداسی جو شاہ جی کے پرعزم، زندگی سے چمکتے اور حوصلہ دینے والے رویے کے برعکس تھی۔ یہ صرف اس کے احساس کا فریب نہیں ہوسکتا تھا۔ اس کے اندر کے ایک آواز اسے خبر دے رہی تھی کہ کہیں کچھ غلط ہے جو شاہ جی نے اس سے چھپایا مگر چھپ نہ سکا۔ اس نے کیوں کہا تھا کہ زندگی نے مہلت دی تو پھر ملیں گے۔ دوپہر تک وہ شاہ جی سے رابطے کی ناکام کوشش میں مصروف رہا مگر اسے وہی ٹیپ کیا ہوا جواب ملتا رہا۔ آپ کے ملائے ہوئے نمبر سے فی الحال رابطہ ممکن نہیں۔ ایک بار بھی اس آواز نے رابطہ ناممکن ہونے کی کوئی وجہ نہیں بتائی۔ اس نے بہتر یہی سمجھا کہ اپنے ہونے والے سالے سے مدد لے۔
شاہد ابھی دکان پر پہنچا نہیں تھا۔ صفائی میں مصروف ملازم نے اسے پہچان کے کرسی پیش کی۔ "وہ آتے ہی ہوں گے، میں آپ کے لیے چائے لاتا ہوں، آپ تشریف رکھیں۔"
عامر نے اسے منع کردیا اور دکان کا جائزہ لیتا رہا۔ اس کے سامنے اور دیواروں پر شیشہ لگی الماریوں کے پیچھے ہر کمپنی کے موبائل فون کا ہر ماڈل موجود تھا۔ رنگ برنگے ڈبے سجے

ہوئے تھے اور نئے متعارف کرائے جانے والے فونز کے دلکش پوسٹرز نظر آرہے تھے۔ موبائل فون ایک ایجاد ہی نہیں بلکہ یہ ایک زبردست سماجی اور معاشی انقلاب تھا۔ فون کے ساتھ استعمال ہونے والی ان گنت چیزیں مارکیٹ میں آگئی تھیں۔ لاکھوں لوگ اس کاروبار سے وابستہ تھے اور اس نے محض رابطے کا ذریعہ فراہم نہیں کیا تھا۔ پرانی اخلاقی قدروں کے ڈھانچے کو بھی بلڈوز کر دیا تھا۔ اب وہ خود یہ وہ کام کرے گا جس کے لیے تعلیم کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ جو میٹرک فیل لڑکے بھی کررہے تھے۔

شاہد نے اس کے خیالات کی بہکتی رو کو بریک لگائے۔ ”عامر بھائی، آپ...... خیریت تو ہے؟“

عامر کو یوں لگا جیسے شاہد کے لہجے میں حیرانی یا خوشی سے زیادہ تمسخر ہے۔ وہ اسے کہہ نہیں سکا کہ واہ بیٹا، مارے خوشی کے رات بھر نیند نہیں آئی اور آتی بھی کیسے...... چپڑی اور دو دو مل رہی ہیں کچھ کیے بغیر...... ایک قسمت کی لاٹری کے دو انعام بھلا کس کے نکلتے ہیں کہ بڑے گھر کی لڑکی بھی مل گئی اور بڑے بزنس مین بھی بن گئے۔

شاہد نے اس کی پریشانی کو صورت سے بھانپ لیا۔ اس نے پھر پوچھا۔ ”سب ٹھیک ہے نا عامر بھائی؟“

عامر چونکا۔ ”نہیں...... میرا مطلب ہے ہاں...... وہ دراصل ایک بات پوچھنی تھی تم سے......“

”جی...... کہیے......“

”دیکھو...... ایک موبائل فون نمبر سے کل رات مجھے ایک بہت پرانے دوست نے کال کی تھی لیکن اس سے پہلے کہ وہ اپنے بارے میں کچھ بتاتا، لائن کٹ گئی اور اس کے بعد سے میں مسلسل کوشش کررہا ہوں مگر نمبر نہیں مل رہا ہے۔ مجھے ایسا لگا کہ میرا وہ دوست کچھ پریشان ہے۔ میں اس کی پریشانی معلوم کرنا چاہتا تھا...... یہ نمبر تو کراچی کا ہے، مجھے بتاؤ نمبر سے مجھے اس کا ایڈریس معلوم کرنا ہو تو میں کیا کروں؟“

شاہد نے نمبر ایک کاغذ کے پرزے پر لکھ لیا۔ ”عامر بھائی، سم اس کے نام پر رجسٹرڈ ہوگی تو نام پتا سب معلوم ہوجائے گا لیکن آپ تو جانتے ہیں یہاں کوئی کام قاعدے قانون کے مطابق تو ہوتا نہیں، خیر میں کوشش کرتا ہوں۔“

عامر نے کہا۔ ”پتا معلوم ہوجائے تو میں آج ہی کراچی چلا جاؤں۔“

عامر خاموشی سے چائے پیتے ہوئے شاہد کو دیکھتا رہا۔ وہ لیپ ٹاپ پر نظریں جمائے بیٹھا تھا اور اس کی انگلیاں مسلسل حرکت میں تھیں۔ پھر اس نے کئی لوگوں سے فون پر بات کی اور انہیں عامر کا دیا ہوا نمبر لکھوایا۔ پندرہ بیس منٹ بعد کسی نے اسے فون کیا اور شاہد نے اسی کاغذ کے پرزے پر فون نمبر کے بعد کچھ لکھ کر عامر کی طرف بڑھا دیا۔

”یہ لیں عامر بھائی...... آپ کا مسئلہ تو حل ہوگیا، جس کے نام پر سم تھی، یہ اس کا نام پتا ہے۔“

عامر کا اشتیاق نسیمہ بانو کا نام دیکھ کر سرد پڑ گیا۔ اس کے بعد کراچی کے کسی علاقے کا ایڈریس بھی تھا۔ ”یہ تو کسی عورت کے نام پر ہے۔“

شاہد نے اس کے چہرے پر مایوسی کی تحریر کو پڑھ لیا تھا۔ ”ہاں...... مگر یہ ہوسکتا ہے کہ عورت آپ کے دوست کو جانتی ہو یا اس کے خاندان کی ہو ورنہ اس کا نمبر کیوں استعمال ہوتا۔“

”تھینک یو شاہد...... میرا خیال ہے کہ اب مجھے کراچی جانا پڑے گا۔“ عامر اٹھ کھڑا ہوا۔

”اگر وہاں آپ کو وقت ملے تو سخی حسن کی چورنگی پر مارکیٹ دیکھ لیں۔ زیادہ بڑی تو نہیں مگر بہت چلتی ہے، والد صاحب کہہ رہے تھے کہ دکان کو فرنش کرنے کا کام شروع کرادو۔ آپ کوئی اچھا سا نام سوچیں، لائیں میں اس کاغذ پر دکان کا نمبر لکھ دوں۔“

عامر نے کاغذ کا پرزہ واپس دے دیا۔ ”شاہد...... تم کسی شاہ جی سے واقف ہو؟“

یہ عامر کا وہم تھا یا واقعی اس نام پر شاہد کا قلم ذرا سی دیر کے لیے رک گیا۔ شاہد نے نظر اٹھا کے اسے دیکھا اور جواب میں سر ہلا کے ”نہیں“ کہا لیکن چند سیکنڈ کے لیے شاہد کی نظریں عامر کے چہرے پر ٹھہر گئی تھیں۔ یہ بظاہر خطرہ اور فوری نظر آنے والے انکار میں عامر کو سوچ کا ایک مختصر ترین وقفہ حائل نظر آیا۔ جیسے جواب دیتے وقت وہ محتاط تھا۔ شناسائی کا اعتراف نہ کرنا ضروری تھا۔ حقیقت شاید مختلف تھی مگر عامر کے لیے یقین سے کچھ کہنا مشکل تھا، اس کا شک بے بنیاد بھی ہوسکتا تھا۔

آتے کے ساتھ ہی واپس کراچی جانے کی بات سن کے ماں پریشان ہوگئی۔ ”ایسا کیا مسئلہ آگیا اچانک؟“

عامر نے جھوٹ کا سہارا لیا۔ ”مسئلہ کیسا ماں...... حکم ہے ان کا کہ جا کے کراچی کی دکان دیکھو...... میری مرضی جانے بغیر کہہ دیا ہے کہ کاروبار کے لیے کوئی اچھا سا نام سوچو، دکان کو ٹھیک کراؤ......“

ماں کا چہرہ کھل اٹھا۔ اس کا مطلب واضح طور پر یہ تھا کہ بیٹے نے اس رشتے اور سسرال والوں کی خواہش پر سر

تسلیم خم کر دیا۔ ”چل اچھا ہے، دیر سے فائدہ بھی کیا......“

■ ■ ■

کراچی رقبے کے اعتبار سے کسی ملک سے کم نہ تھا۔ یہ انسانوں کا ایسا سمندر تھا جس کا ایک کنارا دوسرے سے نہیں ملتا تھا۔ اگر اس نے تلاش معاش میں تین مہینے یہاں نہ گزارے ہوتے تو اس کے لیے بڑی مشکل ہوتی لیکن اب وہ کسی حد تک اس شہر کے جغرافیے سے آشنا تھا اور اس کے راستوں سے آشنا ہوچکا تھا۔ اگر وہ چاہتا تو اپنی بے روزگاری کے زمانے کے ساتھیوں سے بھی مدد لے سکتا تھا مگر وہ اس محلے سے ہی دور رہنا چاہتا تھا جہاں ایک پنکچر لگانے والے کی ان دیکھی بیٹی نے (جو ممکن تھا کہ اسے دیکھ چکی ہو) اس کو بھی اپنے ازدواجی مستقبل کے خوابوں میں جگہ دی ہوگی۔ اب تک وہ عامر کو اسی طرح بھلا چکی ہوگی جیسے ٹرین کے ایک سفر میں ملنے والے جدا ہوتے ہیں تو پھر عمر بھر نہ ملتے ہیں اور نہ اس ملاقات کو یاد رکھتے ہیں۔

اسی دن جب وہ کراچی پہنچا، عامر نے شام ہونے تک نسیمہ بانو کو تلاش کرلیا۔ وہ ایک نرس تھی اور ایک اچھے علاقے میں سلطان اسکوائر میں رہتی تھی۔ وہاں اکثریت آغا خانی لوگوں کی تھی چنانچہ بعض افراد نے پتا پوچھنے پر اسے مشتبہ نظروں سے دیکھا تھا۔ کال بیل کی آواز پر خود نسیمہ بانو نے دروازہ کھولا اور گرل والے گیٹ کے پیچھے سے کہا۔

”میں ہی نسیمہ بانو ہوں، آپ کون ہو؟“

عامر کو خیال آیا کہ اسے براہ راست سوال کرنے سے پہلے اپنے بارے میں بتا دینا چاہیے تھا کہ نہ اس کا تعلق پولیس یا کسی خفیہ ایجنسی سے ہے اور نہ فون نمبر کے بارے میں معلومات کے حصول کا مقصد کسی واردات کا سراغ لگانا ہے۔ ”دیکھیے میں لاہور سے آیا ہوں۔ میرا نام سید عامر شاہ ہے۔ یہ میرا شناختی کارڈ آپ دیکھ سکتی ہیں۔“

نسیمہ بانو کے پیچھے اب اس کی عمر رسیدہ بیزار صورت ماں بھی نمودار ہوگئی تھی۔ ”چلو ٹھیک ہے، ٹھیک ہے...... کیا کام ہے تم کو نسیمہ سے......“

”دیکھیے چند روز قبل اس نمبر سے مجھے ایک دوست نے کال کی تھی جس کی مجھے تلاش تھی لیکن بدقسمتی سے لائن کٹ گئی۔ میں اس کا پتا نہ پوچھ سکا اور اس کے بعد یہ نمبر بھی نہیں ملا۔ میرا خیال تھا کہ نمبر سے مجھے اس کا پتا مل جائے گا...... لیکن یہ آپ کے نام پر تھا۔“

نسیمہ کے چہرے پر اطمینان آگیا۔ ”یہ نمبر بہت پہلے تھا میرے پاس۔“

”اس کا فون بعد میں چھن گیا تھا۔ کراچی میں ہوتا ہے اکثر......“ پیچھے سے ماں نے کہا۔

نسیمہ نے پلٹ کر اسے گھورا۔ ”خوامخواہ جھوٹ بولنے سے کیا فائدہ۔ یہ شریف آدمی اتنی دور سے آیا ہے۔ جناب! میں نرس ہوں۔ اپنا فون میں نے ایک مریض کو دیا تھا۔“

”وہ مریض لے کر بھاگ گیا۔“ ماں نے پھر بات مختصر کرنے کی کوشش کی۔

نسیمہ نے ماں کو ڈانٹا۔ ”مجھے بات کرنے دو، وہ مریض اس اسپتال میں داخل تھا جہاں میں کام کرتی ہوں، اس کا فون چوری ہوگیا تھا۔ کسی نے سوتے میں اس کے سرہانے ٹیبل پر سے اٹھالیا تھا۔“

”یہ کب کی بات ہے؟ کون تھا وہ مریض...... نام کیا تھا اس کا؟“ عامر نے بے چینی میں کئی سوال کر ڈالے۔

”اب مجھے نام تو اس کا یاد نہیں، دو مہینے ہوگئے۔ مریض کو کسی سے بہت ضروری بات کرنی تھی۔ اس نے مجھ سے موبائل فون مانگا اور کہا کہ وہ کال کی قیمت بھی ادا کردے گا۔ پھر اس نے زبردستی مجھے سو کا نوٹ تھما دیا اور مجھے بیٹی بولا تو میں فون دے کر باہر چلی گئی۔ ایک کال کی تو کوئی بات نہیں ہوتی مگر آج کل زمانہ خراب ہے، پتا نہیں کون کیسا ہے۔ اسی وقت وارڈ میں کوئی ایمرجنسی ہوگئی اور مجھے فون واپس لینا یاد نہیں رہا۔ گھر آ کے یاد آیا۔ ایک بات ابھی یاد آئی۔ مریض کے کمرے میں فون تھا لیکن اس روز ایکسچینج میں خرابی تھی۔ شاید بجلی نہیں تھی اور جنریٹر کام نہیں کررہا تھا ورنہ میں گھر سے بھی فون کر کے کسی سے کہہ دیتی اور وہ میرا فون لے لیتا۔ میں نے صبر کیا کہ اگلے دن جاؤں گی تو لے لوں گی۔ دوسرے دن پتا نہیں کیا ہوا ہاں...... خود میں بیمار ہوگئی تھی۔ کچھ بخار ہوگیا تھا۔ تیسرے دن میں گئی تو مجھے معلوم ہوا کہ وہ مریض اب کمرے میں نہیں ہے، ایک ساتھی نرس نے مجھے بتایا کہ وہ مریض بار بار پوچھتا رہا اور جاتے وقت چار ہزار روپے دے گیا جو نئے فون کی قیمت تھی۔“

”وہ تمہارا فون کیوں لے گیا آخر......؟“

”اس نے کہا تھا کہ میرا فون بھی کسی نے اس کے سرہانے سے اٹھالیا۔ ابھی پچھلے ہفتے اسپتال والوں نے ایک عورت کو پکڑا جو کمروں کی صفائی کرتی تھی۔ اس نے کسی مریض کا فون اٹھایا تھا۔ وہ بھی تھی کمرے میں کوئی نہیں۔ مریض اچانک واش روم سے نکل آیا۔“

”اچھا اچھا...... مریض کا نام تو خیر آپ کو یاد نہیں، یہ

یاد ہے کہ اسے کیا بیماری تھی، اس کے کمرے کا نمبر......"

"گیارہ...... فرسٹ فلور پر...... پرائیویٹ روم تھا اور مجھے کچھ یاد نہیں...... آپ اسپتال جا کے معلوم کرو۔"

عامر نے مایوسی سے کہا۔ "آپ کو اس کا کچھ حلیہ یاد ہوگا۔"

نسیمہ نے اس کے لہجے کی لجاجت سے متاثر ہو کے جو حلیہ بیان کیا وہ خاصا تفصیلی تھا مگر یہ شاہ جی کا حلیہ نہیں تھا۔ اس کی امیدیں اب اسپتال والوں سے وابستہ تھیں کہ وہ کس حد تک معلومات دینے میں تعاون کرتے ہیں۔ وہ مایوس ہو کے پلٹا ہی تھا کہ پیچھے سے آواز آئی۔ "محترم...... آپ کا دوست ملے تو مہربانی سے اس سے کہنا کہ...... اپنی سم خرید ے...... فون بے شک رکھے، میں نے دوسرا خرید لیا ہے۔"

عامر نے اس رات صرف سونے کے لیے ایک سستے سے ہوٹل کا انتخاب کیا اور صبح اپنا بیگ اٹھا کے نکل گیا۔ تقریباً دس بجے وہ اسپتال پہنچا۔ معلومات کے کاؤنٹر پر موجود مستعد خاتون نے عامر کی بات توجہ سے سنی، اس نے کمپیوٹر کے بٹن دباتے ہوئے نظر اسکرین پر رکھی۔ "آپ سید غلام مصطفیٰ شاہ کے بارے میں کیوں معلوم کرنا چاہتے ہیں؟"

عامر نے پھر جھوٹ کا سہارا لیا۔ "وہ میرے کزن ہیں، دو سال سے میں دبئی میں تھا اس لیے مجھے ان کی بیماری کا علم نہ ہو سکا۔ ان سے میرا کوئی رابطہ نہیں ہوا اور مجھے کسی نے بتایا بھی نہیں۔"

"یہ کیسے معلوم ہوا آپ کو...... کہ وہ یہاں داخل تھے؟"

"اپنے بھائی سے...... مگر انہیں صحیح تاریخ یاد نہیں تھی۔ وہ ملنے کے لیے یہاں آئے تھے۔ کمرے کا نمبر یاد رہ گیا۔" عامر نے کوشش کی کہ نسیمہ کا نام کہیں نہ آئے۔

"بھائی نے یہ نہیں بتایا کہ وہ کیوں یہاں داخل تھے...... ہاں...... یہ مارچ کی سات تاریخ کا داخلہ ہے۔" معلومات فراہم کرنے والی خاتون کی جستجو کا مرحلہ مکمل ہوا تو اس کی نظر کمپیوٹر اسکرین پر رک گئی۔ "اس کے سی ٹی اسکین میں برین ٹیومر کا پتا چلا تھا جو ابتدائی اسٹیج پر تھا۔ لیکن سرجری سے پہلے وہ چلا گیا تھا۔"

"کہاں چلا گیا تھا؟" عامر نے پریشان ہو کے بولا۔

"آئی ڈونٹ نو...... ممکن ہے کسی کے مشورے پر اس نے دوسرے اسپتال جا کے سیکنڈ اوپینین حاصل کرنا بہتر سمجھا ہو، اکثر مریض ایسا کرتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں تشخیص میں غلطی ہوگی۔"

"تھینکس...... آپ کے پاس ان کا کیا پتا لکھا ہوا ہے۔ میں وہاں جا کے دیکھتا ہوں۔"

"پلیز...... کسی کو معلوم نہ ہو کہ یہ میں نے دیا تھا۔ اوپر سے اجازت کے بغیر ہم کسی مریض کے بارے میں کسی قسم کی معلومات فراہم نہ کرنے کے پابند ہیں۔"

عامر نے کہا۔ "آپ بالکل فکر نہ کریں۔ کسی کو کچھ معلوم نہیں ہوگا۔ میرا مقصد تو صرف اس سے ملنا ہے اور کچھ نہیں۔"

"خدا کرے کہ وہ آپ کو مل جائے...... یوں بھی...... برین ٹیومر میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ سرجری اور کیموتھراپی کے باوجود زندگی کی امید نہ ہونے کے برابر ہوتی ہے۔ زیادہ سے زیادہ چھ ماہ۔"

"تھینکس اگین۔" عامر نے کہا اور بوجھل دل کے ساتھ اسپتال سے نکل آیا۔ اس کے لیے یہ اطلاع بھی سخت صدمے کا باعث بنی تھی کہ شاہ جی کی زندگی کی لکیر محدود ہو کے چھ ماہ پر ختم ہو رہی تھی۔ دو مہینے گزر چکے تھے چنانچہ وہ امید رکھ سکتا تھا کہ شاہ جی جس حالت میں بھی ہوگا اس سے آخری ملاقات ہو جائے گی۔ اگر وہ فوراً کراچی آنے کا فیصلہ نہ کرتا تو اسے ساری عمر اپنی کوتاہی پر پچھتاوا رہتا۔ اب وہ دیکھے گا کہ ناممکن کو ممکن بنانے کے لیے وہ کیا کر سکتا ہے۔ اسے ڈاکٹر یا سرجن کی رائے پر کوئی شک نہیں تھا جو ایک طرح سے شاہ جی کو موت کی سزا سنا چکے تھے۔ صرف اس فیصلے پر عمل درآمد کی تاریخ کا تعین نہیں ہوا تھا۔

عامر نے خود کو بہت لاچار محسوس کیا مگر دو تین گھنٹے کی جستجو کے بعد وہ شاہ جی تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ پتا تلاش کرنے کے لیے وہ ٹیکسی میں پھرتا رہا اور یہ کام اس کے لیے مشکل ثابت ہوا تھا۔ ٹیکسی ڈرائیور خفا بھی تھا اور پریشان بھی مگر پتا اچانک مل گیا تو اس نے خدا کا شکر ادا کیا اور طے شدہ کرائے سے زیادہ ادا کیا۔

عامر کا خیال تھا کہ وہ عالی شان کوٹھی خود شاہ جی کی ہوگی مگر اسے گیٹ کیپر سے یہ جان کے بڑی حیرانی ہوئی کہ شاہ جی نے اس کوٹھی کی تین بیڈ والی انیکسی کو کرائے پر لے رکھا تھا۔ وہ سائڈ کی گیلری سے گھوم کے پیچھے باغ کے بعد آخری حصے میں بنی ہوئی انیکسی تک گیا۔ چالیس پچاس برس کی ایک سیاہ فام عورت نے دروازہ کھولا اور اسے ایک کمرے میں لیٹے ہوئے شاہ جی تک پہنچا دیا۔

عامر کے لیے ایک طویل عرصے بعد شاہ جی کو اس حال میں دیکھنا ایک اذیت ناک تجربہ تھا، سوکھ کے آدھا رہ گیا تھا۔ اس کے چہرے پر جھریاں تھیں اور شیو نہ کرنے سے چہرے پر سفید ڈاڑھی پھیل گئی تھی۔

عامر نے آہستہ سے کہا۔ "شاہ جی......"

شاہ جی نے آنکھیں کھول کے اسے غور سے دیکھا اور پھر اٹھ بیٹھا۔ "عامر تو...... یہاں......"

عامر نے دیوار کے ساتھ رکھی کرسی کو کھینچا اور بیٹھ گیا۔ "تم کیا سمجھتے تھے کہ ایک فون کال کر کے غائب ہو جاؤ گے؟"

وہ اداسی سے مسکرایا۔ "یہی ڈر تھا مجھے، بڑی غلطی کی میں نے تجھے فون کر کے...... بس کچھ ڈپریشن تھا جس کی وجہ سے میں جذباتی ہو گیا تھا پر تو نے تلاش کر لیا مجھے۔"

"شاہ جی...... تم یہاں کیوں لیٹے ہوئے ہو؟ میں ابھی اسپتال سے سب معلوم کر چکا ہوں، یہ کیا بے وقوفی ہے، تم نے آپریشن کیوں نہیں کرایا؟"

"اوئے بیٹھ ادھر آرام سے...... اب تو آ گیا ہے تو تجھے بتانا ہی پڑے گا۔" اس نے دروازہ کھولنے والی عورت کو آواز دی۔ "شانو...... چائے لا فٹا فٹ، ہمارا یار آیا ہے بڑی دور سے......"

"شاہ جی...... ساری باتیں چھوڑو...... پہلے بتاؤ تمہاری طبیعت کیسی ہے؟"

"طبیعت ٹھیک ہے یار......"

"جھوٹ بولنے کا فائدہ کوئی نہیں، میں دیکھ رہا ہوں تمہاری حالت...... اور مجھے بہت دکھ ہو رہا ہے۔"

"ہوتا ہے یار، سب ہوتا ہے۔ زندگی اسی کا نام ہے، کبھی خوشی کبھی غم...... ہم نے جی کے دیکھ لیا ہے...... گاڑی دوڑتی رہتی ہے پٹری پر جس کا آخری اسٹیشن آ جائے رک جاتی ہے۔"

"میں یہ لیکچر سننے نہیں آیا۔ اب تم چلو میرے ساتھ اسپتال، تمہارا علاج بھی ہوگا، آپریشن بھی اور جب تک تم ٹھیک نہیں ہو جاتے میں واپس نہیں جاؤں گا۔"

شاہ جی کے چہرے پر افسردہ سی مسکراہٹ جیسے پھیل گئی۔ اس کی آنکھوں میں جاگنے والی...... دوست کو سامنے دیکھ کے زندگی پانے والی تھوڑی سی خوشی بھی دم توڑ گئی۔ "ہاں، میری بھی خواہش یہی ہوگی کہ اب تو میرے ساتھ ہی رہنا، مجھے دفنا کے واپس جانا۔"

"مت کرو ایسی باتیں شاہ جی، تم زندہ رہو گے۔"

"چھوڑ یہ جھوٹ میری تسلی کے لیے...... ایسی باتوں سے میں بہلنے والا نہیں ہوں۔ کیا سمجھتا ہے آخر تو مجھے، نقل کرا کے امتحان میں پاس کرا دیتا تھا۔ بڑا افلاطون ہے تو، مگر اس امتحان میں تیری وہ کتابی عقل میرے کام نہیں آئے گی پتر...... سب بتا دیا تھا مجھے ڈاکٹروں نے...... ایک ایک دن کا سارا حساب سمجھا دیا تھا۔"

شانو نے چائے لا کے درمیان میں ٹیبل پر رکھی اور ذرا دیر کے لیے رکی۔ "دن میں کیا کھاؤ گے جی آپ۔"

شاہ جی نے کہا۔ "یہ میری بیوی ہے یار...... ابھی ایک مہینا ہی ہوا ہے ہماری شادی کو...... اور شانو...... یہ دنیا میں میرا ایک ہی دوست ہے، دوست بھی اور بھائی بھی...... سب کچھ یہی ہے۔ تجھے بتایا تھا نا میں نے، دیکھ یہ خود ہی آ گیا، بغیر میرے بلائے...... اب اس کے لیے تو کچھ کر...... کچھ اپنے ہاتھ سے بنا، چکن بریانی اور قورمہ...... اور حلوا...... سمجھ لے کہ آج ہوگا اپنا ولیمہ، اب تک نہیں ہوا تھا۔"

دکھ کی آگ میں دہکتی چھری عامر کے دل میں اتر گئی۔ اس نے دیکھا کہ شانو کی آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی اتر آئی تھی۔ بڑی مشکل سے اس نے انہیں بہنے سے روکا۔ اس نے کہا۔ "آپ عامر ہو؟ آپ کا بہت ذکر سنا ہے میں نے ان سے...... بڑا اچھا کیا جو آپ آ گئے، میں ابھی سب تیار کرتی ہوں۔"

عامر نے اسے ایک دم منہ پھیر کے جاتا دیکھا۔ اس کی قوت گویائی جیسے سلب ہو چکی تھی۔

"چائے پی یار......" شاہ جی کی آواز جیسے بہت دور سے آئی۔ "مجھے جب ڈاکٹروں نے بتایا بیماری کے متعلق، تو مجھے بڑی حیرانی ہوئی، دکھ تو خیر ہوا مگر غصہ بہت آیا کہ یہ تقدیر نے کیا دھوکا کیا میرے ساتھ، زندگی میں جو مانگا اس سے کہیں زیادہ دیا...... ہر کامیابی...... ہر عیاشی...... اپنی مرضی سے سب کچھ پا لینے کی عادت، جیت ہی جیت۔ فتح کے غرور میں شکست کے بارے میں سوچا ہی نہیں۔ ڈاکٹروں کے فیصلے کو میں نے قبول نہیں کیا تھا، میں نے ایک ڈاکٹر کو بے عزت کیا۔ وہ سنتا رہا خاموشی سے، ایک پڑھا لکھا مہذب آدمی اور کیا کرتا۔ جواب دیتا تو اس کی بے عزتی زیادہ ہوتی۔ میں مارتا اسے...... وہ میرا کچھ بگاڑ نہیں سکتا تھا۔ اس نے مجھے بند کمرے میں تنہا لڑنے کے لیے چھوڑ دیا۔ جب دوسرے روز کوالیفائیڈ ڈاکٹروں نے بھی وہی ٹیسٹ لے کر وہی فیصلہ سنایا تو میں نے بھی تقدیر کی ہنسی سنی...... میں بہت چیخا چلایا۔ ابھی تو میں جوان ہوں، اتنا دولت مند ہوں، ابھی کیا دیکھا ہے میں نے۔ ابھی شادی تک نہیں کی میں نے......"

شاہ جی خاموش ہو کے چھت کو گھورنے لگا۔ اس کی سانس پھول گئی تھی۔ عامر اسے دیکھتا رہا۔

شاہ جی نے چند سیکنڈ بعد پھر بات شروع کی۔ ''بس یار...... بالآخر میں نے اپنی ہار مان لی۔ حقیقت کو تسلیم کیے بنا چارہ نہ تھا۔ اب پچاس سال کی مہلت سمٹ کر پچاس دن رہ گئی۔ تو کیا جانتا ہے میرے بارے میں عامر؟''

عامر اس غیر متوقع سوال پر چونکا۔ ''وہ سب کچھ...... جو تو نے بتایا۔''

وہ تلخی سے ہنسا۔ ''کچھ بھی نہیں بتایا میں نے، کچھ نہیں جانتا تو...... میں بہت چھوٹا تھا جب میرا باپ مر گیا تھا، میں صرف دو سال کا تھا، وہ ایک بہت بڑے آدمی کا ڈرائیور تھا۔ بڑا آدمی کون ہوتا ہے یہاں؟ جو بیک وقت دولت مند بھی ہو، طاقتور بھی اور بدمعاش...... بااختیار بھی اور سفاک بھی، وہ صرف ایک گاڑی چلاتا تھا جس میں اس کے دو بچے اسکول آتے جاتے تھے، ایک رات وہ بیوی کی بیماری کی وجہ سے جاگتا رہا مگر اسے صبح ڈیوٹی پر جانا پڑا کیونکہ بچوں کو اسکول لے جانے کے لیے کوئی دوسرا ڈرائیور فارغ نہیں تھا۔ رش کا ٹائم تھا اور اسے پل بھر کے لیے جھپکی آگئی، اسی وقت رانگ سائیڈ سے اوورٹیک کرنے والی ویگن نے گاڑی کو ٹکر ماردی۔ ویگن کے ڈرائیور نے بعد میں کہہ دیا کہ اس نے کچھ نہیں کیا۔ کار کے ڈرائیور نے اسے اوورٹیک کیا تو گاڑی اس کے قابو سے باہر ہوگئی تھی۔ عینی گواہ تو کوئی تھا نہیں، خرابی یہ ہوئی کہ اس کی زخمی ہوجانے والی پانچ سال کی بیٹی نے باپ کو کہہ دیا کہ ڈرائیور سو گیا تھا اور جب میرے باپ سے پوچھا گیا تو اس نے بچی کو جھٹلانے کے بجائے اپنی کوتاہی کا اعتراف کرلیا کہ وہ رات بھر کا جاگا ہوا تھا مگر حادثے کی وجہ یہ نہیں تھی۔ اس بڑے آدمی نے اپنے ڈرائیور کو پولیس کے سپرد کردیا اور انہوں نے اسے اتنا مارا کہ وہ مر گیا۔ پولیس نے وہی کہا جو وہ ہمیشہ کہتے ہیں، ملزم پر چوری کا الزام تھا۔ تفتیش کے دوران اس نے خودکشی کرلی۔ میری ماں جوان اور بہت خوبصورت تھی۔ اس نے دوسری شادی کرلی۔ اس کا دوسرا شوہر واقعی بدمعاش تھا۔ دوبار جیل گیا اور پہلے سے زیادہ خراب ہو کے نکلا۔ پولیس اسے استعمال بھی کرتی تھی اور مارتی بھی تھی۔''

خاموشی کے ایک اور وقفے میں عامر نے کہا۔ ''شاہ جی...... کیا دوسری شادی کرتے وقت اسے معلوم نہیں تھا؟''

''معلوم تھا، سب معلوم تھا کہ وہ کیسا آدمی ہے مگر وہ کیا کرتی، کیسے انکار کرتی...... وہ بدمعاش تو اس کے پیچھے لگ گیا تھا اور اسے بچانے والا کوئی نہیں تھا۔ اس نے سوچا کہ شادی کے بعد کم سے کم اس کا مستقبل تو محفوظ ہوجائے گا۔ اس نے مجھے پڑھائی کی طرف لگادیا اور خود...... وہ سب کرتی رہی جو شوہر چاہتا تھا۔ اب میں کیا بتاؤں اپنی ماں کے بارے میں...... شوہر کے لیے وہ سب کچھ کرنے پر مجبور تھی مگر اس کی فرمائش یا ضد ایک ہی تھی، تجھے پڑھ لکھ کے بڑا آدمی بننا ہے اور پتا ہے وہ بڑا آدمی کسے کہتی تھی۔ ڈاکٹر کو، وکیل کو، جج اور پروفیسر کو...... میں نے بہت کوشش کی عامر مگر کیسے پڑھتا میں، تو نے جو مدد کی میری...... میں سمجھتا ہوں ہزار احسان تھا میری ماں پر...... باپ تو میرے میٹرک کرنے کے بعد ہی کہیں غائب ہوگیا تھا اور لوٹ کے نہیں آیا۔ ماں اس وقت مر گئی تھی جب بی اے کرنے کے بعد میں جوان ہوچکا تھا۔ جب میں اسے عزت آرام کی زندگی دینے کے قابل ہوا تو وہ مر گئی۔ بڑا ظلم کیا اس نے بھی میرے ساتھ...... بس اس کے بعد میں نے کہا کہ ایسی کی تیسی شرافت کی، میں بس ویسے ہی جیوں گا جیسے میری ماں کے قاتل نے زندگی گزاری اور میرے باپ کو قتل کرنے والے جیتے رہے۔ ہر غلط کام میں نے کیا۔ دنیا میں کسی کو بھی اپنا دوست نہیں سمجھا، سب میرے لیے دشمن تھے، ایک تیرے سوا...... میں نے جب تیرے بارے میں اپنی ماں سے ذکر کیا تو اس نے یہی کہا کہ تیرا اچھا دوست ہے تو اسے دوست بنا کے رکھنا۔ جیسے وہ تیری مدد کررہا ہے آج، کل ضرورت پڑے تو اس کی بھی مدد کرنا، نیکی کا احسان ہوتا ہے اور احسان کا بدلہ صرف احسان کرکے چکایا جاتا ہے۔ بہت دولت کمائی میں نے مگر...... سب بدمعاشی سے...... اور حاصل کیا ہوا، آج میں سب تجھے بتارہا ہوں۔''

عامر نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ''بتادیا نا، اب اور میں کچھ نہیں سنوں گا۔ تجھے چلنا ہے میرے ساتھ اسپتال۔''

''کیوں نہیں یار، تیری بات ٹال سکتا ہوں میں...... تو جہاں کہے گا تیرے ساتھ جاؤں گا۔ آخر قبرستان بھی تو تیرے ساتھ ہی جانا ہے۔''

''فضول بکواس کرنے کی ضرورت نہیں۔ اب میں آگیا ہوں تو مرنے نہیں دوں گا تمہیں۔''

شاہ جی ہنسنے لگا۔ ''یار ہم تو دھمکی دیتے تھے کہ جینے نہیں دوں گا۔ تو الٹی بات کرتا ہے، دیکھ آج کیسا اچھا دن ہے تیرے آنے سے اپنا ولیمہ ہوگیا۔''

''شاہ جی...... ایک بات پوچھوں، یہ شادی...... میرا مطلب ہے یہ عورت......''

''مجھے انتظار تھا تیرے اس سوال کا...... تجھے ہمت نہیں پڑی پوچھنے کی کہ جب فرشتۂ اجل دستک دے چکا تو

مجھے شادی کی کیوں سوجھی۔ بات یہ ہے پتر کہ آخری وقت کی توبہ قبول نہیں ہوتی، شادی تو قبول ہوجاتی ہے نا...... تو سمجھ رہا ہوگا کہ میں نے اس عورت کو کچھ نہیں بتایا ہوگا۔ نہیں...... میں نے اسے صاف بتادیا تھا کہ میری زندگی کے دن گنے جاچکے ہیں۔ بیوی نہیں میری بیوہ بننا قبول ہے؟ اس نے کہا کہ قبول ہے، تو نے دیکھا وہ عمر میں مجھ سے بہت بڑی ہے۔ کالی موٹی اور بدصورت ہے، ایسا نہیں ہے کہ مجھے کوئی جوان اور خوبصورت عورت قبول نہ کرتی...... اصل بات کچھ اور ہے، میں نے اپنا فائدہ دیکھا اور شانو نے اپنا، جب وقت تھا تو مجھے شادی ایک مصیبت لگتی تھی، خواہ مخواہ کی ذمے داری...... جب بیوی آجاتی ہے تو بچے بھی آتے ہیں، ان کی ذمے داریاں اٹھانا میرے بس کی بات نہیں تھی۔ ایمانداری سے میں سمجھتا تھا کہ میں کبھی اچھا شوہر نہیں بن سکتا...... گھریلو جانور جیسا کہ کتا ہوتا ہے۔ نکاح کے بول پڑھوائے بغیر نہ جانے کتنی اپنے ساتھ بیوی بن کے رہیں اور میرا دل بھر گیا تو خاموشی سے اپنا معاوضہ وصول کر کے چلی گئیں۔ بہت سی واقعی محبت کرنے والی تھیں۔ حسین اور اچھے خاندان کی پڑھی لکھی تھیں۔ ایک دو نے تو خود اس خواہش کا اظہار بھی کردیا کہ وہ ہمیشہ کے لیے میرا ساتھ چاہتی ہیں مگر خود میں نے معذرت کرلی۔ ماں ہوتی نا تو ایسے کھلے سانڈ کی طرح نہ پھرنے دیتی اور کون تھا جو میری فکر کرتا یا جس کی میں سنتا۔ جب اچانک پتا چلا کہ اب ٹائم ہی نہیں رہا تو افسوس ہوا کہ لنڈورے آئے تھے...... لنڈورے ہی سدھاریں گے۔ دل کو خوامخواہ تسلی دی کہ یہ بھی اچھا ہی ہوا کسی کے نصیب نہیں پھوٹے۔ مگر سچی بات یہ ہے کہ افسوس بہت تھا اپنا گھر نہ بسانے کا۔ اپنا کوئی رونے والا ہی نہیں، ماں بہت یاد آئی اور پتا نہیں کتنے سالوں کے بعد میں اس کی قبر پر گیا۔ سخت شرمندہ اور دکھی تھا...... لیکن بہت تلاش کرنے پر بھی مجھے قبر نہ ملی۔ جگہ مجھے یاد تھی لیکن یہاں تو مسئلہ رہتا ہے جگہ کا، زمین صرف زندہ انسانوں پر نہیں مردوں پر بھی تنگ ہوگئی ہے یہی میری ماں کے ساتھ بھی ہوا اس کی جگہ کوئی مولا بخش ناگپوری لمبے لیٹے ہوئے تھے۔ میں فاتحہ پڑھ کے لوٹ آیا۔ اس رات ماں میرے خواب میں آئی۔ بالکل اسی طرح جیسے وہ زندگی میں مجھے سمجھاتی تھی۔ اس نے کہا کہ بیٹا، میں کیا کہتی تھی؟ احسان کا بدلہ احسان سے اور نیکی کا بدلہ صرف نیکی سے اتارا جاسکتا ہے۔ یار عامر...... اس نے تیرا نام لے کر کہا کہ وہ تیرا دوست اور محسن تھا۔ کب سے تو نے اس کی خبر نہیں لی، وہ کراچی میں ہے......"

شانو اندر آئی۔ "کھانا لگادوں۔"

"ہاں ہاں...... بڑی خوشبوئیں آرہی تھیں اندر سے...... میری بھی بھوک جاگ اٹھی ہے آج...... کیا کچھ پکایا ہے تم نے؟ لے آؤ فٹافٹ......" شاہ جی بولا۔

شانو نے دوسرے کمرے میں ڈائننگ ٹیبل پر کھانا لگا دیا۔ پتا نہیں وہ سب پہلے سے گھر میں موجود تھا یا شانو قریب کے کسی بازار سے لائی تھی۔ عامر نے اس کی بہت تعریف کی مگر شانو خاموشی سے کھاتی رہی۔ عامر کو یوں لگا جیسے وہ سخت ٹینشن میں ہے۔ شرمندگی کے احساس میں مبتلا ہے، اپنی بے چارگی اور کم مائیگی پر احساس کمتری کا شکار ہے۔ اپنی عمر، صورت اور غریبی کے کمپلیکس میں مبتلا ہے۔ اسے عامر کا بھابی کہنا بھی اذیت دے رہا تھا۔ شانو نے اپنے ہاتھ سے اسے کھانا کھلایا اور شاہ جی بچوں کی طرح کھاتا رہا......

کھانے کے بعد وہ پھر اسی کمرے میں آگئے۔ شاہ جی بہت تھکا ہوا نظر آرہا تھا، اس نے شانو سے لے کر بہت سی دوائیں نگلیں اور کچھ دیر آنکھیں بند کیے پڑا رہا۔ عامر نے آواز دی تو شاہ جی نے کوئی جواب نہیں دیا۔

شانو نے کہا۔ "ان کی طبیعت بگڑ گئی ہے۔"

عامر گھبرا گیا۔ "شاہ جی بے ہوش ہے۔ میں ایمبولینس منگواتا ہوں، ہم انہیں اسپتال لے جائیں گے۔"

شانو نے کہا۔ "کوئی ضرورت نہیں، یہ ایک دورہ سا کبھی کبھی پڑتا ہے...... ان کے سر میں شدید درد اٹھتا ہے، اتنا کہ یہ سر پکڑ کے چلاتے ہیں اور سر ٹکراتے ہیں پلنگ کی پٹی پر...... ان کی نظر کے سامنے اندھیرا آجاتا ہے، یہ کچھ دیکھ ہی نہیں سکتے، پھر بے ہوشی طاری ہوجاتی ہے۔"

"مگر آج تو ایسا کچھ نہیں ہوا۔ یہ باتیں کرتے کرتے بے ہوش ہوگیا۔"

"آج انہوں نے کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا۔ درد کو برداشت کیا معلوم نہیں کیسے...... جب یہ آپ سے باتیں کر رہے تھے تو شاید انہیں آپ کی صورت بھی نظر نہیں آرہی تھی، آپ نے مجھے کھانا کھلاتے دیکھا تھا۔ اگر انہیں نظر آرہا ہوتا تو یہ خود کھالیتے، ہاتھ پیر تو کام کرتے ہیں ان کے...... مجھے ڈر تھا کہ یہ کھانا کھاتے کھاتے بے ہوش نہ ہوجائیں۔"

عامر دکھ، خوف اور بے یقینی سے منجمد بیٹھا رہا۔ اس کے سامنے شاہ جی نے قوت برداشت کا ناقابل یقین مظاہرہ کیا تھا۔ صرف اس لیے کہ کہیں عامر کو اس کی اذیت ناک حالت کا اندازہ نہ ہوجائے۔ جب تک حواس ساتھ رہے اس نے اپنی تکلیف کو ظاہر نہ ہونے دیا، یہ برین ٹیومر تھا جو

اس کے دماغ کے مختلف حصوں کو مفلوج اور تباہ کر رہا تھا۔

"آپ پریشان نہ ہوں۔ ابھی آدھے گھنٹے میں بالکل ٹھیک ہوجائیں گے۔ زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹا......"

"مگر اس حالت میں آپ کے شوہر کا یہاں پڑا رہنا غلط ہے، ان کو اسپتال میں ہونا چاہیے۔"

"وہ میری کہاں مانتے ہیں، بس درد کم کرنے والی گولیوں پر گزارہ ہے۔"

"یہ دورہ کتنے دن بعد پڑتا ہے؟"

"پہلے ایک دو دن میں پڑتا تھا۔ اب دن میں دو بار بھی پڑ جاتا ہے۔ بیماری بڑھ رہی ہے لیکن میں کچھ بھی نہیں کرسکتی۔ آپ کوشش کر کے دیکھ لیں۔" اس نے دوپٹے کے پلو سے آنسو پونچھ لیے۔

عامر یک دم اٹھا۔ "میں ایسے خاموش تماشائی نہیں رہ سکتا۔ میں اسے اسپتال لے جاؤں گا۔"

شانو نے کہا۔ "آپ ڈرائیو کرسکتے ہیں تو ان کی گاڑی باہر ہے۔"

◘ ◘ ◘

"یہ تو وہی کمرا ہے؟" شاہ جی نے ہوش میں آتے ہی کمزور آواز میں کہا۔

"ہاں...... اور وہی اسپتال...... لیکن اب کی بار میں یہاں سے بھاگنے نہیں دوں گا اور یہ بھی مت بھولنا کہ میں شانو نہیں ہوں کہ تمہارے شور مچانے سے ڈر کے خاموش ہوجاؤں۔"

شاہ جی اسے دیکھتا رہا۔ "کوئی فائدہ نہیں عامر۔ تو کیوں لمبا کرتا ہے میرے عذاب کو، مجھے اب سکون چاہیے، چند روز اور میری سانس چلتی رہی تو کیا ہوگا۔"

"تم ایسے لڑے بغیر ہتھیار ڈالنے والوں میں سے تو کبھی نہ تھے شاہ جی۔"

"موت سے کون لڑسکتا ہے بے وقوف...... تو کیا مجھ سے زیادہ جانتا ہے کہ میری بیماری کیا ہے۔ جب دنیا بھر کے قابل ڈاکٹر مجھے بتاچکے ہیں کہ ان کے پاس اس مرض کا علاج نہیں ہے۔ نہ یہاں، نہ یورپ اور امریکا میں......"

"میرا اعتقاد ہے کہ معجزے ہوتے ہیں اور ڈاکٹر کوئی خدا نہیں ہوتے۔" عامر نے شاہ جی کو مایوسی کے اندھے کنویں سے نکالنے کی کوشش جاری رکھی۔ "دعا کی قبولیت ہو تو دوا بھی کام کرتی ہے، اچھا میں ذرا ڈاکٹر سے مل لوں۔"

باہر آکے اس نے سکون کا سانس لیا۔ ابھی تک اس نے شاہ جی کو معلوم نہیں ہونے دیا تھا کہ وہ جب گھر میں بے ہوش تھا تو شانو کی توقع کے مطابق اسے گھنٹے آدھے گھنٹے بعد ہوش نہیں آیا تھا۔ عامر نے اسے بے ہوشی کی حالت ہی میں اسپتال پہنچا دیا تھا۔ اسے ہوش آیا تو ڈاکٹروں نے انجکشن دے کر سلا دیا تھا۔ عامر نے شاہ جی کا پرانا ریکارڈ نکلوالیا تھا۔ صبح اسے نسیمہ بھی مل گئی تھی اور عامر کو پہچان کے رک گئی تھی۔ "ارے آپ؟"

عامر نے اس کے سوال کو سمجھ لیا۔ "میں اس مریض کو واپس لے آیا ہوں جو آپ کا موبائل فون لے گیا تھا اور وہ اسی کمرے میں ہے۔"

پھر نسیمہ نے ہی عامر کی ملاقات اس ڈاکٹر سے کرادی تھی جسے شاہ جی گالیاں دے کر بھاگ گیا تھا، اس نے بہت افسوس کا اظہار کیا۔ "میری رائے آج بھی وہی ہے اور اب اتنا وقت گزر جانے کے بعد آپ اسے واپس لائے ہیں تو بتائیے میں کیا کروں، سوائے اس کے...... کہ اسے ایک پرسکون اور کم سے کم تکلیف دہ موت تک لے جاؤں۔"

عامر نے ایک آہ بھری۔ "میں اس سے زیادہ کی امید بھی نہیں رکھتا لیکن یہ ناممکن تھا کہ میں اسے گھر پر مرتا دیکھوں، پلیز اس کی کسی بات کا برا مت مانیں۔"

عامر نے اپنے گھر فون کر کے ماں کو بتادیا کہ ابھی اسے کراچی میں کچھ دن رکنا ہوگا۔ شاہ جی کی بیماری کا ذکر لاحاصل تھا۔ اس نے یہ کہنا بہتر سمجھا کہ وہ کاروباری حالات کا جائزہ لے رہا ہے اور دکان کو اپنی نگرانی میں فرنش کرانا چاہتا ہے پھر اس کی شاہدہ سے بھی بات ہوئی اور اس کے باپ سے بھی، ان کے لیے بڑے اطمینان کی بات تھی کہ ان کا ہونے والا داماد عین ان کی توقعات کے مطابق ذمے دار ثابت ہو رہا ہے۔

عامر نے ایک دن اس دکان کو بھی دیکھا جہاں بیٹھ کے اسے موبائل فون بیچنے اور خریدنے تھے، وہاں کارپینٹر کام کر رہے تھے۔ عامر کے دورے کا مقصد اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ اس کے سسرال والوں کو بھی اس کی کاروبار میں دلچسپی کا ثبوت مل جائے۔ فیصلہ خواہ ماں کے مجبور کرنے کا نتیجہ تھا مگر حقیقت تو یہی ہے کہ وہ خود انکار کرنے کی خواہش پر قائم نہیں رہ سکا تھا۔ اسے ہتھیار ڈالنے ہی تھے۔

تین دن میں عامر کو اندازہ ہوگیا تھا کہ کہنے کی بات اور ہے۔ شاہ جی اب چار ماہ تو کیا ایک مہینا بھی نہ گزار پائے گا۔ ابتدا میں اس بے رحم حقیقت کو تسلیم کرنا عامر کے لیے آزمائش بن گیا تھا۔ وہ اس خیال سے سمجھوتا نہیں کر پاتا تھا کہ وہ جو اس کے سامنے موجود ہے ایک ماہ بعد قبر کی مٹی کے

ڈھیر میں مٹی بن رہا ہوگا۔

تیسرے دن وہ اسپتال پہنچا تو اس نے شاہ جی کے کمرے میں ایک کالے کوٹ والے ادھیڑ عمر کے بھاری بھر کم شخص کو دیکھا۔ شاہ جی نے بتایا۔ ”یہ میرے قانونی مشیر حمید اختر صاحب ہیں اور حمید صاحب...... یہ دنیا میں میرا واحد دوست، ہمدرد، محسن...... خیر خواہ......“

عامر نے کہا۔ ”بس شاہ جی...... میرا نام عامر ہے۔“ اس نے وکیل سے ہاتھ ملایا۔

”عامر...... تیرے مجبور کرنے پر میں یہاں آ گیا تھا، دوبارہ۔“

”تم نے اچھا کیا جو میری بات مان لی ورنہ میں زبردستی کرتا۔“ عامر بولا۔

شاہ جی ہنسا۔ ”اب تو میری ایک بات مانے گا؟“

”ضرور مانوں گا۔ تم بتاؤ بات کیا ہے۔“ عامر نے کہا۔

”تو انکار نہیں کرے گا، سوال جواب نہیں کرے گا...... وعدہ کر۔“ شاہ جی بولا۔

عامر کے کان کھڑے ہوئے۔ ”ایسی کیا بات ہے شاہ جی......؟“

”میں نے کہا تھا کہ سوال جواب کوئی نہیں۔“ شاہ جی نے اسے ڈانٹا۔ ”ایک بات اور...... تو نے انکار کیا تو پھر میں دیکھوں گا مجھے یہاں کون روکتا ہے۔“

عامر نے کہا۔ ”او کے...... او کے...... تمہارا حکم سر آنکھوں پر، دھمکی مت دو۔“

شاہ جی نے کہا۔ ”یہ وکیل صاحب ایک فائل اپنے ساتھ لائے ہیں، اس میں کچھ کاغذات ہیں۔ یہ جہاں بھی کہیں تو آنکھیں بند کر کے دستخط کرتا جا۔“

عامر نے وکیل کی طرف دیکھا۔ ”پڑھے بغیر......“

”الو کے پٹھے، کیا میں فراڈ کروں گا تیرے ساتھ...... کون سی دولت جائداد ہے تیرے پاس جو میں ہتھیا لوں گا اور یہ وکیل صاحب کوئی غیر قانونی کام کرا سکتے ہیں کسی سے۔“ شاہ جی بگڑ گیا۔

عامر کے انکار کی گنجائش ہی نہ رہی، اسے سوچنے سمجھنے کا موقع نہیں ملا۔ وکیل پوری تیاری کے ساتھ آیا تھا۔ اس نے فائل کھول کے اسٹامپ پیپر نکالے اور انگلی رکھ کے عامر سے کہتا گیا کہ یہاں دستخط کر دیں اور شناختی کارڈ نمبر لکھ دیں۔ ایک دستاویز پر اس نے انگلیوں اور انگوٹھوں کے پرنٹ بھی لیے۔ عامر پوری کوشش کرتا رہا کہ عبارت پر سرسری نگاہ ڈال کے دستاویز کی عبارت کا اندازہ کر سکے مگر یہ ناممکن تھا، یا تو اصل مضمون پہلے صفحے پر تھا یا اس پر وکیل کا ہاتھ آ جاتا تھا۔

”اس کام میں کتنے دن لگ جائیں گے وکیل صاحب؟“ شاہ جی نے مطمئن ہو کے پوچھا۔

”میں کم سے کم وقت میں سب کرا لوں گا۔“ وکیل جانے کے لیے اٹھا۔

”پیسے کی فکر نہ کریں۔ جہاں ایک روپیہ لگے وہاں دس دیں۔ رکاوٹ کہیں نہیں آنی چاہیے اور کام جلدی ہونا چاہیے۔“

وکیل کے جانے کے بعد عامر نے کہا۔ ”شاہ جی اب تو بتا دو۔“

”جلدی کیا ہے تجھے...... معلوم ہو جائے گا دو چار دن میں...... آج مجھے اپنی طبیعت بہتر لگ رہی ہے، میں تجھے کچھ بتانا چاہتا ہوں، شانو کیسی لگی تجھے......؟“

”اچھی ہے، بہت خیال رکھتی ہے تیرا......“

”میں نے تجھے شانو کے بارے میں کچھ بھی نہیں بتایا۔ میں نے اپنی ماں کے بارے میں بتایا تھا تجھے، ایک رات اس نے خواب میں آ کے کہا، تو نے اپنے دوست اور محسن کو بھلا دیا ہے، وہ کراچی میں ہے آج کل...... یار میری آنکھ کھلی تو مجھے بڑی حیرانی ہوئی اور افسوس بھی ہوا کیونکہ ماں نے جو کہا غلط نہیں تھا لیکن سب سے زیادہ سمجھ میں نہ آنے والی بات کچھ اور تھی۔ پتا نہیں کیسے ایک فون نمبر میرے دماغ میں تھا۔ کچھ نمبر ایسے ہوتے ہیں جو یاد ہو جاتے ہیں۔ بار بار استعمال کرنے سے، میں نے بہت سوچا کہ یہ نمبر کس کا ہے مگر مجھے یاد نہ آیا...... ایک دن پہلے تک یہ نمبر مجھے یاد نہیں تھا اور اب مسلسل اپنی موجودگی کا احساس دلا رہا تھا، ایسا ہوتا ہے نا۔ کبھی کسی گانے کے بول یا کوئی فضول سی بات دماغ میں اٹک جاتی ہے۔ الجھن دور کرنے کے لیے میں نے تکیے کے نیچے سے موبائل فون نکالنا چاہا جس میں میرے تمام کاروباری اور ذاتی نمبر محفوظ تھے۔ کچھ نئے تھے تو کچھ بہت پرانے۔ اب تجھ سے کیا پردہ، ایسے آدھے نمبر تو ان کے تھے جن کو میں بھلا چکا تھا، کچھ پروفیشنل اور کچھ شریف زادیوں کے...... لیکن مجھے وہاں فون ہی نہیں ملا، کسی نے رات کو ہاتھ کی صفائی دکھائی اور فون لے گیا۔ دوپہر تک اس کے سوا چارہ نہ رہا کہ میں کسی فون سے وہ نمبر ملا کے دیکھوں۔ اتفاق سے اس دن میرے سرہانے رکھا ہوا سیٹ کام نہیں کر رہا تھا۔ اسپتال کے ایکس چینج میں خرابی تھی، میں نے ایک نرس سے فون مانگا اور وہ نمبر ملا کے دیکھا، جواب میں مجھے تیری آواز سنائی دی۔ کیا کہے گا تو اسے؟“

”یہ اتفاق تو نہیں تھا...... تو سمجھتا ہے تیری ماں خواب میں آ کے یہ نمبر تیرے دماغ میں ڈال گئی تھی؟“

”اس کے سوا یہ کیسے ممکن تھا۔ کون بتاتا مجھے تیرا نمبر...... تو ایسی باتوں پر یقین رکھتا ہے؟“

شاہ جی نے وضاحت کی۔ ”یہ باتیں ٹھیک، مگر کوئی خواب میں کسی کا کیسے نمبر بتاتا، یہ نمبر تو میرے لاشعور میں بھی نہیں تھا...... اور آگے سن...... کیا تو اسے اتفاق کہے گا؟ میرا فون کیوں نہیں ملا تھا......؟ میں یہ سمجھتا ہوں کہ فون کی میموری دیکھنے کے بعد مجھے نمبر نہ ملتا تو میں اسے بھول جاتا۔ بھولنے کی کوشش ضرور کرتا، مگر دوپہر تک میرے دماغ پر سوار رہا اور میں مجبور ہو گیا کہ اس نمبر پر بات کروں۔ یقین کر مجھے بھی تیری آواز سن کر الیکٹرک شاک لگا تھا، میں نے خود کو بھی سنبھال لیا تھا لیکن اس کے بعد یہ ہوا کہ لائن کٹ گئی۔ ادھر سے تو کوشش کرتا رہا، ادھر سے میں اور ہم دونوں کو جواب ایک ہی ملا...... لیکن......“ وہ بات کرتے کرتے کہیں کھو گیا۔

عامر نے کہا۔ ”ایسا کیوں ہوا تھا......؟“

شاہ جی چونکا۔ ”تو سمجھے گا میرا دماغ چل گیا ہے لیکن میری بات پر غور کر یار، اس ادھوری کال سے فائدہ کیا ہوا...... تیرے دماغ میں ایک کرید اور بے چینی جاگ اٹھی، ایسا نہ ہوتا تو ہم فون پر ہی ساری بات کر لیتے، میں تجھے اپنی بیماری کے بارے میں کچھ نہ بتاتا لیکن تو بھی مجبور ہو گیا میرا سراغ لگانے پر...... اور تو ایک نمبر سے میرے پاس پہنچ گیا۔ تو نہ مان...... مگر میں سمجھتا ہوں کہ میری ماں یہی چاہتی تھی...... پھر دیکھ، وہ نرس آ جاتی تو میں فون اسے واپس کر دیتا، وہ اگلے دن نہیں آئی اور اس رات مجھے خیال آیا کہ کیوں نہ میں یہ فون رکھ لوں۔ میں نے اس کی پوری قیمت یہاں چھوڑ دی، اس وقت یہ مجھے آسان لگا تھا کہ اب کون بازار جا کے نیا فون لے۔ لیکن اس سے بھی فائدہ ہوا۔ تو نے ٹریس کر لیا مجھے ورنہ وہ نرس تو بھول چکی ہوتی کہ اس کے فون سے کس نے، کب کسے کال کی تھی۔“

عامر خاموشی سے شاہ جی کو دیکھتا رہا...... اس کے خیال کی تردید کرنا ممکن نہیں تھا وہ ایک سکون دینے والے خیال کو اپنی ماں سے منسوب رکھ کے مطمئن اور خوش تھا تو اس سے اچھی بات اور کیا ہو سکتی تھی۔

عامر نے کچھ دیر بعد کہا۔ ”شاہ جی...... یہ قانونی کاغذات کیا تھے جن پر تم نے دستخط کرائے؟“

شاہ جی نے جیسے اس کا سوال سنا ہی نہیں...... ”ایک بات پہلے بھی ہو چکی تھی، میں سخت مایوس اور پریشان تھا، کئی راتیں میں سو نہیں سکا۔ سکون آور گولیاں کھانے کے باوجود...... میری حالت اس قیدی سے بدتر تھی جس کی سزائے موت پر عمل درآمد کے لیے بلیک وارنٹ مل چکے ہوں، ایک ڈاکٹر نے مجھے انجکشن لگا کے سلا دیا، رات کو مجھے ماں نظر آئی۔ بالکل اسی طرح جیسے وہ کمرے میں میرے سامنے ہو۔ وہ میرے بیڈ پر آ کے بیٹھ گئی اور اس نے پیار سے میرے سر پر ہاتھ پھیرا۔ میں اس کا ہاتھ پکڑ کے رونے لگا۔ میں نے کہا۔ ”ماں...... تو جانتی ہے کیسی زندگی تھی میری، صرف گناہ کیے ہیں میں نے...... کتنے لوگوں کی زندگی میری وجہ سے برباد ہوئی، میں نے کس کس کے ساتھ دھوکا کیا، بے ایمانی کی...... میں نے چوری کی اور ڈاکے ڈالے اور کوئی میرا کچھ نہ بگاڑ سکا۔ میں بدمعاش تھا، لوگ مجھ سے ڈرتے تھے۔ کتنی شریف اور معصوم لڑکیوں کے ساتھ میں نے زیادتی کی، شراب اور بدکاری کے سوا میرا کوئی کام نہیں رہا۔ نیکی کے راستے پر چلنے کا میں نے کبھی سوچا بھی نہیں۔ روزہ نماز تو بہت سے مسلمان بھی نہیں کرتے مگر میں تو مجسم شیطان تھا۔ اب میں کیا کروں، کس منہ سے توبہ کروں۔“

وہ سب سنتی رہی پھر بولی۔ ”دیکھ...... خدا کی بات خدا جانتا ہے، ابھی وقت ہے تیرے پاس۔ جو کر سکتا ہے وہ کر...... کیا پتا خدا کو تیری کون سی نیکی بھا جائے۔ ایک نیکی پر...... ساری عمر کے گناہ بخش دے تو یہ اس قادر مطلق کی مرضی......“

میں نے کہا۔ ”ماں...... مجھے بتاؤ میں کیا کروں۔“

اس نے کہا۔ ”دیکھ...... یہ تیری جتنی دولت ہے، اب تیرے کام تو آئے گی نہیں، یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ تو ان سب سے معافی مانگے جن کے ساتھ تو نے زیادتی کی...... یا انہیں یہ رقم واپس کرے جن سے لی۔“

میں نے کہا۔ ”ماں مجھے راستہ دکھاؤ، جب میں چھوٹا تھا تمہاری انگلی پکڑ کے چلنا سیکھا تھا میں نے اور زندگی بھر تمہارے سہارے کا محتاج رہا۔ تم نے میرا ساتھ کیوں چھوڑ دیا ماں......“

ماں نے کہا۔ ”میں بتاؤں گی تجھے کیا کرنا ہے۔“

اور یار عامر، جب میری آنکھ کھلی تو میں ایک بالکل بدلا ہوا انسان تھا۔ اب مجھے مرنے کا ڈر نہیں تھا۔ یہ پریشانی تھی کہ جو کچھ میں کرنا چاہتا ہوں اس کے لیے زندگی مہلت دے گی یا نہیں...... اس کی تفصیل تو بہت لمبی ہے۔ پتا نہیں کہاں سے کوئی مجھے فون کرتا اور اپنی ضرورت بتاتا اور تصدیق پر وہ ضرورت مند ہی ثابت ہوتا۔ دس دن میں بیس

بار ایسا ہوا اور میں چیک دیتا گیا، تقریباً اپنی ساری دولت میں نے اسی طرح تقسیم کردی، میری چار کوٹھیاں تھیں، ایک میں نے لاوارث بوڑھوں کے لیے دے دی۔ ایک انگریز عورت ہے جو یتیم خانہ چلاتی ہے، پاکستان میں اس کا نام بھی کوئی نہیں جانتا، ایک کوٹھی اس کے نام کردی۔ ایک اسکول ہے یہاں...... صبح کی شفٹ ختم ہوتی ہے تو اس میں گردونواح کی غریب آبادی کے لاوارث بچے پڑھنے آجاتے ہیں جو کوئی فیس نہیں دیتے مگر انہیں بہترین تعلیم ملتی ہے، ایک کوٹھی انہیں دی۔ چوتھی ایک طبی ادارے کو جہاں غریبوں کو بہترین طبی سہولت بلا معاوضہ فراہم کی جاتی ہے۔ میں نے دس ایمبولینس گاڑیاں ایک رفاحی ادارے کو دیں، دس دوسرے کو...... اور میں کیا بتاؤں عامر...... مجھے لگتا تھا کہ میں ٹھیک ہوگیا۔ میں دن رات یہ کام کرتا رہا اور ایک بار بھی تھک کر نہیں لیٹا، کہاں کا ٹیومر اور کیسی بیماری، مجھے موت کا خیال تک نہیں آیا...... ایک جلدی ضرور تھی کہ کام بہت ہے اور وقت کم ہے۔"

میں نے کہا۔ "شاہ جی...... اب کھانا کھاؤ اور آرام کرو، باقی باتیں کل کریں گے۔"

"کل کے لیے کہتے ہیں ناکہ آئے نہ آئے...... اور تجھ سے بات کر کے میرا دل بھی ہلکا ہو رہا ہے۔" شاہ جی نے کہا۔ لیکن کھانے کے بعد اس پر جو دورہ پڑا وہ اتنا شدید تھا کہ میں بھی گھبرا گیا۔ ایسا لگتا تھا شاہ جی اس حملے سے جانبر نہ ہوسکے گا مگر ڈاکٹروں نے اسے سنبھال لیا۔ اس کے سر میں اٹھنے والے درد کی لہر نے شاہ جی کو دیوانہ وار چیخنے اور سر پٹخنے پر مجبور کر دیا تھا۔ ساتھ ہی اس کی بصارت ختم ہوگئی تھی۔ انجکشن کا اثر ہونے میں چند منٹ لگے۔ پھر وہ پرسکون اور ساکت ہوتا گیا۔ جب وہ سو گیا تو میں نے ڈاکٹروں سے پوچھا تو وہ بہت مایوس نظر آئے۔

"فورتھ اسٹیج پر کچھ کہنا مشکل ہوتا ہے۔" اس ڈاکٹر نے مجھ سے اپنے کمرے میں بات کی جس کی رائے کو مسترد کر کے شاہ جی نکل گیا تھا۔ "پہلی اسٹیج پر ہم کوشش کرسکتے ہیں لیکن اس وقت علامات واضح نہیں ہوتیں، مریض ہمارے پاس آتا ہے تو بہت دیر ہو چکی ہوتی ہے۔"

میں نے بڑی مشکل سے آنسوؤں کو روکا۔ "پھر بھی...... اور کتنے دن......"

"شاید یہ ہفتہ...... اگر اس سے پہلے کچھ ہو جائے تو مجھے الزام نہ دینا، میں کیا دنیا کا کوئی بھی ڈاکٹر اب یقینی پیش گوئی نہیں کرسکتا۔ بٹ دی اینڈ از ویری ویری کلوز......"

عامر کی نیندیں حرام ہوگئیں۔ اب وہ چاہتا تھا کہ رات کو بھی شاہ جی کے پاس رہے مگر شانو نہ مانی، اسے انیکسی میں اکیلے رہتے ہوئے بھی ڈر لگتا تھا کیونکہ سامنے چار ہزار گز پر بنی ہوئی کوٹھی خالی پڑی تھی۔ عامر مجبور ہو گیا لیکن اس رات وہ دیر تک جاگتا رہا اور بار بار شانو کو فون کر کے شاہ جی کی خیریت معلوم کرتا رہا۔

یہ انیکسی کرائے پر لی گئی تھی۔ عامر کو یہ بات کچھ عجیب سی لگی۔ اس کے اندازے کے مطابق تو انیکسی کا کرایہ بھی پچیس ہزار ہوگا۔ اس میں ایک ماسٹر بیڈ تھا اور ایک گیسٹ بیڈ، سارے کمرے بڑی خوبصورتی سے سجائے گئے تھے۔ شاہ جی کے اور شانو کے بیڈروم میں عامر کو شادی کی ایک بھی تصویر دکھائی نہ دی۔ خود شانو کا رویہ شاہ جی کی شریک حیات سے زیادہ اس کی ملازمہ جیسا تھا۔ یہ سمجھ میں نہ آنے والی بات تھی کیونکہ شاہ جی اس سے شادی کے معاملے میں جھوٹ نہیں بول رہا تھا۔

ایک بیڈ سائڈ ٹیبل پر عامر کو کسی عورت کی پرانی رنگین تصویر نظر آئی جو کسی فوٹو اسٹوڈیو میں کھینچی گئی ہوگی۔ بیک گراؤنڈ میں پردے پر کسی بارہ دری کی محراب سی بنی ہوئی تھی اور عورت اس کے سائے میں بڑی نزاکت سے اپنے ایک ہاتھ میں پھول اٹھائے کھڑی تھی۔ اس نے معمولی پھولوں والے پرنٹ کی گلابی شلوار قمیص پہن رکھی تھی اور وہ فوٹوگرافر کے مشورے پر مسکرا رہی تھی ورنہ اس کے چہرے پر دکھوں کی تحریر صاف پڑھی جاتی تھی۔ وہ کمزور اور بیمار نظر آتی تھی اور اس کی عمر بھی چالیس پینتالیس سال ہی تھی وہ عورت اب بھی خوبصورت تھی اور اندازہ کیا جاسکتا تھا کہ جوانی میں اس کے حسن کی تابانی کتنی خیرہ کن ہوگی۔ عامر کے لیے اندازہ کرنا دشوار نہ تھا کہ یہ شاہ جی کی ماں تھی۔

وہ تصویر اپنی جگہ رکھ کے ہٹا ہی تھا کہ اس کا موبائل فون بجنے لگا۔ ایک لمحے کے لیے اس کا دل دھڑکنا بھول گیا۔ کسی وحشت ناک سوچ نے اس کے خیالوں میں سرگوشی کی۔ شاہ جی مر گیا، یہ شانو کا فون ہوگا لیکن کال ریسیو نہ کرنے سے حقیقت تو نہیں بدل جائے گی۔ اس نے ڈرتے ڈرتے کال ریسیو کی اور پھنسی پھنسی آواز میں کہا۔ "ہیلو"

دوسری طرف خاموشی رہی۔ عامر نے پھر ہیلو کہا مگر نمبر نہیں دیکھا جو اسے کال ریسیو کرنے سے پہلے دیکھنا چاہیے تھا، رات کے وقت رانگ کال بھی تو آسکتی ہے۔ کچھ ٹین ایجر رات بھر ایسی ہی کالز کے مزے لیتے ہیں۔ اس نے آخری بار کہا۔ "ہیلو! کون ہیں آپ...... کس سے بات

کرنی ہے؟“

”بات...... آپ سے عامر صاحب......“ کسی لڑکی نے دبی دبی ہوئی سرگوشی کی۔

”مجھ سے...... لیکن آپ ہیں کون......؟“

”میں...... نرگس......“

عامر نے پوچھا۔ ”کون نرگس...... میں کسی نرگس کو نہیں جانتا...... دیکھیے...... میں پہلے ہی بہت پریشان ہوں، مجھے معاف فرمائیے۔“

”میں شاہد کی بہن ہوں، فون بند نہ کیجیے۔“

عامر کے دماغ کو جھٹکا لگا۔ ”شاہد کی بہن...... کون شاہد...... وہ......“

”جی...... دیکھیے میری بات کا کوئی غلط مطلب نہ نکالیے۔ میں نے بڑی مجبوری میں آپ کو فون کیا ہے، آپ سمجھیں گے کیسی بے شرم لڑکی ہے، ابھی کیا حق ہے میرا آپ پر......“

خاصی کوشش کے بعد عامر سنبھل گیا۔ ”نہیں نہیں...... آپ بتائیں، کیا مجبوری تھی، لیکن اس سے پہلے یہ بتائیں کہ میرا فون نمبر آپ کو کہاں سے ملا؟“

”ڈھونڈنے سے تو خدا بھی مل جاتا ہے۔ یہ بات چھوڑیئے۔“

”مگر اتنی رات گئے، خیر آپ فرمائیے......“ عامر کے دل میں کلبلانے والا خوف کا کیڑا ذرا سی دیر میں وہ سانپ بن گیا جو اس کے سامنے پھن پھیلائے پھنکار رہا تھا۔ مجبوری کچھ نہیں، یہ لڑکی تم سے صاف کہنا چاہتی ہے کہ اسے یہ رشتہ منظور نہیں کیونکہ وہ کسی اور کو چاہتی ہے...... مگر ماں باپ کے سامنے بول نہیں سکتی۔ وہ عامر سے کہے گی کہ اسے بخش دے۔ خود اس رشتے سے انکار کر دے...... وہ کر سکتا ہے کیونکہ مرد ہے۔

”میں ہرگز آپ سے نہ کہتی...... مگر وہاں اور کوئی نہیں......“ نرگس نے کہا۔ ”آپ یہ کام کر سکتے ہیں۔“

”میں سمجھا نہیں ابھی تک...... ایسا کون سا کام ہے؟“ عامر کنفیوز ہونے لگا۔

”آپ کراچی میں ہیں نا...... وہاں ایک اسپتال ہے؟“ اس نے ایک اسپتال کا نام بتایا تو عامر کو پھر جھٹکا لگا کیونکہ شاہ جی اسی اسپتال میں داخل تھا۔ ”جی...... دیکھا ہے......؟“

”وہاں کمرا نمبر بارہ میں ایک مریض ہے، وہ میری ایک جاننے والی لڑکی کے والد ہیں، ان کو دل کا پرانا عارضہ لاحق ہے، رہی سہی کسر ذیابیطس نے پوری کر دی ہے۔ ان کو دل کا دورہ پڑا تھا اور ڈاکٹرز کہتے ہیں کہ ابھی تک ان کی حالت سنبھلی نہیں ہے۔ کنڈیشن بہت خراب ہے۔ دراصل ان کا دل بڑا ہے۔ محاورے کی بات نہیں، یہ ایک سیریس میڈیکل پرابلم ہوتی ہے، اس وقت سی سی یو میں کوئی بیڈ خالی نہیں تھا چنانچہ ڈاکٹروں نے وہیں مانیٹر وغیرہ لگا کے دیکھ بھال شروع کر دی ہے۔“

”وہ کب سے وہاں داخل ہیں؟“

”انہیں آج ہی داخل کرایا گیا تھا۔“

”اور آپ مجھے اب بتا رہی ہیں، آدھی رات کو......“

”آئی ایم سوری...... دراصل سب کے سامنے میں آپ سے فون پر بات نہیں کر سکتی تھی۔ اگر زحمت نہ ہو تو آپ صبح اسپتال جا کے انہیں دیکھ لیجیے اور دیکھیے میں نے آپ کو کال کی...... اس کا پتا نہیں چلنا چاہیے کسی کو بھی......“

”نرگس...... یہ لڑکی کون ہے، اس کے والد کا نام...... کچھ تفصیل بتاؤ۔“ عامر نے پوچھا مگر لائن کٹ چکی تھی۔ دوسری طرف سے نرگس نے فون بند کر دیا تھا۔ وہ اسی طرح اپنا فون ہاتھ میں لیے بیٹھا رہا۔ نرگس نے اسے یہ بھی کہا تھا کہ اس فون کے بارے میں کسی سے بات نہ کرے، وہ کال بیک بھی نہیں کر سکتا تھا۔ لہٰذا لائٹ بجھا کے وہ کچھ دیر نرگس کی صورت کو تصور میں دیکھنے کی کوشش کرتا رہا۔ انداز گفتگو سے وہ مہذب اور سلجھی ہوئی لگتی تھی۔ عجیب بات یہ تھی کہ عامر نے ابھی تک اسے دیکھا نہیں تھا۔ وہ ماں کی ضد سے اتنا زچ ہوا تھا کہ اب جو ہو سو ہو مجھے فرق نہیں پڑتا، کہہ کے بے نیاز ہو گیا تھا۔ لیکن سسرال والوں نے غیر مشروط طور پر اعتماد کا مظاہرہ کیا اور اس کے مستقبل کو مضبوط معاشی بنیاد فراہم کر دی تو وہ اخلاقی طور پر بھی بندھ گیا۔ ماں نے ایک بار کوشش ضرور کی تھی کہ عامر کو نرگس کی تصویر دکھائے لیکن اس وقت بجلی بند ہو گئی تھی۔ وہ بات وہیں رہ گئی اور عامر نے خود ہی کہہ دیا کہ چھوڑو تصویر کو...... تمہیں پسند ہے تو کافی ہے۔

اس کے کانوں میں نرگس کی آواز ابھی تک رس گھول رہی تھی مگر اس کے تصور میں نرگس کی کوئی صورت نہ تھی۔ اسپتال تو اسے صبح جانا ہی تھا۔ نرگس کو اس نے نہیں بتایا تھا کہ وہ ساتھ والے کمرا نمبر گیارہ میں سارا دن رہتا ہے۔ وہ شکرگزار ہو گی کہ ہونے والے شوہر نامدار سے اس نے اپنی بات منوالی۔

صبح اسپتال آتے ہوئے عامر نے اپنے موبائل فون میں دیکھنا چاہا کہ نرگس کی کال کس وقت آئی تھی اور اس نے کتنی دیر بات کی تھی۔ اسے بڑی حیرانی ہوئی جب ریسیو

ہونے والی کالز میں اسے کوئی بھی نیا نمبر دکھائی نہ دیا۔ گزشتہ شب کی صرف ایک کال تھی اور یہ نمبر شاہ جی کا تھا۔ عامر کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ کال کا ریکارڈ نہ ہو۔ خود اس نے کال کو ڈیلیٹ نہیں کیا تھا، کیا یہ فون کی خرابی ہے یا سسٹم میں گڑبڑ ہے، وہ راستے بھر سوچتا رہا۔

اسپتال میں دونوں کمروں کے دروازے ساتھ ساتھ تھے اور بند تھے پہلے وہ سیدھا شاہ جی کو دیکھنے گیا۔ وہ بیڈ پر سیدھا بیٹھا ناشتا کر رہا تھا اور جسمانی کمزوری کے باوجود ہشاش بشاش دکھائی دیتا تھا۔ چند منٹ بعد شانو نے اپنا سامان سمیٹا اور گھر چلی گئی۔ شاہ جی نے عامر کے لیے کیفے ٹیریا سے چائے منگوائی۔

عامر کے بولنے سے پہلے شاہ جی نے کہا۔ ”یار یہ ساتھ والا کمرا ہے نا...... بارہ نمبر......“

عامر چونکا۔ ”ہاں...... کیا ہے وہاں......“

”ایک مریض ہے، اس کی حالت ہم سے بھی زیادہ خراب ہے۔ ذرا اسے دیکھ آ...... دراصل رات تیرے جانے کے بعد اس کی بیٹی روتی ہوئی آئی تھی اور تجھے پوچھ رہی تھی۔“

”مجھے...... اسے میرا نام کیسے معلوم ہوا؟“

”نام نہیں لیا تھا اس نے...... کہہ رہی تھی کہ وہ جو آپ کے ساتھ تھے۔ وہ کہاں ہیں...... میں نے کہا کہ وہ دن میں ہوتے ہیں، ابھی گئے ہیں، تمہیں کیا کام تھا ان سے...... وہ کہنے لگی کہ صبح وہ مجھ سے مل لیں اگر...... میں نے کہا کہ اگر کی کیا بات ہے...... تو ذرا جا کے پوچھ، مجھے تو کچھ بتایا نہیں اس نے۔“

عامر گہری سوچ میں گم بیٹھا رہا۔ پھر اس نے شاہ جی کو نرگس سے ہونے والی گفتگو کے بارے میں بتا دیا۔ شاہ جی نے چائے پیتے ہوئے سر ہلایا۔ ”جا تو پہلے اس سے مل آ...... اب تو یہ حکم ہے تیرے لیے۔“

عامر باہر نکلا تو اس نے ایک لڑکی کو باہر کھڑا دیکھا۔ وہ چوبیس پچیس سال کی قبول صورت لڑکی تھی جس کے چہرے پر اداسی اور تھکن کے اثرات غالب تھے۔ شاید وہ رات بھر سوئی نہیں تھی، روتی رہی تھی۔ اس کا لباس بہت میلا، شکن آلود اور سادہ تھا...... عامر کو دیکھتے ہی اس نے دوپٹا سر پر رکھ لیا۔

عامر نے کہا۔ ”دیکھیے، میں عامر ہوں، مجھے نرگس نے بتایا تھا کہ آپ کے والد بہت بیمار ہیں۔“

اس کی آنکھوں میں حیرانی کا تاثر ابھرا۔ ”وہ دیکھنے میں نارمل ہیں مگر ڈاکٹر کہتے ہیں ان کی حالت ٹھیک نہیں...... کسی وقت کچھ بھی ہو سکتا ہے۔“

”میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں خاتون......؟“

”میرا نام زاہدہ ہے، کیا آپ مجھے تھوڑا سا وقت دیں گے، میں یہاں آپ کو ساری بات نہیں بتا سکتی۔“

عامر نے کہا۔ ”ہم کیفے ٹیریا جا سکتے ہیں۔“

زاہدہ نے دروازہ تھوڑا سا کھول کے ایک نظر اندر ڈالی۔ ”وہ سو رہے ہیں ابھی۔“ اور عامر کے ساتھ چلنے لگی۔ کیفے ٹیریا میں وہ چائے کا پیپر کپ تھام کے ایک خالی میز پر آمنے سامنے بیٹھ گئے۔

”بہت مشکل ہے میرے لیے...... ایسی بات کرنا بھی...... لیکن آپ شریف آدمی نظر آتے ہیں۔“

”صرف نظر ہی نہیں آتا، میں واقعی شریف آدمی ہوں۔“

زاہدہ کچھ شرمندہ ہوئی۔ ”ایک نرس ہے تسیر...... اس نے بتایا تھا کہ آپ ایک اچھے انسان ہیں۔ آپ کو ایک چھوٹا سا مگر مشکل کام کرنا ہے پروفیسر صاحب، کیا آپ تھوڑا سا جھوٹ بول سکتے ہیں؟“

عامر سخت حیران ہوا۔ ”جھوٹ بولنا واقعی مشکل ہوتا ہے لیکن بعض اوقات ضروری ہوتا ہے اور سچ سے زیادہ اہم بھی...... آپ وضاحت فرمائیے۔“

”میں آپ کو پروفیسر صاحب کہوں گی...... آپ کے جھوٹ سے ایک مرتے ہوئے شخص کو سکون حاصل ہو سکتا ہے اور خوشی مل سکتی ہے جو اس کی زندگی کی آخری اور سب سے بڑی خوشی ہو گی۔“

”یہ بات ہے تو آپ بتائیے مجھے کیا جھوٹ بولنا ہے۔“

زاہدہ کے چہرے پر تھوڑی سی بشاشت آئی۔ ”ابھی کچھ دیر بعد یہاں سے اٹھ کے میں ڈیڈی کے پاس جاؤں گی، تقریباً آدھے گھنٹے بعد آپ اندر آئیں گے، وہ آپ کو پروفیسر عامر کہہ کے نہیں، کیپٹن صفدر کہہ کے آپ کا استقبال کریں گے۔“

”یہ کیپٹن صفدر کون ہے؟ اور کیا اس کی صورت مجھ سے اتنی ملتی ہے؟“

”ڈیڈی نے کیپٹن صفدر کو کبھی نہیں دیکھا۔ بات کچھ یوں ہے...... ڈیڈی نے میرے لیے کسی اور کو پسند کیا تھا، اپنے ایک دوست کے بیٹے کو...... اس کا نام جہانگیر ہے اور وہ کسٹم آفیسر ہے۔ میری ماں نہیں ہے، ان کا انتقال تب ہو گیا تھا جب میری عمر صرف سات سال تھی۔ ڈیڈی نے میری وجہ سے دوسری شادی نہیں کی۔ اب یہ بتانے میں بھی کوئی حرج نہیں کہ خود ڈیڈی کسی اور سے شادی کرنا چاہتے تھے مگر ماں

باپ کے آگے مجبور ہو گئے تھے۔ میری ماں کے مرنے کے بعد وہ اپنی مرضی کر سکتے تھے کیونکہ وہ خاتون کنواری بیٹھی تھیں۔ ڈیڈی کے بعد انہوں نے کسی کو پسند ہی نہیں کیا تھا اور ایک کالج میں پڑھانے لگی تھیں۔ خود ڈیڈی کی شادی اسی ضد میں سات سال رکی رہی، میں ملی ہوں ان خاتون سے...... اگر وہ عمر میں ڈیڈی سے دو سال بڑی نہ ہوتیں تو شاید بات بن جاتی لیکن اسی بات کو بہانہ بنا لیا گیا۔ حالانکہ دو چار سال کچھ نہیں ہوتے۔ خیر...... ڈیڈی کی شادی ہوئی پینتیس سال کی عمر میں...... جب ماں کا انتقال ہوا تو وہ بیالیس کے تھے اور پروفیسر صاحبہ ہو چکی تھیں چوالیس کی......"

"کیا اس سے فرق پڑتا ہے، لوگ بڑھاپے میں بھی شادی کرتے ہیں۔" عامر نے سوال کیا۔

"بالکل کرتے ہیں، ستر اسی سال میں بھی شادیاں ہو جاتی ہیں لیکن ڈیڈی نے قربانی دی میری خاطر...... تنہائی کا عذاب جھیلا میرے لیے، ایک ڈر تھا ان کے دل میں کہ جو عورت ان کے لیے آئیڈیل بیوی تھی، ضروری نہیں کہ وہ میرے لیے آئیڈیل ماں بھی ثابت ہو۔ اب جس باپ نے اپنی زندگی تباہ کر لی ہو میرے لیے...... اس کی قربانی کو میں کیسے نظر انداز کرتی، میں اور صفدر کالج میں ساتھ تھے، پھر اس نے کمیشن کے لیے اپلائی کیا۔ اس تمام عرصے میں ہم ملتے رہے، وہ مڈٹرم بریک میں یونیورسٹی آ جاتا تھا۔ ڈیڈی نے اپنے دوست کو زبان دے رکھی تھی اور ان کی سوچ عام والدین جیسی تھی کہ کسٹم آفیسر ہوتا ہے نوٹ چھاپنے کی مشین...... میں عیش کروں گی۔ وہ صفدر کی شکل دیکھنا تو کیا اس کا نام تک سننا گوارا نہیں کرتے تھے۔"

"پھر اب کیا ہو گیا ایسا......"

"معلوم نہیں...... غالباً خود جہانگیر تنگ آ گیا اور اس نے کوئی نوٹس دے دیا کہ میں تو یہ انتظار نہیں کروں گا اور ان کی اپنے دوست سے کچھ تلخ کلامی ہو گئی۔ بات یہ طے ہوئی تھی کہ شادی میرے ایم اے کرنے کے بعد ہو گی۔ ابھی ایم اے میں ایک سال باقی تھا۔ ابا نے یہ بات یاد دلائی اور ان کے دوست نے کہا کہ کیا کرنا ہے مجھے ایم اے کی ڈگری کا...... بس ان کی ناراضی ہو گئی تو ابا نے کہا کہ تم صفدر کو بلاؤ، میں اس سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"پھر کیا مسئلہ ہے کہ تم اصلی کیپٹن صفدر کی جگہ مجھے پیش کر رہی ہو؟"

"ابھی وہ نہیں آ سکتا۔" وہ اداسی سے بولی۔ "اس کی پوسٹنگ ہے سیاچن میں...... وہاں چھٹی نہیں ملتی، وہ اپنی مدت پوری کر کے ہی آئے گا، چھ ماہ بعد......"

"یہ بات اپنے ڈیڈی کو بتانے میں کیا حرج ہے؟"

"وہ مایوس ہوں گے اور ہو سکتا ہے میری بات کا مطلب کچھ اور نکال لیں۔ یہ سمجھ لیں کہ اب صفدر بھی مجھے ٹال رہا ہے یا وہ مایوس ہو کے شادی کر چکا ہے...... وہ میرے لیے سخت فکرمند ہیں کہ بعد میں میرا کیا بنے گا، وہ کہتے ہیں کہ دنیا بڑی ظالم جگہ ہے، یہاں مردوں کے بھیس میں بھیڑیے پھرتے ہیں، وہ مجھے کھا جائیں گے۔ ان کی ذہنی کیفیت نارمل نہیں، آپ آ جائیں کچھ دیر بعد اور انہیں یقین دلا دیں کہ آپ مجھ سے بہت محبت کرتے ہیں، مجھ سے شادی کریں گے۔"

عامر خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔ "اور اگر...... انہوں نے کہا کہ...... دیر کا وقت نہیں ہے، نکاح ابھی یہاں میرے سامنے ہو گا...... پھر......؟"

"آپ کہہ سکتے ہیں کہ میرے والدین کی شرکت ضروری ہے۔ وہ کہیں باہر گئے ہوئے ہیں مثلاً لندن یا دبئی...... آپ تو صرف ڈیڈی کو مطمئن کر دیں، انہیں یقین دلا دیں کہ آپ نے میری ذمے داری قبول کر لی ہے۔ دیکھیے، اس میں کیا حرج ہے اگر ان کے دل کو سکون اور اطمینان حاصل ہو جائے۔ مرنے سے پہلے وہ میری طرف سے بے فکر ہو جائیں۔"

"آخر آپ نے میرا انتخاب ہی کیوں کیا، میرا مطلب ہے کیا آپ کے خاندان میں اور کوئی نہیں تھا، کوئی کزن...... دوست...... کلاس فیلو......"

"سب ہیں...... مگر میں رسک نہیں لے سکتی...... میرا مطلب ہے کوئی اسکینڈل بن جائے گا بلاوجہ پتا چل جائے گا کہ میں نے باپ کو آخری وقت میں دھوکا دیا۔ آپ تو اجنبی ہیں، چند جملے بول کر آپ کا کام ختم، پھر آپ اپنے راستے، میں اپنے راستے۔ پتا نہیں کیوں مجھے لگا تھا کہ آپ میری مدد کریں گے۔ اگر آپ کچھ نہیں کرنا چاہتے تو آپ کی مرضی۔"

اس نے آنکھوں سے دو آنسو صاف کیے اور کھڑی ہو گئی۔

"میں آتا ہوں، پندرہ بیس منٹ میں۔" عامر نے اچانک اپنا فیصلہ سنا دیا۔

یہ پندرہ بیس منٹ عامر نے ساری صورت حال شاہ جی کو سمجھانے میں صرف کیے۔ اس نے کہا۔ "یار تو جا...... وہ نرس آئی تھی ابھی، کیا نام ہے اس کا...... نسیمہ...... وہ بتا رہی تھی کہ اس مریض کا بالکل چل چلاؤ ہے۔"

عامر سوچے سمجھے بغیر اٹھا اور ساتھ والے کمرے میں گھس گیا۔ مریض کے بیڈ کے دونوں طرف دو ڈاکٹر کھڑے مانیٹر کو دیکھ رہے تھے اور نرسوں کو ہدایات دے رہے تھے، زاہدہ اپنے باپ پر جھکی ہوئی تھی۔ اسے دیکھتے ہی چلائی۔ "ڈیڈی، وہ آ گئے...... صفدر آ گئے۔"

مریض نے اسے غور سے دیکھا۔ عامر اس کے قریب زاہدہ کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔ اس نے مریض کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ "آئی ایم سوری...... مجھے دیر ہو گئی۔"

مریض نے لمبے لمبے سانس لیتے ہوئے کہا۔ "کیپٹن صفدر، تم شادی کرو گے...... زاہدہ سے......؟"

"میں تو کب سے یہ چاہتا تھا لیکن آپ کی اجازت درکار تھی۔"

"تم...... اسے خوش رکھو گے...... اس کا دنیا میں اور کوئی نہیں۔" وہ ہانپنے لگا۔

"آپ بالکل فکر نہ کریں، زاہدہ اب میری ذمے داری ہے، ساری عمر کے لیے......"

"اللہ...... اللہ تمہیں خوش...... خوش رکھے...... اب میں...... سکون...... سکون سے مر سکتا ہوں، اللہ...... تم دونوں کی...... حفاظت کرے۔" اس کی سانس میں خرخراہٹ بڑھ گئی۔

"ڈیڈی......" زاہدہ چلائی۔ نرسوں اور ڈاکٹروں نے ایک دم ایکٹو ہو کے اپنا کام شروع کیا۔ یہ انجکشن، وہ انجکشن...... دل کی دھڑکن رک گئی ہے، مصنوعی تنفس...... الیکٹرک شاک...... ٹرائی اگین، نو ریسپونس ڈاکٹر، مانیٹر کی بیپ...... بیپ اب ایک مسلسل جگر خراش سیٹی بن گئی تھی۔ دل کی دھڑکن کے ساتھ اوپر نیچے ہوتی روشنی بھی سیدھی لکیر ہے۔ دی اینڈ...... او کے...... وینٹی لیٹر ہٹا دو، مانیٹر کو ڈس کنیکٹ کر دو۔ ڈرپ ہٹاؤ...... پردے کھینچ دو، باڈی کو چادر میں لپیٹ دو...... ڈیتھ سرٹیفکیٹ لاؤ۔

زاہدہ مسلسل ہچکیوں سے رو رہی تھی۔ عامر کے جیسے زمین نے قدم پکڑ لیے تھے اور بے یقینی تھی کہ وہ شخص جو ابھی چند منٹ پہلے اس کی طرح جیتا جاگتا انسان تھا، اس سے باتیں کر رہا تھا وہ اب دنیا میں نظر آنے کے باوجود اس دنیا میں نہیں ہے۔ ایسا ہو چکا تھا حالانکہ یہ ناقابل بیان حد تک ڈرامائی تھا کہ فرشتۂ اجل اس کمرے کے باہر بے چینی سے عامر کا انتظار کر رہا تھا اور بالکل اس کے پیچھے پیچھے اندر آ گیا تھا۔ اسے صرف چند جملوں پر مشتمل گفتگو کی مہلت دی اور پھر اپنا کام ختم کر کے چلا گیا۔

عامر تیزی سے پلٹا اور شاہ جی کے کمرے میں آ کے کرسی پر گر گیا۔ شاہ جی کو اس سے کوئی سوال کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ عامر کے چہرے پر وحشت کی تحریر میں جواب موجود تھا...... اس نے تو ایک بڑی پرسکون موت دیکھی تھی اور بہت بروقت وہ دنیا سے جانے والے کو ذہنی سکون کا مکمل احساس دینے میں شریک ہو گیا تھا۔ وہ ایسا نہ کر پاتا تو ایک ناقابل معافی گناہ کی خلش میں مبتلا رہتا۔

دوپہر تک کمرا نمبر بارہ خالی ہو چکا تھا۔ وہ لڑکی جس سے اسے پھر کبھی نہیں ملنا تھا اپنے باپ کے جسد خاکی کو لے کر جا چکی تھی۔ جانے سے پہلے اس نے عامر کا شکریہ ادا کرنا ضروری نہیں سمجھا تھا۔ یہ اتنی ہی غیر اہم نیکی تھی جیسے راہ چلتے کسی اجنبی کے جنازے کو چند قدم کندھا دینا۔ عامر نے پھر اپنے فون کو دیکھا۔ اس پر صرف اسی گفتگو کا ریکارڈ تھا جو عامر نے شانو سے شاہ جی کے موبائل فون نمبر پر کی تھی۔

اس نے بہتر سمجھا کہ وہ اس بات کو فراموش کر دے گا۔ دنیا میں بہت کچھ ہوتا ہے۔

■ ■ ■

تین دن تک دو دنیاؤں کے درمیان معلق نظر آنے والا شاہ جی چوتھے دن پھر ہوش مندوں سے زیادہ ہوش میں تھا۔ ایک بار اسے شانو نے رات کو بلا لیا۔ وہ رو رہی تھی کہ اپنے دوست کو آخری بار دیکھنا ہے تو فوراً پہنچ جاؤ، لیکن شاہ جی نے صبح کر دی اور سنبھل گیا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ سب کے ساتھ دل لگی کر رہا ہے۔ کھیل رہا ہے...... شانو کے ساتھ، عامر کے ساتھ...... اور موت کے ساتھ...... انہیں شاک پروف بنا رہا ہے بالآخر جب وہ مرے گا تو وہ صدمے کی ریہرسل کئی بار کر چکے ہوں گے۔

چوتھے دن اس نے اپنے اعتراف سے عامر کو دم بخود کر دیا۔ "یار شانو سے میری شادی تو مہینا بھر پہلے ہو چکی تھی، میرا مطلب ہے نکاح اور رخصتی...... لیکن ایک بات بتاؤں؟ ابھی تک اس کے لیے شب عروسی نہیں آئی تھی، رات میں نے ثابت کر دیا کہ میں اس کا شوہر ہوں۔"

عامر نے بڑی مشکل سے کہا۔ "یہاں...... اس جگہ......؟"

اس نے اقرار میں سر ہلایا۔ "اسپتال کا یہ کمرا حجلۂ عروسی بنا، اب بچ بچ وہ میری بیوہ ہو گی۔"

"یار شاہ جی...... تمہاری یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔"

"یہ میری خواہش تھی، میں نے ایک ڈاکٹر سے مدد لی۔ ایسے جینے سے مرنا یقیناً بہتر ہو گا، لیکن میں بچ گیا تو دس فیصد چانس میرے لیے لاٹری کی طرح ہوں گے، عامر

پتر...... میں نہیں مرا......"

عامر نے سر ہلایا۔ "یہ خیال تمہیں پہلے کیوں نہیں آیا، آخر وہ بیوی تھی تمہاری......"

"ہاں یار...... بیوی تھی...... سو فیصد قانونی اور شرعی...... مگر خرابی یہاں تھی۔" اس نے اپنے سر کو انگلی سے بجایا۔ "اب تک میں تجھے نہیں بتا سکا کہ اس عورت سے میں نے شادی کیوں کی تھی۔ میرے دماغ میں ایک خیال تھا، کسی مولوی نے کہا تھا کہ بندہ جانتے بوجھتے شادی نہ کرے اور کنوارا مر جائے تو اس کا جنازہ جائز نہیں ہوتا۔ خدا معلوم یہ بات کس حد تک درست ہے۔ ویسے دیکھا جائے تو میں ہر گز کنوارا نہیں تھا۔ ایک ہزار ایک سو ایک بیویاں کر چکا تھا، کسی نکاح کے بغیر...... خیر یہ الگ بحث ہے۔ میں نے سوچا کہ بس اب شادی کر ہی لوں۔ ایک گھنٹے میں کل تین نام فائنل ہوئے اور میں نے طے کیا کہ صبح تینوں کو پروپوز کر دوں گا۔ ایک کو فون سے...... ایک کو ای میل سے، اور ایک کو رابطہ ہوتے ہی...... اس کا فون نمبر مجھے کسی اور سے لینا تھا۔ خیال یہ تھا کہ جس نے سب سے پہلے رپورٹ کی اسے شریک حیات کی پوسٹ پر فائز کر دوں گا۔ تینوں ایک سے بڑھ کر ایک تھیں، خوبصورتی میں اور شباب میں...... اس رات پھر ماں آ گئی، بالکل اسی طرح جیسے تو آتا ہے یا شانو یا وہ نرس آتی ہے...... نسیمہ...... وہ بہت دکھی ہے میرے لیے بے وقوف جذباتی لڑکی...... ماں نے دروازہ کھولا اور اندھیرے میں میرے پیروں کی طرف آ کے بیٹھ گئی۔ میں نے پیر سمیٹ لیے۔

ماں نے کہا۔ "تو شادی کر رہا ہے؟"

میں نے مذاق کیا۔ "تو کیا تم آؤ گی، ساس کا عہدہ سنبھالنے کے لیے؟"

وہ بولی۔ "ان تینوں کا خیال چھوڑ دے......"

میں نے کہا۔ "کیوں...... کیا تم نے کوئی پسند کر لی ہے۔ ایسا ہے تو وہ نمبر ون ہوگی۔"

ماں نے کہا۔ "میں یہی بتانے آئی تھی۔ تیرے لیے بیوی کا انتخاب کر لیا ہے میں نے......"

"اب سسپنس ختم کرو...... دلہا کو بھی بتا دو اس کی دلہن کا نام...... مگر اس سے پہلے یہ بتاؤ کہ کیا تم نے میرے لیے پیغام دے دیا ہے......؟"

ماں نے کہا۔ "تیری بیوی ہوگی شاہینہ...... جسے ہم شانو کہتے آئے ہیں۔"

مجھے یقین نہ آیا کہ ماں مجھ سے ایسا مذاق بھی کر سکتی ہے۔ "وہ شانو...... ہماری نوکرانی......؟"

"ہاں وہی شانو......"

"یہ تم کیا کہہ رہی ہو ماں......؟"

"ٹھیک کہہ رہی ہوں میں، جن کا انتخاب تو نے کیا ہے ان کی شادی تو ہو ہی جائے گی۔ کیا ضرورت ہے ان کی زندگی خراب کرنے کی......"

میں نے کہا۔ "ماں، اتنی دولت ملے گی انہیں...... اور وہ دوسری کر لیں گی میرے بعد......"

"کیا ضرورت ہے انہیں دولت کی...... وہ پہلے ہی اچھے کھاتے پیتے گھروں کی لڑکیاں ہیں، تجھ پر مرنے کے بعد بھی الزام رہے گا کہ تو نے دھوکے سے شادی کی...... شانو سے شادی کرے گا تو اس کی زندگی سنور جائے گی، اس کے بچوں کا مستقبل بن جائے گا...... یہ کتنا بڑا صدقۂ جاریہ ہوگا، کتنی بڑی نیکی ہوگی، اس کے ثواب کو سمجھو......"

میں دم سادھے اس کی بات سنتا رہا۔ عامر شاہ...... میرے لیے وہ ماں نہیں تھی، ہمیشہ راہ نما تھی، راستہ دکھانے والی روشنی تھی، اس وقت بھی جب میں چھوٹا تھا اور وہ میری انگلی پکڑ کے مجھے چلنا سکھاتی تھی...... اور آج بھی...... وہ جب وہ نہیں ہے...... وہ میرے لیے خضر راہ ہے، وہ میری عقل کو صراط مستقیم پر رکھتی ہے، شاید سب مائیں ایسی ہی ہوتی ہیں۔

خیر یار...... اپنی بات کہہ کے وہ اٹھی اور جیسے آئی تھی ویسے ہی چلی گئی...... میں اٹھ بیٹھا، کمرے میں اندھیرا تھا۔ دروازے کو اندر سے لاک لگا ہوا تھا مگر میں جانتا ہوں کہ وہ آئی تھی کیونکہ کمرے میں اس کے وجود کی خوشبو رہ گئی تھی، جسے صرف میں محسوس کر سکتا تھا۔ ظاہر ہے اس کے بعد میں نے شانو سے شادی کا فیصلہ کر لیا، اب میں بتاؤں تجھے کہ یہ شانو کون ہے۔ یہ اور اس کی ماں لوگوں کے گھروں میں کام کرتی تھیں، اس کا باپ بھیک مانگتا تھا۔ وہ معذور نہیں تھا مگر بنا ہوا تھا۔ اس کی بہت آمدنی ہوگی مگر اس کا زیادہ حصہ تو ٹھیکے دار کی جیب میں جاتا تھا اور وہ آگے پولیس اور دیگر حکام کو بھی بھیجتا تھا مگر شانو کے باپ کو بھی اچھے پیسے ملتے ہوں گے۔ لیکن وہ نشے کا عادی تھا اور جو کماتا تھا ایسے ہی اڑا دیتا تھا۔ بیوی اور بیٹی گھر گھر محنت کر کے اپنا پیٹ پالتی تھیں پھر اس نے اپنی بیوی کو بھی اپنے کام میں شریک کر لیا حالانکہ اس نے سخت مزاحمت کی تھی۔ اسے دوسری اچھی جگہ شوہر کی سفارش پر ملی تھی جہاں وہ اندھی بن کر پیسے کماتی تھی۔ جب میں نے شانو سے پوچھا تھا تو اس نے کہا کہ ماں کو ایک بڑی کوٹھی میں صبح سے شام تک کے لیے رکھ لیا ہے، مگر یہ جھوٹ تھا۔ شانو اپنا کام کرتی رہی اور ماں نے اسے بچانے کے لیے اپنے ہی گھر میں رکھ لیا۔ مگر اس کا باپ اسے لے گیا۔ اس بات کو کئی سال گزر گئے۔ میں کالج میں تھا جب شانو پھر آئی، اس کے ساتھ دو بچے بھی تھے۔ اس نے ماں کو بتایا کہ اس کے شوہر کا...... ایکسیڈنٹ میں انتقال ہو گیا ہے۔ شانو نے بتایا کہ اس کے ساتھ شوہر نے کیا کیا ظلم کیے تھے۔ اس نے شانو سے پیشہ بھی کروایا تھا اور وہ یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتی تھی کہ ان بچوں کا باپ کون تھا جو نہ ضائع ہوئے اور نہ مرے...... شانو بہر حال ماں تھی۔ اس نے اپنے وجود سے وجود پانے والے دونوں بچوں کو پالا۔ اس وقت وہ بچے بہت چھوٹے تھے۔ ایک چار سال کا ہوگا، دوسرا کچھ بڑا...... شاید پانچ سال کا۔ شانو ہمارے ساتھ رہی اور گھر کے سارے کام کرتی رہی، اس نے خود کبھی تنخواہ نہیں مانگی، جو پیسے ملے ان سے وہ بچوں کے لیے کچھ لے گئی۔ ماں جو پرانے کپڑے دیتی تھی وہ شانو پہن لیتی تھی۔ جو ملتا تھا کھا لیتی تھی۔ ماں کے مرنے کے بعد بھی اس کا معمول نہیں بدلا۔ وہ گھر کی اور میری دیکھ بھال اور خدمت کرتی رہی، اب تو بتا عامر شاہ...... میری ماں نے کتنا صحیح انتخاب کیا تھا میرے لیے......"

بولتے بولتے شاہ جی کچھ تھک گیا تھا اور گزر جانے والے وقت کے مقابل، آنے والے وقت کا خیال اسے اداس کرنے کے لیے کافی تھا۔ میں نے کہا۔ "سب بہتر ہے تم آرام کرو......"

"نہیں پتر...... کل کس نے دیکھی ہے، یہ تو سب ہی کہتے ہیں، میں کہوں تو کیا غلط ہے۔" وہ اٹھ کے بیٹھ گیا اور اس نے کیفے ٹیریا والوں سے فون پر چائے منگوائی۔ "میں نے بہت سوچا کہ شانو سے یہ بات کیسے کروں، وہ سمجھے گی کہ میں پاگل ہو گیا ہوں یا نشے میں ہوں۔ مگر ایک دن میں نے اسے اپنے سامنے بٹھا کے کہا کہ جو میں کہہ رہا ہوں دھیان سے سنو۔ وہ حیران سے زیادہ پریشان ہوئی کیونکہ اس طرح میں نے اس سے کبھی بات نہیں کی تھی، میں نے پہلے اسے اپنی بیماری کے بارے میں بتایا اور ڈاکٹروں کی رائے سے آگاہ کیا۔ وہ رونے لگی کہ ایسے مت کہو، اللہ شفا دینے والا ہے۔ اس نے کچھ پیروں فقیروں کی بات بھی کی۔ میں نے اسے خاموش کر دیا کہ میری بیماری کے بارے میں کوئی مجھ سے زیادہ نہیں جانتا۔ تم میری بات سنو، تمہارے لیے انکار کی گنجائش بالکل نہیں ہے۔ میری بات تم کو ماننی پڑے گی، جب میں نے بتایا کہ میں اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں تو وہ بار بار یہی کہتی رہی کہ ایسا نہیں ہو سکتا شاہ جی...... وہ بہت روئی مگر میں نے آہستہ آہستہ اسے سمجھا لیا۔ میں نے کہہ دیا کہ ماں نے خواب میں آ کے مجھے یہ حکم دیا ہے، میرے مرنے کے بعد وہ میری بیوہ ہوگی، قانوناً اور شرعاً۔ وہ میری وارث ہوگی، اس کے لیے سہاگن ہونا کوئی خوشی نہیں ہو سکتی مگر اس کے لیے اور اس کے بچوں کے لیے ایک باعزت مستقبل کی پوری ضمانت ہے۔ میں نے اسے بتا دیا کہ میری بات مانے بغیر وہ کمرے سے باہر نہیں جا سکتی۔ اب ایک آخری بات بھی بتا دوں، وہ کوٹھی بھی میری ہی ہے جس کی انیکسی میں ہم رہتے ہیں۔ میرے وکیل نے اس پراپرٹی کے دو حصے کرائے ہیں۔ انیکسی پانچ سو گز پر تھی، اس کی مالک شانو ہے۔ وہ اپنے بچوں کے ساتھ اس میں رہے گی۔ کوٹھی فروخت ہونے سے تقریباً دو کروڑ ملیں گے، یہ رقم شانو کے نام پر فکس ڈپازٹ ہوگی، ایک کروڑ شانو کے اپنے نام پر...... پچاس پچاس لاکھ دونوں بچوں کے نام پر...... بالغ ہونے سے پہلے وہ اس کو ہاتھ بھی نہیں لگا سکتے۔"

عامر خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔ شاہ جی نے زندگی میں جو بھی کیا تھا اس کے نقطۂ نظر سے برا تھا، گناہ تھا یا جرم تھا مگر اس کا کفارہ بھی اس سے بہتر کیا ہو سکتا تھا۔

■ ■ ■

ایمبولینس خاموشی سے کوٹھی کے اس گیٹ سے اندر داخل ہوئی جو سیدھا انیکسی تک جانے کا راستہ تھا۔ عامر نے اپنی نگرانی میں ڈیڈ باڈی کو اتروا کے برآمدے تک پہنچایا جہاں پہلے سے ایک تخت بچھا دیا گیا تھا۔ شانو وہاں دیوار سے ٹیک لگائے خاموش کھڑی تھی۔ آنسو اس کی آنکھوں سے نکل کر رخساروں پر بہتے جا رہے تھے۔ وہ بیوہ کے مرتبے پر فائز ہو چکی تھی اب خادمہ نہیں رہی تھی، یہ کوٹھی اور اس کی انیکسی سب اس کی ملکیت تھیں مگر وہ اس پر خوش نہیں ہو سکتی تھی۔ اس کا دکھ محض دنیا داری نہیں تھا۔ دنیا کے بارے میں وہ خود بھی جانتی تھی اور اس کے مرحوم شوہر نے بھی سمجھا دیا تھا کہ لوگ کس قسم کی باتیں کریں گے مگر اسے کسی کی پروا کرنے کی ضرورت نہیں۔ شانو کا دل رو رہا تھا، وقت کی اپنی چال ہوتی ہے۔ یہ کسی کے اختیار کی بات نہیں تھی کہ واقعات کی سمت اور ترتیب بدل سکے...... روحانی اذیت پہنچنے کے بعد بھی ایک ایسا شوہر ملا تھا۔ یہ کوٹھی اور کروڑوں روپے تو اس کا کوئی بدل نہیں ہو سکتے۔

عامر نے پہلی بار ان دو لڑکوں کو دیکھا جو کہیں اندر

سے نکل کر آئے تھے اور اب ماں کے ساتھ خاموش کھڑے اس بے جان جسم کو بے حسی سے تک رہے تھے جس کے ساتھ ان کا کسی قسم کا جذباتی یا خونی رشتہ نہیں تھا۔ ابھی تک ان کی سمجھ میں اس انقلاب کا مطلب نہیں آیا تھا کہ ایسا کیوں ہوا اور کیسے ہوا۔

ایمبولینس کے جاتے ہی عامر نے کہا۔ ''بھائی...... لوگوں کو اطلاع کرنی ہوگی۔''

شانو نے اپنے آنسو پونچھے۔ ''میں تو کسی کو بھی نہیں جانتی یہاں عامر بھائی......''

''تم اتنا عرصہ شاہ جی کی فیملی کا حصہ رہی ہو، ان کے عزیز رشتے دار...... پرانے محلے دار...... اور دوست احباب......''

شانو نے نفی میں سر ہلایا ''کوئی نہیں...... انہوں نے سب سے تعلق ختم کرلیا تھا۔''

عامر نے شاہ جی کا موبائل نکالا۔ اس میں درجنوں فون نمبر اور نام تھے۔ عامر نے ایک مضمون بنایا اور ایک بٹن دبا کے سب کو فارورڈ کر دیا۔ پھر اس نے چوکیدار سے کہا کہ وہ پاس پڑوس کے سب گھروں میں اطلاع کرائے کہ نماز ظہر کے بعد تدفین ہوگی۔

وہ گورکن کو قبر کی تیاری اور کفن خریدنے کے لیے نکلنے لگا تو اس نے شانو سے پوچھا۔ ''یہاں نزدیک کون سا قبرستان ہے؟''

''آپ ان کو عزیز آباد کے قبرستان میں دفن کریں۔ ان کی ماں کے ساتھ......'' شانو نے کہا۔

عامر رک گیا۔ ''ان کی تو قبر کا نام و نشان بھی نہیں رہا۔ خود شاہ جی نے تلاش کی تو انہیں ناکامی ہوئی تھی؟'' عامر نے کہا۔

''اب آپ تلاش کریں گے تو مل جائے گی۔'' شانو بولی۔

''میں کیسے تلاش کروں گا۔ اور اب نئی بات کیا ہوگئی ہے؟''

''مجھے کسی عورت نے فون کر کے کہا تھا۔ وہاں ایک پرانا بڈھا بلوچ ہے جو فیملی کے ساتھ اندر ہی رہتا ہے۔ اسے معلوم ہے...... وہاں جگہ حاصل کرنے کے لیے شاید آپ کو کچھ خرچ کرنا پڑے گا......'' شانو نے کہا۔

عامر نے سر ہلا دیا۔ ''میں دیکھ لیتا ہوں، پیسے کا کوئی مسئلہ نہیں...... وہ کون عورت تھی؟''

''معلوم نہیں، رشتے دار ہی ہوگی جو جانتی تھی، نام نہ اس نے بتایا نہ میں نے پوچھا۔''

عامر چلتے چلتے رک گیا۔ ''میں کیا بتاؤں گورکن کو...... مجھے تو شاہ جی کی والدہ کا نام بھی معلوم نہیں اور نہ والد کا......''

''آپ نرگس بانو کی قبر کے بارے میں معلوم کریں۔'' شانو نے کہا۔

اس نام سے عامر کے ذہن کو جھٹکا سا لگا۔ ''نرگس بانو......''

''چوبیس تاریخ تھی مارچ کی...... آج چودہ سال ہوگئے۔'' شانو کی بات جاری رہی۔

''آج چوبیس مارچ ہے، ان کا بھی آج ہی کے دن انتقال ہوا تھا؟'' عامر بھونچکارہ گیا۔

''مجھے اچھی طرح یاد ہے بھائی، جمعرات تھی......''

شانو نے کسی قدیم نمک خوار سے زیادہ قریبی رشتے دار کی طرح اعتماد سے جواب دیا۔ عامر اس اتفاق پر حیران ہوتا رہا۔ شاہ جی کی حالت گزشتہ شام سے بگڑنی شروع ہوئی تھی، بار بار ایسا لگا کہ یہ اس کی آخری سانس ہوگی مگر اس کی روح جیسے بدن سے جدا ہونے پر تیار نہ تھی۔ عامر کے علاوہ خود نرسیں اور ڈاکٹر اس انتظار میں تھے کہ شاہ جی کے لیے نزع کا آزار کب ختم ہوتا ہے۔ ابھی وہ چائے تیار کر کے فارغ ہی ہوا تھا کہ شاہ جی نے اسے آواز دی۔ یہ مدھم سی آواز محض ایک خرخراہٹ تھی۔

عامر نے چائے کا مگ رکھ دیا اور شاہ جی پر جھک گیا۔

''کیا بات ہے شاہ جی......''

اس نے شاہ جی کو زیر لب کلمہ دُہراتے سنا۔ پھر وہ بولا۔ ''خدا حافظ یار......'' اور اس کی سانس رک گئی۔ یکبارگی سرہانے لگے مانیٹر میں دھڑکتے دل کی خبر دینے والی، وقفے وقفے سے سنائی دینی والی مدھم بیپ...... بیپ...... بیپ ایک مسلسل نوحۂ مرگ جیسی سیٹی میں ڈھل گئی اور زندگی کے حرکت پذیر ہونے کی علامت، اوپر نیچے ہوتی روشن لکیریں ایک سیدھی لکیر بن گئی۔ موت کے ہاتھ سے زندگی کو واپس لانے کی ناکام کوشش کا ایک ڈراما پھر دُہرایا گیا۔ مگر شاہ جی بالآخر مر گیا تھا۔

قبرستان میں تاحد نظر کچی پکی قبریں تھیں۔ چھوٹے چھوٹے بچے اور بچیاں ہاتھوں میں تار کے ہینڈل والے گھی کے پرانے ڈبوں میں پانی اٹھائے ان کے پیچھے لپک رہے تھے جو قبرستان میں اپنے عزیزوں کی قبر پر فاتحہ خوانی کے لیے آتے تھے تو قبر پر پانی ڈالنے کے عوض ان بچوں کو پانچ دس روپے دے جاتے تھے۔ گورکن آج آنے والوں کے لیے قبریں کھودنے کے بجائے سنگ مرمر کی ایک صاف قبر پر پاؤں سمیٹے بیٹھا حقہ پی رہا تھا۔ ''یا مولا...... بھیج کوئی مردہ۔'' اس نے بیزاری سے آسمان کی طرف دیکھ کے دعا

کی۔ دعا محض رزق کے لیے تھی جیسے اس کا رزق فرشتۂ اجل کے ہاتھ میں ہو۔

عامر نے اسی وقت شاہ جی کے لیے قبر کی جگہ مانگی۔ گورکن کی دعا قبول ہوگئی تھی۔ وہ بڑی پھرتی سے نیچے اترا۔ ''کیسی قبر چاہیے جناب...... بغلی...... پکی...... سنگ مرمر والی......''

عامر نے کہا۔ ''مجھے ایک خاص جگہ قبر چاہیے۔ منہ مانگی رقم ملے گی۔''

''حکم کرو سرکار......'' گورکن مستعد ہوگیا۔

''مجھے نرگس بانو کی قبر کے ساتھ جگہ چاہیے۔ دائیں طرف یا بائیں طرف...... پیروں کی طرف ہو تو سب سے بہتر......''

''ملے گی سر، ملے گی...... کون ہے یہ نرگس بانو......''

عامر نے اسے تاریخ وفات بتائی۔ وہ سوچ میں پڑ گیا۔ ''ٹھہرو...... میں بابا کو بلاتا ہوں۔''

اس کا بوڑھا سوکھا مریل باپ کھانستا ہوا نمودار ہوا۔ ان کی آپس کی بات عامر کی سمجھ میں نہیں آئی لگتا یوں تھا کہ وہ لڑ رہے ہیں۔ پھر بچوں کو بلایا گیا، ایک...... دو...... تین...... چوتھے بارہ چودہ سال کے بچے نے اقرار میں سر ہلایا اور عامر کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ وہ بہت سی پکی قبروں پر چلتے کچی قبروں کو پھلانگتے قبرستان کے دور افتادہ شرقی حصے میں پہنچے، بچہ بڑے فاتحانہ انداز میں ایک جگہ رک گیا۔ عامر آخر میں وہاں پہنچا۔ اس سے پہلے گورکن نے آس پاس کی جگہ کا سروے شروع کر دیا تھا۔

عامر نے ایک خاصی پرانی قبر دیکھی جس کے کتبے پر نرگس بانو کا نام اور تاریخ وفات لکھی ہوئی تھی، انگریزی بھی اور اسلامی بھی...... وہ اچنبھے میں پڑ گیا۔ آخر شاہ جی اس قبر کی تلاش میں کیوں ناکام رہا؟ وہ بھی انہی لوگوں سے مدد لے سکتا تھا اور پیسا بھی خرچ کر سکتا تھا...... قبر تو اپنی جگہ موجود تھی۔

عامر کے خیالات کو گورکن کی آواز نے منتشر کر دیا۔ ''کدھر جگہ چاہیے سر......؟''

عامر نے ماں کے قدموں کی جگہ کو ترجیح دی۔ ''اگر یہاں ہوتی مگر یہاں تو......''

''اس کی آپ فکر مت کرو سر...... میت کب آئے گا......؟''

''ظہر کے بعد...... ابھی دو ڈھائی گھنٹے ہیں۔''

''آپ شام کو لاؤ، عصر مغرب کا ٹائم...... یہ پکا قبر

ہے۔" گورکن نے پیروں کی جانب سیمنٹ کے چبوترے کی طرف اشارہ کیا۔ "اس کو توڑ کے صاف کرے گا پہلے......"

خلاف امید شاہ جی کے جنازے میں شرکت کے لیے تقریباً پچاس ساٹھ افراد پہنچے۔ عامر کسی کو نہیں جانتا تھا۔ شاہ جی کو رات ہونے سے پہلے ہی ماں کے قدموں کے نیچے کی جنت میں جگہ مل گئی۔ وہاں سے کسی کو زبردستی بے دخل کیا گیا تھا، اس گناہ میں وہ شریک نہیں تھا۔

عامر نے رات کو شانو سے پوچھا۔ "جس عورت نے شاہ جی کی ماں کی قبر کے بارے میں کہا تھا اس نے اپنا نام نہیں بتایا تھا......؟"

"نہیں بھائی...... میں نے پوچھا بھی نہیں تھا۔"

"کتنی عجیب بات ہے، وہ بھی جو شاہ جی کو ایک خاص جگہ دلوانا چاہتی تھی، آخر کون تھی وہ...... اس کا فون نمبر تو ہوگا۔"

شانو نے اسے اپنا موبائل فون دے دیا۔ اس میں جتنے نمبر تھے عامر کے لیے سب ہی اجنبی تھے وہ سب کو فون کر کے معلوم کر لیتا تب بھی کیا ہوتا۔

■ ■ ■

سوئم کی رسمی تقریب بھی ہو چکی تھی۔ اس میں مشکل سے آٹھ دس افراد نے شرکت کی تھی۔ ان میں چوکیدار کے اہل خانہ اور شاہ جی کے وکیل کی فیملی شامل تھی۔ جاتے وقت وکیل نے عامر سے علیحدگی میں کہا۔ "مجھے آپ سے کچھ کام ہے، کل شام آپ میرے چیمبر میں آ سکتے ہیں؟"

"بالکل آ سکتا ہوں۔" عامر نے کہا۔ "مجھے اپنا ایڈریس دے جائیں۔"

وکیل نے اسے ایک کارڈ تھما دیا۔ رات کو اس نے شانو سے کہہ دیا کہ وہ اب واپس جانے کا سوچ رہا ہے، شانو بہت مایوس ہوئی۔ "اتنی جلدی کیا ہے آخر......؟"

"دیکھو بھابی...... اب آپ کو یہ زندگی خود اپنے سہارے پر گزارنی ہے۔ ان دو بچوں کے لیے...... شاہ جی تو اب نہیں رہے مگر ان کا چھوڑا ہوا بہت سرمایا ہے، آپ کی مدد کے لیے کچھ عرصے بعد میں بھی یہاں آ جاؤں گا۔ ابھی یہاں شاہ جی کے معتمد وکیل صاحب ہیں۔ آپ سیکیورٹی گارڈ اور ڈرائیور بھی رکھ سکتی ہیں، بس کچھ دن کی بات ہے۔ پھر انشاء اللہ آپ کے بچے جوان ہو جائیں گے۔ آپ پہلے ان کے لیے اچھی تعلیم کو یقینی بنائیں۔ اس پر آپ کو خصوصی توجہ دینی ہوگی کیونکہ اب تک نہ انہیں صحیح ماحول میسر تھا اور نہ اچھی تربیت...... یہی آپ کے مستقبل کا اصل اثاثہ ہیں۔"

"وہ تو ہے...... مگر تم کب تک واپس آؤ گے...... تم نے بتایا تھا کہ تم نے کراچی میں اپنا بزنس سیٹ کر لیا ہے۔"

"بھابی...... بزنس کے لیے مجھے لوٹ کے کراچی آنا ہے، مگر اس سے پہلے ماں میری شادی کرے گی، اسے میں اکیلا تو نہیں چھوڑ سکتا، جب میں اپنی بیوی کے ساتھ کراچی آؤں گا تو ماں بھی ساتھ ہوگی۔"

شانو نے عامر کا ہاتھ پکڑ لیا۔ "عامر بھائی، مجھ سے ایک وعدہ کرو۔"

عامر نے اس کے ہاتھ کی ٹھنڈک کے بعد اس کی آنکھوں سے ٹپکنے والے ایک قطرۂ اشک کی گرمی کو بھی محسوس کیا۔ وہ بے حس و حرکت بیٹھا رہا۔ "آپ کہیں...... میں کیا کر سکتا ہوں آپ کے لیے......"

"تم انکار نہیں کرو گے عامر......" شانو نے پہلی بار بڑی بہن کی طرح اس کا نام لیا۔ "وعدہ کرو۔"

"میں وعدہ کرتا ہوں، جو میرے امکان میں ہوگا وہ ضرور کروں گا۔"

"دیکھو...... اتنے بڑے گھر میں اکیلے رہتے ہوئے مجھے ڈر لگتا ہے۔ تم یہاں رہو گے میرے ساتھ...... اس گھر میں تین بیڈ روم ہیں، ہم سب کی ضرورت کے لیے جگہ بہت ہے۔ ورنہ ہم کوٹھی میں رہ سکتے ہیں۔"

"یہ...... آپ کیا کہہ رہی ہیں۔ کوٹھی بک چکی ہے۔"

"اس میں کرائے پر رہنا کوئی مشکل نہیں عامر...... مجھے کسی چوکیدار یا ڈرائیور کی نہیں، ایک بھائی کی اور ایک ماں کی زیادہ ضرورت ہے۔ میری اپنی تو کوئی فیملی نہ تھی، نہ ہے......" وہ اب باقاعدہ رو رہی تھی۔

"اچھا...... اچھا...... آپ روئیں نہیں، جیسا آپ چاہتی ہیں ویسا ہی ہوگا۔"

اس نے اپنے آنسو پونچھے اور دونوں بچوں کو سونے کے لیے بھیج دیا۔ "مجھے...... تم سے ایک بات اور کرنی تھی، جو میں کسی سے نہیں کہہ سکتی۔ میرے اس راز کو تم ہی راز رکھ سکتے ہو۔"

"جی کہیے، میں سن رہا ہوں......" عامر نے کہا۔

"میں...... میں ان دونوں بچوں کو...... شاہ جی کا نام دینا چاہتی ہوں، ان کے نام میں باپ کا نام ابھی تک شامل نہیں۔ جب تک یہ یتیم خانے میں رہے ان کے نام رشید اور حمید لکھے ہوئے تھے۔ اللہ مجھے معاف کرے۔ اصل باپ کے نام کا تو مجھے بھی پتا نہیں، کیا میں ان کے ناموں کے آگے شاہ جی کا نام لگوا سکتی ہوں؟"

عامر نے اس کی طرف دیکھنے سے گریز کیا۔ "یہ ہو سکتا ہے...... وکیل صاحب اس معاملے میں آپ کی مدد کر سکتے ہیں، میں ان سے کہہ دوں گا۔"

"میرا نیا شناختی کارڈ تو شاہ جی نے بنوا لیا تھا جس میں شوہر کی جگہ ان کا نام ہے، اچھا ہے بچوں کی ولدیت کے خانے میں بھی یہ نام آ جائے گا۔ جب ان کے شناختی کارڈ بنیں گے۔"

"اس میں قانونی رکاوٹ کوئی نہیں ہو سکتی۔"

ماں سے عامر کی روز بات ہوتی تھی۔ عامر نے بتا دیا تھا کہ جب تک اس کا دوست بیمار ہے وہ واپس نہیں آ سکتا۔ اب ماں کو بھی معلوم ہو چکا تھا کہ اس دوست کا انتقال ہو چکا ہے۔ وہ عامر کی واپسی چاہتی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ شادی کی ساری تیاریاں مکمل ہیں۔ لڑکی والے تاریخ مانگ رہے ہیں۔ الٹی بات۔ تاریخ لڑکے والے مانگتے ہیں، عامر نے اسے بتا دیا تھا کہ وہ دو دن میں پہنچ جائے گا۔ اگلے دن وہ یہ دیکھنے گیا کہ دکان پر کام کی پوزیشن کیا ہے! دکان مکمل ہو چکی تھی اور اس کی ساری دیواروں کے شوکیس ہر قسم کے نئے موبائل فونوں سے بھر گئے تھے...... اب یہ روڈ فیسنگ ڈبل شاپ تھی، شاہد یا اس کے باپ نے ساتھ والی دکان بھی اس میں شامل کر لی تھی۔ صرف اس پر سائن بورڈ لگنا باقی تھا۔ اندر صرف ایک شخص تھا جو شیشوں سے پالش کے داغ رگڑ رگڑ کر مٹا رہا تھا۔ عامر دم بخود کھڑا رہا۔ اس کے اندازے کے مطابق دکان کی مالیت جو تھی سو تھی، اس کو فرنش کرنے میں بھی لاکھوں لگے ہوں گے اور لاکھوں کا مال اندر بھر دیا گیا تھا۔ یہ بلاشبہ ایک سونے کی کان تھی جس کو سونا اگلنے کے لیے ایک مالک کا انتظار تھا۔

شام کو عامر صدر کی ایک بلڈنگ میں وکیل کے آفس پہنچا تو شاندار بیرونی آفس کے ویٹنگ روم میں چند کلائنٹس موجود تھے۔ اس کی سنجیدہ مزاج، درمیانی عمر کی سیکریٹری نے اسے اپنے کمرے میں بٹھا لیا اور اسے کافی پیش کی، مسئلہ باری کا نہیں تھا۔ وکیل اس سے تمام کاروباری امور سے نمٹنے کے بعد ملنا چاہتا تھا...... عامر کو ملاقات کے لیے ایک گھنٹا انتظار کرنا پڑا۔ تقریباً رات کے ساڑھے سات بجے وکیل نے اسے اندر اپنے پرائیویٹ چیمبر میں بلا لیا۔ "اب کوئی کلائنٹ نہیں آئے گا۔ کافی بھیج دو۔" اس نے سیکریٹری سے کہا اور پھر عامر کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔ "ابھی تک یہ میری سیکریٹری تھی، اب بیوی ہے۔ خود بھی وکیل ہے۔"

عامر متاثر ہوا۔ "اس سے اچھی اور کیا بات ہو سکتی ہے؟"

اس نے ایک فائل نکالی۔ "ممکن ہے جو بات میں تمہیں بتانے جا رہا ہوں، وہ تمہارے لیے نئی ہو۔ شاہ جی کی زندگی میں اس راز کو راز رکھنا میری اخلاقی ذمے داری تھی۔ اس نے مجھ سے عہد لیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ تم سے بات کی تو بات بگڑ سکتی ہے...... چنانچہ اس نے ایک دن تم سے کچھ کاغذات پر دستخط کرائے تھے۔"

عامر نے سر ہلایا۔ "اس نے مجھے کچھ سوچنے سمجھنے یا پوچھنے کا موقع ہی نہیں دیا تھا۔"

"وہ کچھ پراپرٹی کے کاغذات تھے۔ تم سخی حسن پر کوئی بزنس شروع کر رہے ہو؟"

عامر چونکا۔ "یس، وہ موبائل فونز کی دکان ہے۔ مجھے نہیں معلوم اس کا کرایہ کتنا ہے۔"

وہ مسکرایا۔ "پہلے وہ کرائے پر تھی، اب تمہاری ملکیت ہے۔ شاہ جی نے وہ تمہارے ہی نام سے خریدی تھی۔" اس نے ایک فائل عامر کی طرف بڑھا دی۔

عامر نے فائل کو ہاتھ لگائے بغیر پوچھا۔ "اور اس میں جو مال ڈالا گیا ہے؟"

"وہ سب تمہارا اپنا ہے، صرف تمہاری اطلاع کے لیے بتا رہا ہوں کہ اس پر شاہ جی نے تقریباً تیس لاکھ خرچ کیے تھے۔ تقریباً ستر لاکھ تمہارے لاہور کے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر ہوئے ہیں۔"

عامر کا دماغ گھومنے لگا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کیا کہے۔ کچھ دیر بعد وکیل کی بیوی کافی کے تین مگ ایک ٹرے میں رکھے اندر آئی۔ اس نے ایک مگ اپنے شوہر کے سامنے رکھا۔ ایک عامر کے سامنے اور تیسرا خود لے کر بیٹھ گئی۔

عامر نے کہا۔ "وکیل صاحب...... شاہ جی کا بزنس کیا تھا......؟"

وکیل نے نفی میں سر ہلایا۔ "آئی ایم سوری...... اس سوال کا جواب میں دے نہیں سکتا۔"

■ ■ ■

یہ کراچی جیسے شہر اور اکیسویں صدی ہونے کے باوجود ایک قدیم روایات کے مطابق منعقد ہونے والی ایسی شادی بن گئی جس میں دلہا دلہن کی مرضی محض رسم پوری کرنے کے لیے معلوم کی جاتی ہے ورنہ فیصلہ کرنے کا اختیار صرف ماں باپ استعمال کرتے ہیں۔

بقول شاعر، اس میں کچھ شائبہ خوبی تقدیر بھی تھا۔ اور

کچھ دخل اتفاقات کو بھی تھا کہ شب عروسی کو رسمی انداز میں گھونگٹ اٹھانے سے پہلے دلہا نے واقعی دلہن کا چہرہ نہیں دیکھا تھا۔ کراچی سے واپس آنے کے بعد عامر کو درحقیقت فرصت ہی نہیں ملی تھی۔ یہاں تمام معاملات طے پانے کے بعد انتظامات مکمل تھے اور تاریخ وغیرہ طے ہو چکی تھی۔ عامر کا زیادہ وقت تیاری میں صرف ہوا جس میں اس کے اپنے کپڑوں کی تیاری سے دعوت ناموں کی تقسیم تک سارے مراحل شامل تھے کیونکہ اس کی طرف سے ماں کی مدد کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ رسمی انداز میں سب کچھ ہوا۔ عامر کی ماں کی عجلت قابل فہم تھی۔ وہ ڈرتی تھی کہ کہیں عامر پھر تاخیر کا کوئی بہانہ تلاش نہ کرلے۔ لڑکی والوں کی تیاری مکمل تھی چنانچہ وہ بھی عامر کی ماں کی بات مان رہے تھے۔

نکاح کے بعد تک جب دلہن کو رسموں کے لیے اس کے پاس لا کے بٹھایا گیا تھا اس نے اپنی شریک حیات کی ایک جھلک تک نہیں دیکھی تھی۔ نتیجہ یہ کہ دلہن کا چہرہ اس نے وہی روایتی اور فلمی انداز میں اس وقت دیکھا جب حجلۂ عروسی میں عامر نے منہ دکھائی میں دینے والا نیکلس کا سیٹ سامنے رکھ کے سرخ جوڑے میں ملبوس گٹھری بنی دلہن کے چہرے سے نقاب الٹا۔

عامر کا ردعمل اتنا شدید تھا کہ خود دلہن حیران اور پریشان ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ عامر اس کی صورت کو پلک جھپکائے بغیر دیکھ رہا تھا اور بت بنا بیٹھا تھا۔ اس کا دماغ جیسے مفلوج سا ہو گیا تھا۔ اس کی دلہن کے روپ میں عامر کے سامنے اس کے دوست شاہ جی کی ماں موجود تھی۔ بالکل ویسی ہی جیسی وہ اپنی جوانی میں ہوگی۔ عامر نے اس کی جو تصویر دیکھی تھی، دلہن بالکل وہی تھی۔ اس کا نام نرگس بانو اتفاق ہو سکتا تھا مگر صورت دیکھ کے وہ یہ سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ یہ اس کا دوسرا جنم ہے۔ ایسی بات عامر کے عقیدے کے خلاف تھی اور وہ فلمی کہانیوں جیسے اتفاقات کو حقیقی نہیں مانتا تھا۔ مگر جو وہ دیکھ رہا تھا، اس سے بھی انکار ممکن نہیں تھا۔

آخر دلہن ہی کو پوچھنا پڑا۔ ’’خیریت تو ہے، آپ کیا دیکھ رہے ہیں؟‘‘

عامر نے چونک کر بات بنائی۔ ’’کچھ نہیں...... وہ دراصل...... تمہارے حسن کے نظارے نے مجھے مبہوت کر دیا تھا۔‘‘

دلہن شرما کے مسکرائی اور عامر نے اسے منہ دکھائی کا تحفہ دیا۔ اپنی شب عروسی عامر نے ایک خلجان میں گزاردی۔ صبح اس نے رخصت ہونے سے پہلے دلہن سے پوچھ ہی لیا۔

’’نرگس...... تمہاری کوئی سہیلی ہے، زاہدہ؟‘‘

وہ ابھی نہا کے واش روم سے نکلی تھی اور آئینے کے سامنے بال سکھا رہی تھی۔ اس نے پلٹ کے کہا۔ ’’نہیں......‘‘

عامر اسے دیکھتا رہا۔ ’’اس زاہدہ کے والد کا حال ہی میں انتقال ہوا تھا...... کراچی میں......‘‘

’’کراچی میں کبھی نہیں گئی...... نہ وہاں میری کوئی واقفیت یا عزیز ہے۔‘‘

عامر کے لیے اب حیرانی اپنی انتہا کے بعد پریشانی کی بات نہیں رہی تھی...... درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا۔ اس نے کہا۔ ’’تم نے مجھے فون نہیں کیا تھا؟ جب میں کراچی میں تھا......‘‘

دلہن حیرت اور شرم سے ساکت ہوگئی۔ ’’میں نے؟ یہ آپ کیسی باتیں پوچھ رہے ہیں؟ میں آپ کو کیسے فون کر سکتی تھی؟ میرے پاس تو آپ کا کوئی فون نمبر نہیں تھا اور خدانخواستہ ایسی کوئی ضروری بات ہوتی تو ابا آپ سے کرتے...... یا شاہد بھائی کرتے......‘‘

’’برا مت ماننا نرگس...... شاید میری باتیں تمہیں عجیب لگیں، میں تمہیں بعد میں سب بتادوں گا۔ ایک آخری سوال ہے، کیا شادی سے پہلے تم نے گھر میں شاہ جی کا ذکر سنا تھا؟ کسی غلام مصطفی شاہ کو جانتے تھے تمہارے والد...... یا بھائی......‘‘

نئی نویلی دلہن کی پریشانی کچھ بڑھ گئی، معلوم نہیں اس کے شوہر کے سوالات کا مقصد کیا تھا۔ اس نے پھر نفی میں سر ہلایا۔ ’’آخر کون ہے یہ شاہ جی......‘‘

’’وہ...... اب تو انتقال ہو چکا ہے ان کا......‘‘

’’ان کے بارے میں والد صاحب یا بھائی کچھ جانتے ہوں تو میں کہہ نہیں سکتی...... آپ انہی سے پوچھیں۔‘‘

عامر نے جیسے اپنے آپ سے کہا۔ ’’میرا خیال ہے...... اب کوئی فائدہ نہیں...... شاید ان کا جواب بھی یہی ہوگا جو تمہارا ہے۔‘‘

’’کچھ بتائیے تو سہی...... آخر معاملہ کیا ہے......؟‘‘ دلہن نے پوچھا۔

عامر مسکرایا۔ ’’کچھ نہیں...... بہت سے معاملات ایسے ہوتے ہیں جو سمجھ میں نہیں آتے، عقل اور فہم یا منطقی اسباب کی دنیا سے الگ ایک دنیا ہے، جس کے بارے میں سمجھنا مشکل ہے کہ اس کی حقیقت کیا ہے۔‘‘

وہ حیران پریشان دلہن کو سوچ میں گرفتار چھوڑ کے باہر نکل گیا۔

